خدا بخش لائبریری

جرنل

١١ ١٠

خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ

خدابخش لائبریری

جرنل

۱۰-۱۱

خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ

رجسٹریشن نمبر ۳۳۴۲۴/۷۷

مجلس ادارت

- قاضی عبدالودود (چیرمین)
- سید حسن عسکری
- افسرالدولہ فیاض الدین حیدر
- عابد رضا بیدار (سکریٹری)

دسواں اور گیارہواں شمارہ
۱۹۷۹ء

> اس سہ ماہی مجلّے میں انگریزی، اردو، فارسی یا عربی میں ایسے مضامین شائع ہوں گے جو خدابخش لائبریری کے نادر مواد پر مبنی ہوں، یا لائبریری سے کسی نہ کسی قسم کا تعلق رکھتے ہوں۔

قیمت : تیس روپے

سالانہ زرِ خریداری:

اندرون ملک :	۶۰ روپے
پاکستان :	۱۲ ڈالر
یورپ :	۸ پونڈ
امریکا اور دیگر ممالک :	۲۴ ڈالر

KHUDA BAKHSH O.P. LIBRARY PATNA-800004 PRICE Rs.

محبوب حسین نے اُردو حصہ پٹنہ لیتھو پریس، رمنا لین پٹنہ ۴، اور انگریزی حصہ تارا پریس ترپولیہ، پٹنہ میں چھپوا کر خدابخش لائبریری سے شائع کیا

انتخاب از صبحِ امید لکھنؤ

پریم چند :	۱- روے سیاہ (نومبر ۲۰ء)	پریم چند	۱
	۲- آبِ حیات (مارچ ۲۰ء)	"	۹
	۳- بعد از مرگ (اگست، ستمبر ۲۰ء)	"	۱۹
	۴- پریم چند کی دو کتابوں پر تبصرہ :		
	پریم پچیسی	ایڈیٹر	۳۲
	روٹھی رانی	"	۳۳
	۵ جمہور فلاطون	پریم چند	۱۶۲
منظومات :	۶ - غزلیاتِ نظر	نوبت رائے نظر	۳۴
	۷ - غزل	قمر گیاوی	۳۸
	۸ - قدیم وجدید طرزِ حکومت - انڈمنٹی بل اور رولٹ بل	سلیمان ندوی	۳۹
تذکرۂ شعرا :	۹ - حضرت مشتاق	نوبت رائے نظر	۴۱
	۱۰ - وفا رامپوری	حسرت موہانی	۴۹
	۱۱ - اقبال کے بارے میں (جنوری ۱۹ء)	—	۵۶
	۱۲ - نقیب بدایوں : ازل لکھنوی کی مثنوی	—	۵۷
	۱۳ - کلامِ جوش	ایڈیٹر	۶۴
	۱۴ - یارانِ طریقت کی یاد	نوبت رائے نظر	۶۶
ادبی مباحث :	۱۵ - حضرت طباطبائی اور ادب الکاتب والشاعر	احمد علی شوق قدوائی	۷۸
	۱۶ - ادب الکاتب والشاعر: جواب	علی حیدر طباطبائی	۸۴
	۱۷ - اعتراض مزید	احمد علی شوق قدوائی	۸۶
	۱۸ - 'ستی' اور 'تحریک' (الفاظ کی بحث)	ادیب لکھنوی	۸۹
	۱۹ - 'ستی' اور 'تحریک'	محقق لکھنوی	۹۵
	۲۰ - اردو میں انگریزی الفاظ	—	۱۰۵
زبان وادب :	۲۱ - ہماری زبان	لالہ لاجپت رائے	۱۰۶
	۲۲ - اردو کا مستقبل	ابوالخیر مودودی	۱۱۲
	۲۳ - مذاقِ ادب کی قومی کشش	تیج بہادر سپرو	۱۲۶
	۲۴ - قومی تعلیم	لالہ لاجپت رائے	۱۳۱
مذاہب :	۲۵ - ہندو مت	شبیر حسن مارہروی	۱۴۷
	۲۶ - بودھ مت	"	۱۵۵
سیاسیات :	- جمہور فلاطون	پریم چند	۱۶۲
	۲۷ - سوراج	د۔م آنند	۱۷۰

	۲۸- سلف ڈٹرمینیشن	تیج بہادر سپرو	۱۷۷
	۲۹- ہندوستان میں جمہوریت کا آغاز	جے۔آر۔رائے	۱۸۲
	۳۰- مہاتما گاندھی اور ان کی تعلیم	عبدالماجد دریابادی	۲۰۱
	۳۱- مذہب اور وطن پرستی	بشیر حسین زیدی	۲۲۲
	۳۲- ہند کا افلاس کیوں کر دور ہو؟	جے۔آر۔رائے	۲۲۷
مشرق وسطیٰ:	۳۳- مسئلۂ مصر	عبدالرزاق ندوی	۲۳۹
	۳۴- مصر انگریزی احتلال سے پہلے	ابوالخیر مودودی	۲۷۲
	۳۵- پریس کمیونک: عراق کے بارے میں	ایڈیٹر	۳۰۳
انقلاب اور تحریکیں:	۳۶- فلسفۂ انقلاب	مطلب حسین	۳۰۵
	۳۷- سوشلزم (مئی، جون، اگست، ستمبر ۲۰ء)	کشن پرشاد کول	۳۰۹
	۳۸- بولشیوزم	'مؤرخ'	۳۲۸
	۳۹- سویٹ روس	کشن پرشاد کول	۳۵۵
	۴۰- انقلاب روس	″	۳۶۴
سیاسیات:	۴۱- نئی دنیا	لالہ لاجپت رائے	۳۹۱
	۴۲- سرکار سے قطع تعلق	کشن پرشاد کول	۳۹۷
	۴۳- شورش پنجاب	″	۴۰۵
	۴۴- شورش پنجاب و مابعد	'پنجابی'	۴۲۱
	۴۵- پنجاب کی بدقسمتی پر چند منتشر خیالات	لالہ لاجپت رائے	۴۳۱
سیاست و معاشیات:	۴۶- پرانا دکھڑا	'رشی' ازمان سرور	۴۳۹
	۴۷- کانگریس کا کچا چٹھا	″	۴۴۹
	۴۸- آئینی اصلاحات ہند	تیج بہادر سپرو	۴۵۹
	۴۹- مساوات کا مسئلہ (فروری ۲۱ء)	—	۴۷۱
تہذیب و ادب:	۵۰- اورنگ زیب عالمگیر کے بارے میں	برج نرائن چکبست	۴۷۲
	۵۱- (اورنگ زیب عالمگیر پر چکبست کی تحریر کے جواب میں) مراسلہ	دستہ پرشاد فدا	۴۷۴
	۵۲- سلطنت اودھ میں ہندوؤں کا حصہ	سید سلیمان ندوی	۴۷۸
	۵۳- سید ابوالاعلیٰ مودودی کے ایک مضمون کے بارے میں	ایڈیٹر	۴۸۵
	۵۴- لفظ تنظیم کا استعمال	″	۴۸۶
	۵۵- حضرت ناقب سے معذرت	″	۴۸۸
صبح امید کا تعارف			۴۸۹

اس انتخاب میں شامل

'صبحِ امید' کے لکھنے والے

چکبست، برج نرائن (۱۹ جنوری ۱۸۸۲ء - ۱۹۲۶ء) - مشہور شاعر؛ معرکۂ 'چکبست و شرر' شہرت کے ناقد؛ کلام کا مجموعہ 'صبحِ وطن' شائع ہو چکا ہے۔ تفصیل کے لئے افضال احمد کا مقالہ تحقیقی اور 'چکبست اور باقیاتِ چکبست' از کالیداس رضا۔ باپ شیو پرشاد (سوپور) کشمیر سے تعلق کی بنا پر شیو پوری کہلاتے تھے۔ چکبست کی ولادت کے وقت وہ پٹنہ میں ڈپٹی کمشنر تھے۔

کشن پرشاد کول: (م ۱۹۵۴ء) رسالہ 'صبحِ امید' کے اصل محرک، لیکن ایڈیٹر کے بجائے نام پبلشر ہی کے طور سے دیتے رہے۔ سرونٹس آف انڈیا سوسائٹی کے سرگرم کارکن؛ مشاہیرِ قوم کی سیاسی تقریریں، گوکھلے کی تقریریں اور گلدستۂ پنچ کے مرتب؛ شاما (ناول) اور ادبی اور قومی تذکرے (۶۲)، اور دنیا ادب، کے مصنف۔ آزادی کے بعد انجمن ترقی اُردو کی مجلس عاملہ کے فعّال رکن تھے اور اُردو کے لئے ہر محاذ پر مخلص سپاہی کی حیثیت سے خدمات کے لئے تیار رہتے تھے۔ ۱۹۵۴ء میں وفات پائی (معارف فروری ۵۴ء)

جے۔ آر۔ رائے: اندورین الٰہیات کے استاد؛ مشاق اخبار نویس، ادیب العصر اور صبحِ امید کے مستقل مضمون نگار۔

مطلب حسین —

وشنو پرشاد فدا —

شبیر حسن مارہروی —

حسرت موہانی، سید فضل الحسن (۸۱/۱۸۷۸ — ۱۹۵۱ء) جنگ آزادی کا ناقابلِ فراموش نام؛ علیگڑھ کے گریجویٹ؛ اُردو کے معروف غزل گو، ماہنامہ اردوے معلّٰی کے ایڈیٹر۔ (تفصیل کے لئے: نقوش شخصیات نمبر ۱۹۵۶ء؛ حسرت موہانی، از عبدالشکور؛ نگار اور اردو ادب کے حسرت نمبر)

لاجپت رائے: (۱۸۶۵ء — ۱۹۲۸ء) بال پال لال کی تثلیث کا ایک جز؛ تحریکِ آزادی کے جانباز سپاہی؛ آریہ سماج اور کانگریس کے رہنما، متعدد تعلیمی اور سماجی تنظیموں کے بانی، اردو میں درجنوں مضامین اور متعدد کتابیں ان سے یادگار ہیں۔

سید سلیمان ندوی: (۱۸۸۴ء—۱۹۵۳ء) نامور عالم اور مصنف؛ مولانا شبلی کے شاگرد؛ شبلی کے دارالمصنفین (اعظم گڑھ) کے بنانے والے۔ رسالہ 'معارف' کے ایڈیٹر۔ تفصیل کے لئے: حیاتِ سلیمان؛ 'معارف'، سلیمان نمبر۔

قمر گیاوی: نواب محمد نقی (پ ۱۸۹۷ء م بعد ۱۹۳۱ء) شمشاد لکھنوی کے شاگرد۔ اودھ پنچ کے نامہ نگار تھے۔ دیگر رسالوں میں بھی لکھتے رہے۔ قمراللغات، آفتاب اُردو؛ تذکرۂ شعرائے بہار: آب کوثر کے علاوہ دیوان پیغمبر آپ سے یادگار ہیں۔ مولانا محمد علی کے انتقال (۱۹۳۱ء) تک زندہ تھے۔

عبدالرزاق ندوی: عبدالرزاق ملیح آبادی، جامعہ ازہر کے تعلیم یافتہ، عربی کے عالم، اردو کے ادیب اور صحافی، جوش ملیح آبادی کے چچا زاد بھائی؛ مولانا آزاد کے معتمد خاص۔ ترکی سے نکلنے والا 'جہانِ اسلام' کے اردو حصہ کے ایڈیٹر، مولانا آزاد کے اخباروں پیغام (الجامعہ (عربی) اور الہلال (دورِ ثانی) کو ایڈٹ کیا؛ اپنا اخبار، 'ھند' پھر اُجالا اور پھر آزاد ہند جاری کیا؛ ابن تیمیہ اور ابن قیم کی کئی کتابوں کا ترجمہ اُردو میں کیا بعض اور مشاہیر کی تصانیف کو عربی سے اُردو میں منتقل کیا۔ آخر میں سرکاری عربی مجلے ثقافۃ الھند کے ایڈیٹر رہے اور آل انڈیا ریڈیو کے شعبۂ عربی کے سپروائزر۔ جون ۱۹۵۹ء میں وفات پائی۔

سید ابوالخیر مودودی: جس طرح بیسویں صدی کے پہلے دہے میں دو بھائی ابوالنصر غلام یٰسین آہ اور ابوالکلام غلام محی الدین آزاد اُبھرے، جن میں چھوٹے بھائی نے قومی سیاست سے ہٹ کے ادب میں بھی بہت شہرت پائی۔ ایسے ہی بیسویں صدی کے دوسرے دہے کے اواخر میں دو بھائی سید ابوالخیر مودودی اور سید ابوالاعلیٰ مودودی ادبی رسائل میں سامنے آئے، اور یہاں بھی چھوٹے بھائی نے مذہبی اور (پاک قومی) سیاست کے ساتھ ساتھ اردو نثر کے میدان میں وہ شہرت حاصل کی کہ آج بڑے بھائی کو لوگ چھوٹے ہی کی نسبت سے پہچانتے ہیں۔ ابوالخیر مودودی نے جامعہ عثمانیہ کے لئے 'فتوح البلدان' (بلاذری)' تاریخ کامل (ابن کثیر)' کتاب الخراج (قدامہ ابن جعفر) کے ترجمے کئے۔

ابوالخیر مودودی ۱۹۰۰ء میں پیدا ہوئے تھے اور سید ابوالاعلیٰ مودودی سے ۳ سال بڑے تھے۔ انہوں نے اگست ۱۹۷۹ء میں وفات پائی۔

عبدالماجد دریابادی: (۱۸۹۲ء – ۱۹۷۷ء) صاحب طرز ادیب، مفسر، صحافی: سچ، صدق، صدق جدید (مختلف اوقات میں ایک ہی پرچے کا نام) کے ایڈیٹر؛ فلسفہ، تصوف، تفسیر، شخصیات، ادب، اخلاق اور نفسیات پر متعدد کتابوں کے مصنف کئی انگریزی کتابوں کے مترجم۔ مولانا محمد علی کے خاص چیلے۔
تفصیل کے لیے: فروغ اُردو دریابادی نمبر، آپ بیتی۔

بشیر حسین زیدی: (پ۔ ۳ر جولائی ۱۸۹۸ء) کیمبرج سے تاریخ میں ٹرائی پوس، لنکنز ان سے بیرسٹری۔ علیگڑھ میں ذاکر صاحب کے بعد وائس چانسلر ہوئے۔ یہیں یونیورسٹی اسکول کے پہلے ہندوستانی ہیڈ ماسٹر بھی رہے تھے۔ سابق ریاست رامپور میں جج، ہاؤس ہولڈ منسٹر اور پھر چیف منسٹر ہوئے رامپور ہی کے وزارت اعلیٰ کے دور میں اعزازی کرنل ہوئے؛ دستور ساز اسمبلی کے رکن ہوئے اور پھر پارلیمنٹ کے بھی!
آج کل جامعہ ملیہ میں مقیم ہیں اور جامعہ کے علاوہ متعدد ادبی اور سماجی انجمنوں اور تنظیموں کے ڈائرکٹر، صدر یا نائب صدر ہیں۔ 'دنیا کے رہنے والے' کے عنوان سے ایک دو کتابچے لکھے تھے۔ کیمبرج کے قیام کے زمانے میں ایک رسالہ 'نوائے کیمبرج' بھی نکالا تھا، جس کے غالباً دو تین شمارے نکلے۔

معلم، مورخ، پنجابی، رشی، ازمانہ دور اور آنند، صبح امید کے مستقل معاونین میں سے کس کس کے قلمی نام تھے، یہ بتانا اب دشوار ہے۔ امکان ہے کہ کشن پرشاد کول خود ہوں یا چکبست؛ یا پھر لاجپت رائے یا تیج بہادر سپرو۔ محقق، اور ادیب، نوبت رائے نظر، عبدالماجد دریابادی، نظم طباطبائی اور شوق قدوائی میں سے کوئی دو صاحب ہو سکتے ہیں۔

تیج بہادر سپرو: اُردو تہذیب کا ایک معروف نام؛ اعتدال پسند محب وطن، مشہور قانون داں؛ اُردو کی کتابوں پر ان کے مقدمے اور دیباچے موجود ہیں۔ ہندوستانی اکیڈمی کے صدر تھے۔ تقسیم سے قبل انجمن ترقی اردو کے صدر تھے۔ بجنور کے رہنے والے تھے۔ ۱۸۷۷ء میں پیدا ہوئے۔ ۱۷–۱۸ سال کی عمر میں الٰہ آباد میں آئے اور پھر یہیں کے ہو رہے۔ ۲۰ جنوری ۱۹۴۹ء کو انتقال ہوا۔

شوق قدوائی: احمد علی (پ ۱۸۵۳ء – م ۱۹۲۵ء) امیر لکھنوی کے شاگرد، شعرائے متاخرین اردو میں ایک اہم مثنوی نگار اور زباں داں۔ ریاست رام پور میں جامع اللغات کی تدوین میں شریک۔ مثنوی ترانۂ شوق، عالم خیال اور ڈراما قاسم و زہرا وغیرہ کے مصنف۔

پریم چند: (پ ۱۸۸۱ء م ۱۹۳۶ء) مشہور ناول نویس و افسانہ نگار۔

نوبت رائے نظر: (پ ۱۸۶۶ء – م ۱۹۲۳ء) ۱۸۹۷ء میں مشہور رسالہ 'خدنگ نظر' نکالا۔ ۱۹۱۰ء میں انڈین پریس کے پرچے ادیب کے ایڈیٹر رہے۔ پھر زمانہ، دکانپور اور اودھ اخبار (لکھنؤ) میں کچھ عرصہ کام کیا۔ ۱۹۲۳ء میں وفات پائی۔

رگھو کل تلک : (پ ، جنوری ۱۹۰۰ء) گوکھلے کے تربیت یافتہ؛ گاندھیائی عہد اور اس سے بھی زیادہ ہندوستان کی گنگا جمنی مشترک تہذیب کے کاروانِ رفتہ کی معتبر ترین نشانی ککشن پرشاد کول، تیج بہادر سپرو، برج نرائن چکبست، گنگا پرشاد ورما، دتاتریہ کیفی، جگت نرائن ملّا، جواہر لال اور سروجنی نائیڈو کے قافلے کے آخری راہی؛ جنگ آزادی کے آزمودہ سپاہی۔ آزادی کے بعد ریلوے سروس کمیشن (شمالی) کے چیرمین رہے (۵۳-۵۸ء) کاشی ودیا پیٹھ (بنارس) کے وائس چانسلر (۱۹۷۱-۷۴ء) گاندھین انسٹی ٹیوٹ بنارس کے ڈائریکٹر اور اعزازی پروفیسر (۱۹۷۴-۷۶ء)۔ ۱۹۷۷ء سے راجستھان کے گورنر ہیں۔ ازمنۂ وسطیٰ کی تاریخ اور فارسی اور اردو ادبیات سے ایسا شغف اور ذوق رکھنے والے اور ہندوستان کے ملے جلے کلچر کی علمی اور عملی نمائندگی کرنے والے ۱۹۸۱ء میں مسٹر تلک جیسے دو چار بھی نکل آئیں تو بڑی بات ہوگی۔ ●●

پریم چند

روے سیاہ

(۱)

عالمگیر قحط کا سامنا تھا۔ سال بھر سے پانی کی ایک بوند بھی نہ گری تھی۔ کھیتوں میں خاک اُڑتی تھی۔ گھاس تک جل گئی تھی۔ نہ کہیں دانہ تھا نہ کہیں پانی۔ لوگ درختوں کی چھالیں کوٹ کوٹ کر کھاتے تھے۔ آدھی رات کو لو چلتی تھی اور دوپہر کو تو زمین سے آگ کے شعلے نکلتے تھے۔ معلوم ہوتا تھا کوہ آتشیں ہے۔ لوگوں کے دل تک خشک ہو گئے تھے۔ کوئی کسی کی بات نہ پوچھتا تھا۔ سب اپنی اپنی مصیبت میں گرفتار تھے۔ روزانہ مندروں اور مسجدوں میں خلقت جمع ہوتی تھی۔ لوگ روتے، ہائے ہائے کرتے، مگر اس نالہ وشیون کا کچھ اثر نہ ہوتا تھا۔ شاید ارباب قضا کے دلوں میں بھی رطوبت باقی نہ رہی تھی۔ جوتشیوں اور نجومیوں کے دروازوں پر شب و روز نیاز مندوں کا ہجوم رہتا تھا۔ بازاروں میں لڑکے برہنہ تن گھومتے پھرتے تھے اور گاتے تھے۔

کال کلوٹی اجلی دھوتی میگھا دادا پانی دو

ایک عالم طبیعات نے شگوفہ چھوڑا کہ میں کیمیاوی ترکیب سے پانی برسا سکتا ہوں۔ رعایا نے لاکھوں روپے چندے دیے۔ ڈاکٹر صاحب نے بادلوں پر مقناطیسی اثر ڈالنے کی خوب کوششیں کیں لیکن نتیجہ کچھ نہ نکلا۔ نہ اندر پسیجے، نہ پانی برسا اور رعیت کی حالت روز بروز زبوں ہوتی چلی گئی۔

(۲)

لاچار ایک دن لوگوں نے فیصلہ کیا کہ اس مصیبت میں اولیا اور مہاتماؤں کے دربار میں فریاد کرنی چاہیے۔ آخر وہ کس دن کام آئیں گے۔ لاکھوں ہندو جمع ہو کر بابا درلبھ داس کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اُن کی کٹی کے سامنے دھرنا دے کر بیٹھے۔ مسلم رعایا

خواجہ رشید جلالی کے رفعت نشان آستانے پہ ماتھے رگڑنے لگی۔ دونوں بزرگوں کو رعایا کے حال زار پر ترس آیا۔ باباجی نے سارے ملک کے سادھو سنتوں کو مدعو کیا۔ خواجہ صاحب نے اطراف و اکناف سے برگزیدگان خدا سے امداد طلب کی۔ ایک ہفتہ میں چاروں طرف سے سادھوؤں اور فقیروں کے غول کے غول اور جتھے کے جتھے آنے لگے۔ دارالخلافہ میں کبھی اہل تقدس کا ایسا نورانی مجمع نظر آیا تھا۔ یہ حضرات معجزات و خوارق کے لئے مشہور تھے۔ لوگوں کو کامل اعتماد تھا کہ اگر یہ لوگ ابروؤں کا اشارہ بھی کردیں گے تو اِندر کی مجال نہیں کہ وہ نافرمانی کر سکے۔ بالآخر ایک روز بابا درگیھ داس ان تمام باکمالوں کے ساتھ شہر سے باہر نکلے۔ جلوس شاندار تھا۔ آگے آگے اونٹوں پر نقارے بجتے تھے۔ اس کے بعد مختلف قسم کے علم اور نشان، پیچھے سنکھ اور گھنٹے بج رہے تھے۔ سب سادھوؤں کے دل تھے۔ کوئی سنہری جھول سے آراستہ ہاتھی پر سوار تھا، کوئی سجے ہوئے گھوڑے پر، کوئی سرق پالکیوں پر، چلے چھتر لگائے چنور ہلاتے جاتے تھے۔ اس جلوس سے کئی قدم پر اولیاء کی قطار تھی۔ یہاں وہ شاہانہ کر و فر تو نہ تھا۔ ہاں اُن کی وضع و قطع سے ایک فقیرانہ جلال ٹپک رہا تھا۔ سارے شہر کا چکر لگانے کے بعد یہ جلوس ایک اونچے ٹیلے پر جا پہنچا۔ یہاں لوگ اپنے اپنے آسن جما کر بیٹھے اور خدا سے التجا کرنے لگے۔ کسی نے سمادھی لی۔ کوئی جوگ کے آسن دکھانے لگا۔ کسی نے رامائن پڑھنا شروع کیا۔ کرشن کے بھگتوں نے کیرتن کرنا ہی کافی سمجھا۔ فقرا تسبیح خوانی کرنے لگے۔ کوئی وِرد میں مگن ہوا، کوئی حال میں، اور یہ کیف و کم کا دور تین گھنٹے تک جاری رہا۔ لاکھوں آدمی نیچے کھڑے یہ نظارہ دیکھ رہے تھے اور وہ رہ رہ کر آسمان کی طرف تاکتے تھے کہ بادل اُٹھا یا نہیں۔ جب دوپہر ہوا آفتاب سر پر جا پہونچا۔ تمازت سے چہرہ سرخ ہونے لگا اور ابر کا ایک ٹکڑا بھی نظر نہ آیا تو لوگ مایوس ہو کر نیچے اُتر آئے۔ خواجہ رشید جلالی نے باآواز بلند کہا۔ ملک کی یہ حالت تمہارے راجہ کی بے انصافی کا نتیجہ ہے۔ جب تک راجہ صاحب خدا کے دربار میں آہ و زاری نہ کریں گے، یہ عتاب ایزدی دور نہ ہوگا۔ تم لوگ جا کر انہیں کے قدموں پر گرو۔ انہیں کی شفاعت سے تمہاری نجات ہو سکتی ہے۔

(۳)

راجہ پرتھوی پت سنگھ ایک نفس پرست آدمی تھے۔ اپنے عیش و نشاط کے سوا اُنہیں اور کوئی کام نہ تھا۔ مہینوں محل سے باہر نہ آتے تھے۔ ہمیشہ راگ و رنگ کا چرچا رہتا تھا۔ تمام شہر کے بھانڈ، بھڑوے، لچے اور شہدے اُن کے مقربین میں تھے۔ روزانہ نئی نئی شرابیں کھینچی جاتیں۔ انواع و اقسام کے لذیذ کھانے تیار ہوتے تھے۔ انہیں صرف شاعری سے اُنس تھا اور وہ بھی اُسی شاعری سے جس سے آتش عشق تیز ہوتی ہے۔ وہ خود ٹھمریاں اور دادرے بناتے تھے اور اکثر نشہ میں مست ہوکر چیلیوں کے ساتھ ناچتے تھے۔ اُنہیں اب تک اس عالمگیر قحط کی خبر بھی نہ تھی۔ اُن کے وزرا بھی خود غرض تھے۔ ملک کی اصلی حالت کا اخفا اُن کے مفید مطلب تھا۔ ملک پر خواہ کیسی ہی مصیبت کیوں نہ نازل ہو، شاہی دربار کے خرچ کے لئے روپے کہیں نہ کہیں سے نکل ہی آتے تھے۔ رعایا کی یہ مجال کہاں تھی کہ وہ معاملات شاہی میں دخل در معقولات کر سکے۔ وہ راجہ سے مایوس ہو رہی تھی۔ جو مصیبت آپڑتی تھی اُسے برداشت کرتی تھی۔ پر راجہ کے عیش و عشرت میں مخل ہونے کی جرأت نہ کر سکتی تھی۔

مگر جب خواجہ رشید جلالی نے صاف صاف کہدیا کہ اس آفت سماوی کا علاج بجز راجہ صاحب کے اور کسی سے نہ ہوگا تب لوگ مجبوراً شاہی محل کے سامنے آکر میدان میں جمع ہو گئے اور جان پر کھیل کر باواز بلند آہ و زاری کرنی شروع کی۔ دربانوں اور سپاہیوں نے اُنہیں وہاں سے بزور ہٹانا چاہا۔ ڈرایا، ڈانٹا، مارنے کی دھمکی دی، پر اس وقت لوگ جان دینے پر آمادہ تھے کسی طرح وہاں سے نہ ٹلے۔ ان کی صدائے بیداد بلند ہوتی گئی یہاں تک کہ راجہ کے عیش میں خلل پڑ گیا۔ اہنوں نے غصے میں آکر دربان سے پوچھا۔ "یہ کون لوگ شور مچا رہے ہیں؟"

ایک دربان نے مخوف ہوکر عرض کی۔ "غریب پرور! اہل شہر کا ایک کثیر مجمع شاہی محل کے سامنے کھڑا ہے اور کسی طرح نہیں ہٹتا۔"

راجہ:- وہ لوگ کیا چاہتے ہیں؟

ایک وزیر نے جواب دیا "حضور کچھ معلوم نہیں کہ اُن کی کیا خواہش ہے - وہ کہہ رہے ہیں کہ ہم حضور کی زیارت کے مشتاق ہیں -

راجہ - آج انہیں میری زیارت کا شوق کیوں ہوا ہے؟

وزیر - حضور! میں نے انہیں بہت سمجھایا مگر وہ کہتے ہیں کہ ہم بغیر شرف باریابی حاصل کیے ہرگز واپس نہ ہوں گے" -

راجہ - "تو انہیں گولی مار کر بھگا دو - انہیں یہ معلوم ہونا چاہیئے کہ میں اُن کا راجہ ہوں، وہ میرے راجہ نہیں - وہ میرے محکوم ہیں میں اُن کا محکوم نہیں ہوں" -

وزیر - "عالی جاہ! میں سب کچھ کر کے مجبور ہو گیا - مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اگر گولی بھی چلائی گئی تو سب کے سب جان دیدیں گے مگر اپنے ارادہ سے باز نہ آئیں گے" -

راجہ نے کچھ سوچ کر کہا - "تو ضرور اُن کو کوئی تکلیف ہے - لاؤ سواری حاضر کرو" -

ایک لمحہ میں تامجان حاضر ہوا - راجہ صاحب بغیر سواری کے ایک قدم بھی نہ چل سکتے تھے - شاید اُن کے پیروں کا مقصود صرف اعضا کی تکمیل تھا - سواری پر بیٹھ کر وہ رعایا کے سامنے آموجود ہوئے - انہیں دیکھتے ہی "جے جے" کا نعرہ بلند ہوا - گو تمام رعایا راجہ کی شاکی تھی پر اُن کی اس نگاہ ترحم سے ان کے دل شاد ہو گئے - علاوہ بریں وہ صاحب غرض تھے اُس وقت ترشی بے موقع تھی - لیکن دراصل اُن کے جوش کا سبب یہ تھا کہ راجہ کو دیکھتے ہی اُن کے دلوں میں ارادت کی ایک لہر سی دوڑ گئی جس نے بے دلی اور شکوہ پروری کے خس و خاشاک کو بہا دیا -

جے جے کی آواز بند ہوئی - لوگوں نے عرض کی "مہاراج - ہم سخت مصیبت میں گرفتار ہیں - آپ ہمارے بادشاہ ہیں - اگر ہمیں آپ نہ بچائیں گے تو ہم سب دانہ پانی بغیر تڑپ تڑپ کر مر جائیں گے" -

راجہ نے متعجب ہو کر پوچھا "تم پر کون سی مصیبت ہے؟"

رعایا - "غریب پرور، سال بھر سے ایک بوند پانی نہیں برسا - تمام ملک میں کہرام مچا ہوا ہے - تالابوں میں پانی نہیں، کنوئیں سوکھ گئے، دریا کا پانی بھی جواب دے چکا

آپ ہمارے مالک ہیں۔ آپ ہی کی نظر ترحم سے اب ہماری مصیبت دور ہو گی۔"

راجہ۔ "مجھے تو آج یہ کیفیت معلوم ہوئی۔ کیا دراصل پانی نہیں برسا؟"

رعایا۔ "غریب پرور آپ خود چل کر ہماری حالت ملاحظہ فرمالیں۔ دانہ پانی بغیر ہماری حالت بہت نازک ہو رہی ہے۔"

راجہ۔ "کیا تم لوگوں نے دیوتاؤں کی پرستش نہیں کی اور جگ نہیں کیے؟"

رعایا۔ "حضور ہم سب کچھ کر کے تھک گئے۔"

راجہ۔ "تو مہاتماؤں اور فقرا کے آستانوں پر جبہہ سائی کی ہوتی۔ مہاتما در لیچھ داس کو گھیرا ہوتا۔ خواجہ رشید صاحب جلالی سے کیوں نہیں کہا۔ وہ خدا رسیدہ بزرگ ہیں چاہیں تو ابھی چشم زدن میں جل تھل ایک کر دیں۔"

رعایا۔ "حضور! ان برگزیدگان خدا نے بڑی کوشش کی ہزاروں با خداؤں کو لے کر آہ وزاری میں مصروف ہوئے پر کسی سے کچھ نہ ہو سکا۔"

راجہ۔ "سچ؟"

رعایا۔ "حضور! بالکل سچ۔"

راجہ۔ "میں نے تو اُن کے معجزات کی عجیب عجیب داستانیں سنی ہیں۔"

رعایا۔ "غریب پرور ان لوگوں نے تو یہی کہہ کر ٹال دیا کہ تم لوگ اپنے راجہ کی پناہ میں جاؤ۔ وہی تمہاری اس مصیبت کو رفع کریں گے۔ یہ عتاب الٰہی بغیر راجہ کی آہ وزاری کے دور نہ ہوگا۔"

راجہ نے ہنس کر کہا۔ "جب ایسے ایسے اہل کمال کچھ نہ کر سکے تو میری کیا ہستی ہے۔"

رعایا۔ "حضور! آپ اس ملک کے مالک ہیں۔ بادشاہ ہیں۔ آپ ہماری عرضداشت کو اگر دربار ایزدی تک پہونچا دیں تو ہمیں یقین ہے کہ ہماری تکلیف دور ہو جائے گی۔"

راجہ نے لرز کر کہا۔ "مجھے امید نہیں۔ آپ مصیبت میں گرفتار ہیں مجھے سخت رنج ہے۔ مگر جو راجہ ہوس رانیوں میں اس قدر محو ہو کر اسے اپنی رعایا کی حالت کی ذرہ

برابر بھی خبر نہ ہو، جو ہمیشہ شراب کے نشہ میں چور پڑا رہتا ہو، جو ہمیشہ خواہش نفسانی کا شکار رہا ہو، اُس کی ذات سے تمہاری کیا بھلائی ہو سکتی ہے؟ مگر میں تم لوگوں کو مایوس نہیں کرنا چاہتا ہوں۔ تمہاری مصیبت کو اپنی بے نیازی سے بڑھانا نہیں چاہتا۔ میں ایشور سے کوئی التجا کرنے کے قابل نہیں ہوں۔ مجھے ان سے التجا کرتے ہوئے شرم آتی ہے، پر نہیں، تمہارے نفع کے لئے بے حیا بن کر اُن کے سامنے جاؤں گا۔ اطمینان رکھو۔"

(۴)

دوپہر کا وقت تھا۔ آفتاب کی تیز شعاعیں تیز آتشیں بن کر زمین پر گر رہی تھیں اور زمین خوف سے لرزاں تھی۔ جھلستی ہوئی ریت سے بھاپ نکلتی تھی۔ گویا یکس زمین کی آہ کا دھواں تھا۔ اُسی وقت راجہ پرتھوی پت سنگھ محل سے برآمد ہوئے۔ اُن کے جسم پر ایک پتلی سی لنگوٹی کے علاوہ اور کوئی لباس و زیور نہ تھا۔ خوبصورت بال مُنڈے ہوئے تھے اور منھ میں کالک لگی ہوئی تھی۔ اِس سیاہی میں اُن کی سُرخ آنکھیں ایسی معلوم ہوتی تھیں گویا سیاہ بانات پر سُرخ ریشم کے پھول بنے ہوں۔ اُن کا چہرہ اُداس اور افسردہ تھا۔ آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ اس طرح وہ ننگے سر ننگے پیر، درد، مایوسی، عزت کی تصویر بنے ہوئے آکر محل کے سامنے جلتی ہوئی زمین پر کھڑے ہو گئے۔ وزیروں اور مصاحبوں نے راجہ کے روکنے کی بہتیری فکریں کیں مگر انہوں نے کوئی مضبوط عہد کیا تھا۔ اُس سے نہ ڈگے۔

اہل شہر نے جب یہ کیفیت سُنی تو دوڑے ہوئے اس مقام پر جمع ہو گئے۔ ایسا کوئی دل نہ تھا جو راجہ کی اُس صورت درد و یاس سے تڑپ نہ گیا ہو۔ اُنھوں نے نہایت عاجزی سے کہا۔ "خداوندا آپ اس سیاہی کو دھو ڈالیے، اس سے ہمارے دلوں پر چوٹ لگتی ہے۔" راجہ نے نہایت استقلال سے جواب دیا۔ "بھائیو! یہ سیاہی اب ایشور کے باران رحمت سے دُھلے گی۔ یوں نہیں۔"

ایک گھنٹہ گذر گیا۔ راجہ کا چہرہ سیاہ توے کی طرح تپ رہا تھا۔ آنکھوں سے آگ کے شعلے نکلنے لگے۔ چوٹی کا پسینہ ایڑی تک پہونچ گیا۔ پیروں کے نیچے زمین تر ہو گئی۔ دماغ گرم پانی کی طرح کھولنے لگا۔ لوگوں کو ہر لمحہ اندیشہ ہوتا تھا کہ کہیں غش کھا کر گر نہ پڑیں۔

لوگ عاجزانہ طریق سے عرض کرتے تھے "غریب پرور! آپ اپنے جسم نازک کو اس قدر تکلیف نہ دیں۔ ہمیں دانہ پانی بغیر مر جانا قبول، پر آپ کی یہ تکلیف دیکھنی قبول نہیں۔ پر راجہ کا چہرہ التجائے صادق اور استقلال کے نور سے معمور تھا۔ حواس ظاہری تو ساکن تھے مگر موئے بدن ہمہ تن زبان بن کر کہہ رہا تھا کہ "اے معبود! میری رعایا مورد آلام ہے اُسے پناہ دے۔ میں گنہگار ہوں، ناسزاوار ہوں، سیہ کار ہوں۔ مجھے آپ سے التجا کرتے ہوئے شرم آتی ہے۔ پر میری خطاؤں کی سزا مجھے ملنی چاہیئے۔ میری رعایا بے قصور ہے اُس پر رحم کریں۔ سخت سے سخت عذاب کیلئے تیرے دربار میں سر تسلیم خم کیے ہوں۔ اگر میری دعا مستجاب نہ ہوگی تو میں یہیں کھڑے کھڑے جان دے دوں گا پر رعایا کو اپنا منہ نہ دکھاؤں گا۔ میں تیرا بندہ ہوں۔ تجھ سے اپنی مصیبت کہنے میں کوئی بے عزتی نہیں لیکن جو رعایا مجھے اپنا مالک تصور کرتی ہے اُس کے سامنے میں کونسا منہ لے کر جاؤں۔"

دو گھنٹے گذر گئے آفتاب کی شعاعیں اور بھی تیز ہو گئیں۔ زمین پہلے سے کہیں زیادہ جلنے لگی۔ تمام رعایا آسمان کی طرف ٹکٹکی لگائے تاک رہی تھی مگر بادل کا کہیں نام نہ تھا۔

(۵)

تمام شہر یہ عجیب و غریب نظارہ دیکھنے کے لئے اُمڈا چلا آتا تھا۔ ہر ایک سینہ میں عقیدت و وفا کی موجیں اُٹھ رہی تھیں۔ ہزاروں آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ عورتیں بیچین ہو کر نالہ و فریاد کرتی تھیں۔ راج محل سے درد انگیز صدائیں بلند ہو کر دلوں کو اور بھی پاش پاش کرتی تھیں۔

تین بج گئے تھے مگر سورج کی تپش میں ذرہ بھر بھی کمی نہ تھی۔ راجہ پرتھوی سنگھ کی آنکھیں پھیل گئی تھیں۔ ماتھا سکڑ گیا تھا۔ جسم کو سنبھالنے اور حواس کو قابو میں رکھنے کی مستقل کوشش کے باعث لب ہائے نازک پھول کی کلیوں کی مانند ہو گئے تھے۔ معلوم ہوتا تھا کہ ان کے بدن میں خون کی حرکت نہیں ہے، جان نہیں ہے، صرف ایک مایوسانہ استقلال ہے جو اُن کو پیروں پر کھڑا کیے ہوئے ہے۔ لوگوں کو ہر وقت یہی گمان تھا کہ راجہ اب گرے اب گرے۔ کتنے ہی آدمیوں کو تو یقین تھا کہ گو راجہ کھڑے ہیں مگر یہ صرف اُن کی لاش بے جان

ہے۔ جس طیش ڈگری کو گھر میں بیٹھ کر برداشت کرنا مشکل تھا، جس دھوپ میں چیل انڈے چھوڑتی تھی اور حشرات زمین سے نکل نکل کر مر جاتے تھے۔ جس کرۂ نار میں کسی ذی روح کا ایک لمحہ ٹھہرا رہنا ناممکن تھا اس دہکتی ہوئی آگ میں راجہ جیسا نازک بدن اور ناز پروردہ شخص اتنی دیر تک کیسے ٹھہرا رہ سکتا ہے۔

یکایک جے جے کار کا نعرہ بلند ہوا۔ زمین تھرائی۔ آسمان ہلا۔ گویا کوئی زلزلۂ عظیم آگیا ہو۔ دو پہاڑوں نے ٹکر کھایا ہو۔ لاکھوں آدمی خوشی سے دیوانے ہو کر اُچھلنے کودنے لگے۔ ساری خلقت میں ہلچل سی پڑ گئی۔ بیشمار انگلیاں پورب کی جانب اُٹھ گئیں۔ ایک چھوٹا سا بادل کا ٹکڑا افق پر اس طرح نظر آرہا تھا جیسے فضائے تاریک میں کوئی چراغ ٹمٹما رہا ہے۔ قلعہ سے توپیں چھوٹنے لگیں۔ عورتوں نے منگل گانا شروع کیا۔ دروازۂ شاہی پر غربا و مساکین کو راجہ کی طرف سے خیرات دی جانے لگی۔ مگر رعایا اس وقت ایک سکون کی حالت میں تھی۔ مسرت و شادمانی کی پہلی لہر نے انہیں بے خبر بنا دیا تھا۔ اب وہ اپنے جذبات کو روکے ہوئے امید و بیم کی نگاہ سے بادل کے ٹکڑے کو دیکھنے لگے۔ دیکھتے ہی دیکھتے اُس ٹکڑے نے پھیلنا شروع کیا اور بارود کے دھوئیں کی طرح آن واحد میں تمام آسمان پر چھا گیا۔ بجلی چمکنے لگی۔ ہوائیں چلنے لگیں۔ گرجنے کی کرخت آواز سنائی دی مگر یہ کرخت آواز لوگوں کو بہشتی نغمہ سے بھی کہیں زیادہ پیاری معلوم ہوئی۔ اِس آواز کے سننے کے لئے آدمی بہت دنوں سے بے چین تھے۔ آفتاب نہایت تیزی سے مغرب کی جانب بھاگ رہا تھا۔ گویا وہ بادل کی اِس فوج سے خائف ہو کر اپنی جان چھپانا چاہتا تھا۔ مگر اس کا بھاگنا بے کار ہو گیا۔ چشم زدن میں وہ بادلوں کے دل میں چھپ گیا۔ دنیا میں اندھیرا چھا گیا۔ یہ اندھیرا مخلوق خدا کی امیدوں کا آفتاب تھا۔

بادل پھر گرجنے لگا اور بوندیں پڑنی شروع ہوگئیں۔ لوگ اعتقاد اور محبت کے ساتھ راجہ کی طرف دوڑے اور اُنکے قدموں پر گر پڑے۔ راجہ ابھی تک ہمہ تن تصویر بنے کھڑے تھے۔ اُنکے منہ کی سیاہی دھل دھل کر چھوٹتی جاتی تھی اور اُنکا روشن چہرہ اس تاریکی میں بادل کے چاند کی مانند روشن ہوتا جاتا تھا۔ اُنکے چہرے پر ایک روحانی جلال جلوہ افروز تھا اور آنکھوں سے نورانی شعاعیں نکل رہی تھیں۔ انہوں نے عہد کیا تھا کہ منہ کی یہ سیاہی باران رحمت ہی سے دھلے گی اور ویسا ہی ہوا کیونکہ استقلال تھا، روحانی طاقت تھی اور ایشور کی دستگیری کا یقین تھا۔ ملک کو اس سے پہلے کبھی اتنی خوشی اتنا اطمینان اور اتنی فراغت نصیب نہ ہوئی تھی۔

پریم چند

آبِ حیات

ڈاکٹر گھوش ایک عجیب و غریب آدمی تھے۔ ایک بار انہوں نے اپنے چار معزز دوستوں کو اپنی تجربہ گاہ میں ملنے کے لیے بلایا۔ ان میں سے تین اصحاب اتنے کبرسن تھے کہ اُن کی داڑھیاں بھی سفید ہو گئی تھیں۔ اُن کے نام تھے بابو دیارام، ٹھاکر دکرم سنگھ اور لالہ کروڑی مل۔ چوتھی ایک بیوہ تھیں۔ جن کا نام مسماۃ چنچل کنور تھا۔ بڑھاپے نے ان کے جسم پر جھریاں ڈال دی تھیں۔ یہ چاروں اشخاص بہت ملول و مخزون رہا کرتے تھے۔ ان کی زندگیاں تلخ ہو گئی تھیں اور سب سے بڑا ستم یہی تھا کہ وہ ابھی تک بقیدِ حیات تھے۔

لالہ کروڑی مل شباب میں ایک متمول تاجر تھے۔ مگر انہوں نے اپنی ساری دولت سٹوں میں اُڑا دی تھی اور اب صرف مہذب گداگری پر گزران کرتے تھے۔ ٹھاکر دکرم سنگھ عیش و طرب کے بندے تھے۔ انہوں نے اپنی دولت ہی نہیں اپنی صحت بھی ہوس رانیوں پر قربان کر دی تھی۔ اور اب ان کا جسم متعدد امراض کا مامن بنا ہوا تھا۔ وہ بہت پریشان اور افسردہ رہا کرتے تھے۔ بابو دیارام کسی زمانہ میں وکیل تھے اور قومی تحریکوں میں بھی کچھ حصّہ لیا تھا مگر کسی نہ کسی وجہ سے وہ بدنام ہو گئے تھے اور اب کوئی اُن کے قریب نہ پھٹکتا تھا۔ گوشۂ ناکامی میں پڑے دن کاٹ رہے تھے۔ رہیں مسماۃ چنچل کنور، کسی زمانہ میں اُن کے حسن کا شہرہ تھا، بہت عرصہ سے وہ متبرک مقامات کی زیارت کرنے میں مصروف تھیں اشرفانے شہر یہاں تک کہ اُن کے عزیز رشتہ دار بھی اُن سے محترز رہتے تھے۔ کروڑی مل، دیارام، دکرم سنگھ تینوں حضرات کسی زمانے میں ان مسماۃ کے عشاق میں تھے۔ یہاں تک کہ ایک بار باہمی رقابت کے باعث ان میں خون خرابہ کی نوبت بھی آ چکی تھی مگر اب وہ پچھلی باتیں خواب و خیال ہو گئی تھیں۔ اُن کی یاد بھی دل فگار ہو گئی تھی۔

ڈاکٹر گھوش نے ان آدمیوں کو بیٹھنے کا اشارہ کر کے بولے۔ دوستو! آپ کو معلوم ہے کہ میں اپنا وقت چھوٹے موٹے تجربات کرنے میں صرف کیا کرتا ہوں۔ آج

مجھے ایک تجربہ میں آپ کی مدد کی ضرورت ہے۔ اگر روایتوں پر اعتبار کیا جائے تو ڈاکٹر گھوش کی لیبوریٹری ایک عجوبہ چیز تھی۔ کمرہ تاریک، پرانی وضع کا تھا، مکڑیوں کے جالے کھڑکیوں پر پردہ کا کام دے رہے تھے۔ اور فرش پر برسوں کی گرد جمی ہوئی تھی۔ دیواروں سے ملی ہوئی کئی ساکھو کی الماریاں تھیں، ان میں مجلد کتابیں چنی ہوئی تھیں۔ بیچ کی الماری میں "بھیرو" کی ایک مورت رکھی ہوئی تھی۔ کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ مشکلات میں ڈاکٹر صاحب اسی مورت سے مشورہ کیا کرتے تھے۔ کمرے کے سب سے اندھیرے گوشے میں ایک پتلی اونچی الماری تھی، اُس میں سے ایک انسان کا استخوانی ڈھانچا کچھ کچھ نظر آتا تھا۔ اُسی کے قریب دو الماریوں کے بیچ میں ایک دُھندلا سا آئینہ رکھا ہوا تھا جس کا سنہری چوکھٹا میلا ہو رہا تھا۔ کہا جاتا تھا کہ ڈاکٹر صاحب کے دست شفا سے مرے ہوئے مریضوں کی روحیں اسی آئینہ میں رہتی تھیں اور جب کبھی وہ آئینہ کی طرف دیکھتے تھے تو وہ سب کی سب اُن کی طرف گھورنے لگتی تھیں۔ کمرے کے دوسری طرف ایک حسینہ کی قدِ آدم تصویر تھی مگر مرورِ ایام سے چہرے اور کپڑے کا رنگ اُڑ گیا تھا۔ پچاس برس کا عرصہ ہوا ڈاکٹر صاحب نے اسی حسینہ سے شادی کرنے کی تجویز کی تھی مگر شادی کے چند روز قبل وہ بیمار پڑی اور اپنے طالب ڈاکٹر کی دوا کھا کر اس دنیا سے چل بسی تھی۔ تجربہ گاہ کی سب سے عجیب چیز کا ذکر کرنا ابھی باقی ہے۔ یہ ایک سیاہ جلد کی ضخیم کتاب تھی۔ اس کتاب کا نام کسی کو نہ معلوم تھا۔ لیکن لوگ جانتے تھے کہ یہ جادو کی کتاب ہے۔ ایک بار خادم نے گرد جھاڑنے کے لئے اس کتاب کو اُٹھایا تھا۔ کتاب کو اُٹھاتے ہی الماری میں رکھا ہوا استخوانی ڈھانچا کانپ اُٹھا۔ حسینہ کی تصویر ایک قدم آگے بڑھ گئی اور بہت سا خوفناک صورتیں آئینہ میں جھانکنے لگیں۔ اتنا ہی نہیں۔ بھیرو کی مورت کے تیور بدل گئے اور اس کے منہ سے "بس کرو، بس کرو" کی آواز نکلنے لگی تھی۔

ڈاکٹر گھوش کی زبان سے تجربہ کا ذکر سن کر اُن کے چاروں دوستوں نے سمجھ لیا تو یہی ہوا ہے خالی شیشہ کی نلی میں کسی چوہے کی موت کا تماشہ دکھایا جائے گا یا خوردبین سے مکڑی کے جالے کا ملاحظہ کرنا ہوگا یا اسی قسم کی اور کوئی دور از کار بے تکی بات ہوگی۔

کیونکہ ایسے ہی تجربات کے مشاہدے کے لیے ڈاکٹر صاحب پہلے بھی بیسیوں بار اپنے دوستوں کو دق کر چکے تھے۔ اُنہیں اس مجوزہ تجربہ سے کچھ زیادہ شوق نہ پیدا ہوا۔ مگر ڈاکٹر صاحب اُن کے انتظار کیے بغیر اُٹھ کھڑے ہوئے اور لنگڑاتے ہوئے کمرے کے دوسرے گوشہ سے وہی ضخیم کتاب اُٹھا لائے جو عرف عام میں جادو کی کتاب مشہور تھی۔ انہوں نے اس کتاب کو کھولا اور اوراق میں سے ایک گلاب کا پھول نکالا جو کبھی سرخ ہوگا۔ پر اس وقت مٹیالا ہو رہا تھا۔ اسکی پنکھڑیاں ایسی خشک ہو گئی تھیں گویا چھوتے ہی چور چور ہو جائیں گی۔

ڈاکٹر صاحب ٹھنڈی سانس لے کر آہستہ سے بولے، آج پچپن سال ہوئے یہ گلاب کا پھول جو اب بالکل مرجھایا ہوا ہے اور چھونے سے چور چور ہوا جاتا ہے سرخ اور شگفتہ تھا۔ یہ اس حسینہ کا تحفہ تھا جس کی تصویر سامنے لٹک رہی ہے اور میں اسے شادی کے دن اپنے کپڑوں میں لگانا چاہتا تھا۔ ان اوراق میں یہ پھول پچپن سال تک دفن رہا۔ کیا یہ نصف صدی کا پُرانا پھول پھر ہرا ہو سکتا ہے؟ مسماۃ چنچل کنور نے بے دلی سے سر ہلا کر کہا "یہ تو ایسا ہے جیسے کوئی پوچھے کہ کسی بوڑھی عورت کا پُرشکن چہرہ پھر چکنا ہو سکتا ہے"!

ڈاکٹر گگوشس نے فرمایا "اچھا دیکھو"۔

یہ کہہ کر انہوں نے میز پر رکھے ہوئے مٹکے کا ڈھکنا اُٹھایا اور اُس مرجھائے ہوئے پھول کو پانی میں ڈال دیا جو اس میں بھرا ہوا تھا۔ پہلے کچھ دیر تک تو پھول پانی پر تیرتا رہا۔ اس پر پانی کا کچھ اثر نہ ہوا۔ لیکن ایک ہی لمحہ میں اس میں حیرت خیز تغیر نظر آنے لگا۔ چپٹی اور سوکھی ہوئی پنکھڑیاں ہلیں اور ان کا رنگ آہستہ آہستہ سرخ ہونے لگا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ پھول ایک گہری نیند سے جاگ رہا ہے۔ پتلا ڈنٹھل اور پتیاں ہری ہوگئیں اور دیکھتے دیکھتے وہ پچاس سالہ پھول بالکل تازہ و شگفتہ معلوم ہونے لگا۔ یہ ابھی اچھی طرح کھلا نہ تھا۔ بیچ کی کچھ پنکھڑیاں لپٹی ہوئی تھیں۔ ان پر شبنم کی دو بوندیں بھی چمک رہی تھیں

ڈاکٹر صاحب کے دوستوں نے لاپروائی سے کہا "تماشا تو بہت اچھا ہے لیکن بتلائیے یہ ہوا کیونکر؟" ان لوگوں نے بازی گروں کے اس سے بھی کہیں عجیب شعبدے دیکھے تھے۔

ڈاکٹر گگوشس بولے "کیا آپ لوگوں نے ظلمات کا نام کبھی نہیں سنا؟"

دیارام:۔ سنا ضرور ہے مگر وہاں کا پانی کسی کو ملا کب ؟

ڈاکٹر گھوش:۔ اس لئے نہیں ملا کہ کسی نے اس کی مناسب تلاش نہیں کی۔ اب تحقیق سے معلوم ہوا ہے کہ ظلمات میں آبِ حیات کا ایک چشمہ ہے، اس کے کنارے بڑے بڑے درخت ہیں جو کئی صدیوں کے پُرانے ہونے پر بھی آج تک ہرے بھرے ہیں، مجھے انکشافوں کا دلدادہ سمجھ کر میرے ایک دوست نے تھوڑا سا پانی میرے پاس بھیجا ہے۔ وہ اس پیالہ میں بھرا ہے۔

ٹھاکر دکرم سنگھ کو ان باتوں کا مطلق یقین نہ ہوا۔ تاہم انہوں نے پوچھا "ہاں ہو گا۔ لیکن یہ بتلائیے کہ اس پانی کا اثر انسان کے جسم پر بھی ہو سکتا ہے ؟"

ڈاکٹر گھوش:۔ یہ آپ کو ابھی ایک لحظہ میں معلوم ہوا جاتا ہے۔ آپ سب حضرات اس پانی کو بے تکلف پئیں تاکہ آپ کا شباب ایک بار پھر لوٹ آئے۔ مجھے تو جوان ہونے کی ہوس نہیں ہے کیونکہ میں بہت مصیبتیں جھیل کر اس عالم تک پہنچا ہوں۔ اگر آپ کو شوق ہو تو میں اس پانی کا تجربہ کروں۔ یہ کہہ کر ڈاکٹر گھوش نے چار شیشہ کے گلاس نکالے اور انہیں اس پانی سے بھرنے لگے۔ پانی میں کوئی جان نواز قوت ضرور تھی کیونکہ گلاسوں کے ہاتھ سے چھوٹے چھوٹے بلبلے لگاتار اُٹھنے لگے۔ وہ اوپر آ کر چمکیلی پھوار بنتے تھے اور تب پھوٹ جاتے تھے۔ اس کے سوا اس میں سے ایک دلآویز خوشبو نکل رہی تھی۔ یہ دیکھ کر لوگوں کو پانی کی تاثیر کا کچھ یقین ہونے لگا، حالانکہ انہیں یہ باور نہ ہوتا تھا کہ کوئی بوڑھا آدمی یہ پانی پی کر جوان ہو سکتا ہے۔ تاہم سب کے سب پانی پینے پر آمادہ ہو گئے۔ ڈاکٹر گھوش نے انہیں اس قدر شائق دیکھ کر اُن سے ایک لمحہ تامل کرنے کی درخواست کی اور بولے۔ میرے پیارے اور معزز دوستو! آپ لوگوں کو پوری زندگی کا تجربہ ہو چکا ہے اس لئے پانی کو نوش کرنے سے پہلے کچھ ایسے اصول زندگی مقرر کر لیجئے تاکہ شباب کی دشواریاں دوبارہ آپ کو خستہ و خوار نہ کریں اور آپ اس وادی تاریک سے بخیر و عافیت گذر جائیں۔ سوچیے کہ گرم و سرد زمانہ کے اتنے تجربہ کے بعد اگر آپ محاسن اخلاق میں نوجوانانِ دنیا کے لئے نمونہ

نہ بن سکیں تو کتنے شرم کی بات ہوگی۔

ڈاکٹر صاحب کا یہ دعنا سن کر ان لوگوں کے چہرے پر خفیف سی مسکراہٹ نمودار ہوگئی انہوں نے اس کا کچھ جواب نہ دیا۔ یہ خیال ہی مضحکہ خیز تھا کہ شباب کی غلط کاریوں اور لاابالیوں کے ایسے تلخ تجربے کے بعد یہ لوگ پھر عمداً ان میں گرفتار ہوں گے۔

ڈاکٹر صاحب نے انداز تلطف سے کہا۔ "اب آپ لوگ اسے شوق سے پیئں۔ مجھے بے انتہا مسرت ہے کہ مجھے اپنے تجربہ کے لیے آپ جیسے لائق آدمی مل گئے۔"

نحیف ہاتھوں سے ان چاروں آدمیوں نے گلاسوں کو اٹھا کر ہونٹوں سے لگایا۔ اگر فی الواقع ڈاکٹر صاحب کے خیال کے مطابق اس پانی میں جان بخش اثر تھا تو ان آدمیوں سے زیادہ دنیا میں شاید ہی کسی کو اس کی ضرورت ہوگی۔ ان کے بشروں سے ایسا گمان ہوتا تھا کہ انہوں نے شباب کی صورت ہی نہیں دیکھی اور مادر زاد بوڑھے ہے۔ گویا ہمیشہ سے ایسے ہی خستہ، مایوس اور سفید ہو رہے تھے۔ یہ لوگ ڈاکٹر صاحب کی میز کے چاروں طرف جھکے ہوئے بیٹھے تھے۔ آنے والی جوانی کی خوشی بھی ان کے چہرے پر رونق نہ پیدا کر سکتی تھی۔ ان کے جسم اور دل بالکل بے جان ہو گئے تھے۔ پانی پی کر گلاس میز پر رکھ دیے

مگر ایک لمحہ میں ان لوگوں کی حالت میں ایک خوشگوار تبدیلی نمودار ہوئی۔ ان کے چہرے روشن ہو گئے، رونق نظر آنے لگی۔ ان کے زرد اور بے رنگ رخساروں پر سرخی پیدا ہو گئی۔ انہوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ انہیں ایسا معلوم ہوا کہ فی الواقع کوئی برقی قوت ان کے جسم سے ان علامتوں کو مٹا رہی ہے جنہیں بے رحم زمانہ عرصۂ دراز سے نقش کرتا رہا ہے۔ مسماۃ چنچل کنور کو ایسا محسوس ہوا کہ مجھ پر پھر جوبن آ رہا ہے۔ اس نے ایک انداز سے چہرے پر گھونگھٹ بڑھا لیا۔

سب لوگ خوش ہو کر بولے۔ "تھوڑا سا آب حیات اور عطا کیجئے۔ ہم کچھ جوان ضرور ہو گئے ہیں، لیکن ابھی بہت کسر ہے۔ لائیے جلد ایک گلاس اور پلائیے۔"

ڈاکٹر مگوشی جو بیٹھے ہوئے اپنے تجربے کو عالمانہ دلچسپی کے انداز سے دیکھ رہے تھے بولے۔ "ذرا صبر کیجئے۔ آپ لوگوں کو بڈھے ہونے میں بہت دن لگے تھے۔ اگر جوان

ہونے میں آدھ گھنٹہ لگ جائے تو آپ کو بے صبر نہ ہونا چاہئے۔ یہ پانی حاضر ہے، آپ لوگ جتنا چاہیں پی سکتے ہیں۔"

یہ کہہ کر ڈاکٹر صاحب نے چاروں گلاس کو دوبارہ بھرا۔ خم میں اب بھی اتنا پانی باقی تھا کہ شہر کے آدھے بڈھے اپنے ناتی پوتوں کے ہم سن ہو سکتے تھے۔ ابھی گلاسوں میں بلبلے اٹھ ہی رہے تھے کہ چاروں آدمیوں نے جھپٹ کر میز پر سے گلاس اٹھا لیے اور ایک ہی جرعہ میں انہیں خالی کر دیا۔ یہ یقیناً آبِ حیات تھا۔ ابھی پانی ان لوگوں کی حلق سے اترا ہی تھا کہ ان کی صورت میں انقلاب پیدا ہونے لگا۔ ان کی آنکھوں میں شباب کا سا نور آگیا۔ سفید بال سیاہ ہونے لگے۔ ایک لمحہ اور گزرا۔ میز کے گرد چاروں بڈھوں کی جگہ تین نوجوان مرد بیٹھے تھے اور ایک حسین گلفام نازنین۔

ٹھاکر دکرم سنگھ نے چنچل کنور کی طرف مستانہ نگاہ سے دیکھ کر کہا۔ "پیاری چنچل تم پر اس وقت غضب کا نکھار ہے۔"

تو یہ صبح سے جس طرح تاریکی ہٹنے لگتی ہے اُسی طرح چنچل کنور کا چہرہ شگفتہ ہوتا جاتا تھا۔ اُسے پُرانا تجربہ تھا کہ ٹھاکر صاحب کی مدح سرائیاں ہمیشہ سچی نہیں ہوتیں۔ اسلئے وہ دوڑی ہوئی آئینہ کے سامنے گئی اور اس میں اپنی صورت دیکھنے لگی۔ اُسے اب بھی خوف تھا کہ کہیں بڑھاپے کی مکروہ صورت نہ نظر آئے۔ باقی تینوں آدمیوں کے انداز سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس پانی میں کچھ نشہ انگیز صفت ہے۔ شاید اس کا یہ ہی سبب ہو کہ بڑھاپے کا بوجھ سر سے اُتر جانے کے باعث وہ خوشی کے مارے متوالے ہو گئے تھے۔ بابو دیارام ملکی مسائل پر غور کر رہے تھے لیکن ان مسائل کا تعلق زمانۂ حال سے تھا یا ماضی یا استقبال سے اس کا پتا لگنا مشکل تھا۔ کبھی تو وہ بآواز بلند حب وطن، خدمت قوم یا حقوق انسان پر تقریر کرنے لگتے۔ کبھی کسی خفیہ معاملہ کے متعلق ایسی دبی زبان سے سرگوشی کرتے کہ انہیں اپنی ہی آواز نہ سنائی دیتی تھی اور کبھی رُک رُک کر نہایت مؤدبانہ انداز سے بولنے لگتے گویا کسی حاکم اعلیٰ کے روبرو بول رہے ہوں۔ ٹھاکر دکرم سنگھ کوئی چلتی ہوئی چیز گنگنا رہے اور گلاس پر انگلیوں سے تال بھی دیتے جاتے تھے۔ اُن کی آنکھیں چنچل کنور کے حسین چہرے

کی طرف لگی ہوئی تھیں۔ میز کے دوسری طرف سیٹھ کردوری مل رو کڑ ا اور کھانے کی دُھن میں محو تھے کہ اگر ہمالیہ پہاڑ سے برف کے تودے کاٹ کاٹ کر لائے جائیں تو کتنا نفع ہو۔ اور چنچل کشور آئینہ کے سامنے کھڑی اپنی صورت دیکھ دیکھ کر خوشی سے مسکرا رہی تھیں۔ رہ رہ کر وہ اپنا چہرہ آئینہ کے قریب سے جا کر یہ دیکھنے کی کوشش کرتی تھیں کہ کوئی پرانا داغ تو باقی نہیں رہا۔ انہیں اپنے نکھار پر اب بھی کامل اطمینان نہ ہوا۔ انہیں یاد آتا تھا کہ میں شباب میں اس سے بھی زیادہ حسین تھی۔ آخر وہ ایک انداز سے گھونگھٹ اُٹھائے ہوئے میز کے قریب آگئی اور بولیں۔ "ڈاکٹر صاحب! براہ کرم مجھے ایک گلاس اور دیجئے۔"

ڈاکٹر گگوشس نے ہنس کر کہا "ہاں ہاں شوق سے لیجئے۔ یہ دیکھئے میں گلاس بھرے دیتا ہوں۔

آبِ حیات سے لبریز گلاس میز پر رکھے ہوئے تھے اُن سے نکلنے والی مہین پھواریں ہیروں کے ریزے کی طرح چمک رہی تھیں۔ سورج ڈوب چکا تھا اس لئے کمرے میں زیادہ اندھیرا ہو گیا تھا۔ لیکن خم میں سے چاندنی کی سی ہلکی روشنی نکل کر ڈاکٹر اور ان کے دوستوں کے چہروں پر پڑ رہی تھی۔ ڈاکٹر صاحب کے چہرے پر پڑی ہوئی جھریاں اور اس کی زردی اس روشنی میں اور بھی واضح ہو رہی تھیں۔

تیسرا گلاس پیتے ہی ان چاروں آدمیوں کی رگوں میں جوانی کی امنگیں لہریں مارنے لگیں۔ اب ان کا عنفوان شباب تھا۔ جوش مسرت ان کے دلوں میں نہ سماتا تھا۔ مایوسی اور غم ضعف اور بیکسی کا بڑھاپا اب اُنہیں ایک خواب سا معلوم ہوتا تھا جسے انہوں نے عرصہ ہوا دیکھا تھا۔ انہیں اب ہر ایک چیز میں ایک خاص رونق نظر آنے لگی۔ وہ روحانی شگفتگی جس سے وہ لوگ قبل از وقت محروم ہو چکے تھے اور جس کے بغیر دنیا کے دلفریب نظارے اُنہیں دھندلی تصویروں کی طرح نظر آتے تھے پھر اُن پر تمناؤں کا جادو کرنے لگی۔ انہیں ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ہم ایک نئی دنیا کے نئے وجود ہیں۔ سب کے سب جھک کر بولے۔ "ہم جوان ہو گئے۔ ہم جوان ہو گئے۔" فی الواقع یہ بےفکر نوجوانوں کی ایک جماعت تھی جنہیں تقاضائے سن نے شوریدہ سری پر مائل کر دیا تھا۔ ان کی

خوش فعلیوں کا سب سے عجیب پہلو یہ تھا کہ اُن لوگوں کو اس پیری اور نقاہت کا مضحکہ اُڑانے کی دلی تحریک ہو رہی تھی جس سے ابھی ابھی ان کی گو خلاصی ہوئی تھی۔ وہ اپنی پرانی وضع کے کپڑوں کو دیکھ کر خوب قہقہے مار کر ہنسنے لگے۔ ایک صاحب وجع مفاصل کے درد سے کراہتے ہوئے بوڑھے بابا کی نقل کر کے لنگڑا لنگڑا کر چلنے لگے۔ دوسرے صاحب ناک پر عینک رکھ کر جادو کی کتاب کو غور سے پڑھنے کا بہانہ کرنے لگے۔ تیسرے صاحب ایک آرام کرسی پر بیٹھ گئے اور ڈاکٹر ہگموسش کی بزرگانہ متانت کی نقل کرنے لگے۔ پھر سب کے سب بغلیں بجا بجا کر کمرے میں کودنے پھاندنے لگے۔ مسماۃ چنچل کنور ایک دلربا نہ انداز سے ڈاکٹر کے پاس آئیں۔ ان کے گلاب کے سے رخساروں پر ایک دلفریب اور شرارت آمیز تبسم تھی۔ ڈاکٹر صاحب سے بولیں۔ "پیارے ڈاکٹر! اٹھ کھڑے ہو ذرا میرے ساتھ ناچو۔" اس پر چاروں آدمیوں نے یہ سوچ کر قہقہہ مارا کہ ڈاکٹر صاحب اس حسینہ کے پہلو میں کیسے احمق معلوم ہوں گے۔

ڈاکٹر صاحب نے متانت سے کہا۔ "مجھے معاف کیجئے میں بوڑھا ہوں گٹھیے نے ناک میں دم کر رکھا ہے۔ میرے ناچنے کے دن کب کے رخصت ہو گئے۔ لیکن ان تینوں نوجوانوں میں سے کوئی بھی تمہارے ساتھ ناچنے کے لیئے جان دے دیگا۔"

ٹھاکر دکرم سنگھ نے فرمایا۔ "چنچل میرے ساتھ ناچو۔"

بابو رام دیال بولے۔ "نہیں وہ میرے ساتھ ناچیں گی۔"

لالہ کروڑی مل نے کہا۔ "واہ میں ان کا پرانا رفیق ہوں۔ پچاس سال ہوئے انہوں نے میرے ساتھ ناچنے کا وعدہ کیا تھا۔"

یہ کہتے کہتے تینوں آدمی چنچل کنور کے گرد کھڑے ہو گئے ایک نے بیتاب ہو کر اس کے دونوں ہاتھ پکڑ لئے۔ دوسرے نے اُس کی کمر میں ہاتھ ڈالدیا اور تیسرے صاحب نے اس کے عنبریں زلفوں کا بوسہ لینا شروع کیا۔ چنچل کنور لجاتی تھی۔ تیوریاں بدلتی تھی۔ ہنستی تھی۔ تھرتھراتی تھی۔ اس کی گرم گرم سانس باری باری سے ان تینوں آدمیوں کے منھ پر وہ کام کر رہی تھی جو ہوائے سرد نشہ پر کرتی ہے۔ اُن کے بیچ سے نکلنے کے لیے

زور کر رہی تھی لیکن کچھ بس نہ چلتا تھا۔ ایک جادو طراز معشوقہ کی ہمدوشی کے لئے ایسی سرگرم رقیبانہ کشمکش کا نظارہ کسی نے کم دیکھا ہو گا۔ مگر کمرہ میں رکھے ہوئے قد آدم شیشہ میں کچھ اور ہی ماجرا نظر آتا تھا۔ وہاں تین کہن سال اور خستہ حال بوڑھے ایک خمیدہ کمر، مردہ اور جھری دار بڑھیا سے ہم آغوش ہونے کے لئے دست بگریباں تھے لیکن وہ جوان تھے۔ اُن کی مستی اس کا ثبوت تھی۔ چنچل کنور کی عشوہ گری اور پرہیز سے بیخود ہو کر تینوں رقیبوں نے باہم خشمگیں نظریں ڈالنی شروع کیں۔ عین معشوقہ سے چمٹے ہوئے وہ ایک دوسرے پر پل پڑے۔ ہاتھا پائی اور دھول دھپّا شروع ہوا۔ اسی جھمیلے میں میز کو ٹھوکر لگی اور وہ اُلٹ گئی۔ شیشہ کا خم گر کر چور چور ہو گیا اور وہ آب زندگی ایک درخشاں دھار کی صورت میں بہہ نکلا۔ ایک نیم جاں تتلی زمین پر پڑی سسک رہی تھی۔ اس کے پر اس دھارے تر ہو گئے۔ وہ پھر سے اُڑ کر ڈاکٹر گھوش کی ٹوپی پر جا بیٹھی۔

ڈاکٹر گھوش بولے۔ "بس بس یارو بس چنچل کنور بس۔ اب بہت ہوا مجھے یہ ہنگامہ قطعی پسند نہیں۔" وہ سب کے سب خاموش ہو گئے۔ اُنہیں لرزہ سا آ گیا۔ انہیں ایسا معلوم ہوا کہ پیر فرتوت زمانہ ہمیں شباب کے اس سبزہ زار سے پھر پیری کی تاریک وادی کی طرف کھینچے لیے جاتا ہے۔ انہوں نے ڈاکٹر گھوش کی طرف دیکھا۔ وہ اس پنجاہ سالہ پھول کو لئے حسب سابق بیٹھے ہوئے تھے جسے انہوں نے خم کے ٹکڑوں میں سے نکال لیا تھا۔ اس کے ہاتھوں کا اشارہ پاتے ہی چاروں بادۂ مستی کے متوالے اپنی اپنی جگہوں پر آ بیٹھے۔ حالانکہ وہ جوان تھے پر اس کشمکش اور خر مستی نے انہیں بیدم کر دیا تھا۔

ڈاکٹر گھوش نے پھول کو شفق کی روشنی میں دیکھ کر کہا۔ افسوس یہ پھول پھر مرجھایا جاتا ہے۔

یہ بالکل صحیح تھا۔ ان لوگوں کے دیکھتے دیکھتے پھول ایسا خشک اور مرجھا ہو گیا جیسا خم میں ڈالتے وقت تھا۔ ڈاکٹر نے اس کی پنکھڑیوں پر لگی ہوئی پانی کی بوندیں

کو ہٹا کر گرا دیا۔ اور آئینے اپنے سوکھے ہوئے ہونٹوں سے لگا کر بولے۔" میرے لیے یہ اب بھی تازہ اور شگفتہ ہے۔ ڈاکٹر صاحب کے منہ سے یہ الفاظ نکل رہے تھے کہ تتلی پھڑپھڑائی اور ان کے سر پر سے زمین پر گر پڑی۔

ڈاکٹر صاحب کے دوستوں کے جسم میں پھر رعشہ ہوا۔ ایک عجیب قسم کی برودت معلوم نہیں اُن کے جسم یا دل پر دوڑتی چلی جاتی تھی۔ وہ ایک دوسرے کی طرف تاک رہے تھے۔ انہیں ایسا خیال ہوتا تھا کہ ہر ایک لمحہ اُن کے گھمائے شباب کو توڑ کر اس کی جگہ ایک ایک داغ چھوڑتا چلا جاتا تھا۔ کیا یہ بالکل مغالطہ نظری تھا؟ کیا مدت العمر کی تبدیلیاں اتنے مختصر لمحوں میں سمیٹ دی گئی تھیں؟ اور وہ سب اب چار کہن سال بڈھے تھے جو اپنے پرانے دوست ڈاکٹر گوش کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے؟

ان لوگوں نے مایوسانہ لہجہ میں کہا۔ کیا ہم پھر اتنی جلدی بڈھے ہو گئے؟

ہاں ان کا شباب رخصت ہو چکا تھا۔ اس آبِ حیات میں شراب کے نشہ سے بھی سریع تاثیر تھی۔ اس سے پیدا ہونے والی شوریدگی صرف تبخیر ہو چکی تھی۔ بڑھاپے نے پھر ان پر اپنا سیاہ لبادہ ڈال دیا تھا۔ چنچل کمور نے ایک عالم بے بسی میں اپنا چہرہ مسطر صفت انگلیوں سے ڈھک لیا۔ اس کے دل میں بے اختیار خواہش پیدا ہوئی کہ جب حُسن ہی نہ رہا تو کیوں نہ اُس پر کفن کا پردہ پڑ جائے۔ نسائیت کا یہی ایک حُسن اس میں باقی رہ گیا تھا۔

ایک لمحہ کی خموشی کے بعد ڈاکٹر گوش نے فرمایا" دوستو! افسوس ہے کہ آپ پھر بوڑھے ہو گئے۔ دیکھئے آبِ حیات سے زمین تر ہو گئی۔ لیکن مجھے اس کا مطلق غم نہیں ہے۔ کیونکہ اگر چشمۂ حیات میرے دروازے ہی پر لہریں مارے تو بھی میں اس سے اپنے ہونٹ نہ تر کروں۔ چاہے لمحوں کے بدلے اس کا نشہ برسوں تک کیوں نہ قائم رہے۔ آپ لوگوں سے آج مجھے بھی عبرت حاصل ہوئی ہے۔" لیکن ڈاکٹر صاحب کے احباب کو یہ عبرت نہ ہوئی۔ انہوں نے چشمۂ حیات کے سفر کا مصمم ارادہ کیا۔ جہاں وہ صبح، دوپہر، شام حسب خواہش آبِ حیات نوش کریں اور سدا بہار جوانی کا لطف اٹھائیں۔

••

پریم چند

بعد از مرگ

بابو ایشور چندر میں طفلانہ خود نمائی کی عادت نے آگے چل کر نامہ نگاری کی صورت اختیار کی۔ زمانہ تحصیل ہی میں اخباروں میں مضامین لکھنے لگے۔ ہمیشہ نئے مضامین کی تلاش اور فکر میں مصروف رہتے تھے۔ رسالوں میں اپنا نام دیکھ کر انہیں اس سے کہیں زیادہ خوشی ہوتی تھی جو امتحانی اعزاز، وظیفہ، یا تحسین سے ممکن تھی۔ وہ کالج کے زمرۂ احرار کے سرغنہ تھے۔ اخباروں میں امتحانی پرچوں کی سختی یا پروفیسروں کی بے اعتنائی کی شکایت کا بار انہیں کے سر تھا۔ اس سے انہیں کالج میں خاص وقار حاصل ہو گیا تھا۔ احتجاج کے ہر ایک موقعہ پر نیابت کا قرعہ ان کے نام پڑ جاتا تھا۔ انہیں یقین ہو گیا تھا کہ میں اس محدود دائرے سے نکل کر زیادہ وسیع دنیا میں اس سے کہیں زیادہ کامیاب ہو سکتا ہوں۔ پبلک لائف کو وہ اپنی تقدیر سمجھ بیٹھے تھے۔ کچھ ایسا اتفاق ہوا کہ ابھی ایم۔ اے۔ کے نتیجے گزٹ میں نکلے بھی نہ تھے کہ "خزانہ" کے ایڈیٹر نے "بان پرست" اختیار کرنے کی ٹھانی اور رسالہ کے انصرام کے لیے ایشور چندر کا انتخاب کیا۔ بابو صاحب کو یہ خط ملا تو اچھل پڑے۔ زہے نصیب! میں اس اعزاز کے قابل سمجھا گیا۔ اس میں شک نہیں کہ وہ اس بار کی ذمہ داریوں سے بخوبی واقف تھے۔ مگر شوق پرواز نے انہیں مخالف ہواؤں کا مقابلہ کرنے پر آمادہ کر دیا۔ ان کے دل میں اخبار نویسی کے کتنے ہی نئے نئے حوصلے تھے۔ وہ اس پیشے کو زیادہ آزاد، زیادہ باخبر، زیادہ ذمہ دار بنانے کے مدعی تھے۔ ہندوستانی جرنلزم کو مغربی معیار پر پہونچانا چاہتے تھے۔ ان ارادوں کے پورے کرنے کا موقع ہاتھ آیا۔ عاشقانہ امنگ کے ساتھ دریا میں کود پڑے۔

(۲)

ایشور چندر کی بیوی مانکی ایک معزز و متمول خاندان کی لڑکی تھی اور ایسے

خاندانوں کی رعونت اور نمائش پسندی سے بہرہ وافی رکھتی تھی۔ یہ ماجرا سُن کر ڈری کہ کہیں یہ حضرت اس خلجان میں پڑ کر قانون کے مطالعہ سے منھ نہ موڑ لیں۔ لیکن جب بابو صاحب نے یقین دلا دیا کہ اس مشغلہ سے میرے قانونی مطالعہ میں کوئی ہرج نہ ہوگا تو وہ خاموش ہو گئی۔

مگر ایشور چندر کو بہت جلد معلوم ہو گیا کہ اخبار نویسی نہایت حاسد پیشہ ہے جو دل و دماغ کی ساری قوتوں پر حاوی ہو جاتا ہے۔ انہوں نے اسے ایک مشغلہ تفریح اور ذریعہ شہرت خیال کیا تھا، اُسے ملکی خدمت کا ایک وسیلہ سمجھا تھا۔ اُسے ذریعہ معاش بنانے کا مطلق خیال نہ تھا۔ لیکن کشتی میں بیٹھ کر تجربہ ہوا کہ سفر اتنا خوش گوار نہیں ہے جتنا خیال کیا تھا۔ مضامین کی تصحیح و ترتیب، مضمون نگاروں سے خط و کتابت، نئے مضامین کی جستجو، معاصر رسالوں سے سبقت لے جانے کی فکر میں انہیں قانون کے مطالعہ کی فرصت ہی نہ ملتی تھی۔ صبح کو کتاب کھول کر بیٹھتے کہ سَو صفحے پڑھ کر تب اٹھوں گا لیکن جونہی ڈاک کا پُلندہ آجاتا ایک بے صبرانہ اشتیاق کے ساتھ اُس کے دیکھنے میں محو ہو جاتے۔ کتاب کھلی کی کھلی رہ جاتی تھی۔ بار بار ارادہ کرتے کہ اب باقاعدہ طور پر مطالعہ کروں گا اور ایک معین وقت کے سوا اخباری مشاغل میں زیادہ وقت نہ صرف کروں گا۔ لیکن ڈاک کا بنڈل سامنے آتے ہی طبیعت بے قابو ہو جاتی تھی۔ اخباروں کی نوک جھونک، رسالوں کے مناظرے اور تنقیدیں، شعرا کی بلند پروازیاں، مضمون نگاروں کی جدت طرازیاں ان کے دل پر سحر کا کام کرتی تھیں۔ اس پر کتابت اور طباعت کی تردّدات، توسیع اشاعت کی فکر، رسالہ کو دیدہ زیب بنانے کی تمنا اور بھی سوہانِ روح تھی۔ کبھی کبھی وہ افسوس کرتے کہ ناحق اس وبال میں پھنسا۔ یہاں تک کہ امتحان کا زمانہ سر پر آگیا اور ان کی تیاری بالکل ناممکن تھی۔ وہ شریک نہ ہوئے۔ دل کو سمجھایا کہ ابھی کام کا آغاز ہے، اس لیے یہ پریشانیاں ہیں۔ آئندہ سال یہ معاملات ایک منضبط صورت اختیار کر لیں گے اور تب میں اطمینان سے امتحان میں شریک ہوں گا، پاس کر لینا کیا مشکل ہے! ایسے ایسے گوُدکھے پاس ہو جاتے ہیں جنہیں ایک سیدھا سا مضمون لکھنے کی بھی تمیز نہیں، تو کیا میں ہی رہ جاؤں گا۔

مانکی نے برسنا تو خوب دل کے پھپھولے پھوڑے۔ میں تو جانتی تھی کہ یہ دُھن تمہیں ملیامیٹ کرے گی۔ اسی لیے بار بار روکتی تھی لیکن تم نے میری ایک نہ سنی۔ آپ تو ڈوبے ہی مجھے بھی لے ڈوبے۔ والد بزرگوار بھی برہم ہوئے۔ اعزہ نے بھی تحریک کرنی شروع کی کہ فی الحال اس کام کو ملتوی کردو۔ قانون سے فارغ ہو کر شوق سے پبلک لائف میں داخل ہو جانا۔ مگر بابو ایشور چندر ایک بار میدان میں آکر بھاگنا وضعداری کے خلاف سمجھتے تھے۔ ہاں انہوں نے عزم مصمم کیا کہ دوسرے سال امتحان کی دل و جان سے تیاری کروں گا۔

چنانچہ دوسرے سال کا آغاز ہوتے ہی انہوں نے قانون کی کتابیں بکثرت جمع کیں۔ ٹائم ٹیبل بنایا۔ روزنامچہ لکھنا شروع کیا۔ اپنے حیلہ ساز ارادہ اور سہل انگار طبیعت کو چاروں طرف سے جکڑا۔ مگر چٹ پٹی چیزوں کی عادی زبان کو سادہ غذائیں کب مرغوب ہوتی ہیں؟ قانون میں وہ اشتعال انگیز دلچسپیاں کہاں، وہ گھاتیں کہاں، وہ چوٹیں کہاں، وہ نشہ کہاں، وہ جنون کہاں۔ بابو صاحب ہمیشہ ایک کھوئی ہوئی حالت میں رہتے۔ جب تک اخباری نشہ کی تحریک تھی دن رات میں چند گھنٹوں کے لیے اُن کی رگوں میں ضرور حرارت آجاتی تھی وہ گھنٹہ آدھ گھنٹہ قانون دیکھ لیا کرتے تھے، مگر ترک نشہ نے ان پر ایک جمود کی سی حالت طاری کردی۔ اعضا مفلوج ہو گئے۔ انہیں محسوس ہونے لگا کہ اب میں قانون کے لائق نہیں رہا۔ اور یہ احساس قانون سے بے دلی کی صورت میں ظاہر ہونے لگا۔ طبیعت قناعت کی جانب مائل ہوئی۔ مشیت اور تقدیر کے فلسفہ سے تسکین ہونے لگی۔

ایک روز مانکی نے کہا۔ یہ کیا بات ہے؟ کیا پھر قانون سے طبیعت اچاٹ ہو گئی کیا؟

ایشور چندر نے دلیرانہ لہجہ میں کہا۔ ہاں بھئی میری طبیعت ادھر مائل ہی نہیں ہوتی۔

مانکی نے طنزیہ لہجہ میں کہا۔ بہت مشکل ہے۔

ایشور چندر:۔ مشکل نہیں ہے اور مشکل ہوتا بھی تو میں اس سے ڈرنے والا نہ تھا مگر مجھے وکالت کا پیشہ ہی مکروہ معلوم ہوتا ہے۔ جوں جوں وکیلوں کی حالت کا تجربہ ہوتا ہے میری طبیعت اس پیشہ سے متنفر ہوتی جاتی ہے۔ اسی شہر میں صدہا وکیل اور بیرسٹر پڑے ہوئے ہیں لیکن ایک فرد بھی ایسا نہیں جس کے سینہ میں درد ہو، جو ذاتی مفاد کا دیوانہ نہ ہو۔

خود غرضی، گندم نمائی اس پیشہ کی جان ہے۔ اس کے بغیر چارہ نہیں۔ اگر کوئی صاحب قومی مشاغل میں شریک بھی ہوتے ہیں تو جلب منفعت کے لیے، ذاتی نمود کے لیے۔ انکی ساری زندگی خود پروری کی نذر ہو جاتی ہے۔ بد قسمتی سے ہمارے ملک کے بہترین دماغ اسی درگاہ کے مجاور ہیں اور ہوتے جا رہے ہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ ہماری قومی تحریکوں کو فروغ نہیں ہوتا۔ جس کام میں ہمارا دل نہ ہو ہم محض نام و نمود اور خودنمائی کے لیے اس کے کارکن بنے ہوئے ہوں وہ کبھی سرسبز نہیں ہو سکتا۔ کتنی یک طرفہ بات ہے کہ وہی اصحاب جو مزدوروں اور دوکانداروں کو ہڑتال کرنے پر آمادہ کرتے ہیں، بازاریں بند کرواتے ہیں، خود وقت معین پر بلا ناغہ بارگاہ عدالت میں داخل ہو جاتے ہیں۔ اُن پران تحریکوں کا مطلق اثر نہیں ہوتا۔ انہیں حضرات نے قومی جرچوں کو ایسٹر اور دسمبر کی تعطیلات کے لئے مخصوص کر رکھا ہے تاکہ ان کی آمدنی میں خلل نہ واقع ہو۔ یہ ہمارے موجودہ نظام تمدن کا سیاہ ترین پہلو ہے اور اس کے لئے ہم مغربی تہذیب کے شرمندہ احسان ہیں کہ ہمارے تعلیم یافتہ طبقہ کا بیشتر حصہ خود کسب دولت نہ کر کے دوسروں کی پیدا کی ہوئی دولت پر گذران کرتا ہے شہد کی مکھی نہ بن کر چیونٹی بننا اپنا معراج زندگی سمجھتا ہے۔

ایشور چندر نے اسی لہجہ میں پیشۂ وکالت کی خوب مذمت اور فضیحت کی۔ یہاں تک کہ مانکی سُنتے سُنتے چڑھ گئی۔ دق ہو کر بولی۔ "پہلے تو تم وکیلوں کے اتنے مخالف نہ تھے۔"

ایشور چندر نے جواب دیا۔ اس وقت تجربہ نہ تھا۔ اس پیشہ نے ہپناٹائز (Hypnotise) کر رکھا تھا۔

مانکی :- کیا جانے تمہیں اخباروں میں کیا مزہ آتا ہے۔ میں تو جس اخبار والے کو دیکھتی ہوں اپنی مصیبت کا رونا روتے ہوئے پاتی ہوں۔ کوئی خریداروں سے نئے خریدار پیدا کرنے کی التجا کرتا ہے۔ کوئی نادہندوں کی شکایت کرتا ہے۔ کوئی کاغذ کی گرانی کا بکھڑا لگاتا ہے۔ کوئی اپنے خساروں کا مرثیہ سناتا ہے۔

بتلادو کہ کوئی اعلیٰ درجہ کا تعلیم یافتہ آدمی کبھی اس پیشہ میں آیا ہے؟ جسے کچھ نہیں سوجھتی، جس کے پاس نہ کوئی سند ہے نہ ڈگری ہے وہی اخبار نکال بیٹھتا ہے اور بھوکوں مرنے کے مقابلے میں روکھی روٹیوں ہی پر خوش ہوتا ہے۔ ولایت لوگ جاتے ہیں۔ کوئی بیرسٹری پڑھتا ہے، کوئی ڈاکٹری، کوئی انجنیری، کوئی سول سروس۔ لیکن آج تک نہ سنا کہ کوئی ایڈیٹری کا کام سیکھنے بھی گیا ہو۔ کوئی کیوں سیکھے؟ کسی کو کیا غرض پڑی ہے کہ زندگی کے حوصلوں کو خاک میں ملا کر فقر و افلاس میں بسر کرے ہاں جنہیں سودا ہو گیا ہو ان کی بات نرالی ہے۔

ایشور چندر:۔ زندگی صرف دولت کمانے کے لیے نہیں ہے۔

مانکی :۔ ابھی تم اسی بنا پر تو وکیلوں کی برائی کر رہے تھے کہ یہ لوگ دوسروں کی کمائی کھا کر موٹے ہوتے ہیں۔ اخبار والے بھی تو دوسروں ہی کی کمائی کھاتے ہیں۔

ایشور چندر:۔ بغلیں جھانکتے ہوئے کہا۔ اخبار والے دوسروں کی کمائی کھاتے ہیں تو دوسروں پر نثار بھی ہوتے ہیں۔ قوم پر جان بھی دیتے ہیں۔ وکیلوں کی طرح افترا اور دروغ بازی نہیں کرتے۔

مانکی :۔ یہ تمہاری ہٹ دھرمی ہے۔ وکیل بھی تو آخر اپنے موکل کیلئے سینہ سپر ہو جاتا ہے۔ وکیلوں کی کمائی بھی اتنی ہی حلال ہے جتنی اخبار والوں کی۔ فرق صرف یہ ہے کہ ایک کی کمائی میں برکت ہے دوسرے کی کمائی میں تنگی۔ ایک میٹھے لقمے کھاتا ہے دوسرا نان خشک پر گزرتا ہے۔

ایشور چندر:۔ اول تو میں یہی نہیں مانتا کہ وکیلوں کی کمائی حلال ہے۔ اور یہ مان بھی لوں تو یہ تو کسی طرح نہیں تسلیم کر سکتا کہ وکیل سب کے سب خوش حال ہیں۔ اپنی اپنی تقدیر سب جگہ ہے۔ اس ملک میں اخباروں کا ذوق عام نہیں ہے۔ اسی وجہ سے اخباروں کی گرم بازاری نہیں ہے۔ یورپ اور امریکہ میں اخبار نویس بڑے بڑے کروڑپتی ہیں۔ اس وقت دنیا کے بڑے بڑے ملکوں کے ناخدا یا تو اخباروں کے ایڈیٹر اور نامہ نگار ہیں یا رہ چکے ہیں اور ایسے کتنے ہی اور بھی ہیں جنہوں نے اپنی دولت

کی بنیاد اخباروں ہی پر کھڑی کی تھی۔

ایشور چندر کی یہ تقریر اور بھی طولانی تھی وہ ثابت کرنا چاہتے تھے کہ ہندوستان میں اخبار نویسوں کی جو خراب حالت ہے وہ تعلیم کی کمی کے باعث ہے۔ ورنہ دولت، عزت اور شہرت حاصل کرنے کا اس سے بہتر کوئی ذریعہ نہیں اور سب سے بڑی بات تو یہ کہ یہاں حق کی حمایت اور وکالت کے سچے موقعے ملتے ہیں۔ مگر مانکجی پر اس تقریر کا مطلق اثر نہ ہوا۔ چشم کوتاہ کو دور کے نظارے صاف نہیں نظر آتے۔ مانکجی کے دائرہ نگاہ میں کامیاب ایڈیٹری کی کوئی مثال نہ تھی۔

(۳)

سولہ سال گزر گئے۔ ایشور چندر نے اخباری دنیا میں شہرت پیدا کی۔ قومی مشاغل میں نمایاں حصہ لیا۔ نئی کتابیں لکھیں۔ ایک روزانہ اخبار نکالا۔ حکام کی نظروں میں بھی رسوخ حاصل کیا۔ کئی لڑکے پیدا ہوئے۔ بڑا لڑکا بی اے میں جا پہونچا۔ چھوٹے لڑکے نیچی جماعتوں میں تھے۔ ظاہری حیثیت سے اُن کی زندگی بہ آسائش بسر ہوتی تھی۔ مگر اُنکی مالی حالت قابل اطمینان نہ تھی۔ آمدنی خرچ کے لیے بمشکل کفایت کرتی تھی۔ گھر کی کئی ہزار کی جائداد ہاتھوں سے نکل گئی۔ اس پر بھی بینک کا کچھ نہ کچھ بقایا سر پر سوار ہی رہتا تھا۔ بازار میں بھی خوش معاملہ نہ سمجھے جاتے تھے۔ اب وہ اکثر اپنی اوائل عمر کی سہل انکاریوں پر افسوس کرتے تھے۔ قومی خدمت کا جوش اب ان کے سینہ میں موجزن تھا۔ لیکن جب وہ دیکھتے تھے کہ ان کا اعزاز بھی بڑے بڑے وکیلوں اور مہاجنوں کو نصیب ہوتا ہے جو دونوں ہاتھوں سے دولت بٹورنے میں منہمک ہیں تو اُن کا دل ٹوٹ جاتا تھا۔ اُن کا شمار ابھی چھٹ بھیوں میں تھا۔ اگرچہ دل میں ہر شخص معترف تھا کہ شہر کی پبلک لائف انہیں کی ذات سے قائم ہے مگر اس کا کبھی عملی اظہار نہ ہوتا تھا۔ انہیں وجوہ سے اب ایشور چندر کی طبیعت اخبار نویسی سے بھاگتی تھی۔ لیکن اس جال سے نکلنے کی کوئی صورت نظر نہ آتی تھی۔ اُن کی فکر میں اب جولانی نہ تھی۔ قلم میں زور نہ تھا۔ اُن کے رسالہ اور اخبار سے ایک بیدلی ٹپکتی تھی۔ انہوں نے سارا بار اسسٹنٹ ایڈیٹروں پر ڈال دیا تھا اور خود بہت کم کام کرتے تھے ہاں چونکہ بنیاد مضبوط

پڑ چکی تھی اِس لیے رسالوں کی اشاعت میں کوئی فرق نہ آتا تھا۔ وہ اپنے نام پر چلتے تھے۔

مگر اِس کشمکش کے دور میں افسردہ دلی کا نباہ کہاں؟ "خزانہ" کی نیم دلانہ انداز اشاعت نے کئی دوسرے رقیب کھڑے کر دیے جنکی تازہ سرگرمیوں نے "خزانہ" کو پس پشت ڈال دیا۔ اس کی کساد بازاری شروع ہو گئی۔ نئے رقیبوں کا پبلک نے جوش سے خیر مقدم کیا۔ ان کی روز افزوں ترقی ہونے لگی۔ وہی مسائل تھے جن پر "خزانہ" برسوں سے خامہ فرسائی کر رہا تھا۔ مضمون نگار بھی بیشتر وہی تھے۔ باتیں بھی وہی۔ لیکن نو آمدوں نے اُن میں ایک تازگی ایک جدت پیدا کر دی تھی اور پبلک نے قدردانی کے ہاتھ بڑھا دیے۔ اُن کی اولوالعزمیاں دیکھ کر ایشور چندر کو بھی جوش آتا تھا کہ ایک بار پھر اپنی رُکی ہوئی گاڑی میں زور لگائیں لیکن نہ اپنے میں دم تھا نہ کوئی مددگار نظر آتا تھا۔ اِدھر اُدھر مایوسانہ نگاہیں ڈال کر خاموش ہو جاتے تھے۔ میں نے اپنی ساری زندگی پبلک لائف کی تحریزی اور آبیاری میں صرف کی۔ نقصانات اُٹھائے۔ بدنام ہوا۔ زیر بار ہوا۔ اور جب فصل کاٹنے کا وقت آیا تو مجھ میں ہنسیا پکڑنے کی طاقت نہیں! دوسرے لوگ جن کا اُس زمانہ میں کہیں نشان بھی نہ تھا فصل کاٹ کاٹ کر انبار لگا رہے ہیں اور میں کھڑا منہ تاکتا ہوں۔ انہیں کامل امید تھی کہ اگر کوئی زندہ دل نوجوان میرا شریک ہو جائے تو "خزانہ" اپنے رقیبوں سے سبقت لے جائیگا۔ چونکہ ان کا رسوخ اور وقار قائم ہو گیا تھا۔ حالات اُن کے زیادہ موافق تھے۔ ضرورت محض تازہ خون کی تھی۔ انہیں اپنے بڑے لڑکے سے زیادہ موزوں آدمی اس کام کے لئے نظر نہ آتا تھا اُس لڑکے کی طبیعت بھی اِس پیشہ کی جانب مائل تھی مگر وہ اِس خیال کو ماں کی دلآزاری کے خوف سے زبان پر نہ آنے دیتے تھے۔ اسی کو دنت اور خلجان میں دو سال گذر گئے اور یہاں تک نوبت پہونچی کہ یا تو "خزانہ" کا دیوالہ نکال دیا جائے یا اُسے سکرات کے خیالات سے معمور کر دیا جائے۔ ایشور چندر نے اُس کے احیاء کے لئے ایک آخری کوشش کرنے کا مصمم ارادہ کر لیا۔ اِس کے سوا انہیں اور کوئی مفر نہ تھا۔ یہ رسالہ اُن کی زندگی کا خلاصہ اُن کی حیات کا لب لباب تھا۔ اس کی زندگی اور موت کے ساتھ ان کی قومی زندگی اور موت وابستہ تھی۔ اس کے بند کرنے کا وہ خیال بھی نہ کر سکتے تھے۔ باوجودیکہ اُن کی صحت خراب

تھی، پر تحفظِ زندگی کے فطری تقاضا نے انہیں اپنا سب کچھ، یہاں تک کہ جان بھی اپنے رسالہ پر قربان کرنے کے لیے آمادہ کر دیا۔ صبح سے آدھی رات تک سر نہ اٹھاتے۔ ایک جنون کی سی حالت طاری ہو گئی۔ "زمانہ" کے مضامین میں پھر زندہ دلی نمودار ہوئی۔ باخبر حلقوں میں پھر اُس کے چرچے ہونے لگے۔ ہمعصروں نے پھر اُس کے مضامین کو نقل کرنا شروع کیا۔ رسالوں میں پھر اس کے تبصرے ہونے لگے۔ پرانم شیری للکار پھر گونجنے لگی۔

مگر ان بڑھاوؤں کے ساتھ صحت کا انحطاط بھی روز بروز نمایاں ہونے لگا۔ ضعف قلب کی علامتیں پیدا ہو گئیں۔ کثرتِ خون سے چہرہ پر زردی چھا گئی۔ ایسی حالت میں بھی وہ صبح سے آدھی رات تک اپنے کام میں منہمک رہتے۔ ملک میں محنت اور سرمایہ کی جنگ چھڑی ہوئی تھی۔ اُن کی مظلوم شناس فطرت نے انہیں محنت کا حامی بنا دیا تھا۔ سرمایہ کے حامیوں کی تردید اور تحریف اور تعریض کرتے ہوئے اُن کے خون میں گرمی آجاتی تھی۔ الفاظ سے چنگاریاں نکلنے لگتی تھیں۔ حالانکہ وہ چنگاریاں مرکزی حرارت کو منتشر کیے دیتی تھیں۔

ایک روز رات کے دس بج گئے تھے۔ مانکی آہستہ آہستہ اُن کے کمرہ میں داخل ہوئی۔ لیمپ کی شعاعوں میں اُن کے چہرے کی زردی اور بھی نمایاں ہو رہی تھی۔ وہ ہاتھ میں قلم لیے کسی فکر میں غرق تھے۔ مانکی کے آنے کا مطلق علم نہ ہوا۔ مانکی دردآمیز نظروں سے کچھ دیر تک انہیں دیکھتی رہی اور تب بولی۔ اب تو یہ دفتر بند کرو آدھی رات ہونے کو آئی۔ کھانا پانی ہوا جاتا ہے۔

ایشور چندر نے چونک کر سر اٹھایا اور بولے۔ کیا آدھی رات ہو گئی؟ نہیں ابھی تو مشکل سے نو بجے ہوں گے۔ مجھے اس وقت بالکل بھوک نہیں ہے۔

مانکی:۔ کچھ تھوڑا سا کھا لینا۔

ایشور چندر:۔ ایک لقمہ نہیں۔ مجھے اپنا مضمون اسی وقت ختم کرنا ہے۔

مانکی:۔ میں دیکھتی ہوں تمہاری حالت دن دن خراب ہوتی جاتی ہے۔ آخر دوا کیوں نہیں کرتے۔ جان کھپا کر تھوڑے ہی کام کیا جاتا ہے۔

ایشور چندر:۔ اپنی جان کو دیکھوں یا اس کشمکش کو دیکھوں جس نے ملک میں ایک کہرام

پچھار رکھا ہے - ہزاروں لاکھوں جانوں کی حمایت میں ایک جان نہ بھی رہے تو اس کا کیا غم!

مانکی :- کوئی ہوشیار آدمی کیوں نہیں رکھ لیتے۔

ایشور چندر :- ایک ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ بہت تلاش کرتا ہوں - کوئی نہیں ملتا۔ ایک خیال میرے دل میں کچھ عرصہ سے آرہا ہے - اگر تم صبر سے سننا چاہو تو کہوں۔

مانکی :- کہو سنوں گی - ماننے کے لائق ہوگی تو مجھے کیا عذر ہو سکتا ہے۔

ایشور چندر :- میں چاہتا ہوں کہ کرشن چندر کو اپنے کام میں شریک کرلوں - امسال وہ ایم - اے - بھی ہوگیا - اس پیشہ کی طرف اس کی طبیعت بھی مائل ہے - معلوم ہوتا ہے کہ ایشور نے اسی کام کے لیے بنایا ہے۔

مانکی نے ہمدردانہ انداز سے ان کی طرف دیکھا اور بولی - کیا اپنے ساتھ اسے بھی لے ڈوبنے کا ارادہ کیا ہے - کوئی کنبہ کی خدمت کرنے والا بھی چاہئے کہ سب قوم کی خدمت ہی کریں گے۔

ایشور چندر :- کرشن چندر یہاں کسی دوسرے پیشہ سے برا نہ رہے گا۔

مانکی :- جی معاف رکھیے - باز آئی - وہ کوئی دوسرا کام کرے گا جہاں چار پیسے ملیں - یہ گھر پھونک کام آپ ہی کو مبارک رہے۔

ایشور چندر :- وکالت میں بھیجو گی مگر دیکھ لینا پچھتانا پڑے گا - کرشن چندر اس پیشہ کے لئے سراسر ناموزوں ہے۔

مانکی :- وہ چاہے مزدوری کرے پر اسے اس کام میں نہ ڈالوں گی۔

ایشور چندر :- تم نے مجھے دیکھ کر سمجھ لیا کہ اخبار نویسی میں گھاٹا ہی گھاٹا ہے - اسی ملک میں ایسے لوگ موجود ہیں جو اس پیشہ کی بدولت دولت اور شہرت سے مالامال ہو رہے ہیں۔

مانکی :- اس پیشہ میں تو اگر کنچن بھی برسے تو میں اسے نہ آنے دوں - جان دیدینگی۔

ساری عمر بیراگ میں کٹ گئی۔ اب کچھ دنیا کی نعمتوں کی لذت بھی اٹھانا چاہتی ہوں۔

(۴)

یہ بندۂ قوم بالآخر دردِ قوم کے ساتھ ضعفِ قلب کا متحمل نہ ہو سکا۔ اس گفتگو کے بعد مشکل سے چھ مہینے گذرے تھے کہ ایشور چندر نے دنیا کو الوداع کہا۔ ان کی ساری زندگی حق کی حمایت، راستی کی وکالت اور جور و زبردستی کی مخالفت میں بسر ہوئی تھی۔ اپنے اصولوں کی پیروی میں انہیں بارہا حکام کی تہدید برداشت کرنا پڑی، بارہا جمہور کی بدگمانیاں۔ حتیٰ کہ احباب کی حرف گیریاں موہانِ روح ہوئیں لیکن اُنھوں نے اپنے ضمیر کا کبھی خون نہ کیا۔ افلاس آزار کو ہمیشہ تمولِ جبیں سا پر ترجیح دی۔

جوں ہی اس سانحے کی خبر پھیلی سارے شہر میں کہرام مچ گیا۔ بازاروں کی دوکانیں بند ہو گئیں۔ ماتمی جلسے ہونے لگے۔ معاصر رسائل رقیبانہ تنگ خیالیوں سے آزاد ہو گئے۔ چاروں طرف سے ایک ہی صدا آ رہی تھی کہ ملک سے ایک آزاد، اصول پرور اور باریک نظر اخبار نویس اور ایک بے خوف جان نثار ہمدردِ قوم اُٹھ گیا اور اُس کی جگہ عرصہ تک خالی رہے گی۔ ایشور چندر کو اس قدر حسنِ قبول ہے اس کا کسی کو گمان نہ تھا۔ ان کا جنازہ نکلا تو سارا شہر سوگوار تھا۔ انکی یادگاریں بننے لگیں۔ کہیں تعلیمی وظائف قائم ہوئے، کہیں ان کی تصویر نصب ہوئی مگر سب سے زیادہ شاندار وہ یادگار تھی جو شہر کے طبقۂ احرار نے قائم کی۔ یہ ایک قدِ آدم سنگِ مرمر کا مجسمہ تھا۔

(۵)

مانکی کو اپنے شوہر کی ہردلعزیزی کے یہ مظاہرے دیکھ کر دلآویز عبرت ہوتی تھی۔ اسے اب افسوس ہوتا تھا کہ میں نے ان کے نورانی اوصاف کو نہ پہچانا۔ اُن کے پاکیزہ جذبات اور بلند ارادوں کی قدر نہ کی۔ سارا شہر اُن کے لئے ماتم کر رہا ہے۔ اُن کے قلم اور زبان نے ضرور ان لوگوں پر ایسے احسانات کیے ہیں جنہیں یہ بھول نہیں سکتے اور

میں آخر دم تک اُن کا خار جگر بنی رہی۔ اپنی ہوس کی ترغیب میں آ کر ان کو لاؤ زاری کرتی رہی۔ اُنہوں نے مجھے سونے میں مڑھ ہی دیا ہوتا، عالی شان محل میں کھڑا کر دیا ہوتا، کوئی جائداد ہی پیدا کر لی ہوتی تو کیا ہوتا۔ شہر میں کون اُن کے لئے آنسو بہاتا۔ کون اُن کا جس گاتا۔ یہیں ایک سے ایک متمول انسان پڑے ہوئے ہیں۔ وہ دنیا سے چلے جاتے ہیں اور کسی کو خبر بھی نہیں ہوتی۔ سنتی ہوں اُن کے نام مدرسوں میں وظیفے دئے جائیں گے۔ جو لوگ ان وظیفوں کے طفیل میں پڑھیں گے وہ مرتے دم تک ان کا احسان مانیں گے۔ اور ان کی آتما کو دعائیں دیں گے افسوس میں اُن کی نیتوں کی تہ تک نہ پہونچی۔ حرص نے میری آنکھوں پر پردہ ڈال دیا تھا۔

جوں جوں یہ خیالات مانکی کے دل میں جاگزیں ہوتے جاتے تھے اُس کے دل میں اپنے شوہر کے ساتھ عقیدت بڑھتی جاتی تھی۔ وہ مغرور عورت تھی۔ اس کا ترفع پسند دل اس نمود اور شہرت سے آسمان پر جا پہونچا تھا۔ علاوہ بریں اب اس کی مالی حالت بھی پہلے کی سی اندیشہ ناک نہ تھی۔ کرشن چندر کی کاوش اور جانفشانی نے انہیں بہت جلد وکلا میں ممتاز بنا دیا تھا۔ وہ قومی کاموں میں ضرور شریک ہوتے تھے۔ انہیں اخبار نویسی سے خاص اُنس تھا۔ اخباروں میں مضامین بھی لکھتے تھے۔ لیکن مانکی ہمیشہ انہیں ان مشاغل سے دور رکھنے کی کوشش کرتی رہتی تھی کہ مبادا وہ اپنے پیشہ سے لاپروائی کرنے لگیں۔ کرشن چندر اپنے اوپر جبر کرتے تھے ماں کا دل دکھانا انہیں منظور نہ تھا۔

ایشور چندر کی پہلی برسی تھی۔ دن کو برادری کی دعوت تھی۔ شام کو براہمنوں کا بھوج ہوا۔ آدھی رات تک غربا کو کھانا تقسیم ہوتا رہا۔ علی الصباح مانکی اپنی سیج گاڑی پر گنگا نہانے گئی۔ یہ اُس کی پُرانی تمنا تھی جواب بیٹے کی سعادتمندی کی بدولت پوری ہوئی تھی۔ وہ اُدھر سے واپس آ رہی تھی کہ اس کے کانوں میں بینڈ کی آواز آئی اور ایک دم میں ایک جلوس سامنے آتا ہوا دکھائی دیا۔ پہلے کوتل گھوڑوں کی قطار تھی۔ بعد ازاں سوار والنٹیروں کی فوج جو مقامی سیوا کمیٹی اور بائے اسکاوٹ کے ممبروں سے چن کر بنائی گئی تھی۔ اس کے پیچھے متعدد سواری گاڑیاں تھیں۔ عقب میں ایک سجے ہوئے رتھ پر کسی دیوتا کی مورت تھی۔ اس رتھ کو بھی والنٹیر ہی کھینچتے تھے مانکی سوچنے لگی یہ کس دیوتا کا رتھ ہے۔ نہ تو رام لیلا کے دن ہیں، نہ رتھ جاترا کے۔ نہ تہا

اس کا دل زور سے اُچھل پڑا۔ اُسے معلوم ہوا کہ رتھ پر ایشور چندر بیٹھے ہوئے ہیں۔ وہی لباس تھا، وہی صورت، وہی خط و خال وہی انداز، اس نے حیرت کی نگاہ سے مورت کو دیکھا۔ اُسکا دل بانسوں اُچھل رہا تھا۔ رتھ اور قریب آ گیا مشابہت کا جادو کھل گیا یہ ایشور چندر کی مورت تھی جو طبقۂ احرار نے اُن کی یادگار میں بنوائی تھی اور جسے میدان میں نصب کرنے کے لئے لوگ لیے جا رہے تھے۔ مانکی کے دل پر عقیدت کا ایک نشہ چھا گیا۔ جگر میں ایک لہر سی اٹھی کہ پردے سے نکل کر اس جلوس کے روبرو اپنے شوہر کے قدموں پر نثار ہو جاؤں۔ پتھر کی مورت قالب انسانی سے زیادہ ارادت انگیز ہوتی ہے۔ مگر کون منھ لیکر مورت کے سامنے جاؤں؟ اس کے ضمیر نے کبھی اُس کی ایسی ملامت نہ کی تھی۔ کاش میری سفلہ طبعی زنجیر پا نہ ہوتی تو (دُکّا) نہ جانے کس معراج پر پہونچتے۔ میں زندگی بھر اُن کے پہلو کا کانٹا بنی رہی۔ میرے باعث انہیں کتنی روحانی کلفت ہوئی! گھر والوں کی ہمدردی غیروں کی قدرشناسی سے کہیں زیادہ حوصلہ انگیز ہوتی ہے۔ میں انہیں کیا کچھ نہ بنا سکتی تھی۔ پر میں نے کبھی انہیں اُبھرنے نہ دیا۔ سوامی جی! مجھے معاف کردیں تمہاری خطاوار ہوں۔ میں نے تمہارے پاک ارادوں کا، تمہاری اولوالعزمیوں کا خون کیا ہے، میں نے تمہاری خاطر شکنی کی ہے۔ میں نے عقاب کو پنجرے میں بند رکھا اور کبھی اس کی تمنائے پرواز کو پورا نہ ہونے دیا۔ افسوس!

سارے دن مانکی کو یہی افسوسناک خیالات ستاتے رہے۔ شام کو اُس سے نہ رہا گیا وہ اپنی کہاری کو لے کر پیادہ پا اس دیوتا کے درشن کو چلی جس کی آرزوؤں کا اُس نے خون کیا تھا۔

شام کا وقت تھا۔ آسمان پر شفق پھولی ہوئی تھی۔ افق مغرب پر کچھ ابر بھی تھا۔ آفتاب کبھی بادلوں میں چھپ جاتا تھا۔ کبھی باہر نکل آتا تھا۔ اس دھوپ چھاؤں میں ایشور چندر کی مورت دور سے کبھی نور سحر کی طرح متبسم نظر آتی تھی، کبھی شام تاریک کی طرح پر حسرت اور متین۔ مانکی اُس کے قریب گئی لیکن اُس کے چہرے کی طرف نہ دیکھ سکی۔ ان کی آنکھوں میں شکوۂ بیداد تھا۔ مانکی کو ایسا معلوم ہوا کہ وہ میری طرف نگاہ فریاد سے دیکھ رہی ہے۔ اُسکی آنکھوں سے ندامت کے آنسو بہنے لگے۔ اس مجسمہ کے قدموں پر گر پڑی اور منھ ڈھانپ کر رونے لگی۔ دل میں جذبات اُبل پڑے۔ اپنی پستی کا ایسا رقت انگیز احساس اسے کبھی نہ ہوا تھا۔

مانکی گھر آئی تو رات کے ۹ بج گئے تھے۔ کرشن چندر گھر میں کھانا کھانے آئے ہوئے تھے۔ مانکی کو دیکھتے ہی بولے۔ اماں آج آپ اس وقت کہاں گئی تھیں؟

مانکی نے فخریہ انداز سے کہا۔ گئی تھی تمہارے بابو جی کی مورت کا درشن کرنے۔ مورت کیا ہے معلوم ہوتا ہے وہ آپ کھڑے ہیں۔

کرشن چندر:۔ جے پور سے بن کر آئی ہے۔

مانکی نے تجاہل سے کہا میں گنوار کیا جانوں۔ پر اپنی زندگی میں انہوں نے کوئی بڑا کام کیا ہوگا تب ہی تو اُن کی ایسی ایسی یادگاریں بن رہی ہیں۔

کرشن چندر:۔ اُن کی ساری عمر حق اور انصاف کی وکالت میں گذری۔ اس سے بڑا اور کون سا کام ہوگا۔

مانکی:۔ انہوں نے وکالت کہاں کی؟

کرشن چندر:۔ ہاں وہ وکالت نہیں کی جو میں اور میرے ہزاروں بھائی کر رہے ہیں، جس سے حق اور انصاف کا خون ہو رہا ہے۔ اُن کی وکالت زیادہ اونچے درجہ کی تھی۔

مانکی:۔ اگر ایسا ہے تو تم بھی وہی وکالت کیوں نہیں کرتے۔

کرشن چندر:۔ بڑا مشکل کام ہے۔ دنیا کا جنجال اپنے سر لیجیے، دوسروں کی فکر میں جان کھپائیے، دوسروں کے لیئے رویئے، کمزوروں کی حمایت میں لٹھ لیے پھریئے، حکام کے منھ آئیے۔ ان کی تندی اور گرمی برداشت کیجیے اور اس تمام سرگردانی اور جانکاہی کا صلہ کیا ہے؟ فقر اور فاقہ۔

مانکی:۔ مگر جس تو ہوتا ہے۔

کرشن چندر:۔ ہاں جس ہوتا ہے۔ غریب دعائیں دیتے ہیں۔

مانکی:۔ جب اتنا جس ملتا ہے تو تم بھی وہی کام کرو۔ ہم لوگ اُن کی اور کچھ یادگار نہیں بنا سکے تو اُس کام کو جاری ہی رکھیں جو اُنہوں نے اپنی زندگی میں اتنی پاک نیتی سے چلایا ہے اس سے اُن کی آتما کو شانتی ہوگی۔

کرشن چندر نے ماں کی طرف نگاہ احترام سے دیکھ کر کہا۔ کروں تو مگر یہ سب ٹیم ٹام نہ نبھ سکے گا۔

شاید وہی پہلے کی سی حالت ہو جائے گی۔

مانک :- کوئی مضائقہ نہیں۔ سنسار میں جس تو ہوگا۔ دوسروں کی دولت کے سامنے سر تو نہ جھکانا پڑے گا۔ آج تو اگر دھن کی دیوی بھی میرے سامنے آئیں تو میں آنکھیں نہ نیچی کروں۔ (اگست۔ بحر ۱۹۳۰ء)

پریم چند کی دو[۲] کتابوں پر تبصرہ :

(۱) پریم پچیسی حصہ دوم ، مرتبہ منشی دیانرائن صاحب نگم ' ایڈیٹر رسالہ "زمانہ" کانپور '

زمانہ پریس ' کانپور۔ قیمت ۱۲ /

منشی "پریم چند" کے نام سے اُردو رسالوں کے پڑھنے والے واقف ہیں اور اُن کی دلکش اور پُر درد کہانیوں کو قبولیت عام اور پسند خاص کی سند مل چکی ہے۔ حق یہ ہے کہ منشی پریم چند اپنے رنگ میں خوب لکھتے ہیں۔ ہندوستان کی سوشیل زندگی خصوصاً دیہات کی زندگی سے ان کو خوب واقفیت ہے اور جس طبقہ سے بھی ان کا قصہ متعلق ہوتا ہے اس کے جذبات کا وہ نہایت صحیح اظہار کرتے ہیں۔ اُن کی زبان میں سلاست اور روانی ہے اور اُن کا طرزِ ادا دلپذیر ہے۔

"تریا چرتر" کے قصہ کا پلاٹ ٹامس مور کی لالہ رُخ کی یاد دلاتا ہے۔ یہ قصے "زمانہ" میں شائع ہو چکے ہیں۔ اب اسی رسالہ کے منتظمین نے ان کو جمع کر کے کتاب کی شکل میں جمع کیا ہے۔

(مئی ۱۹۱۹ء)

(۲) روٹھی رانی مصنفہ "نواب رائے" زمانہ پریس کانپور۔ قیمت ۶ر

جیسلمیر کی راج کماری اُما کی شادی مارواڑ کے راجہ مالدیو کے ساتھ قرار پائی مگر عروسی کی شب کو راجہ کی طرف سے کچھ ایسی بے اعتنائی عمل میں آئی کہ رانی اُما روٹھ گئی اور ایسی روٹھی کہ پھر جیتے جی نہ منی۔ راجہ نے بہت کوشش کی۔ منت سماجت کی۔ لوگوں کو بیچ میں ڈالا۔ قول اقرار کیے۔ یہاں تک کہ رانی کا دل بھی کچھ پسیج گیا مگر آسا چارن کے ایک دوہے نے سارا رنگ بدل دیا۔

"مان رکھے تو پیو تج پیو رکھے تج مان
دو گی ہاتھی باندھیے ایک کھمبو ٹھان"

یعنی اگر خودداری نبھانا چاہتی ہو تو شوہر کو ترک کرو اور شوہر کی خاطر چاہتی ہو تو خودداری چھوڑ دو کیونکہ ایک ہی تھان میں دو ہاتھی نہیں باندھے جا سکتے۔

غرض کہ رانی نے اپنی ٹیک نہ چھوڑی، راجہ مالدیو کے مرنے پر جب اس کی پگڑی اُما کے پاس پہنچی تو اُس پگڑی کو دیکھتے ہی روٹھی رانی نے اُسی وقت اپنی ٹیک چھوڑ دی۔ اُسکا سارا گھمنڈ دور ہو گیا۔ رو کر کہنے لگی کہ اب کس سے روٹھوں گی جس سے روٹھی تھی وہی اب نہ رہا تو جی کے کیا کروں گی۔ اس نے میری مان رکھی تھی، اس نے میرا گھمنڈ نباہ دیا۔ اب میں کس کے لئے جیوں۔ یہ کہا اور چتا بنوا کر ستی ہو گئی۔ اسی رانی کی کہانی اس کتاب میں بیان کی گئی ہے۔ اور ہم بلاخوف تردید کہہ سکتے ہیں کہ گو زمانہ بدل گیا ہے، خیالات میں اصولوں میں طرز معاشرت میں انقلاب پیدا ہو گیا ہے تاہم:

سننے کے قابل آج بھی اُسکا فسانہ ہے

(مئی ۱۹۰۶)

●●

نوبت رائے نظرؔ

غزلیات

(۱)

گردشِ دہر بھی اک گردشِ پیمانہ ہے
ذرّے ذرّے میں ترا جلوۂ مستانہ ہے

کیا کہوں دل کی تباہی کا اثر ہے کتنا
ساری دنیا نگہِ یاس میں ویرانہ ہے

حالتِ محفلِ عشرت ہے رقم سب اِس میں
ایک دفتر سے نہیں کم پرِ پروانہ ہے

تیرے ملنے کی وہ تقریب جو مجھ یاد اب تک
جس سے کہتا ہوں وہ کہتا ہے کہ اک افسانہ ہے

پرتوِ مہر کجا، ذرّۂ ناچیز کجا
کیوں یہ دل حسرتیِ جلوۂ جانانہ ہے

ایک حالت پہ نہیں میکدۂ دہر کا رنگ
کس قدر عام تری لغزشِ مستانہ ہے

دل مئے عشق سے کتنا ہی لبالب ہو نظرؔ
جب چھلک جائے تنک ظرفیِ پیمانہ ہے

(مئی ۱۹۱۹ء)

(۲)

فسردہ خاطری کی شرح ہو سکتی ہے مشکل سے
حرارت تک نہیں اس میں دھوئیں اٹھتے نہیں دل سے

یہ ناکامی کہ آلودہ ہوئے جو خونِ بسمل سے
وہ ذرّے ہو گئے خارج زمینِ کوئے قاتل سے

نہ پوچھو اے ہمنشیں تاثیرِ سوزِ غم کہاں تک ہے
شرر نکلے ہیں پتھر سے دھوئیں اٹھتے ہیں آب و گل سے

لکھا تھا قسمتِ خرمن میں گرنا برقِ سوزاں کا
دلِ غمگیں کو خوش کرنا ہوا اب افسوس حاصل سے

کسی کی جستجو پر ہے مدارِ زندگی اپنا
کہ مجھ کو ہر نفس نزدیک تر کرتا ہے منزل سے

کہوں کیا آرزوئے قتل میں کیوں اشکباری ہے
لہو پانی ہوا محرومیِ دامانِ قاتل سے

نہایت مجھ پہ ہجومِ فکرِ دنیا ہے مگر پھر بھی
ذرا فرصت ملی اور ذکر اس کا چھڑ گیا دل سے

عبث جلتا ہوں دنیا میں نظر آتا ہے سناٹا
کہاں اس دل کو بہلاؤں نکل کر تیری محفل سے

سبب کیا پوچھتا ہے میری آہِ سرد کا ہمدم
کہ اس اجمال کی تفصیل ہو سکتی ہے مشکل سے

ٹپکتا ہے ان آنکھوں سے جو قطرہ اشکِ حسرت کا
دکھا دیتا ہے دریا کا جدا ہونا وہ ساحل سے

یقینِ سوزِ غم اب بھی نہ ہو تمکو تو مجبوری
کہ صاف اک روشنی آتی ہے باہر روزنِ دل سے

جوابِ نالۂ مجنوں، حیائے حسن کیا دیتی
دھواں سا ایک اُٹھ کر رہ گیا آخر کو محمل سے

خدا جانے یہاں تک کس خوشی سے دل کو لایا تھا
اٹھا کر لے چلا ہوں اک جنازہ تیری محفل سے

نظرؔ اشعار میں اظہارِ سوزِ دل کہاں ممکن
یہ کچھ چنگاریاں نکلی ہیں منقارِ عنادل سے

(جون ۱۹۱۹ء)

(۳)

برق و باراں کے فلک پر بھی ساماں ہوں گے
ہم جنوں میں کبھی خنداں کبھی گریاں ہوں گے

خاک میں مل کے ہوئے آج وہی لالہ و گل
جو کسی وقت ترے چاک گریباں ہوں گے

دل کے داغوں میں وہ قدرت ہے کہ ہوں مہرِ منیر
کچھ نہ ہوں گے تو چراغِ شبِ ہجراں ہوں گے

جیتے جی ہم سے کہاں ترکِ محبت ممکن
مر بھی جائیں گے، تو خاکِ درِ جاناں ہوں گے

وحشتِ دل میں ہے گر خوابِ زلیخا کا اثر
ہم بھی یوسف کی طرح داخلِ زنداں ہوں گے

تھوڑی تھوڑی یونہیں سب خاک ہماری لے جا
تیرے ممنون ہم اے گوشۂ داماں ہوں گے

بڑھ سکے کچھ تو بڑھا لے شبِ وصل اے گردوں
پھر نہ یہ رات ہی ہوگی نہ یہ ساماں ہوں گے

عکسِ آئینۂ محبت میں ہے ہستی اپنی
ہم نہ ہوں گے وہ نگاہوں سے جو پنہاں ہوں گے

جائے عبرت ہے نظرؔ سیرِ بہارِ گلشن
چار دن بعد یہی دشت و بیاباں ہوں گے

(اکتوبر ۱۹۱۹ء)

(۴)

وہ تغافل کو علاجِ غمِ پنہاں سمجھا
چارہ گر بھی نہ مرے درد کا درماں سمجھا

تابِ دیدار نہ لائی نگہِ ناز پرست
اور وہ دیدۂ عشاق پہ احساں سمجھا

جمعِ خاطر نہ ہوئی دیدِ بتاں سے اپنی
دفترِ حسن کا اجزائے پریشاں سمجھا

نہ ہوئی جلوہ گہِ ناز کی وسعت معلوم
گو میں ہر ذرہ کو اک دیدۂ حیراں سمجھا

تھی تری یاد بھی کیا انجمن آرائے خیال — دل میں جو شعلہ اٹھا شمعِ شبستاں سمجھا
واقفِ رازِ محبت ہے وہی دیوانہ — اپنی ہستی کو جو اک خوابِ پریشاں سمجھا
شورشِ عشق کا آساں نہ تھا اندازہ — چاک ہو کر مری وحشت کو گریباں سمجھا
صاحبِ دل ہے وہی مرشدِ کامل ہے وہی — میرے چہرے سے جو میرا غمِ پنہاں سمجھا
وحشتِ دل کی ہوئی حد نہ مقرر کوئی — چند دن بعد بیاباں کو بھی زنداں سمجھا

ہر نفس شاہدِ دشوارئ الفت ہے نظرؔ
سخت مشکل تھا وہی کام جسے آساں سمجھا

(نومبر ۱۹۱۹ء)

(۵)

سب کے حصے میں ترے عشق کا انعام نہیں — ایک نعمت یہی دنیا میں ہے جو عام نہیں
قابلِ گریہ ہے آغازِ محبت کی خوشی — دلِ پُر شوق کو معلوم ابھی انجام نہیں
مدعی کچھ گردشِ ایام کی لازم ہے ضرور — یہ مسلّم کہ جہاں منزلِ آرام نہیں
دلِ افسردہ کی ہستی ہے چراغِ خاموش — حسرتِ صبح نہیں، آرزوئے شام نہیں
شرحِ ناکامئ حسرت دلِ مایوس عبث — وسعتِ دہر بقدرِ غم و آلام نہیں
جان دینے کو میں ہر وقت ہوں حاضر اے مرگ — دیکھ لینا ہے کہ باقی تو کوئی کام نہیں
خونِ انگور کو کہتے ہیں شرابِ گلفام — کیا یہ بیدردیِ رنداں مئے آشام نہیں
ساری دنیا کی زمیں بسترِ گل ہے لیکن — ہم جسے آرام کہیں، وہ آرام نہیں

کارسازانِ محبت سے شکایت ہے نظرؔ
اس ستمگر کے ستم قابلِ الزام نہیں

(فروری ۱۹۲۱ء)

(۶)

گو حسن میں تم یکتا ہو، جلاد نہیں تو کچھ بھی نہیں — بیداد کے ہم خوگر ہیں، بیداد نہیں تو کچھ بھی نہیں
دنیا میں اگر جینا ہے غمگین و افسردہ رہنا کیا — دل شاد ہو تو سب کچھ ہے، دل شاد نہیں تو کچھ بھی نہیں

یہ طوقِ اسیری دیوانو! زینت دہ گردن کب تک — انساں ہے بنا آزاد ہے جو آزاد نہیں تو کچھ بھی نہیں

اب دل سے اُترتے جاتے ہیں اگلے وہ طریقے الفت کے — ہر بات میں اک جدت ہو ایجاد نہیں تو کچھ بھی نہیں

تم وعدہ کرو اور مکرو بھی اور اس پہ غلط بیاں بھی — میں اس کے سوا کیا اور کہوں جب یاد نہیں تو کچھ بھی نہیں

جب باغ بھی ہے اور بلبل بھی، جب پھول بھی ہے اور سبزہ بھی — پھر دام نہیں تو کچھ بھی نہیں صیاد نہیں تو کچھ بھی نہیں

اے عشق کے بندو سن رکھو ہے حسن ہمیشہ بے شنوا — فریاد کرو فریاد کرو، فریاد نہیں تو کچھ بھی نہیں

جب دل ہی نظر کا ویراں ہے، فردوس بھی اک جنگل ہے
دنیا ہے وہی آباد ہے جو آباد نہیں تو کچھ بھی نہیں

(مارچ ۱۹۲۰ء)

(۷)

متفرق اشعار:

کارگر ہو کوئی تدبیر نہ جب مرنے کو — مے پیو تم غمِ ایام غلط کرنے کو

یہ تجربے ہوئے اس دل کو قحطِ الفت کے — وطن میں لطف اب آنے لگے ہیں غربت کے

بجھے لحد میں بھی جا کر نہ داغ فرقت کے — گواہ حال ہیں ذرے زمینِ تربت کے

جو زندہ ہیں تو ہمیں دیکھ لیں گے جلوہ دوست — وہ ہم نہیں کہ رہیں منتظر قیامت کے

تھوڑی سی جان رہ گئی ہے جسمِ زار میں — کچھ اور میرے حال سے غفلت کرے کوئی

ہستی ہے کہ عکسِ نیستی ہے — ہم کیا ہیں؟ ابھی یہ طے نہیں ہے

جب وہ سرمایۂ نشاط نہیں — پھر ہمارے لئے خوشی کیسی

ہوئی کس کی نگاہ کو جنبش — دل پہ بجلی سی یہ گری کیسی

درد اٹھ اٹھ کے یہ بتاتا ہے — دل پہ کیا جانئے بنی کیسی

فکرِ خزاں ہے رات دن، جوشِ بہار دیکھ کر — رنگِ زمانہ دیکھنا، لیل و نہار دیکھ کر

دشتِ وفا کے گم شدہ چھوٹ کے کارواں سے کیا — پائیں سراغ قافلہ، گرد و غبار دیکھ کر

جل گیا بستر جو سوزِ غم ترقی پر ہوا — بلکہ فرشِ خاک پر بیٹھے وہ خاکستر ہوا

ترک کی اس نے جفا یہ آزمائش سخت ہے — یوں تو ہونے کو ہمارا امتحاں اکثر ہوا

(مارچ ۱۹۲۱ء)

قمر گیاوی

غزل

ہائے اے بادِ مخالف تو نے یہ کیا کر دیا
ہم غریبوں کا سفینہ غرق دریا کر دیا

پاؤں کی آہٹ سے مردے چونک اٹھے قبر میں
یار کی رفتار نے اک حشر برپا کر دیا

بے پیے آٹھوں پہر وارفتگی رہنے لگی
فیض ساقی نے مجھے کچھ مست ایسا کر دیا

ہلکے پانی پی نہیں سکتا فراق یار میں
ناتوانی نے مجھے مجبور ایسا کر دیا

ہے ہوس قلب سیہ میں دیں اسے ہم بھی جگہ
جس نے اپنے رُخ سے دنیا کو اجالا کر دیا

پیر رہ جاتے ہیں دُکھ سہنے کو مرتے ہیں جواں
دہر کے نیرنگ نے اندھیر ایسا کر دیا

(فروری ۱۹۱۹ء)

سید سلیمان ندوی

قدیم و جدید طرز حکومت
انڈمنٹی بل اور رولٹ بل

ایک صاحب نے کہا مجھ سے کہ آئین کہن — منبع ظلم تھا اور مایۂ آلام و محن
نہ کوئی ملک میں قانونِ جہاں بانی تھا — نہ حکومت کے تھے آداب و اصولِ احسن
نہ کمیشن سے کسی جرم کی تحقیق کا طرز — نہ شہادت سے کسی رائے کے اثبات کا فن
منھ سے جو بات نکل جائے وہی ہوتی تھی — خواہ وہ عدل ہو یا ہو غلطی کا مخزن
ملک میں گر کوئی قانون تھا نافذ تو فقط — ایک قانون تھا وہ حکم شہنشاہ زمن
صوبہ داروں کو یہ تاکید تھی ہر صوبہ میں — جو خلاف اسکے کرے اسکی اڑا دو گردن
لیکن اب نظم حکومت کا ہے انداز نیا — اب تو قانون ہے اس ملک پہ سایہ افگن

میں نے کی عرض اجازت ہو تو کچھ میں بھی کہوں — میرے نزدیک صداقت سے ہے عاری یہ سخن
کیا کمیشن کے تقرر سے نتیجہ ہوگا — منتخب اس میں وہی ممبر جو ہوں پہلے بدظن
کونسل بھی نہیں بیماری غم کا نسخہ — دوست بنکر جو نمودار ہوں اصلی دشمن
کارواں کا سر منزل پہ پہونچنا معلوم — رہنما ان کو وہی ہوں جو ہوں شب کے رہزن

طے شدہ مسئلہ اب بھی وہی بن جاتا ہے
اتفاقاً جو نکل جائے کوئی منھ سے سخن

اُس میں تغییر کسی نوع سے ممکن ہی نہیں
گویا وہ خاص ہے فرمودۂ خلاق زمن

فرق جو طرز حکومت میں ہے صرف اتنا ہے
پہلے صرف ایک تھا اب ساتھ ہیں دو چار دہن

پہلے تھا ایک خدا جس کو منا سکتے تھے
اب تو ہیں سیکڑوں ارکان حکومت کے دشمن

پہلے فرمان سلاطین جہاں جو کچھ تھا
اب بھی حکام ممالک کو وہی ہے قدغن

عدل و اصلاح طلب کے لیے تیار رہے
قید و زنجیر و تفنگ و تبر و دار و رسن"

(نومبر ۱۹۱۹ء)

عہ بحث

نوبت رائے نظر

حضرت مشتاق مرحوم

گزشتہ صدی کے آخری ربع میں لکھنؤ کو اپنے چند اہل کمال پر بجا ناز تھا۔ اس وقت اردو زبان کے جس قدر کامل الفن شعرا اس سرزمین پر موجود تھے زمانہ ما بعد کے اب پھر کبھی نہیں دیکھے گئے۔ ۱۸۵۷ء کے غدر کو ختم ہوئے ۱۸-۱۹ سال کا عرصہ ہو چکا تھا اور اس عرصہ میں لکھنؤ کی حالت پھر سنبھل چلی تھی۔ لوگوں کو ایک عرصہ کے بعد اطمینان سے بیٹھنا نصیب ہوا تھا۔ دماغوں میں یکسوئی کی کیفیت پیدا ہو گئی تھی اور اگرچہ اب اس بہشت میں "سوما خاک اڑ رہی تھی جسے مشہور سیاح "ٹیلر" نے خلد بریں کے بیرونی پھاٹک سے تشبیہ دی تھی۔ تاہم قدیم معاشرت اور وضع قطع میں ایسا انقلاب نہیں ہوا تھا جو آج کل نظر آتا ہے۔ روزانہ زندگی کے اشغال وہی تھے جس کے باشندگان شہر ہمیشہ سے عادی تھے اور ان میں شعر و سخن کا شغل زیادہ مقبول و ہر دلعزیز تھا جہاں عہد شاہی کے بعض باقیات الصالحات اس وقت موجود تھے وہاں نوخیز اور ابھرنے والے شاعروں کی بھی ایک بڑی تعداد پیدا ہو گئی تھی۔ اور ان کے بیچ میں ایک طبقہ ایسے شاعروں کا تھا جو اگرچہ ابھی استادی کے درجے تک نہیں پہنچے تھے لیکن اپنی استعداد علمی اور مشق سخن کی بدولت کافی شہرت حاصل کر چکے تھے اور بعد کو اردو شاعری کے جید اور مسلم الثبوت استاد مانے گئے۔ انہیں اصحاب میں نواب محمد باقر علی خاں عرف بڑے صاحب مشتاق بھی تھے، جو اس دور کے نہایت نامور اور ذی استعداد شعرا میں شمار کیے جاتے تھے۔ ان کے والد ماجد نواب آغا دولہ صاحب بھی ایک گرانمایہ شاعر اور زمانہ قدیم کی یادگار تھے۔ اگلے امرا کی طرح ان کو بھی مشاعرہ سے خاص دلبستگی تھی اور عموماً اچھے اچھے مشاعرے کرتے رہتے تھے، جن میں میاں بحر، میر دوست علی خلیل، میر وزیر علی صبا اور دور شاہی کے دیگر باقیات الصالحات شریک ہوا کرتے تھے۔ کبھی کبھی منشی محمد اسمٰعیل حسین منیر شکوہ آبادی اور میر یار علی عرف جان صاحب مشہور ریختی گو بھی آغا صاحب کے مشاعروں میں شریک ہوتے تھے۔ منشی مظفر علی خاں اسیر بھی جب رامپور سے لکھنؤ آتے تو ان مشاعروں میں شریک ہوا کرتے تھے۔ اس طرح یہ مشاعرہ ایک سندی مشاعرہ ہوتا تھا جس میں زیادہ تر اساتذہ ہی اساتذہ ہوتے تھے، جن کی نورانی صورتیں بزم سخن کی رونق کو دوبالا کر دیتی تھیں۔ غالباً ۱۸۷۵ء

یا اسی کے قبل کا ذکر ہے جب راقم نے اس قسم کے دو ایک مشاعروں کو دیکھا تھا اور ان کا الٹا سا خیال اب تک دماغ میں باقی ہے۔ نواب بنے صاحب مشتاق اس وقت جوان تھے، لیکن ایسے سندی مشاعروں کی شرکت سے ان کی طبیعت میں اُستادانہ رنگ اسی وقت سے جاگزیں ہونے لگا تھا۔ عموماً لکھنؤ کے نوابوں کو لاابالی کہا جاتا ہے اور ان کے روزمرہ کے مشاغل کی نہایت ہی خراب تصویریں پبلک کے سامنے پیش کی جاتی ہیں۔ لیکن یہ بہت کم لوگوں کو معلوم ہوگا کہ لکھنؤ کی شاعری کی تمام ترقی اسی طبقے کی ذہانت اور فیاضانہ سرپرستی کی رہین منت ہے۔ لکھنؤ میں شعر و سخن کا چرچا محض لکھنؤ کے نواب زادوں کے دم سے قائم تھا اور جس قدر اس طبقے پر زوال آتا گیا اسی قدر لکھنؤ کی شاعری بھی زوال پذیر ہوتی گئی۔ یہاں تک کہ اب لکھنؤ میں شعر و سخن کا ذکر بمشکل سنائی دیتا ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے جس سے انکار نہیں ہو سکتا۔

نواب بنے صاحب مشتاق کا ذکر کرتے ہوئے ان کے معاصرین کے نام بے اختیار زبان پر آجاتے ہیں۔ اس اگلے عہد سے قطع نظر کر کے جس کا ذکر کیا گیا ہے راقم کی یاد میں نواب صاحب نے جب کامل شہرت اور سند استادی حاصل کر لی تھی، اُن کے معاصرین میں سید صاحب تعشق، مولوی علی میاں کامل، میر مہدی حسین ماہر، سید عباس حسن فصاحت۔ نواب شیر علی خاں رسا غزل گوئی کے میدان میں سبقت لے گئے تھے۔ اور بیشتر یہی اصحاب عام و خاص مشاعروں میں ہم بزم نظر آتے تھے۔ حالانکہ حکیم سید ضامن علی جلال، شیخ محمد جان شاد پیر و میر، شیخ اچھے صاحب عیش، میر خورشید علی صاحب نفیس میر انیس مغفور، اور منشی غضنفر علی خاں صاحب خلف حضرت امیر مرحوم بھی اسی دور کے گرانمایہ شاعر اور اساتذہ تھے۔ لیکن یہ اصحاب عموماً مشاعروں میں شرکت نہیں کرتے تھے۔ اب اس عہد کے مایۂ ناز اصحاب میں صرف فصاحت حضرت افضل اور حضرت انجم باقی ہیں۔ نواب سید باقر علی خاں صاحب اور نواب سید جعفر علی خاں صاحب (رؤسائے شیش محل) بھی گرانمایہ اور کہنہ مشق شاعر ہیں۔ لیکن اپنے علوئے مرتبہ کے لحاظ سے یہ حضرات شہر کے مشاعروں میں غالباً کبھی شریک نہیں ہوئے۔ البتہ ممدوحین کے ذوق سخن کی بدولت شیش محل میں اکثر چیدہ مشاعرے ہوتے رہے جن میں شہر کے منتخب اساتذہ اور بعض نہایت خوشگو اصحاب مدعو کئے جاتے تھے۔ شہزادہ میرزا سلیمان قدر بہادر مرحوم برادر خورد میرزا محمد واجد علی شاہ آخری شاہ اودھ کو بھی شعر و سخن سے خاص دلچسپی تھی۔

اور ممدوح بھی اکثر چیدہ چیدہ مشاعرے منعقد کرتے رہتے تھے۔ اسی دور کے یادگار شعرا میں مولانا سید علی نقی صاحب صفی بھی ہیں جن کی شیوا بیانی کی فی زمانہ ایسی زبردست شہرت ہے اور جو درحقیقت لکھنؤ کے لئے مایۂ ناز ہیں۔ سید محمد مصطفےٰ میرزا صاحب رشید نبیرۂ حضرت انیس مغفور جن کا تھوڑا عرصہ قبل انتقال ہوا ہے ایک گوشہ نشین لیکن کامل الفن شاعر تھے اور اپنی خوش گوئی کے اعتبار سے اپنے معاصرین میں ممتاز درجہ رکھتے تھے۔ عموماً مشاعروں میں شریک نہیں ہوتے تھے۔ لیکن جس طرح بوئے مشک خود بخود پھوٹ نکلتی ہے اسی طرح آپ کی شعر گوئی کی شہرت بھی آپ کے کنج عزلت سے نکل کر عالمگیر ہو گئی۔

نواب بنے صاحب مشتاق ان سب حضرات کے معاصر اور ہم جلسہ تھے اور تمام شعرائے شہر اُن کی اُستادی اور استعداد علمی کے معترف ہیں۔ عربی و فارسی پر اہل زبان کے برابر عبور حاصل تھا۔ شمس بازغہ کا درس بے تکلف دیتے تھے۔ اپنے تلامذہ کو فن سخن میں کامل بنائے بغیر نہیں چھوڑتے تھے۔ خصوصاً عروض و قافیہ کی تعلیم دیے بغیر اصلاح شعر نہیں کیا کرتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ ان کے شاگردوں میں ایسے ذی استعداد لوگ تھے جو فن سخن کے عموماً ماہر ہوتے تھے۔ طبقۂ شعرا کے علاوہ طبقۂ علما میں ان کی خاص عزت و توقیر ہوتی تھی۔ مشاعروں میں حضرت مشتاق اور مولوی علی میاں صاحب کامل برابر کے اُستاد سمجھے جاتے تھے۔ ان دونوں اصحاب میں اکثر شاعرانہ نوک جھونک بھی ہوتی رہتی تھی۔ محلہ رہی متصل حضرت گنج میں نواب سید اصغر حسین فاخر کے دولت خانہ پر مسلسل معرکہ آرا مشاعرے ہوا کرتے تھے اور ان مشاعروں میں دیگر اساتذہ شعرائے شہر کے علاوہ حضرت کامل اور حضرت مشتاق خصوصیت کے ساتھ شریک ہوا کرتے تھے۔ یوں تو تمام شعرا ایسے مشاعرے کے لئے اپنی تمام تر قوت شاعری صرف کر کے غزل کہتے تھے لیکن حضرت مشتاق اور حضرت کامل کی شاعرانہ لاگ کچھ اور ہی لطف رکھتی تھی۔ مشاعرے سے پہلے ایک دوسرے کی فکر سخن کی اطلاع دیا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ عین مشاعرے کے روز حضرت مشتاق کو معلوم ہوا کہ مولوی علی میاں طرح میں ستّر مطلع کہہ چکے ہیں اور ابھی یہ سلسلہ ختم نہیں ہوا۔ نواب بنے صاحب مشتاق نے یہ خبر سنتے ہی دریائے فکر میں غوطہ لگایا اور مشاعرے کے وقت سے پہلے نوّے مطلع کہہ لئے، حالانکہ طرح اس قدر تنگ محدود تھی کہ دو چار مطلع بھی مشکل سے نکل سکتے تھے۔ مجھے مصرع طرح یاد نہیں، لیکن نواب بنے صاحب مشتاق

کا ایک مطلع اب تک اُس وقت کے لوگوں کی زبان پر ہے :

حاسد نہ میرے تا دیب (کلاہ) تک گئے — رستے ہیں بال قفس پرواز تھک گئے

اس سے مرحوم کی طبیعت کی مشکل پسندی کا بھی کافی اندازہ ہوتا ہے۔ افسوس کہ دیگر اساتذۂ لکھنؤ کی طرح مرحوم کا کلام بھی معرضِ طبع میں نہ آیا اور آپ کے کمالات آپ کے ہمراہ گوشۂ گمنامی میں مدفون ہو گئے۔ راقم کو حضرت مشتاق کی ہمسائیگی اور قربت کی وجہ سے آپ کے کمالاتِ شاعری سے کافی واقفیت ہے۔ نواب صاحب درحقیقت اسم بامسمیٰ شاعر تھے۔ آپ کی مشاقی کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ ہر مشاعرے میں اپنی غزل کے علاوہ اپنے بعض شاگردوں کے لئے بھی غزلیں کہتے اور کثیر التعداد شاگردوں کی غزلوں پر اصلاح بھی دیتے اور اگر اس کے بعد معلوم ہوتا کہ فلاں شاعر نے کسی خاص قید میں غزل کہی ہے تو خواہ مشاعرے کے لئے کتنا ہی تھوڑا وقت باقی ہو، اسی التزام کے ساتھ اپنے لئے ایک اور غزل کہہ لیتے۔ ان کا توسنِ خیال نہایت تنگ میدان میں طرارے بھرنے کا زیادہ خوگر تھا۔ کوئی خاص قافیہ دیجئے اور وہ خواہ کیسا ہی محدود ہو آپ اس میں اس قدر مضامین پیدا کر دیتے تھے جو آپ کے معاصرین میں مولوی علی میاں صاحب کامل کے سوا کسی کے لئے ممکن نہ تھا۔ "خدنگ نظر" کے لئے جب راقم نے آپ سے غزل مانگی، تو آپ نے کہا کہ "مجھے تم سے ایک خصوصیت ہے لہٰذا میری غزل میں بھی کوئی خصوصیت ہونا چاہیئے۔" اس خصوصیت کے لحاظ سے آپ اس رسالہ کے لئے ایک قافیہ غزل کہا کرتے تھے۔ افسوس کہ یہ سلسلہ زیادہ عرصے تک قائم نہیں رہا۔ اور دو ہی چار طرحوں میں غزل دینے کے بعد آپ رامپور چلے گئے اور وہیں آپ کا انتقال ہو گیا۔ مجھے معلوم ہے کہ آپ کے دو مبسوط دیوان اب تک مسودہ کی صورت میں موجود ہیں۔ لیکن نہ وہ اب تک معرضِ طبع میں آئے ہیں اور نہ آئندہ اس کی امید ہے۔ ناچار "خدنگ نظر" سے آپ کی چند غزلوں کو "صبحِ امید" کے دامن میں منتقل کر کے زمانۂ حال کے اساتذۂ سخن کے سامنے حضرت مشتاق کے کمالاتِ شاعری کو پیش کرتا ہوں۔ دیکھئے مرحوم نے ایک "دیوارِ گلستاں" سے کتنے مضامین پیدا کئے ہیں :-

ڈھلا ہے حسن لیکن رنگ ہے رخسارِ جاناں پر — ابھی باقی ہے کچھ کچھ دھوپ دیوارِ گلستاں پر

نہ ہم گل ہیں نہ بوئے گل فقط رنگیں طبیعت ہیں — نہ ہم صحنِ چمن میں ہیں نہ دیوارِ گلستاں پر

قفس سے چھُٹ کے بلبل کا تو جانا ضعف میں کیسا — نہ پہنچا رنگِ رخ بھی اُڑ کے دیوارِ گلستاں پر

جو ہے دربند کیوں صیاد لاغر چڑھ نہیں سکتا — کمندِ بوئے گل لٹکی ہے دیوارِ گلستاں پر

قفس سے چھوٹ کر یہ بعد مدت کون آتا ہے — کہ مجمع عندلیبوں کا ہے دیوارِ گلستاں پر
اسیروں نے پھڑک کر جان دیدی شوقِ گلشن میں — قفس ٹوٹے ہوئے رکھے ہیں دیوارِ گلستاں پر
خزاں میں بھی وہی رہتا بہارِ باغ کا عالم — گلوں کا رنگ پھر جاتا جو دیوارِ گلستاں پر
ہے میعاد نامعلوم کچھ مدت اسیری کی — ہماری قید کا دن لکھ دے دیوارِ گلستاں پر

گلستاں میں نہ جاؤ اپنی رنگ آمیزیاں دیکھو
ہزاروں رنگ میں مشتاقؔ، دیوارِ گلستاں پر

جس زمانے میں "خدنگ نظر" نکالا گیا تھا اس وقت شعرائے لکھنؤ میں ناگوار شکر رنجیاں پیدا ہو گئی تھیں، اور ان کی پارٹیاں بن گئی تھیں۔ ایک پارٹی دوسری پارٹی کے ساتھ شریک مشاعرہ نہیں ہوتی تھی۔ اس لئے اگرچہ مندرجۂ بالا طرح میں ایک عظیم مشاعرہ "خدنگ نظر" کی طرف سے کیا گیا تھا، لیکن حضرت مشتاقؔ اس میں شریک نہیں ہوئے تھے۔ بعد کو نواب صاحب نے خود ایک مختصر سی صحبت کر کے جس میں سید پیارے صاحب رشید، حضرت مظہرؔ مرحوم اور بعض دیگر اساتذہ مدعو کئے گئے تھے اپنی غزل سنائی تھی۔

اُردو شاعری میں ایک قافیہ غزلوں کی کمی نہیں ہے، بلکہ اس قید کو عموماً بہت سہل خیال کیا جاتا ہے۔ لیکن قافیہ پیمائی اور چیز ہے اور مضمون آفرینی اور چیز۔ اس اعتبار سے حضرت مشتاقؔ کی مندرجۂ بالا غزل مرحوم کے کمالِ فن کا ایک بیش بہا نمونہ ہے۔ ہر شعر کا مضمون منتخب اور جداگانہ ہے۔ پیش پا افتادہ مضامین کی تمام غزل میں ہوا تک نہیں پہنچنے پائی ہے۔ بیشتر اشعار کے مضامین آج چہارم صدی بعد بھی اُسی قدر نئے ہیں جس قدر اس زمانے میں خیال کئے گئے تھے جب یہ غزل شائع ہوئی تھی۔ ایک اور غزل میں مرحوم نے ایسا ہی کمال دکھایا ہے اور "آستیں" ایسے محدود قافیے میں بہتر سے بہتر مضامین کا انبار لگا دیا ہے:۔

حذر قاتل کے دستِ نازنیں سے — پناہ اُس خون ٹپکی آستیں سے
نگاہِ یار کا اِس دل سے شکوہ — شکایت ہاتھ کی اور آستیں سے
لگی ہے سر مرا جو شعلہ رخسار — جلا جاتا ہے دامن آستیں سے
معاذ اللہ مرے اشکوں کی گرمی — جلی بو آ رہی ہے آستیں سے
گلے جا مے سے وابستہ ہو وحشت — جنوں لپٹا ہوا ہے آستیں سے

تری پوشاک کا عاشق ہوں ایجاں
بندھا ہے دامنِ دل آستیں سے

جنوں خیز آ گئی فصلِ بہاری
ہزاروں ہاتھ نکلے آستیں سے

اُلجھ کر رہ گیا کچھ دستِ وحشت
رہا دامن کا پردہ آستیں سے

بسی کیوں بوئے گیسو یہ خطا ہے
گنہ ثابت ہے میرا آستیں سے

بڑھے جب دُختِ رز تک رند کے ہاتھ
کیا شیشے نے پردہ آستیں سے

دلِ عالم اُلٹ جائے گا مشتاق
کسی ظالم کی اُلٹی آستیں سے

حال میں بمقام میرٹھ ایک نامی گرامی مشاعرہ ہوا تھا۔ "زمیں ہوتی" "آستیں ہوتی" طرح تھی۔ اکثر اخبارات نے اس مشاعرے کی غزلیں شائع کی ہیں جس میں "آستیں" کا قافیہ اچھے اچھے شاعروں نے اس طرح کہا ہے "ہمارا ہاتھ اور اس کی آستیں ہوتی"۔ غرضکہ ایک ہی مضمون کو ایک آدھ لفظ کے اُلٹ پھیر سے اس طرح نظم کیا گیا ہے، لیکن کسی کو اس کی حس تک نہ ہوئی کہ اس نے "گریباں" کی جگہ "آستیں" نظم کر دیا ہے۔ دست و گریباں کی ضرورت ہے، نہ کہ آستیں کی۔ اگلے اساتذہ کے کلام میں ایسے معنوی نقائص کبھی نہیں ہوتے تھے۔ حضرت مشتاق نے گیارہ طرح سے آستیں کا قافیہ نظم کیا ہے، لیکن معنوی نقص کہیں نہیں ہے۔ ایک اور طرح میں مشتاق مرحوم نے "خیال" کے قافیہ میں غزل کہی ہے:

باغ میں دل سے ہو گر ذکرِ وصال اچھا ہے
رنگ بھرنے کے لئے نقشِ خیال اچھا ہے

آہوئے چشم کا سودا ہے تصور میں ضرور
مشقِ رم کے لئے صحرائے خیال اچھا ہے

ہجر میں یاد ہے رخسارۂ پُر نورِ صنم
ماہتابِ شبِ تاریکِ خیال اچھا ہے

سازِ عشرت کی بھری رہتی ہے کانوں میں صدا
دل بھی اک زمزمۂ قانونِ خیال اچھا ہے

جلوۂ حسنِ حسیں ہر شبِ غم پیشِ نظر
شعلۂ شمعِ شبستانِ خیال اچھا ہے

یادِ گیسو میں ہے میرا دلِ زخمی پابند
صید بستۂ فتراکِ خیال اچھا ہے

کسی بیتابِ طبیعت کے تلون کا ہو دھیان
رقص کرتا ہوا طاؤسِ خیال اچھا ہے

تل کسی چہرے کا مرکز ہے تصور کا مرے
بس یہی نقطۂ پرکارِ خیال اچھا ہے

شاہدِ نظم سے مشتاق کہا کرتا ہوں
تیرے رہنے کے لئے قصرِ خیال اچھا ہے

ذیل میں حضرت مشتاق کی ایک غزل عام قافیوں میں پیش کی جاتی ہے۔ اس میں کسی قافیے کی قید نہیں ہے۔ اس سے آپ کی شاعری اور رنگِ سخن کا اندازہ کسی قدر وضاحت کے ساتھ ہو سکے گا۔

اکھوں سے ترقی پہ مرا سوزِ جگر ہے
اب آگ کے لگنے کی بہت گرم خبر ہے

وسعت ہے مرے دل میں بہت کیا تجھے ڈر ہے
آ شوق سے تو اے غمِ عالم ترا گھر ہے

مشتاقِ جمالِ رخِ جاناں مرا گھر ہے
اک دیدۂ مشتاق ہے جو روزنِ در ہے

آرام کروں بن چکے بس گیسوئے مشکیں
زلفِ سیہ لیلیٰ شب تا بہ کمر ہے

باتیں جو بہکی ہوئی کرتا ہے ہر اک مست
میخانے میں یہ قلقلِ مینا کا اثر ہے

مدت سے ہے اک عارضِ پُر نور کی الفت
میرا دلِ روشن کسی آئینے کا گھر ہے

کل جاتے تھے تم جس کی عیادت کو مری جاں
لو آج اُسی بیمار کا دنیا سے سفر ہے

ہے قبلہ نما شوقِ شہادت میں مرا دل
یہ بھی ہے اُدھر رخ ترے ناوک کا جدھر ہے

جانے دے مجھے کوہ پہ اے جوشِ جنوں تو
پتھر ہی سے ٹکرانے کے قابل مرا سر ہے

راحت ہے اُسے پہلوئے دلدار میں ہے جو
چین اس کو ہے جس کا دلِ محبوب میں گھر ہے

مے جام میں بھر ان کی نگہ روک کے ساقی
شیشے میں جو ہے بال یہ مستوں کی نظر ہے

آخر میں نواب صاحب کی ایک اور غزل پیش کی جاتی ہے۔ یہ بھی اک قافیہ ہے اور اس میں اشعار مطلعوں کی تعداد زیادہ ہے۔ ان کے پہلے مصرعوں میں بھی ایک ہی قافیہ استعمال کیا گیا ہے:

چارہ سازِ المِ ہجر ہے الفت اُن کی
زخمِ دل کے لیے مرہم ہے محبت اُن کی

ہے ہمارے دلِ سربستہ میں الفت اُن کی
مثلِ بو قید ہے غنچے میں محبت اُن کی

اس دلِ صاف میں پیدا ہوئی الفت اُن کی
بن گئی جوہرِ آئینہ محبت اُن کی

گرمیِ آتشِ جاں سوز ہے الفت اُن کی
آب ہے دلِ بریاں کا محبت اُن کی

مرتے مرتے بھی نہ جائے گی یہ الفت اُن کی
دل میں ہے داغِ سویدا کہ محبت اُن کی

رونقِ گلشنِ ایجاد ہے الفت اُن کی
رنگ ہے پھولوں کے عارض کا محبت اُن کی

عشق کے جوش میں اشکوں کا بہا ہے دریا
نقش بر آب نہ کیونکر ہو محبت اُن کی

اپنے مرنے کی خبر آج اڑاتے ہیں ہم
آزمانا ہے ہمیں آج محبت اُن کی

جان دینے میں یہ ڈر ہے کہ وہ رسوا ہوں گے — مجھے مرنے نہیں دیتی ہے محبت اُن کی
ذکر بھی کرتا ہوں الفت کا بہا کر آنسو — میری باتوں سے ٹپکتی ہے محبت اُن کی
عشق میں وحشتِ دل کیوں نہ فزوں ہو مشتاق — جوش دریائے جنوں کا ہے محبت اُن کی

حضرت مشتاق کے کلام میں مضمون آفرینی کے ساتھ طرزِ بیان کی سادگی ایک لطف خاص رکھتی ہے۔ باوجود تمام تر فضل وکمال کے ان کا کلام فارسی الفاظ وتراکیب کی کثرت سے پاک ہے۔ یہ حضرات طرز بیان کی رنگینی پر معانی کی پختگی کو ترجیح دیتے تھے اور کلام کو عیوب شعری سے پاک رکھنا مقدم سمجھتے تھے۔ نواب بنے صاحب مشتاق کا رنگ سخن قدیم وجدید طرز شاعری کا مجموعہ ہے۔ خاندان ناسخ کے پیرو ہونے کی وجہ سے مرحوم کا کلام ضرورت سے زیادہ پھیکا اور بے لطف ہو گیا ہے۔ لیکن ان کا زور طبیعت اور ان کی کہنہ مشقی ہر شعر میں اپنا جلوہ دکھاتے ہیں۔ مجھے مرحوم کا زیادہ کلام دستیاب نہیں ہوا۔ ناچار جس قدر "خدنگ نظر" کے اوراق پریشان میں مل سکا پیش کیا گیا ہے۔ آخر آخر نواب بنے صاحب مشتاق رامپور چلے گئے تھے اور ریاست سے ان کا تعلق بھی ہو گیا تھا۔ وہیں انتقال بھی فرمایا۔ آپ کے فرزند ارجمند نواب محمد مرتضیٰ خاں مشفق بھی ایک ہونہار اور نازک خیال شاعر ہیں اور اپنے نامور والد کے نقش قدم پر چلنے کی کوشش کرتے ہیں۔ حضرت مشتاق نہایت خلیق ملنسار اور سنجیدہ مزاج رئیس تھے۔ مزاج میں تمکنت کا نام نہ تھا۔ اگلے زمانہ کی وضعداری مرحوم کی طبیعت کا جزو اعظم تھی۔ مشاعروں میں ان کی شرکت ایک خاص رونق پیدا کر دیتی تھی۔ ہر ایک کے کلام کی داد فراخدلی سے دیتے تھے۔ کسی قدر شاعرانہ خودداری کے باوجود آپ کو نومشق شعرا کے دل بڑھانے کا خاص خیال تھا اور مشاعروں میں اس طبقہ کے شعرا کے اچھے شعروں کی داد زور شور سے دیتے تھے۔ معاصرین سے شاعرانہ لاگ کے ساتھ لطف واخلاص بھی تھا۔ کبھی کسی سے علانیہ بے لطفی کی نوبت نہیں آئی۔ مشاعرے میں اول سے آخر تک شریک رہتے۔ طولانی سے طولانی مشاعروں میں بھی کبھی درمیان میں اٹھ جانے کی خواہش نہیں کی۔ چہرے پر ہمیشہ ایک "شگفتگی" رہتی تھی۔ شکل وشباہت سے نیشاپوری نسل کی وجاہت اور خصوصیات نمایاں تھی۔ ہمیشہ عینک لگاتے تھے۔ تقریباً ۵۰ سال کی عمر میں رحلت فرمائی، مگر آخر تک ضعیفی کے آثار نمایاں نہیں ہوئے۔ لکھنؤ کے اہل کمال میں مرحوم کا نام ہمیشہ عزت کے ساتھ لیا جائے گا۔

(دسمبر ۱۹۱۹ء)

حسرت موہانی

وفا رامپوری

(۱۸۶۹ - ۱۹۱۲ء)

قیدِ فرنگ شاق (از اپریل ۱۹۱۶ء تا مئی ۱۹۱۸ء) کے بعد جیل سے باہر آنے پر راقم حروف نے زمانے کے جن انقلابی آثار کو سب سے زیادہ محسوس کیا اُن میں ایک یہ بھی ہے کہ راقم کے بعض ایسے خالص اور بے ریا احباب دنیا سے رخصت ہو چکے تھے جن کی یاد کا دل سے فراموش ہونا مشکل معلوم ہوتا ہے۔ اُن احباب میں سے ایک مرحوم حکیم عبدالہادی خاں وفا بھی تھے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

نام و خاندان: عبدالہادی[1] خاں نام وفا تخلص ولد یعقوب خان رسالدار، ولد ہزار میر آخوند زادہ ولد عبدالحمید خاں رام پور میں، تقریباً ۱۲۸۲ھ میں غوغون کے گھر کے قریب اخون خیلوں کے محلے میں پیدا ہوئے۔ ہوش سنبھالا تو گھر میں حکومت، دولت، عزت سب کچھ موجود تھا۔ آپ کے والد کی عظمت تمام شہر میں مسلّم تھی۔ دربار میں بھی خوب اعزاز تھا۔ رسالداری کوتوالی وغیرہ مختلف عہدوں پر ملازم رہے۔ گھر میں موروثی املاک کے سوا استاجری، کھنڈسال اور تجارت ہوتی تھی۔

تعلیم: معلم ملازم رکھے گئے اور زمانۂ تعلیم کے ساتھ فارسی اور عربی تعلیم شروع ہوئی۔ مولوی عبدالعلی خاں ریاضی داں، مولوی ظہور الحسن، مولوی محمد عالم، مولوی سلامت اللہ، مولوی عبدالغفار خاں اور شمس العلما مولوی عبدالحق سے کتابیں پڑھیں۔ طبیعت نہایت ذکی اور حافظہ بہت قوی تھا۔ طب اپنے ماموں حکیم محمد حسین خاں سے پڑھی۔

سلسلۂ شاعری: فارسی کلام میں کسی سے اصلاح لینے کا حال معلوم نہیں ہوا۔ البتہ اردو کی دو ایک غزلیں ابتدا میں مرزا داغ کو دکھائی تھی اور اس کے بعد کچھ کلام امیر مینائی مرحوم کی نظر سے گذرا تھا۔ مگر حق یہ ہے کہ مرحوم خود اپنی طبیعتِ خداداد کے شاگرد تھے اور اُن دونوں سے شاگردی کا تعلق برائے نام اور محض ایک رسم قدیم کی تقلید تھی، ورنہ وفا کے رنگِ سخن کو داغ و امیر کے رنگ سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔

۱۔ از تذکرۂ کاملانِ رام پور قلمی مؤلفہ حافظ احمد علی خاں صاحب افسر کتب خانہ رام پور۔

مشاغل: آپ کے والد کا منشا یہ تھا کہ آپ گھر پر بیٹھ کر طلبا کو درس دیا کریں اور اس طور پر خاندان میں جو علمی سلسلہ چلا آتا ہے وہ از سر نو قائم ہو جائے۔ چنانچہ آپ نے اپنے والد کی زندگی تک قدم گھر سے باہر نہ نکالا۔ ملازم، خدمتی سب موجود تھے۔ مگر جب علاقہ مستاجری میں نقصان ہوا، جائداد تلف ہوئی اور والد کا بھی انتقال ہو گیا، تو مجبور ہو کر مطب شروع کیا۔ اللہ تعالیٰ نے ہاتھ میں شفا دی تھی علی گڑھ اور نواح علی گڑھ میں بڑی کامیابی کے ساتھ مطب کرتے تھے۔ راقم حروف سے ملاقات کی ابتدا علی گڑھ ہی کے زمانے میں ہوئی تھی۔

وفات: علی گڑھ سے بیمار ہو کر وطن گئے اور وہاں ۱۴ ماہ علیل رہ کر ۱۳۱۲ھ میں انتقال فرمایا اور بزرگوں کے قبرستان میں اپنے مکان کے متصل دفن ہوئے۔ اللہ تعالیٰ غریقِ رحمت فرمائے۔ منشی احمد علی صاحب شوق قدوائی نے حسب ذیل قطعۂ تاریخ وفات تصنیف کیا: ؎

بست و ہفتم ذی قعدہ کی ہے اور ہو سہ شنبہ کا روز　　جان وفا پر دست درازی آ کے اجل نے کی ہے آج
فکر وفات کے سن کی تھی تو ہاتف نے دی یہ آواز　　عبدالہادی خانِ وفا نے راہِ عدم کی لی ہے آج

تصانیف: یادگار وفا ایک ضخیم کلیات اردو و فارسی کلام کا آپ کے صاحبزادے میاں عبدالواحد خاں سلمہٗ عرف رکھن میاں کے پاس موجود تھا۔ یہ لڑکا بھی مصداق اَلوَلَدُ سِرٌّ لِاَبِیْہِ ماشاء اللہ نہایت ذہین اور ہوشمند ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کی عمر اور علم میں برکت دے۔ اگر دربار رام پور سے اس کی تعلیم کے لیے کچھ ماہوار وظیفہ مقرر ہو جائے، تو یہ لڑکا یقیناً اپنے باپ کا لائق جانشین ثابت ہو۔ عزیز موصوف نے از راہ مروت و محبت وہ کل مجموعہ بغرض ترتیب و طبع راقم کے سپرد کر دیا ہے۔ وقت پر شائع ہو گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔ اس کلیات میں اردو و فارسی کے مکمل دواوین کے علاوہ مسدس، مخمس، واسوخت، رباعی، قطعہ، قصیدہ وغیرہ جملہ اصناف سخن کے نمونے موجود ہیں۔ رکھن میاں کا ایک بھائی اتفاقی طور پر چراغ کی لَو سے جل کر گذر گیا تھا۔ اس کی مرگِ ناگہانی کا حکیم صاحب کو کچھ روز تک بہت قلق رہا، چنانچہ اس سانحۂ ہوش ربا کی یادگار ایک غزل بطور مرثیہ بھی کلیات میں موجود ہے جس کے چند شعر یہ ہیں:

پھر تازہ امتحانِ وفا ہے وفا کے بعد　　کیا رہ گیا تغافلِ صبر آزما کے بعد
بھرتا ہوں زہر کاسۂ گردوں میں ہائے ہائے　　پیتا ہوں زہر جامِ شہیدِ ادا کے بعد

۱۔ از تذکرۂ کاملانِ رام پور قلمی مولفہ حافظ احمد علی خاں صاحب افسر کتب خانہ رام پور

تُو جل گیا کہ خانۂ امید جل گیا　　　دل بجھ گیا ترے سخنِ دلکشا کے بعد
ہے ہے دیا قضا نے تجھے آتشیں کفن　　　کیا داغ تازہ لیکے چلا ہے قضا کے بعد

اخلاق و عادات: مرحوم اخلاق و محبت کے کان تھے۔ اسلام کی ہمدردی رگ و پے میں ساری تھی۔ نہایت درجہ غیور، با مروّت، بے نمود و بے ریا مسلمان تھے۔ تمام عمر پابند صوم و صلوٰۃ رہے۔ نازک مزاجی کا یہ عالم تھا کہ کبھی کبھی اپنے خالص دوستوں سے بھی ذرا ذرا سی بات پر بگڑ جاتے تھے۔ مگر یہ شکر رنجی دیرپا نہ ہوتی تھی۔ بہت جلد اور خود بخود زائل ہو جاتی تھی۔ مریض اگر اپنا لکھا ہوا نسخہ کھو کر دوبارہ نسخہ لکھنے کی درخواست کرتا تھا تو بہت برہم ہوتے تھے۔ کئی بار ایسا ہوا کہ بعض اُمرا کے بے وقت بلانے پر آپ نے صاف صاف کہہ دیا کہ میں قُلی نہیں ہوں کہ رات دن سرگرداں رہوں۔ اس وقت نہیں آ سکتا۔

علی گڑھ میں کئی طالب علم اُن سے طب کا سبق لینے روزانہ آیا کرتے تھے۔ ان میں سے ایک کے سبق میں ایک دن کیموس کا لفظ آیا۔ حکیم صاحب نے پوچھا کہ کیموس کو تو جانتے ہی ہو گے۔ شامت اعمال سے طالب علم نے اس کا جواب کچھ ایسا دیا جس سے اُس کی بے علمی ظاہر ہوتی تھی۔ حکیم صاحب نے فوراً کتاب زور سے بند کر کے پھینک دی اور فرمایا کہ "آج سے اگر تم لوگ مجھ سے پڑھنے آئے تو تجھ پر اور میں تجھے پڑھاؤں تو مجھ پر لعنت" اور پھر کبھی اس کو سبق نہ دیا۔

خودداری کا یہ حال تھا کہ کبھی کسی مشاعرے میں بغیر بلائے نہیں گئے اور بلائے جانے پر بھی صرف اس وقت جاتے تھے جب ان کو یقین ہو جاتا تھا کہ ان کا احترام اُن کے مرتبۂ شاعری کے لحاظ سے ضرور کیا جائے گا۔ نااہل کو اپنا کلام ہرگز نہ سُناتے تھے۔ لیکن سخن شناس احباب کو جب کبھی سناتے تھے تو پوری داد چاہتے تھے اور اگر اس میں کمی ہوتی تھی تو بلا تصنّع ناراضی کا اظہار فرما دیتے تھے۔

ایک مرتبہ مرحوم عظمت اللہ برقؔ راقم کے ہمراہ آپ سے ملنے گئے۔ آپ نے حسب معمول اپنا تازہ کلام دیر تک سُنایا۔ راقم نے بہت کچھ تعریف کی، مگر برقؔ مرحوم خاموش بیٹھے رہے۔ حکیم صاحب چونکہ اُن سے واقف نہ تھے اس لئے ان کی خاموشی کا کچھ خیال نہ کیا۔ مگر جب آخر میں مجھ سے دریافت حال کرنے پر ان کا نام عظمت اللہ اور تخلص برقؔ معلوم ہوا، تو نہایت درجہ برہم ہوئے اور بے اختیار کہنے لگے کہ حضرت آپ نے گویا مجھ کو کُتا سمجھ لیا کہ میری سمع خراشی کی جانب مطلق اعتنا نہ کی۔ آپ شاعر ہیں اس لئے یا تو میرے کلام کی داد دینا تھی یا آپ اس کی ہجو ارشاد فرمایئے۔ برقؔ مرحوم چونکہ حکیم صاحب کے مزاج سے آشنا نہ تھے اس لئے ان کی اس بیباک گفتگو

سے نہایت پریشان اور متحیر ہوئے۔ خود بھی دیر تک معذرت کرتے رہے اور راقم نے بھی ان کی طرف سے بہت کچھ کہا سنا مگر اس وقت وہ کسی طرح راضی نہ ہوئے، البتہ دوبارہ جب برقی مرحوم کو پھر کبھی میرے ساتھ ان سے ملنے کا اتفاق ہوا، تو ان سے بھی بڑی محبت اور خلوص کے ساتھ پیش آئے اور آخر تک اس وضع کو نباہا۔

اگر کسی کم علم یا کم فہم شاعر کی تعریف کسی کی زبان سے سنتے تھے، تو ان کے غصہ کی انتہا نہ رہتی تھی بارہا ان کی زبان سے یہ الفاظ سُنے گئے کہ "فلاں جاہل ہے، جاہل کو شاعری سے کیا علاقہ۔ فلاں شخص فارسی یا عربی سے بیگانہ ہے اس کی شاعری ہی کیا ہو" شریعت کی ظاہری پابندی کے لحاظ سے حکیم صاحب مرحوم کے رنگِ طبیعت کا اندازہ مندرجہ ذیل حکایات سے بخوبی ہو سکے گا:

ایک روز عند الملاقات مرحوم راقم حروف کو اٹھا کر علیحدہ لے گئے، اور نہایت عاجزی کے ساتھ کہا کہ ایک بات کی درخواست کرنا چاہتا ہوں بشرطیکہ تم اس کو مان لینے کا وعدہ کرو۔ حکیم صاحب مرحوم چونکہ ایک مردِ قانع و متوکل تھے اس لئے راقم کو فوراً یہ خیال ہوا کہ شاید کسی فوری ضرورت کے لئے ان کو کچھ رقم قرض کی حاجت ہوگی۔ چنانچہ اس خیال سے بلا تامل جواب دیا کہ فرمائیے میں تعمیلِ ارشاد کے لئے بسر و چشم حاضر ہوں۔ مگر جواب میں مرحوم نے اس کے سوا اور کچھ نہ کہا کہ بھائی میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ تم داڑھی نہ منڈوایا کرو۔

حقیقتِ حال یہ ہے کہ اس وقت تک راقم کی روش داڑھی کے باب میں یہ تھی کہ بر بنائے آزادی نہ منڈانے کا پابند ہونا چاہتا تھا نہ رکھانے کا۔ ہوتا یہ تھا کہ جب تک داڑھی کی درازی تکلیف دہ نہیں ہوتی تھی اس وقت تک اسے اپنے حال پر چھوڑ دیا کرتا تھا۔ لیکن تکلیف دہی کی حد تک پہنچ جانے پر اکثر تیسرے مہینے بالکل صاف کر دیا کرتا تھا۔ چنانچہ جس روز کا واقعہ اوپر درج کیا گیا ہے اُس سے دو چار دن پہلے تین ماہ بعد داڑھی منڈائی گئی تھی اور حکیم صاحب کو یہ روش پسند نہ آئی تھی۔ بہرحال ان کی التجائے خلوص کا راقم کے دل پر ایسا گہرا اثر ہوا کہ اس دن کے بعد پھر کبھی داڑھی منڈانے کی نوبت نہیں آئی۔

یادش بخیر مولوی محمد احسن اللہ صاحب ثاقب پروفیسر گوالیار کالج جو ایک مردِ حسن پرست رند مشرب اور آزادہ وضع ہیں کا بیان ہے کہ بے زری اور بیکاری کے زمانہ میں ایک بار وظیفہ و وظائف کی طرف توجہ ہوئی۔ اس کی صورت یہ تھی کہ شب کو ان کا قیام مسٹر تجمل حسین گورکھپوری بیرسٹر علی گڑھ کی کوٹھی پر ہوتا تھا اور وہ شب کو تہجد کے وقت سے بیدار ہو کر صبح تک مشغول ذکرِ الٰہی رہتے تھے۔ مگر ان کو فطرتی تن آسانی اور سستِ مذہبی کا اثر اس وقت بھی اتنا باقی تھا کہ یہ جملہ مراحل بسترِ استراحت پر لیٹے لیٹے طے ہوا کرتے تھے اور باوجود انہم

ذکر و فکر نماز فجر کی نوبت ایک دن بھی نہ آتی تھی۔

مسٹر تجمل حسین اپنے کمرے سے رود یا سیمبؔ یا سیمیؔ کا ورد کیا کرتے تھے۔ حضرت ثاقب کی ولایت کے قائل ہو چلے تھے۔ راقم حروف بھی وا ایسے تو قائل نہ تھا مگر گرمی محفل اور تفریحاً احباب کی غرض سے مسٹر تجمل حسین کے خیال کی بڑی شد و مد سے تائید کیا کرتا تھا۔

رفتہ رفتہ یہ ذکر حکیم صاحب تک بھی پہنچا کہ ثاقب نماز تو نہیں پڑھتے اگر ذکر و شغل کی اس درجہ کثرت ہے کہ کچھ روز میں لوگ انہیں عجب نہیں کہ منجملۂ ابدالِ وقت سمجھنے لگیں۔ اتفاق سے اسی اثنا میں ایک دن ثاقب راقم کی موجودگی میں حکیم صاحب سے ملے تو انہوں نے پہلا کام یہ کیا کہ ثاقب کا ہاتھ تھام کر کہنے لگے "بھائی احسن اللہ نماز پڑھا کرو نماز عذاب جہنم سے بچنے کی بھی ایک شکل ہے۔ میاں نماز کے بغیر یہ ذکر اور شغل کچھ کام نہ آئے گا" نتیجہ یہ ہوا کہ ثاقب صاحب کا دور ولایت اسی دن بلکہ اسی وقت ختم ہو گیا اور پھر کسی پر یہاں تک کہ مسٹر تجمل حسین پر بھی اُن کا رنگ نہ جم سکا۔

وفا کی شاعری: الفاظ کی رنگینی، تراکیب کی خوبی، مضمون کی نزاکت اور معنی کی دشواری کو کلام وفاؔ کے خصوصیات میں سے سمجھنا چاہیے۔ اُن کی شاعری سوقیانہ مذاق اور عامیانہ مضامین سے بالکل پاک ہے اور متانت مضمون اور بلندی خیال کے لحاظ سے بھی ہر آئینہ ستائش کی مستحق ہے۔ اُردو غزلوں کا نمونہ ملاحظہ ہو:

نکلو پردے سے تمہیں پردۂ پنہاں کی قسم	ہم نہ دیکھیں گے ہمیں دیدۂ حیراں کی قسم
اِک ذرا چھیڑ کے خونابہ فشانی دیکھو	تم کو نشتر کی قسم تم کو رگِ جاں کی قسم
مستی جلوہ پر صیقل رُخِ رنگیں کے لئے	گل خورشید دبہارِ مے رخشاں کی قسم
یوں اُڑے رنگ کہ چھونے پہ نہ کھلنے پائے	جا نگنی تجھ کو ہمارے غمِ پنہاں کی قسم
نگہ شوق ہے ظالم پر پروانہ کہاں	آنکھیں جلتی ہیں تری بزم چراغاں کی قسم
شہد جنت بھی ہوا جرعۂ شراب مجھے	میں نے کھائی ہے وفاؔ تلخی ہجراں کی قسم

بیکسی نے گھر بنا یا میرے گھر کے سامنے	رو رہا ہوں بیٹھ کر دیوار و در کے سامنے
حیرت واماندگاں ہوں حیرت وارفتگاں	اِک طرف بیٹھا ہوا ہوں رہگذر کے سامنے
انتظارِ شوق کی یہ ناتمامی ہائے ہائے	مر گیا ہوں نامہ دے کر نامہ بر کے سامنے

ہاں ابھی بزمِ خیالِ غیر سے آیا ہوں میں
تم نہ آنا میرے شوقِ پردہ در کے سامنے

اے وفاؔ قطرہ بھی خالی ہے کمالِ بحر میں
عیب ہو کر آئے ہم اہلِ ہنر کے سامنے

تلخیِ مرگِ ناگہاں آئے گی کس شمار میں
وہ بھی ہے ایک دردِ مے ساغرِ انتظار میں

ہے یہ زکوٰۃِ حسن مست آئے اور آکے دے گئے
ذوقِ نظر بہار میں ساغرِ مے خمار میں

چلتی ہے پھر نسیم آہ پھلتے ہیں پھر نہالِ شوق
آتی ہے فصلِ نو بہار سینۂ داغدار میں

عفو کو بات مل گئی لے تری بندہ پروری
خوف سے جان پڑ گئی ہر دمِ گناہگار میں

جل مرے دل میں ہیں نہاں حسرتِ قتلِ ناگہاں
جیسے ذخیرہ موت کا سینۂ ذوالفقار میں

مشقِ سخن ہے کیا وفاؔ فیضِ ازل ہے جلوہ گر
طبعِ دقیقہ سنج میں خامۂ سحر کار میں

نظارہ سوزِ انجمن ماہ و من ہے کون
جوہر گدازِ آئینۂ جان و تن ہے کون

در پردہ آرہی ہے پھر اک بوئے دلنواز
عطرِ بہار روح دماغِ چمن ہے کون

تم سے ملا ہے سلسلۂ نظمِ کائنات
جب تم ہو ہر جگہ تو غریب الوطن ہے کون

کہتے ہیں کس کو مونس دکھیا ہے سوگوار
خلوت طرازِ گوشۂ بیت الحزن ہے کون

کس کا پیام لے کے چلی ہے نسیمِ مصر
منت گزارِ دلکشیِ پیرہن ہے کون

یہ حاصلِ بیاں ہے وفاؔ غیر از خدا
اندازہ دانِ مرتبتِ پنجتن ہے کون

ان غزلوں کے مطالعے سے اربابِ نظر کو معلوم ہو جائے گا کہ کلامِ وفاؔ میں شاعری کے تمام محاسن موجود ہیں۔ صرف دشوار پسندی کا ایک عیب البتہ ایسا ہے جس سے کبھی کبھی ان کے شعر کی اور کل خوبیاں بیکار ہو جاتی ہیں۔ وہ عیب خیال کی دور از کار بلندی اور مضمون کی ناگوار پیچیدگی کے لباس میں ظاہر ہو کر اکثر ان کے بہترین اشعار کو درحقیقت بالکل بے معنی بنا دیا کرتا ہے۔ طولِ مضمون کے خوف سے اس قسم کے بے معنی اشعار کا انتخاب اس موقع پر نظر انداز کیا جاتا ہے۔ اردو دیوان کی غزلوں میں ایسے اشعار اکثر پائے جاتے ہیں۔ اردو قصاید میں کم ہیں اور فارسی قصاید میں بہت کم۔ چنانچہ اس لحاظ سے راقم کی رائے میں قصایدِ وفاؔ کا درجہ غزلیاتِ وفاؔ سے زیادہ بلند ہے۔ قصاید اردو و فارسی کے نمونے ملاحظہ ہوں۔

(از قصاید اردو در مدح حکیم اجمل خاں صاحب)

دم لیا تھا کہ ہوئے دونوں جہاں بے آرام
میرا آغاز مصیبت ہے قیامت انجام

اس کے ہاتھوں میں بیماری حرماں کی دوا — جس قدر مورت لگا بیٹھا ہے انجاح مرام

مرحبا شان کرم فیہ شفاء للناس — حبذا فیض اتم فیہ صلاح للعوام

حافظ و حاذق و یکتائے زماں اجمل خاں — کاملِ فاضل و فرزانہ فہیم و فہّام

اس سے چمکا مہِ انور میں جمالِ احساں — اس سے پایا شہِ خاور نے کمالِ انعام

فیض و ایثار و کرم جس کے خطوطِ کفِ دست — علم و تمکین و ادب جس کے نقوشِ اقدام

توسنِ طبع کی شوخی کا ٹھکانا ہے کیا — میں چلا آپ سے اور ہاتھ سے چھوٹی ہے لگام

صاحبا فیض پناہا دعقیدت گاہا — میری امید نے باندھا ترے در پر احرام

تیری توضیح بیاں صبحِ بہارِ اعجاز — تیرا ابہامِ سخن غنچۂ شاخِ الہام

تیری تعلیم ہے اک رابطۂ حسنِ عمل — تیری ترمیم ہے اک ضابطۂ حسنِ نظام

مے معنی سے ہو تار و شنی بزمِ حواس — دشمنِ افعالِ دماغی کا ہو جنگِ سرسام

تو ہو اور نشۂ فیضانِ الٰہی کا عروج — ہر بد خواہ کے حصے میں نزولِ آلام

(انتخاب قصیدہ فارسی در مدح نواب صاحب بہادر رامپور)

تاجِ سکندری کہ بہ کیواں برابر ست — بافاکپائے خسروِ دوراں برابر ست

در پیشگاہِ قہر سیاست گرائے او — ہر دو جہان بہ پیکرِ بیجان برابر ست

در جلوہ گاہ لطفِ تسلی فزای او — حنظل بہ شہد و زہر بہ درمان برابر ست

وقتِ خرام تازگی نقشِ پای او — بانوبہارِ گلشنِ رضوان برابر ست

در کارگاہِ عقل بہ فتوای اعتقاد — آئینِ تو بہ حکمتِ یزدان برابر ست

حدِ ادب شناس وفاؔ مختصر بگو — حرفیکہ با دعاے فراوان برابر ست

تا غنچۂ تبسم رنگین نگارِ حسن — اندر شگفتگی بہ گلستان برابر ست

دلہای دوستان ہوا خواہ تازہ باد
آں تازگی کہ با گلِ خنداں برابر ست

وفاؔ کی فارسی غزلوں میں چونکہ کوئی خاص خوبی نہیں ہے اس لئے ان کا انتخاب بھی اس موقع پر نظر انداز کیا جاتا ہے۔

(فروری ۱۹۱۰ء)

اقبال کے بارے میں:

زمانہ کے اکتوبر نمبر میں اڈیٹر صاحب نے شعرائے حال کے نام سے ایک سلسلۂ مضامین شروع کیا تھا۔ اس سلسلہ میں حضرت اکبر کی شاعری پر ریویو ہو چکا ہے۔ اب نومبر نمبر میں ڈاکٹر اقبال کے کلام پر تنقید کی گئی ہے اور ان کے کلام کے نمونے بھی درج کئے گئے ہیں۔ منشی دیا نرائن نگم اکبر اور اقبال کے خیالات اور طرز کلام کا مقابلہ یوں فرماتے ہیں:

"اکبر اور اقبال کی شاعری کی دنیا ایک دوسرے سے بالکل جدا اور نرالی ہے۔ اکبر قومی معاشرت کا مصلح اور اقبال روحانی شانتی کا منادی ہے۔ اکبر مغربی تہذیب کی کورانہ تقلید کا مضحکہ اڑاتا ہے وہ ہنسی ہنسی میں تنبیہ کرتا ہے، تاکہ ہمارے طرز معاشرت اور تہذیب کا اصلی اور وطنی جوہر مفقود نہ ہونے پائے۔ وہ محب وطن ہے اور جب دیکھتا ہے کہ قومی معاشرت اصلیت اور مشرقیت سے خالی ہو رہی ہے تو کراہنے لگتا ہے۔ اکبر کی تمام عمر اس کوشش میں گذری ہے کہ ہمارے جسد قومی پر مغربیت کا ملمع نہ چڑھنے پائے۔

اقبال کا نقطۂ خیال اس سے بھی بلند ہے۔ اس کی دنیائے شاعری بالکل نرالی ہے وہ مجاز کی پرواہ ہی نہیں رکھتا، صرف حقیقت کی طرف دیکھتا ہے۔ مجاز اور حقیقت کے امتیاز سے اس کی آنکھیں ہر وقت پرنم رہتی ہیں۔ ع

اشک کے دانے زمینِ شعر میں بوتا ہے وہ

اقبال کے لئے دنیا کی ظاہری ترقی ایک فنا ہونے والی شے ہے اور وہ کسی اور چیز کا متوالا ہے۔ اسی کی تلاش و جستجو میں وہ سرگرداں رہتا ہے اور جب اسے نہیں پاتا تو رو دیتا ہے اور اس کی آہ و زاری اشعار بن جاتی ہے۔ اقبال اس بلبل کی مثال ہے جس کو اپنے پر ہی قفس معلوم ہوتے ہیں۔ اکبر طرز معاشرت میں قوم کو قید فرنگ سے آزاد دیکھنا چاہتا ہے۔ اقبال قید حیات سے مکدر رہتا ہے وہ زندگی کو ایک منزل خیال کرتا ہے۔ آخرت کی موت کو زندگی جاوید کی ابتدا سمجھتا ہے۔ موت سے بھی اسے لڑنے میں عار نہیں اور اپنے خدا سے بھی حق پر حجت اور تکرار کرنے میں تامل نہیں۔ وہ روحانی نجات کو بخشش ربانی کی طرح نہیں مانگتا وہ اپنے آپ کو اور اپنی قوم کو اس کا اہل اور اس کا حقدار بنانا چاہتا ہے۔ وہ کبھی کبھی خدا کے سامنے دستِ سوال پھیلاتا ہے۔ لیکن ہمیشہ بے نیازی اور خودداری کا پہلو لئے ہوئے اس کی مثال اس فقیر کی سی ہے، جو ایثار نفس خلوص نیت اور صدق عقیدت کی رضاعت رکھتا ہے اور اسی لئے وہ اپنی روح پُرفتوح کی عظمت سے واقف ہے۔

ماہنامہ نقیب بدایوں

نقیب (اکتوبر۔ نومبر اور دسمبر ۱۹۲۰ء) نقیب کے اکتوبر اور نومبر نمبر ایک ساتھ اور دسمبر نمبر علٰحدہ تینوں ایک ہی ماہ کے اندر شائع ہوئے ہیں۔ ان تینوں پرچوں میں کئی مضامین قابل تذکرہ ہیں "یہ روغن قاز" از محمد عظمت اللہ خان صاحب اور "عالم ارواح" از سلطان حیدر صاحب جوشؔ، دونوں مضامین دلچسپ ہیں اور اپنے رنگ میں اچھے ہیں۔ آخر الذکر کا تذکرہ کرتے ہوئے مدیر رسالہ تحریر فرماتے ہیں کہ "نومبر نمبر میں نقیب کی خصوصیت اس مختصر اور دلچسپ قصے سے قائم ہے جس کو جناب جوشؔ نے عالم ارواح سے موسوم کیا ہے۔ جناب جوشؔ اگر ادق نگاری میں ایک طرف طبع رواں کے جوہر دکھا سکتے ہیں تو سادہ نگاری میں بھی دوسری طرف موتیوں کے انبار لگا سکتے ہیں۔ بحث صرف یہ ہے کہ آئندہ وہ طریقہ اختیار کیا جائے جو خود ان کو یا ان کے معدودے چند احباب کو پسند ہے، یا یہ سیدھا سادھا طرز جس کو میرے اصرار پر اس قصہ میں اختیار کیا ہے۔ یہ ووٹ کا معاملہ ہے۔ ہمارا ووٹ ہمیں افسوس ہے کہ مدیر رسالہ کے خلاف جائے گا۔

"ہندو کے مختلف مذاہب" پر عزیز آسیوانی صاحب نے ایک مفصل اور دلچسپ مضمون لکھا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ صاحب مضمون نے اہلِ ہنود کے مذاہب و فلسفہ سے واقف ہونے کی کوشش کی ہے جو اس امر کو مدنظر رکھتے ہوئے کہ اہل اسلام بالعموم اس طرف سے بالکل لاپرواہ ہوتے ہیں قابل تحسین ہے محمد یمین صاحب نازشؔ بدایونی نے حکیم مرزا آغا حسن ازلؔ لکھنوی کے کلام اور بالخصوص ان کی مثنوی سحرِ عشق پر تبصرہ کیا ہے، جو خوب ہے۔ ناظرین کی دلچسپی کی غرض سے بعض اقتباسات پیش کئے جاتے ہیں۔ مضمون کی تمہید یہ ہے:

"گذشتہ لکھنو کی خوبصورتی اور دلفریبی کا نظارہ ایسا نہیں ہے جو تاریخی اوراق الٹنے سے ایک انجام بین انسان کے دل پر حیرت نہ طاری کر دے۔ زمانہ کا انقلاب صاف بتا دیتا ہے کہ قومیں کس حالت میں پیدا ہوتی ہیں، کیونکر ترقی کرتی ہیں اور کس طرح عروج کی سطح سے گر کر زوال کی نذر ہو جاتی ہیں۔ جس طرح درختوں اور پھولوں کا نشو و نما اس بات پر ہے کہ تراش خراش سے ان کو خوشنما بنایا جائے، اسی طرح ملکی واقعات کی زندگی کا

دار ومدار ان لوگوں پر ہے جو اقوام کو گھٹا ٹوپ تاریکی سے نکال کر ان کو بہترین شاہراہ دکھا سکیں۔ قانون قدرت ہر ایک چیز کے انتہائے کمال کو تنزل کا ہیولا بنانے میں بلا کا مشاق ہے۔ کسی زمانے میں لکھنؤ اور دہلی ہندوستان کے عروس البلاد مشہور تھے اور ان کی صنعتیں دیکھ کر سیاحوں کی آنکھیں کھل جاتی تھیں۔ یہ دونوں شہر علوم وفنون کا مرکز تھے۔ ان کی شاندار عمارتیں آسمان سے باتیں کرنے والے محل اب تک موجود ہیں جو اپنی شکستہ زبان سے اگلے جاہ وجلال کے مٹے ہوئے نقش ونگار دکھا رہے ہیں اور گذشتہ تہذیب وشائستگی کی یاد کو تازہ کر رہے ہیں۔

لکھنؤ میں جہاں ہر فن کے کامل موجود تھے وہاں شاعری نے بھی اس کی شان اور خوبصورتی میں چار چاند لگا دیے تھے۔ میر تقی طالب، میرزا رفیع سودا، میر حسن حسرت، غلام ہمدانی مصحفی، غرض جس قدر چوٹی کے شاعر تھے وہ دلی اجڑنے کے بعد لکھنؤ میں آباد ہو گئے تھے۔ شاعری ایک حسین اور پری جمال ملکہ تھی جس کے نورانی شعاعوں نے دماغ اور ذہن کو منور کر دیا تھا۔ بادشاہ سے لے کر رعیت تک سخن کے جام سے سرشار تھے اور فارغ البالی نے خیالی میدان کو نہایت وسعت دے دی تھی۔

لکھنؤ کی عام شاعری مبالغہ اور الفاظ پرستی میں بدنام ہے۔ لیکن یہاں ایسے حضرات بھی ہر دور میں موجود رہے ہیں جنہوں نے قدرت کی مصوری کا حق ادا کرنے میں کوئی بات اٹھا نہ رکھی۔ مرثیہ گوئی کے فن کو چھوڑ کر حضرت آتش مرحوم کے تغزل سے قطع نظر کرتے ہوئے ہم حکیم نواب میرزا شوق مرحوم مصنف "زہر عشق" کا نام لیتے ہیں جن کی شاعری اس بات کا ثبوت ہے کہ ایشیائی شاعر قدرت کے مناظر اور فطرت کے راز بتانے میں کسی طرح عاجز نہیں ہے اور اردو زبان میں بھی اتنی قدرت ہے کہ وہ انسانی زندگی کا عمدہ نقشہ کھینچ سکے۔ مولانا حالی مرحوم نے حضرت شوق مرحوم کے کمالات کا اعتراف کرتے ہوئے مثنویات پر جو ریویو کیا ہے وہ ادبی دنیا میں نہایت وقیع نگاہوں سے دیکھا جاتا ہے۔

حکیم آغا حسن ازل بھی شوق مرحوم کے سرچشمۂ فیض کی ایک پرجوش موج تھے جنہوں نے شاعری کے اسٹیج پر قدم رکھ کر ان کی شاگردی کا حق ادا کر دیا۔ آپ لکھنؤ کے متاخرین شعرا میں

کسی سے کم نہ تھے۔ جملہ اصنافِ سخن پر قادر تھے۔ غزل، قصیدہ، خمسہ اور مسدس بھی کہتے تھے، مگر مثنوی ان کا خاندانی حق تھا جس کو خوب نبھایا۔ حکیم صاحب مرحوم لکھنو کے نواب زادے تھے۔ نواب میرزا کے قریبی رشتہ دار تھے۔ فنِ سخن میں انہیں سے تلمذ تھا۔ کلام کا رنگ، زبان میں محاورات کی خوبی، بے تکلف الفاظ کی روانی، خیالات کی طرز بتا رہی ہے کہ آپ نے زمانے کے حوادثات کا اچھی طرح مطالعہ کیا تھا اور ازل کے دن سے اپنے پہلو میں چوٹ کھایا ہوا دل رکھتے تھے۔

حکیم مرزا آغا حسن کے سوانح زندگی کا مختصر تذکرہ کرنے کے بعد "سحرِ عشق" کی بابت فرماتے ہیں:

"سحرِ عشق" کے ہر مصرعے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کے پردے میں نواب میرزا بول رہے ہیں۔ محاورہ بندی، روزمرہ، بیان کی روانی، شوخی اور دلگدازی میں یہ تصنیف بھی اردو لٹریچر کے لئے مایۂ ناز ہے۔ اگرچہ زہرِ عشق نقشِ اول ہے، تو یہ نقشِ ثانی ہے۔ لیکن یہ مثنوی زہرِ عشق کی طرح مقبول بھی نہ ہوئی تھی کہ اتفاق سے اسی سال حکیم صاحب کا انتقال ہو گیا اور عشق کے بولتے ہوئے جادو نے انہیں عمر بھر کو شہرِ خموشاں میں سلا دیا۔

وطن کی یاد: حکیم صاحب نے اس مثنوی کے آغاز میں موجودہ لکھنو کی جو دردناک تصویر کھینچی ہے اس کو پڑھ کر یہ معلوم ہوتا ہے کہ شاعر حب الوطنی کے رنگ میں ڈوب گیا ہے۔ اونچے میناروں اور اپنے شہر کے در و دیوار پر آنسو بہا رہا ہے۔ گری ہوئی اینٹوں کو اپنے دامن میں لے رہا ہے اور گذشتہ اقبال کا ماتم کر رہا ہے۔ انقلاب کا مہیب دیو اس کے سامنے کھڑا ہوا ہے اور وہ اس کی تصویر کھینچ رہا ہے۔ بعض اشعار یہ ہیں:

پاس تھا جن کے مال اور دولت — ہم سے بد تر ہے اُن کی اب حالت
جو کوئی ان کے پاس جاتا ہے — دیکھ کر حال رونا آتا ہے
ہیں نشاں در پہ اب نہ نوبت ہے — کچھ نہ پوچھو کہ ان کی کیا گت ہے
بدلی اس جنس کی ہوا ہے آج — دانہ دانہ کو رہتے ہیں محتاج
اب یہ حالت ہے ان کی یہ احوال — نہ ہنر کام آتا ہے نہ کمال
پوچھتا کون ہے لیاقت کو — بیچے بیٹھا کرد شرافت کو
کہیں جاتے ہیں اٹھ کے گھر سے کب — بیٹھے رہتے ہیں بس سکوت میں سب

کھانے پینے سے کیا علاقہ ہے — دن کو روزہ ہے، شب کو فاقہ ہے
پوچھتے ہیں جو اُن سے ہم جا کر — کیا ہوا آپ کا وہ مال و زر
ڈیوڑھی آتی ہے کیوں نظر ویراں — ہے ملازم کوئی نہ اب درباں
کیا ہوا کچھ بتائیے للّٰہ — وہ حشم آپ کا وہ عز و جاہ
کہتے ہیں اب کہاں وہ بات رہی — نہ تو وہ دن رہے، نہ رات رہی
کیسی دولت اجی مکاں کیسا — بے نشاں ہو گئے، نشاں کیسا
پاس مونس ہے یار حسرت ہے — یہ وہ نوبت تھی، آج یہ گت ہے
چرخ نے جب ذلیل و خوار کیا — ہم نے بھی صبر اختیار کیا
مثلِ نقشِ حباب تھا وہ عیش — کیا کہیں اب کہ خواب تھا وہ عیش
کیا کہیں آہ اِک فسانہ ہے — اب نہ وہ ہم نہ وہ زمانہ ہے
یاد کس کو کریں کسے روئیں — جان کس کس کے واسطے کھوئیں
اپنے ہم بزم ہمنشیں نہ رہے — وہ مکاں اور وہ مکیں نہ رہے
تھے جو وا ماندہ اپنے کچھ احباب — اُن کو پوچھا تو بس ملا یہ جواب
قافلہ وہ عدم روانہ ہوا — ان کے مرنے کو اک زمانہ ہوا
جس جگہ تھے مکان عالیشاں — نظر آتا ہے اب وہ ہُو کا مکاں
اب وہ جنگل ہے، راستہ ہی نہیں — صاحبِ خانہ کا پتہ ہی نہیں
پوچھتے ہیں جو دوستوں کے نشاں — کہتے ہیں کُلُّ مَنْ عَلَیْہا فَان

ہائے جلسہ وہ کو بکو نہ رہا
لکھنؤ اپنا لکھنؤ نہ رہا

آگے چل کر "سراپا" ملاحظہ ہو:

سراپا: مشرقی شاعری میں سراپا نگاری نازک خیالی کا زبردست عنصر قرار دی گئی ہے۔ اثرؔ مرحوم نے قصہ کو ہیروئن کا سراپا کرنے میں اپنے سادہ رنگ کو ہاتھ سے نہیں دیا ہے۔ اس موقعہ پر دو چار شعر لکھے جاتے ہیں:

کیا کہوں کس طرح کی صورت تھی — شکل تھی یا خدا کی قدرت تھی
قد میں انداز سب قیامت کا — زلف میں رنگ شام فرقت کا
شوخیوں میں ادا، ادا میں ناز — انکھڑیوں میں حیا، حیا میں ناز
چشم بد دور سرمگیں آنکھیں — ایسی دیکھی نہیں، کہیں آنکھیں
ہائے کیا وہ رسیلی آنکھیں تھیں — مست تھیں یا نشیلی آنکھیں تھیں
وہ رخِ صاف اور سیاہ وہ بال — جان عاشق کے واسطے جنجال
دیکھنے والے کہتے تھے یہ بات
اس طرف دن ہے اُس طرف ہے رات

بیٹی کی لاش پر ماں کا بین : زمانۂ حال کی تہذیب ایسے افسانوں کو حقارت سے دیکھتی ہے۔ دنیا کی تبدیلی علم و ادب میں اس شُہدپن کی روادار نہیں۔ تعلیم کے اضافہ سے اخلاق میں ترقی ہوتی جاتی ہے۔ اقوام اچھی کتابوں کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر پڑھتی ہیں لیکن مشرقی شاعری کے پُرانے ذخیرے میں بعض ایسے جواہرات پوشیدہ ہیں جن کی حفاظت نہ ہوئی تو وہ بالکل نیست و نابود ہو جائیں گے۔ ازل نے مثنوی سحرِ عشق کے آخر میں "ماں کی فطرت" کا نقشہ اتارتے ہوئے جذبات اور تاثیر کا دروازہ کھول دیا ہے۔ کون ہے جو اس کو پڑھے اور دل تھام کر نہ رہ جائے۔ ماں کو جب اپنی بیٹی کے مرجانے کی خبر ہوتی ہے، تو وہ بال بکھیرے ہوئے لاش پر آتی ہے اور اس طرح بین کرتی ہے :

ماں کا واری نہ کچھ خیال کیا — ہے پیاری نہ کچھ خیال کیا
بدلے سہرے کے ہائے رشک قمر — قبر پر پھولوں کی پڑی چادر
ایسی جلدی تھی تم کو جانے کی — راہ دیکھی نہ ماں کے آنے کی
دن سفر کرنے کے ابھی تو نہ تھے — تیرے دن مرنے کے ابھی تو نہ تھے
چھوٹ کر تم سے غم اٹھاتی ہوں — تم چلو بیٹا، میں بھی آتی ہوں
آؤ چھاتی سے میں لگاؤں تمہیں — کچھ خفا ہو تو میں مناؤں تمہیں
تم پہ کیا کیا کہوں، بلا گذری — اس اندھیری لحد میں کیا گذری

میری ناشاد میری بُرا ار ماں — میں جیوں، تو مرے، خدا کی شان
جان میری لبوں پہ آئی ہے — کچھ تو سنتی نہیں دُہائی ہے
میری باتوں کا رنج و غم ہے اگر — میرے کہنے کا کچھ الم ہے اگر
عذر کرتی ہوں دل کو صاف کرو — میری پیاری خطا معاف کرو
فائدہ کچھ نہیں ہے رُکنے سے — آؤ لگ جاؤ میرے سینے سے
اے مری گودیوں کی پالی ہائے — میری پیاری مرادوں والی ہائے
میری زلفیں سنوارنے والی — میری اُماں پکارنے والی
چُپ نہ ہو اس طرح سے بات کرو — اپنی اماں سے التفات کرو
میری ہٹ کرنے والی منھ سے بول — اے مری مرنے والی منھ سے بول
ماں ہے برباد، کچھ جواب تو دے — اری ناشاد کچھ جواب تو دے
اے مری چاند، میری ماہ منیر — آنکھوں میں پھرتی ہے تری تصویر
ڈھونڈھتی تھی یہی بہانہ مرگ — پھٹ پڑیں اے مری جوانا مرگ
کیوں نہ آنکھوں میں ہو نگر سونا — ہو گیا آج میرا گھر سونا
ہائے وہ وقتِ خواب تیری ہٹ — میری اماں ادھر کو لو کروٹ
روشنی ہوتی تھی جو رات کو گُل — کیسا اُٹھ اُٹھ کے کرتی تھیں تم غُل
آج کچھ تم کو ڈر نہیں بی بی — کچھ کسی کی خبر نہیں بی بی
میری بستی اجڑ گئی بیٹا — میری قسمت بگڑ گئی بیٹا

خوف سے چونکنا نہ گھبرا کر
چین سے سوؤ پاؤں پھیلا کر

انہیں نمبروں میں حضرت اکبر الہ آبادی کا کچھ تازہ کلام بھی شائع ہوا ہے۔ ملک کی موجودہ صورتِ حال کو حضرت اکبر نے اپنے مخصوص رنگ میں چند اشعار میں خوب بیان کیا ہے۔ ملاحظہ ہو:

نئی روشنی کا ہوا تیل کم — حکومت نے اس سے کیا میل کم
اِدھر مولوی کس مپرسی میں تھے — نہ آفس میں تھے اور نہ کرسی میں تھے

یہ ٹھہری کہ آپس میں مل جائیے سیاسی کمیٹی میں چل جایئے

اسی میل کا آج کل ہے ظہور

خدا جانے ظلمت ہے یہ، یا کہ نور

نقیب کے دسمبر نمبر میں صرف ایک مضمون اچھا ہے۔ حامد اللہ صاحب افسرؔ نے "عہد مغلیہ میں ہندوستان میں ترویج تعلیم" کے عنوان سے ایک بسیط مضمون لکھا ہے۔ اس امر کو مد نظر رکھتے ہوئے کہ صاحب مضمون صرف ایف' اے کلاس کے طالب علم ہیں مضمون قابل داد ہے۔

(بذیل ہمارے معاصرین: جنوری ۱۹۲۱ء)

●●

کلامِ جوشؔ

شبیر حسن خان صاحب جوشؔ کے نام سے اُردو شاعری کے قدردان واقف ہیں۔ آپ فقیر محمد خان صاحب گویاؔ کے خاندان سے ہیں اور اپنے نامور مورث کی ریاست و شاعری دونوں کے ورثہ دار ہیں۔ حال میں آپ کے کلام کا مجموعہ شائع ہوا ہے جس کا نام "روحِ ادب" ہے۔ یہ مجموعہ نہایت شائستہ عنوان سے شائع کیا گیا ہے اور جابجا اکثر اشعار کی تشریح تصویروں سے کی گئی ہے۔ اُردو میں یہ ایک بالکل نئی بات ہے اور قابلِ قدر اضافہ ہے۔ مجموعہ کے شروع میں رفیع احمد خان صاحب ایم۔اے کے قلم کا لکھا ہوا مقدمہ ہے جس میں مصنف کے خاندانی حالات درج ہیں اور کلام کی خصوصیت پر بحث کی گئی ہے۔ ہمیں حضرت جوشؔ کی فکرِ سخن سے حظ اٹھانے کا اتفاق اکثر مشاعروں میں ہوا ہے اور یہ دیکھ کر خوشی ہوتی ہے کہ آپ نے اپنے کلام کے بکھرے ہوئے پھولوں کا ایک گلدستہ بنا کر قدردانانِ سخن کے سامنے پیش کیا ہے۔ آپ کی طبیعت کا رنگ قدرتی طور پر شاعرانہ ہے اور روحانی اور اخلاقی جذبات کا پرتو آپ کے کلام میں بہت نظر آتا ہے۔ جو لوگ ذاتی طور پر آپ کی شرافت و وضعداری سے واقف ہیں وہ آپ کی شاعرانہ بلند نظری کی زیادہ داد دے سکتے ہیں۔

اس زمانہ میں جبکہ پولیٹکل طوفان کے اثر سے صرف تباہی اور بربادی کی قوتیں ترقی پر ہیں اور علمی و ادبی مذاق کا چراغ گل ہو رہا ہے ہمیں یہ دیکھ کر مسرت ہوتی ہے کہ ایک ایسی نوجوان طبیعت بھی موجود ہے، جو دنیا کے گرد و غبار سے الگ ہٹ کر روحانی اور ادبی مشاغل کی طرف مائل ہے۔

تمثیلاً چند اشعار "روحِ ادب" سے لکھے جاتے ہیں جن کو پڑھ کر ہمارے احباب خوش ہوں گے:

کاروبار اپنی محبت کا وہاں ہو کر جہاں — قیمتِ جنسِ فرومایۂ منصور نہیں
اب کھلا راز درِ دوست پہ سجدہ کر کے — آسمانوں کی بلندی تو کوئی دور نہیں
داغِ ہستی کو بہر طور مٹا ہی دیں گے — اپنے دامن پہ یہ دھبا ہمیں منظور نہیں
جھلملاتے ہوئے تاروں میں یہ سنتا ہوں صدا — رونے والے میں ترے پاس ہوں کچھ دور نہیں

مسکراتے ہوئے آئے ہیں وہ میت پہ مری　　روح قالب میں پلٹ آئے تو کچھ دور نہیں
دیکھ لو بندِ کفن کھول کے تم ایک نظر　　اب نہ شرماؤ کہ آنکھوں میں مری نور نہیں

بے ہوشیوں نے اور خبردار کر دیا　　سوئی جو عقل روح کو بیدار کر دیا
فطرت نے شام ہوتے ہی دنیا کو روک کر　　آئینۂ ثوابت و سیار کر دیا
ہم جن تصورات میں بہتے ہیں رات دن　　کتنوں کو اس جنون نے بیکار کر دیا

آساں نہ ہوگا راس کسی کو نہ آئے عشق　　ہم کو تو تیرے درد نے انساں بنا دیا
دنیا بہت وسیع ہے لیکن مرے لئے　　آزادیٔ خیال نے زنداں بنا دیا

(رفتارِ قوم : فروری ۱۹۲۱ء)

●●

نوبت رائے نظر

یارانِ طریقت کی یاد

ناچیز نظرؔ کے قلم کو عرصے سے یہ خدمت سپرد کر دی گئی ہے کہ وہ یارانِ رفتہ کا ماتم کیا کرے۔ یہ خدمت جبری نہیں بلکہ اختیاری ہے اور اس قدر لذت آفریں کہ ترک کرنے کو جی نہیں چاہتا۔ جب ہجوم افکار اور دنیاوی مکروہات سے فرصت ملتی ہے، تو تھوڑا بہت وقت اس رنج افزا مشغلے میں بھی صرف کیا جاتا ہے۔ لیکن اب تک اس سلسلے میں جو کچھ ہوا ہے، وہ صرف اسی قدر کہ وقتاً فوقتاً بعض اساتذۂ لکھنؤ اور سخن سنج احباب کا فرداً فرداً ذکر کیا گیا ہے۔ آج لکھنؤ کے ایک پرانے مشاعرے کے ذکر کے سلسلے میں بہت سے ایسے احباب کی یاد تازہ کرنے کو جی چاہتا ہے، جو اب اس دنیا میں نہیں ہیں۔ لیکن ان کی یاد ہر وقت دل کو بے چین رکھتی ہے اور افسوس یہ ہے کہ اُن کی طباعی، خوشگوئی اور کمالات سے بیرونی دنیا تقریباً ناواقف ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ میرے کمزور قلم پر ان کا حق ہے اور اپنی بے بضاعتی کو محسوس کرتے ہوئے بھی جس قدر یہ حق مجھ سے ادا ہو سکتا ہے، اس کے ادا کرنے کی جرأت کرتا ہوں۔ اس سلسلے میں اکثر ایسے احباب کا بھی ذکر آئے گا، جو بفضلہ اب تک بقیدِ حیات ہیں، مگر چراغِ سحری ہو رہے ہیں اور معلوم نہیں کہ بادِ حوادث ان کی شمعِ حیات کو کب گل کر دے۔ بہت ممکن ہے کہ میں خود اُن سے پہلے سفرِ آخرت اختیار کروں اور اس طرح یہ آرزو پوری نہ ہو سکے۔

ہر نوع اب سے ۲۲ سال بیشتر "خدنگِ نظر" کے لئے ایک مشاعرہ کیا گیا تھا جسے یادگار مشاعرہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا۔ اس وقت تک لکھنؤ کے بعض مشہور اساتذہ بقیدِ حیات تھے اور خوشگو احباب کی بھی ایک خاص کثرت تھی۔ مصرعِ طرح حسبِ ذیل تھا:

ترس آتا ہے کس کس کو مرے حالِ پریشاں پر

اس طرح میں فخرالاساتذہ میرزا غالب مرحوم کی غزل یادگارِ زمانہ ہے۔ کوئی شک نہیں کہ یہ اپنے رنگ کے فردِ کامل تھے اور جس زمین میں طبع آزمائی کرتے اس میں دوسروں کے لئے بہت کم گنجائش چھوڑتے تھے لیکن "ہر گلے را رنگ و بوئے دیگر است" کے مطابق شعرائے لکھنؤ نے بھی دادِ سخن گستری دی تھی اور اسی

لاگ پر انہوں نے اپنی بہترین فکر صرف کر کے غزلیں کہی تھیں۔ تقریباً پچاس شاعر جن پر لکھنؤ کی شاعری کو ناز تھا، اس مشاعرے میں شریک تھے۔

حضرت رشید مرحوم ایسے گوشہ نشین شاعر بھی اس مشاعرے میں تشریف فرما تھے، جو باوجود بجد اصرار کسی مشاعرے میں شریک نہیں ہوتے تھے۔ حضرت مظہر مغفور ان کے قریب ہی رونق افروز تھے۔ حضرت فصاحت، حضرت انجم، مولانا صفی، مرزا ہادی صاحب بی اے۔ میر ذاکر حسین صاحب یاس، حکیم بارق، مولوی صادق علی خاں مائل، سید باقر صاحب حمید، سید ابو صاحب جلیس، سید مہدی صاحب حبیب، نواب سید عسکری مرزا خاں صاحب بلیغ، حکیم علی محسن خاں اثر، سید منجھو صاحب آرزو، مرزا کاظم حسین محشر، مرزا مہدی علی خاں ثمر، سید محمد اصغر رسوا، نواب باقر علی خاں شائق، سید احسن مرزا شر رمہدی، سید اچھے صاحب شہرت، سید علمدار حسین عابد، حکیم سید محمد مہدی صاحب کمال خلف حضرت جلال، سید فرزند حسین ذاخر اور دیگر شعرائے خاص اس بزم کی رونق کا باعث تھے۔ حضرت مشتاق مرحوم جن کا ذکر خیر اس سے پہلے "صبح امید" میں کیا جا چکا ہے مشاعرے میں نہیں آئے تھے لیکن اپنے مکان پر ایک جداگانہ مشاعرہ کر کے جس میں حضرت رشید، حضرت مظہر اور بعض دیگر اساتذہ تشریف رکھتے تھے، اپنی غزل سنائی تھی۔ مولانا صفی صاحب نے طرح میں غزل نہیں فرمائی تھی لیکن جو غیر طرح غزل آپ نے پڑھی تھی اس کا دلکش مطلع راقم کو اب تک یاد ہے:

ناحق نشانہ باندھ کے قاتل ٹھہر گیا — کہدو لگائے تیر، مرا دل ٹھہر گیا

کوئی شک نہیں کہ باعتبار تخیل غالب مرحوم کے مندرجہ ذیل شعر آپ اپنی نظیر ہیں:

لرزتا ہے مرا دل زحمت مہر درخشاں پر — میں ہوں وہ قطرۂ شبنم جو ہو خار بیاباں پر

نہ چھوڑی حضرت یوسف نے یاں بھی خانہ آرائی — سفیدی دیدۂ یعقوب کی پھرتی ہے زنداں پر

بجز پرواز شوق ناز کیا باقی رہا ہوگا — قیامت اک ہوائے تند ہے خاک شہیداں پر

میری رائے میں زور نظم اور اعلیٰ تخیل کے لحاظ سے غالب نے ان قافیوں کو ختم کر دیا ہے لیکن جن لوگوں نے اس طرح میں محنت کر کے غالب کے بعد داد سخن گستری دی ہے ان کا اعتراف نہ کرنا بھی سخت بد اخلاقی ہے۔ میں کوشش کروں گا کہ نازک خیالی کے اعلیٰ سے اعلیٰ نمونے پیش کر کے یہ ثابت کروں کہ غالب کے بعد اس طرح میں جس قدر گنجائش تھی اس کی حد کاملین لکھنؤ نے دکھا دی ہے۔

حضرت رشید جن کا انتقال گذشتہ سال ہوا ہے اساتذۂ لکھنؤ میں

خاص پائے کے شاعر تھے۔ مرحوم کی شیوا بیانی کا شہرہ اردو شاعری کی دنیا کے ہر گوشے میں پھیلا ہوا ہے۔ اُن سے زیادہ خاندانی شاعر شاید ہی کوئی اور لکھنؤ میں نکل سکے۔ آپ کے جد امجد سید محمد مرزا صاحب اُنس امام الشعرا ناسخ کے شاگرد رشید تھے اور والد ماجد سید احمد مرزا صاحب صابر اپنے پدر بزرگوار سے تلمذ رکھتے تھے۔ میاں عشق اور سید صاحب تعشق ایسے خلاق المعانی آپ کے حقیقی چچا تھے۔ خدائے سخن میر انیس مغفور آپ کے حقیقی نانا تھے۔ آپ کو غزل اور مرثیہ دونوں میں یکساں ید طولیٰ حاصل تھا اور اپنے نامور بزرگوں کی مایۂ ناز یادگار تھے۔ آپ کے انتقال سے لکھنؤ کی شاعری کا چراغ اگر بالکل بجھ نہیں گیا ہے، تو جھلملانے ضرور لگا ہے۔ مشاعرۂ مذکور میں جو غزل آپ نے پڑھی تھی، اس کے بعض اشعار حسب ذیل ہیں، جن سے آپ کے زور تخیل اور شاعرانہ مرتبے کا اندازہ ہو سکتا ہے:-

پس مردن رہائی کا ہے غم دلہائے نالاں پر — وفاداروں کی روحیں روتی ہیں درہائے زنداں پر
ترا وحشی فقط ہے منتظر اک خندۂ گل کا — نظر سوئے چمن ہے ہاتھ رکھا ہے گریباں پر
زلیخا حال کی اپنے خبر دیتی تھی یوسف کو — کہ جب کی آہ گھر میں، برق چمکی آ کے زنداں پر
گلے پیدا ہوں لاکھوں اب بھی یہ شوق شہادت ہے — وہ چھڑکیں تیغ کا پانی اگر خاک شہیداں پر
نشاں خونریزیوں کا دے رہے ہیں سرخ لب تیرے — شہیدوں کے ہیں لاشے سرحد شہر خموشاں پر

آغا محمد وصی علی خاں صاحب مظہر جنہیں عرف عام میں آغا مظہر کہتے تھے اپنے رنگ کے فرد کامل اور لکھنؤ کے مایۂ ناز اساتذہ میں تھے۔ استاذ الاساتذہ منشی محمد اسمٰعیل حسین منیر شکوہ آبادی سے تلمذ حاصل تھا، عمر بھر اکتساب فن کی تشنگی رہی۔ ہر وقت شعر و سخن ہی کی فکر میں مستغرق رہتے تھے۔

طبع رسا اور کمال فن کی بنا پر اپنے ذاتی تخیل پر ناز تھا اور حتی الامکان اپنے کلام کو دیگر شعرائے ممیز رکھنے کی خاص کوشش کرتے تھے۔ مرحوم کی شیوا بیانی کا ہر سخن سنج معترف تھا۔ آخر آخر دربار رامپور سے تعلق ہو گیا تھا اور عمر کے آخری ایام وہیں بسر ہوئے۔ آپ کے کلام کا تمام ذخیرہ بھی وہیں رہ گیا۔ مشاعرۂ مذکور میں جو غزل آپ نے پڑھی تھی اُس کے بعض اشعار حسب ذیل ہیں:

نہ پہنچے دست تاراج جنوں میرے گریباں تک — لہو سر کا پڑا ہے اُڑ کے داماں و گریباں پر
چلا ہے جوش کھا کر خون دل مہندی لگانے کو — یہ کس نے ہاتھ رکھا بیخودوں کی چشم گریاں پر
بہاروں کو ہے گا بادۂ یاقوت احمر کا — ہوا جاروب کش ہے آج پھر قبر شہیداں پر

خبر دیتی ہے تیزی دھوپ کی آمد خزاں کی ہے　　ہزاروں بلبلیں چھائی ہیں پر کھولے گلستاں پر

دو داغ اے درد کی لذت سیاہی آ گئی زخموں پر　　عرق نے زلف کے زہراب چھڑکا ہے نمکداں پر

سید صبا حسن صاحب فصاحت، مشہور زمانہ حضرت امانت مغفور کے فرزند اصغر ہیں۔ آپ کی استادی اور کہنہ مشقی محتاج تصریح نہیں۔ آپ کے تلامذہ کی شہر اور بیرونجات میں خاص کثرت ہے۔ عرصے سے شغل شاعری ترک کر دیا ہے اور مشاعروں میں تشریف نہیں لے جاتے۔ مشاعرۂ مذکور میں آپ نے جو غزل پڑھی تھی اس کے دو شعر ہدیۂ ناظرین کیے جاتے ہیں :

کسی عالم میں وحشت کو نہ چھوڑا واہ ری عادت　　رہا تصویر میں بھی ہاتھ مجنوں کا گریباں پر

نہیں یہ شام وصلت شام سے تارے نکل آئے　　فلک بھی ہنس پڑا مجھ بے سر و ساماں کے ساماں پر

نواب سید بہادر حسین خاں انجم جن کا اسی ماہ کے اوائل میں انتقال ہوا ہے، حضرت امیر مرحوم کے شاگرد رشید اور لکھنؤ کے مسلم الثبوت شعرا میں تھے۔ شاعری کے علاوہ فن فوٹوگرافی میں بھی ید طولیٰ رکھتے تھے۔ شعرائے قدیم و جدید کی عکسی و قلمی تصاویر کا ایک بڑا ذخیرہ مرحوم کے پاس تھا۔ ذیل کے اشعار سے آپ کی شیوا بیانی کا اندازہ ہو سکتا ہے :

دروغ مصلحت آمیز ہے کچھ زندگی اپنی　　وگرنہ کون جی سکتا ہے اس کے عہد و پیماں پر

اب اتنی بھی ہنسی کو زخم کمزوری میں ترستے ہیں　　جو قوت میں کبھی آ جاتی تھی خالی نمکداں پر

عروج نامہ بر سے اک رقابت ہو گئی پیدا　　کبوتر نے فلک باندھا زمین کوئے جاناں پر

فلک نے قبر الگ بنوائی تو کیا ہرج ہے انجم　　ہماری روح پھرتی ہے زمین کوئے جاناں پر

پروفیسر مرزا محمد ہادی صاحب بی۔ اے جو پچھلے سال نظام یونیورسٹی کے پروفیسر کے طور پر حیدرآباد دکن تشریف لے گئے ہیں۔ لکھنؤ کے ان جدت طراز عالی خیال شعرا میں ہیں جنہوں نے طرز جدید کی بنیاد ڈال کر قدیم رنگ سخن کی کایا پلٹ کر دی ہے۔ آپ کو مرزا اوج مرحوم ایسے قادر الکلام استاد فن سے تلمذ حاصل تھا۔ ایک عالم اور فلسفی کی حیثیت سے آپ کا پایہ بہت بلند ہے۔ ذیل کے اشعار آپ کے فلسفیانہ مذاق اور شگفتگی بیان کے شاہد ہیں :

نگاہ مہر ہے عالم کے اجزائے پریشاں پر　　ہر اک ذرے کا حق ثابت ہے خورشید درخشاں پر

فنا کے بعد بھی چھوٹا نہ میں قید تعلق سے　　مری تصویر کھچوائی گئی دیوار زنداں پر

نہایت خوش ہیں اپنے دل میں ہم ذوقِ جراحت سے ۔۔۔ لگا دے چارہ سازی کا کوئی تہمت نمکداں پر

نہ تھا ابرِ دباراں سے کوئی مطلب گریہ تھا ۔۔۔ قیامت تک فلک رویا کرے خاکِ شہیداں پر

سمجھتے کافرانِ عشق کی دشواریاں یہ بھی ۔۔۔ اگر طاعت بتوں کی فرض ہوتی اہلِ ایماں پر

میرزا ذاکر حسین صاحب یاسؔ حضرت جلالؔ مرحوم کے شاگرد رشید اور نہایت کہنہ مشق شاعر تھے۔ مشاعروں میں بہت ہی کم شریک ہوتے تھے۔ لیکن اس مشاعرے میں خصوصیت کے ساتھ تشریف لائے تھے۔ نہایت ہی صالح اور سیدھے سادے بزرگ تھے۔ آپ کے چند اشعار حسبِ ذیل ہیں:

تکلف سے بری رہتے ہیں دیوانے محبت کے ۔۔۔ پڑی ہے خاک کی چادر ہمارے جسمِ عریاں پر

تسلی بعد فرقت اس طرح دیتے ہیں وہ آکر ۔۔۔ مصیبت بھی کبھی دنیا میں پڑ جاتی ہے انساں پر

تواضع حضرت واعظ کی میخواروں کو لازم ہے ۔۔۔ جو ہے انکار پینے سے چھڑک دیں جیب و داماں پر

حکیم میر عنایت حسین صاحب بارقؔ پرانی وضع کے آدمی تھے جن کا حال ہی میں انتقال ہوا ہے۔ شاعری کے علاوہ فنِ حکمت میں بھی خاص دخل تھا، اپنی وارستہ مزاجی کے لئے خاص شہرت رکھتے تھے جس نے اُن کے علم وفضل پر پردہ ڈال دیا تھا۔ ذیل کے اشعار سے آپ کا رنگِ سخن واضح ہوگا:

نہ رخت زیست بھی رکھ لے جنوں اے جسمِ عریاں کو ۔۔۔ حسد تارِ نفس کو تا نہ ہو تارِ گریباں پر

نظر میں دشت پھرتا ہے جو زنداں میں ہوں اے وحشی ۔۔۔ سکوں مجھکو تو گردش کو ہے زحمت خود بیاباں پر

مولوی صادق علیخاں صاحب مائلؔ بھی زمانہ شاہی کی یادگار اور قدیم وضع کے بزرگ تھے۔ غدر کے بعد کلکتہ چلے آئے اور عرصۂ دراز تک آخری شاہ اودھ محمد واجد علی شاہ کی مصاحبت میں رہنے کے بعد آخری عمر میں پھر لکھنؤ میں واپس آ گئے تھے۔ روزانہ سہ پہر کو چوک میں ایک عطر فروش کی دکان پر آ بیٹھتے تھے اور اسے داخلِ وضع سمجھتے تھے۔ طرزِ قدیم کی شاعری میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔ آپ کے چند اشعار حسبِ ذیل ہیں:

بنے ہیں جب سے شیدا گیسو و رخسارِ جاناں پر ۔۔۔ نظر شیخ و برہمن کی نہیں ہے کفر و ایماں پر

سبب کیا ہے سوئے عاشق ترا ناوک نہیں آتا ۔۔۔ کہ واجب ہے قبولِ دعوتِ احباب مہماں پر

بہت عرصے سے میری فکر میں صیاد و گلچیں تھے ۔۔۔ گری شاخِ نشیمن جھک کے دیوارِ گلستاں پر

سید باقر صاحب تمیدؔ حضرت رشیدؔ مرحوم کے برادرِ اصغر ہیں اور خاندانی فضیلت کے علاوہ شاعرانہ فضل و کمال سے بھی اپنے نامور بزرگوں کی طرح مالا مال ہیں۔ آپ کے عم مکرم حضرت تعشقؔ مرحوم آپ پر خصوصیت

کے ساتھ مہربان تھے اور مشاعروں میں آپ کو اپنے ساتھ رکھتے تھے۔ اپنے بزرگوں کی طرح آپ کو بھی غزل و مرثیہ دونوں میں کمال حاصل ہے۔ طرح ہٰذا میں آپ کے بعض اشعار ذیل میں درج کیے جاتے ہیں:

ادب معشوق کا دستور ہے عشاق کرتے ہیں — پڑا دستِ زلیخا کس طرح یوسف کے داماں پر
وہ اپنے پاؤں کی مہندی کے کس درجہ معرف ہیں — سمجھتا ہوں یہ گویا طعن ہے خونِ شہیداں پر
غضب کے ہیں یہ جھگڑے دمبدم آنکھیں نہ جھپکاؤ — کہ رکھے ہیں دلِ عشاق نوکِ تیرِ مژگاں پر

اساتذہ کا ذکر کرنے کے بعد ان احباب کا ذکر کیا جاتا ہے، جن کی خوش بیانی نے فضائے شاعری کو مطلع انوار بنا دیا تھا اور مشاعروں کی خاص رونق سمجھے جاتے تھے۔ اب ان میں بہت سے اس دنیا میں نہیں ہیں اور اکثر ایسے ہیں جن کو یارانِ سخن سنج فراموش کر چکے ہیں۔ ان میں سید ابو محمد صاحب جلیس کا ذکر سب سے پہلے کیا جاتا ہے۔ جو خاندان میر انیس مغفور کے چشم و چراغ تھے۔ یہ حضرت انیس کے حقیقی پوتے اور جناب سلیس مرحوم کے فرزند ارجمند تھے۔ دوستی و محبت کی یہ حد جس سے ایک مرتبہ قائم ہو گئی عمر بھر اس میں کمی بیشی نہیں ہوئی۔ زبان کے سچے اور دل کے بہادر تھے۔ طبیعت ہر درجہ آزادی پسند۔ دوستوں سے بے تکلفی کی انتہا نہیں۔ چونکہ ان کا رمنہ تھا اور کہا کرتے تھے کہ میں عنقائے مضامین کا شکار نہیں کیا کرتا ہوں۔ سنجیدہ اور ظریفانہ دونوں قسم کی شاعری میں یدطولیٰ حاصل تھا۔ "خدنگ نظر" کی طرحوں میں ہمیشہ ایک ظریفانہ غزل بھی کہتے تھے جن کی خاص شہرت تھی۔ اس رنگ کی غزلوں میں ان کا تخلص "چناں" ہوتا تھا۔ تھوڑے عرصے کے بعد اس قسم کی غزلوں کا ایک مجموعہ "دیوان چناں" کے نام سے شائع بھی کیا تھا۔ طرح زیرِ بحث میں مرحوم کے چند اشعار درج ذیل ہیں:

بہار آئی پھر دل مائل ہوا وحشت کے ساماں پر — نظر میری کبھی زنجیر پر ہے، گاہ زنداں پر
سراپا سوختہ ہوں کشتۂ برقِ تبسم ہوں — جلا جاتا ہے کیونکر ہاتھ رکھوں قلبِ سوزاں پر
ہوئے ہیں غیر کر نقشِ قدم سیل فنا مجھ کو — ٹھہر سکتا نہیں دم بھر زمین کوئے جاناں پر
جفا کس لطف سے کرتا ہے مجھ پر چارہ گر بن کے — نظر ہے زخمِ دل پر ہاتھ ظالم کا نمکداں پر
مجھے رو کر کرے گا خون ظالم اک زمانے کا — جڑے جاتے ہیں پیکاں آنسوؤں کے تیرِ مژگاں پر

سید محمد مہدی صاحب جدید حضرت رشید لکھنوی کے سب سے چھوٹے بھائی تھے۔ نازک خیالی ان کی شاعری کی خاص خصوصیت تھی۔ خوشگویان لکھنؤ میں خاص درجہ رکھتے تھے۔ عین عالمِ شباب میں داعیِ اجل کو

لبیک کہہ گئے۔ ذیل کے اشعار سے ان کی نازک خیالی کا اندازہ ہوگا۔

ہمارے پارۂ دل کون سے ہیں خاک پہچانیں — پڑے ہیں سیکڑوں ٹکڑے زمینِ کوئے جاناں پر
تم آتے ہو یقیں سب کو ہوا چُپ ہو گئے قیدی — ذراسی روشنی دیکھی اگر دیوارِ زنداں پر
چراغِ حسن نے پایا فروغ اس کی تربت میں — مناسب تھا کہ ہوتی روشنی گورِ غریباں پر
خبر پھیلی ہے ایسی دستِ وحشت کی درازی کی — جسے ہم دیکھتے ہیں ہاتھ رکھے ہے گریباں پر

نواب سید عسکری مرزا خان صاحب بلیغ لکھنؤ کے نہایت عالی خاندان رؤسا میں ہیں۔ عالی نسبی اور شرافت خاندانی کے علاوہ شعر و سخن میں بھی اعلیٰ دستگاہ رکھتے ہیں۔ احباب پرستی ان کا خاص حصہ ہے۔ خلق و محبت، سیر چشمی و کشادہ دلی، پابندیٔ وضع، انکسار و تواضع ان کے خاص اوصاف ہیں۔ غزل، مرثیہ اور تاریخ گوئی میں ید طولیٰ رکھتے ہیں۔ احباب کے ساتھ بیٹھ کر غزل کہنے کا خاص شوق ہے۔ دوستوں کی خاطر مدارات میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کرتے۔ مشاعروں میں ان کی غزل خصوصیت کے ساتھ چمکتی تھی۔ ذیل کے اشعار آپ کے زورِ طبیعت اور خوش بیانی کے شاہد ہیں:

زمانے کی ترقی و تنزل بھی تماشا ہے — جو سر زانو پہ ان کے تھا وہ اب ہے پائے درباں پر
خیال آتے تھے ایسے حضرت یوسفؑ کی فرقت میں — تمنائے زلیخا رات دن صدقے تھی زنداں پر
فنا کے بعد بھی بس پائیں گے دل مرنے والوں کے — یہ کس انداز سے رکھا قدم گورِ غریباں پر
ہمارا قید ہونا اک نمائش گاہِ عالم ہے — جسے دیکھو نظر کرتا ہوا جاتا ہے زنداں پر

حکیم سید علی محسن خاں عرف ننھے آغا صاحب آبرؔ، شیخ محمد جان شادؔ پیرو میر کے ارشد تلامذہ میں تھے۔ چند سال پیشتر آپ کا انتقال ہوا۔ خوش گویانِ لکھنؤ میں ان کا خاص شمار تھا۔ میر و غالب کے رنگِ سخن کے دلدادہ تھے۔ شوقِ شاعری عشق کے درجہ تک پہنچا ہوا تھا۔ ہر مشاعرے میں دادِ خوش کلامی دیتے تھے۔ احباب میں شوقِ شاعری کو تازہ رکھنے اور شہر میں شعر و سخن کی گرم بازاری کو ترقی دینے کی خاص کوشش کرتے رہتے تھے۔ خدنگِ نظر کے کاموں میں عرصے تک سرگرمی کے ساتھ حصہ لینے کے بعد مرحوم نے اپنا ایک ذاتی رسالہ "معیار" نکالا تھا، جسے آخر وقت تک محنت کے ساتھ شائع کرتے رہے اور جس نے اچھی شہرت حاصل کی تھی۔ احباب کے دلوں میں اُن کی یاد ہنوز تازہ ہے۔ طرح ہذا میں ان کی غزل کے بعض اشعار درج ذیل ہیں:

سبب اُن کے حکم سے ہنستے ہیں ہنس لیں چشمِ گریاں گو — فلک ٹوٹے نہ یوں مجھ سے کسی بیکس پُر ارماں پر

یہ کس کی آمد آمد ہے ہنسے دیتا ہے سارا گھر — ہزاروں شادیاں صدقے شبِ وصلت کے ساماں پر

سمجھ کر سرخ آندھی وہ ڈرے جاتے ہیں کیا ہوگا — قیامت کی ہوا ئے تند ہے خاکِ شہیداں پر

یہ زورِ ناخنِ وحشت بامیدِ رہائی ہے — لکیریں گہری گہری پڑتی ہیں دیوارِ زنداں پر

بیا محشر لئے ساتھ اپنے محشر میں میں وحشی ہوں — کہ ہے اک مجمعِ تارِ نظر چاکِ گریباں پر

سید انور حسین عرف منجھو صاحب آرزو۔ میر ذاکر حسین صاحب یاس کے فرزندِ ارجمند اور حضرت جلال مرحوم کے تلمیذ رشید ہیں۔ فنِ سخن میں کامل دستگاہ رکھتے ہیں۔ اپنی خوش گوئی اور نازک خیالی کے لیے مشہور ہیں۔ تھوڑے عرصے سے ڈراما نویسی کا بھی شوق ہوا ہے اور اس میں زبردست شہرت حاصل کی ہے مشاعرۂ مذکور میں شریک تھے۔ آپ کی غزل کے چند اشعار حسب ذیل ہیں:

بحسرت کہہ رہی ہیں لختِ دل آ آ کے مژگاں پر — وہ گل ہیں ہم جگہ جن کو ملی خارِ بیاباں پر

ادا اس روکنے کی سلسلہ جنبانِ وحشت ہے — کہ ہر جھٹکے کا دامن کے اثر پہنچا گریباں پر

بظاہر بےخبر تھی گو زلیخا حالِ یوسف سے — تصور کی نظر درباں بنی تھی بابِ زنداں پر

ہوا چارہ نہ کوئی عادتِ ایامِ وحشت کا — چھٹا جب ہتکڑی سے ہاتھ پھر پہنچا گریباں پر

مرزا کاظم حسین محشر لکھنؤ کے مایۂ ناز شعرا میں ہیں۔ سید علی محمد صاحب عارف نبیرۂ جناب نفیس مرحوم سے تلمذ حاصل تھا۔ زورِ طبیعت، رسائی فکر اور طرزِ بیان کی بےساختگی ان کے کلام کی خصوصیات میں ہیں۔ کہنہ مشقی نے طبیعت کو برق کر دیا ہے۔ مشاعروں میں شروع ہی سے ان پر خاص نظریں پڑتی تھیں۔ خلق محبت کے پتلے ہیں۔ اچھے شعر کی ان سے اچھی داد بہت کم لوگ دے سکتے ہیں۔ شاعرانہ کشادہ دلی ان کا خاص حصہ ہے۔ غزل، تاریخ، قصیدہ اور نیچرل قسم کی نظموں میں خاص دستگاہ رکھتے ہیں۔ قدیم و جدید دونوں رنگ پر قادر ہیں۔ ان کے قصائد اور دیوان غزلیات شائع ہو چکا ہے۔ تذکرۂ احباب کے عنوان سے معاصر شعرا کا ایک بسیط تذکرہ لکھنے میں عرصے سے مصروف ہیں۔ طرحِ زیرِ بحث میں ان کے اشعار حسب ذیل ہیں:

نہ آیا آنکھ سے آنسو کوئی رخسارِ تاباں پر — چلو جانے دو بس تم رو چکے خاکِ شہیداں پر

تماشا دیکھتا ہوں دستِ ایذا و تحمل کا — ذرا تھم تھم کے چل اے خنجرِ قاتل رگِ جاں پر

ہوا اس وجہ گرد آلود اک مدت نہ کھلنے سے — گماں دیوار کا ہوتا ہے مجھ کو بابِ زنداں پر

فلک بھی بہنے اٹھائیں ہم پروونے ہم ٹھکرایا — خدایا بھی کہ بیٹھے تھے زمین کوے جاناں پر

دکھانے ہی کو آنکھیں سرخ کر لو تنہ ہے — تمہیں رونا نہیں آتا اگر خاک شہیداں پر

نواب مرزا امیر علی خاں تمر بھی خوش گویان لکھنؤ میں ممتاز درجہ رکھتے تھے۔ مدت ہوئی کہ داغ مفارقت دے گئے اور اب ان کی یاد احباب کے دلوں سے فراموش ہو چکی ہے۔ نہایت خلیق، ملنسار، در پابند وضع آدمی تھے۔ مشاعروں میں التزاماً شریک ہوتے اور وقعت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ اشعار ذیل سے ان کے رنگ سخن کا اندازہ ہو سکتا ہے:

شفق بن کر گل ولالہ کی رنگت پھوٹ نکلی پر — جدھر دیکھو لگی ہے آگ دیوار گلستاں پر

مآل کار اپنا کچھ سمجھتا ہے جو اے غافل — نظر کر غور سے تو حالت گور غریباں پر

قیامت میں بھی قاتل اس طرح دامن بچاتا ہے — کہ اس سودا زدے کا خون ہے خار مغیلاں پر

مسلّم ہے جنوں، علم وفا کا درس ہوتا ہے — تصدق جان مجنوں ہے تمر میرے دبستاں پر

سید محمد اصغر اسوا، میر وزیر علی اخگر کے فرزند ارجمند اور حضرت رشید مرحوم کے ممتاز شاگردوں میں تھے۔ نازک خیالی اور مضمون آفرینی میں خاص انہماک تھا اور مشاعروں میں ہمیشہ داد خوش بیانی دیتے تھے۔ عین جوانی میں انتقال کر گئے۔ احباب میں ان کی یاد بھی اب کم ہو چکی ہے، حالانکہ ان کی خوش گوئی کے سب معترف تھے۔ ان کے چند اشعار حسب ذیل ہیں:

ہوا سے آ گئی واں زلف ان کے روے تاباں پر — گئی وہ روشنی بھی یاں جو تھی دیوار زنداں پر

مزا لیتا ہوں در دعشق کا میں اس کی فرقت میں — نمک پاشی کیا کرتا ہوں اپنے زخم خنداں پر

یہ ہم نے سوچ کر جامہ دری کی جوش وحشت میں — کوئی بھی ہاتھ ڈالے گا نہ عریاں کے گریباں پر

کہاں سے دل تمہیں دوں بہہ گیا ہمراہ اشکوں کے — وہ اک قطرہ لہو کا تھا ابھی تک نوک مژگاں پر

نواب باقر علی خاں شائق نہایت عالی خاندان رئیس اور حضرت مشتاق مرحوم کے ارشد تلامذہ میں تھے۔ خوش گویان لکھنؤ میں ان کا بھی خاص شمار تھا۔ عالم شباب ہی میں انتقال کر گئے۔ احباب کے دلوں میں ان کی یاد اب تک تازہ ہے۔ ذیل کے اشعار سے ان کی طبیعت کا اندازہ ہو گا:

دل پر داغ عاشق لے کے کوئی بھول جائے گا — بے گا بن کے گلدستہ کسی کے طاق نسیاں پر

کوئی کب بیکسوں کی قبر پر آنسو بہاتا ہے — کبھی ابر آ کے رو جاتا ہے کچھ گور غریباں پر

بجھ گئی آتش فرقت نہ آب اشک حسرت سے ۔۔۔ کہ پانی پڑ کے جل جاتا ہے میرے قلب سوزاں پر

سراپا درد مجھ کو عشق مژگاں نے بنایا ہے ۔۔۔ بنے ہیں خار غم سب رونگٹے اس جسم عریاں پر

سید احسن مرزا عرف بے مرزا اشرف (شہید) حضرت مظہر مرحوم کے شاگرد رشید ہیں۔ ان کی طباعی، نازک خیالی اور حسن بیان کی شہرت بھی شروع سے ہے اور خوشگویان لکھنو کی فہرست میں ان کا نام بھی ممتاز درجہ رکھتا ہے۔ قدیم و جدید رنگ سخن پر یکساں قادر ہیں۔ علم عروض میں ایک رسالہ ان کی تصنیف سے ہے، جو شائع ہو چکا ہے۔ مشاعروں میں ان پر بھی ہمیشہ خاص نظر پڑتی رہی۔ مشاعرۂ زیر بحث انہیں کے مکان واقع سرائے معالیخاں میں منعقد ہوا تھا۔ تھوڑے عرصہ سے مزاج میں ایک قسم کی سنک پیدا ہو گئی ہے، جو شاعرانہ وارستگی کا نتیجہ ہے۔ طرح مذکور میں ان کی غزل کے چند شعر حسب ذیل ہیں:

ہر اک ہنستا ہے وحشت میں مرے حال پریشاں پر ۔۔۔ حجاب اے چشم گریاں ڈال دے چاک گریباں پر

بہت ٹھہرے تماشا قیدیوں کے دیکھنے والے ۔۔۔ جنوں نے کیں وہ رنگ آمیزیاں دیوار زنداں پر

نے قلب و جگر باہم نہ اک دن بھی قیامت میں ۔۔۔ ملال آخر بڑھا ایسا ترے ناوک کے پیکاں پر

مزار اونچے زمیں سے اس لیے بنتے ہیں دنیا میں ۔۔۔ نہ رکھیں وہ قدم بھولے سے بھی گور غریباں پر

یہ کہتے ہیں جو تڑپانا انہیں منظور ہوتا ہے ۔۔۔ ترا ہم ہاتھ رکھتے ہیں تمہارے قلب سوزاں پر

سید باقر حسن عرف اچھے صاحب شہرت حضرت لطافت خلف میر امانت مرحوم کے فرزند ارجمند اور حضرت فصاحت کے حقیقی بھتیجے ہیں۔ خوشگوئی کے اعتبار سے ان کا درجہ بھی خاص ہے۔ بہت عرصے تک داد خوش بیانی دینے کے بعد اب مشاعروں کی شرکت ترک کر دی ہے۔ طرح ہذا میں ان کے بعض اشعار حسب ذیل ہیں:

اسیروں پر جو آفت ہو وہی آفت ہو دربان پر ۔۔۔ وہ ہیں زنداں کے اندر قید یہ ہے باب زنداں پر

کہیں رکھ کر ہمارے دل کو اچھا بھول جانا تم ۔۔۔ کہ یہ شیشہ حفاظت سے رہے گا طاق نسیاں پر

اندھیرا منہ چھپا کر پردۂ شب میں نہ کیوں نکلے ۔۔۔ کہ نور حسن یوسف ہے در و دیوار زنداں پر

جب اس نے تیغ رکھی حلق پر وحشی کو جیا کر ۔۔۔ ہر اک سمجھا ہنسی آئی لب چاک گریباں پر

سید عابد حسین عابد مرحوم حضرت فصاحت کے شاگرد تھے۔ مبلغ علم کے ساتھ دنیاوی خوش حالی سے بھی بہت کم حصہ پایا تھا۔ لیکن اپنی خوش گوئی اور خصوصاً شوق شاعری کے لئے خاص شہرت رکھتے تھے۔ جب تک زندہ رہے دور و نزدیک کے تمام مشاعروں میں التزاماً شریک ہوتے رہے۔ اگرچہ بالکل تنگدست

اور کم استطاعت تھے، لیکن شوق شاعری کی یہ انتہا تھی کہ ہر مہینے اپنے مکان پر ایک مشاعرہ کرتے تھے جس میں لکھنؤ کے تمام خوش گو احباب اور اکثر اساتذہ شریک ہوتے تھے۔ ایک غریب دکاندار کی حیثیت سے مہینے بھر میں جو کماتے سب مشاعرہ پر خرچ کر دیتے۔ ان کے کچے مکان اور چھپر میں جیسے پُرلطف مشاعرے ہوگئے، بڑے بڑے محلوں میں مشکل سے ہوئے ہوں گے۔ یاران سخن سنج کو ان کے شوق شاعری کی خاص قدر تھی۔ ان کے مشاعروں میں چٹائی کا فرش اور لیمپ کی جگہ مٹی کے تیل کی کُپیاں جلتی تھیں اور کنول یا لالہ کے بجائے تیل کی کُپی ہی کا دور ہوتا۔ لیکن اس سادگی اور بے تکلفی اور ان کے ساتھ ان کے عجز و انکسار میں جو مزہ آتا تھا، اُسے زبان قلم ادا نہیں کر سکتی۔ اگرچہ ان کی وفات کو عرصہ دراز گزر چکا ہے، لیکن ان کے جاننے والے ان کو یاد کرکے اب تک ایک آہ سرد بھر لیتے ہیں۔ مرحوم کے کلام کا نمونہ حسب ذیل ہے:

کرے احساں تمہارے عاشق بیتاب نالاں پہ　　لگائے یاد مژگاں شوق سے نشتر رگ جاں پر
اندھیری رات میں اغیار آ کر ٹھوکریں کھائیں　　جو کچھ اونچی ہو قبر اپنی زمین کوئے جاناں پر
بجائے قید ہونے سے ہوا اطفال کو سودا　　لگانے آئے ہیں پتھر در و دیوار زنداں پر
کہاں ہے قصد جانے کا دم زینت پر کیوں جلدی　　کبھی شانہ پہ غصہ ہے، کبھی زلف پریشاں پر
یہی تجھ سے دعا ہے اس بت کافر کی الفت میں　　زوال آنے نہ پائے اے خدا عابد کے ایماں پر

حکیم سید محمد مہدی کمال خلف حضرت جلال مرحوم بھی لکھنؤ کی شاعرانہ سوسائٹی کے ممتاز رکن تھے۔ علم و فضل سے بہرہ ور، شعر و سخن میں اپنے نامور والد کے مقلد اور پیرو، مزاج میں شاعرانہ خودداری بھی اسی قدر، لیکن احباب سے بے تکلفی اور خوش مزاجی سے ملتے تھے۔ "رسالہ دستور الفصحا" جس میں اُردو کے غلط اور متروک وغیرہ فصیح الفاظ کی صراحت کی گئی ہے، ان کی تصنیف سے یادگار ہے۔ عین عالم شباب میں اپنے والد کے انتقال کے تھوڑے ہی عرصہ بعد ریاست رامپور میں انتقال کر گئے۔ طرح ہذا میں ان کے بعض اشعار حسب ذیل ہیں:

بجھا دینا لگی کو رکھ کے دامن چشم گریاں پر　　میں صدقے آپ کی طرز علاج سوز پنہاں پر
یہ باعث تھا جو کچھ آنسو تھمے تھے بیقراری میں　　مقدر تنگ آکر ہنس پڑا تھا چشم گریاں پر
مری گردن میں ان کا ڈال دینا ہاتھ یہ کہہ کر　　فلک نے کیا ستم توڑے ہیں اس ناشاد ہجراں پر
جگر بھی کھنچتا ہے دل بھی سینے پر جو رکھا ہے　　پڑے ہیں جھگڑے کیا دونوں میں اک تصویر جاناں پر
کبھی کوئی تسلی دی نہ اس بیداد نے آ کر　　تڑپ دل کی ہے چشمک زن جگر کے درد پنہاں پر

مولوی سید فرزند حسین فاخرؔ، نواب سید اصغر حسین صاحب فاخرؔ کے تلمیذ رشید ہیں۔ اپنی کہنہ مشقی، پُرگوئی، اور رسائی فکر کے لئے شہرت نامہ رکھتے ہیں۔ ذیل کے اشعار سے آپ کی طبع رسائی کا اندازہ ہوگا۔

رہوں کیونکر نہ دلدادہ میں اس چاہ زنخداں پر ۔۔۔ چراغِ عمر جلتا ہے امیدِ آبِ حیواں پر
خیالِ آمدِ لیلیٰ سے دشتِ نجد میں مجنوں ۔۔۔ چھڑک دیتا ہے آنسو جابجا خاکِ بیاباں پر
خدا جانے بلائیں ہیں کہ میرا اگشتہ دل ہے ۔۔۔ کوئی شب کو صدا دیتا ہے آکر بابِ زنداں پر
تری تصویر دل سے کھینچ لاتا ہے دکھانے کو ۔۔۔ جو اشکِ خوں کوئی آتا ہے میری نوکِ مژگاں پر
خبر پائی جو ہے تیرے اسیروں کی رہائی کی ۔۔۔ کھڑے ہیں دیکھنے والے ہزاروں بابِ زنداں پر

شاید اس خیال سے کہ مشاعرہ مذکور راقم الحروف کی طرف سے کیا گیا تھا، یہ ذکر اس وقت تک مکمل نہ سمجھا جائے گا جب تک میں بھی اپنے چند اشعار طرح ہٰذا میں درج نہ کردوں۔ بہر نوع تکمیل تذکرہ کے لحاظ سے چند اشعار حسب ذیل ہیں:

گمانِ خندہ بیجا ہے ہر چاکِ گریباں پر ۔۔۔ بہت سے ہنسنے والے ہیں مرے حالِ پریشاں پر
جنوں میں بھی رہا ہے پاسِ ناموسِ جنوں ہم کو ۔۔۔ اٹھا جب ہاتھ پردہ پڑ گیا چاکِ گریباں پر
رکھا ہے اپنے دیوانوں کو دوہری قید میں اُس نے ۔۔۔ لگے ہیں قدِ آدم آئینے دیوارِ زنداں پر
مرے رونے سے ثابت ہے کہ دل سے دل نہیں ملتا ۔۔۔ کوئی آنسو ہے دامن پر کوئی آنسو گریباں پر
یہ احساں ہے وہ احساں جو اٹھائے سے نہیں اٹھتا ۔۔۔ کرم کی آنکھ سے آنسو گرے خاکِ شہیداں پر

(اپریل ۱۹۲۰ء)

احمد علی شوق قدوائی

حضرت طباطبائی
اور
ادب الکاتب و الشاعر

بخدمت اڈیٹر صاحب "صبح امید"

ایک پرچے میں مولوی علی حیدر صاحب طباطبائی کا جوابی مضمون "ادب الکاتب والشاعر" کی سرخی کے ساتھ شائع ہوا ہے۔ حضرت طباطبائی نے رسالہ "کہکشاں" کے جس مضمون کا ذکر فرمایا ہے اسے میں نے دیکھا تھا۔ وہ میری نگاہ میں ایسی وقعت دینے کے قابل نہیں تھا کہ اس کا جواب دیا جاتا۔ یہ خیال میں نے اس سبب سے قائم کیا تھا کہ ذی فہم شعرائے اُردو نے اضافت کے جن اصول کو مسلم قرار دے لیا ہے ان سے ہٹ کے وہ جاہلانہ راستہ اختیار کرنے سے رہے اور ناواقف نہ اب اصول کے پابند ہیں نہ اس وقت تک ہو سکتے ہیں جب تک وہ فن کو فن کے قاعدے سے نہ سیکھیں۔

عربی، فارسی یا ترکی الفاظ سے ہندی الفاظ کی مشابہت یا مناسبت پا کے ان کو مضاف یا مضاف الیہ بنا دینا اور محض ہندی الفاظ کو عطف اور اضافت سے بچانا، یہ باتیں کچھ عجیب سی ہیں۔ اصول تو کوئی قائم نہ رہے گا۔ اب ہر شخص چاہے وہ خوش فہم ہو، چاہے کم فہم، مشابہت اور مناسبت کا فیصلہ کرنے کے لئے مجتہد بن جائے گا۔ اگر کوئی معترض ہوگا تو پھر اس فیصلے کے لئے ایک دوسرے مجتہد کی ضرورت ہوگی کہ مشابہت کا فیصلہ ابتداً صحیح ہوا ہے یا غلط۔ مجتہد ثانی کے فیصلے کو بھی سب ماننے سے رہے۔ غرض اردو کی شاعری بچوں کا کھیل ہو جائے گی جس کو نہ قواعد کی پابندی سے مطلب نہ ارباب علم و فن کے مسلّمہ اصول سے۔

عربی، فارسی اور ترکی الفاظ مشابہت اور مناسبت سے دوسری زبان کے الفاظ نہ بن جائیں گے، مہنّد ہی رہیں گے۔ پھر مہنّد اور ہندی الفاظ میں علماً اور عقلاً کوئی فرق نہیں ہے۔ دونوں کو چاہے ہندی کہو، ہندوستانی اور چاہو اُردو۔ اب میں پوچھتا ہوں کہ اسکی کیا وجہ ہے کہ ایک ہندوستانی لفظ قاعدے کی تحت میں لیا جائے اور دوسرا نہ لیا جائے۔ پھر میں یہ کہتا ہوں کہ مہنّد الفاظ جن کو یہ کہنا چاہیے کہ اُردو ہو گئے ہیں، اُن کو آپ اردو کی نحو میں تولے سکتے ہیں، مگر یہ اختیارات آپ کو کہاں سے اور کس قاعدے

سے حاصل ہو سکتے ہیں کہ لفظ کو تو آپ لفظی یا معنوی صورت بدل کے ایک دوسری زبان سے چھین لیں اور چاہیں یہ کہ اُس پر اُسی زبان کی نحو کا عمل کیا جائے جس سے وہ چھینا گیا ہے۔ حضرت طباطبائی بھی جواب میں کہیں کہیں بہکے ہیں۔ اُن کا یہ فقرہ تعجب کے قابل ہے۔

"اس باب ترکیب میں دار کے ساتھ جو اسمائے صفت مرکب ہوتے ہیں اُس میں ہندی الفاظ بے تکلف داخل کیے جاتے ہیں:

سمجھ دار۔ چھلکے دار۔ لچھے دار۔ مگر اہلِ قلم اس سے بھی احتیاط کرتے ہیں۔"

[نوٹ: میں اصلی عبارت کی نقل سے مجبور ہوا ورنہ بجائے "اس میں" کے "اون میں" لکھتا۔ اس لئے کہ یہ اشارہ اسمائے صفت کی جانب ہے، جو بصیغۂ جمع لکھے گئے ہیں]

میرے خیال میں یہ بات آتی ہے کہ حضرت طباطبائی کو حیدرآباد کے طویل قیام نے لکھنؤ کی بول چال سے کچھ بیگانہ کر دیا ہے۔ ورنہ دار کی ترکیب سے جو اسما ہندی ہو کے عام میں آ گئے ہیں وہ سب بے تکلف بولے اور لکھے جاتے ہیں۔ اہلِ زبان کو ان کے بولنے میں اور اہلِ قلم کو لکھنے میں ذرا بھی پس و پیش نہیں ہوتا۔ البتہ اس قسم کے ہندی اسما عطف اور اضافت سے ضرور بچائے جاتے ہیں۔ اس قسم کی ترکیب صرف دار ہی کے ساتھ منحصر نہیں ہے جس طرح بہت سے اسما دار سے مرکب ہو کے بنے ہیں اسی طرح دان اور بان سے مرکب ہو کے بھی بنے ہیں۔ جیسے ناگردان اور گاڑیبان وغیرہ۔ اہلِ قلم اگر احتیاط کریں گے، تو اردو میں لکھیں گے کیا۔ ان میں بہت سے اسما ایسے ہیں جن کا مفہوم کسی دوسری طرح ادا ہی نہیں ہو سکتا۔ لٹو دار پگڑی اور ناگردان کے بدلے مولانا ہی ہم کو ایسے اسما بتا دیں جن سے سننے والے کا ذہن فوراً ان چیزوں کی طرف منتقل ہو جائے جن کا ظاہر کرنا مقصود ہو۔

سنسنی خیز اور رہائش وغیرہ سے بحث فضول ہے۔ یہ جہلا کے تراشے ہوئے الفاظ ہیں۔ فصحا ان کا استعمال نہیں کرتے۔ اس قسم کے لچر الفاظ کا ایجاد اکثر پنجاب سے ہوا ہے جہاں کی اردو بہت خام ہے۔

نون کا اعلان عطف یا اضافت کے ساتھ انیس اور غالب کے یہاں پایا گیا۔ غالب کے یہاں "آئے ہے" اور "جائے ہے" بھی موجود ہے بلکہ ذوق کے یہاں بھی۔ میرے خیال میں ایسی ترکیبیں شاید ان اساتذہ کے یہاں پہلے کی ہوں جب اردو زبان ضوابط سے کم مقید ہوئی تھی۔۔ وہ ابتدائی کلام میں ہوں۔ یا آخری کلام میں، غلط بہر حال غلط ہے۔

حضرت طباطبائی نے ہائے مختفی میں غالب کے دو مصرعوں سے امالہ دکھایا ہے اس مصرعے میں امالہ ضرور ہے۔ مصرعہ: نقش پا جو کان میں رکھتا ہے انگلی جادہ سے

یہاں محاورۂ جادے یہ' چاہتا ہے' لیکن اس مصرع میں امالہ نہیں ہے۔ مصرعہ:

شیشے میں نبض پری پنہاں ہے موج بادہ سے

موج مضاف اور بادہ مضاف الیہ ہے۔ فارسی ترکیب اضافت کے سبب سے لفظ بادہ کے دال کو مفتوح ہی چاہتا ہے۔ حضرت کو دھوکا ہوا۔

خلطیہائے مضامین مت پوچھ

اس مصرعے میں غالب نے ایک لفظ کو تین ترکیبوں سے غلط کیا ہے۔ (۱) غلط خود مصدر ہے۔ اس میں ہندی کی ے بڑھائی (۲) اس کو ہائے سے فارسی کا صیغہ جمع بنایا۔ (۳) اس کو فارسی کی اضافت دی۔ شاید ان کو ے کے ساتھ غلطی کے مفرس ہونے کا گمان ہوا، ورنہ وہ ایک لفظ کو چند شکلوں سے غلط نہ کرتے۔

عربی، فارسی اور ترکی کے الفاظ جو معنوی تغیر سے ہند ہو گئے ہیں ان کا ذکر کرکے حضرت طباطبائی خاموش ہو لیے۔ اصولاً جب ہند معنی کے ساتھ کہے جائیں گے تب وہ بھی عطف اور اضافت سے بچائے جائیں گے۔

حضرت طباطبائی کا یہ فقرہ قابل تعجب ہے جو انہوں نے مرزا سیتا عیش سے کہا تھا: "جس لفظ کی فارسی یا عربی نہ ہو اُسے فارسی و عربی میں استعمال کر سکتے ہیں۔ خواہ وہ لفظ ہندی ہو یا ہند" پہلی گرفت میری یہ ہے کہ حضرت نے ہند کا لفظ یہاں کیوں تحریر فرمایا۔ ہند کا اطلاق محاورے میں اسی لفظ پر ہو سکتا ہے جو فارسی وغیرہ سے متغیر ہو کر اُردو میں آیا ہو۔ اگر وہ لفظ اُس زبان میں نہ تھا تو بگڑ کے ہند کیونکر ہوا۔ اب میں کہتا ہوں کہ حضرت اپنے کلیے کی صحت ثابت کرنے کے لیے پہلے یہ ثابت فرمائیں کہ فارسی اور عربی کے تمام الفاظ پر آپ ایسے حادی ہیں کہ اُن زبانوں کا ہر ہر لفظ آپ کے دماغ میں جگہ لیے ہوئے ہے۔ اگر یہ نہیں ہے تو آپ کا کلیہ بھی صحیح نہیں ہے۔ میں کہتا ہوں ایسا حادی ہونا اس زمانے میں کسی ہندوستانی کے لیے اس سبب سے ممکن نہیں ہے کہ فارسی زبان ہندوستان میں اب زندہ زبان نہیں رہی۔ ایران کی فارسی بھی اب اس قدر نئی ہو گئی ہے کہ اس پر ہندوستانی کا عبور ممکن نہیں۔ پھر میں کہتا ہوں کہ پرانی فارسی پر بھی ہندوستانی کا عبور کامل دشوار کیا بلکہ محال ہے۔ بہت سے الفاظ ایران کی بول چال کے ایسے ہیں،

جن کا لغات فارسی میں کہیں پتہ نہیں ملتا۔ میں بہت سے فارسی الفاظ بعض کتاب میں ایسے پاتا ہوں جو کسی لغت میں نہیں ملتے ہیں۔ ان کے معنی حل کرنے کی یہ صورت ہوتی ہے کہ آغا لطف علی صاحب ایرانی کے سامنے پیش کیے جاتے ہیں۔ بعض لفظ کے معنی وہ بھی نہیں بتا سکتے اور بعض لفظ ہندوستان کے چھاپے سے اتنا متغیر ملتا ہے کہ اس کی تصحیح سخت جستجو کے ساتھ کرنا پڑتی ہے۔ یہ حالت فارسی کی ہے، تو کون ہندوستانی یہ کہہ سکتا ہے کہ یہ لفظ فارسی یا عربی میں نہیں ہے۔ اس سبب سے ہندی یا ھند لفظ (یہاں ھند سے میں نے وہ لفظ خیال کر لیا جو انگریزی یا ہندی سے اردو میں لایا گیا ہو) فارسی یا عربی عبارت میں لینا پڑا (نوٹ: جدید عربی جو مصر وغیرہ میں آج کل رواج پائے ہوئے ہے وہ بھی ہندوستانی کے لیے فارسی سے کچھ کم غیر مانوس نہیں ہے)۔ ان دشواریوں کے علاوہ یہ دشواری کیونکر آسان ہو سکتی ہے کہ حضرت کے غلط کلیے سے ہر ہندوستانی فارسی یا عربی ہونے یا نہ ہونے کی رائے قائم کرنے کے لئے مجتہد ہو سکتا ہے اور ایسے اجتہاد کی ناکامیابی بہ نسبت کامیابی کے کہیں زیادہ قرین عقل ہے۔ لہٰذا ایسا کلیہ سوائے غلط کے کبھی صحیح نہیں تسلیم کیا جا سکتا۔ مجھے اس بات پر ہنسی آگئی کہ حضرت نے فارسی کے مشتبہ لفظ کی اضافت کو کس شد و مد سے رد کا اور مجوزہ اضافت سے کس زور شور کے ساتھ اختلاف فرمایا، مگر خود ہی اس اشتباہ کو کہ فارسی یا عربی میں یہ لفظ نہیں ہے اتنی قوت دے بیٹھے کہ ہندی یا ھند لفظ کو بطور فارسی یا عربی لفظ کے استعمال میں لانے کا فتویٰ دے دیا۔

ارباب فہم کا عمل اردو میں اسی حد تک ہے کہ اہل ایران جب ہندی لفظ کو مفرس فرما گئے ہیں انہیں تک فارسی کی ترکیبوں کو محدود رکھیں۔ محتاط اہل فہم اس پر بھی احتیاط سے کام لیتے ہیں اور شاذ کو اختیار نہیں کرتے۔ محسن تاثیر جو وزیر یزد تھا اور کبھی ہندوستان کو نہیں آیا، دیباچ میں عطف کا واؤ دے کر "راگ و رنگ" کہہ گیا ہے۔ مگر کوئی اُردو کا ذی فہم سخنور اس لفظ میں تاثیر کی تقلید نہیں کرتا۔ مرزا طاہر وحید (ایرانی) نے ہندی کے بہت سے الفاظ لے لیے ہیں۔ لیکن میں لکھ چکا ہوں کہ اُردو کے سخنور شاذ کی تقلید سے اپنے کلام کو بچاتے ہیں۔ ایسی حالت میں (حضرت طباطبائی کی رائے کے موافق) ہندی یا ھند لفظ کو مضاف یا مضاف الیہ بنانا جہل اور بے احتیاطی کا راستہ کھول دینا ہے۔ خصوصاً اس ناواقفی کے ساتھ کہ فارسی کی پوری زبان پر اہل ہند کا قبضہ محال ہے بلکہ خود ایرانیوں کا بھی اس لیے کہ ملک کے مختلف حصوں کی زبانوں میں اور در تفاوت ہے۔

حضرت طباطبائی نے آتش کا یہ مصرع بھی زیر بحث لے لیا۔ ع کسی کی محرم آب رواں کی یاد آئی

اور یہ ستم کا فقرہ بھی تحریر فرما دیا:

"میں نے کہا کہ محرم اور شاماچہ (فارسی میں شاماچہ سینہ بند زنان کو کہتے ہیں) کی وضع میں ذرا سا بھی فرق ہو اتو محرم عَلم ہو جائے گا اور عَلم کو ہر زبان میں اسی طرح بگاڑ لیا جاتا ہے جس طرح خود اُس زبان کے الفاظ کو۔"

محرم اور شاماچہ دونوں کی شکلیں ایک سی ہوں یا مختلف۔ کسی صورت سے محرم پر عَلم کا اطلاق نہیں ہو سکتا۔ محرم نکرہ ہے جو ایک جنس پر دلالت کرتا ہے۔ اسی کو اسم جنس بھی کہتے ہیں اور اسم عام بھی (ملاحظہ ہو صرف و نحو) جیسے آدمی، گھوڑا، بکری وغیرہ۔ محرم معرفہ نہیں ہے جس کی ایک قسم کو اسم عَلم کہتے ہیں۔ عَلم کی تعریف تو یہ ہے کہ وہ کسی معین چیز کی ذات واحد کو ظاہر کرتا ہو۔ جیسے عبدالعزیز ایک خاص شخص کا نام، یا گومتی ایک خاص دریا کا نام، یا لکھنؤ ایک خاص شہر کا نام، یا دار جلنگ ایک خاص پہاڑ کا نام ہے۔ اسم نکرہ اور اسم معرفہ کے متعلق حضرت طباطبائی سے ایسی غلط تحریر حیرت انگیز ہے۔ ناسخ کا اعتراض محرم پر اس سبب سے تھا کہ ایک ہندی اسم نکرہ پر غلط اضافت دے دی گئی تھی اور پھر مضاف الیہ آب رواں تھا، جو کپڑے کے معنی میں ہندی ہے۔ آتش نے اس ترکیب میں یہ دو غلطیاں کی تھیں۔

رہا "آب رواں" اس کے متعلق میں آگے لکھوں گا جہاں حضرت طباطبائی نے اس پر بحث کی ہے۔ داغ نے عطف کا واو دے کے "محبت و تکرار" کی ترکیب میں ضرور غلطی کی۔ تکرار جھگڑے کے معنی میں ہندی ہے۔ حضرت طباطبائی کی یہ تاویل کہ یہاں تکرار کو تکرار محبت قرار دے دو، اس صحیح اعتراض کا جواب نہیں ہو سکتی تھی جو داغ پر ہوا تھا۔ اگر داغ نے جواب کے لئے اس رکیک تاویل کو کافی نہ خیال کیا تو ان کا خیال درست تھا۔

حضرت طباطبائی بار بار غلط تحریر فرماتے ہیں۔ شاید وہ تمام ہندوستان کو جاہل قرار دے کے یہ خیال فرمانے لگے ہیں کہ ان کی غلط تحریر بھی صحیح سمجھی جائے گی۔ اب وہ آب رواں کی نسبت لکھتے ہیں:

"ناسخ نے محرم کی اضافت پر اعتراض کیا ہے۔ آب رواں پر اعتراض نہیں کیا کہ اس میں عَلمیت پائی جاتی ہے۔"

"آب رواں" میں عَلمیت کا پایا جانا بالکل غلط ہے۔ ناسخ ایسے ناواقف نہ تھے کہ اسم نکرہ کو اسم معرفہ کی تحت میں لے کے عَلمیت کا گمان کرتے۔ حضرت طباطبائی نے کوئی دلیل عَلمیت کی نہیں لکھی۔ اور صرف

ان کا لکھ دینا غلط کو صحیح نہیں بنا سکتا۔ آتش کے مصرع میں آب رواں جس صورت سے واقع ہے، اس پر ناسخ یہ گرفت کر سکتے تھے کہ یہ مہمل نام بروزن فاعلن ہے اور وہیں تک درست ہے۔ بروزن مستفعلن کیوں کہا گیا۔ اگر آتش نے آب رواں کے دونوں الفاظ کو فارسی دیکھ کے بے کی اضافت کو کشش سے طول دیدیا تو اچھا نہیں کیا آب رواں مضاف نہ تھا۔ ناسخ اس سبب سے خاموش ہے۔ ڈیوڑھی آغا میر اور کٹرہ ابو تراب خان۔ فارسی ترکیب سے مضاف ہوں یا مضاف الیہ، صحت میں کچھ گفتگو نہیں، اس لئے کہ دونوں نام معرفہ اور علم ہیں۔ لیکن اگر کوئی شخص ڈیوڑھی اور کٹرہ کی اضافت کو کھینچ کے ان کو بروزن فاعلن کہے گا تو ضرور غلط کہے گا۔ اس لئے کہ یہ نام فارسی کے نہیں ہیں، اُردو کے ہیں اور طویل اضافت کے ساتھ وضع نہیں کیے گئے ہیں۔ اضافت کی کشش سے فارسی کی صورت پیدا ہوگی جیسی آتش کے مصرع میں آب رواں پیدا ہوئی ہے اور اس صورت کے غلط ہونے میں کچھ شک نہیں۔ یہ صحیح ہے کہ ایرانیوں نے ہندی کے بہت سے الفاظ کو مفرس کر کے انہیں فارسی کی ترکیبوں سے کہا گیا ہے۔ مگر اس تصرف کی مثال لے کے ہم ایرانیوں کے تصرف سے تجاوز نہیں کر سکتے۔ انہیں الفاظ کو فارسی کی ترکیب سے کہہ سکتے ہیں، جن کو انہوں نے مفرس کیا ہے۔ ہم تتبع کرنے والے ہیں تو فارسی زبان میں اجتہاد کا منصب ہم کو حاصل ہے نہ اختراع کا نہ تصرف کا۔

——— احمد علی۔ شوق قدوائی۔ (دسمبر ۱۹۱۹ء)

ادب الکاتب والشاعر

جواب

(فارسی وعربی میں ہندی لفظ کا داخل کرنا)

یہ رایہ فقرہ کہ "جس لفظ کی فارسی وعربی نہ ہو اُسے فارسی وعربی میں استعمال کر سکتے ہیں" (یعنی خواہ لفظ انگیا کی طرح وہ لفظ ہندی ہو خواہ لفظ محرم کی طرح مہند ہو نمین سکھ کی طرح ٹھیٹ بھاکا کا لفظ ہو، یا آب رواں وگلبدن کی طرح مہند ہو۔ انگریزی کا لفظ ہو جیسے لونگ کلوتھ یا انگریزی سے مہند کر لیا گیا ہو جیسے لکلاٹ ان الفاظ کو فارسی وعربی میں استعمال کر سکتے ہیں) محتاج دلیل نہیں ادائے مطلب کی دوسری صورت ممکن ہی نہیں ایک ایرانی یہ کہنے پر مجبور ہے" نین سکھ نمی خواہم لنکلاٹ میخواہم۔ گلبدن تماش ہندیست در ایران گیر نمیاید"۔ میں کبھی انگرکھا بھی پہنتا ہوں کبھی قبا بھی پہن لیتا ہوں۔ ایرانی خادم سے یہی کہوں گا کہ "انگرکھا بیار قبا بجایش بگزار۔ سیکل از کار رفت۔ موتر درست کن"۔

اگر محرم وآب رواں کی نسبت کسی کو یہ وسواس ہو کہ شاید ایران کے کسی گوشہ میں محرم کی وضع کا سینہ بند پہنتے ہوں اور آب رواں کے مثل کا کپڑا بُنا جاتا ہو تو وہ سیکل اور موٹر اور انجن وغیرہ ہزاروں نوایجاد اشیا کے متعلق تو یقین رکھتا ہے کہ ہرگز اس کی فارسی عربی ترکی کچھ بھی نہیں ہے۔

غرض عدم مترادف یا وجود علمیہ کے سبب سے ہر ایک زبان کا لفظ دوسری زبانوں میں استعمال کر سکتے ہیں اور ایسا ہی کیا کرتے ہیں۔ عَلَم کو شخص معین کے لئے مخصوص سمجھنا اصطلاح علما سے بیخبری ہے۔ تعین ذہنی کے سبب سے جنس بھی علم ہو جاتی ہے جیسے اسامہ اصطلاح نحویین میں عَلَم جنس ہے۔ اسم معنی بھی علم ہو جاتا ہے۔ جیسے ذکری کو عَلَم مصدر کہتے ہیں۔

اور اس بات کا بھی لحاظ رکھنا چاہیے کہ زبان اُردو جس فارسی کا تتبع کرتی ہے،

"وہ فارسی اب زندہ زبان نہیں رہی"

اور اس سبب سے نہایت محدود ہو گئی۔ فارسی کے ادبیات ولغت ومصطلحات کی کتابوں سے باہر وہ زبان نہیں ہے اور عربی تو اس سے بہت پیشتر فنا ہو چکی۔ جدید فارسی وعربی سے اُردو کو کچھ تعلق نہیں۔ ایران

کہ لوگ خوبصورت کو خوش گل فربہ کو قطوز خادمہ و پرستار کو کلفت کہتے ہیں۔ اُردو ان الفاظ سے نفرت رکھتی ہے۔

ایک مضمون میں یہ بھی میں گزارش کر چکا ہوں کہ اُردو کو بلا واسطہ زبان فارسی کوئی تعلق عربی سے نہیں ہے۔

"دار کے ساتھ جو اسمائے صفت مرکب ہوتے ہیں اس میں ہندی الفاظ بے تکلف داخل کیے جاتے ہیں" (یہاں اسمائے صفت کے لئے غیر ذوی العقول ہونے کے سبب سے ضمیر واحد بھی لا سکتے ہیں)۔ مگر اہل قلم اس قسم کی ترکیبوں سے بھی احتیاط کرتے ہیں۔ سمجھ دار کی جگہ ہوشیار یا ذی فہم لکھنا بہتر سمجھتے ہیں۔ چھلکوں دار کی جگہ چھلکوں سمیت کھچڑی یا چھلکوں بھری دال لکھیں گے۔

"لٹو دار پگڑی" سب جانتے ہیں کہ ایک خاص وضع کی پگڑی کا نام ہے۔ کیا یہ تعیین ذہنی اُس کے علم ہونے کے لئے کافی نہیں ہے۔

"ناگردان" بمعنی ناگر بان کے معنی پر ہے جس کے لئے فارسی میں کوئی لفظ نہیں ہے۔ وہی علم مترادف دو وجود علیہ کا ضابطہ یہاں موجود ہے۔

اسی ضابطہ کی رو سے جھر مرصع و مالائے مروارید و نالکی گنگا جمنی وغیرہ کا لکھنا پڑھنا سلاطین مغولیہ کے دربار میں رائج تھا اور وائسرائے ہند و کمشنر دہلی وغیرہ اس طرح کے الفاظ ہیں۔

غالب کی اس زمین میں (جادہ ہے اور موج بادہ ہے) مجھے یہ کہنے کی ضرورت نہ تھی کہ قافیہ ردیف بے مگر اب کہنا پڑا کہ بادہ میں اگر امالہ نہ کیا جائے گا تو جادہ کا قافیہ موج بادہ کیونکر ہو سکے گا اور بادہ میں امالہ کرنے سے لفظ مہند ہو جائے گا۔ پھر ترکیب فارسی میں اس کا لانا کیونکر درست ہوگا۔ شاعر کو ایسا دھوکا نہ ہونا چاہیے۔

افسوس ہے کہ یہ بھی مجھے سمجھنا پڑا کہ آب رواں میں "اضافت" ہرگز نہیں ہے اور بر وزن فاعلن کہنا بھی ٹھیک نہیں یوں کہنا چاہیے کہ اس لفظ میں بے کے کسرہ کا اشباع نہ کریں تو مفتعلن کے وزن پر ہوگا۔ اور اگر آتش کی طرح اشباع کریں تو مستفعلن کا وزن پیدا ہوگا۔ لیکن ناسخ جانتے تھے کہ شاعر کے لئے ایسے تصرفات جائز ہیں۔ اس پر وہ کیا گرفت کرتے۔ کسرہ اضافی ہو یا توصیفی، شاعر کو اشباع کرنے نہ کرنے کا اختیار ہے۔

یہ بات تو کہتے ہوئے خود مجھے شرم آتی ہے کہ یہ دونوں فقرے غلط ہیں اور غلطی زبان کی ہے

"داغ نے عطف کا واو دیگر حجت و تکرار کی ترکیب میں ضرور غلطی کی"

"محسن تاثیر نیچ بہن عطف کا واو دیکر راگ و رنگ کہ گیا ہے"

"زید زید دینا کہتے ہیں اس کے قیاس پر داؤ دینا" دہلی و لکھنؤ کی زبان نہیں ہے۔ یوں کہنا چاہیئے کہ حجت و تکرار کی ترکیب میں عطف کا واؤ لانا داغ نے غلطی کی۔ لیکن یہ یاد رہے کہ حجت و تکرار میں واؤ عطف سے اسی کا کے معنی بھی پیدا ہوتے ہیں کہ (ایک تو حجت پھر اس کی تکرار، جیسے اردو میں (حجت اور بار بار) میں مفہوم حرف عطف ادا کر رہا ہے۔ عربی میں بھی ایک زن بدویہ کا یہ فقرہ اہل ادب میں مشہور ہے:

مسکٌ وریحُ عمرٍو

اس فقرے میں بھی واؤ عطف کا یہی مفہوم نکل رہا ہے۔ حکایت یہ ہے کہ ایک شخص عمرو تھا۔ زن بدویہ اس کی معشوقہ تھی اہل قبیلہ کو یہ گوارا نہ تھا۔ موقع ڈھونڈھتے رہتے تھے۔ ان لوگوں نے آخر اسے قتل کر کے اُس کا قمیص جو مشک میں بسا ہوا تھا عورت کے سامنے لا کر ڈال دیا۔ وہ اس قمیص کو پیراہن یوسفی سمجھی۔ کہنے لگی (مسکٌ وریحُ عمرٍو) یعنی ایک تو مشک پھر اس پر عمرو کی خوشبو۔ اس نکتہ کو مرزا داغ بھی سمجھ نہ سکے۔ دوسروں سے کیا امید ہو سکتی ہے۔

یہ مضمون بھی نکات ادبیہ سے خالی نہ رہا "ادب الکاتب والشاعر" کے عنوان سے اسے بھی معنون کریں تو بیجا نہ ہوگا۔ — علی حیدر طباطبائی (دسمبر ۱۹۱۹ء)

اعتراض مزید

جناب ایڈیٹر صاحب "صبح امید"!

مولانا علی حیدر صاحب طباطبائی کے مضمون "ادب الکاتب والشاعر" پر میں ایک مضمون لکھ چکا ہوں۔ وہ طویل ہو گیا تھا۔ اس سبب سے میں نے خیال کیا تھا کہ باقی حصے پر فرصت کے وقت پھر کبھی لکھوں گا۔

مولانا تحریر فرماتے ہیں:

"اس طرح کی ترکیب میں ایک دوسری غلطی ہندیوں سے واقع ہوتی ہے۔ مثلاً "فرماں بردار" "ناز بردار" میں یہ غلطی ہے کہ فرمان اور ناز کے ساتھ برداشتن کا فعل خلاف محاورہ ہے۔ صحیح فرماں بر و ناز کش ہے۔ یہ دونوں لفظ ہندیا در غلط العام میں داخل ہو گئے ہیں۔ ان کو فارسی ترکیب میں لانے سے احتراز واجب ہے، مگر ترک تو ہو سکتے"۔

فرمان بردار اور ناز بردار کے بیچ میں عطف کی ضرورت تھی۔ خیر۔ مولانا کی اُردو ہے!

مولانا کی زبان اُردو ہے۔ اُردو ہی پر حاوی ہونا محال ہے۔ پھر غلط اجتہاد سے وہ فارسی کے قلمرو میں اپنا کھوٹا سکہ کیوں چلانا چاہتے ہیں "فرماں بردار" ہرگز ہندی نہیں ہے۔ اس کو اُردو کے

غلط العام میں داخل کرنا مولانا کی غلطی ہے۔ "منتخب" (عربی الفاظ کا لغت ہے۔ الفاظ کے معانی فارسی عبارت میں بیان) سے مولانا واقف ہوں گے۔ اس کے معتبر اور مستند ہونے میں بھی شاید شک نہ ہو۔ اس لغت میں "نجیب" کے معنی ان الفاظ میں درج ہیں:

"فرماں بردار و غریب و خرمائے است نیکو"

ایک سند فرمان بردار کے فارسی ہونے کی یہ ہوئی۔ اب دوسری سند اس سے بھی بڑھ کے لیجیے۔ شیخ سعدی شیرازی کا قطعہ گلستاں میں موجود ہے:

قطعہ

ابر و باد و مہ و خورشید و فلک در کارند ۔۔۔ تا تو نانے بکف آری و بغفلت نخوری

ہمہ از بہر تو سرگشتہ و فرمان بردار ۔۔۔ شرط انصاف نباشد کہ تو فرمان نبری

اب حضرت مولانا ہی فرمائیں کہ صاحبِ منتخب اور شیخ سعدی جو فرمان بردار کے لفظ کا استعمال فرما گئے ہیں وہ فرمان کے ساتھ بردا شتن کے فعل کو خلاف محاورہ کہہ گئے ہیں یا با محاورہ۔ گلستان پر تو حافظہ کام نہیں دیتا اور مولانا ایرانی زبان کے مسائل پر غلط فتوی صادر فرماتے ہیں۔ فارسی زبان کا تو کچھ نقصان نہیں مگر ایسی لغو تحریروں سے اردو کو سخت نقصان کا اندیشہ ہے۔

انیس اور غالب کے کلام میں کسی جگہ فارسی ترکیب کے ساتھ نون کا اعلان ضرور ہے۔

انیس ع مسکن چھٹا ہمارے سعادت نشاں سے

غالب ع دین و آئین پر مدار سبھی

" ع ناف زمین ہے نہ کہ نافِ غزال ہے

مولانا نے ان مصرعوں کو لکھ کے یہ تحریر فرمایا ہے کہ وہ اس بحث میں آئندہ کچھ لکھیں گے۔ وہ لکھیں یا نہ لکھیں، غلط ہر صورت سے غلط ہے چاہے وہ انیس کے کلام میں ہو، چاہے غالب کے کلام میں۔ حسن ظن سے یہ تاویل ہو سکتی ہے کہ انیس اور غالب کا ایسا کلام شاید اس زمانے کا ہو جب اردو میں ضوابط کی اتنی پابندیاں نہ تھیں، جتنی اب ہیں۔

اب میں مولانا سے یہ التجا کرتا ہوں کہ یا تو وہ لکھنے ہی سے دست کش رہیں یا لکھیں تو دو باتوں کا لحاظ رکھیں۔ (۱) مولویانہ اردو نہ ہو جس سے دیکھنے والے کا دماغ پریشان ہوتا ہے اور مجھ سا کم فہم یہ کہتا ہے کہ کاش مولانا اس مضمون کے ساتھ خود تشریف لائے ہوتے اور میں اس الجھی ہوئی عبارت کو انہیں سے

سمجھا سکتا۔ (۲) آئندہ لکھیں تو ذرا غور فرما کے لکھیں۔ اس خیال کو لکھتے وقت اپنے دماغ سے نکال دیں کہ جو کچھ وہ لکھ دیں گے، لوگ اس کو تسلیم ہی کر لیں گے۔

حضرت ایک فقرہ یہ تحریر فرماتے ہیں کہ:

"نمرود کی زنبیل کو غالب نے امر کی زنبیل باندھ دیا ہے۔"

اس فقرے سے حضرت طباطبائی کا مطلب سمجھنے کے لئے انسان کو علم غیب کی ضرورت ہے۔ میں پوچھتا ہوں کہ کیا صرف یہ بات ہے کہ بجائے عین کے الف لکھ دیا گیا۔ اگر یہی ہے، تو ایسی غلطیاں کاتب کے قلم سے اکثر ہو جایا کرتی ہیں اور اگر غالب نے الف کے ساتھ میم کو ساکن فرمایا ہے، تو البتہ اعتراض کی گنجائش ہے۔ اب مولانا تحریر فرمائیں کہ الف پر اعتراض ہے یا کسی کی حرکت پر، تو اُن کا صحیح مقصد معلوم ہو۔

حضرت مولانا تحریر فرماتے ہیں:

"ایک زبان کا لفظ دوسری زبان میں اُس وقت استعمال نہیں کرتے جب تک کہ اس نے دوسری زبان کا لبادہ نہ پہن لیا ہو، ورنہ (مصرع غالب):

"تو اور ایک وہ نہ شنیدن کہ کیا کہوں"

عربی کے الفاظ جب فارسی میں آ کر فارسی بن گئے، تو فصحا نے اُن کو استعمال کے قابل سمجھا"

مصرعے سے پیشتر کی نثر عبارت کو، پھر مصرعے کو، اور پھر مصرعے سے بعد کی نثر عبارت کو باہم کچھ ربط ہے یا نہیں، اس کا فیصلہ مولانا ہی فرمائیں۔ ایسی نثر لکھنے سے کیا فائدہ۔

میں اور بھی بعض باتوں پر کچھ لکھتا۔ مگر مولانا کی عبارت جا بجا اس قدر اُلجھی ہوئی اور بے ربط ہے کہ میرا دماغ پریشان ہوتا ہے۔ اس سبب سے میں مجبور ہوں۔

— احمد علی شوق قدوائی (جنوری- فروری ۱۹۲۰ء)

ادیب لکھنوی

"مستی" - اور "تحریک" (الفاظ کی بحث)

جن الفاظ سے اس مضمون کی سرخی قائم کی گئی ہے ان پر ابتدائی بحث عزیز لکھنوی کا دیوان (گلکدہ) دیکھ کے مولانا ابوالکلام آزاد نے کی تھی۔ عزیز نے مستی کے اعتراض کو تسلیم کر لیا اور تحریک کے اعتراض کا جواب عرفی کے شعر سے دیا۔ یہاں تک یہ بحث سنجیدگی کے ساتھ معترض اور مجیب دونوں کے قلموں سے زبان اور علم کی حدود میں رہی تھی۔ واقفیت کی نگاہوں سے دیکھنے والوں نے عزیز کا جواب نکلنے سے پیشتر ہی یہ سمجھ لیا تھا کہ آزاد کا اعتراض مستی پر صحیح اور تحریک پر غلط ہے۔ عزیز نے معقول طریقے سے یہی جواب بھی دیا تھا۔ اب جنوری ۱۹۲۰ء کے "مخزن" میں اطہر صاحب ہاپوڑی نے اس بحث کو پھر زندہ کیا ہے۔

مولانا آزاد نے اپنے جوابی مضمون میں خود لکھ دیا تھا کہ مستی سے متعلق ان کا روئے سخن عزیز کی جانب ہے جو غالب کے مقلد ہیں نہ کہ داغ اور جرأت کی تقلید کرنے والوں کی جانب۔ اس جملے کو سمجھ کے اطہر صاحب کو مستی کی بحث میں دخل دینا ہی نہ تھا۔ وہ تو زبان کے اس مرکز سے جہاں کی بول چال زیر بحث تھی اُس قدر فاصلے پر ہیں کہ وہاں کی ہوا بھی ان تک نہیں پہنچ سکتی۔

یہ ظاہر ہے کہ مولانا آزاد دہلی کی زبان میں پختہ مغز ہیں اور عزیز لکھنوی ہیں۔ (میرا مطلب یہ نہیں ہے کہ عزیز بھی لکھنؤ کی زبان میں پختہ مغز ہیں۔ گلکدہ عیوب سے پاک نہیں ہے) مولانا نے عزیز کو لکھنوی سمجھ کے لفظ مستی کے غلط استعمال پر ٹوکا تھا اور عزیز نے لکھنؤ کے محاورے سے اپنا تجاوز سمجھ کے اعتراض کو تسلیم کر لیا تھا یہ نہایت عمدہ بات تھی۔ اطہر صاحب نے دو مستند شہروں کے محاورے میں دخل دیا تو کس بنا پر۔ ستم تو یہ ہے کہ اطہر صاحب نے "خاکسار راقم" لکھ کے ایک اپنا شعر بھی مستی کے استعمال کی سند میں تحریر کیا ہے (ملاحظہ ہو جنوری ۱۹۲۰ء کے مخزن کا صفحہ ۲۴) انہیں یہ بھی معلوم نہیں کہ جواب میں اپنے کلام سے سند پاس کرنا اصول بحث کے خلاف ہے۔ وہ خواہ ہو یا نہ ہو اطہر صاحب کی زبان کو جانتا اور مانتا کون ہے۔ وہ آزاد ہیں، جو چاہتے ہیں کہتے ہیں اور جو چاہیں آئندہ کہیں۔ انہیں نہ کوئی ٹوکتا ہے نہ ٹوکے گا۔

اطہر صاحب نے سب سے پہلے مولانا آزاد کے لکھے ہوئے لفظ "ابتذال" پر بحث کی ہے۔ دہلی

اور فارسی کے لغات اور اسناد کو اُردو محاورے کی بحث میں بالائے طاق رکھنا چاہیئے۔ ہم نے جس لفظ کو (چاہے وہ کسی زبان کا ہو) جس تصرفِ لفظی یا معنوی کے ساتھ اُردو کی عام بول چال میں (میں نے عام لکھا ہے، عوام نہیں لکھا ہے) اختیار کر لیا ہے اُردو کے لئے وہی صحیح ہے۔ ابتذال کا محاورہ اُردو میں کلام (شعر وسخن) کے متعلق ایسا عام ہو گیا ہے کہ اسی جنوری کے مخزن میں صفحہ ۴۸ پر مرزا احسان احمد صاحب بی۔اے نے "ابتذال سے پرہیز" کی سرخی دے کے یوں اس محاورے کا استعمال کیا ہے " ان کے کلام میں اکثر ابتذال پایا جاتا ہے" "مبتذل خیالات تم کو ملیں گے" دوسری سرخی کے گیارہ سطروں کے مضمون میں پانچ مقاموں پر "ابتذال" اور ایک مقام پر "مبتذل" تحریر ہے۔ ہر جگہ اردو کے محاورے کو درست طریقے سے لکھا ہے۔ اطہر صاحب سے تو مرزا صاحب ہی محاورے کے زیادہ واقف کار نکلے۔ اگر دہلی اور لکھنؤ ابتذال اور مبتذل کو اپنے محاورے میں اصلی معانی کے خلاف بھی اختیار کئے ہوئے ہوں، تو اطہر صاحب کو یہ منصب حاصل نہیں ہے کہ وہ ان شہروں کی بول چال کے خلاف اپنی منطق بگھاریں۔ مولانا آزاد نے اُردو کے لحاظ سے لفظ ابتذال کا استعمال بالکل صحیح کیا ہے۔ عام طور پر مستی کا لفظ مبتذل نہیں ہے، لیکن جب یہ ابتذال کے پہلو پر استعمال میں لایا جائے گا تو ضرور اس عیب کا اطلاق اس پر ہو سکے گا۔

اطہر صاحب نے فلسفۂ اخلاق پر بھی چند سطریں لکھی ہیں۔ میں ذیل میں ان سطروں کی نقل درج کروں گا۔ مجھے افسوس ہے کہ اطہر صاحب نے اپنے اخلاق سے مولانا آزاد کے پاکیزہ اخلاق پر حملہ کیا ہے۔ اطہر صاحب کی عبارت یہ ہے (ملاحظہ ہو مخزن کا صفحہ ۲۲-۲۳):

> "بیشتر ایسے الفاظ ہیں جو طبقۂ اراذل کی زبان میں معنی مذموم و مفہوم فحش رکھتے ہیں، لیکن اعلیٰ طبقے کے لوگ ان مفاہیم و معانی سے گوشِ آشنا نہیں ہوتے۔ ایک مہذب شریف شخص کو کسی شعر میں کوئی پہلوئے ذم دکھائی نہیں دیتا اور ایک غیر مہذب ارذل آدمی اسی شعر میں اپنے مذاق سے معنی فحش و مذموم پیدا کر لیتا ہے۔ جو لوگ اونچے طبقۂ شرفا میں پرورش یافتہ ہیں اور ادنیٰ طبقے کے زدہ یا افراد کے اثر صحبت سے محفوظ ہیں ان کا ذہن بھی معنی مذموم کی جانب منتقل نہیں ہوتا، مگر یہ ضرور ماننا پڑے گا کہ کچھ الفاظ ایسے بھی ضرور ہیں جن سے ہر طبقے کے لوگ واقف ہیں۔ مولانا نے حضرت عزیز لکھنوی کے اس مصرعے میں:
>
> سامنے آئینہ تھا مستی تھی

پہلوے ذم بتایا ہے۔ مولانا کے خیال میں یہاں مستی سے مستیِ ... مفہوم ہوتی ہے۔ میرے نزدیک اس محل پر مستی سے مستیِ ... مفہوم نہیں ہوتی۔ لفظ آئینہ مقصود شاعر کو واضح طور پر ظاہر کر رہا ہے کہ آئینہ سامنے رکھا ہوا ہے اور حسن خود آرائی کی مستی چھائی ہوئی ہے۔ کوئی قرینہ مستیِ .... کا اس محل پر نہیں ہے[1]۔

اس لئے میں کہتا ہوں کہ یہ مصرع پہلوے ذم سے قطعاً پاک ہے"

میں ارباب فہم سے پوچھتا ہوں کہ اطہر صاحب کی عبارت کیا یہ نتیجہ نہیں نکالتی ہے کہ مولانا آزاد ایک غیر مہذب اور ارذل آدمی ہیں اور ان کی پرورش ادنیٰ طبقے کے فرد یا افراد میں ہوئی ہے۔ اس سبب سے انہوں نے مذموم معنی پیدا کر لئے۔ کیسی تعجب کی بات ہے کہ دو مستند شہروں کی طے شدہ بحث میں ایک ایسا شخص جو نہ دہلی اور لکھنؤ کی زبان جانے نہ محاورہ، خواہ مخواہ دخل دے کے کسی کو برا بھلا کہنا شروع کر دے۔ میں کہتا ہوں کہ صورت واقعہ اطہر صاحب کی تحریر کے برعکس ہوتی ہے۔ اراذل کی زبانیں مذموم باتوں میں مشاق ہوتی ہیں۔ وہ لوگ ذم کو سمجھتے ہی نہیں اور شرفا تہذیب کا لحاظ رکھ کے ذم کے الفاظ سے گریز رکھتے ہیں۔ وہ ذم کے پہلو کو اپنی عادت کے خلاف پا کے فوراً سمجھ لیتے ہیں۔

اور نوادر، تاجور صاحب (مخزن کے اڈیٹر) بھی اطہر صاحب کی رائے کے ساتھ ایک نوٹ سے اتفاق ظاہر کر کے زبان والے بن بیٹھے۔ یک نہ شد دو شد! میں جانتا ہوں کہ وہ فاضل ہیں اور یہ بھی میں کہتا ہوں کہ وہ پنجابیوں کی زبان کے معلم ہو سکتے ہیں جن کی اردو ابھی بچپن کے گہوارے میں جھول رہی ہے۔ لیکن ہماری زبان اور ہمارے محاورے وہ کیا جانیں۔

اب میں کہتا ہوں کہ فصحائے لکھنؤ کے محاورے میں یہ بات طے شدہ ہے کہ مستی کا لفظ جب تنہا بولا جائے گا تو ذم کا پہلو سمجھا جائے گا۔ اگر اس عیب سے کلام کو بچانا ہو تو لفظ مستی کو مضاف کر کے کسی ایسے لفظ کو مضاف الیہ کر دینا چاہیے جس سے تہذیب کا مطلب ظاہر ہو جائے جیسے مستیِ حسن یا مستیِ دولت وغیرہ۔ اگر کسی محل پر یہ صورت نہ بن پڑے تو کوئی ایسا کھلا ہوا اشارہ کر دینا چاہیے جو مستی کو اپنی جانب کھینچ کر ذم کے پہلو سے دور کر دے۔ ممکن ہے کہ دہلی کے فصحا بھی اسی تہذیب کے پابند ہوں۔ ایسا نہ ہوتا تو مولانا آزاد عزیز کو نہ ٹوکتے۔ مولانا آزاد نے جس اضافت کا ذکر کیا ہے وہ یہی ہے جس کی صراحت میں نے کر دی۔

۱۔ مولانا اطہر کی تنقید سے میں بھی متفق ہوں۔ لیکن باایں ہمہ حضرت عزیز کے مصرعے کی ساحد خراشی الآن کما کان کی مصداق ہے (تاجور)

عزیز کا یہ مصرع "سامنے آئینہ تھا مستی تھی" لکھنؤ کے محاورے سے یہ معنی دے رہا ہے کہ معشوق آئینہ سامنے رکھے ہوئے اپنے حسن کو دیکھ رہا تھا اور مذموم مستی اس پر چھائی ہوئی تھی۔ مولانا آزاد زبان کے نکات سے واقف تھے۔ انہوں نے یہ عیب دیکھ کے عزیز کو ٹوکا۔ عزیز لکھنوی ہیں وہ اپنے دعوے کو سمجھ گئے اور انہوں نے سنجیدگی سے اس گرفت کو تسلیم کر لیا۔ اطہر صاحب اور تاجور صاحب دونوں زبان دہلی اور زبان لکھنؤ کی باریکیوں سے ناواقف ہیں۔ خواہی نخواہی مدعی سست اور گواہ چست کی مثل پوری کرنے لگے۔ اطہر صاحب نے اپنی زبان اور اپنے خیال کی تائید میں کچھ ایسے اشعار بھی لکھے ہیں جن میں مستی کا لفظ کہا گیا ہے۔ فارسی کے اشعار فضول لکھے۔ بحث صرف اردو سے ہے۔ اردو بھی دہلی اور لکھنؤ کی۔ یہ اس لئے کہ محاورے کی چھیڑ چھاڑ دہلوی اور لکھنوی میں ہوئی تھی۔ اطہر صاحب نے یہیں ایک شعر اپنا بھی سند کے طور پر لکھا ہے۔ میں اُن کے شعر سے کچھ بحث نہ کروں گا۔ ان کی زبان اس قلمرو کی حدوں سے باہر ہے جس کو میں اس گفتگو میں اختیار کئے ہوئے ہوں۔ یعنی مولانا آزاد اور عزیز، یا یہ کہوں کہ دہلی اور لکھنؤ کی زبان۔ اطہر صاحب جب ٹکسال باہر ہیں تو وہ اپنی اردو کا سکہ جے پور میں چلا سکتے ہیں جہاں کھرے کھوٹے کی پرکھ نہیں ہو سکتی۔ یہاں جانچ کے لئے ہر متنفس کی زبان ایک کسوٹی ہے۔

اردو کے جو اشعار اطہر صاحب نے لکھے ہیں ان پر کچھ لکھنے سے پیشتر میں اتنا لکھ دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ غلطی ہر صورت سے غلطی ہے وہ کسی استاد ہی سے کیوں نہ ہو۔ اس کلیے سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا۔

اطہر صاحب نے غالب کا یہ مصرع لکھا ہے: ؎ "ورنہ ہم چھیڑیں گے رکھ کر عذر مستی ایک دن" اس کے نیچے یہ عبارت لکھی ہے:

"اس مصرعے میں عذر مستی کی ترکیب اضافی بھی مستی کو ... سے ممتاز اور ممیز نہیں کرتی ہے"

میں پوچھتا ہوں کہ پہلا مصرع کیوں نہیں لکھا گیا۔ وہی تو مستی کو ذم کے پہلو سے بچاتا ہے۔ پورا شعر یہ ہے:

ہم سے کھل جاؤ بوقت مے پرستی ایک دن ورنہ ہم چھیڑیں گے رکھ کر عذر مستی ایک دن

مے پرستی کا وقت صاف بتا رہا ہے کہ یہ مستی مے کی ہے نہ کہ مذموم۔

ترکیب اضافی کی حجت اطہر صاحب بیکار لائے۔ اضافت تو عذر میں ہے مستی میں نہیں ہے۔ جب مستی کا لفظ مضاف اور کوئی دوسرا لفظ اس کے بعد مضاف الیہ ہو گا تب ذم کا پہلو کبھی نہ نکلے گا جیسے مستیِ ناز، مستیِ دولت، مستیِ علم وغیرہ۔ مولانا آزاد کا مطلب ایسی ہی اضافت سے تھا۔ اگر اطہر صاحب کسی زباندان سے پوچھ لیتے۔

تو اس غلط فہمی سے بچ جاتے کہ مطلب مستی کی اضافت سے ہے اور وہ پیش کر رہے ہیں عذر کی اضافت۔

اطہر صاحب نے اس کے بعد امیر مینائی کا ایک شعر لکھا ہے اور پھر تھوڑی سی عبارت بھی تحریر کی ہے۔ ستم تو یہ کیا کہ شعر کا دوسرا مصرعہ غلط لکھ دیا۔ شعر یوں لکھا گیا ہے:

ہیں شاہد پرستی میں کچھ معذور اے واعظ جوانی کا نشہ ہے، بیخودی ہے جوش مستی ہے

صحیح مصرعہ ثانی یوں ہے: " .... + جوانی کا ہے نشہ، بیخودی ہے۔ جوش مستی ہے" (صنم خانۂ عشق)

اطہر صاحب اگر شعرائے اُردو کی صحیح زبان سے واقف ہوتے تو سمجھ جاتے کہ امیر مینائی نشے کو بلا تشدید شین بروزن فعَل کبھی نہ کہتے۔ صحیح زبان تو نشّہ بروزن فعْلُن ہے۔ اس شعر کے نیچے جو عبارت لکھی گئی ہے وہ یہ ہے:

"جوش مستی کی اضافت ترکیب سے بھی پہلوے ذم کی گنجائش باقی رہی"

اس فہم سخن کی داد کہاں تک دی جائے کہ کام تو مستی کی اضافت سے ہے لیکن کبھی عذر کی اضافت پیش کر دی جاتی ہے اور کبھی جوش کی اضافت۔

امیر مینائی کے مصرعے میں بھی غالب کے مصرعے کی طرح پہلوے ذم کی گنجائش ذرا بھی نہیں ہے۔ وہاں مے کی مستی ظاہر تھی اور یہاں نشۂ جوانی کی مستی ظاہر ہے۔ جب الفاظ سے ذم کا پہلو بچا ہوا ہے، تو مستی کی اضافت سے کسی دوسرے یا تہذیب لفظ کو مضاف الیہ بنا کے ذم سے بچانے کی ضرورت ہی نہ تھی۔

اطہر صاحب نے ان اشعار پر بھی کچھ بحث کی ہے جن کو لکھ کے مولانا آزاد نے ذم کی بعض صورتیں دکھائی تھیں۔ میں اس معاملے میں دخل دینا نہیں چاہتا۔ یہ محاورے سے جدا صرف فہم سے متعلق ہے۔ مولانا آزاد کچھ سمجھیں اور اطہر صاحب کچھ سمجھیں، اپنی اپنی سمجھ ہے۔ ہاں میں اتنا کہہ سکتا ہوں کہ فہم سخن کے لیے بھی زبان کے جاننے اور محاوروں سے واقف ہونے کی ضرورت ہے۔ ان دونوں میں مولانا آزاد اہل زبان ہیں اور اطہر صاحب زباندان بھی نہیں۔

اطہر صاحب نے لفظ تحریک پر بھی چند سطریں لکھی ہیں، مگر بیکار ہیں۔ عزیز نے اعتراض کے جواب میں عرفی کے قصیدے کا شعر دکھا دیا تھا، وہ کافی تھا۔ ایران کے شعرا نے بھی تحریک کو ترغیب کے معنی میں کہا ہے۔ ضمیری اصفہانی کہتا ہے:

فراموشم ز یادش بخت آنم کو کہ بدگوی دہد تحریک آزار من وازمن دہد یادش

اطہر صاحب نے اپنے مضمون کے آخری حصے میں مولانا آزاد کی تحریر کے بعض جزئیات پر آئندہ بھی کچھ

لکھنے کا ادعا کیا ہے۔ میں اُن کو دوستانہ یہ صلاح دیتا ہوں کہ پہلے وہ ایسی اُردو لکھنا سیکھ لیں جو دیکھنے والوں کے دماغوں کو تکلیف نہ دے، پھر کچھ لکھنے کا ارادہ کریں۔ ابھی تو ان کی تحریر میں سلاست، فصاحت اور لطافت کا یہ حال ہے کہ گویا صفحوں کی سرزمین پر کنکر اور پتھر بچھے ہوئے ہیں۔ مثلاً:

"تنافرِ حروف۔ یہ لفظ اوساط الناس اور اہلِ علم سب کی زبان پر ہے۔ مفاہیم معانی میں بعد و سعت پیدا کرتا ہے۔ ایک ادیب، ایک شاعر کو ان تمام مواقع کو بغیر عبور کیے ہوئے قدم قلم اٹھانا دشوار ہے۔ لوگ ان کو مفاہیم و معانی سے گوش آشنا نہیں ہوتے" اگر اعلام الناس کی عربی عبارت سے کتب طلیطلہ عربی میں تحریک اسی معنی میں مستعمل ہوا ہے۔"

کیا اُردو میں "اوساط الناس" سے صرف جاہلوں کا گروہ سمجھا جا سکتا ہے۔ کیا اُردو ایک ادیب "ایک شاعر اور "قدم قلم" کے بیچ میں عطف کی ضرورت نہیں رکھتی۔ کیا "تحریک" سے پیشتر لفظ کا لکھنا ضروری نہ تھا۔ اگر نہ تھا تو تحریک مونث ہے۔ اس کے لیے "ہوا ہے" فعل مذکر کس قاعدے سے لکھا گیا۔ اور لفظِ معنی کو فصحائے اُردو ہمیشہ صیغۂ جمع میں بولتے اور لکھتے ہیں۔ "اسی" کے استعمال سے صیغۂ واحد کا اظہار کیوں کیا گیا۔

یہ اُردو اور مولانا آزاد سے اردو کے محاورے پر بحث۔ اور وہ آزاد جن کی زبان اور جن کا قلم دونوں یکساں فصاحت کے وہ ابر ہیں جن سے موتی برستے ہیں۔

(اپریل ۱۹۲۰ء)

●●

محقق لکھنوی

"مستی" - اور - "تحریک"

جولائی ۱۹۲۰ء کے "مخزن" میں "مستی اور تحریک" کی سرخی کے ساتھ ایک مضمون منشی بادشاہ حسین صاحب قیصر اور رعنا لکھنوی کے نام سے شائع ہوا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ جب "گلکدہ" (یعنی دیوان جناب عزیز لکھنوی) چھپا، تو مصنف نے اس کی ایک جلد ریویو کی غرض سے مولانا آزاد دہلوی کے پاس بھیجی۔ مولانا نے تحریر فرمایا کہ "مستی" کا لفظ اردو میں بلا اضافت خالی از ابتذال نہیں ہے۔ اور لفظ "تحریک" کے معنی عربی میں یہ نہیں ہیں جن کا استعمال آج کل اُردو کی بول چال میں ہے۔ مولانا کا مضمون ہمدم میں دیکھ لیا جائے۔ مستی پر (جبکہ وہ بلا اضافت ہو) محاورۂ اُردو کے اعتبار سے گرفت کی گئی تھی اور تحریک پر عربی کی معنوی حیثیت سے۔ جناب عزیز کا جواب بھی ہمدم ہی میں نکلا جس میں دبے ہوئے الفاظ کے ساتھ سہی مگر مستی پر مولانا کا اعتراض تسلیم کر لیا گیا اور تحریک پر یہ صحیح سند پیش کی گئی کہ عرفی نے یہ معنی لیے ہیں جو جناب عزیز نے لیے۔ گویا اہل ایران نے تصرف معنوی کیا ہے۔ اُردو نے فارسی کی تقلید کی تو اعتراض کی گنجائش نہیں رہی۔

یہ بحث جناب عزیز کے جواب ہی پر ختم ہو گئی تھی۔ مگر چند دنوں کے بعد جناب اطہر ہاپوڑی نے پھر بے محل چھیڑ چھاڑ کی اور جنوری ۱۹۲۰ء کے "مخزن" میں) ایک مضمون شائع کرایا۔ جناب اطہر ہی کے قول سے ظاہر ہے کہ خود مصنف (یعنی جناب عزیز) تنہا مستی کے استعمال میں سقم تسلیم کر کے کم از کم اس کے ترک کو اولیٰ مانتے ہیں۔ مگر جناب اطہر نے جناب عزیز کے اس مصرع کو "سامنے آئینہ تھا مستی تھی" مقبول اور غیر مبتذل تجویز فرمایا۔ یہیں سے یہ بات ثابت ہوئی کہ تنہا لفظ مستی لکھنؤ کی بول چال میں ذم کا پہلو لیے ہوئے ہے مگر ہاپوڑ میں نہیں۔

جناب ادیب لکھنوی نے جناب اطہر ہاپوڑی کی رائے سے اختلاف کر کے اپنا مضمون لکھنؤ کے رسالہ "صبح امید" میں چھپوایا۔ جناب ادیب کے مضمون میں ایک لفظ بھی خلاف تہذیب نہیں تھا البتہ جناب اطہر کی بے راہداری اور انہیں کی نثر سے اُن کی فصیح اُردو دکھا دی گئی تھی۔ ان بحثوں کو زبان سے تعلق تھا مگر ادبی جواب کے بدلے جناب ادیب کو مخزن ہی میں ادب اور تہذیب کی شان دکھائی گئی یعنی خوب صلواتیں سنائی گئیں۔ وہ مضمون تو قابلِ التفات نہ تھا مگر اب ستمبر ۱۹۲۰ء کے مخزن میں جناب تاجور

اڈیٹر نے ایک مضمون جناب قیصرؔ اور رعناؔ کا اپنے نوٹ کے ساتھ شائع کیا ہے۔ پہلے تو جناب قیصر کی مدح سرائی کی ہے، پھر مضمون کو جناب ادیب لکھنوی کا مُسکت جواب قرار دیا ہے۔

جناب اڈیٹر یہ بھی لکھتے ہیں کہ "ہم کو سردست اس امر کے اظہار کی ضرورت نہیں ہے کہ ادیب لکھنوی کون بزرگ ہیں۔ مگر یہ طریقہ کہ راقم مضمون ایک علمی بحث میں اپنا نام نہ ظاہر کرے پسندیدہ نہیں ہے۔ کوئی وجہ بجز اس کے خیال میں نہیں آتی کہ مولانا اطہر کا رعب کمال اس درجہ ادیب لکھنوی پر چھایا ہوا ہے کہ وہ مولانا کے سامنے بے پردہ آنے کی جرأت نہ کر سکے۔"

یہ افسوس کی بات ہے کہ ہمارے ایشیائی اہل قلم مضامین علمی میں بھی ذاتیات پر آجاتے ہیں اور جب میں جناب تاجور کو ایڈیٹر کی صورت میں دیکھتا ہوں تو افسوس اور بھی بڑھ جاتا ہے۔ ارباب فہم کا استدلال اگر نفس مضمون سے تجاوز کر کے ذاتیات کی جانب جائے تو یہ اخلاقی جرم ہے۔ لہٰذا میں ہر ایسے خیال سے جس طرح اپنے دماغ کو بچانا فرض اخلاق سمجھتا ہوں اسی طرح اپنے قلم کو بھی بچاؤں گا۔

اخفائے نام کی وجہ جناب تاجور کے خیال میں سوا اس کے اور نہ آئی کہ جناب اطہر کا رعب جناب ادیب پر چھایا ہوا ہے۔ یہ وجہ تو بدیہۃ البطلان ہے۔ اگر رعب چھایا ہوتا تو تردیدی مضمون ہی کیوں لکھا جاتا۔ میرا خیال یہ ہے کہ اخفائے نام غالباً صرف اسی اندیشے سے کیا گیا تھا، جس کا ظہور جوابی مضامین کی طرز تحریر سے ہو رہا ہے۔ یعنی ادبی بحث میں ادب سے تجاوز۔

کمال کا ذکر اس محل پر نفس مضمون سے غیر متعلق ہے۔ ممکن ہے کہ کوئی شخص کسی علم میں کامل ہو مگر محاورات اُردو میں کامل نہ ہو۔ یا یہ کہ معاملہ اس کے برعکس ہو۔ جو بحث پیش ہے وہ لکھنؤ کی اُردو کی ہے نہ کہ اور کسی علم کی۔ غرض حکمائے علم کا فلسفہ یہ ہے "انظر الیٰ ما قال ولا تنظر الیٰ من قال"۔ چونکہ جناب تاجور نیز مضمون نگاران مخزن کی جانب سے اس فلسفۂ علمی کے خلاف عمل ہونے کا اندیشہ ہے لہٰذا مجھے بھی اپنے نام پر صفر قائم کرنا پڑے گا۔

میں جناب تاجور اور جناب قیصر اور رعنا سے اپنے با تہذیب جملوں کی بھی معافی چاہتا ہوں۔ میری رائے میں ذاتیات کی چھیڑ چھاڑ کا نتیجہ یہی نکلتا ہے کہ چلتی ہوئی بحث رُک جاتی ہے اور واقفیت کے با احتیاج علمی فیض سے محروم رہ جاتے ہیں۔ اگر اب بھی حضرات موصوف سب و شتم پر آمادہ ہو جائیں جیسا انہوں نے جوابی مضامین میں کیا ہے تو میں تہذیب کی داد دے کے اس صنف سخن میں ان معترضین کا کمال

تسلیم کر لوں گا۔

اب میں مضمون کی طرف متوجہ ہوتا ہوں۔ حضرات مضمون نگار لفظ مستی کے متعلق جناب عزیز کی رائے بجواب اعتراض مولانا آزاد ان الفاظ میں ظاہر کرتے ہیں " عزیز صاحب گو لفظ مستی میں عمومیت کے ساتھ ابتذال تسلیم نہیں فرماتے مگر تاہم اس کا ترک مرجح سمجھتے ہیں۔ لیکن ادیب اس ترک اولیٰ کو تسلیم اعتراض سے تعبیر کرتے ہیں۔" میں پوچھتا ہوں کہ کیا ترک اولیٰ کو جناب قیصر کوئی چھوٹی سی بات سمجھتے ہیں۔ کسی شخص سے اگر کوئی ایسا امر سرزد ہو جو اس سے سرزد نہ ہونا چاہیے تھا اور پھر وہ متنبہ ہو کے اسی امر کی نسبت یہ تسلیم کرے کہ اس کا ترک اُولیٰ تھا تو یقیناً یہی نتیجہ نکلے گا کہ اس امر میں ابتذال یا ذم یا کوئی نہ کوئی عیب ضرور تھا۔ جناب عزیز نے ترک کو مرجح کیوں قرار دیا۔ بلا شبہ وہ تنہا لفظ مستی کے استعمال میں لکھنو کی بول چال سے ذم کا پہلو سمجھ گئے۔ کیا عالم شاعری میں ذم جس کا ترک مرجح ہو حد ابتذال میں بھی نہیں آتا؟ پھر جناب ادیب ترک مرجح کے تسلیم کر لینے کو اگر تسلیم اعتراض سے تعبیر نہ کرتے تو کیا کرتے۔

لفظ مستی کے مقدمہ میں جناب اطہر کا استشہاد ایک گواہ سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا۔ تو پھر خود مدعا علیہ یعنی عزیز کے اقبال خطا کے سامنے جو بہ اقرار ترک اولیٰ ہے وہ استشہاد کس قدر قابل وقعت ہو سکتا ہے جو اس کا فیصلہ سخن سنجان زبان دان پر منحصر ہے، بالخصوص سخن گسترانِ لکھنو پر جہاں کا محاورۂ مقامی زیر بحث ہے۔ جناب عزیز کی وہ تحریر جس میں جناب اطہر کا مضمون "محققانہ" قرار دیا گیا ہے نہایت حیرت انگیز ہے۔ خود ہی جناب عزیز تنہا لفظ مستی کے ترک استعمال کو مرجح قرار دے کے معترف خطا ہوئے، اور خود ہی اپنے اقرار کے خلاف مضمون جناب اطہر کے موید بنے۔ اب یا تو اقرار جناب عزیز بے معنی ہے یا استشہاد جناب اطہر۔ جناب قیصر تحریر فرماتے ہیں:

"محقق فن جناب اطہر ہاپوڑی نے یہ رنگ دیکھ کر داد تحقیق دی اور سمجھایا کہ اردو میں لفظ مستی کے نہ تو استعمال بالاضافت میں ابتذال ہے اور نہ استعمال بلا اضافت میں پہلوے ذم ہے کیونکہ حقیقت ابتذال فی حد ذاتہ نہ کسی لفظ میں داخل ہے اور نہ استعمال لفظ سے متعلق ہے بلکہ ابتذال نام ہے محض کسی لفظ کے کثرت استعمال کا۔" کما قیل فی المطول "وقد یتصرف فی التشبیہ القریب المبتذل بما یجعلہ غریباً ویخرجہ من الابتذال" (اس عبارت میں کاتب نے یجعلہ کو یجعلکہ کر عبارت کو غلط کر دیا اور ناقل نے متن تلخیص المفتاح

اور شرح علامہ کو ملا کر لکھا ہے) بلکہ رفع توہم کے لئے مولانا اطہر نے اس کے ساتھ ہی یہ بھی لکھا کہ ابتذال تو درکنار لفظ مستی میں عدم فصاحت کا بھی عیب نہیں ہے اس لئے کہ نہ تنافر حروف ہے نہ مخالفت قیاس لغت ہے نہ غرابت۔ لہٰذا یہ اعتراض مولانا آزاد کا درست نہیں ہے اور یہ لفظ ادب اُردو و فارسی کا ناقابل ترک لفظ ہے۔"

مجھے جناب اطہر اور جناب قیصر دونوں کے استدلال پر تعجب ہے۔ عربی عبارت جو تحریر کی گئی اس کا مطلب تو یہ ہے کہ "کبھی تشبیہ قریب متبذل کسی خاص تصرف کی وجہ سے غریب ہو جاتی ہے اور اس کا ابتذال جاتا رہتا ہے۔ پھر اس بیان کو مسئلہ مبحوث عنہ سے کیا تعلق ہے۔ البتہ لفظ ابتذال اس عبارت میں آ گیا ہے۔ در اصل جو تشبیہ کثیر الاستعمال اور پیش پا افتادہ ہو وہ علمائے فن بلاغت کے نزدیک ضرور مبتذل ہے۔ مگر الفاظ کو تو کثیر الاستعمال ہی ہونا چاہیے۔ اگر وہ قلیل الاستعمال ہوں گے تو عبارت میں غرابت کا عیب پیدا ہو جائے گا جو منافی فصاحت ہے۔ لفظ مستی پر جناب آزاد نے قلت استعمال یا عدم فصاحت یا پہلوئے ذم کے پیدا ہونے کا اعتراض نہیں کیا ہے۔ بلکہ اُن کا مقصود یہ ہے کہ لفظ مستی بلا عطف و اضافت اہل زبان (یعنی دہلی اور لکھنؤ) کی اُردو اور ان شہروں کے فصحا کی بول چال اور ان کے محاورے میں بمعنی ہیجان قوت شہوانی ہے۔ بمعنی ازدیاد نشہ یا جوش غفلت نہیں ہے۔ یہ صحیح ہے اور صحت ہی کو تسلیم کر کے جناب عزیز لکھنوی نے تنہا لفظ مستی کے ترک استعمال کو مرجح قرار دیا۔ دو شہروں کے مقامی محاورے کی بحث وہیں مختتم ہو چکی۔ پھر جناب اطہر یا جناب قیصر کو غیر متعلق باتوں کے لکھنے کا کیا فائدہ تھا۔ یہ کس نے کہا کہ لفظ مستی ترک کر دیا جائے یا غیر فصیح ہے۔ جناب آزاد کا مطلب ابتذال سے اتنا ہی ہے کہ جب مطلق لفظ "مستی" نثر یا نظم میں لایا جاتا ہے، تو فصحائے دہلی و لکھنؤ کے محاورے سے تو بہ سبب اُس پہلو کے جس کا ذکر میں اوپر کر چکا ہوں اس عبارت یا شعر کا مفہوم اچھا نہیں رہتا۔ مفہوم اور خیال پر جناب آزاد کا اعتراض نہیں ہے جبکہ "مستی" کے ساتھ "لفظ" یعنی لفظ مستی کہہ کے اس بات کو ظاہر کر دیا کہ ابتذال سے ابتذال مصطلح مقصود نہیں ہے۔ پھر اس کو مسئلہ علمی سے کیا تعلق رہا۔ اس جھگڑے کو بول چال اور روز مرہ سے تعلق تھا۔ اسی وجہ سے جناب ادیب نے محاورۂ دہلی و لکھنؤ کو زیر بحث لیا۔

اب میں کہتا ہوں کہ جب یہ بحث دہلی اور لکھنؤ کے خاص محاورے سے متعلق ہو گئی ہے اور دہلی کا روز مرہ جناب آزاد کے اعتراض اور جناب عزیز کے جواب میں اختیار کیا گیا تو پھر جناب ادیب کا یہ لکھنا

بہت صحیح ہے کہ ان دونوں شہروں کی مقامی زبان اور تخصیصی محاورے میں کسی تیسری جگہ کے رہنے والے کو بولنے کا کچھ حق نہیں ہے۔

اس موقع پر یہ بات جتا دینے کی ہے کہ عام بول چال اور خاص بول چال ان دونوں میں فرق ہے۔ عام بول چال میں تمام ملک شریک ہے۔ مگر خاص بول چال میں وہی فصحا شریک ہو سکتے ہیں جو مقامی بود و باش سے اس زبان کے اہل زبان ہوں۔ ہر شہر اور ہر قصبے کے بعض مقامی محاورات ایسے ضرور ہیں جن سے دوسرے مقامات والے اس وقت تک واقف نہیں ہو سکتے جب تک اسی مقام کی سکونت سے وہ ان کو حاصل نہ کرلیں۔ اگر دہلی یا لکھنو کا رہنے والا باوجود ناواقفیت کے ایک دوسرے کے مقامی محاورے میں دخل دے تو کس قدر نازیبا امر ہے۔ فصحا واقف ہیں کہ دہلی اور لکھنو کے بہت سے محاورات میں اختلاف موجود ہے مگر ایک کو دوسرے پر گرفت کا حق نہیں۔ یہی اور صرف یہی وجہ ہے جس کی بنا پر جناب ادیب نے یہ تحریر کیا کہ مطلق لفظ مستی محاورۂ لکھنو میں اچھے معنی کے ساتھ مستعمل نہیں ہے اور چونکہ یہ خاص لکھنو کا مقامی محاورہ ہے اور فصحائے لکھنو نے مفہوم معنوی میں تصرف کرکے وہاں کی اُردو کے لئے مطلق لفظ مستی کو ہیجان جوش شہوانی کے مصطلح مفہوم یا اختیار کر لیا ہے لہٰذا جناب اطہر یا جناب تاجور کو اس میں دخل دینے کا حق نہیں ہے۔ اگر دخل دیں تو سوا اس کے کہ وہ وہاں کی زبان سے ناواقف سمجھے جائیں اور کیا کہا جائے۔ یہ ایسی بین دلیل ہے جس کی تردید کسی منطق سے نہیں ہو سکتی۔ اس صورت میں نہ جناب اطہر کو اور نہ جناب تاجور نہ جناب قیصر نہ کسی اور کو اظہار غضب کی ضرورت تھی نہ الفاظ غیر مہذب کے استعمال کی، جو شیوۂ ارباب علم نہ ہونا چاہیے۔ حضرات موصوف العدو ر مجھے معاف فرمائیں، گالیوں سے بحث محاورہ کا جواب نہیں ہو سکتا اور نہ غیر فصیح اُردو فصیح قرار پا سکتی ہے۔ اس ناسنجیدہ روش کا نتیجہ یہی ہو سکتا ہے کہ پرچے کی شایستگی پر حرف آئے اور مہذب شخص اپنے قلم کو اس قسم کے سوال و جواب کی گندگی سے آلودہ نہ کرے۔

ہاپڑ دہلی نہیں ہے لیکن مجھے اس محل پر نہ زبان ہاپڑ سے بحث ہے، نہ زبان دہلی سے۔ میری بحث کا مقصود صرف یہ ہے کہ جناب آزاد نے مطلق لفظ مستی کے استعمال پر جناب عزیز کو بجا ٹوکا۔ لکھنؤ کا مختص المقام محاورہ اس کے مفہوم اصطلاحی کو ضرور ابتذال کی جانب کھینچتا ہے۔ اور بالآخر جناب عزیز لکھنوی نے اپنے دھوکے کو قبول کرکے تنہا لفظ مستی کے ترک استعمال کو مرجح قرار دیا۔ اصطلاح لکھنو کے بدل دینے

کا اختیار نہ جناب اطہر کو ہے نہ جناب تاجور کو۔ یہی ماحصل ہے جناب ادیب کی بحث کا۔ جناب اطہر اور جناب تاجور سے نہ کوئی اصطلاح لکھنؤ کے اختیار کرنے کو کہتا ہے نہ زبان لکھنؤ کی تقلید کو، نہ کسی لفظ کے ترک کرنے کو۔ انہیں اپنی زبان کا اختیار ہے۔ مگر یہ حق ان کو کہاں سے حاصل ہوا کہ زبان لکھنؤ میں دخل دے کے فصحاے لکھنؤ کی اصطلاح خاص کے بطلان کا فتویٰ صادر فرمائیں۔

اس میں ذرا بھی گنجائش اشتباہ نہیں ہے کہ جناب آزاد کا اعتراض اور جناب عزیز کا جواب دونوں مفہوم اصطلاحی پر ہیں۔ ورنہ مستی کے لغوی معنی سے دونوں ناطلد قرار پائیں گے اور یہ قرین عقل نہیں؛ اس لیے کہ یہ لفظ کثرت کے ساتھ بول چال میں مستعمل ہے۔ اگر اصطلاح لکھنؤ کا یقین کامل جناب عزیز کو نہ ہوتا تو کوئی وجہ نہ تھی مستی مطلق کے ترک کو وہ اُردو میں اولیٰ قرار دیتے۔ لہٰذا لغوی معنی اور علم بلاغت کی حجت اس بحث میں خواہ مخواہ لائی جاتی ہے۔ وہ یقیناً اس محل سے غیر متعلق ہے۔ یہی مطلب جناب ادیب کا ہے۔ اور فصحاے لکھنؤ کی زبان اور اصطلاح کے اعتبار سے صحیح ہے۔ اس صورت میں جناب ادیب نے محاورے اور زبان کا ذکر کیا تو کیا بیجا کیا۔ البتہ اگر وہ اس موقع اصطلاح پر بحث بلاغت سے کام لیتے تو طبقۂ فصحاے لکھنؤ میں ان کی زبان پر حرف رکھا جاتا۔

جناب امیر مینائی رہ کے کلام سے جو سند پیش کی گئی ہے اس سے میں بعد کو بحث کروں گا۔ جناب داغ اور جناب اطہر کے اشعار سے بحث کی ضرورت نہیں۔ اس لیے کہ جناب عزیز لکھنوی ہیں۔ اور جناب ادیب نے صرف زبانِ لکھنؤ اور "مستی" کے محاورۂ خاص اور اصطلاح مقامی کو اہل لکھنؤ کے لیے قابل استعمال قرار دیا ہے لہٰذا نہ زبان دہلی معرض بحث میں ہے نہ زبان ہاپڑ۔

پہلے مجھے یہ لکھنا ہے کہ زندہ زبان میں ہمیشہ تغیرات ہوا کرتے ہیں۔ پندرہ بیس برسوں میں کچھ نہ کچھ تفاوت ضرور ہو جاتا ہے۔ دیکھیے جناب امیر مینائی اور جناب جلال مرحوم دونوں نے رنگ کا نام "اگری" (بہ فتح الف۔ و فتح کاف فارسی۔ و کسر رائے مہملہ۔ و یائے معروف) لکھا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پہلے زبان لکھنؤ یہی تھی۔ اس لیے کہ رند لکھنوی کا وہ دیوان جو سب سے پیشتر طبع ہوا تھا اس میں اگری یوں ہی (یعنی بلا ہمزہ) چھپا ہوا ہے: ع "اگری کا ہے گماں شک ہے ملاگیری کا"
مگر اب لکھنؤ کی عام بول چال اگرئی ہے (بہ فتح الف و سکون کاف فارسی و فتح رائے مہملہ دو دو یا یعنی ایک بصورت ہمزۂ مکسور اور دوسری معروف) امیر مینائی کے شعر کی زبان اور آج کی زبان میں فاصلۂ دراز واقع ہے

جسے تیس چالیس پچاس ساٹھ سال قرار دینا چاہیئے۔ کیا یہ محال ہے کہ اتنے عرصے میں مستی مطلق کے متعلق لکھنؤ کی اصطلاح حال نے زمانۂ گذشتہ کی زبان پر غلبہ حاصل کر لیا ہو۔ تغیر زبان کا کلیہ اور لکھنؤ کی اصطلاح مروجہ کا رواج تو ایسے تفاوت کو ممکن بلکہ بہت آسان قرار دیتا ہے۔ بالفرض کبھی فصحاے لکھنؤ مستی مطلق کو معنی زیادتی نشہ بھی بولتے ہوں مگر آج نہیں بولتے، صرف بہ معنی ہیجان شہوانی بولتے ہیں:

اب میں امیر مینائی کا وہ شعر لکھتا ہوں جس کو جناب اطہر نے مستی مطلق کی بحث میں سنداً تحریر فرمایا ہے: ؎

ہمیں شاہد پرستی میں سمجھ معذور لے واعظ جوانی کا ہے نشہ بیخودی ہے جوش مستی پر

اس شعر میں تنہا لفظ مستی کہاں ہے۔ تعجب ہے کہ مستی مطلق کی سند میں پیش کیا گیا یہ "جوانی کا نشہ" موجود ہے۔ یہ جوش مستی جو اس شعر میں ہے نشۂ جوانی سے ہے۔ جناب آزاد اور جناب ادیب مستی نشہ کو کب محاورۂ لکھنؤ کے خلاف کہتے ہیں۔ وہ تو مستی مطلق کو کہتے ہیں، جو اس مصرع جناب عزیز میں ہے۔ مصرع

"سامنے آئینہ تھا مستی تھی"

تعجب پر تعجب یہ ہے کہ جناب اطہر نے اس اضافت کو جس کا ذکر جناب آزاد نے کیا ہے جوش مستی سے دکھایا ہے۔ یعنی امیر مینائی کے شعر میں جوش مستی موجود ہے۔ جناب اطہر کی عبارت یہ ہے:

"جوش مستی کی اضافت ترکیب سے بھی پہلوے ذم کی گنجائش باقی رہی"

جناب آزاد کی تحریر کا یہ مطلب ہی نہیں ہے وہ تو لفظ مستی کی اضافت چاہتے ہیں۔ جیسے مستیِ حسن، مستیِ مے، مستیِ دولت۔

جناب ادیب نے جناب اطہر کی اُردو کے جملے جو اپنے مضمون میں دکھائے ہیں ان پر کوئی اعتراض مقصود نہیں ہے۔ ان کی تحریر خود ظاہر کر رہی ہے کہ وہ سلیس، فصیح اور منشیانہ اُردو کے پسند کرنے والے ہیں۔ فی الحقیقت نثر اُردو کچھ نظم اردو سے کم درجہ نہیں رکھتی۔ بلکہ بہ نظر انصاف ملاحظہ ہو، تو نثر بہ نسبت نظم کے زیادہ مشکل ہے۔ نظم میں الفاظ کے الٹ پھیر سے آسانیاں پیدا ہو جاتی ہیں، لیکن نثر کا ایک لفظ بھی اگر غیر مانوس یا ثقیل ہوا یا بے محل صرف کیا گیا تو مخل فصاحت ہو جاتا ہے اور وہ نثر پایۂ لطافت سے نیچے گر جاتی ہے۔ غرض نثر وہی تمغۂ خوبی حاصل کر سکتی ہے جو سلیس اور فصیح ہو اور صحیح یہ ہے کہ راقم نثر جس قدر زبان پر حاوی ہوگا، اسی قدر اس کی نثر (بلکہ نظم بھی) سلیس اور فصیح ہوگی۔

نثر اور نظم دونوں کا اندازہ کرنے کے لیے تمام ہندوستان پر نگاہ جستجو ڈالی جائے تو نثر سلیس اور فصیح کے لکھنے والے شاذ ہی نظر آئیں گے۔ حالانکہ نظم کے لکھنے والے بے شمار ملیں گے۔

جناب ادیب نے 'ایک ادیب۔ ایک شاعر' کے درمیان میں واو عاطفہ کی ضرورت خیال کی ہے۔ میں اس گرفت میں جناب ادیب سے متفق نہیں ہوں۔ واو عاطفہ ضروری نہیں ہے، اگر ہو تو بہتر اور نہ ہو تو کچھ مضائقہ نہیں۔

جناب ادیب نے اعتراضاً یہ لکھا کہ فصحائے اردو معنی کو جمع کے ساتھ بولتے ہیں۔ صیغۂ واحد میں نہیں بولتے۔ (مثلاً۔ یوں کہتے ہیں۔ اس لفظ کے یہ معنی ہیں، یوں نہیں کہتے 'اس لفظ کا یہ معنی ہے') جناب قیصر نے تحریر فرمایا کہ مجھے اس (اعتراض) میں شبہ ہے اور یہ شعر جناب فصیح الملک مرحوم کا لکھا:

بولتے ہو موت کے معنی میں تم لفظِ وصال ۔۔۔ اور بھی تو اک محل پر اس کا استعمال ہے

اس شعر میں لفظ معنی کے لئے نہ فعل واحد لایا گیا ہے نہ فعل جمع۔ پھر جناب قیصر کا مدعا کیوں کر ثابت ہو سکتا ہے۔ جناب ادیب کہہ سکتے ہیں کہ یہاں بھی جمع ہے۔ اس دعوی کی تردید جناب قیصر کس دلیل سے کر سکیں گے۔ میری یاد جہاں تک کام کرتی ہے میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ فصحائے اردو کی نظم سے معنی کے فعل واحد کی سند شاید جناب قیصر کو نہ مل سکے۔

جناب ادیب نے جناب اطہر کے مضمون کی عبارت سے یہ نتیجہ نکالا تھا کہ جناب اطہر نے جناب آزاد کو بھی اراذل میں شمار کیا ہے۔ عبارت طویل ہے۔ اس کے یہاں لکھنے کی ضرورت نہیں۔ خصوصاً ایسی حالت میں کہ جناب قیصر خود اس باتہذیب اعتراض کے جواب سے مجبور ہو کے یہ عبارت ذیل جناب اطہر کو رفع اعتراض کی جانب متوجہ کرتے ہیں:

"میرا غالب خیال ہے کہ مولانا اطہر بجائے خود اس اتہام کے رفع اور رد میں کچھ نہ کچھ ضرور تحریر فرمائیں گے۔ بات صرف اتنی ہے کہ ابتذال کے متعلق لکھتے لکھتے عمومیت کی جانب ذہن متبادر اور منتقل ہوا اور مولانا اطہر یہ بھی لکھتے چلے گئے۔"

جناب ادیب کی اس معنی آفرینی بجا ہے جناب قیصر ضرور منفعل ہوئے۔ استاد (جناب اطہر) سے بھی اعانت چاہی اور عمومیت سے بھی تاویل فرمائی۔ مگر امر صحیح یہ ہے کہ جواب کے لیے کوئی بات بنائے نہ بنی۔ عام میں تو مفہوم خاص داخل ہے جب تک کہ استثنا نہ کر دیا جائے تبھی تو اعتراض جناب ادیب کا ہے۔ ورنہ وہ نہ تو پہلے سے جناب آزاد کو رذیلوں میں داخل کرتے تھے اور نہ جناب اطہر کے اس جملے سے رذیل سمجھنے لگے۔

میں نے چاہا تھا کہ جناب اطہر کی وہ طویل عبارت نہ لکھوں جس پر جناب ادیب نے یہ اعتراض کیا ہے کہ جناب اطہر نے جناب آزاد کو اراذل میں داخل کیا۔ مگر جناب قیصر نے باوجود اس بات کے کہ اعتراض جناب ادیب کے جواب سے مجبور ہو کے جناب اطہر سے بھی اعانت چاہی ہے اور خود بھی عمومیت کی تاویل غلط فرمائی ہے، پھر بھی یہ جملہ تحریر فرمایا ہے: "یہ محض حضرت ادیب کی خوش فہمی اور شرافت نفسی ہے" اس مجبوری سے مجھے وہ عبارت نقل کرنا ہی پڑی تاکہ ارباب فہم بغیر میرے کچھ لکھے ہوئے خود فیصلہ فرمالیں کہ خوش فہمی اور شرافت نفسی کس کی ہے۔

ممکن ہے کہ مضامین ماسبق جو اس بحث میں مطبوعہ ہوئے ہیں ان کا مطلب ارباب معانی اور اصحاب فہم کی یاد میں اس وقت نہ ہو۔ لہٰذا مجھے اس قدر تحریر کر دینا ضروری معلوم ہوا کہ جناب آزاد نے اس مصرع جناب عزیز پر ؎ "سامنے آئینہ تھا مستی تھی" یہ تحریر فرمایا تھا کہ "مستی مطلق" کے استعمال میں ابتذال ہے (میں نے مفہوم معنوی لیا ہے، مولانا آزاد کے الفاظ نہیں لیے ہیں) جناب اطہر نے اپنے مضمون میں جو بہ تردید تحریر جناب آزاد رقم فرمایا طرز معاشرت کا ایک کلیہ بیان کیا جس کلیے کا نتیجہ جناب آزاد کا فرقۂ اراذل میں ہونا ثابت کر رہا ہے۔ جناب اطہر کی عبارت حسب ذیل ہے:

"اور بیشتر ایسے الفاظ ہیں جو طبقۂ اراذل کی زبان میں معنی مذموم و مفہوم فحش نہیں رکھتے ہیں لیکن اعلیٰ طبقے کے لوگ۔ ان مطالب و معانی سے گوش آشنا نہیں ہوتے۔ ایک مہذب شریف شخص کو کسی شعر میں کوئی پہلوے ذم دکھائی نہیں دیتا۔ اور ایک غیر مہذب ارذل آدمی اسی شعر میں اپنے مذاق سے معنی فحش و مذموم پیدا کر لیتا ہے۔ جو لوگ اونچے طبقۂ شرفا میں پرورش یافتہ ہیں اور ادنیٰ طبقے کے ذوبائے افراد کے اثر صحبت سے محفوظ ہیں ان کا ذہن بھی معنی مذموم کی جانب منتقل نہیں ہوتا۔ مگر یہ ضرور ماننا پڑے گا کہ کچھ الفاظ ایسے بھی ضرور ہیں جن سے ہر طبقے کے لوگ واقف ہیں۔ مولانا نے حضرت عزیز لکھنوی کے اس مصرع میں ؎:
"سامنے آئینہ تھا مستی تھی" پہلوے ذم بنایا ہے۔ مولانا کے خیال میں یہاں مستی سے مستیِ ... مفہوم ہوتی ہے۔ میرے نزدیک اس محل پر مستی سے مستیِ ... مفہوم نہیں ہوتی۔ لفظ آئینہ مقصود شاعر کو واضح طور پر ظاہر کر رہا ہے کہ آئینہ سامنے رکھا ہوا ہے اور حسن خود آرائی کی مستی چھائی ہوئی ہے۔ کوئی قرینہ مستیِ ... کا اس محل پر نہیں ہے اس لیے میں کہتا ہوں کہ یہ مصرع پہلوے ذم سے قطعاً پاک ہے۔

یہ تمام عبارت مولانا آزاد کو بہ ہر نوع رذیل، غیر مہذب، افراد فرومایہ کا صحبت یافتہ اور بہ پہلوئے ذم کا خوگر ظاہر کر رہی ہے یا نہیں۔ ارباب فہم و معانی سے اسی کا تصفیہ مطلوب ہے اور وہ حضرات بزبان انصاف یہ فرمائیں کہ مولانا آزاد سے معزز ذی علم اور مقبول ملک کی ذات پر جو حملہ کیا گیا ہے یہ کس جرم کی سزا میں ہے۔ اور اب "خوش فہمی اور شرافت نفسی" کے الفاظ مرقومۂ جناب قیصر کا مستحق کون ہے۔

جناب اطہر مجھے معاف فرمائیں۔ ان کی عبارت مرقومہ بالا میں ایک جگہ یہ الفاظ ہیں "مستی چھائی ہوئی ہے۔" "اصطلاح لکھنؤ میں" "چھانے" کے ساتھ "مستی" کا مفہوم بالخصوص بہ پہلوئے ذم ہی کے ساتھ ہے۔ یہ اعتراض نہیں ہے۔ صرف فصحائے لکھنؤ کی مقامی اصطلاح کا ذکر ہے۔

جناب قیصر آخر میں لکھتے ہیں کہ "ادیب صاحب مضمون کے سمجھنے میں قاصر رہے۔ چند فقرے اور بھی اسی ضمن میں ہیں۔ جناب قیصر ہی پر کچھ منحصر نہیں ہے۔ ابھی تک ایشیا کا مذاق یہی ہے کہ زیادہ تر لوگ کسی مسئلہ علمی یا اعتراض کا جواب اسی ڈھنگ سے لکھتے ہیں، گویا معترض اور مجیب میں بیر ہے۔ مگر یہ طرز تحریر شائستگی اور مذاق علم و فن کے خلاف ہے۔ جناب قیصر کے ان جملوں کا نیز ان تمام جملوں کا ذکر بھی میں خلاف تہذیب سمجھتا ہوں، جو ذاتیات سے متعلق ہیں۔ ارباب فہم خود سمجھ سکتے ہیں کہ بحث ایک محاورۂ لکھنؤ پر تھی اور بالیقین جناب ادیب زبان دانِ لکھنؤ ہیں۔ گو مجھ سے اور ان سے شناسائی نہ ہو لیکن ان کا مضمون ضرور میری نگاہ سے گزرا، اور وہ لفظ مستی کے متعلق معیار اصطلاح لکھنؤ پر ٹکسالی تھا۔ میں جس طرح جناب ادیب سے ناواقف ہوں اسی طرح جناب اطہر اور جناب قیصر سے بھی ناواقف ہوں مگر یہ مضمون میں نے صرف اس ضرورت سے تحریر کیا کہ ایک اصطلاح لکھنؤ ہے جو متنازعہ ہے اور مجھے بھی اس کی واقفیت کی عزت حاصل ہے۔ جب یہ مضمون غیر متعلق حضرات کی نگاہوں کے سامنے پڑے گا، تو ان کو نتیجہ صحیح نکالنے کا موقع ملے گا۔ تعرف الاشیاء باضدادہا۔ والسلام علیٰ من اتبع الہدیٰ۔

(اکتوبر ۱۹۲۰ء)

●●

اُردو میں انگریزی الفاظ

ہم اس کے قطعی خلاف ہیں کہ اُردو یا ہندی میں خواہ مخواہ انگریزی الفاظ داخل کیے جائیں مگر اس کے ساتھ ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ محض انگریزی کی جگہ عربی الفاظ قائم کر دینے میں کیا خوبی ہے۔ ایک "یونیورسٹی" ہی کے لفظ کو لیجیے کیا یہ کہا جا سکتا ہے کہ "جامعہ" یا "وشو ودیالیہ" کا لفظ یونیورسٹی کے لفظ کے مقابلہ میں زیادہ مانوس اور عام فہم ہے ہر زندہ زبان دوسری زبانوں سے الفاظ لیتی ہے۔ ہاں اس کا البتہ خیال رکھنا چاہیے کہ الفاظ اس شکل میں داخل ہوں کہ جن کے قبول کرنے کی زبان میں صلاحیت ہے۔

(ہمارے معاصرین (اقتباس)، دسمبر ۱۹۱۰ء)

ہماری زبان

"صبح امید" کے ستمبر نمبر میں میں نے مولانا مودودی کا آرٹیکل اُردو زبان کے مستقبل پر نہایت دلچسپی سے پڑھا۔ اس سے پہلے میں نے اتفاق سے ایک آرٹیکل 'مخزن' میں عربی زبان کے "ام السنہ" ہونے کے بارے میں پڑھا تھا۔ میرے دل میں چند خیالات زبان کے بارے میں کچھ عرصہ سے جوش دکھا رہے ہیں جو میں اپنے ہموطنوں کے سامنے پیش کرنا چاہتا ہوں۔

زبان محض ایک آلہ ہے تبادلہ خیالات کا، رفع حاجات کا، آپس میں گفتگو کرنے کا۔ مختلف گروہ انسانوں کے مختلف زبانیں بولتے ہیں، کیونکہ ساری دنیا کی زبانیں ایک ہی وقت میں ایجاد نہیں ہوئیں۔ جیسے قومیں اور جماعتیں پیدا ہوتی ہیں۔ نشو ونما پاتی ہیں۔ بوڑھی ہو جاتی ہیں اور مر جاتی ہیں۔ ایسا ہی حال زبانوں کا ہے۔ وہ شخص زندہ ہے جو بڑھتا رہتا ہے اور ترقی کرتا رہتا ہے۔ تبدیلی زندگی کی نشانی ہے۔ اپنے آپ کو حالات کے مطابق تبدیل کرنا، اپنے اردگرد کے حالات سے فائدہ اٹھانا اور اپنے مزاج کے مطابق ترقی کرتے رہنا زندگی کی علامات میں سے ہیں۔ جو قوم تبدیلی و ترقی کے ناقابل ہو جاتی ہے وہ مر جاتی ہے۔ عمر کے ایک مرحلہ پر پہونچکر انسان مزید تبدیلی و ترقی کے ناقابل ہو جاتا ہے۔ اس کا جسم کام نہیں کرتا اس لیے وہ مر جاتا ہے۔ یہی اصول بڑی حد تک زبانوں پر حاوی ہیں۔

زبانوں سے مختلف قوموں کی شناخت ہوتی ہے۔ اس لیے زبان قومی تمیز کا ایک زبردست آلہ ہے۔ قومی زبان قومی ترقی کی کسوٹی ہے۔ قومی لٹریچر اس کسوٹی کی پرکھ ہے۔ ہندوستانیوں کے عام اتفاق پر جو لوگ نکتہ چینی کرتے ہیں وہ منجملہ دیگر اسباب نا اتفاقی کے ایک باعث یہ بھی بتلاتے ہیں کہ ہمارے ملک میں اس قدر زبانیں ہیں کہ ہم اچھی طرح سے ایک دوسرے کی بات نہیں سمجھ سکتے اور آپس میں ایک زبان میں گفتگو نہیں کر سکتے۔ یہ نکتہ چینی بے بنیاد نہیں ہے اور اس میں شک نہیں کہ زبان اور رسم الخط کے سوال ہماری آئندہ قومی ترقی کے ساتھ بہت حد تک وابستہ ہیں اور ان کے حل کرنے میں ہمکو عقل سلیم اور ضروریات قومی سے مدد لینی چاہیئے۔ تعصب، طرفداری، مذہبی پاس اور شخصی نفع و نقصان اور جماعتی جنبہ داری کو برطرف رکھنا چاہیئے۔ ایسا کرنا قریباً ناممکن ہے۔ کیونکہ انسان ان سب چیزوں کا ایک مجموعہ ہے۔

۱۔ یہ آرٹیکل (۲) ملاحظہ ہو

ہر ایک انسان اپنے آپ کو تعصب سے خالی سمجھتا ہے اور دوسروں کو نصیحت کرتا ہے۔ مگر حقیقت میں کوئی بھی انسان کلیتہً تعصب سے خالی نہیں ہے۔ بعض تعصب ایسے ہیں جو وراثت میں ملتے ہیں۔ چند دیگر ایسے ہیں جو ہم اپنی تعلیم اور تربیت سے حاصل کرتے ہیں۔ بعض ایسے ہیں جو ہم اپنی منفعت کے خیال سے جمع کرتے ہیں۔ غرض جوں جوں ہم بڑے ہوتے ہیں ہمارے تعصبات کا خزانہ بڑھتا و گھٹتا رہتا ہے۔ حتیٰ کہ شاذ ہی کوئی انسان ایسا ہو جو انصاف سے یہ کہہ سکے کہ وہ بالکل بلا تعصب ہے۔ خیر یہ تو جملہ معترضہ تھا۔ قومی زبان کے حل کرنے میں ہمیں کوشش کرنا چاہیے کہ محض قومی نفع و نقصان کی بنا پر اس کی بحث کریں۔ جہاں تک ہو سکے مذہبی و دیگر قسم کی جذبہ داری کو اس بحث سے خارج رکھیں۔

اوّل یہ ظاہر ہے کہ ہم سنسکرت، عربی و فارسی میں سے کسی کو ہندوستان کی قومی زبان نہیں بنا سکتے ہیں۔ یہ تینوں زبانیں ہمارے لیے پیاری ہیں۔ ہماری قدیم تاریخ، ہمارا قدیم لٹریچر اور ہماری مذہبی کتابیں اُن زبانوں میں ہیں۔ وہ ہماری سابقہ بزرگی اور عظمت کی شہادتیں ہیں۔ ہم کو اُن سے پیار ہے۔ ہمارے دل میں ان کی عزت ہے۔ مگر یہ ظاہر ہے کہ باوجود اس محبت و عزت کے ہم اُن میں سے کسی کو بھی ہندوستان کی قومی زبان کا رتبہ نہیں دے سکتے۔

سنسکرت زبان ایک معنی میں مردہ ہے۔ ہندوستان کی کوئی جماعت اپنی روزمرہ کی ضروریات کے لیے اس زبان کو استعمال نہیں کرتی۔ مگر جس حد تک یہ زبان ہندوؤں کے مذہبی، اخلاقی و قومی ضروریات کو پورا کرتی ہے وہ زندہ ہے اور ہندو کبھی بھی اس کو ترک نہیں کر سکتے۔ سنسکرت زبان میں جو لٹریچر پایا جاتا ہے وہ اس قدر بے بہا ہے کہ نہ صرف ہندوستان بلکہ دنیا بھی اس کے مطالعہ سے محروم نہیں ہو سکتی۔ سنسکرت ہمیشہ زندہ رہے گی اس میں شک نہیں۔ دنیا میں سنسکرت کا مطالعہ روز افزوں ہے۔ ہندوستان میں بھی سنسکرت کے مطالعہ کی طرف روز افزوں توجہ ہے اور یہ امر ہماری خوشی کا باعث ہے۔

عربی و فارسی زبانیں زندہ ہیں۔ اگرچہ جدید عربی و فارسی قدیم عربی و پہلوی فارسی سے بہت درجہ مختلف ہیں۔ تاہم کثیر تعداد ایشیائی اور افریقن انسانوں کی اپنی روزمرہ کی ضروریات کے لیے ان زبانوں کو استعمال کرتی ہے۔ عربی نہ صرف عربستان میں بلکہ ایشیائے کوچک، افریقہ و شمالی افریقہ میں بولی جاتی ہے۔ امریکہ کے رہنے والے شامی عیسائی بھی عربی کو استعمال کرتے ہیں۔ اُن کے اخبار عربی میں نکلتے ہیں۔ اسی طرح فارسی ایران، افغانستان و سنٹرل ایشیا میں بولی اور پڑھی و لکھی جاتی ہے۔

کچھ عرصہ سے ہندو عربی و فارسی کا مطالعہ ترک کرتے جاتے ہیں۔ یہ اُن کی غلطی ہے۔ ہم نہیں کہتے کہ سنسکرت و عربی و فارسی ہر ایک بچے کو پڑھائے جائیں۔ ہم نہیں چاہتے کہ کثیر تعداد طلبا کا وقت ان زبانوں کے مطالعہ میں صرف ہو۔ لیکن ہم یہ بتا دینا چاہتے ہیں کہ اگر ہندوستانی ایشیائی مغربی قوموں سے رشتہ اتحاد والفت کا پیدا کرنا چاہتے ہیں، اُن سے کاروبار کرنا چاہتے ہیں تو ان کا فرض ہے کہ عربی و فارسی کا مطالعہ جاری رکھیں اور جدید عربی و فارسی میں مہارت پیدا کرنے کی کوشش کریں۔ عربی و فارسی کے پروفیسر و اُستاد ایران و مصر و عرب سے حاصل کرنے چاہئیں۔ ہندوستانی مولوی جدید عربی و فارسی سے پورے ماہر نہیں ہیں اور وہ ہم کو جدید عربی و فارسی کی تعلیم نہیں دے سکتے۔

اس موقع پر یہ کہنا بے محل نہ ہوگا کہ قومی، تعلیمی، پولیٹکل اور اکانامک ترقی کے لیے ہم کو قدیم اور زمانۂ حال کی (یعنی ماڈرن) زبانوں میں تمیز کرنی چاہیئے۔ قدیم زبانیں بیشک بہت حد تک فضیلت و علمیت و مذہب کی کانیں ہیں۔ تہذیب و تحقیق کے لیے اُن کا جاننا ضروری ہے۔ مگر دنیا میں تحقیق کا کام صرف معدودے چند کر سکتے ہیں۔ قوموں کی قومیں تحقیق کے کام میں مصروف نہیں ہو سکتیں۔ مگر زمانہ حال کی زبانوں کا مطالعہ بہت ضروری ہے۔ یہ زبانیں ہم کو دنیا کی دیگر قوموں سے تعلقات پیدا کرنے میں مدد دیں گی۔ ان زبانوں میں زمانہ حال کی عجیب و غریب معلومات بند ہیں جن کا جاننا اور جن میں مہارت پیدا کرنا ہمارا فرض ہے۔ ماڈرن زبانوں کی واقفیت اور اشاعت کے بغیر ہم کو دنیا کے حالات سے پوری آگاہی نہیں ہو سکتی اور ہم زندہ دنیا میں زندہ قوم کا درجہ حاصل نہیں کر سکتے۔ اس لیے میں اپنے ہموطنوں کو اس امر کی طرف متوجہ کرنا چاہتا ہوں کہ جہاں ان کی قدیم متبرک زبانیں تحقیق و ادائے فرائض مذہبی کے لیے ضروری ہیں وہاں دنیا کی تمام ماڈرن زبانیں ہماری موجودہ ضروریات زندگی کے لیے ضرورتر ہیں اور ہر ایک تعلیم یافتہ ہندوستانی کا فرض ہے کہ کوئی نہ کوئی ماڈرن زبان جانتا ہو۔ اس طرح یورپ کی زبانیں ہماری علمی و تہذیبی ترقی کے لیے ضروری ہیں۔ مضمون کے اس حصہ کو میں یہاں پر ترک کرتا ہوں۔ کیونکہ مجھے اصلی مضمون پر ابھی کچھ عرض کرنا ہے۔

مسلمانوں کا دعویٰ ہے کہ اُردو دس کروڑ ہندوستانیوں کی زبان ہے۔ ہندوؤں کا دعویٰ ہے کہ ہندی بیس کروڑ ہندوستانیوں کی زبان ہے۔ دونوں دعاوی صحیح ہیں۔ جو زبان بیس کروڑ ہندوستانی سمجھتے ہیں وہ نہ اُردو ہے، نہ ہندی ہے بلکہ ہندوستانی ہے وہ زبان نہ تو "صبح امید" کی زبان ہے، نہ "سرسوتی" کی زبان ہے بلکہ وہ عام ہندوستانی ہے جن میں نہ عربی و فارسی کے اور نہ سنسکرت کے مشکل الفاظ

بنے ہوئے ہیں۔ ہم دونوں مسلمانوں اور ہندؤوں سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ اس امر پر توجہ دیں کہ اگر وہ حقیقت میں ہندوستانی کو ہندوستان کی قومی زبان بنانا چاہتے ہیں، تو اس اُردو ہندی کے جھگڑے کو چھوڑ دیں اور اصلی ہندوستانی کو فروغ دینے کی کوشش کریں۔

جو لوگ اُردو لٹریچر لکھیں گے، خواہ وہ نثر ہو یا نظم ہو وہ فارسی و عربی کے الفاظ کے استعمال سے گریز نہیں کر سکتے۔ اُن کی نگاہوں میں زبان مزیدار و لطیف نہیں بنتی جب تک کہ وہ ذرا دقیق نہ ہو۔ علی ہذا ہندی لٹریچر کے لکھنے والے بھی ایسا ہی سمجھتے ہیں۔ مگر ہم دونوں سے عرض کیے دیتے ہیں کہ اپنی اپنی زبانوں کو دقیق بنانے کی کوشش میں وہ حقیقت میں ہندوستانی زبان کی ترقی و اشاعت کے دشمن بن گئے ہیں۔ ہماری کوشش یہ ہونی چاہیئے کہ ہندوستانی نہایت آسان اور سلیس بنے۔ کسی درجہ تک اُردو لٹریچر کے لیے فارسی و عربی کا استعمال و فارسی و عربی لٹریچر کے اشارات و کنایات کا استعمال ضروری ہے۔ ایسا ہی ہندی لٹریچر میں سنسکرت الفاظ کا استعمال اور سنسکرت زبان کے محاورات، اشارات و کنایات کا قدرے استعمال لابدی ہے لیکن زبان کی خوبی اس میں ہے کہ اُس میں اعلیٰ سے اعلیٰ اور مشکل سے مشکل خیالات آسان سے آسان زبان میں ادا کیے گئے ہوں۔ انگلستان و امریکا میں جو انگریزی اہل قلم استاد و مصنف اس وقت سب سے زیادہ عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں وہ وہ ہیں جو نہایت کم یعنی استعمال لاطینی و یونانی الفاظ کا کرتے ہیں اور جو اپنے خیال کو مروجہ زبان میں نہایت آسان الفاظ میں ادا کرتے ہیں۔ ماڈرن زبانوں کے بہت سے جملے فقرے و محاورات انگریزی میں داخل ہوتے جاتے ہیں۔ مگر گریک اور لاطینی محاورات کا استعمال دن بدن کمی پر ہے۔

لٹریچر ایک آرٹ ہے۔ آرٹ کی خوبصورتی اُس کی سادگی پر ہے۔ عبارت کی خوبصورتی مشکل الفاظ پر انحصار نہیں رکھتی بلکہ اُن کی بندش پر۔ فقروں کی بندش، اُن کی ترکیب اور خیالات کی عمدگی لٹریچر کے اوصاف ہیں۔ دقیق الفاظ کا استعمال اور فقروں کی مشکل بندش اور اُن کا طولانی پن عمدہ لٹریچر کی شہادت نہیں ہیں۔ زبان کی عمدگی کی پرکھ یہ ہے کہ کس قدر کثیر تعداد انسانوں کی نفس مضمون کو بلا امداد لغت (Dictionary) سمجھ سکتی ہے۔ جس مضمون کو سمجھنے کے لیے اس کے بار بار پڑھنے کی ضرورت پڑے نہ اس سبب سے کہ اس میں خیالات مشکل واقع ہوئے ہیں بلکہ اس سبب سے کہ اس کی زبان پیچیدہ اور ثقیل ہے، وہ مضمون لوگوں میں پوری دلچسپی پیدا نہیں کرتا۔ اس لیے میں ہندوستانی زبان کے

مددگاروں و معاونوں سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ ہندوستانی کو سلیس بنانے کی کوشش کریں اس
میں اس قسم کے مضمون لکھیں جو اپنی عمدگی کے باعث دیگر زبانوں میں ترجمہ کرنے کے قابل سمجھے جائیں۔
ٹیگور کی تمام تصانیف بنگالی زبان میں ہیں۔ آج یورپ کی مختلف قومیں اُن کو اپنی اپنی قومی زبانوں میں ترجمہ
میں مصروف ہیں۔ روس کے اکثر اُستادوں نے اپنی تصنیفات کو اپنی زبان میں لکھا ہے اور یورپ کی مختلف
میں ان کے ترجمے ہوئے ہیں اور کروڑوں کی تعداد میں فروخت ہوئے ہیں۔ علیٰ ہذا فرانس، اسپانیہ، جرمن
اطالین، آسٹرین، ڈینش و ناروے کی زبانوں میں جو اعلیٰ درجہ کی کتابیں لکھی گئی ہیں ان کے ترجمے
ہو رہے ہیں۔ جدید فارسی کی بعض کتابیں بھی ترجمہ ہوئی ہیں۔ گو بہت کم۔ مگر ہندوستانی کتابوں کے
ترجمے کرنے کی کوئی شخص تکلیف نہیں اُٹھاتا کیونکہ ہندوستان کے اُستاد اور مصنف ابھی تک
لکیر کے فقیر ہیں اور اُردو لٹریچر میں یا ہندی لٹریچر میں اس قسم کی اعلیٰ تصنیفات پیدا نہیں کی جا رہیں
جن کا کوئی ترجمہ کرے۔ اس ملک میں مجھ سے کئی دفعہ درخواست کی گئی کہ میں ماڈرن ہندوستانی
نظم و نثر کے ترجمے علمی رسالوں کے لیے کروں۔ میں نے اقبال کی چند نظموں کے ترجمے کرنے شروع
تھے۔ مگر بدقسمتی سے وہ کتاب ہی کہیں گم ہو گئی اور میں صرف ایک نظم کا ترجمہ شائع کر سکا۔

انگریزی میں تعلیم پائے ہوئے ہندوستانی اکثر اُردو ہندی کے رسالوں کو نہیں پڑھتے۔ کیونکہ
کا خیال ہے کہ ان رسالوں میں اس قسم کے آرٹیکل شائع نہیں ہوتے جن پر وہ اپنا وقت صرف کریں۔ کوشش
یہ ہونی چاہیے کہ ہندوستانی زبان میں عمدہ سے عمدہ اچھوتے مضامین لکھے جائیں اور انگریزی رسالوں
یا اخبارات میں ان کا ترجمہ شائع کیا جائے۔ بجائے اس کے ہم کیا دیکھتے ہیں کہ ہمارے اچھے سے اچھے مصنف
انگریزی رسالوں میں اپنے مضامین لکھتے ہیں۔ وہ ایسا کیوں کرتے ہیں: (الف) اوّل ان کی قدرتی
خواہش یہ ہے کہ اُن کے مضامین سارے ملک میں پڑھے جائیں اور چونکہ اردو ہندی میں لکھنے سے وہ
ایک محدود جماعت تک اپنے خیالات پہنچا سکتے ہیں، اس لیے وہ انگریزی لکھنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ (ب)
دوئم ان کی تعلیم ایسی واقع ہوئی ہے کہ ان کو اُردو ہندی میں خیالات ظاہر کرنا انگریزی کی بہ نسبت زیادہ
مشکل معلوم ہوتا ہے۔ (ج) سوئم اُردو ہندی کے اُستاد انگریزی خوانوں کی اُردو ہندی پر ہنسا کرتے
ہیں اور بجائے ان کی حوصلہ افزائی کے اُن کو قطعاً اُردو ہندی کو ترک کرنے پر مجبور کرتے ہیں۔ پھر اُردو
میں نقل کرانا بہت مشکل امر ہے۔ اچھے سمجھدار کاتب و نقل کرنے والے نہیں ملتے۔ انگریزی میں یہ کام آسانی سے

اُردو ہندی کو ترقی دینے کے لیے ہمیں انگریزی زبان کے وہ تمام الفاظ استعمال کرنے سے پرہیز نہیں کرنا چاہیے، جو آجکل زبان زد خلائق ہو گئے ہیں اور جن کو تقریباً ہر فرد بشر سمجھتا ہے۔ بعض اوقات ہر ایک انگریزی لفظ کی جگہ سنسکرت و عربی کا الفاظ استعمال کرنے سے مضمون نہایت مشکل و پیچیدہ ہو جاتا ہے۔

میری رائے میں چند مزید الفاظ ہم کو ان زبانوں میں داخل کرنے چاہئیں، تاکہ پولیٹکل و ایکانامک مضامین آسانی سے داخل کیے جا سکیں۔ میں نے "صبح امید" کے مضامین پڑھتے ہوئے نوٹ کیا ہے کہ ہر ایک انگریزی لفظ کا ترجمہ کرنے کی کوشش مضمون کو دقیق اور بے لطف بنا دیتی ہے۔

میری رائے میں اردو ہندی لکھنے والوں کو ایک اور اصلاح کرنے کی ضرورت ہے۔ ہم ابھی تک پرانے دقیانوسی سلسلۂ آداب کی پیروی کیے جاتے ہیں۔ ہر ایک قابل قدر شخص کے نام کے آگے جناب اور آخر میں صاحب لکھنا ضروری سمجھا جاتا ہے۔ علیٰ ہذا "حضور" وغیرہ الفاظ کا استعمال بھی نہایت مکروہ ہے۔ دنیا میں کوئی شخص خواہ کسی رتبہ کا کیوں نہ ہو حضور کہلانے کا مستحق نہیں (سوائے مذہبی پیشواؤں کے) کسی قوم میں عزت و ناموری کے جھوٹے یا مبالغہ آمیز معیار سامنے رکھنا اس قوم کے اخلاقی معیار کو گرانا ہے۔ ہم کو انسانوں کی قدر ان کے کیرکٹر، ان کی علمیت یا ان کی فضیلت، ان کی نیکی سے کرنی چاہیے، نہ کہ ان کے القاب وغیرہ سے۔ قبل اس کے کہ میں اس تحریر کو ختم کروں میں چند الفاظ رسم الخط پر بھی کہنا چاہتا ہوں۔ اس میں کلام نہیں ہو سکتا کہ ہندوستانی کو عام ہندوستان کی قومی زبان بنانے میں ناگری رسم الخط کا استعمال نہایت موزوں اور مفید ہے۔ مگر چونکہ ہمارے مسلمان بھائی اس امر کو پسند نہیں کرتے اور فارسی کا رسم الخط رکھنا چاہتے ہیں یہ یا کم از کم پنجاب و صوبجات متحدہ میں اس بحث پر زیادہ زور دینا قرین مصلحت معلوم نہیں ہوتا۔ اگر ہماری زبان ایسی ہو جائے کہ خواہ وہ فارسی حروف میں لکھی جائے خواہ دیوناگری میں لکھی جائے، اس کے سمجھنے میں ہندو و مسلمانوں کو یکساں سہولت ہو تو رسم الخط کا سوال اس قدر اہم نہیں رہتا جیسا کہ دوسری حالت میں۔

میں اس امر سے ناواقف نہیں ہوں کہ جن بزرگوں کو کسی قدر مشکل الفاظ استعمال کرنے کی عادت ہے، وہ فوراً اس عادت کو نہیں چھوڑ سکتے۔ لیکن اگر کوشش کی جائے تو آہستہ آہستہ ہم اپنی زبان کو سلیس اور آسان بنا سکتے ہیں۔ مگر بعض ایسے القاب و آداب کو ترک کر دو۔ جس قدر زنجیریں کم ہو جائیں اسی قدر بہتر ہے۔ ہر ایک امر میں پرانی عادات کو برقرار رکھنا ضروری نہیں ہے۔ ہم کو آہستہ آہستہ آدمیت کا رتبہ حاصل کرنا چاہیے۔ آدمیت سب سے برتر رتبہ ہے اور اس کے لیے بہت سے فضول القاب و آداب کی ضرورت نہیں۔ (۔ مارچ ۱۹۰۰ء)

●●

ابوالخیر مودودی

اُردو کا مستقبل

"صرف اردو ہی ایک ایسی زبان ہے جس میں ہندوستان کی متحدہ اور عالمگیر زبان بننے کی صلاحیت ہے" (مرر آف انڈیا)

اُردو زبان کو اپنی مقبولیت کے لحاظ سے کہ وہ کم از کم دس کروڑ نفوس کی زبان ہے ایک جامع زبان ہونا چاہیے تھا کیونکہ یہ پراکرت زبانوں کی طرح غیر ملکی الفاظ کے شمول کی کافی سے زیادہ قابلیت رکھتی ہے۔ اس کا دامن جہاں عربی اور فارسی کے الفاظ و محاورات کے رنگ سے لطف دے سکتا ہے وہاں ترکی اور بھاشا کے رنگین فقرے بھی پھب سکتے ہیں اور کہیں کہیں انگریزی یا سنسکرت کی لطیف افشاں بھی ہو جائے تو بُری نہیں معلوم ہوتی اور اس سے کوئی وہ متنفس بھی انکار نہیں کر سکتا جو اپنے پہلو میں ایک منصف مزاج دل رکھتا ہو۔ کیونکہ نہ صرف ہندوستان بلکہ دنیا کی کوئی زبان ایسے اشتراک و شمول کی بدرجۂ اتم صلاحیت نہیں رکھتی۔ فارسی اپنی پیدائش میں مختلف گروہوں اور جماعتوں کے اجتماع کی تاریخ نہیں ہے اور نہ عربی و سنسکرت کی آفرینش کے وقت اس نوع کا سامان اجتماع فراہم تھا۔ عربی کوئی شک نہیں کہ اب مسلمانوں کی زبان ہے۔ فارسی بھی لاریب آج سے نہیں بلکہ عرصہ سے مسلمانوں کی زبان ہے اور ہندوستان کی سرزمین پر صدیوں سرکاری زبان رہی ہے لیکن اس سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ عربی جس کے بغیر اردو کا مجسمہ تیار نہیں ہو سکتا مسلمانوں سے پہلے ہندوؤں کی زبان تھی اور فارسی جو اردو کے چہرے کا نمک ہے دراصل سنسکرت کی دریات سے ہے! پھر جس زبان کا عنصرِ اولی ہی از فرق تا بہ قدم ہندویت پر مبنی ہو اسے مسلمانوں کی زبان قرار دینا صریح غلطی اور حقیقت و واقعیت کے مطلع کو گرد آلود کرنا ہے۔ اُردو کو یہ سمجھنا کہ مسلمانوں کی قومی زبان ہے مسلمانوں کے گھر میں پیدا ہوئی ہے اور مسلمان اسے اپنے ساتھ لائے نادانی ہے جس سے زیادہ افسوس ناک نادانی نہیں ہو سکتی۔ یہ انگور کی بیل، یہ کنول کے پھول اور یہ گلاب کی قلم کوئی شک نہیں کہ سب سے پہلے چمنستانِ اسلام کی زمین پر لگائی گئی تھی لیکن اس کے مالی ہندو ہی تھے۔ رتن ناتھ سرشار نے اس کی آب یاری کی اور سرور جہان آبادی

نے اس سنبلستان کو گلستاں بنایا۔ لہٰذا اُردو کسی خاص قوم کی زبان نہیں بلکہ ہندو مسلم اتحاد کی سیاسی و تمدنی یادگار ہے اور اس یادگار کا انہدام تعلقات کی کشیدگی اور نااتفاقی کا پیام ہے۔

حق بات اگرچہ تلخ اور آواز دراے زیادہ تلخ تر ہوتی ہے، لیکن زبان پر آئی اور بے اختیار آجاتی ہے کہ یہ بھی ہمارے لئے دوستان شیوہ طراز کی ہنگامہ سازیوں کا ایک ادنیٰ کرشمہ ہے جن کا مطمح نظر دو دلوں میں حسد کی تخم ریزی اور اس کے ثمر نااتفاقی سے حصول استفادہ ہے ورنہ

ع اس سے پہلے اعتبار شان رسوائی نہ تھا۔

کوئی جانتا بھی نہ تھا کہ اُردو اور ہندی آپس میں دو سوتیں ہیں۔ مسلمان ہندی پڑھتے تھے، سنسکرت کی تحصیل میں مدتوں سعی و جہد سے نہ جھکتے تھے، حالانکہ ان کو اس راہ میں ذلتیں اور مصیبتیں برداشت کرنا پڑتی تھیں، تاہم یہ موانع بھی ان کے ذوق طلب کے پائے عزم و ثبات کو متزلزل نہیں کر سکتی تھیں۔ پھر یہ واقعات اس زمانہ کے واقعات نہیں جب کہ مسلمان اس گھر میں اپنا سرمایہ لٹا چکے تھے، اس نگری میں ان کا دھن لُٹ چکا تھا، بلکہ یہ واقعات اس عہد زریں کے واقعات ہیں جب اس دیس میں عرب کے خانہ بدوش مسافر کی مسرت و کامرانی کے شادیانے بج رہے تھے اور ہندوستان کے گوشہ گوشہ میں اس آفتاب کی شعاعیں پہنچ چکی تھیں! ابومعشر فلکی اور علامہ بیرونی کو آپ چاہیں اپنے معشوقان لالہ رنگ کے اغواء سے بھلادیں، لیکن جب تک آنکھوں میں بصارت کی روشنی موجود ہے اور تاریخ کے صفحات تند باد کذب کی دست برد سے محفوظ ہیں خسرو، خانخاناں اور ملک محمد جائسی کے نام کو کوئی نہیں مٹا سکتا اور فیروز شاہ کا نام حشر تک زندہ رہے گا۔

تعجب ہے کہ ابتلا و آزمائش کے اس نازک زمانہ کو اس طرح برباد کیا جا رہا ہے جس طرح نادان بچے اپنے زمانہ تعلیم کو برباد کیا کرتے ہیں! ہندو اور مسلمان دونوں ایک درخت کی دو شاخیں ہیں اور ان کی آپس میں جدائی موت کا پیغام ہے۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کے تعلقات آج سے نہیں بلکہ ازل سے وابستہ ہیں۔ یہاں تک کہ میر عرب جب اپنے کیفیات سے سرشار ہو جاتے تھے تو بے اختیار ان کی زبان سے نکل جاتا تھا: "طیب ریحا ارض الهند" نسیم ہند مجھے جنت کی ہوا کی طرح محبوب ہے۔ اور اس لئے نکل ہوا تھا کہ اسی سرزمین پر بودھ نے پیام حق سنایا تھا۔ اسی دنیا میں اس نغمۂ ازلی کی مرکیاں بانسری سے نکل کر گونجی تھیں

جسے دنیا آج بھگوت گیتا کے نام سے یاد کرتی ہے۔ یہی چھوٹی سی دنیا مقدس دنیا ہے جہاں سری رامچندر جی نے ۱۴ برس کا بن باس اختیار کیا تھا۔ آپ ممکن ہے کہ اس اندازِ تحریر کو محض الفاظ کا لفافہ سمجھیں۔ لیکن یقین کیجئے کہ یہ عین اس آیت کا ترجمہ ہے جو قرآن حکیم میں مذکور ہے:

وَ اِنْ مِّنْ اُمَّةٍ اِلَّا خَلَا فِیْهَا نَذِیْرٌ اور دنیا کی کوئی قوم ایسی نہیں جس کے لیے ہم نے بُری باتوں سے ڈرانے والا اور وَ كُلُّ اُمَّةٍ تُدْعٰۤى اِلٰى كِتٰبِهَا، نیک باتوں کی طرف رغبت دلانے والا رسول مبعوث نہ کیا ہو اور دنیا کی ہر قوم کو ہم نے اس کی کتابوں کے ذریعہ جو منزل من اللہ ہیں راہ ہدایت کی طرف راہبری کی ہے۔

پھر جس قوم کی حقیقت کچھ نہیں مگر ایک باغ و چمن ہو جس کی کائنات محض اشجار و اثمار کا اتحاد اور اجتماع ہے، اس کائنات کا ہر فرد خواہ وہ کوئی مذہب رکھتا ہو اور کسی نسل سے اس کا تعلق ہو ہمارا بھائی ہے۔ لَاۤ اِكْرَاهَ فِی الدِّیْنِ اور جب جنس متاع کی نوعیت میں اختلاف نہیں بلکہ سب کی حقیقت ایک ہی نقطۂ اتحادی پر منتہی ہوتی ہے، تو یہ تمام تخیلات امتیازی وسائس شیطانی ہیں اور ہمیں اپنے نفس شریر کے اغوا اور اسیرانِ جوع البقر کی فریب کاریوں سے آزاد ہو کر اپنے بھائیوں سے صلح و آشتی کر لینا چاہیے کہ بغیر محبت و الفت کے زندگی اک موت ہے بد۔

محبت کے شرر سے دل سراپا نور ہوتا ہے ذرا سے بیج سے پیدا ریاض طور ہوتا ہے

زبان کا مسئلہ کوئی شک نہیں کہ ایک اہم مسئلہ ہے اور حکومت خود اختیاری سے پہلے اس حکومت لسانی کا فیصلہ ضروری ہے۔ کیونکہ جب افق پر آفتاب عالمتاب طلوع ہوگا، جب آسمان پر سیمیائی کی نمود ہوگی اور یہ طلسم ٹوٹے گا یعنی جب غلامی و محکومی کی زہرہ گداز چیخوں کے بجائے ہمارے تخت فیروز بخت سے مسرت و شادمانی کے نغمے بلند ہوں گے تو اس وقت کونسی زبان ہوگی جو تبادلۂ خیالات کا ذریعہ بنے گی اور ایک مقرر جب دارالعوام میں تقریر کرے گا، تو اسے کون سی زبان اختیار کرنی پڑے گی؟ کیا اس کا درجہ اردو کو دیا جائے گا؟ کیا یہ عزت دنیا کی کسی اور زبان کو دی جائے گی جس کے بولنے والے تو زندہ ہوں لیکن اس کے حامیوں اور رفداکاروں پر موت نما سکوت طاری ہو؟ اس کا جواب زبانی شور و غل کے ہنگاموں میں نہیں بلکہ دست عمل کی جنبش اور پاے سعی و جہد کی حرکت میں ملے گا! کیونکہ اس کا فیصلہ انسان کی خود غرض طبیعت نے

نہیں خدا کی منصف مزاجی عدالت نے کر دیا ہے: لَیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی
زبان ہی پر انحصار نہیں زندگی بھی اسی صورت ممکن ہوتی ہے، جب زندہ رہنے پر اصرار کیا جائے اور حیات کے پُرشور دریا میں خس و خاشاک کی طرح نہیں، ایک ماہر تیراک کی طرح کوشش کی جائے۔

"کوئی زبان اس وقت تک اہم قرار نہیں دی جا سکتی جب تک اہلِ زبان اس کی اہمیت تسلیم نہ کرائیں"
(مہاتما گاندھی)

پس اگر جبیبانِ وطن نے یہ فیصلہ کر لیا ہے کہ اُردو زبان مسلمانوں کی قومی زبان ہے، ہند و ہندی کو ترقی دینا چاہتے ہیں، تو کیا مسلمانوں کا یہ فرض نہیں کہ وہ اپنی قومی زبان کو ترقی دیں؟ یہ داستان اب بہت پرانی ہو گئی ہے کہ ہندوستان کی ترقی کا انحصار اگر اتحاد نسلی پر نہیں ہو سکتا، اگر مختلف المذاہب گروہ ایک مذہب کے پابند نہیں ہو سکتے کہ یہ نہ صرف محال ہے بلکہ مشکلات کا ایک عظیم الشان دروازہ ہے جس کے بعد امن و سلامتی عنقا ہو جائے گی، لیکن تاہم اتحادِ زبان ضرور اس نقطۂ شعاعی پر پہنچا سکتی ہے، جہاں سے حریت اور وطن پرستی کی کرنیں ہمارے قلوب میں اتر رہی ہیں اور یہ ولولہ ہمارے دل میں پیدا ہو گیا ہے۔ لیکن یہ خیال اگرچہ مفید ضرور ہے اور ترقی کے لیے کسی ایک اتحاد کا ہونا بھی ناگزیر ہے، مگر اس ناقابلِ عمل تخیل کا عملی صورت اختیار کرنا سراب کی موج دریا بن جانے سے زیادہ نہیں۔

عزیزانِ وطن سے ہماری یہ خواہش کہ وہ اپنی مادری زبان کو چھوڑ دیں، ہمارا ان سے یہ کہنا کہ وہ اپنی ترقی کی بنیاد اساسی گذشتہ عظمت اور قومی روایات پر نہ رکھیں، ایک جاہلانہ اور غیر منطقی سوال ہے۔ کوئی قوم اگر وہ منازل ارتقا کو طے کرنا چاہتی ہے اس بات کے لئے آمادہ نہیں ہو سکتی کہ اپنی قدیم تہذیب اور آبائی مسلک کے جادۂ خصوصی کو چھوڑ دے، مسلمان گو نہ سمجھیں اور مغرب پرستی کو اپنے انتہائی عروج کا مرکز سمجھ لیں، لیکن اصل یہ ہے کہ کوئی قوم اپنے لئے اس وقت تک مستقبل نہیں پیدا کر سکتی جب تک قومی و مذہبی روایات پر کاربند نہ ہو۔ تعلیم یافتہ گروہ کے پیدا ہونے اور منصۂ مجالس پر نمودار ہو کر سرگرم تقریریں کر دینے سے نہ کوئی قوم زندہ ہوئی ہے اور نہ ہو سکتی ہے۔

ابتدائے آفرینش سے آج تک جن اقوام نے ترقی کی ہے تاریخ شاہد ہے کہ ہر ایک قوم کے

عہدِ عروج و اقبال میں اس کی مادری زبان کی حکومت و فرمانروائی ہوتی ہے۔ اہلِ بابل کے عہدِ حکومت میں کالڈی عروج پر تھی۔ بنو قحطان کے زمانہ سلطنت میں سبائی و حمیری السنہ دنیا کی حکمراں زبانوں میں شمار کی جاتی تھیں۔ اسمٰعیلی اعراب ولادت مسیح سے قبل اور بعد جب فلسطین کے اطراف میں حکمراں تھے۔ نیز بائدہ عرب جن میں سے ہر اک کی زبردست حکومتیں قائم تھیں ان میں سے ہر اک کے زمانے میں اس کی قومی زبان حکومت کی زبان تھی۔ خود مسلمانوں کا دامن اس سے پاک نہیں۔ عراق و شام اور مصر کے سرکاری کاغذات اگرچہ ابتداً عربی میں نہ تھے لیکن ۸۱ھ میں تمام دفاتر قبطی اور فارسی وغیرہ سے عربی میں منتقل ہو گئے۔ پھر جب مامون کے زمانہ میں برامکہ کا نفوذ واثر زیادہ ہو گیا تھا، تو عجمی رسم ورواج کے ساتھ فارسی کی گھلاوٹ کی شگفتگی بڑھتی جاتی تھی۔ لہٰذا عزیزان وطن سے ہماری یہ خواہش کہ وہ اپنی مادری اور قومی زبان کو چھوڑ دیں سراسر ناجائز اور ناقابل عمل خواہش ہے لیکن اگر اتحاد سیاسی کے ساتھ اتحاد لسانی بھی ضروری ہے، تو سب سے پہلے مسلمانانِ عالم کے اتحاد لسانی کا فیصلہ کیجئے کہ حقیقی ترقی وہی ترقی ہوگی اور جب تک کل مسلمان متحد و متفق نہ ہو جائیں گے اس وقت تک ان کی ہستی معرضِ خطر میں رہے گی:

تو اپنی فکر کر ناداں مصیبت آنے والی ہے ترى بربادیوں کے مشورے ہیں آسمانوں میں

رہا یہ فیصلہ کہ ہندوستان کی متحدہ زبان کون سی زبان ہوگی اس کا جواب انانیت و خودداری کے ولولوں پر ہے۔ اس گلزار ہستی میں جسے رہنا ہوگا وہ آپ اپنی زندگی کا سامان کرے گا اور اپنی عزت و شرف کے لئے جہاد مالی و جہاد لسانی سے بھی دریغ نہ کرے گا۔ مگر جسے موت آنے والی ہے جو موت نما ذلت کی زندگی بسر کرنے والا ہے، وہ غافل پڑا سوتا ہے۔ وَلَيَنصُرَنَّ اللَّهُ مَن يَنصُرُهُ ۔ لیکن کیا ہم اپنی زندہ زبان کی ترقی کا سامان بھی نہیں کر سکتے۔

آج ہندوستان کی قدیم قوم اپنی مادری زبان کو زندہ کر رہی ہے اور ہر وطن پرست ہندو اپنی مذہبی و علمی زبان کے حصول میں سرگرم ہے۔ یعنی آریہ ورت کی وہ شاہی زبان (سنسکرت) جو مرچکی تھی زندہ کی جارہی ہے اور ہندوستان کے ہر گوشہ میں اس کی نشر و اشاعت کے سامان کیے جاتے ہیں۔ مرہٹی زبان جس کے بولنے والوں کی تعداد ایک کروڑ سے زائد نہیں، سات کروڑ مسلمانوں

سے اس قدر آگے ہیں کہ اب ان کی گرد کو پہنچنا بھی محال ہے۔ ہندی زبان جس کے بولنے والوں کی تعداد موسیو لیبان نے ہندوستان کے طول وعرض میں (۳۰ لاکھ) بتلائی تھی آج وہ اپنے حامیوں کی قوتِ بازو سے ہندوستان کی عالمگیر اور متحدہ زبان ہونے کے درجے تک صعود کر رہی ہے اور اس لئے اس کی قوت تصیعدٗ دن بدن بڑھتی جاتی ہے کہ بعض ناعاقبت اندیش حضرات اور خطاب یافتہ بزرگان قوم ہندی کی عالمگیریت پر ماتم گسارانہ چیخیں بلند کرتے اور ہندوؤں کی انانیت وخودداری کو اپنی جہالت اور کوتاہ نظری کے باعث نااتفاقی پر محمول سمجھتے ہیں۔ حالانکہ سب سے زیادہ افسوسناک اور ماتم گسارانہ حالت ان کی حالت ہے کہ زبان سے تو اُردو کے لئے پُردرد اپیلیں کرتے ہیں اہندوؤں سے انقطاع تعلقات پر زور دیتے ہیں تا آنکہ ہندی کی ترقی کے خوفناک دیوتا سے لرزہ براندام ہو جاتے ہیں۔ لیکن اگر اس باب میں خود ان کی مساعی کا پتہ چلایا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ غریب تو چینی کی گڑیا ہیں اور پس پردہ جو کچھ ان کے معبودان باطل کہتے ہیں، وہی یہ منصۂ عام پر بیان کرتے ہیں۔

جو قوم اس درجہ معطل ہو اور جس کی حالت اس قدر رحم ناک ہو، تعجب ہے اس کی زبان اب تک زندہ کیوں ہے؟ اور کیوں نہیں کسی غیر زبان نے اس کو اب تک ہلاک کر دیا ہ صوبۂ متحدہ اور اس کی قدیم شان وشوکت کا مرکز جہاں اردو نے نشو ونما پائی، جس زمین پر اس نے اپنے شباب کی رعنائیاں دکھائیں یہاں تک کہ جس کے آغوش میں یہ بن ماں باپ کی بچی پروان چڑھی، خود وہاں یہ حالت ہے کہ عدالت سے خارج کی جا چکی ہے۔ جن گودوں میں اس نے پرورش پائی تھی اوہی اب اس کو جدا کر رہی ہیں۔ یعنی ۱۹۱۶-۱۷ء کی (۲،۴۴۰) مطبوعات میں کثیر حصہ ہندی مطبوعات کا تھا اور ان کتابوں میں بھی بعض ایسی کتابیں تھیں جو اُن حضرات کے قلم سے نکلی تھیں جنہیں ہندی کا دشمن اور اُردو کا مالک کہا جاتا ہے۔ پھر مشرقی بنگال کے اضلاع اور صوبۂ متوسط میں ایک کثیر حصہ مسلمانوں کا ایسا ہے جو اردو سے یکقلم ناواقف ہے اور یہی نہیں بلکہ ایسے حضرات بکثرت ملیں گے جو اُردو ایک سطر بھی صحیح نہیں لکھ سکتے۔ مگر ہندی میں مضامین لکھتے ہیں۔ چنانچہ جبل پور (جہاں نسبتۂ مسلمانوں کی زیادہ آبادی ہے) کی اسلامی انجمن کے مدرسہ میں ایسے طلبا کی تعداد زیادہ ہے جنہوں نے فارسی یا اُردو کو چھوڑ کر دوسری زبان ہندی لی ہے۔ متحدہ زبان کی انجمن کے اس جلسہ سے قطع نظر کیجئے جو گذشتہ سال کلکتہ میں منعقد ہوئی تھی اور جہاں غریب اُردو کو ایک متنفس بھی ایسا نہ ملا تھا جو اس کی

حمایت میں کچھ کہہ سکتا ' ہندی لٹریری کانفرنس کے اس جلسہ کی روداد پر نظر ڈالئے جس کا غالباً تیسرا جلسہ پچھلے مہینہ منعقد ہوا تھا اور جس میں ایک مولوی صاحب نے جن کا تعلق شاید پنڈتوں سے زیادہ ہے ہندی کی تائید میں دریا بہا دیئے تھے اور نہایت شد و مد کے ساتھ اپنی رائے ظاہر کی تھی کہ ہندوستان کی عالمگیر زبان صرف ہندی ہو سکتی ہے۔

ہمیں غیروں سے شکایت نہیں' بلکہ شکایت ہے اور گلہ کر سکتے ہیں تو اُن نادانوں سے جو اپنے گھر کی تباہی پر آمادہ ہیں ' یا ان بدذات قوم فروشوں سے جو قوم پرست اور بھارت ماتا کو پوجے والے تمام بزرگ، وتہنیت ہندوؤں کو گالیاں دیتے ہیں اور ہندو مسلم اتحاد کے مقبرے کو محض اس وجہ سے منہدم کرنا چاہتے ہیں کہ انہیں اپنی قوم سے محبت ہے اور وہ مسلمانوں کی طرح پرستی (؟) میں مبتلا نہیں بلکہ اپنی قدیم تہذیب اور آرین رسم و رواج کو زندہ کرنا چاہتے ہیں اور جن کی اولین خواہش یہ ہے کہ ان کی محدود زبان ہندوستان کی عالمگیر زبان ہو جائے۔ ہمیں دوسروں پر اعتراض کرنے کا کیا حق ہے جب ہم خود اپنی زبان کے لئے کچھ نہیں کر سکتے! یا کرتے ہیں تو صرف اس قدر کہ دہلی میں اردو کانفرنس کا ایک جلسہ ہو جاتا ہے' جس میں اشکل سے ڈیڑھ سو آدمی شریک ہوتے ہیں' اور پھر وہ بھی جن کی مسیحا نفسی سے یقین کامل تھا کہ اس قالب بے جان میں جان ڈال دیں گے غافل ہو جاتے ہیں جس طرح دیار محبت کا آوارہ وطن مست و غافل ہو جاتا ہے۔

ترقی اُردو کے متعلق اگر کچھ امیدیں ہیں' تو صرف جامعہ عثمانیہ سے۔ لیکن ظاہر ہے کہ وہ تمام ہندوستان کی تعلیمی ضروریات کو پورا نہیں کر سکتا اور اس نیر درخشاں کی شعاعیں ان قریوں اور قصبوں تک نہیں پہنچ سکتیں جہاں مسلمان آباد ہیں لیکن اردو سے ناواقف ہیں۔ اس کے علاوہ جامعہ عثمانیہ کے ارباب حل و عقد میں جن بزرگوں کا ہاتھ سب سے زیادہ کارفرما ہے ان کی یبوست دماغی بجائے رنگینی و رعنائی کے ٹھوس اور پتھر کی طرح خشک بنا دیگی۔ تاہم : این ہم غنیمت است۔

"انجمن ترقی اُردو" جس کے نام سے ظاہر ہے کہ وہ غریب اُردو کو ترقی دینے کے لئے موض وجود

میا آئی تھی۔ آج تک اس نے جو کچھ کام کیا ہے اور اُردو کو جس قدر بھی ترقی دی ہے وہ ایک داستان حسرت والم ہے۔ اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ ترقی سے یہ مطلب نہیں کہ جو لوگ اُردو جانتے ہیں مگر اب چھوڑتے جاتے ہیں ان کا انتظام کیا جائے گا، بلکہ ترقی اردو سے صرف یہ مراد تھی کہ اردو زبان میں چند رسایل اور کتابیں شائع کردی جائیں گی تو انجمن کے قابل کاتب خصوصی سوائے سیدی عبدالماجد کی تصانیف اور چند اور کتابوں کے ایک کتاب بھی ایسی نہیں پیش کر سکتے جسے اُردو میں قابل قدر اضافہ کہا جا سکے یا جس سے ترقی اردو کا معیار معلوم ہو سکے۔

اول تو یہی ایک اساسی غلطی ہے کہ جناب کاتب خصوصی بنیادوں اور دیواروں کے استحکام سے یکسر غافل ہیں اور سقف محراب کی تعمیر کے انہماک نے وارفتگی و جنون کی سی کیفیات پیدا کر دی ہیں حالانکہ زیب و زینت اور منزلوں کی تعمیر سے پہلے گھر میں جو آگ لگ رہی ہے اس کے بجھانے کی ضرورت ہے لیکن اگر آپ کی طبیعت ایسی ہی آتش باز واقع ہوئی ہے اور آپنے ترقی اُردو کو صرف کتابی ترقی مفہوم کیا ہے، تو اس باب میں بھی پرستاران شبلی کی دارالمصنفین آپ سے پیش پیش ہے اور اس نے اپنی قلیل زندگی میں وہ کام کر لیا ہے جو آپ حضرت ناظر کے مصنفات کو علیحدہ کر کے ایک قرن میں بھی نہیں کر سکتے۔

اس سے انکار نہیں کہ قوم کی بد مذاقی اور بے التفاتی کے مقابلہ میں جس قدر بھی کام کیا گیا ہے اور کیا جا رہا ہے قابل قدر ہے کیونکہ عدم سے وجود اگرچہ وہ شل اور مفلوج ہی ہو بسا غنیمت ہے۔ لیکن یہ بات اگر موجب تکلیف نہ ہو تو کہنا پڑتا ہے کہ اس عدم التفات اور بد مذاقی کے ذمہ دار بھی ارباب کار ہیں۔ ہر کام کا ایک طریقہ اور ہر چیز کا ایک نظام طبعی ہوتا ہے اور اس پر بدقسمتی سے اب تک انجمن "ترقی اردو" کے لائق کاتب خصوصی نے توجہ نہیں کی اور جب تک انجمن پراگندگی اور ہذیان علمی سے دستکش نہیں ہوگی اس وقت تک وہ قوم کے لیے مفید ہو سکتی ہے اور نہ قوم اس کی مدد کرنے پر آمادہ ہو سکتی ہے۔ بچوں کی نالایقی کا ذمہ دار ہمیشہ استاد ہوتا ہے۔ بدتمیزی سے والدین کی غفلت کا پتہ چلتا ہے بس اس بد مذاقی کا صرف ایک علاج ہے اور وہ انتشار عمل کی راہ ظلمات کو چھوڑ کر نظام عمل اور وحدت عملی کے چشمۂ حیوان کی مراط مستقیم ہے اس کے بعد عملی جد و جہد اور ارباب درد و سوز کے حصول خدمات کا درجہ ہے جو شہر شہر اور ضلع ضلع کا دورہ کریں۔

پروفیسر براؤن نے کیمبرج یونیورسٹی ہال میں بیٹھ کر ترقی اُردو کے لئے جو نظام ترکیبی اور لائحہ عمل مرتب کیا ہے وہ کوئی شک نہیں کہ مفید ہے، لیکن مفید صرف اسی صورت میں ہو سکتا ہے جب اُردو بولنے والے ملیں! سب سے پہلے اس کے چاہنے والے پیدا کیجئے جو اس کی مراد اپر جان دیں، ورنہ مطبوعات کی ترقی اور مردانہ حُسن تو اور تنفر و تنقص کی تخلیق کا باعث ہوگا۔ آپ بھی غور کیجئے کہ ایک زمانہ وہ تھا جب سرسید نے ملکی زبان میں تعلیم کا خواب دیکھا تھا اور علی گڑھ کی زمین پر ۳۰ ہزار کے سرمایہ سے مجلس علمی وجود پذیر ہوئی تھی جس کے سرپرست وزیر ہند تھے۔ لیکن جب ۱۸۸۲ء میں ملکی زبان کی تعلیم کا مسئلہ پیش ہوا تو خدا غریق رحمت کرے بوڑھے قوم پرست کو جس کے عزائم کو ایک دلستان صدائے مترنم نے بدل دیا جس طرح آئرلینڈ کے اسٹوارٹ پارنل کو مسز روشی کی شگفتہ نگہ، نازاور بیاض شانہ پر پھیلی ہوئی آبشار کی شکیب ربا انداز نے عین اسی وقت بدل دیا تھا جبکہ آرائش عزت و حقوق طلبی کا فیصلہ ہونے والا تھا! یعنی مدرسۃ العلوم بجائے مسلمانوں کی درس گاہ اور ان کے درد کے علاج کے انگریزی کالج اور دفتروں کے لئے منشی بنانے کا ایک آلہ عمل بن گیا۔ حکومت کا قاعدہ ہے (اور پھر وہ بھی موجودہ حکومت کا) کہ وہ ہمیشہ رنگ غالب کی حامی و ناصر ہوتی ہے۔ ابتداءً دفاتر اُردو میں تھے، رفتہ رفتہ انگریزی میں ہوئے اور اب اکثر مقامات پر ہندی کا بھی جگہ لیتی جاتی ہے۔ لہٰذا اگر آبرو کی تمنا ہے تو آرام و آسائش کو چھوڑیئے کہ وہ زندگی جس میں قوم و ملک کی محبت نہیں محض ایک قالب بےجان! مخملی صوفوں پر بیٹھنے اور اونچی ایڑی کی پرستش کا ایک وقت ہوتا ہے۔ بادہ خواری ہر موسم میں نہیں کی جاتی بلکہ اس کا ایک خاص وقت ہے اور یاران طریقت جانتے ہیں کہ وہ خاص وقت کون وقت ہے:

جذبۂ شوق تو ہے باعث اعزاز بشر — کون کہتا ہے کہ تو عشق میں خوددار نہ ہو

گھنگھور گھٹا چھا رہی ہو اور خدا کے سوا کوئی مونس و دمساز نہ ہو تو شوق سے مے و مینا کا شغل کیجئے لیکن جب برشگال اور اس کی رنگینیاں ختم ہو جائیں تو اس معصیت سے توبہ کیجئے، یعنی:

تمنا آبرو کی ہے اگر گلزار ہستی میں — تو کانٹوں میں اُلجھ کر زندگی کرنے کی خو کرلے

ہمیں ان دوستوں سے غرض نہیں کرنا چاہیئے جو ہندی کے حامی ہیں اور نہ اُن مسلمان مصنفین کو مردود و مطرود سمجھنا چاہیئے جنہوں نے دیو ناگری رسم الخط اختیار کر لیا ہے کیونکہ یہ تو اتحاد و اشتراک

کا صرف ملی اقدام ہے۔ جب تک آپ کسی سے محبت نہ کریں گے کیسے ممکن ہے کہ کوئی دوسرا اپنا دین ایمان آپ پر نثار کر دے! یاد کیجئے اس زمانہ کو جبکہ نظام الدین بلگرامی اور سید برکت اللہ جیسے علما سنسکرت بھاشا کی تکمیل کرتے تھے اور شیخ غلام مصطفےٰ جیسے لقبہ اور صوفی بزرگ بھاشا میں شاعری کرتے تھے۔ فیضی، عبد الجلیل، ملک محمد اور خان خاناں کے ہندی شعر تو ہماری زبان کا گہوارہ ہیں۔ لیکن کیا آپ کو معلوم ہے کہ اس اقدام کا کیا اثر ہوا؟ صوبہ متحدہ سے نہیں، صرف خاک پاک لکھنؤ سے سیکڑوں ہندو شاعر پیدا ہوئے۔ راجہ الفت رائے خیال رام، بختاور سنگھ، لالہ رام بخش یہ وہ نام ہیں اور وہ ہمارے خزانۂ رفعت و اقبال کے لعل و عقیق ہیں جنہوں نے علمی اتحاد کا اپنے ناموں تک سے اعلان کیا۔ بلگرام کی خاک نے جہاں غلام علی آزاد کو پیدا کیا تھا وہاں پنجاب کی خاک نے وارستہ کو پیدا کیا جس نے ۳۰ برس ایران میں رہ کر الفاظ و محاورات کی تحقیق کے بعد "لغت الاصطلاحات" تصنیف کی۔ پس اگر آج ایک مولوی ہندی کی حمایت کرتا ہے تو ہمیں اس کی عزت کرنا چاہیے کہ وہ علمی اتحاد کا نقیب ہے۔ لیکن ساتھ ہی خودداری کا اقتضا یہ ہے کہ ہم اپنی زبان کو بھی نہ چھوڑیں۔

وصل یہ ہے کہ خلش میں ہو بسر لذتِ ہجر
خواہشِ وصل میں رسوا سرِ بازار نہ ہو

یہ خیال کہ کل ہندو ہندی کے طرفدار اور اردو کے مخالف ہیں صحیح نہیں۔ "انجمن خادم ہند" کے اکثر اعضا و ارکان دل سے اردو کے حامی ہیں اور قدر دان ہیں۔ یہاں تک کہ آج ان ہی کی عنایت و مہربانی ہے کہ اردو میں چند سیاسی رسائل شائع ہوئے اور مستقل طور پر "صبح امید" شائع ہو رہا ہے۔ الہ آباد کے مشہور "لیڈر" جن کے متعلق بیان کیا جاتا ہے کہ وہ اردو کے دشمن ہیں جب پچھلے مہینہ بمبئی میں دہلی اور پنجاب کے خونی واقعات پر تقریر کرنے کھڑے ہوئے تو اگرچہ ابتداً ان کی زبان ہندی تھی لیکن جب جذبات میں زیادہ جوش اور تموج پیدا ہوا، تو ان کی زبان سے سنسکرت اور برج بھاشا کے الفاظ اور فقرے نہیں عربی اور فارسی کے لفظ جملے بن بن کر نکل رہے تھے کیا یہ اردو کی متحدہ زبان ہونے کی قابلیت کا اعتراف نہیں؟ فدا کارانِ ہندی گو زبان سے نہ کہیں لیکن دل سے اردو کے اقتدار کا اعتراف کرتے ہیں۔ شاید آپ کو مسز بسنٹ کے وہ یادگار الفاظ یاد ہوں جو پالی گھاٹ ملیبار کے ایک جلسہ میں کانگریس کمیٹیوں کو متوجہ کرتے ہوئے انہوں نے کہے تھے،

"کثیر تعداد لوگوں کو آگاہی کے لئے یہ امر لازمی ہے کہ اردو زبان میں مشورہ

مضامین اور پرچے شائع کیے جائیں۔ کیونکہ یہی ایک ایسا ذریعہ ہے جس سے آپ کی پہنچ لوگوں کی بیشمار جماعتوں تک ہو سکتی ہے ؎

حقیقت یہ ہے کہ پرستاران مذہبی زبان سے اس لئے اقرار نہیں کرتے کہ اُردو کے نادان حامی جو کچھ کر رہے ہیں اس سے بھی غافل ہو جائیں گے۔ لیکن نہ جانے اِن دشمنان قوم و ملک کو کیا ہو گیا ہے کہ اب بھی وہی خمار مستی باقی ہے اور زبانی دعووں کے ابتدائی میدانوں میں ایک دو قدم بھی نہیں چل سکتے۔ حالانکہ یہ جو کچھ ہے ہماری بیداری کے لئے ہے اور عزیزانِ وطن کی مساعی کی انتہا محض غیرت دلانا ہے :

جنس آلام تو ہے زینت بازار حیات — غم جو پیش آئے کوئی جان سے بیزار نہ ہو
لطف کیا وادی وحشت میں اٹھائے مجنوں — اگر لے آبلہ پائی خلش خار نہ ہو
ہر نوا ساز حوادث کی ہے پیغام عمل — حیف اس آنکھ پہ جو آج بھی بیدار نہ ہو

اُردو کے نام نہاد مالک ناشرین ہندی سے ناراض ہیں کہ وہ کیوں اپنی چیز کی قدر کرتے ہیں۔ درانحالیکہ اُردو سے دست بردار ہو جانے کی ان غریبوں نے ہم سے کبھی خواہش نہیں کی وہ اگر ہندی کو ترقی دینے میں سرگرم ہیں، تو ہمارے لئے بھی ایک وسیع میدان کھلا ہے۔ یہ ہماری نادانی ہے کہ خود زہر کھاتے ہیں اور دوسرا جو نہیں کھاتا اُس پر اعتراض کرتے ہیں۔ دنیا میں کبھی کسی قوم نے غیروں کی زبان کے بھروسہ پر ترقی نہیں کی۔ پس رزمگاہ ہستی کے ان معرکہ ہائے خودداری کے اوراق میں ہمیں اُردو کے مستقبل پر غور کرنا چاہیئے اور بجائے زبانی شور و غل کے عمل کی صدائے تکبیر اپنے جذبات و خیالات کے اظہار کے لئے اختیار کرنا چاہیئے۔

اُردو کانفرنس جس کا جلسہ (چشم بد دور) دہلی میں ہو چکا ہے نہایت نامکمل جلسہ تھا اور غالباً اسی کا نتیجہ ہے کہ جلسہ کے بعد کسی کو یہ بھی نہیں معلوم ہوا کہ اُردو کانفرنس زندہ بھی ہے یا نہیں؟ تعجب تو یہ ہے کہ جناب مرحوم حکیم ناصر الدین صاحب نے بھی جو ہزاروں بیماروں کا علاج کرتے ہیں اور جن کی مسیحائی سے سیکڑوں مایوسان حیات زندگی کے لطف اٹھاتے ہیں انہوں نے بھی تریاق غلط کاری نہیں دیا، بلکہ عمل جراحی کیا! لیکن اب ضرورت ہے کہ مرحوم شفاء الملک کے خلف الصدق اپنے دست شفا بخش سے اُس بیمار نیم جان کو زندہ کریں کہ اسی کی زندگی پر اپنی زندگی

کا انحصار ہے اور ان کی موت سے پہلے ہمیں اپنے لئے زمین کی تلاش کرنا پڑے گی۔ حکیم صاحب خود صحیح معنوں میں حکیم اور عاقل و فرزانہ ہیں۔ ان کے لئے کسی نظام عمل یا ضوابط اساسی بنانے کی ضرورت نہیں۔ لیکن غالباً عجلت میں انجمن کے ارباب کار نے ایک اساسی غلطی کی اور وہ یہ ہے کہ اس کانفرنس کو رسم الخط سے کوئی تعلق نہیں ہوگا۔"

حالانکہ جب آپ رسم الخط سے کوئی تعلق نہیں رکھتے، تو دوسرے الفاظ میں اس کے یہ معنی ہیں کر دیو ناگری رسم الخط ہونا چاہیئے، اور یہی بڑی کمزوری کانفرنس کا مقصد اولین ہے کیونکہ جب طرز رقم کا سوال زیر بحث نہ رہے گا تو ظاہر ہے کہ غلبۂ آراء کی وجہ سے فارسی رسم الخط کو شکست ہوگی اور جب شکست ہوئی تو رفتہ رفتہ آپ کی زبان تلسی داس اور چنتامن کی زبان ہو جائے گی۔ لہٰذا کانفرنس کو موجودہ رسم الخط کی بقا و ترویج کی طرف سے آنکھیں بند نہ کرنا چاہیئے۔ ہندو شریک ہوں یا نہ ہوں، جب اردو زبان مسلمانوں کی زبان قرار پا چکی، تو اب یہ بحث فضول ہے اور ہمیں خواہ مخواہ ایسے اندر انجذاب گدایانہ پیدا کرنے کی ضرورت نہیں۔:

وہ اپنی خو نہ چھوڑیں گے ہم اپنی وضع کیوں بدلیں
سبک سر بن کے کیا پوچھیں کہ ہم سے سرگراں کیوں ہو

چونکہ دسمبر کا جلسہ بہت ہی معمولی تھا اور اعلان بھی ایسے وقت ہوا جبکہ مندوب نہیں آسکتے تھے، اس لئے نومبر میں ایک خاص جلسہ کیا جائے جس میں اغراض و مقاصد کے اہم مسائل طے کیے جائیں۔ کانفرنس اپنے لئے ایک دستور العمل مرتب کرے۔ ہندوستان کی اسلامی ریاستوں سے امداد و اعانت کی درخواست کی جائے اور نومبر میں سالانہ جلسہ کے انعقاد کا ابھی سے اعلان کر کے حضور بیگم صاحبہ دارالاقبال بھوپال کے خلف اصغر (میجر عبداللہ خاں صاحب) سے استدعا کی جائے کہ وہ صدارت قبول فرمائیں۔

حکیم صاحب کے مشاغل اور مصروفیتیں اگر کانفرنس کی سکریٹری شپ کے خدمات انجام دینے میں حائل نہ ہوں تو زہے نصیب ورنہ پھر مسلمانوں میں ایک مولانا حسرت کی ذات بابرکات ہے جو اس اہم ترین فرض قومی کو اپنے خاص شغف و انہماک اور خلوص کے ساتھ منزل مقصود تک پہنچا سکتی ہے ورنہ پھر اس کے لاشہ کو غیروں کے سپرد کرنا ہوگا (اور جہاں تک میرا خیال ہے) غیروں میں بھی دو تین کام کرنے والوں کا مل جانا دشوار نہیں۔ لیکن حکیم صاحب کی ذات گوناگوں صفات سے یقین کامل ہے

کہ وہ اس بیمار الفطرت دوشیزہ کو کسی نامحرم کے حوالے نہ کریں گے اور یہی غیرت و حمیت ملی کے جذبۂ عالیہ کا اقتضا ہے۔

یوں تو حکیم صاحب کی متوارث بنامنی مرض کی تشخیص کرے گی لیکن انہوں نے اپنی تقریر میں کانفرنس کے فرائض اولین کی جو فہرست پیش کی ہے وہ قبل از وقت ہے۔ اردو کی تعاوجیات کے لیے جو کچھ کرنا ہے پہلے اسی کو کیجئے کہ یہ کام بعد کو بھی ہو سکتے ہیں کیونکہ دربا جب متلاطم ہوتا ہے تو تزئین و آرائش کی نہیں جان کی حفاظت کی ضرورت ہوتی ہے۔ بس اگر آج اردو شکست کھا کر تباہ ہوا چاہتی ہے تو مصنفین کی فہرست کی ترتیب سے پہلے اس غریب کو موت کے گرداب سے بچا لیجئے۔ یہ کام تو "انجمن ترقی اردو" بھی کر سکتی ہے اور غالباً مولوی عبدالحق صاحب کی نگرانی میں عنقریب فہرست شائع ہو جائے گی۔ نماز تو اس وقت پڑھیے جب شریک زندگی "انفلوئنزا" سے بچ جائے۔ رکوع و سجدہ اور دعا و تسبیح نوازی کے لئے ابھی وقت بہت باقی ہے۔ سیاست کے نام سے آخر کب تک صبانا صبانا کیجئے گا جب کہ اسلام خود ایک دعوتِ دینی و سیاسی ہے۔ "صاحب" یتور کی خوا آشائی سے بےخوف ہو کر کام کیجئے کہ "این ذلت و دناءت تا بہ کے"؟ "این پستی و جمود تا چند"؟ یاد کیجئے اس آیت کو جس میں ارشاد ہے یضع عنھم اصرھم والاغلال التی کانت علیھم۔ پیغمبر اسلام کی بعثت کا مقصد اغلال و سلاسل سے آزاد کرانا ہے اور جو گردنیں غلامی کے طوق و زنجیر میں مقیّد ہیں انہیں اس بوجھ سے نجات دلانا ہے۔ اردو کی مقبولیت بڑھانے اس کے طرفداروں کی تعداد میں اضافہ کرنے اور ملکی زبان بنانے کے لئے انگریزی کو شکست دینا اور وائسرائے کے اس خیال کو کہ:

"انگریزی تمام ہندوستان کی قومی زبان ہے"

باطل کرنا ہے اور جس زعم کے ساتھ یہ کہا گیا تھا کہ انگریزی کا درجہ دیسی زبانوں کو دیا جانا اب عملی سیاست سے باہر ہے، اپنی سعی و جہد سے حاصل کرنا ہے اور اس کے لئے میری رائے میں اردو کانفرنس دین کر میدان میں آئے۔ مانگے تانگے کے آدمیوں سے کام نہیں چلا کرتا۔ تنخواہ دار اسسٹنٹ اور جوائنٹ سکریٹری رکھیے۔ باقاعدہ دفتر بنایئے ان مقامات پر جہاں اردو کم سمجھی جاتی ہے یا ان مقامات پر جہاں اردو بولی جاتی ہے۔ اسی طرح ان مقامات پر جہاں اردو سے صرف محبت ہے۔ مدارس و مکاتب

قائم کیے جائیں۔ چھوٹے چھوٹے کتب خانے کھولے جائیں۔ "انجمن ترقی اردو" سے ایسا سلسلہ کتب لکھوایا جائے جسے بچے (اور جو بھی بچے پڑھنا چاہیں) دلچسپی سے پڑھیں اور یہ سلسلہ کتب لیتھو کے بجائے ٹائپ میں طبع کرایا جائے کہ ترقی کی راہ بھی صاف ہو جائے اور لیتھو کے باعث جن موانع و مشکلات سے دوچار ہونا پڑتا ہے ان سے نجات ملے۔ گورنمنٹ اگر بی۔اے اور ایم۔اے کے امتحانات میں اردو کو لازمی کرنے پر آمادہ ہو تو فبہا ورنہ اس کا خود انتظام کیا جائے کہ کوئی مسلمان یا جسے اردو سے محبت ہو ایسا نہ رہے جو شگفتہ اردو لکھنے سے عاجز ہو۔ اپنی آواز کے زور اور اجتماعی طاقت سے عدالتوں کی زبان اردو بنا دی جائے۔ قومی مجالس کے چبوتروں سے جو آواز کانوں میں آئے وہ اردو ہو۔ دکانوں کے بہی کھاتے، دفتروں کے حساب کلیتۃً اردو میں ہوں اور صوبہ در صوبہ سے کم از کم دو دو ماہوار رسالے جاری کیے جائیں جن میں سے ایک مبتدیوں کے لیے ہو اور دوسرا اوسط اور اعلیٰ درجہ کی جماعتوں کے لیے۔ اسی طرح دو دو اخبار جن میں ایک ہفتہ وار اور ایک روزانہ جو نہ زمیندار کا نقش قدم ہوں نہ الہ آباد کے مشہور انگریزی اخبار کے پیرو۔ بلکہ لیڈر اور ہمدرد کے بھائی ہوں جن کا مقصد حکومت کو گالیاں دینا نہیں بلکہ اپنے ضروریات کا اظہار اور معلومات کا پھیلانا ہو۔

یہ ہیں وہ کام جو اردو کے مستقبل کو بنانے اور ترقی دینے کے لئے سب سے پہلے کرنے ہیں اور اردو کانفرنس کو چاہیے کہ اپنی آہستہ خرامی کو چھوڑ کر بادیہ پیمائی اور آبلہ پائی کے لیے نکل کھڑی ہو بشرطِ مصارف سے بے نیاز ہو جانا چاہیے کہ جب حیدرآباد اور بڑودہ، بھوپال اور رامپور موجود ہیں تو اس قسم کے خیالات کو اپنے دماغ کی غذا بنا کے دینا بھی ناشکری اور کفرانِ نعمت ہے:

غمزہ کہیں ہے ابھی ہونے کو ہر صبح وصال　　دور کر دل سے شبِ ہجراں کا اندوہ ملال

جب کام کرنے کا ولولہ آپ کے دل میں موجزن ہوگا، جب آپ اپنی زندگی کا سامان کر رہے ہوں گے اور خلوص و صداقت مطمح نظر ہوگا تو خدا خود ایسے سامان کر دیگا کہ والیان ملک و دولت کے دل آپ پر نرم ہو جائیں گے۔ "ولا تشغلوا انفسکم بالدعاء علی الملوک ولکن اشغلوا انفسکم بالذکر والتضرع کی اکفیکم ملوککم (حدیث قدسی)" پس تم خواہ مخواہ والیان ملک و دولت کو بددعائیں مت دو، بلکہ اپنے اندر حقیقی نیائش و نہادگی اور میرے سامنے تضرع و زاری کی اصلی کیفیت پیدا کرو میں بادشاہوں کا بادشاہ ہوں، تاکہ ان کے دلوں کو تم پر پھیر دوں۔

●●

تاہم ایڈیٹر کا نوٹ: "مضمون کے شائع کرنے کے یہ معنی نہیں کہ ہمکو صاحب مضمون کی ہر ایک رائے سے اتفاق ہو"

ڈاکٹر تیج بہادر سپرو

مذاق ادب کی قومی کشش

دنیا کی تاریخ میں ایسی مثالیں موجود ہیں کہ ایک ملک میں ایک زمانہ میں دو قومیں جن کی نسل، زبان اور مذہب جداگانہ تھا ساتھ ساتھ آباد رہی ہیں اور کچھ عرصہ تک ان میں باہمی تنازعات جاری رہے ہیں۔ لیکن بعد ازاں ایک قسم کا اتحاد پیدا ہو گیا جس کی وجہ سے وہ ایک دوسرے کی قدر کرنے لگیں اور معمولی امور دنیوی میں ایک دوسرے کا ساتھ دینے لگیں۔ اس امر کی تحقیقات کہ اس اختلاف کے بعد یہ اتفاق کیسے پیدا ہوا خالی از دلچسپی نہیں ہے۔ بعض اوقات تو ایسا ہوا ہے کہ ایک قوم دوسری قوم کے ساتھ فاتح کی حیثیت سے پیش آئی ہے اور تلوار کے زور سے اس پر حکومت کی ہے۔ مفتوح قوم نے مجبور ہو کر فاتح قوم کی طرز معاشرت کو اختیار کیا یا کہ فاتح قوم کا مذہب اختیار کیا اور رفتہ رفتہ باہمی ازدواج کی بدولت اپنی علیحدہ ہستی کو فاتح قوم کی نذر کر دیا۔ یہ مثالیں تو اس اتحاد و اتفاق کی نہیں ہو سکتیں کہ جو اس موقع پر مد نظر ہے۔ بعض اوقات ایسا بھی ہوا ہے کہ ایک قوم نے دوسری قوم کو فتح کیا ہے اور جو فتح پائی ہے اس کو بطور جزو سلطنت کے اپنے علیحدہ بھی رہنے دیا لیکن نہ مفتوح قوم کو اپنے مذہب کے ترک کرنے پر مجبور کیا نہ اس کے طرز معاشرت میں کوئی دست اندازی کی ہے بلکہ مفتوح قوم نے اپنی ذاتی تہذیب اور شائستگی کا فاتح قوم پر اکثر ایسا اثر ڈالا کہ فاتح قوم کی تہذیب و شائستگی کے آئینہ میں مفتوح قوم کی تہذیب و شائستگی کا عکس نظر آنے لگا۔ اس کی سب سے بڑی مثال دنیا کی تاریخ میں یونان و روما کے تعلقات سے ملتی ہے۔ شائقین تاریخ کو معلوم ہے کہ جب سلطنت یونان کو زوال ہوا اور ملکی حیثیت سے اس نے روما کا لوہا مانا تو باوجود مفتوح ہو جانے کے اس نے اپنی تہذیب و تربیت کو نہ چھوڑا بلکہ رفتہ رفتہ یونانی فلسفے کا روما کی تہذیب پر بہت بڑا اثر پڑا۔ چنانچہ اس اثر کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اہل روما اپنے قانون کو وسعت دینے پر مجبور ہو گئے۔ اہل روما کے پرانے اصول کے مطابق ان کے متبرک قانون کا نفع سوائے باشندۂ روما کے غیر شخص نہیں اٹھا سکتا۔ مگر جو لوگ قانون بین الاقوام کی اصولی اور تاریخی حیثیت سے واقف ہیں وہ بخوبی جانتے ہیں کہ روما کے قانون پر یونان کے فلسفہ کا کس قدر اثر پڑا۔ تاریخی حیثیت سے اس تمثیل کے متعلق زیادہ وضاحت کے ساتھ لکھنا میرے مقصد کے لئے ضروری نہیں ہے۔ مختصر لکھوں گا کہ

قطع نظر کرکے اگر ایسے ہی ملک ہندوستان پر نظر ڈالی جائے تو نہایت غور طلب سوالات پیدا ہوتے ہیں۔ ایک زمانہ جس کی تشخیص کی چنداں ضرورت نہیں ہے وہ تھا کہ جب آریہ قوم ہندوستان میں فاتح بن کر آئی اور اس نے یہاں کے اصلی باشندگان کو مدت تک اپنے زیر حکومت رکھا۔ ہندوستان کے قدیم باشندے رفتہ رفتہ مفقود ہو گئے اور یہ تہذیب وشائستگی کہ قوم فاتح اپنے ساتھ لائی تھی یا جس کی نشو و نما کہ ہندوستان میں ہوئی اس کے اوپر مفتوح قوم کی تہذیب وشائستگی کا مطلق اثر نہیں ہوا۔ غالباً اس کی وجہ یہ تھی کہ مفتوح قوم میں کوئی تہذیب وشائستگی پہلے سے تھی ہی نہیں یا اگر تھی تو نہایت پست حالت میں تھی۔ ممکن ہے کہ جو تعصبات روزمرہ کی زندگی میں ہم ہندوؤں میں پاتے ہیں ان کا تعلق اس مفتوح قوم کے طرز معاشرت سے ہو۔ مگر پرانے زمانے کو چھوڑ کر جو سب میں دلچسپ زمانہ ہماری نگاہ کے سامنے پیش آتا ہے وہ ہے جبکہ مسلمان ہندوستان میں آئے۔ مسلمان ہندوستان میں بحیثیت فاتح قوم کے آئے تھے۔ میرے خیال میں اس سے انکار کرنا تاریخ اور واقعہ کے خلاف ہے مگر یہ یاد رکھنا چاہیے کہ جس وقت کہ مسلمان یہاں آئے تھے اگرچہ ملکی حیثیت سے ہندو بوجہ باہمی نفاق کے تباہ ہو چکے تھے، لیکن اخلاقی اور علمی حیثیت سے ہندوؤں کے بزرگوں نے ایک ایسا بیش بہا خزانہ تہذیب وشائستگی کا ورثہ میں چھوڑا تھا کہ ہندو باوجود مفتوح ہو جانے کے اس خزانے کے مالک بنے رہے۔ ابتدائے سلطنت اسلامیہ میں بعض سلاطین اسلام نے اس بات کی کوشش کی کہ ہندو اپنے مذہب کو ترک کرکے اسلام قبول کریں۔ لیکن باوجودیکہ ایک کافی تعداد ہندوؤں کی اپنے موروثی مذہب کے دائرے سے نکل گئی تاہم بحیثیت مجموعی ہندو مذہب میں کوئی زوال عظیم پیدا نہیں ہوا۔ رفتہ رفتہ جبکہ مسلمانوں نے ہندوستان میں بود وباش اختیار کی اور کسی نہ کسی مقام کو ہندوستان میں اپنا مرکز سلطنت بنایا تب ایک عجیب کیفیت پیدا ہوئی۔ ادھر فاتح قوم ایسی تھی کہ جو اپنی تہذیب وشائستگی اور فلسفہ وعلم وادب کا سرمایہ لائی تھی، دوسری طرف مفتوح قوم ایسی تھی جس کو اپنے قدیم فلسفہ وادب پر ناز تھا۔ اگر کل ہندو مسلمان ہو گئے ہوتے یا مسلمان ہونے پر مجبور کیے گئے ہوتے تو یہ سوال کہ جو معرض بحث ہے ہرگز نہ پیدا ہوتا۔ کیا یہ کہنا صحیح ہے کہ مسلمانوں نے ہمیشہ اور ہر زمانہ میں ہندوؤں کو تلوار کے زور سے اپنا ماتحت رکھا۔ یا یہ کہنا صحیح ہے کہ ابتدا میں تلوار کا زور تھا لیکن رفتہ رفتہ ہندو ان کی حکومت سے مانوس ہوتے گئے۔ میرے خیال میں ابتدا میں مسلمانوں نے جو کچھ کیا ہو بعد ایک زمانہ کے انہوں نے وہی طریقہ اختیار کیے جو ایک قوم کو دوسری قوم پر حکومت کرنے کے لئے لازم ہوتے ہیں۔ چند متعصب مسلمان بادشاہوں کو چھوڑ کر

میرے خیال میں زیادہ اسلامی حکومت کا ایسا تھا کہ ہندو اس بات کو بھول گئے تھے کہ وہ اس مفتوح قوم میں پیدا ہوئے ہیں۔ اس کے دو سبب ہو سکتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ ہندوؤں کے دل سے قومی حفظ مراتب کا خیال قطعی مفقود ہو گیا تھا کہ وہ اپنے جداگانہ قومی حیثیت کو فراموش کر گئے تھے۔ میں اس کو آسانی سے ماننے کے لئے تیار نہیں ہوں۔ دوسرا سبب یہ ہو سکتا ہے کہ ہندوؤں کو مسلمانوں کی حکومت ہی نہیں بلکہ اُن کی تہذیب وشائستگی سے ایک خاص انس پیدا ہو گیا تھا۔ میں اس کو زیادہ قرین قیاس وجہ سمجھتا ہوں۔

جہاں تک مجھے تاریخ کا تجربہ اجازت دیتا ہے میں اس بات کے ماننے کے لئے تیار نہیں ہوں کہ مفتوح قوم فاتح قوم سے محض اس کے عدل و انصاف یا وسعت اخلاق کی وجہ سے مانوس ہو سکتی ہے اس انس کے لئے دیگر اسباب کا ہونا لازمی ہے اور سب میں بڑا سبب میرے خیال میں جو ہو سکتا ہے وہ یہ ہے کہ اگرچہ مذہبی اختلاف ہو تاہم ایک قوم دوسری قوم کی طرز معاشرت و تمدن تہذیب و شائستگی کی قدر کرنے لگے۔ چنانچہ ہندوستان میں میرے خیال میں ایسا ہی کچھ ہوا۔ ابتدا میں ضروریات معاش کو محسوس کرکے ہندوؤں نے فارسی و عربی پڑھنا شروع کیا۔ رفتہ رفتہ فارسی کی تحصیل ہندوؤں کے لئے تہذیب و تربیت کا معیار ہو گئی۔ چنانچہ اکبر کے زمانہ سے لے کر آخر زمانہ تک صدہا مثالیں ایسے ہندوؤں کی ملیں گی کہ جنہوں نے فارسی زبان سیکھنے میں کمال حاصل کیا اور اس کمال کی بدولت دنیوی طریقہ پر ہی نہیں کامیابی حاصل کی اور جلیل القدر مراتب پر ہی نہیں پہنچے بلکہ مسلمانوں کی نگاہ میں انہوں نے قومی وقار حاصل کیا۔ میرے خیال میں یہ غیر ممکن ہے کہ اگر ایک شخص یا ایک قوم کسی دوسری قوم کی تہذیب اور فلسفہ کو حاصل کرے اور اس کی نگاہ میں اس قوم کی وقعت نہ پیدا ہو۔ مسلمانوں کی بھی ایسی مثالیں موجود ہیں کہ جنہوں نے سنسکرت پڑھی اور ہندوؤں کی تہذیب و شائستگی و فلسفہ کی قدر کی۔ اگرچہ یہ بات ماننی پڑے گی کہ مسلمانوں کی ایسی مثالیں زیادہ نہیں ہیں۔ رفتہ رفتہ جب اُردو زبان کی بنیاد پڑی اور شمالی ہندوستان میں اردو کا بولنا اور لکھنا شائستگی اور تہذیب کا معیار مانا گیا، تو ہر جگہ ہندوؤں نے اس مشترکہ زبان کی ترقی میں ویسی ہی کوشش کی جیسی کہ مسلمانوں نے۔ چنانچہ دہلی و لکھنؤ میں غدر سے پہلے ایک کافی تعداد ایسے ہندوؤں کی پیدا ہو چکی تھی کہ جن کو مسلمان بھی اہل زبان مانتے تھے اور غدر کے بعد بھی اگرچہ ہندو مسلمانوں میں بوجوہ چند در چند اختلافات بڑھتے چلے گئے لیکن ہندوؤں نے ایک عرصہ تک فارسی و اردو سے اپنا پرانا انس قائم رکھا۔ میری رائے ناقص میں یہ کہنا تو ہرگز صحیح نہیں ہے کہ ہندوؤں نے پچھلے ۲۰ برس میں اردو کے ترک کرنے

کی کوشش کی گئی اس کے ماننے کے لئے ضرور تیار ہوں کہ فارسی اور اردو کی طرف سے بے اعتنائی ضرور ہے۔ کچھ سبب یہ ہے کہ ہندوؤں میں اپنی عظمت دیرینہ کے خیال سے سنسکرت و ہندی کے دوبارہ ترقی دینے کا جوش پیدا ہوا ہے اور کچھ سبب یہ ہے کہ فی زمانہ ہمارے طلبا کو سائنس کا شوق زیادہ ہو گیا ہے میری رائے میں کوئی حق پسند مسلمان ہندوؤں سے یہ نہیں کہہ سکتا کہ وہ سنسکرت یا ہندی کو ترقی نہ دیں کیونکہ ہندوؤں کا جو کچھ پرانی تہذیب کا سرمایہ ہے وہ انہیں زبانوں میں ہے اور کوئی قوم اپنے ایسے قیمتی ورثہ سے دست بردار نہیں ہو سکتی۔ لیکن ساتھ ہی اس کے میں یہ بھی ضرور کہوں گا کہ کوئی حق پسند ہندو یہ بھی نہیں کہہ سکتا کہ ہندی کی ترقی کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ اردو کو نقصان پہنچانے یا اس سے بے اعتنائی کرے۔ میں اردو زبان کے بہی خواہ کی حیثیت سے کبھی یہ گوارا نہیں کر سکتا کہ ہندو اردو سے منہ موڑیں یا اس کو کسی قسم کا نقصان پہنچادیں۔ مگر میرا دائرہ خیال اس سے زیادہ وسیع ہے۔ میں یہ سمجھتا ہوں کہ کوئی زمانہ ایسا نہیں آئے گا کہ جب ہندو، ہندو نہ رہیں گے، یا مسلمان مسلمان نہ رہیں گے۔ میرے خیال میں ہر قوم اپنے مذہب پر قائم رہے گی مگر جس قدر سائنس کی ترقی ہوتی جائے گی اور لوگوں میں تعلیم پھیلتی جائے گی۔ لوگوں میں اختلافات جو مذہب کی وجہ سے نہیں بلکہ دوسرے تعصبات کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں کم ہوتے جائیں گے۔ یہ دیکھتے ہوئے کہ دونوں قوموں کو ہندوستان میں رہنا ہے اور ملکی اغراض کے لئے ایک دوسرے کے ساتھ کوشش کرنا ہے کوئی رشتۂ اتحاد دونوں میں قائم رہنا لازمی ہے۔ میرے خیال میں اگر کوئی ایسا رشتۂ اتحاد ہو سکتا ہے، تو وہ یہی ہو سکتا ہے کہ ایک قوم دوسری قوم کی تہذیب و شائستگی، فلسفہ، علم ادب کی قدردانی کرے اور یہ غیر ممکن نہیں ہے کم از کم شمالی ہندوستان میں ہندو فارسی اور اردو کی تحصیل کو قائم رکھیں اور مسلمان بھی ہندوؤں کی تہذیب و شائستگی کے سمجھنے کی کوشش کریں۔ میری سمجھ میں نہیں آسکتا کہ اگر کوئی مسلمان لڑکا روما اور یونان کی تہذیب و شائستگی کی تاریخ پڑھنے پر آمادہ ہو جاتا ہے، تو وہ ہندوؤں کی تہذیب و شائستگی سے اس طرح مانوس ہونے کی کوشش کیوں نہ کرے۔ علیٰ ہذا القیاس اگر کوئی ہندو لڑکا مدرسوں یا کالجوں میں دلی شوق سے یونان و روما کی تاریخ پڑھتا ہے اور ان کی تہذیب و شائستگی سے اچھی طرح واقفیت حاصل کرتا ہے، تو کیا وجہ ہے کہ وہ عرب و فارس یا مصر کی تاریخ نہ پڑھے اور وہاں کی تہذیب و شائستگی سے اچھی طرح واقف نہ ہو۔ یورپ میں تو کوئی شخص اس وقت تک مہذب نہیں سمجھا جاتا جب تک

کہ وہ کم از کم دو یا تین زبانیں نہ جانتا ہو۔ ہندوستان کی یہ کیفیت ہے کہ ہمارے یہاں کے نوجوان تمام کر بی اے یا ایم اے ہو جاتے ہیں مگر انگریزی زبان پر ان کو پوری طرح قدرت حاصل نہیں ہوتی ہے۔ وہ اپنی زبان سے قریب قریب بے بہرہ رہتے ہیں اور ایسے شخصوں کی تعداد تو شاذ نہایت ہی قلیل ہوگی کہ جو فارسی یا سنسکرت یا اردو ہندی دونوں سے بخوبی واقف ہوں۔ جہلا کو چھوڑ کر تعلیم یافتہ طبقہ پر اگر نظر ڈالی جائے تو بہت سے ہندو ایسے ملیں گے جنہیں یہ معلوم نہیں ہے کہ مسلمانوں میں عشرۂ محرم کس تاریخی واقعے کی یادگار ہے۔ اسی طرح مسلمانوں میں اکثر تعلیم یافتہ مسلمان ایسے ملیں گے کہ جو رام لیلا کی اصلیت سے واقف نہیں ہیں۔ نتیجہ اس کا یہ ہے کہ ایک دوسرے کے تاریخی واقعات سے بالکل ناواقف ہیں۔ ایسی حالت میں دونوں قومیں ایک دوسرے کی شائستگی و تہذیب کی کس طرح قدر کر سکتی ہیں۔

ملکی اتفاق جذبات پر یہ ناواقفیت پر کبھی مبنی نہیں ہو سکتا۔ اگر ہم اس حسن اتفاق کے خواہاں ہیں جس کے بغیر میری رائے میں ملکی آزادی ترقی نہیں کر سکتی تو یہ لازمی ہے کہ ایک دوسرے کے سارے اصولوں سے واقف ہوں اور ان کی قدر کرنا سیکھیں۔ بغیر اخلاق اور معاشرتی ارتباط کے محض پولیٹیکل اتفاق میری رائے میں ایک عمارت بے بنیاد ہے۔ یا تو یہ ہو کہ ہم سب ایک مذہب ہو جائیں جو کہ ناممکن ہے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ مذہبی و قومی اختلافات کو جس قدر ہو سکے کم کریں۔ مگر ایسا ہونا اسی حالت میں ممکن ہے جبکہ دونوں قومیں ایک دوسرے کی تاریخ و تمدن سے واقف ہوں۔ واقفیت سے وقعت اور وقعت سے اخلاص پیدا ہوتا ہے۔ محض پولیٹیکل کانفرنسوں میں شریک ہونا (اگرچہ یہ بھی ضروری ہے اور اس کا بھی اثر ہوتا ہے) میرے خیال میں قومی ترقی کے لئے کافی نہیں ہے۔ علاوہ بریں اگر دو چار ہندو اور مسلمان کسی جلسہ میں بیٹھ کر ہم مشرب و ہم پیالہ ہو گئے تو اس سے باہمی اختلافات مٹ نہیں سکتے۔ روزمرہ دیکھتا ہوں کہ باوجودیکہ اس قسم کے تعلقات تعلیم یافتہ طبقہ میں روز بروز بڑھتے جاتے ہیں لیکن جہاں تعصب کا جھونکا آیا، وہیں قدم ڈگمگانے لگتے ہیں۔ میری رائے میں جہلا کی شکایات بالکل بیکار ہے پہلے اعلیٰ طبقہ کے لوگوں میں اور خصوصاً تعلیم یافتہ طبقہ میں وہ سچا ارتباط کہ جس کی مستحکم بنیاد صرف اخلاق ہی ہو سکتی ہے، پیدا ہونا چاہئے۔ اس کے لئے لازمی یہ ہے کہ ہندو پرانے طریقہ کے مطابق اردو اور فارسی سے جو کہ ذریعہ اسلامی تہذیب و تمدن کی واقفیت کا ہے، اپنا تعلق اور انس قائم رکھیں اور مسلمان بھی اپنا یہ فرض سمجھیں کہ باوجودیکہ ان کو ہندو مذہب سے شرعی اختلاف ہے، لیکن ہندوؤں کے رسم و رواج و فلسفہ و علم و ادب سے مانوس ہونا ان کے لئے لازمی اور ضروری ہے۔

(اکتوبر ۱۹۱۸ء)

●●

اچیت رائے

قومی تعلیم

"قومی تعلیم" کے بابت تین رائیں ہیں سامنے موجود ہیں۔ ایک مسز بسنٹ، دوسری مسٹر بال گنگادھر تلک اور تیسری مسٹر اشو ہماری گھوش کی۔ ان میں سے شائد صرف ایک ایسی رائے ہے کہ جس میں اس مسئلہ کے متعلق خیالات منارج ہیں اور وہ مسز بسنٹ کی رائے ہے۔ اس لئے میں مسز بسنٹ کی رائے پر سب سے پہلے غور کروں گا۔ مسز بسنٹ فرماتی ہیں:

"کوئی شے قومی زندگی کو اس قدر جلد ناکارہ نہیں بنا سکتی۔ کوئی چیز قومی کیریکٹر کو یقینی طور سے اس قدر زیادہ کمزور نہیں کرتی جس قدر اس بات کا رواج کہ قوموں کی تعلیم پر غیر ملکی اثرات کا اقتدار حاصل ہو اور غیر ملکی نصب العین پیش کئے جائیں۔ ۱۸۹۶ء سے متواتر میں ہندوستانیوں کے دلوں پر یہ ذہن نشین کرنے کی جرأت کی ہے کہ ان کے لڑکوں کو جو تعلیم دی جاتی ہے وہ ان کو دائرۂ قومیت اور روحانیت سے خارج کر رہی ہے۔ غیر ملکی عادات، غیر ملکی اطوار، غیر ملکی لباس، غیر ملکی طریقہ۔ سب کے سب غیر ملکی زبان کے ساتھ ہی ساتھ عیسائی اسکولوں میں نوجوانان قوم اختیار کرنے کے لئے مجبور ہو رہے ہیں۔ غیر ملکی مذہب یہ مسئلہ ہے کہ وہ لڑکوں کے دل پر کوئی اثر نقش جمنے نہیں دیتا اور ان کی تمام فطرت کو روحانیت سے بے بہرہ کر دیتا ہے۔"

اس مسئلہ کے عملی پہلو کو دکھاتے ہوئے مسز بسنٹ نے ایک حد تک اس سوال کو بھی اٹھایا ہے کہ ہماری "قومی تعلیم کیسی ہونی چاہیئے" اور بعد ازاں مسز موصوفہ نے اس سوال کا جواب الفاظ ذیل میں دیا ہے۔

(۱) اس تعلیم پر سب ہندوستانیوں کو مقدرت ہونا چاہیئے۔ ہندوستانی ہی اس کا ڈول ڈالیں۔ ہندوستانی ہی اس کو جاری رکھیں۔ اس کا نصب العین ہندوستانی ہونا چاہیئے تا کہ اخلاق، محبت اور دانائی کا بول بالا ہے اور روحانیت کا اثر اس کے رگ و ریشہ میں سرایت کر جاتا ہو۔ محض مذہبی عقائد کی درسی کتابوں کی تعلیم یہ بات پیدا نہیں کر سکتی۔ ہماری روحانیت کی اسپرٹ وافر ہے، رواداری ہے۔ سب کے واسطے اس کی آغوش محبت وا ہے۔ یہ اس حقیقت کو تسلیم کرتی ہے کہ مار گاہ ایزدی تک انسان کی رسائی کی بہت سی راہیں ہیں اور تمام پیغمبر خدا ہی کے بھیجے ہوئے ہیں۔

(۲) قومی تعلیم کو قابل فخر اور نورانی حب قومی کی فضا میں رہنا چاہیئے اور اس فضا کو

ہندوستانی علم و ادب، ہندوستانی تاریخ، علم سائنس، فنون، سیاسیات، جنگ، نئی بستیوں کی آبادی، تجارت اور بیوپار میں ہندوستانی نمایاں کامیابیوں کے مطالعہ سے تازہ، لطیف، خوشگوار اور موزوں بنانا چاہیے اگر ارتھشستر پڑھایا جائے، تو دھرم شاستر پر بھی نظر ڈالی جائے۔ علم سائنس اور سیاسیات کے مطالعہ کے ساتھ ہی مذہب کی کتب کا مطالعہ بھی ضرور کیا جائے۔

(۳) قومی تعلیم کو قوم کی خانگی زندگی سے جوڑا کرنا چاہیے۔ قوم کے جو نصب العین، حقوق، اصول اور جذبات ہوں قومی تعلیم ان کا آئینہ ہونی چاہیے، کیونکہ قوم افراد اور خاندانوں سے بنتی ہے۔ گھر اور اسکول کے مابین آج کل جو مخالفت ہے، وہ ضرور دور ہونی چاہیے۔ اسکول اور کالج کے استادوں کو گھروں پر تعلیم دینے والے اُستادوں کے ساتھ یکسوئی ضرور قائم رکھنی چاہیے۔

(۴) قومی تعلیم ہر موقع پر قومی ضرورت کے مطابق ہونی چاہیے اور قومی تعلیم ایسی ہونی چاہیے کہ جو قومی کیرکٹر کو ابھارے۔ ہندوستان کو نہ تو انگلستان سے کمتر رہنا ہے اور نہ برتر ہونا ہے، بلکہ اس کو ترقی کرکے بہت طاقتور ہندوستانی بننا ہے۔ برطانوی نصب العین اہل برطانیہ کے حق میں سودمند ہیں لیکن ہندوستان کے حق میں ہندوستانی نصب العین ہی اچھے ہوں گے۔ نہ ہم کو صدائے بازگشت کی ضرورت ہے نہ ایک رنگی آوازوں کی۔ ہم اقوام کی اس دلآویز ہمنوائی کے خواستگار ہیں جو فطرت اور خدا کے گوناگوں اوصاف کا آئینہ ہو۔ کیا قدرت اپنا ایک ہی یک رنگ روپ قائم رکھے گی۔ کیا درخت، پھول، پہاڑ اور آسمان صرف ایک ہی رنگ میں ڈوبے رہیں گے۔ کمال کی علامت یہ ہے کہ یکسوئی کے ساتھ انواع اقسام کے رنگ بدلتے ہیں، نہ یہ کہ ایک ہی رنگ برابر قائم ہے۔

ہندوستان کے لئے تمام تر عذر خواہیوں سے قطع نظر کرکے ہندوستان کے طریقوں، رسوم اور روایات قدیم کی مذمت کے باوجود ہندوستان خود بھرپور ہے اور اس کو اس کی ضرورت نہیں ہے کہ وہ کسی بات کا محتاج قرار دیا جائے۔

مسز بسنٹ کی یہ رائے اور ان کا یہ انداز گفتگو کون وطن پرست ہے کہ جسے پیارا نہ معلوم ہو۔ اس میں جوش بھرا ہے۔ ترغیب دینے والا ہے اور ساتھ ہی نہایت پاکشان اور حوصلہ افزا ہے۔ فصاحت و بلاغت کے لحاظ سے نہایت نادر ہے۔ میں نے بسا اوقات اس قسم کے الفاظ استعمال کیے ہیں اور ان کا نتیجہ بہت اچھا نکلا ہے۔ اگر کسی موقع پر ضرورت ہوگی تو میں ان کو پھر استعمال کروں گا۔ ہم اپنی تنقید سے نکل ہو سکی

اور بنارس کے سنٹرل ہندو کالج سے متعلق سرگرمیوں کے بابت مسز بسنٹ کے احسانات عظیم کے بہت کچھ مشکور
ومنون ہیں یا مسز موصوفہ نے ہوم رول لیگ کی سرکردگی اختیار کر کے اور اس کے ساتھ دلچسپی ظاہر کر کے اپنا احسانات
کے بار کو ہمارے لئے زیادہ وزنی بنا دیا ہے۔ بدین وجہ وہ جو کچھ ارشاد کریں اس پر ہم کو نہایت غور اور ادب کے
ساتھ توجہ کرنا لازم ہے۔ لیکن یہی واقعات ہمارے لئے اس امر کو اور لازمی بناتے ہیں کہ اگر ہم توجہ اور
ادب کے ساتھ غور و فکر کر کے مسز موصوفہ کی رائے سے اختلاف کریں تو ہم یہ کہدینے میں مطلق تامل نہ کریں کہ ہمکو
آپ کی رائے سے اختلاف ہے۔ مجھے یقین ہے کہ وہ ہم سے یہ نہیں چاہتی ہیں کہ ہم آنکھ بند کر کے اُن کی پیروی
کریں۔ اُن کو اس بات کا دعویٰ نہیں ہے کہ ان کی رائے کبھی خطا نہیں کر سکتی۔

ہندوستانی خادمان قوم کو ایک فرض انجام دینا ہے وہ اپنی قوم کے مستقبل کا خاکہ تیار کر رہے
ہیں کہ جس میں متواتر ردوبدل ہوتا رہتا ہے اور جس نے ابھی کوئی مستقل صورت اختیار نہیں کی ہے لیکن
جس کا مستقبل کلیتہً تعلیم پر منحصر ہے۔

تعلیم کا سوال ہم سب کے واسطے نہایت ضروری ہو رہا ہے۔ ہمارے تمام مسائل سے زیادہ
اہم یہی مسئلہ ہے بلکہ یہ کہنا چاہیئے کہ ایک معنی میں بنیادی مسئلہ ہے تعلیم، مقاصد و اغراض تعلیم اور
تعلیم کے طریقوں کے بابت پریشان اور اُلجھے ہوئے خیالات سے ہمارا کام کسی طرح نہیں چل سکتا۔ ہمارے
تمام مستقبل کا دار و مدار اسی پر ہے۔ پس ہمارا فرض ہے کہ ہم اپنی تمام تر قوت اس مسئلہ کو صحیح طور پر سمجھنے
اور صحیح طور پر حل کرنے میں صرف کریں۔ تعصبات اور جذبات کے بندے بن جانے سے کام نہ چلے گا۔ اس مسئلہ
کا فیصلہ اس طریق سے ہو سکتا ہے کہ تمام تر مسئلہ پر گہری اور نہایت احتیاط کے ساتھ تنقیدانہ نظر ڈالی
جائے۔ اگر جلد بازی کے ساتھ کوئی فیصلہ کیا گیا یا وہ تعصبات اور جذبات پر مبنی ہوا، تو اس سے ہماری
رفتار ترقی رُک جائے گی اور اگر ایسا نہ بھی ہوا تو بہرحال رفتار ترقی سست ضرور پڑ جائے گی۔ ابھی قوم
کے دل و دماغ کی کیفیت موم کی سی ہے کہ جس پر آپ جو نقش چاہیں جما سکتے ہیں۔ لہٰذا ضرورت ہے کہ دانشمندی
اور غور و فکر کے ساتھ اس کی رہنمائی کی جائے، جن کے ساتھ لوگوں کو الفت ہو جن کی تعظیم کی جاتی ہو اور جن
کی دانشمندانہ رہنمائی میں لوگوں کو اعتماد ہو وہ جو رجحان روا رکھیں، جن تعصبات کی نشو و نما ہونے دیں
اور جو جذبات ابھاریں وہ قوم کے دلوں پر گہرا نقش جما دیتے ہیں پھر ان کو مٹانا مشکل ہو جاتا ہے۔ قومی
میلان، جذبات، تعصبات، خیالات اور ترجیحات کو بدیں خیال جلد بازی کے ساتھ پیدا کر دینا کہ بعد میں
جب وہ ناقص ثابت ہوں گی تب اُن کی اصلاح کر دیجائے گی، سراسر باعث زیان ہے۔ اس مضمون کے

ذریعہ سے صرف یہ عرض کرنا مقصود ہے کہ مسئلہ زیر بحث پر ہوشیاری کے ساتھ تنقیدانہ نظر ڈالی جائے اور ساتھ ہی اس کے لیے غور و فکر کے ساتھ وسیع خاکہ کھینچا جائے۔ ہمارا ہرگز یہ مقصد نہیں ہے کہ بے معنی نکتہ چینی میں مشغول ہو جائیں نہ ہم کو علم غیب کا دعویٰ ہے۔ اولاً ہم کو خوب سمجھ لینا چاہیے کہ ہمارے قومی نصب العین کیا ہیں۔ کیا ہم تہذیب دنیا کی ترقی میں قول و فعل کے ذریعہ سے اپنا حصہ اضافہ کر کے اس کا جزو لاینفک ہونا چاہتے ہیں یا یہ کہ ہم سب سے علیحدہ اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد بنانا چاہتے ہیں اور ہمارے لئے علیحدگی اور کنارہ کشی ہی میں جمیع سامان راحت موجود ہیں۔ بیشک ہم سیاسی آزادی، اقتصادی خود مختاری، سوشیل استواری اور مذہبی آزادی کے خواہاں ہیں۔ لیکن یہ سب آخر کس مقصد کے لئے۔ کیا یہ خود ہی منزل مقصود ہیں یا کسی دوسرے اور اعلیٰ منزل مقصود تک پہنچنے کے صرف ذرائع ہیں۔ اگر ایسا ہے تو وہ منزل مقصود کیا ہے۔

بعض اشخاص یہ کہیں گے کہ ہمارا اعلیٰ منزل مقصود "نجات" ہے۔ لیکن نجات کے معنی کیا ہیں؟ کیا یہ بودھ مت کا "نروان" ہے جس کے یہ معنی ہیں کہ شخصی روح ویدانت کی برتر روح میں مل جائے۔ کیا یہ آریہ سماج کے عقائد کے مطابق عارضی نعمت ہے۔ کیا یہ عیسائیوں کی مکتی یا راسخ الاعتقاد مسلمانوں کا بہشت ہے؟ یا یہ سب باتیں آخر کار دھوکہ ہی دھوکہ ہیں۔ حقیقی نجات اسی میں ہے کہ مفلسی، مصیبت، بیماری، جہالت اور ہر قسم کی غلامی سے اسی زندگی میں خود ہم کو اور اس کے بعد ہمارے جانشینوں کو آزادی مل جائے۔ یہاں ایسے مذاہب بھی موجود ہیں جو اپنے پیرووں پر یہ فرض قرار دیتے ہیں کہ وہ مصیبت، افلاس، بیماری، جہالت اور غلامی کے تمام آلام جھیلیں تاکہ آخرت میں ان کو راحت اور شادمانی نصیب ہو۔ درحقیقت یہی کم و بیش ان تمام مذاہب کا میلان ہے جو ایک طریقے پر قائم ہو گئے ہیں۔ ہندوستان کے تمام فرقے مصائب افلاس، بیماری، جہالت اور غلامی کا مقابلہ کرنے کے لئے جو ہمدردی ظاہر کر رہے ہیں ان کی گفتگو سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے کم از کم ایک امر طے کر لیا ہے یعنی چاہے آخری نجات، مکتی، نجات یا نروان میں ہو۔ ہمارے ابنائے وطن مصیبت، جہالت، مفلسی، بیماری اور غلامی کے دور کا قیام نہ اپنے واسطے چاہتے ہیں اور نہ اپنی اولاد کے واسطے۔ سناتنی، آریہ سماجی، برہمو سماجی، ویدانتی اور دیگر ہندو و مسلمان و عیسائی سب کے سب اس بات پر متفق ہیں۔ ان میں سے ہر ایک اپنے عقائد کی تلقین اس طریق سے کرتا ہے کہ اس دنیا میں راستبازی کے ساتھ دولت، تندرستی اور علم حاصل کر کے شادمانی نصیب ہونا اپنا منزل مقصود قرار دے۔ انسان کے دل کا درد و نیز بجا ان بھی اسی جانب ہے لیکن پنڈت پجاری، پیغمبر اور رہنما ابھی دنیا سے غائب نہیں ہوئے ہیں اور نہ ان کے غائب ہونے کی کوئی امید ہے۔ وہ فی الحال

گوشہ نشیں ہو کر اپنا وقت گزار رہے ہیں۔ اگر ذرا سی بھی حوصلہ افزائی اور ترغیب ان کو دی جائے تو وہ عزلت کدہ سے نکل آتے اور اپنی جد و جہد شروع کر دیتے ہیں۔

ویراگ یعنی ہر چیز کے تیاگ اور مفلسی کی زندگی گزارنا ہنوز ہر ایک مذہب کا نمایاں منزل مقصود ہے۔ سنیاسی، درویش اور راہب ہنوز نوع انسان میں ہمارا نصب العین بنے ہوئے ہیں۔ ہر ایک دانا اور فراخدل رفارمر ان کی واجبی عزت اور قدر کرتا ہے۔ ہم اُن کو مذہبی پیشوا کہتے ہیں اور اسی باعث ہم آنکھ بند کر کے گرمجوشی اور عمیق جذبات کے ساتھ ان کی موافقت کے لئے تیار رہتے ہیں۔ بدتر حالت یہ ہے کہ موجودہ زمانہ کے بعض تعلیم یافتہ اشخاص جو نہ تو پُوجاری ہیں اور نہ راہب اور جن میں سے زیادہ تر تارک الدنیا کی سی زندگی بھی بسر نہیں کرتے ہیں وہ بھی اپنے نوجوان ابنائے وطن کے واسطے یہی نصب العین قائم کرتے ہیں۔ ہر ایک مذہب میں چند دلآویز اور اعلیٰ اصول ہوتے ہیں، جو اس کے پیرؤوں کو کشمکش زندگی میں خواہ وہ شخصی ہو یا سوشیل بالکل نیست و نابود ہو جانے سے بچاتے ہیں۔ لیکن ہر ایک مذہب کی تعلیم اور لٹریچر کی مقدار عظیم جیسا کہ بالعموم خیال کیا جاتا ہے بمقابلہ زندگی کی اہمیت سمجھنے اور قدر کرنے کے اس امر پر زور دیتی ہے کہ زندگی کی کوئی وقعت نہیں ہے۔ اعلیٰ درجہ کا ہندو مذہب یہ سکھاتا ہے کہ گیان (علم) سے نجات حاصل ہوتی ہے۔ یعنی صرف معمولی علم سے نہیں بلکہ حقیقی علم سے۔ وہ اس بات پر زور دیتا ہے کہ جو لوگ اس قسم کی طبیعت حاصل کرنے کے متمنی ہوں وہ اس قسم کا گیان حاصل کرنے کے پیشتر بھرپور زندگی گزاریں چاہے وہ ایسی زندگی کیوں نہ ہو کہ جس کو اپنے نفس پر قابو ہو۔ ان کو سوسائٹی کے ساتھ اپنا پورا پورا فرض انجام دینا اور پسندیدہ سوشیل حالات، تعلقات اور دنیا کے نشیب و فراز سے جو کچھ سیکھنا ہو سیکھیں۔ تب وہ زندگی کی بعض تہیوں کو چند دیگر تہیوں کے حق میں ترک کر سکتے ہیں۔ سلف میں مفلسی کی زندگی بسر کرنے کے خلاف کے یہ معنی نہیں تھے کہ دولتمندی کے مقابلہ میں مفلسی سربلند ہے۔ بلکہ اس کے یہ معنی تھے کہ زندگی کی کسی منزل پر پہنچ کر انسان جائداد کے جھگڑوں سے آزاد ہو جائے۔ درحقیقت ہندوؤں کے قدیم زمانہ کے علم و ادب میں ان کا کوئی ذکر سنیاس کے سوا نہیں ہے۔ سلف کے تمام رشیوں اور منیوں کے قبضہ میں جائداد رہتی تھی اور ان کے خاندان بھی تھے۔ وہ صرف یوگ سمادی کے واسطے بغرض تحقیق و تدقیق تنہائی میں رہنا پسند کرتے تھے اور مسائل زندگی پر اپنے قلب کو مرکوز کرتے تھے۔ یہ بطور خود کوئی منزل مقصود نہ تھا بلکہ سوشیل مقصد برآری کا ایک سوشیل ذریعہ تھا۔

صرف نیکی کی خواہش ان کو یہ طرزِ زندگی اختیار کرنے کی ہدایت نہیں کرتی تھی، بلکہ مسائلِ زندگی کو عقلی طور سے حل کرکے نوعِ انسان کو مدد پہنچانے کی سوشیل اور قابلِ تعریف خواہش اس کا باعث تھی۔ اب دیکھئے کہ اس زمانہ کے بعد یہ نصب العین کس قدر گر گیا۔ حتیٰ کہ ہم اس حالت پر پہنچے ہیں کہ جب ہم صرف تیاگ کی زندگی پر پھولے نہیں سماتے اس کو زندگی کی عمارت کی چوٹی پر قائم کرتے اور اس کو منزلِ مقصود اور منارۂ روشنی قرار دیتے ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ کل قوم اس پر کاربند نہیں ہوئی کہ جس کا باعث یہ تھا کہ ایسا ہونا ناممکن تھا۔ جن لوگوں نے اس طریقہ کو اختیار کرنا چاہا، اختیار کر لیا اور آج ہم کو یہ حالت نظر آتی ہے کہ قوم کے ایک بڑے حصے نے قریب قریب تمام اقتصادی کام ترک کر دیئے ہیں کہ جن سے نفع پہنچ سکتا تھا اور اب وہ سادھومت کی خوبیوں کا وعظ کرنے میں مشغول رہتا ہے اور لوگوں کو اس بات کا یقین دلاتا ہے کہ اگر خود سادھو نہ ہو تو انسان کو چاہیئے کہ عذاب سے بچنے کے لئے سادھوؤں کو کھانا کھلائے، اور ان کی خبرگیری کرتا رہے۔

مجھے خوف ہے کہ ہندومت کے بابت میں نے جو کچھ کہا ہے وہی کم یا بیش اسلام اور مذہب عیسوی کے حق میں بھی صادق آتا ہے۔ یہ خیال اس قدر بیٹھا ہوا ہے کہ ہندوؤں میں آریہ سماج، برہمو سماج اور ویکانند مشن کے ذرائع اصلاح بھی یہی میلان ظاہر کرتے ہیں۔ ان کے بھجن، گیت اور پرارتھنائیں ہنوز اسی رنگ میں ڈوبی رہتی ہیں۔ جس زمانہ میں انگریزی تعلیم کا چرچا ہندوستان میں شروع ہوا تھا، زندگی کو بے وقعت سمجھنے کا یہ مہلک رجحان ہماری قومی کیریکٹر کا ایک معقول حصہ بنا ہوا تھا۔ ہم مختلف مذاہب کو اگرچہ اس الزام سے بری بھی کرا لیں کہ انہوں نے زندگی کو بے وقعت سمجھنا ایک نصب العین کی حیثیت میں سکھایا ہے تاہم ہم ایمانداری کے ساتھ اس واقعے سے انکار نہیں کر سکتے کہ یہ اسپرٹ ہمارے اپنے وطن میں خوفناک حد تک پھیلی ہوئی ہے۔ ہم اس امر پر بھی پردہ نہیں ڈال سکتے کہ ہمارا علم ادب بھی کم یا بیش اسی رجحان کو ظاہر کرتا ہے۔ ہم اس کو چاہے زوال پذیر زمانہ کا ایک ضمیمہ کہیں لیکن یہ حالت موجود ہے۔ جو شخص اسی علم ادب کو پڑھے گا اس میں جو زود ولد رجحان بھرا ہوا ہے اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ ہماری رزمیہ نظمیں اگرچہ انسانی کارناموں کی داستانیں ہیں لیکن ان میں بھی یہی اسپرٹ بھری ہوئی ہے۔

اب اس بات کا اقرار کیا جائے گا کہ موجودہ بیداری کا پیدا ہونا یعنی اس اسپرٹ کے خلاف صدائے احتجاج کا بلند ہونا غیر ملکی تعلیم کے باعث وقوع میں آیا ہے۔ چاہے وہ کیسے ہی دہریہ کیوں نہ ہو۔ اگر اس قسم کی تعلیم نہ ہوتی یہ بیداری بھی نہ ہوتی، بلکہ اصلیت تو یہ ہے کہ موجودہ بیداری میں بیحد تاخیر ہوئی ہوتی

میرے خیال میں ہندوستان کے لئے پہلی ضرورت اس بات کی ہے کہ یہ رجحان بالکل مٹا دیا جائے۔ یہی رجحان ہماری تمامتر قومی کمزوری کا اصلی باعث ہے۔ مذہب عیسوی میں بھی یہ رجحان موجود ہے اور عیسائی اقوام اگر سچے مذہب عیسوی پر قائم رہی ہوتیں تو انہوں نے مطلق ترقی نہ کی ہوتی۔ یہ عیسائی مذہب نہیں ہے کہ جس نے زندگی کے جدید سامان ترقی فراہم کر دیئے ہوں۔ یورپ میں مذہب عیسوی کے علاوہ بھی ترقی ہوئی ہے۔ پس ہم کو ایک یہ اہم کام درپیش ہے کہ ہم اس باب خاص میں اپنے ابنائے وطن کی عام روحانیت کو بدل دیں۔ اُس میں حقیقی زندگی کا لطف اور اس سے دلچسپی پیدا کریں۔ ہندوستان میں زندگی کے نسبت یہ عام خیال پھیلا ہوا ہے کہ وہ ہے تو بُری چیز لیکن اس کی ضرورت ہے۔ زندگی آلام اور مصائب کا مجموعہ اور ایسا سامانِ تخریب ہے کہ جس سے دور بھاگنا چاہیئے۔ ہمارے ابنائے وطن کے دلوں پر اس خیال کا ایسا گہرا نقش جما ہوا ہے کہ اس کو مٹانا چنداں آسان نہیں ہے۔ ہندوستان کے لئے اس بات کی ضرورت ہے کہ صدق دلی کے ساتھ عالمگیر اور مسلسل کوشش زندگی کی انجیل پڑھانے اور اسی کا وعظ کرنے کی شروع کی جائے۔ زندگی ایک حقیقی شے ہے۔ وہ بچی بیش بہا اور قیمتی ہے اس کی قدر کی جائے۔ برقرار رکھی جائے، طویل بنائی جائے۔ ہمارے ابنائے وطن کو یہ باتیں ایسی وضاحت کے ساتھ معلوم نہیں ہیں جیسی کہ ہونی چاہئیں۔ یہ بات نہیں ہے کہ اہلِ ہند کی نگاہوں میں زندگی کی قدر نہیں ہے۔ یہ بات نہیں ہے کہ وہ زندگی کا واجبی احترام نہ کرتے ہوں۔ بلکہ حقیقت حال یہ ہے کہ بعض اہلِ ہند تو زندگی کی اس درجہ فکر رکھتے ہیں کہ وہ انسانی زندگی کو قربان کر کے یا اس کا زیان گوارا کر کے ادنیٰ ہستیوں کو برقرار رکھتے ہیں۔ اہلِ ہند کی بہت بڑی جماعت صرف زندہ رہنے کو باعزت زندگی پر ترجیح دیتی ہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ سلف کے ہندوؤں کو یہ بخوبی معلوم تھا کہ انسان کی تدریجی ترقی میں قوم نے اپنی سرگرمی کس تعداد میں صرف کی تھی۔ یہ خیال ایسا گہرا جما ہوا ہے کہ ہر ایک ہندو دیہاتی آپ کو بتا دے گا کہ انسان کی حیثیت میں جنم لینا خوش نصیبی ہے۔ اس حد تک اس کا خیال بہت درست ہے۔ لیکن مشکل تو اُس وقت پیدا ہوتی ہے کہ جب وہ زندگی کے ماحصل پر غور کرنا شروع کرتا ہے۔ اس کے نسبت آئے دن اس کو یہ بتایا جاتا ہے کہ سب سے اعلیٰ حقیقت یہ ہے کہ خواہشات کو مار و حسیات کی زندگی سے دور بھاگو تاکہ دوسرا جنم لینے کی زحمت سے بچ جاؤ۔ اس تعلیم کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ زندگی سے نفرت کرتا ہے اس کی کچھ وقعت نہیں سمجھتا اور آخرکار یہ کوشش کرتا ہے کہ اگر ممکن ہو تو اس سے چھٹکارا ہو جائے۔

میں مانتا ہوں کہ یہ اصلی عقیدہ کی تخریب ہے اور قدیم مذہبی کتب میں ان باتوں کی کافی منظوری نہیں ملتی ہے۔ لیکن باین ہمہ یہی عقیدہ آجکل پھیلا ہوا ہے جس کو مقدس کتابوں کے الفاظ سے معقول حمایت اور جواز کی سند ملتی ہے۔ قومی نظام تعلیم کا پہلا مقصد اس عقیدہ کو مٹانا ہونا چاہیئے۔ یہ مقصد اس طور سے پورا نہیں ہو سکتا کہ وہ علم ادب موجودہ صورت میں مشتہر اور قائم رکھا جائے جس میں ماحصل زندگی کے لیے خیالات فاسد بھرے پڑے ہوں بالذات مجھے زبان سنسکرت اور اس زبان کے علم ادب سے بڑا انس ہے۔ لیکن میری رائے یہ ہے کہ اس کو تعلیم عامہ اور ترقی کا ذریعہ قرار دینے کی کوشش ضرور ناکامیاب ہوگی اور مستوجب ناکامیابی ہے۔ تواریخی تحقیقات کے لئے سنسکرت کا بیش بہا ہونا واضح ہے۔ اپنی دیسی زبانوں کی لغت کو مالامال کرنے کے لئے سنسکرت سے مدد لینا ناگزیر ہے۔ ادیب بننے کے لئے اس کا مطالعہ لا کلام ہے لیکن معمولی شہری کے لئے زندگی کی عملی اغراض کے واسطے اس کا استعمال متنازع فیہ سے بھی زیادہ ہے۔ اس باب خاص میں بمقابلہ سنسکرت عربی اور فارسی زبانیں زیادہ تر وقیع ہیں۔ دونوں زندہ زبانیں ہیں مسلمانوں کی کل آبادی اس وقت تک انہیں زبانوں میں بات چیت کرتی ہے۔ اگرچہ ان کا جدید رنگ قدیم رنگ سے بیشک جداگانہ ہے۔ ہندوستان میں سنسکرت کا وہی مرتبہ ہے، جو یورپ میں یونان اور لاطینی زبانوں کو حاصل ہے۔ فہمیدہ یورپ آخر الذکر کا مطالعہ ترک کر رہا ہے۔ سوا معدودے چند اشخاص کے جو ادبی سلسلہ زندگی بسر کرنے کے متمنی ہیں۔ ہندوستان کو بھی یہی کرنا ہوگا۔ اگر وہ یہ چاہتا ہے کہ اس کے بچے اپنا وقت اور سرگرمی عملی مسائل زندگی حاصل کرنے میں صرف کریں۔

ماضی کے حالات میں زندگی بسر کرنے کی کوشش نہ صرف بیسود بلکہ ایک حماقت بھی ہے۔ ہمکو مستقبل کی فکر کرنے کی ضرورت ہے۔ اگر ہندوستان مستقبل کو بھرپور، تندرست اور سرگرم زندگی گذارنی ہے۔ اگر یہ مدنظر ہے کہ اس کی ہستی اس کی اہمیت کے شایان ہو جو اس کو آبادی اور دیگر وسائل کے لحاظ سے حاصل ہے تو اس کو باقی ماندہ دنیا کے قریب تر جانا چاہیئے۔ اگر ہندوستان کو اقوام عالم کے گروہ میں اپنا واجبی مرتبہ حاصل کرنا ہے، تو اس کو اپنی دماغی، قلبی اور عام انسانی ممکنات کو ایسے موثر طریق سے کام میں لانا چاہیئے کہ جس سے زیادہ نفع پہنچے۔ سنسکرت بہمہ نوع ایک مکمل زبان ہے۔ بیش قیمت علم ادب کا بہت بڑا ذخیرہ اس کے پاس موجود ہے۔ لاطینی اور یونانی زبانیں بھی ایسی ہی تھیں۔ یہ سب آپس میں بہنیں ہیں جس طرح یورپ اور امریکہ اب یہ خیال کر رہی ہے کہ معمولی درجہ کے اس لڑکے کے واسطے جو اپنی زندگی علم ادب اور تواریخ کی

تحقیقات کے لئے وقف کرنا نہ چاہتا ہو لاطینی اور یونانی زبانوں کی جگہ دیگر جدید زبانیں سیکھنے میں زیادہ نفع ہے، وہی ہندوؤں کو بھی کرنا پڑے گا۔ روشن ضمیر ہندو اس کی حقیقت تسلیم کرتے رہے ہیں۔ اس کا ثبوت خود ان کے طرز عمل سے ملتا ہے۔ دیانند اینگلو ویدک کالج کے متعلق گذشتہ سولہ سال کے اندر مجھے جو تجربہ ہوا ہے اس کی بنا پر مجھے یہ کہنے کا حق ہے کہ جن لوگوں نے دیانند اینگلو ویدک کالج کی بنیاد ڈالی اور بعد ازاں جن لوگوں نے الفت اور گرمجوشی کے ساتھ اس کے قیام کے واسطے کوششیں کیں ان میں صرف معدودے چند ایسے اشخاص اس وقت بھی تھے اور اب بھی ہیں کہ جن کی یہ خواہش تھی کہ ان کے بچے سنسکرت کا وہی نصاب پڑھیں جو انہوں نے دوسروں کے واسطے تعین کیا تھا، ان میں ایسے اشخاص کی تعداد اور بھی زیادہ قلیل ہے کہ جن کی اولاد علم سنسکرت کو کسی معتد غرض کے لئے کام میں لائی ہو۔ زیادہ تر نے سنسکرت کا مطالعہ یکلخت بند کردیا ہے اور تحصیل علم سنسکرت میں وقت صرف کرنا سراسر زیان خیال کرتے ہیں ایسے پرہیزگار معلّی جو سنسکرت کا مطالعہ ہردلعزیز بنانے یا عقائد و رسوم کی مذہبی تعلیم جاری ہو۔ نہ کے واسطے بڑی بڑی رقوم وقف کرتے ہیں اُن میں بھی معدودے چند ہی ایسے اشخاص ہوتے ہیں جو اپنے لڑکوں اور رشتہ داروں کا بیشتر وقت مطالعہ سنسکرت یا مذہبی تعلیم میں صرف کراتے ہوں۔

بالذات میری نظر میں قدیم زمانہ کے آریوں کی عزت کسی سے کم نہیں ہے۔ مجھے ان کے کارہائے نمایاں پر اتنا ہی ناز ہے جتنا کہ کسی دوسرے کو ہو سکتا ہے۔ اُنہوں نے علم انسانی کو اس حد تک ترقی دی ہے کہ آج لوگوں کے لئے آگے قدم بڑھانا ممکن ہوا۔ مجھے ان کی دانشمندی، ان کی روحانیت، اُن کے اخلاق اور ان کے ادبی کمالات کا فخر ہے۔ لیکن ساتھ ہی اس واقعہ کی جانب سے اپنی آنکھیں بند نہیں کر سکتا کہ علمیت میں اب دنیا بہت آگے بڑھ گئی ہے اور علمیت اگر دانشمندی ہے تو ہمکو یہ بھی خیال کرلینا چاہئے کہ دنیا گذشتہ تین ہزار سال کے مقابلہ میں آج زیادہ دانشمند ہے۔

بڑھی ہوئی علمیت اور اس سے پیدا ہونیوالی دانشمندی فی الحال غیر ملکی زبانوں میں بکھا ہے۔ ہر سال، ہر ماہ، بلکہ سال میں ہر روز وہ آگے بڑھتی جاتی ہے۔ ترقی کی یہ حالت ہے کہ علم سائنس کی ایک کتاب ایک ہی سال کے اندر متروک ہو جاتی ہے اور توضیح و ترمیم کے بعد اس کا جدید ایڈیشن چھپوانا پڑتا ہے۔ جو شخص پیچھے رہنا نہیں چاہتا وہ ان علوم سائنس کی جانب سے غافل نہیں رہ سکتا، جو سالہا سال تک موثر طور سے کم از کم ان غیر ملکی زبانوں میں پڑھے جا سکتے ہیں۔

علاوہ بریں یہ امر فراموش نہ ہونا چاہیے کہ موجودہ زمانہ کے سائینٹفک ایجادوں نے جن میں بھاپ اور قوت برق کو بار برداری کے کام میں لانا بھی شامل ہے، فاصلہ اور بُعد کو مٹا دیا ہے۔ کوئی قوم چاہے اس کی خواہشات اور حوصلے کیسے ہی نادر کیوں نہ ہوں اپنے معیارِ قدرِ زندگی کے بارے میں چاہے وہ روحانیت کے رنگ میں کیسی ہی غرق کیوں نہ ہو علیحدگی کی زندگی بسر نہیں کرسکتی۔ اگرچہ اس کی ایسی خواہش کیوں نہ ہو تجارت اور سوداگری کی غرض سے دیگر اقوام کے ساتھ ربط و ضبط بڑھانا اب کسی کی ترقی پر منحصر نہیں ہے۔ اب ایسا ہونا لازمی ہوگیا ہے۔ اگر ہندوستان کی تجارت ہندوستانی اپنے ہاتھ میں رکھنا چاہتے ہیں نہ کہ غیر ملک والوں کے قبضہ میں اور ہندوستانی اگر اس سے نفع اٹھانا چاہتے ہیں تو یہ ضروری ہے کہ اولاً مدارس میں اور بعد ازاں ان کے باہر جتنی زبانیں سیکھ لینا ممکن ہو سیکھ لیں۔ قوم کا بہت بڑا حصہ صنعت و حرفت یا کاروبار میں مصروف ہونا چاہیے۔ ان تمام اغراض کے واسطے السنہ جدیدہ کا علم ہونے کی ضرورت ہے۔ ایسے حالات میں لڑکوں کو اس کے لئے مجبور کرنا کہ وہ جد و جہد زندگی میں داخل ہونے کی تیاری میں زمانہ طالبعلمی کا بہت بڑا حصہ سنسکرت کی سب سے پیچیدہ اور مشکل قدیم زبان کی تحصیل میں صرف کریں سرگرمی کا ایسا بے کار زیاں ہے کہ اس سے قوم کی عمدگی کو ضرور نقصان پہنچے گا۔ اگر ہم اس بیڈھنگی رفتار پر اپنی ضد قائم رکھیں گے۔ پس اب وہ وقت آگیا ہے کہ قوم یہ تصفیہ کرے کہ مانند دیگر لوازمات عیش سنسکرت کا مطالعہ معدودے چند کے واسطے ہے، نہ کہ بہت لوگوں کے واسطے۔ معدودے چند اشخاص بغرض علمی تحقیقات اور نیز دیسی زبانوں کی لغت کو مالا مال بنانے کے لئے اگر قوم کی مدد کریں اور سنسکرت پڑھیں تو کیا مضائقہ ہے۔ اس امر پر اصرار کیا جائے کہ بہت بڑی تعداد غیر ملکی جدید زبانیں سیکھے اور اس کے ساتھ ہی ہندوستان کی جدید زبانوں میں بھی کامل واقفیت حاصل کرے۔ میں اس مسئلہ پر پھر کبھی کچھ زیادہ تحریر کرنے کا ارادہ رکھتا ہوں۔ فی الحال میں یہ خیالات اس غرض سے ظاہر کر رہا ہوں کہ اس امر پر غور کرنے کے لئے زمین صاف ہو جائے کہ ہندوستان کے لئے قومی نظام تعلیم کا منشا اور مقصد کیا ہوگا۔

(مارچ ۱۹۲۰ء)

(۵)

قومی علم ادب کو چھوڑ کر، قومی تعلیم کے طریقوں کے جانب رجوع ہوتے یہ کہدینا چاہیے کہ قومی تعلیم کے طریقوں کو از سرِ نو جاری کرنا ایک حماقت ہوگی۔ وہ متروک اور پارینہ ہو چکے ہیں۔ اُن کو اختیار کرنا ایک قدم پیچھے ہٹنا ہے، نہ کہ ایک قدم آگے بڑھانا۔ موجودہ مدرسوں کے طریقے بیرحمانہ ہیں اور اس میں شبہ نہیں ہے کہ قدیم طریقے بعض امور کے لحاظ سے (یہ خیال ہے کہ صرف بعض امور کے لحاظ سے) بہت بہتر تھے۔ حکومت برطانیہ قائم ہونے پر جو طریقہ درمیل رائج تھا اس میں سلف کی بہترین خصوصیات باقی نہیں رہی تھیں۔ ہم کو یہ خیال کرکے بے انتہا مسرت ہوتی ہے کہ اس وقت جو طریقہ رائج تھا مغربی اسکولی نظام کے مقابلہ بیکار کر دیا گیا۔ آخر الذکر طریقے نے جو ناکارہ پن پیدا کر دیا ہے وہ اور زیادہ ناکارہ اور بدترین ہوتا اگر اوّل الذکر طریقہ کو سرکار سے منظور کرکے جاری کیا ہوتا۔

یہ مسئلہ ایسا وسیع اور پیچیدہ ہے کہ اس سے اس مضمون کے ضمن میں تفصیل کے ساتھ بحث کرنا ناممکن ہے۔ لیکن چند مزید خیالات ظاہر کئے بغیر اس مسئلہ کو ہر شخص پوری طور پر نہیں سمجھیگا۔ قدیم طریقہ جو گرو اور چیلے کے ذاتی تعلقات پر زور دیتا تھا بعض معنی میں اچھا اور بعض معنی میں ضرر رساں تھا۔ ذاتی تعلق وہ انسانی مختصر بہم پہنچاتا تھا، جو آج نظر نہیں آتا۔ ان عادات کے قائم کرنے میں جو بہ حیثیت مجموعی چال چلن کہلاتی ہیں زیادہ توجہ نہ ہونے کی ضمانت اس تعلق کے ذریعہ سے ہوتی تھی۔ بخلاف ازیں اس میں شاگردوں کے دل کو غلام بنانے کا رجحان پیدا ہوتا تھا۔ تعلیم کا یہ مقصد ہونا چاہیے کہ تعلیمیافتہ اس قابل ہو جائے کہ وہ سوسائٹی کے ساتھ اپنی ذمہ داری کو اچھی طور پر محسوس کرکے اپنے قول اور فعل کا اظہار کرے۔

کیا گوروکل کے طریقہ کو اس میں کامیابی ہوئی ہے؟ میری رائے ہے کہ اسے کامیابی نہیں ہو سکتی۔ برہمچاری کو جو حلف دیا جاتا تھا اور گورو جن الفاظ کے ساتھ آمین کہتا تھا اگر اس کی مناسب تشریح کی جائے تو ظاہر ہوگا کہ چیلہ کی ذات میں گرو کے اوصاف نمایاں کرنے کا نصب العین پیش نظر رہتا تھا۔ ہر ایک والدین اور ہر ایک استاد کا مقصد یہ ہونا چاہیے کہ اس کے بچے اور شاگرد اُن کی نقل کرنے کے بجائے بہت بڑے اور بہتر آدمی بن جائیں۔ اگر میرا یہ خیال غلط ہو تو مجھے نہایت خوشی ہوگی کہ اُسکی

صحت کردی جائے، جو ڈسپلن (ضابطہ) قرار دیا جاتا تھا نہایت ہی سخت بخود بخود کام کرنے والا اور نیم حکیمانہ تھا، جو قدر معیب سکھایا جاتا تھا نہایت باضابطہ، سخت اور اس کا دائرہ نہایت تنگ تھا۔ صرف نحو اور عبارت آرائی کے قواعد حفظ کرنے میں بےحد وقت صرف کیا جاتا تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ اُپنشدوں کے زمانہ میں اُستاد اور شاگرد کے تعلقات میں آزادی کی زیادہ جھلک تھی۔ مجموعہ ضوابط میں جس طریقہ کی تعین کی گئی ہے وہ آہنی اور آتشین طریقہ ہے۔ یہ ہندوستان کی مخصوص حالت نہ تھی۔ عربوں، یونانیوں اور لاطینیوں کے یہاں بھی اس قسم کے طریق رائج ہیں۔ اب بعد یہ واقعہ کسی طور سے ان کی عمدگی کا ثبوت نہیں ہو سکتا کہ ان کو باہوں کے باوجود ہندو، یونانی، رومی، عربی اور کیتھولک عیسوی آئین یورپ نے قرون متوسط میں فلسفی اور مصنفین کے تھے اسی سے صرف انسان کی یہ قلبی حالت قرار پائی ہے کہ وہ اپنے گرد وپیش کی حالتوں سے تجاوز کر کے اُن حدود سے باہر ہو جاتا ہے۔ جو کسی ذی اختیار شخص نے نہیں کی ہوں۔ چاہے وہ ذی اختیار شخص والدین ہوں، گرو ہو، یلیمو کلاد ہرد وار کے گرد کل نے ان میں سے بعض نقائص رفع کرنے کی کوشش کی ہے۔ لیکن مجھے اس بات کا اطمینان یقین نہیں ہے کہ اس درگاہ میں جس قسم کی علیحدگی پر اقرار کیا جاتا ہے، وہ قدیم زمانہ میں ایسی مکمل تھی جیسی کہ آجکل منائی جاتی ہے۔ گورو کل کا نام یہ بتاتا ہے کہ شاگرد اپنے گرد کے ساتھ اس طرح رہتا تھا کہ گویا گرد کے خاندان نے اس کو متبنیٰ کر لیا ہو۔ ہر طور سے وہ اسی خاندان کا بچہ تصور کیا جاتا تھا۔ ایسی حالت میں ہر ایک گرد شاگردوں کی محدود تعداد کو اپنی نگرانی میں لیتا ہو گا۔ اشرموں اور برتشدوں کی تعداد ضرور زیادہ ہو گی۔ جن میں گورو صاحبان کی ایک تعداد، بلکہ شاگردوں کی ایک تعداد کو تعلیم اور تربیت دیتی ہو گی۔

لیکن اس میں شبہ ہے کہ یہ اشرم اور پرتشد اپنے شاگردوں پر سوسائٹی سے قطع تعلق کر لینے کے لئے زور ڈالتے ہوں۔ بہرحال جب شاگرد بھکشا مانگنے جایا کرتے ہوں گے، اُن کو مستورات سے بات چیت کرنے کا ہر روز موقع ملتا ہو گا۔ مجھے اس بات میں بہت شبہ ہے کہ مجموعہ ضوابط میں جس طرز تعلیم کی سفارش کی گئی ہے کبھی کسی عام طور پر اُس کی پیروی کی گئی ہو۔ مجھے یہ خیال کرنے کی معقول وجہ معلوم ہوتی ہے کہ تدبیر خاص کر برہمنوں کے بچوں کے واسطے نکالی گئی تھی۔ چاہے جو کچھ ہو مجھے اس میں شبہ نہیں ہے کہ آج ہندوستان میں اس کو عام اسکیم تعلیم کے ایک جز کی حیثیت میں از سر نو رائج کرنا ناممکن ہے۔

مجھے اس بات کا اطمینان ہے کہ یہ طریقہ اسی قسم کے کیریکٹر کے لئے ضرر رساں ہے۔ جس کی نشو نما ہم چاہتے ہی نہیں، بلکہ حس کو اپنے لڑکوں اور لڑکیوں میں ہمیں ضرور پیدا کرنا چاہیے۔ اگر ہم آگے بڑھنے کے لئے باقی ماندہ دنیا کے ہم قدم ہونا چاہتے ہوں تو ہمارے لڑکوں اور لڑکیوں کی پرورش و تعلیم بند کمروں میں نہیں ہونی چاہیے۔ ان کی تعلیم اس سوسائٹی میں ہونا چاہیے جس کے وہ افراد ہوں۔ ان کو ایسی عادتیں ڈالنی چاہئیں اور ایسے وطیرے سیکھنے چاہئیں، جو ان کو ہر ایک ضرورت کا مقابلہ کرنے کے قابل بنا دیں۔ ان کو ترغیبات سے دور رہنا سیکھنا چاہیے نہ کہ ان سے نفرت کرنا۔ دنیا ترغیبات کا مسکن ہے دنیا اس لئے ہے کہ اس میں رہکر انسان اس کا لطف اٹھائے۔ لیکن اس وقت تک جبتک کے ایسا کرنے سے خود اس کو اور دیگر اشخاص کو نقصان نہ پہنچتا ہو۔ جس وقت تک کوئی شخص اس سوسائٹی کا وفادار فرد ہے جس میں قسمت نے اس کو پیدا کیا ہے اور جس کے ساتھ وہ سوشیل فرائض سے وابستہ ہے، تو وہ شخص حد اعتدال تک لطفِ زندگی حاصل کرنے میں کسی گناہ کا مرتکب نہیں ہوتا ہے۔

لڑکوں اور لڑکیوں کو اپنے سوشیل فرائض زمانۂ صغر سنی میں سیکھنے چاہئیں۔ ان کو اس سن میں سوسائٹی سے علیحدہ رکھنا ان کو اپنی زندگی میں ایک بہت بڑی اور بہترین موقع سے محروم رکھنا ہے۔ اسی قدیم خیال کو اب دنیا کے بہترین مصلحان تعلیم ترک کرتے جاتے ہیں کہ اسکول و کالج اور یونیورسیٹیاں ایسے مقامات پر ہونی چاہیں، جو شہر کی چہل پہل سے دور اور اس سے لازمی طور پر پیدا ہونے والی ترغیبات سے پاک ہوں۔ جدید خیال یہ ہے کہ لڑکے اور لڑکیاں ان حالاتِ زندگی سے گھری رہیں۔ جس میں ان کو نقل و حرکت کرنا ہے اور جن کا اُن کو اپنی زندگی میں آگے چل کر مقابلہ کرنا ہے۔ لڑکوں اور لڑکیوں کو تنہائی میں رکھنا، اصل زندگی کے حالات سے ان کو ناواقف رکھنا، زندگی کے سوشیل لطائف سے ان کو محروم رکھنا، جماعتی زندگی کے فوری مطالبات اور حاجات کا طریقہ نہ ہونے دینا، ان کو تعلیم کے نہایت بیش بہا مطالبات سے محروم رکھنا ہے۔ تعلیم کا مقصد یہ ہے کہ مرد اور عورت کشمکش زندگی میں داخل ہونے کے قابل بن جائیں۔ ان کو گوشہ نشین اور تارک دنیا بنانا نہیں چاہتے۔ آج جو لڑکے اور لڑکیاں ہیں کل وہی شہری کہلائیں گے۔ انہیں میں سے ہمارے مدبر، ناظم، قومی جنرل، موجدِ صنعت و حرفت، فلسفی، صاحب خیال اور معلم پیدا ہونے چاہئیں۔ زندگی کی علمی اغراض کے لئے، خیالات صاحبِ سوشیل زندگی کے مختلف پہلو سے کامل واقفیت پر مبنی ہونی چاہئیں۔ تمام زندگی سوشیل ہے۔ ہم اب یہ محسوس کرتے جاتے ہیں کہ دنیا کے بہترین خیال خیالات والے لوگ وہ ہوئے ہیں، جنہوں نے اپنے زمانہ کی سوشیل حالات کے زمانہ عروج میں تعلیم و تربیت پائی تھی اور جن کو ذاتی تجربہ اس بات کا تھا

کہ لوگ بالعموم کس طرح سے بسر کرتے اور ایک دوسرے پر کس طرح اچھا اور برا اثر ڈالتے ہیں۔

میری رائے میں یہ خیال پختہ نہیں ہے کہ لڑکے یا لڑکی کو تارک الدنیا بنایا جائے۔ لڑکوں اور لڑکیوں کو زندگی کے چہل پہل میں دخل ہونے اور معکوس اثرات زندگی کے مشاہدہ کا ہر ایک موقعہ دینا چاہیئے۔ جو لڑکے سب سے علیحدہ رکھے جاتے ہیں لڑکیاں پردہ میں رکھی جاتی ہیں وہ اچھے مرد اور عورت نہیں ہوتے۔ لہٰذا اوقات یہ کیفیت نظر آتی ہے کہ ان حالات میں رہنے والے لڑکے اور لڑکیاں خلوت سے باہر آنے سے پہلے ہی ترغیب میں پھنس جاتے ہیں۔ وہ تجربہ اور جرأت نہ ہونے کے باعث اپنی زندگیوں کو تباہ کر ڈالتے ہیں۔ میں جو کچھ کہہ رہا ہوں اس کا مجھے ذاتی تجربہ ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ جو لوگ معمولی اسکولوں اور کالجوں میں تعلیم پاتے ہیں وہ سب سے بہتر ثابت ہوتے ہیں۔ لیکن کم از کم اس قدر ضرور کہوں گا کہ اول ابتلا کرنیوالے ان حالات کے تدارک میں کوئی فوقیت نہیں دکھائی ہے جو ان کے ان سوشل حالات میں جھونک دیئے جانے سے پیدا ہوتی ہیں، جن سے کہ وہ سابق میں ناآشنا تھے۔ میرا تجربہ مجھے یہ بیان کرنے کا مستوجب قرار دیتا ہے کہ آخر الذکر اول الذکر کے مقابلہ میں چال چلن کی کوتاہیوں اور بداطواریوں میں حد سے زیادہ تجاوز کرتے ہیں۔ جدید حالات کو اپنے موافق بنانے کی کوتاہی ان میں موجود ہوتی ہے۔ میری خواہش ہے کہ جس قدر اصرار کے ساتھ مجھ سے ممکن ہو میں اپنے ابنائے وطن کے یہ ذہن نشین کروں کہ لڑکے اور لڑکیوں کو علیحدگی میں پرورش و پردہ کرنے کے دقیانوسی خیالات کو ترک کرنا نہایت پسندیدہ معلوم ہوتا ہے۔ لڑکوں اور لڑکیوں کے ساتھ اپنے ہمدم کا سا برتاؤ ہونا چاہیئے۔ نہ کہ ان کو آپ حقیر غلام اور اپنا محتاج یا دست نگر سمجھیں۔ ہم کو اُن پر کامل اعتماد کرنا چاہیئے اور اُن کے ساتھ کامل بے تکلفی پیدا کرنی چاہیئے۔ لڑکوں اور لڑکیوں سے علیحدہ نہیں رکھنا چاہیئے۔ ان کو باہم ملنے جلنے دینا چاہیئے۔ میری رائے ہے کہ بمقابلہ میل جول علیحدگی سے زیادہ نقصان پہنچتا ہے۔ میں جانتا ہوں کہ میں نازک مسئلہ پر قلم اٹھا رہا ہوں۔ صدہا سال کی پابندیوں سے جو تعصبات اور جذبات مجتمع ہو گئے ہیں وہ سب کے سب میرے بیان کے خلاف ہیں۔ لیکن مجوزہ حالات رفتہ رفتہ رونما ہوگی۔ ضرور رونما ہونی چاہیئے اور ہوگی۔ دیگر ممالک کے باشندوں کے تجربات سے فائدہ نہ اٹھانا اپنی سرگرمی کو ضائع کرنا ہوگا۔ اخلاق اور پاکیزگی کے بارے میں جو ہمارے نصب العین ہیں ان میں رد و بدل ہونا چاہیئے۔ ہمارے لڑکے اور لڑکیاں بے تکلفی آزادی اور باہمی اعتماد کے حالات میں پلنے چاہئیں۔

شکوک اور بے اعتباری سے ان کو دور رہنا چاہیئے۔ اس سے مکاری، بدکاری اور بیماری پیدا ہوتی ہے۔ ہندوستان کے آئندہ معلمین اور گرو صاحبان کو حکیمانہ لہجہ جب کے وہ اس وقت تک عادی ہو چکے ہیں بالائے طاق رکھ دینا سیکھنے کی ضرورت ہے۔ لڑکے اور لڑکیاں ان کے ہاتھ میں مٹی کے لوندے کے مانند ہیں کہ وہ جس سانچے میں چاہیں ان کو ڈھال لیں۔ اگر کبھی اس قسم کا خیال پایا جاتا تھا، تو وہ لچر خیال تھا۔ وہ بھی زندہ مخلوق ہیں۔ بچہ ([illegible]) اور گرد و پیش کے حالات کا ثمرہ تھا۔ ان کے دلوں میں بھی وہی جذبات، اُمنگیں اور خیالات عود کر آتے ہیں، جو ہمارے دلوں میں پیدا ہوتے ہیں۔ ان جذبات اور امنگوں کے واسطے دانشمندانہ رہنمائی کی ضرورت ہے۔ حکیمانہ برتاؤ سے ان کی مردانگی اور لوازت کو ضرر پہنچائے بغیر ان جذبات اور امنگوں کو راہ راست پر لایا نہیں جا سکتا۔ ہم ان کو حکم دیتے تھے کہ راستبازی کے وہ کام انجام دو جن کا وقعت اُن کے ذہن نشین نہیں ہوتی ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بے چون و چرا تعمیل حکم کی عادت پڑ جاتی ہے۔ میں تسلیم کرتا ہوں کہ ہم اپنے لڑکوں اور لڑکیوں کی تعلیم و تربیت سے حکومت کا عنصر بالکل خارج نہیں کر سکتے۔ ان کو بعض اوقات خود ان کے حالات سے بچانے کی ضرورت ہوتی ہے۔ لیکن حکومت آخری کارروائی ہونی چاہیئے، جو مجبوراً اور اُسی حالت میں اختیار کی جائے کہ جب کوئی بات بچے کی سمجھ اور ذہن میں نہ آئے اور سوا حکم اور کوئی چارہ کار نہ ہو۔ والدین اور اُستادوں کو بچے کی عزت کرنا اور اس کی عزت کا لحاظ سیکھنا چاہیئے۔ کوئی جاپانی کبھی کسی بچے کو مارتا پیٹتا نہیں ہے۔ لیکن پھر بھی جاپانی بچے معقولیت کا نمونہ ہیں۔ جاپانی اپنے بچوں کی عزت کا میلان برابر قائم رکھتے ہیں، وہ اپنے بچوں کو اپنا ہمسفر سمجھتے ہیں اور ان کو اسی لحاظ کے ساتھ خطاب کرتے ہیں۔ وہ کبھی بچوں پر اعتراض نہیں کرتے۔ جاپانی گھروں میں ڈنڈوں کی مار معدوم ہے۔ بچوں کے حق میں درشت الفاظ کا استعمال یا غصہ کا اظہار شاذ ہی ہوا کرتا ہے۔ جاپانیوں کا ضابطۂ زندگی بعض امور میں نہایت سخت ہے۔ وہ یہ چاہتا ہے کہ ہر ایک شہری سخت فرماں بردار اور سخت پابند ضابطہ ہے۔ جاپانی سپاہ نے اپنے اعلیٰ احساس فرض اور سخت پابندی ضابطہ کیواسطے نام پیدا کیا ہے۔ لیکن اس کا باعث زیادہ تر حُبِّ وطن اور اپنے بادشاہ کے ساتھ الفت ہونے کی قدیم روایات تھیں نہ یہ کہ زمانہ صغر سنی میں اُن پر حکومت اور ان کی تادیب ہونے کا نتیجہ ہو۔ خلاصہ یہ کہ جو طریقہ استاد یا والدین کی حکومت پر زور دیتا ہے، جس کا دار و مدار فطرت انسانی اور انسانی میلان

طبع کے جانب سے شکوک پر ہو، جو صغیر سنی اور جوانی کی جانب سے بے اعتبار ہو، جو بالاعلان اقتدار و ضابطہ کی پابندی اور دباؤ کا حامی ہو، جو نیم حکیمانہ طریقوں کا حامی ہو جس کو لڑکے اور لڑکی کے ادراک کی مطلق قدر نہ ہو۔ وہ ایک ایسا آئیڈیل طریقہ نہیں ہے کہ جس سے اپنی ذات پر بھروسہ کرنے والے اور روز ترقی ہونے کے لئے پیشقدمی کرنے والے مرد اور عورت پیدا ہو سکیں جن کی ہندوستان جدید کو ضرورت ہے۔ پس میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ سلف یا قرون متوسط کا تعلیمی نظام عام طور پر رائج کیا جانا میرے خیال میں نہیں آتا۔ ایسا کرنا ہم کو ایک صدی پیچھے ہٹا لے جائے گا اور مجھے یقین واثق ہے کہ ملک اس طرز تعلیم کو اختیار نہیں کرے گا۔ بیشک مسز بیسنٹ اس کی سفارش نہیں کرتی ہیں۔ لیکن میں جانتا ہوں کہ ہندوستان میں ایسے گروہ موجود ہیں، جو اس طرزِ تعلیم کے دلدادہ ہیں۔ بعض اوقات ان کے طریقہ کی بعض خصوصیات کی تھوڑی بہت تعریف ممتاز غیر ملک والوں اور مصلحانِ تعلیم کی زبان سے اس کو مست کر دیتی ہے۔ یہ ممکن ہے کہ کوئی طریقہ دلآویز ہو، لیکن وہ ساتھ ہی پختہ نہیں ہو سکتا۔ بطور آزمائش وہ نہایت دلچسپ ہو۔ اغراض حکومت کے لئے بہت اچھا ہو۔ لیکن باانیہمہ شہری کے نقطۂ خیال سے ضرر رساں ہوگا۔ اگرچہ وہ چند نمونے پیش کرنے کے لئے بہت اچھا ہو۔ لیکن کل قوم کے واسطے اس کا اجرا سوا ضرر رساں ہونے کے اور کیا ہو سکتا ہے۔ میں اپنے ابنائے وطن سے التجا کروں گا کہ ہمارے علم ادب اور ہمارے طریقوں کی جو تعریف بعض اوقات کوئی غیر ملک والا کرتا ہے اُس سے مسرور ہو کر اچھل نہ پڑیں۔ غیر ملک والوں میں سے بعض صرف بدیں وجہ تعریف کر دیتے ہیں کہ اُن کو اپنا طرز زندگی نہیں بھاتا۔

(اپریل ۱۹۲۰ء)

شبیر مارہروی

ہندومت

ہندوؤں کا مذہب کہئے یا برہمنوں کا، یہ ہندوستان کا نہایت قدیم مذہب ہے۔ ہندوستان کے قدیم ترین باشندوں کو ان کی وجہ سے یا تو ملک بدر ہونا پڑا، جو رہ گئے "شودر" بننے پر مجبور ہوئے۔

۶۰۰ ق۔م میں بودھ مذہب ہندومت کے کل پرزے ٹھیک کر کے خود ایک ہزار سال تک ہندوستان کا غالب مذہب بنا رہا۔ آج بھی نیپال، سیلون، چین، جاپان، سائبریا، لاپ لینڈ وغیرہ میں اسی کا دور دورہ ہے۔

رگ وید جو ۱۲۰۰ اور ۱۵۰۰ ق۔م کے درمیان تحریر کیا گیا ان کی سب سے پرانی مذہبی کتاب ہے۔ ویدوں کی تحریر سے سیکڑوں برس قبل تک اُن کے منتر سینہ بسینہ یاد کرائے جاتے تھے۔ اس لئے ان کی قدامت کا کوئی اندازہ لگانا تقریباً ناممکن ہے۔ البتہ اتنا وثوق کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ جب اگیمینن[1] شاہ پریم کی ماہ پیکر لڑکی قصندرا سے شادی رچا رہا تھا اُس وقت بھی برہمن سورج[2] دیوتا کی جانب منہ کئے گنگا جی کے ساحل پر یہ منتر پڑھتا نظر آتا ہے۔

"اے سورج دیوتا اور اے ہماری خواہشات کی روشنی ہم تیرے خیال میں مستغرق ہیں" —— (رگ وید)

علامہ ابو ریحان البیرونی نے اپنی کتاب "الہند" میں برہمنوں کے فرائض کی مکمل تصویر درج کی ہے۔ ہم اس موقع پر پہلے اس کا سطحی اور اجمالی خاکہ پیش کرنا چاہتے ہیں کہ ناظرین ان مذہبی سرگرمیوں کے اصل فرائض سے آگاہ ہو کر دیکھیں کہ موجودہ زمانہ میں یہ لوگ کہاں تک برہمن کہلائے جانے کے مستحق ہیں اور زمانہ کی رفتار نے ان کے روحانی وجود میں کیسا کچھ تغیر پیدا کر لیا۔

"برہمن کی زندگی کے چار دور ہیں۔ پہلا دور ۲۵ ویں سال تک رہتا ہے، جس میں تمام لذائذ کو ترک کرنا، زمین پر سونا، کسی گرو سے وید اور اس کی تفسیر کا علم حاصل کرنا، گرو کی سیوا کرنا"

۱۔ قدیم یونانی افسانوں کے قدیم ترین نام جن کا وجود زمانہ تاریخ سے مدتوں قبل بتایا جاتا ہے۔

۲۔ سورج برہمنوں کا قبلہ ہے۔ پرستش کے وقت اس کا منہ ہمیشہ اسی کی جانب ہوگا۔

دن میں تین بار غسل کرنا، صبح و شام پُوجَن (پوجا) کرنا، ایک دن برت رکھ کر دوسرے روز برت کھولنا، ایک دن میں صرف پانچ گھروں سے اپنی اور اپنے گرو کی بسر اوقات کے لئے خیرات لینا وغیرہ اس کے ضروری فرائض ہیں۔"

"دوسرے دَور میں (۲۵ اور ۵۰ کے درمیان) وہ بہ اجازت گرو کسی ایسی لڑکی سے شادی کرتا ہے، جو ۱۲ سال سے زیادہ عمر کی نہ ہو۔ مہینے میں اپنی بیوی سے ایکبار سے زیادہ ہم صحبت نہیں ہو سکتا۔ وہ اپنی بسر اوقات کے لئے درس و تدریس یا پروہتی کے فرائض انجام دیتا ہے۔ اس کے صلہ میں وہ بطور معاوضہ کچھ لینے کا مستحق نہیں بلکہ بخوشی بطور نذرانہ اُسے جو کچھ مل جائے اُس کا جائز حق ہے۔ وہ کاشت اور کسی ویش کے ذریعہ سے تجارت بھی کر سکتا ہے۔"

"تیسرے دَور میں (۵۰ اور ۷۵ سال کے درمیان) وہ دنیوی لذائذ دوبارہ ترک کر کے صحرا نورد ہو جاتا ہے۔ بیوی اس کے ساتھ جائے تو جائے ورنہ اسے اولاد کے سپرد کر دیتا ہے۔ خود ترکاریوں اور جنگل کی جڑی بوٹیوں پر بسر کرتا ہے۔"

"چوتھے دَور میں وہ گیان دھیان میں مصروف رہکر دوستی و دشمنی کے خیالات دل سے نکال دیتا اور عام طور پر آوارہ گرد رہتا ہے۔"

"اس کے علاوہ برہمن کے عام فرائض یہ ہیں کہ اس کی زندگی نیک کاموں کے لئے وقف [illegible] مندوں کو خیرات دے۔ اُس کے پانی پینے کا برتن سب سے علیحدہ ہو۔ وہ شرقاً و غرباً سمندر کے درمیان رہنے پر مجبور ہے کہ سود[1] لینا برہمن کے لئے قطعاً حرام ہے۔"

یہ تو اُن کے اصلی اور سچے مذہبی سرگروہ (برہمن) کی مذہبی تصویر ہے۔ لیکن ان کے تمدن و معاشرت کا کچھ اور حال معلوم کرنا ہو تو ویدوں کا مطالعہ ناگزیر ہے۔ ویدوں کے منتروں میں پہلے ملک کی حالت کا ایک علمی خاکہ دیا گیا ہے۔ مثلاً: دریاؤں کا برفستانی ہمالیہ سے جاری ہونا، شیروں کا جنگلوں میں دکارنا، بھیڑوں بکریوں کا میدان میں ممیانا، کوئل کا باغوں میں کوکنا، موروں کا درختوں پر بولنا وغیرہ۔ وید بتاتے ہیں کہ اس زمانہ کی آبادی

---

[1] سود لینا صرف برہمنوں ہی کے لئے نہیں بلکہ چھتریوں اور ویشوں کے لئے بھی گناہ کبیرہ ہے۔ صرف شودر سود لے سکتے ہیں لیکن وہ بھی دو فیصدی سے زائد نہیں۔

کے چاروں جانب فصیلیں ہیں جس میں ماہر ہر فن کے لوگ موجود ہیں سُنار، کمہار، بڑھئی اپنے اپنے دروازوں پر دکان لگائے ہوئے ہیں، چھتری ملک و ملت کی حفاظت کے لئے اپنی تلواروں کی دھار درست کر رہے ہیں، ویش تجارت میں منہمک، شودر خدمت گزاری میں معروف، برہمن پوجا پارٹ میں مشغول ہیں اور عوام اپنے دروازوں یا چوکوں میں بیٹھے سادہ خوراکیں، یا نشہ آور "سوم"[1] کھا پی رہے ہیں۔

راجہ اپنی رعایا کے حالات معلوم کرنے یا تفریح کے لئے نکلتا ہے تو ایک طلائی گھوڑے کے رتھ پر سوار ہوتا ہے جسے اعلیٰ قسم کے دو سفید بیل کھینچتے ہیں۔ راجہ کے گرد برہمنوں کا گروہ ہوتا ہے جن کا سردار سونے کے ہودار میں بیٹھا کچھ ناقابل فہم الفاظ[2] پڑھتا جاتا ہے۔ گنگا کے کنارے جہاں علی الصباح مرد عورت لڑکے لڑکیاں گناہوں سے پاک ہونے کے لئے مقدس پانی میں غسل کرتے ہیں یا کہیں کہیں ہندو مردوں کی نعشیں نظر آتی ہیں۔ گرد اپنے چیلوں کے جھرمٹ میں بیٹھا انہیں مذہبی اور دنیوی تعلیم دے رہا ہے۔

برہمن چونکہ محصولات اور خدمات سرکاری سے مستثنیٰ تھے اس لئے صرف پوجا پاٹ یا وعظ و پند ان کا کام تھا۔ ان کے متعدد دیوتا ہیں لیکن یہ تمام دیوتا رب الارباب پرمیشور کے ماتحت ہیں۔ منکرین پرمیشور ان کے نزدیک لعین و ملعون ہیں۔ ان مقدس مذہبی سرگروہوں پر نفسانیت نے رفتہ رفتہ غلبہ کیا یہاں تک کہ وہ وعظ و پند چھوڑ کر صرف کمزوروں کی توہین و تذلیل میں معروف ہو گئے۔ بھکشا (بھیک) جو صرف بسر اوقات کے لئے لی جا سکتی تھی، یہ نذرانہ جو خوشی سے مل سکتا تھا اپنا جائز حق سمجھ کر بجبر وصول کیا جانے لگا اور برہمن کا سوال رد کرنا ایک ناقابل تلافی جرم ہو گیا۔

تخلیق عالم کے متعلق وید کی تعلیم ہے کہ ایک تصور مطلق نے دنیا کو اس تاریکی سے نکالا جس میں اس کا خیالی ہیولیٰ چکر کاٹ رہا تھا۔ "برس" جو خالق مطلق ہے، وہ خود اپنی قربانی کر کے دنیا کو عالم وجود میں لایا اور اگنی یعنی روشنی کا دیوتا انسان کے لئے باعث آرام بنا۔

مسلمانوں میں بچہ بچہ طوفان نوح کے حالات سے واقف ہے۔ بالکل اسی سے ملتا جلتا ایک واقعہ ان کے یہاں بھی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ان کے اوتار "مانو" یا "منوجی" نے مع سات آدمیوں کے چند جانوروں اور مختلف اناجوں کے تخم کے ایک بڑے زبردست طوفان سے بھاگ کر پناہ لی تھی اور منتظر رہے

---

[1] یہ ایک قسم کا نشہ آور عرق تھا۔ [2] ناقابل فہم اس لئے کہ زبان سنسکرت سیکھنے کی عوام کو اجازت نہ تھی۔ حتیٰ کہ آج بھی غیر ہندو کو اس کے سیکھنے میں متعدد مشکلات کا مقابلہ کرنا ہوتا ہے۔

کہ طوفان کم ہو تو دنیا کو ان چیزوں سے پھر مالا مال کر دیں۔

وید کہتے ہیں کہ آگن (آگ) میں حرارت، انلد (پانی) میں روانی اور واتا (ہوا) میں جنبش بغیر برہم کی مدد کے ناممکن ہے، جو ان تینوں میں سے کسی ایک نہ ایک میں ہمیشہ موجود رہتا ہے۔

خدا یا پرمیشور کا وجود اور اس کی معبودیت ان کے یہاں مسلّم ہے۔ چنانچہ ویدوں میں لکھا ہے:

"وہ کون ہے جسے بھینٹ دی جاتی ہے؟"

"وہ جو آسمان کو روشن کرتا ہے۔"

"وہ جس نے زمین کو مضبوطی عطا کی"

"وہ جو ہوا کی وسعت سے واقف ہے"

"وہی پرمیشور ہے اور ہم اسی کو بھینٹ دیتے ہیں"

"وہ کون ہے جسے بھینٹ دینی چاہیے؟"

"اُسے جو بڑا ز آب بادلوں کے اُوپر بھی دیکھ سکتا ہے"

"اُسے جو روشن زمین کی زندگی ہے"

"اُسے جو قربان گاہ کی آگ روشن کرنے کی طاقت رکھتا ہے"

"وہی پرمیشور ہے جس کی ہم پرستش کرتے ہیں"

پاتنجلی کا شاستر خدا کے متعلق بتاتا ہے کہ "وہ، وہ ہے جو ازلی و ابدی اور عدیم المثال ہونے کے لحاظ سے انسان کے کسی فعل یا عمل کا محتاج نہیں جس کے صلہ میں اس کی طرف سے خوشی یا سکھ کا انعام ملے .... وہ رفعت مطلق ہے .... وہ خیر محض ہے .... وہ علیم ہے، لیکن فراموشی اور عدم معرفت کی آلائشوں سے مبرّا .... وہ علیم بھی ہے اور کلیم بھی .... اس کا علم ازل سے ایک چلا آتا ہے اور ابد الآباد تک ایک ہی رہے گا"

خدا کے متعلق گیتا کا بھی ایک اقتباس ملاحظہ کیجیے۔ واسدیو اور ارجن میں مکالمہ ہو رہا ہے جس کے ذیل میں معبود برحق کی تصویر ان الفاظ میں کھینچی گئی ہے:

"میں کائنات ہوں مانند ولادت نے میری ابتدا کی، نہ موت میری انتہا کرے گی۔ میں اپنے

افعال کے صلہ کا خواستگار نہیں۔ میں ایک کو دوسرے پر ترجیح نہیں دیتا ...... میں نے جملہ مخلوق کو حسب ضرورت ہر چیز دے رکھی ہے۔ جو میرے متعلق یقین رکھتا اور اپنی خواہشات کو افعال سے الگ کر کے مجھ جیسا بننے کی کوشش کرتا ہے، اس کی بیڑیاں کٹ جاتی ہیں اور وہ نجات آزادی حاصل کر لیتا ہے۔"

اسی ضمن میں دوسری جگہ کرشن اور ارجن کے مکالمہ میں خدا کی تصویر ان الفاظ میں پیش کی جاتی ہے:

"میں ہی معبود ہوں اور میں ہی بھینٹ، میں ہی آگ ہوں، میں ہی تمام عالم کا ماں باپ اور میں ہی تمام مخلوق کو آرام دینے والا۔ میں ہی سب کی پناہ ہوں، سب کا دوست ہوں، میں خفیہ مقامات پر خاموش محض اور عقل کی جگہ عقل مطلق ہوں۔"

لیکن اسی کے ساتھ ساتھ وید یہ تعلیم بھی دیتا ہے کہ:

"جو پختہ اعتقاد سے دوسرے دیوتاؤں کو پوجتے ہیں، وہ گویا میری ہی پرستش کرتے ہیں۔"

ہندوؤں میں آگ کی بے انتہا عظمت ہے۔ وہ اُسے پھولوں کی بھینٹ دیتے ہیں، لیکن خود اس کے ماننے والوں میں بھی ہزاروں کیا لاکھوں ایسے ہوں گے جن کے دلوں میں یہ سوال پیدا ہوتا ہو کہ آگ کو جو دم زدن میں جلا کر خاک سیاہ کر دیتی ہے اتنی وقعت اور عظمت کیوں دی گئی؟ اس کا جواب دیا جاتا ہے کہ آگ بے شک جلانے اور تباہ کرنے والی چیز ہے۔ لیکن وہ ہر چیز کو جلا کر اس کی اصلیت پہلے آتی اور ہر آلائش سے پاک کر دیتی ہے۔ خدا کی کامل سچائی اور تقدس کے مقابلہ میں انسان خطا و نسیان کا پُتلا ہے۔ لہٰذا اُس کے حضور میں پہنچنے کے لئے تمام آلائشوں سے پاک ہونا ضروری ہے اور یہ کام صرف اگن دیوتا ہی پورا کر سکتا ہے۔ اس مہیب دیوتا کے متعلق وید کا یہ منتر ملاحظہ کیجئے:

"اے اگن دیوتا! کیا ہمارے گناہوں کا کچھ کفارہ ہو سکتا ہے؟"

"ہمیں خاک کے مکان میں جانے سے باز رکھ"

"رحم کر اے طاقت مطلق ہم پر رحم کر!!!"

"اگر ہمارے جسم میں کچھ بھی ارتعاش پیدا ہو"

"جیسے ہوا کے اتصال سے بادل میں ہوتا ہے تو"

"رحم کر اے طاقت مطلق ہم پر رحم کر!!!"

"پرمیشور رحمت مطلق ہے !! اپنی کم طاقتی کی وجہ سے"

"اگر ہم غلط ساحل پر پہنچ گئے ہیں تو"

"رحم کر اے طاقت مطلق ہم پر رحم کر !!!"

"اگر ہم کسی گناہ کے مرتکب ہوں"

"تو بیکنٹھ (جنت) میں جانے سے قبل"

"رحم کر اے طاقت مطلق ہم پر رحم کر !!!"

"پجاری پیاسا ہے"

"حالانکہ وہ پانی بیچ کھڑا ہے"

"رحم کر اے طاقت مطلق ہم پر رحم کر !!!"

وید ہمیں ایسی دنیا کا وجود بھی بتاتے ہیں، جہاں ہمیشہ امن و مسرت کا دور دورہ رہتا ہے اور اس کے بعد ظاہر کرتے ہیں کہ: "برہم کی غیر فانی دنیا اُن کے حصہ میں آئیگی، جو گناہوں سے پاک ہیں"

انسان کی زندگی کے متعلق اس کی روح کا فلسفہ اس طرح حل کیا جاتا ہے:

"روح انسان کے جسم کا ضروری عنصر ہے۔ شہد کے چھتہ سے جب مکھیوں کی شاہزادی باہر نکل آتی ہے، تو باقی مکھیاں بھی اُس چھتہ کو چھوڑ دیتی ہیں۔ اسی طرح انسان کے تمام حیات روح کے ساتھ ہی باہر نکلنے پر مجبور ہوتے ہیں جس طرح پرند اپنے نشیمن کی جانب جاتے ہیں اسی طرح روحیں اپنے سے بہتر جسم میں چلی جاتی ہیں"

اس موقع پر مجھے امریکہ کے ایک شاعر کا یہ مقولہ بے اختیار یاد آگیا "موت کوئی چیز نہیں بلکہ یہ نام ہے نقل و تبادلہ کا" موت، تقریباً تمام مذاہب میں مصائب کا خاتمہ کرنیوالی سمجھی گئی ہے، چنانچہ لکھا ہے:

"یم (موت) انسانی دماغ کے لئے غیر فانی اور ایک حالت پر قائم رہنے والی دنیا کا دروازہ کھول دیتی ہے۔ وہیں دائمی مسرت اور اطمینان حاصل ہو سکتا ہے"

روح کے متعلق ایک اور جگہ بیان کیا گیا ہے:

"انسان کے جسم کی بادشاہ صرف روح ہے اور وہ بھی فانی"

"روح اسی دنیا میں ہم سے علیحدہ کر لی جاتی ہے، تاہم وہ برہم کی محکوم رہتی ہے"

"جسم سے نکلتے وقت اُسے مادہ اپنے ساتھ رکھنے پر مجبور کرتا ہے، لیکن روح اپنی آزادی کے لئے مادہ سے جھگڑتی ہے۔"

"روح کا جھگڑا اُسے رفعت کی جانب لیجاتا ہے، یا پستی کی طرف"

اسی آخری فقرہ سے آواگون کا مسئلہ وجود میں آیا ہے، جس کا مطلب ہے کہ مرنے کے بعد انسان کی روح کسی دوسرے انسان یا جانور کے قالب میں جنم لیتی ہے۔ بدترین گنہگاروں کے لئے مختلف نرکھ (دوزخ) ہیں۔ اور بہترین نیکوں کی روحیں برہم سے متصل ہو جاتی ہیں۔ عوام کو اُن کے افعال کے مطابق نئے قالب چھیلنے پڑتے ہیں۔ یہ سلسلہ اس وقت تک جاری رہتا ہے جب تک وہ نیکی مجسم نہ بن جائیں۔

پہلے زمانہ میں ہندوؤں کی تعلیم عموماً پاٹھ شالاؤں، مندروں، یا میدانوں وغیرہ میں ہوتی تھی اُسی زمانہ کے نقطۂ نظر سے ہم دیکھتے ہیں کہ دریا کے کنارے ٹھنڈی ہوا یا چاندنی راتوں میں گرو چیلے ایک ساتھ بھجن کر رہے ہیں۔ ذیل کا بھجن ایسے ہی موقع پر گایا جاتا تھا:

"ناحق سے ہمیں حق کی جانب لے چل"
"تاریکی سے ہمیں روشنی کی جانب لے چل"
"موت ہمیں دے کہ غیر فانی ہو جائیں"

برہمن کی تقریر بہت طویل نہیں ہوتی تھی۔ البتہ اس کا طرز تقریر بقراط کی اُن تقریروں کے مشابہ ہوتا تھا جو وہ اکثر پرائیوٹ جلسوں میں کیا کرتا تھا۔ بعض اوقات گرو ایسی دنیا کا ذکر کرتا ہے، جہاں ہمیشہ امن و مسرت کا دور دورہ ہو۔

"برہم کی غیر فانی دنیا اُن کے حصہ میں آئے گی، جو گناہوں سے پاک ہیں"

اوقات فرصت میں گرو اور چیلے مراقبہ کرتے اور اس سے فارغ ہونے پر یہ مقدس منتر پڑھتے ہیں:

"بالعموم انسان مذہب کی جانب رجوع کرتا ہے"
"اپنے نفس پر غالب رہنے والا عزت حاصل کرتا ہے"
"خاموش طبائع ہمیشہ اعزاز کی مستحق ہوتے ہیں"
"اے برہم میں تجھ سے اپنی روح کی دائمی خوشی چاہتا ہوں"

اس کے بعد چیلا گرو کی پالاگن کرتا اور یہ کہہ کر "آپ ہمارے پتا ہیں" رخصت ہو جاتا ہے۔

مسلمانوں میں بھی استاد کو اس قدر وقعت دی ہے کہ اُسے باپ سے بھی بڑھا دیا ہے۔ لیکن کیا حیرت کا مقام نہیں کہ جہاں تہذیب و تمدن پایۂ کمال پر پہنچے ہوئے ہیں، وہاں اُستاد کی کوئی قدر و قیمت نہیں۔ بلکہ طالب علم کو یہ تہذیب سکھائی جاتی ہے کہ اگر رخصت میں کچھ دیر ہو تو صاف صاف کہہ دیا جائے "بس اب معاف رکھئے اور ہمیں جانے دیجئے۔"

ہم نے اوپر جو کچھ بیان کیا یہ ہندوؤں کے مذہب اور ہندوؤں کے مذہبی سرگروہوں (برہمن) کا نہایت اجمالی خاکہ ہے۔ تاہم اس سے ان کے معتقدات اور ان کی قدیم روحانیت پر بہت کچھ روشنی پڑ سکتی ہے۔ اب صرف اتنا باقی رہ گیا ہے کہ برہمنوں نے ہندوستان کی تاریخ میں بڑا زبردست حصہ لیا ہے۔ پہلے وہ روحانیت و مذہبیت کے سچے پیکر تھے۔ لیکن جیسے جیسے انہیں عروج ہوتا گیا، نفسانیت بھی اپنا غلبہ کرتی رہی۔ حتیٰ کہ عوام محبت کرنے کے بجائے اُن سے خوف کھانے لگے۔ ہر ادنیٰ سرمایہ دار بھی ان کے دست تظلم کا شکار بننے لگا۔ یہی حالت تھی کہ حضرت مسیحؑ سے چھ سو سال پیشتر خدا کا ایک اور نیک بندہ (بودھ) دنیا کا سبق حاصل کرنے نکلا — وہ کون تھا — اس نے کیا دیکھا — اور کیا کیا یہ انشاء اللہ ہم کسی آئندہ اشاعت میں بتائیں گے۔

([illegible])

شبیر مارہروی

بودھ مت

زمین و آسمان نے ہزاروں پلٹے کھا کر ہندوستانی مذہب کی کایا پلٹ دی تھی۔ روحانیت و مذہبیت کے شفاف چشمے خشک ہو گئے تھے اور رہنمایان دینی کی نفسانیت و خود پرستی نے عوام کی بے اطمینانیوں میں غیر محدود اضافہ کر دیا تھا کہ غیرتِ حق کو جنبش ہوئی اور اسی قومیت ہند کا ایک فرد مذہب کا ایک دوسرا جھنڈا لے کر نکلا۔ جس نے نفس پرست و حریص طبقۂ رہبران مذہب میں ایک ہلچل سی ڈال دی اور آخر اسی کی مسلسل اور انتھک کوششوں نے اپنے لئے کامیابی کا راستہ بھی حاصل کر لیا۔

تقریباً ۶۲۰ ق۔م میں نیپال کے ایک شہر کپل وست میں "مایا" نام کی ایک راج کماری اپنے حسن و جمال کے باعث مشہور آفاق تھی۔ صرف یہی نہیں کہ وہ اپنے ناز و انداز اور تیر نگاہ سے دلوں کو برمانے کی اہلیت رکھتی ہو، بلکہ حسن بے تمثال کے ساتھ خدا نے اس میں کچھ ایسی صفات حسنہ بھی ودیعت فرمائی تھی کہ جن کے ہوتے ہوئے عورت یقینی طور پر ایک نایاب دولت کہلائی جانے کی مستحق ہے۔ عصمت و عفت، محبت و اخلاق، وفاداری و پارسائی کی یہ مجسمہ انہیں اطراف کے ایک راجہ "سوپر بودھ" کی بیٹی اور نیپال کے مشہور راجہ کھدودن کی چہیتی بیوی تھی اور کھدودن جنگجو و بہادر کیکئی خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔

"مایا" کو خدا نے ایک حسین بیٹا عطا فرمایا لیکن حیف کہ وہ اس کی بہاریں دیکھنے سے محروم رہی۔ ابھی اس بچہ کو پیدا ہوئے ایک ہفتہ بھی نہ ہوا تھا کہ ظالم موت نے اسے ہمیشہ کے لئے ماں کی آغوش محبت و شفقت سے چھین لیا۔ یہی وہ راج کمار تھا جو آج "سدھارتھ گوتم بدھ" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ جب تبلیغ مذہب کی خاطر اس نے بادیہ پیمائی اور آوارہ گردی پر کمر باندھی تو لوگ اسے کیکئی منی بھی کہنے لگے تھے۔

کپل وست کے شاہی محلات کی شان و شوکت، لومبنی کے عیش باغات، بے شمار جاہ و حشم اور انواع و اقسام کے سامان تعیشات نے سدھارتھ کو آرام طلب و بے فکر بنانے کی بجائے اس کے تخیلات میں ایک غیر محدود ارتعاش و اضطراب انگیز کیفیت پیدا کر دی۔ وہ ایک مقید پرند کے موافق شاہی محلات کے قفس میں محبوس تھا۔ لیکن چونکہ نبوت کا تعلق مادر اندیشی کا مہد طفلی سے ہی آغاز ہو جاتا ہے ہم دنیوی

بندشیں اسے عشقِ حقیقی سے باز نہ رکھ سکیں۔

نہ چھوڑی حضرت یوسف نے وال بھی خانہ آرائی ‏ ‏ سفیدی کا دیدۂ یعقوب کی پھرتی ہے زنداں میں

وہ اس حالت میں بھی کسی غیر معلوم شئے کا متلاشی رہا جسے وہ جنگلوں میں ڈھونڈھتا۔ اپنے باغوں میں تلاش کرتا، اپنے محلات کی چار دیواریوں میں دیکھنے کی کوشش کرتا لیکن اسے تو یہ خبر نہ تھی کہ وہ کس شے کا متلاشی ہے۔

سن بلوغ پر پہونچتے ہی وزرا و امراء سلطنت نے مجبور کیا کہ وہ اپنی شادی رچائے وہ آمادہ ہوا لیکن اس شرط پر کہ جس نازنین کو اس کی زندگی کا شریک بنایا جائے وہ بیہودہ گو اور بے عصمت نہ ہو۔ اس نے کہا "مجھے اس کی پرواہ نہیں کہ کس خاندان یا قوم سے تعلق رکھتی ہے۔ میں صرف اتنا چاہتا ہوں کہ اس کے عادات و اطوار پسندیدہ ہوں"۔ اسی کے ساتھ اس نے جن صفات فردی کا حوالہ دیا اُن سب کا ایک فرد واحد میں ایک ساتھ پایا جانا تقریباً ناممکن سمجھا جانے لگا۔ ہزاروں حسین و نازک اندام دلربائیں، جو محض اس امید پر کپل وستو میں جمع ہوئی تھیں کہ شائد راج کمار اُن میں سے کسی کے حسن جہانسوز سے متاثر ہو کر اسے اپنا شریک زندگی بنائے ناشاد و نامراد واپس چلی گئیں۔ آخر بڑی سعی بسیار اُس کی نظر پڑی تو اپنی ہی قوم کی ایک مجسمہ شعر و نزاکت پر جس کا نام "گوپا" تھا۔ اس کے باپ ونداپنی نے اس کے پیغام کا نہایت سخت جواب دیا اس نے کہا "ایک کاہل اور ہمہ وقت تخیلات میں مست رہنے والا نوجوان راج کمار ایسی لڑکی کا شوہر نہیں ہو سکتا، جس کے آباؤ اجداد کی عمریں سپہ گری میں گذری ہیں۔ اگر اُسے شادی کی تمنا ہے، تو پہلے صرف اپنے علم کا ہی نہیں، بلکہ طاقت و جرأت کا بھی امتحان دینا چاہیئے"۔

راجکمار اس پر آمادہ ہو گیا اور اس نے ایک دربار عام میں نہ صرف اپنی علمی قابلیت کا ثبوت دیا بلکہ فنون سپہ گری وغیرہ میں بڑے بڑے جنگ آزماؤں کو مغلوب کر لیا۔ آخر شادی ہوئی لیکن شادی ہوتے ہی گوپا نے اپنے یہاں کے رسم و رواج کا ڈھانچہ توڑ کر رکھ دیا۔ اُس نے گھونگھٹ وغیرہ کو بالکل خیرباد کہہ کر اعلان کیا کہ :

"عورتیں اپنے تخیلات و جذبات کی آقا ہیں وہ اپنے خاوندوں ہی پر قانع رہ سکتی ہیں اور کسی دوسرے مرد کا خیال بھی ان کے دل میں نہیں آسکتا۔ پھر آفتاب و ماہتاب کی طرح باہر کیوں نہ نکلا جائے۔ تمام رشی، دیوتا اور خود پرمیشور میرے، خالق زندگی، میری عصمت وعفت اور میرے دل کی حقیقت سے بخوبی واقف ہیں۔ پھر میں اپنا چہرہ کیوں چھپاتی پھروں؟"

فی زمانہ متمدن ممالک کے بادشاہوں اور ذی عزت سرداران مملکت کو ہم دیکھتے ہیں کہ جب ان کی سواری کسی گذرگاہ عام پر نکلتی ہے، تو رنج و غم اور موت و ماتم وغیرہ کے تمام آثار ڈھادینے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اسی طرح کھدودن بھی چاہتا تھا کہ سدھارتھ بدھ کے سامنے کوئی ایسی چیز نہ آنے پائے جس سے اس کے تاثیرات قلبی کی آگ کچھ اور زیادہ بھڑک اٹھے۔ لیکن یہ بھاری بھاری نقاب اُس کے دریائے بیتابی میں کوئی سکون و جمود پیدا نہ کرسکے۔ پائے شوق کو آہنی طوق و سلاسل بھی مجبور و معذور نہیں کرسکتے۔ پھر سدھارتھ بدھ آرام و آسایش میں پھنس کر نچلا کیوں کر بیٹھ سکتا تھا۔ وہ اپنے گاڑی بان کو ہمراہ لے کر اکثر باہر جاتا اور مختلف مواقع پر مختلف حیثیت کے لوگوں کا مشاہدہ کرتا۔ کبھی کسی بڈھے کو دیکھتا۔ کبھی ایک غریب گداگر کو۔ کبھی جنازوں پر نگاہ پڑتی۔ کبھی بیماروں پر۔ غرضیکہ زمانہ کی ستائی ہوئی مخلوق خدا کو دیکھ دیکھ کر اس کا دل بھر آیا اس نے سوچا کہ جس زندگی میں اتنے نشیب و فراز موجود ہوں اس میں اطمینان کیونکر نصیب ہو سکتا ہے۔ آخر ایک دن ایک گوشہ نشیں تارک الدنیا فقیر کے پُرجلال و مطمئن چہرہ کے نظارہ نے اس کی زندگی کو یکلخت ایک دوسرا پلٹا دیا۔ شب کی تاریک خاموشی میں اس کی قوت متخیلہ نے روپہلے چمکتے ستاروں کو بزبان حال بولتے سنا، جو اس سے تاکید کررہے تھے کہ انسانی عظمت، اکرام قدرت، دنیوی جاہ و حشم اور بے تعلق دلچسپی کی سلطنت کے راستوں میں سے کوئی ایک راستہ جلد اختیار کر۔

نصف شب گذر جانے پر جبکہ تمام آسمان شہاب ثاقب کی شرر افشانیوں سے روشن ہو رہا تھا وہ گھوڑے پر سوار ہو کر ایک جانب چل دیا اور دل میں پختہ ارادہ کرلیا کہ جب تک اپنے اور اپنے ہمجنس نوع انسان کے لئے وہ کوئی مذہبی پناہ یا کوئی نیا مذہب نہ تلاش کرے چین سے نہ بیٹھے گا۔

اس زمانہ کی مذہبی حالت دیکھتے ہوئے بدھ کو خواہ مخواہ یہ خیال ستاتا رہتا تھا کہ برہمنوں نے اپنے پوجا پاٹ اور بھینٹ نذر سے کیا کیا۔ انہوں نے دنیوی دولت سے اپنے گھر تو بھر لئے لیکن عوام ہمیشہ سے زیادہ بیکس و لاچار ہو گئے۔

بدھ مت کی مقدس کتابوں میں سدھارتھ گوتم کی اس ہجرت کا حال بعینہٖ ان الفاظ میں پایا جاتا ہے:

"جب وہ جنگل میں جارہا تھا، پوشیدہ چمکدار مخلوق کے گروہ اس کے دیکھنے کے لئے جھک پڑے۔ وہ خوب جانتے تھے کہ شب میں یہ کون سوار جارہا ہے۔ انہوں نے اس میں قدرت کے

منظور نظر خاندان بودھ کے آخری فرد سدھارتھ کی چمک دیکھی جو عقل و راستی کا جوہر اور ہر قسم کی بےچینی دور کرنے والا تھا۔"

وہ لپ اثنائے سفر میں جب مشہور پنڈت یا عالم کا پتہ پاتا، اس کی خدمت میں ضرور جاتا، اس کی باتیں سنتا، اس کی تعلیمات پر غور کرتا لیکن بالآخر یہ الفاظ دہراتا ہوا اٹھ بیٹھا:

"آپ کے اصولوں سے روحِ انسانی کو کوئی مسرت یا آزادی حاصل نہیں ہو سکتی میں تو انہیں کے حصول کی کوشش کرنا چاہتا ہوں۔ مفلسی اور خواہشات پر اپنا قابو یہی دو چیزیں انسان کو آزاد بنا سکتی ہیں۔"

بیاسہ کی سلطنت میں پانچ لوگوں نے اس کے ہاتھ پر بیعت کی اور اس کا ساتھ دینے کے لئے آمادہ ہو گئے۔ اب تک وہ راہِ حق برہمنوں کے الفاظ میں تلاش کر رہا تھا لیکن اب مایوس ہو کر اس نے دوسرا راستہ اختیار کیا۔ چھ سال تک مع اپنے پانچ مریدوں کے آوارہ گردی میں مصروف اور جوگ کی جانفرسا ریاضتوں کی آزمائشوں میں مشغول رہا۔ یہ اس کی زندگی کا وہ دور تھا جب انسان کو اپنی ضروریات کم کرنے اور اپنے سامان تعیشات کو قطعاً نیست و نابود کر دینے پر بہت زور دیتا تھا۔ اس زمانہ میں ایک لونڈی رادھا کا انتقال ہوا جو زمین میں دفن کی گئی تھی۔ سدھارتھ نے قبر کھود کر اس کا کفن نکالا اور بطور کفنی اپنے گلے میں ڈال کر اس وقت تک پہنے رہا جب تک کہ اس کے تار تار نہ ہو گئے۔ اس طرح اس نے اپنی قوت احساس پر بھی پورا قابو حاصل کر لیا۔ غرض اس زمانہ میں کوئی ایسی ریاضت و نفس کشی نہ تھی جس پر وہ عامل نہ رہا ہو۔ فاقوں اور جوگ کی مسلسل ریاضتوں کی تکالیف اٹھاتے اٹھاتے جسمانی طاقت رخصت ہو گئی۔ لیکن جس کی تلاش تھی اس سے اب بھی قطعاً محروم رہا اور آئندہ بھی ان ریاضتوں سے اسے بہبودی کی کوئی صورت نظر نہ آئی۔ اس نے نفس کشی اور جوگ کی تمام ریاضتیں چھوڑ دیں۔ مریدوں کو اس انقلاب سے حیرت ہوئی اور یہ سمجھ کر کہ وہ راہِ حق سے منحرف ہو گیا ہے سب نے اس کا ساتھ چھوڑ دیا۔ لیکن جس چیز کے حصول کے لئے تکالیف و مصائب کا سامنا کیا ایک ایک موسم کئی کئی بار آیا اور گذر گیا۔ وہ چیز اس سے اتنی ہی دور رہی جتنے انسان سے ماہتاب و آفتاب! اور ملی تو چشم زدن میں ایسی جگہ جہاں وہم و گمان بھی نہ تھا:

خدا کی دین کا موسیٰ سے پوچھئے احوال — کہ آگ لینے کو جائیں پیمبری ہو جائے

ایک دہقان کی نا کتخدا لڑکی کے دل ربا ہاتھوں سے روٹی کھا کر ایک درخت[1] کے سایہ میں بیٹھے۔ رات

[1] یہ وہی درخت ہے جو اسی دن سے درخت دانش کے نام سے مشہور ہوا۔

بھر ایک عجیب کیفیت طاری رہی اور قریب صبح کے وقت نور خدا نظر پڑ گیا۔ تکالیف دنیوی کا حقیقۃ لاحل سمجھ میں آگیا اور تمام رموز مخفی پر عبور حاصل ہو گیا۔

۴۵ سال گوتم اپنے مذہب کی تبلیغ و اشاعت میں منہمک رہا۔ بڑے بڑے پر سطوت بادشاہوں حتیٰ کہ خود اس کے والدین اور اہل دھیال نے اس کے مذہب کو قبول کر لیا۔ چونکہ وہ ایک ایسے مذہب کی تعلیم دیتا تھا جس سے ہر امیر و غریب اور ہر شریف و کمینہ یکساں مستفیض ہو کر نجات ابدی حاصل کر سکتا ہے۔ اس کا مذہب نہایت تیز رفتاری کے ساتھ آگے بڑھتا رہا۔ ہندوستان کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک پاٹھ شالے اور مدارس اس کی تعلیمات کو وسعت دینے کے لئے جاری ہو گئے۔

چونکہ وہ مساوات کا حامی تھا۔ برہمنوں کو اپنے تفوق میں کمی آنے کا اندیشہ ہوا۔ لہٰذا اس فرقہ نے عام طور پر اس مذہب کی نہایت سخت مخالفت کی۔ تاریخ کے بوسیدہ اوراق بتاتے ہیں کہ گوتم بدھ کی مخالفت میں اس کے مخالفین نے ہر اس فعل پر عمل کیا، جو کسی حالت میں بھی کسی کے ساتھ روا نہیں ہو سکتا۔ زناکاری کا اتہام اس پر لگایا گیا، جان لینے کی فکریں اس کی کی گئیں لیکن وہ ان تمام امتحانات میں پورا اُترا۔ ہم دیکھتے ہیں کہ بڑے بڑے شاہان ذی حشم اس کی قدموں کو اپنے لئے باعث فخر سمجھنے لگے۔

غرض اس زبردست شخصیت نے اپنی عمر کے ۸۰ سالوں میں سے بیشتر حصہ آوارہ گردی، بادیہ پیمائی، نفس کشی اور تبلیغ مذہب میں صرف کر کے ایک جنگل میں پیڑ کے نیچے مریدوں کے جھنڈ کے درمیان نصیحت و موعظت کرتے کرتے اس جہان فانی سے کوچ کیا اور دنیا میں اپنے اثرات ایسے چھوڑے کہ آج بھی اس کا نام لینے والے کروڑوں کی تعداد میں موجود ہیں۔

سدھارتھ گوتم کی تعلیمات اس قدر وسیع ہیں کہ اس مختصر مضمون میں ان کا سمانا ناممکن ہے۔ لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ اس کا مذہب ایک حد تک نہایت سہل الاصول تھا۔ اس نے اپنے پیروؤں کو دو گروہوں میں تقسیم کیا تھا یعنی ایک زاہد، دوسرے دنیادار۔

زاہدوں کے لئے قانون مذہب بہت سخت تھا۔ وہ اپنی بسر اوقات کے لئے کسی حالت میں کوئی پیشہ اختیار نہیں کر سکتا تھا۔ وہ بھیک بھی نہ مانگ سکتا تھا۔ البتہ اگر کوئی شخص خوشی سے کچھ دیتا، تو بقدر ضرورت لے سکتا تھا۔ اس کے کھانے کے لئے بھی اوقات مقرر تھے۔ علم حاصل کرنا، دنیا داروں کو تعلیم و تلقین کرنا اور حصول نجات کے لئے ریاضتیں کرنا اُن کے خاص فرائض تھے۔ دنیادار فرقہ جیک آزاد تھا۔

ان کے لئے صرف یہی کافی تھا کہ وہ طہارت و پارسائی کی زندگی بسر کریں۔ ظلم و ستم کا نام نہ لیں۔ اس کے ساتھ اپنے ہر عزیز، قریب اور دوست کے حقوق کا خیال رکھیں۔ ان کے خاص فرائض یہ تھے کہ زاہدوں سے علم سیکھیں۔ فرائض خانہ داری ادا کریں اور زاہدوں کے خورد و نوش کا انتظام کریں۔

گوتم دنیا کو خواب و خیال سے تعبیر کرتا ہے، وہ رنج و غم کو اپنی غلطیوں کا خمیازہ بتاتا ہے۔ اس کا مقولہ ہے کہ "جیسا کرو گے ویسا پاؤ گے۔"

اس کے نزدیک "نروان" کے حاصل ہونے پر انسان دنیا کے تمام رنج و مسرت سے بالاتر ہو جاتا ہے۔ لیکن نروان کیا چیز ہے؟ اس کے لفظی معنی نیست و نابود ہونے کے ہیں اور اس سے مراد ہے خواہشات کا فنا ہونا۔ گوتم بدھ کا اس کے متعلق خیال ہے کہ "خواہش بدترین فرض ہے۔ جب یہ بات انسان کی سمجھ میں آجاتی ہے، تو اس حالت کو "نروان" کہا جاتا ہے۔

"نروان" کے حصول کا طریقہ وہ یہ بتاتا ہے کہ "ہر بات کو نہایت خاموشی کے ساتھ برداشت کیا جائے آخر نروان حاصل ہو جائے گا۔

دوسری جگہ کہتا ہے کہ "نجات صرف نروان سے ہی ہو سکتی ہے۔"

گوتم نے خدا کا نام بدھ رکھا تھا اور ایسے فنا فی الوحدت ہوئے کہ خود کو بھی بدھ کہنے لگے۔ وہ کہتے ہیں کہ ہر شخص بدھ ہو سکتا ہے۔ جب انسان کو نروان حاصل ہو جاتا ہے، تو وہ بدھ ہو جاتا ہے۔ جہالت سے انسان اپنی دنیوی ہستی اور خدا کو علیحدہ علیحدہ محسوس کرتا ہے۔ جب جہالت جاتی رہتی ہے، وہ اپنے آپ کو بدھ کے درجے میں پاتا ہے۔

ایک اور جگہ کہتا ہے "اپنے اوپر بھروسہ کرو اور بدھ ہو جانے کی تمنا رکھو۔"

بہرحال وہ خدا اور اس کی وحدانیت کا قائل ہے۔ درخت دانش کے نیچے جب اس کا مقصد حاصل ہوا، تو اس کی زبان سے جو الفاظ نکلے وہ قابل غور ہیں:

"اے خاک کے پتلے کے بنانے والے! جب تک میں نے تجھے نہ دیکھا تھا، مجھے مختلف دردانگیز حالتوں سے گذرنا پڑا .... مگر اب دل نے نروان کی دولت حاصل کر لی اور تمام خواہشیں فنا ہو گئیں۔"

قومی تفریق اور چھوا چھات کا وہ سخت مخالف تھا۔ وہ شودر ذاتوں کے ساتھ ہم نوالہ و ہم پیالہ

ہوتا اور کہا کرتا تھا کہ "ترحم اور عزت سب میں رشتۂ اخوت قائم کر دیتے ہیں۔ خون سب کے جسموں میں ایک ہی سا رنگ کا ہوتا ہے۔ ہر ذی حیات کے آنسو بھی ایک ہی شکل و شباہت کے ہوتے ہیں۔ ان میں قومیت کی کوئی تفریق نہیں ہوتی۔ راہِ حق پر قائم رہنے والا انسان شریف اور ناحق کا راستہ اختیار کرنے والا کمینہ ہے۔"

ایک دوسری جگہ کہتا ہے: "انسان کو مخالفت کا لفظ فراموش کر دینا اور خون کے تعلقات کے خیال سے قطعاً آزادی حاصل کر لینی چاہیے۔"

وہ موت کو انسان کے لئے ایک رحمت خیال کرتا ہے۔ اس کے نزدیک انسان موت کے بعد ایسی زندگی میں قدم رکھتا ہے جو بالکل غیر فانی ہے۔

"زندگی جو ہمارے چراغِ حیات کے گل ہونے پر چمکتی ہے وہ غیر فانی مسرتوں سے لبریز ہے۔" وہ زندگی کو ایک شب کی مسافرانہ شب باشی سے تعبیر کرتا ہے۔

"شبنم کا قطرہ کنول کے پھول پر ہے۔ اے عظیم الشان سورج نکل۔ اس کی پنکھڑیوں کو اٹھا اور انہیں حرکت دے۔ سورج نکلتا ہے اور شبنم کا قطرہ چمکدار سمندر میں پھسل جاتا ہے۔"

اس کو طہارت کا بھی بیحد خیال رہتا تھا، چنانچہ کہتا ہے:

"راہ نجات" طہارت سے شروع ہو کر عشق میں ختم ہو جاتی ہے۔"

عورت اور مخصوص غریب بیوہ یا فاحشہ عورتوں کو وہ بہت زیادہ "قابل رحم" سمجھتا تھا۔

جانوروں کے قتل، چوری، زناکاری، شراب خواری اور دروغ گوئی کی وہ نہایت سختی کے ساتھ ممانعت کرتا ہے۔

●●

پریم چند

جمہور فلاطون

"پلیٹو" جسے افلاطون بھی کہتے ہیں یونان کے ان زندہ جاوید حکما میں تھا جس کے تجربکی روشنی دنیا کے ہر ایک شعبۂ تہذیب و تمدن پر آج بھی پڑ رہی ہے۔ اس کی شہرت اُس کی حیات ہی میں چاروں طرف پھیل چکی تھی اور سبھی اس کو اپنے وقت کا ایک بے نظیر عالم تصور کرتے تھے۔ لیکن باوجود اس شہرت کے اس کی خلقی تاریخ پر تاریکی کا پردا پڑا ہوا ہے۔ سلاطین یونان تاریخ کے شیدا تھے۔ ان کو چھوٹے سے تاریخی واقعات کو ثبت کرنے کا شوق تھا۔ تاہم ایسے فقید المثال عالم کی جائے پیدائش اور تاریخ ولادت کے متعلق بنظر تحقیق کہیں کچھ نہیں لکھا گیا۔

کوئی کہتا ہے کہ وہ سنہ عیسوی سے ۴۳۰ برس قبل پیدا ہوا تھا۔ کوئی کہتا ہے کہ نہیں! ۴۲۸ برس قبل پیدا ہوا تھا چند عالموں کا اتفاق ہے کہ اس کا مولد و ماویٰ یونان ہے اور چند کہتے ہیں کہ نہیں! وہ مصر میں پیدا ہوا تھا۔ تاریخ وفات سنہ عیسوی سے ۳۴۷ سال قبل بتلائی جاتی ہے۔ غرضکہ صاف صاف کوئی کچھ نہیں کہہ سکتا۔

ہاں اس کے متعلق جو کچھ معلوم ہو سکا اس سے یہ البتہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ بہت خوش نصیب واقع ہوا تھا۔ وہ ایک دولتمند شخص کا لڑکا تھا۔ جسمانی صحت اچھی تھی۔ قویٰ مضبوط تھے۔ علوم متداولہ سے بہرہ وافی رکھتا تھا۔ غالباً اس نے فوجی تعلیم بھی پائی تھی اور آئین و قانون سلطنت کا بھی ماہر تھا۔ سقراط سا مشہور باکمال بزرگ اس کا استاد تھا۔ ان موافق حالات میں افلاطون کی فطرتی عقل و ذہانت کے گلزار کا لہلہانا اور اپنی خوشبو سے اہل دنیا کے دماغوں کو معطر کر دینا کوئی تعجب کی بات نہیں۔

افلاطون نے خود انتظام سلطنت میں بہت کم حصہ لیا۔ اگر سیاسیات کا اُسے کچھ شوق بھی تھا تو وہ سقراط کے جذبات عامہ کا شکار ہونے کے بعد بالکل جاتا رہا۔ اپنی زندگی کے بہت کچھ نشیب و فراز دیکھنے کے بعد بالآخر وہ یونان میں آکر مقیم ہو گیا اور وہیں درس و تدریس میں اپنی زندگی صرف کر دی۔

افلاطون میں خودی کا مادہ بہت کم تھا، وہ اپنی تعریف پسند نہ کرتا تھا اور نہ تعلی کا عادی تھا یہاں تک کہ اس نے اپنے تصانیف میں اپنے خیالات اپنے اُستاد سقراط کی زبان سے ادا کیے ہیں۔ وہ ایک فطری شاعر تھا، اس کے کل تصانیف نثر میں ہیں، مگر اس میں شعر کی چاشنی موجود ہے۔ اُس نے مضامین کی صورت میں کوئی کتاب نہیں لکھی۔ وہ اپنے اُستاد کے اس اصول کا پیرو تھا کہ بات جیسی کہی جائے ویسی ہی درست وصحیح ثابت کی جائے۔ اس کی سب کتابیں مناظرے کی شکل میں ہیں۔ اس نے اپنے خیالات کا مظہر سقراط ہی کو بنایا ہے اور کسی کو پیرو، کسی کو سامع، کسی کو مخالف، کسی کو معترض۔ غرضیکہ اسی طرح کسی کو کچھ اور کسی کو کچھ بنایا ہے۔ جمہور میں بھی اس نے اسی اصول کی تقلید کی ہے۔ اس میں اس نے سوسائٹی کے عیوب کو مصلح کی نگاہ سے دیکھا ہے۔ لیکن یہ کتاب ایسی بے مثل بن گئی ہے کہ اس میں نہ صرف تمدنی بلکہ سیاسی، تاریخی، ادبی اور علمی مسائل کی بھی کماحقہ عقدہ کشائی ہو جاتی ہے۔ اس ایک ہی تصنیف نے فلاطون کو مجلس حکما کا استاد نشیں بنا دیا ہے۔ بعض علما کا یہ خیال ہے کہ اگر ہم پلیٹو کے مضامین کا مطلب اچھی طرح سمجھ جائیں، تو اس کے باہر ہمیں کوئی علمی مسئلہ نہ ملے گا۔ اس تصنیف کو اخلاقی، سیاسی، تعلیمی یا اور جو کچھ چاہیں کہہ سکتے ہیں۔ وہ دراصل ایک بے مثل کتاب ہے۔ جس نقطۂ نگاہ سے دیکھیے، اسی حیثیت سے اس میں کچھ نہ کچھ تفریح کے سامان ضرور مل جاتے ہیں۔ اسے خواہ کتنی ہی بار پڑھیے ہر بار ایک نیا لطف پیدا ہوتا ہے۔ وہ زمانہ کی قید سے آزاد ہے اس سے فیض دوام حاصل ہوتا ہے۔ فلاطون نے اپنی نظر غائر اور عقل رسا سے ہزاروں برس آئندہ کی انسانی معاشرت کی حالت دیکھ لی ہے۔ اس کی دُور بینی کے بارے میں صرف اسی قدر کہنا کافی ہوگا کہ جن مجلسی مسائل کے حل کرنے میں آج کل بڑے بڑے علما وحکما کے دماغ چکرا چکے ہیں ان مسائل کو دو ہزار برس پہلے یونان کے ایک کونے میں بیٹھ کر اس نفس عالی نے نہایت آسانی سے حل کر ڈالا تھا۔

جمہور دس حصوں میں منقسم ہے لیکن معلوم ہوتا ہے کہ یہ تقسیم بعد میں ہوئی ہے کیونکہ نفس مضامین کے اعتبار سے وہ یا تو دو یا زیادہ سے زیادہ پانچ حصوں پر مشتمل ہو سکتی ہے۔ لیکن ان امور پر بحث کرنے کی ضرورت نہیں:

پہلا حصہ: کسی تقریب کا حصہ تھا۔ اتھنس کے لوگ جمع تھے۔ سقراط اور گلاکن بھی جشن میں شریک تھے۔ اتفاقاً پالی مارکس ایڈیمنٹس اور نیسرٹس مل گئے۔ ان لوگوں نے سقراط سے

پالمارکس کے باپ سفیلس کے یہاں چلنے کو کہا۔ وہاں دوران گفتگو میں یہ بحث چھڑ گئی کہ انصاف کیا چیز ہے؟ لوگوں نے سفیلس ہی کو سن وشعور کے اعتبار سے مجتہد قرار دیا۔ لیکن اس بیچارے سیدھے سادے ضعیف آدمی نے دو چار تجربے کی باتیں کہکر اس مضمون کی مزید تحقیق نوجوانوں کی فہم و ذکاوٴں پر چھوڑ کر اپنی راہ لی۔ تب جواب کا بار اس کے لڑکے پالمارکس پر پڑا۔ اس نے فوراً انصاف کی تعریف میں سائمونائیڈس نامی شاعر کا ایک شعر پڑھ دیا جس کا خلاصہ مطلب ہے "جو کچھ جس انسان کے قابل ہو وہ اس کو دینا" پالمارکس کا علم اخلاق صرف اسی قسم کے اقتباسات تک محدود تھا۔ جوں ہی سقراط جیسے منطقی کے استخراجی سوالات کی بارش شروع ہو گئی وہ اکھڑ گیا اور اپنی ہی زبان سے اپنے بیان کردہ اصولوں کو مردود اور باطل ثابت کرنے لگا۔ جب یہ موقع پیش آیا تو تھریسی میکس نامی ایک کج بحث آدمی جسے اپنے عقلی دلائل پر ناز تھا، اس دوستانہ مناظرہ میں شامل ہو گیا اور اس نے خود غرضی ہی کو انصاف بتایا۔ پہلے تو اس نے خوب پینترے بدلے لیکن آخر سقراط کی دلیلوں نے اُسے بھی لاجواب کر دیا۔ سقراط نے اسے سمجھا دیا کہ طاقت کو انصاف کہنا مناسب نہیں۔ نا انصاف آدمی کبھی ہوشیار، نیک اور ذی اقتدار نہیں ہو سکتا۔ تجربے سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ ہوشیاری، عقلمندی، فیاضی، طاقت اور اطمینان سب اہل انصاف کی میراث ہے۔ کیونکہ "انصاف" ہی روح کا وہ کمال وصف ہے جس سے وہ اپنا کام اچھی طرح انجام دے سکتی ہے اور انصاف کا اصول قائم رہ سکتا ہے۔ یہ باتیں نا انصافی میں کبھی نہیں حاصل ہو سکتیں۔"

دوسرا حصہ: اس کے بعد گلاکن اور ایڈیمنٹس نہایت ادب کے ساتھ سقراط ہی سے انصاف کی حقیقت پوچھنے لگے۔ انہوں نے پوچھا کہ انجام و نتائج سے قطع نظر فی نفسہ کیا شے ہے؟ سبھی کہتے ہیں کہ انصاف پر چلنے والا آدمی اس دنیا میں آرام سے رہتا ہے اور عاقبت کے مزے اٹھاتا ہے۔ لیکن دیکھنے میں یہ آتا ہے کہ نا انصاف ہی اس دنیا میں فروغ پاتے ہیں۔ منصف فاقہ کشی کی مصیبتیں جھیلتا ہے اور نامنصف لقمۂ لطیف کے مزے اڑاتا ہے۔ رہی عاقبت کی بات، تو کیا نا انصاف امیر خیرات، زکوٰۃ، نیز دیگر کار خیر سے دیوتاؤں کو خوش نہیں کر سکتا؟ انصاف اور بے انصافی کے نتائج کو بغور دیکھا جائے تو ہر طرح سے یہی نتیجہ نکلتا ہے، تو پھر انصاف کا درجہ اعلیٰ و ارفع کیوں مانا جاتا ہے؟ اور اس کی کیوں پیروی کی جائے؟ اس کا جواب اسی حالت میں دیا جا سکتا ہے جبکہ "انصاف" کا حقیقی و اصلی مفہوم ظاہر ہو جائے۔

سقراط نے اس سوال کی اہمیت قبول کی۔ اس نے کہا کہ بہتر ہو گا کہ ہم انصاف کی تحقیق کسی ذات

قاعدہ کے اعتبار سے نہیں بلکہ ایک چھوٹی سی قوم یا چھوٹے ملک کے اعتبار سے کریں۔ اس میں نہایت آسانی ہوگی۔ چنانچہ اس نے ایک ایسی چھوٹی قوم کا تخیل کیا جس میں صرف خواہشات ضروریہ کی تکمیل، ذاتی تحفظ اور باہمی اتحاد۔ یہی تین باتیں مقدم تھیں۔ اس فرضی قوم کے افراد میں محافظ طبقہ کو فضیلت ہوگی۔ اس لئے انہیں کیسے رہنا چاہیئے؟ اور ان کی تعلیم کیسی ہونی چاہیئے؟ اس کا خیال کرنا نہایت ضروری ہے۔ محافظ طبقہ میں انہیں کا شمار ہونا چاہیئے، جو توی بے لوث اور بہادر ہوں۔ ماسوا اس کے فراخدل، مستقل مزاج، فرض شناس اور علم دوست ہوں۔ محافظ طبقہ کے آدمیوں کو زمانہ طفولیت میں ایسے قصے سنائے جائیں جن میں معرفت اور حقیقت کی روح پھونکی گئی ہو۔ خدا پر الزام لگانے والی حکایتیں کبھی نہ پڑھائی جائیں۔ مخرب اخلاق افسانوں کی تعلیم سے ان کے دلوں پر نہایت برا اثر پڑے گا۔ پس انہیں صرف ایسے فسانے سنانے چاہئیں جن میں صداقت، ہمت اور نفس کشی ان تینوں اوصاف حمیدہ کا نہایت اچھی طرح ظہور ہو۔

تیسرا حصہ: صرف فسانوں ہی کی نہیں بلکہ ان کے طرز بیان کی اصلاح کی بھی اشد ضرورت ہے۔ شعروں اور نظموں میں صرف اسی بات پر خاص طور سے زور دیا جائے جس کی تقلید سے محافظوں کی ترقی ہو سکے۔ ان کا طرز بیان سیدھا سادھا اور معنی خیز ہونا چاہیئے۔ اسی طرح موسیقی اور آلات موسیقی میں ترمیم کی ضرورت ہے۔ صرف سادگی کو مدنظر رکھنا چاہیئے۔ صرف گانے بجانے ہی پر زور نہ دینا چاہیئے بلکہ ورزش کا بھی خیال رکھا جائے۔ ورزش سے صرف جسمانی ہی ترقی نہیں ہوتی بلکہ روحانی بالیدگی بھی ہوتی ہے۔ اس لئے اس میں سادگی اور احتیاط کی ضرورت ہے لیکن حد سے تجاوز ہونا یہاں بھی جائز نہیں۔ اس طریقہ سے ان کی تعلیم پوری ہو جائے گی۔ پھر ان میں جو سب سے زیادہ فہیم، دوراندیش، عقلمند، توی، محبِ ملک اور بے نفس ہوں۔ ملک کے انتظامی مناصب پر مامور کیے جائیں اور حقیقی محافظ کہلائیں۔ باقی محافظ' معاون و مددگار کے نام سے پکارے جائیں۔ اس طرح اس ملک کو، اہل انتظام، اہل سیف اور اہل حرفہ و زرع، ان تینوں حصوں میں ہمیشہ کے لئے تقسیم کر دینا قوم کے لئے موجب فلاح ہے۔ اس کے لئے ایسی تدبیریں کرنی مناسب ہوں جن سے لوگ اس تقسیم کو قدرتی تصور کرنے لگیں۔ محافظ طبقہ کے آدمیوں کی خود غرضیاں بالکل کالعدم ہونی چاہئیں۔ انہیں تاہل' عیالداری اور دولت سے محترز رہنا مناسب ہے۔ قوم کی طرف سے صرف معمولی معاش پر قناعت کرنی چاہیئے۔

چوتھا حصہ: محافظوں کا پہلا فرض مساوات کا رائج کرنا ہوگا، تاکہ کوئی حد سے زیادہ

غریب ہو اور نہ کوئی مالدار ہو۔ دوسرا فرض مملکت کی توسیع کا انسداد ہوگا۔ تیسرا فرض موسیقی اور تربیت جسمانی کی نگہداشت ہوگی۔ باقی چھوٹی موٹی باتیں وہ خود سوچ کر طے کر سکتے ہیں۔ اس طرح اس فرضی قوم کا معیار قائم ہوگیا۔ پورا ملک بن کر تیار ہوگیا۔ اب دیکھنا چاہیئے کہ اس میں "انصاف" کا مقام کہاں ہے؟ وہ اس ملک کے کسی خاص حصہ میں ہے، یا تمام ملک ہی میں ساری ہے۔

یہ ہمارا فرضی ملک بہمہ صفت موصوف ہے۔ اس لئے اس میں دانشمندی، ہمت، تہذیب نفس اور انصاف یہ چاروں اوصاف بدرجۂ اتم موجود ہوں گے۔ دانشمندی اہل انتظام میں، ہمت اہل سیف میں، تادیب نفس تینوں جماعتوں کے باہمی تعلقات میں مضمر ہے۔ ان تینوں جماعتوں کا بالاتفاق اپنے فرائض انجام دینا ہی انصاف ہے۔ اس کے برعکس اگر کوئی شخص دوسروں کے فرائض میں مداخلت کرے تو وہی بے انصافی ہے۔ ہم نے قوم اور ملک میں انصاف کی ماہیت دریافت کرلی۔ اب دیکھیں افراد میں یہ حقیقت کہاں روپوش ہے۔ ہر ایک انسان کے دل میں دو متضاد اوصاف موجود ہوتے ہیں۔ روحانیت اور حیوانیت۔ ایک سے دانشمندی ظاہر ہوتی ہے، دوسرے سے جہالت۔ ایک تیسرا وصف اور بھی ہے جسے بشریت کہہ سکتے ہیں۔ یہ ہے تو جہالت ہی کی ایک شاخ مگر تائید ہمیشہ روحانیت کی کرتی ہے۔ اس لئے قوم کے اہل انتظام، اہل سیف اور عوام افراد میں علی الترتیب روحانیت، بشریت اور حیوانیت کے مترادف ہیں۔ دانشمندی روحانیت میں، ہمت بشریت میں، تادیب نفس حیوانیت اور بشریت پر روحانیت کی مناسب حکومت میں ہے۔ انصاف ان تینوں اوصاف کی موافقت کا نام ہے۔

پانچواں حصہ: اس طرح اپنی فرضی سلطنت کے نشو کی تشریح کرنے کے بعد سقراط اس کے زوال پر بحث کرنی چاہتا تھا کہ پالمارکس وغیرہ نے اس سے تعلیم نسواں پر اپنے خیالات ظاہر کرنے کا اصرار کیا۔ سقراط نے جواب دیا کہ عورت اور مرد میں کوئی خاص تفریق نہیں ہے۔ اگر ہے تو صرف تفریق مشاغل کا نتیجہ ہے۔ حالات کے تغیر سے یہ فرق بھی مٹ سکتا ہے۔ توالد کا فرق خارجی ہے اس لئے ان دونوں کو یکساں تعلیم دینی چاہیئے، جو طرز تعلیم اہل سیف کے لئے بتلایا گیا وہی ان کے لئے بھی موزوں ہے۔ یہ مردوں کے دوش بدوش رہ کر ہی موسیقی تربیت جسمانی وغیرہ امور میں مشاق ہو سکتی ہیں۔

دوسرا اہم سوال عورت کی قومی خدمت کا ہے۔ اس کے بارے میں سقراط کا قول ہے کہ جس عورت کا میلان جنگ کی طرف نظر آئے اس کا تعلق اہل انتظام سے کرایا جائے۔ لیکن حسب خواہش اس کی تبلیغ

ہو سکے۔ یہ بھی ضروری ہے کہ عورتیں اپنی اولاد سے مغائر رکھی جائیں۔ یہ تعلق مجسٹریٹ کی رائے سے ہو اور اولاد کی تربیت اور پرورش منجانب سلطنت ہو۔

تیسری تجویز یہ ہے کہ فرمانبرداری کا اعزاز اور اختیار صرف اہل حقیقت کو ملنا چاہیئے بلکہ اس موقع پر امتیاز سے کام لینا چاہیے۔ جس شخص نے اِدھر اُدھر کے منصوبات پیدا کر کے لفاظی شروع کر دی ہو وہ بالکل فریبی ہے۔ سچا دانا وہی ہے جس نے ہر قسم کے معلومات کی حقیقت دریافت کرلی ہو۔ وہی ہر ایک کام کو خوش اسلوبی سے انجام دے سکتا ہے اور وہی بادشاہی کا سزاوار ہے۔

چھٹا حصہ: اہل حقیقت کے عالم، جھوٹ کے دشمن، سچائی کے عاشق جسمانی لذات سے محترز، دولت سے مستغنی، آزادہ رو اور کشادہ دل، منصف، متحمل، عاقل، ادراکِ خیال اور شاعرانہ مذاق سے آشنا ہونا چاہیئے۔ قوم کو چاہیئے کہ وہ ایسے آدمیوں کو ڈھونڈھ نکالے وہ خود اس قید میں پھنسنا پسند نہیں کر سکتے۔ ریاست کا یہ بھی فرض ہے کہ وہ علوم حقیقی کی تشویق اور توسیع کا بھی لحاظ رکھے تاکہ بنے ہوئے لوگ اصلیت کے باہر نہ کہلائیں۔ سقراط نے مجسٹریٹ ہونے کے قبل تک اہل انتظام کی تعلیم کے اصول مقرر کر دیئے تھے۔ لیکن اس کا قول ہے کہ منصب پر فائز ہونا تعلیم کی انتہا نہ ہونی چاہیئے۔ مجسٹریٹوں کو بالالتزام حقائق اور معارف کا دلدادہ ہونا چاہیئے۔ تمام حقائق میں راستی اعلیٰ ترین حقیقت ہے۔ یہی ہر ایک ذی روح کا ماحصل حیات اور ہر ایک وجود کی علت اولیٰ ہے۔ عالم موجودات میں آفتاب کا جو درجہ ہے وہی دنیا حقیقت میں راستی کا درجہ ہے۔

ساتواں حصہ: اس حصہ میں سقراط نے ایک طویل قصہ کہکر واضح کر دیا ہے کہ اہل حقیقت کا طرز انتظام کیا ہوگا اور وہ اس کام کو کتنی خوبصورتی سے انجام دے سکتے ہیں۔ سقراط کے خیال میں تعلیم کا منشا اولی تہذیب اخلاق و نفس ہے اور اس کے لئے بالترتیب ریاضی، طبیعیات، مساحت، نجوم، علم آداب اور علم استدلال حاصل کرنے کی ضرورت ہے۔ سقراط نے ان کے حصول کے اوقات اور اصول بھی منضبط کر دیئے ہیں، جن کے بیان کرنے کی یہاں چنداں ضرورت نہیں۔

آٹھواں حصہ: اس باب میں سقراط نے پھر زوال قوم اور اس کے اسباب کی بحث شروع کی ہے۔ اس نے جمہور کو پانچ قسموں میں تقسیم کیا ہے، (۱) حکومت صلحا اس کے آئین و ضوابط اوپر بیان ہو چکے۔ لیکن یہ دور دیرپا نہیں ہو سکتا۔ ترقی کے بعد تنزل کا ظہور ضروری ہے۔ چنانچہ اس دور کے بعد

(۳) فطری طور پر حکومت امرا کا ظہور ہوتا ہے۔ اس میں بشریت کا غلبہ رہتا ہے۔ اہل سیف کی بن آتی ہے اور عوام کی حالت بالکل غلاموں کی سی ہو جاتی ہے۔ ہر جگہ اعزاز اور اقتدار کو فروغ ہوتا ہے۔ بالخصوص مالکان زمین کو (۳) اس کے بعد حکومت اغنیا کا دور آتا ہے۔ اس میں عزت کی جگہ دولت کو شرف حاصل ہوتا ہے۔ زردار اور بے زر، دو متضاد گروہوں کا نشو شروع ہو جاتا ہے۔ یہاں تک کہ مفلس گروہ اہل زر کے خلاف آمادہ پیکار ہو جاتا ہے اور اس حالت میں (۴) حکومت عام کا عمل درآمد ہو جاتا ہے۔ وقعت اور شرافت ماری ماری پھرتی ہے نہ کوئی اصول رہ جاتا ہے، نہ کوئی قاعدہ انصاف اور قانون کی مٹی خراب ہو جاتی ہے۔ نہ اُن کے لئے کوئی قاعدہ ہوتا ہے اور نہ وہ کسی قاعدہ کے پابند۔ لیکن یہ حالت چند سالوں تک بھی قائم نہیں رہ سکتی، مطلق العنانی کا دور شروع ہو جاتا ہے۔ اس دور میں خواہشات کی گرم بازاری ہوتی ہے اور جفا شعار، نااہل، نفس پرور، طماع اور جابر افراد کا غلبہ رہتا ہے۔

انہیں پانچوں اقسام سلطنت کے مانند پانچ قسم کے انسان بھی ہوتے ہیں۔ حاسد، عزت پرست، خود پرست اور نفس پرست۔

نواں حصہ : اس حصہ میں سقراط نے کئی مثالوں سے دکھلایا ہے کہ منصف آدمی کو ہمیشہ عافیت نصیب ہوتی ہے۔ اس کے برعکس انصاف کو پامال کرنے والے ہمیشہ آفات و حوادث کے شکار ہوتے ہیں۔ تھریسیکس کا یہ قول کہ جفا شعاروں کو ہمیشہ فروغ ہوتا ہے باطل ہے، لہذا حتی الامکان انسان میں انصاف کی تقویت اور تکمیل کا اہتمام کرنا چاہیئے۔ اگر یہ مادہ دہبی ہو تو بہتر، ورنہ اس کے اکتساب کے خارجی وسائل پیدا کیے جانے چاہئیں۔ تاکہ روح میں یہی وصف غالب رہے۔

دسواں حصہ : سقراط کو شعرا اور فن شعر کی اصلاح کی بھی بڑی ضرورت معلوم ہوتی ہے۔ اس وقت کی مروجہ شاعری سے وہ مایوس ہو گیا تھا۔ اس کتاب کے آخر میں اس نے پھر وہی بحث چھیڑی ہے۔ اس کا قول ہے کہ شاعری سے صرف موجودات کے ظاہر کا علم ہوتا ہے باطن کا نہیں۔ اس لئے اس سے صرف رذائل کی تحریک ہوتی ہے، فضائل کی نہیں۔ حالانکہ شاعری محاسن سے خالی نہیں۔ اس سے قوم کو بے انتہا فیض حاصل ہو سکتا ہے۔

اس کے بعد سقراط نے اوصاف حسنہ کے جزائے خلد کا ذکر کرتے ہوئے، روح کے امر ادی ہونے کا بھی ذکر کیا ہے۔ چونکہ روح غیر فانی ہے، اس لئے اوصاف حسنہ کی اہمیت اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ وہ

بلکہ روح کا ذکر کر کے خاموش نہیں رہ جاتا۔ اس نے ایک نہایت دلچسپ قصہ لکھ کر دکھلایا ہے کہ اوصاف حسنہ کی دیوتاؤں کی نگاہ میں کتنی وقعت ہے اور وہ اس کا کیا صلہ عطا کرتے ہیں۔ یہ قصہ حقائق اور باطنیات سے پُر ہے۔ اس میں بیان کیا گیا ہے کہ روح مختلف اجسام میں گھومتی ہوئی بالآخر سکون ابدی حاصل کرتی ہے۔ انسان خود اپنی قسمت کا معمار ہے۔ لیکن ایک بار اپنی قسمت کا انتخاب کر لینے کے بعد اُسے پھر اس کے نتائج سے چارہ نہیں۔ وہ چاہے بہشت کے مزے اٹھائے یا دوزخ کے شدائد جھیلے۔ لیکن اس کے بعد اُسے پھر اسی دنیائے فانی میں آنا پڑتا ہے۔ "جمہور" کا اسی حقیقت اور پرمعنی قصہ پر خاتمہ ہو جاتا ہے۔

ہم نے اجمالاً چند سطروں میں "جمہور فلاطون" کا تبصرہ کرنے کی کوشش کی ہے، لیکن محض اس تبصرے سے اس کے مندرجہ موضوعات اور مباحث کا پورا علم ہونا غیر ممکن ہے۔ کتنے ہی اہم مسائل بخیال طوالت نظر انداز کر دیے گئے ہیں۔ فلاطون کے زمانہ میں یونان اور ہندوستان کے درمیان کافی ارتباط تھا۔ تجارت سے قطع نظر، اس ارتباط کا اثر دونوں ملکوں کی صنعت و حرفت، فلسفہ اور ادب اور نیز معاشرت پر نظر آتا ہے۔ "جمہور" میں فلاطون نے کئی ایسے مسائل سے بحث کی ہے، جو کہ اہل ہند کی ایجاد ہیں اور چونکہ جدید یورپ کی سیاسی اور معاشرتی تکوین بیشتر "جمہور" کے اصولوں ہی کے مطابق ہوئی ہے، اس لئے ہمارے لئے اس کتاب کا مطالعہ اور بھی دلچسپی کا باعث ہے۔

(مارچ ۱۹۲۱ء)

●●

آنند

سوراج

۱۸۵۷ء کے خونریز غدر کے بعد برٹش حکومت کو استقلال اور اہل ہند کو ایک گونہ امن حاصل ہوا۔ انیسویں صدی کے آخری حصہ میں مغربی تعلیم سے متاثر ہو کر چند اہل الرائے اور وطن پرست ہندوستانیوں اور روشن خیال انگریزوں نے انڈین نیشنل کانگریس کی بنیاد ڈالی۔ بیس پچیس برس تک سیاسی جدوجہد کا مطمح نظر کوئین وکٹوریہ کے شاہی اعلان کی بنا پر مساوی حقوق کے تحصیل تک محدود تھا۔ ۱۹۰۶ء میں دادا بھائی نوروجی کے زیر صدارت جو معرکۃ الآرا اجلاس کانگریس منعقد ہوا اس میں صاحب صدر اور ارکان کانگریس نے بالاتفاق یہ فیصلہ کیا کہ برٹش راج کے زیر سایہ رہتے ہوئے سلطنت خود انتظامی یا سوراج حاصل کرنا آئندہ کے لئے ہمارا سیاسی وزمن ہوگا۔ چنانچہ اس زمانہ سے اس وقت تک ملک میں پولیٹکل جدوجہد کا سلسلہ بڑی سرگرمی اور تندہی سے جاری رہا۔ گو ۱۹۱۶ء سے ہوم رول (سوراجیہ) کی صدا معمول سے زیادہ بلند رہی اور ۱۹۱۸ء سے وہ متفقہ اصول جن پر کانگریس کی بنیاد ڈالی گئی تھی نہ صرف متزلزل ہو گئے، بلکہ اصولی تبدیلی اس قدر واقع ہوئی کہ اختلاف آرا کے سبب دو مستقل گروہ پیدا ہو گئے۔ ان میں سے ایک کے سرغنہ اور ہادی مہاتما گاندھی مہاراج اور دوسری جماعت کے رہبر مسٹر شاستری، مسٹر داچا، سر سریندر ناتھ بنرجی وغیرہ بنے۔

قطع نظر ان اصولی اختلافات ابھی تک مہاتما جی اور ان کے رفقا اعتدال پسند جماعت کے اس اصول سے دلی تمنا سے متفق نظر آتے ہیں جس کا منشا یہ ہے کہ ہم اپنے مقصد برآری کے لئے جو چاہیں کریں؛ مگر خونریزی، بیجا تشدد، ظلم و جبر سے قطعاً پرہیز کریں۔

کسی ملک یا سلطنت میں تبدیلی پیدا کرنے کے دو ہی ذریعہ ممکن ہیں۔ ایک فوری انقلاب اور جنگ کے ذریعہ طرز حکومت کو محدود وقت کے اندر بدل دینا، دوسرے قومی تعلیم کی اشاعت سے قوم میں بلا خون ریزی اور شورش اس درجہ قومی بیداری پیدا کرنا اور اس حد تک وطن پرستی کے جذبہ کو نشو و نما دینا کہ کافی عرصہ کے سیاسی ارتقا اور بے غرضانہ انتھک کوششوں کے بعد عنان حکومت مطلق العنان فرماں روا

کے ہاتھ سے لے کر جمہور کے ہاتھوں میں دینا۔

موجودہ حالات کو پیش نظر رکھتے ہوئے اور ہندوستانیوں کی بے بسی، بیچارگی اور کم مائگی کا اندازہ کرتے ہوئے مہاتما گاندھی خونریزی، جنگ اور جبر و تشدد کو منزل مقصود تک پہنچنے کے لئے ضروری نہیں سمجھتے چنانچہ اگست ۱۹۲۰ء میں جس وقت مہاتما جی نے بدرجۂ مجبوری مایوس ہو کر گورنمنٹ سے ترک موالات کا اعلان کیا تو اس کا لازمی جزو عدم تشدد اور عدم ضرر رسانی رکھا۔

اب ہم کو یہ دیکھنا ہے کہ آیا جو طرز عمل مہاتما جی نے منزل مقصود تک پہنچنے کا اختیار کیا ہے، وہ بجائے خود کس حد تک کامیاب ثابت ہوا اور کس حد تک ملک کے لئے مضرت رساں ہوا۔ دوسرے یہ کہ جو طریقہ عمل اور مطمح نظر ہندوستانیوں کے سامنے سیاسی آزادی اور سلطنت خود انتظامی کے حاصل کرنے اور پامال حقوق کی دادرسی کا ہمارے سامنے پیش کیا ہے وہ کہاں تک ہم کو فائز المرام کر سکتا ہے اور اس میں کیا نقائص ہیں۔

مہاتما گاندھی کے بے نظیر اور عظیم الشان خدمات کا اعتراف ہر گروہ و طبقہ کا فرد کرتا ہے۔ ان کی بے لاگ سچائی، ملکوتی صفات، حیرت انگیز ایثار اور خالص وطن پرستی کا سکہ ہر شخص پر خواہ وہ مخالف ہو یا موافق جما ہوا ہے۔ جنوبی افریقہ میں بیس سال تک ہندوستانی حقوق کے تحفظ کے لئے انہوں نے جو کچھ خدمات انجام دیے وہ اظہر من الشمس ہیں۔ ہندوستان واپس آ کر اپنے احمد آباد میں ستیہ گرہ آشرم قائم کی چند سال تک ہندوستان کی سیاسی معاملات میں انہوں نے وہ گہری دلچسپی نہیں لی جو فی زمانہ لے رہے ہیں۔ ۱۹۱۶ء میں مسز بسنٹ کے مساعی جمیلہ نے ہوم رول کی جس وقت بنیاد ڈالی تو آپ اس تحریک میں شریک نہیں ہوئے۔

۱۹۱۸ء میں رولٹ بل کے نفاذ نے آپ کے امن و سکون کو برہم کر دیا۔ آپ نے کافی غور و تامل کے بعد ستیہ گرہ کی تعلیم دی اور قانون کے خلاف عمل پیرا ہونے کا مشورہ دیا۔ یہی وہ زمانہ ہے جبکہ آپ اپنی غیر معمولی اخلاقی اور روحانی قویٰ کے ساتھ سیاسی میدان میں نمودار ہوئے۔

منحوس رولٹ بل اگر پاس نہ ہوتا تو پنجاب میں قتل و غارت کی نوبت نہ آتی اور نہ ہمارے سیاسی جذبات اس درجہ مشتعل ہوتے جہاں سوز جنگ عظیم اگر یورپ میں نہ ہوتی تو خلافت کا مسئلہ نہ پیدا ہوتا۔ بہرکیف یہ دو ایسی زبردست بجلیاں ہندوستان کی سیاسی سطح پر گریں کہ ہمارے خرمن امن و چین کو جلا کر خاک کر دیا۔ انہیں دو اسباب کا یہ حوصلہ افزا اور امید افزا نتیجہ نکلا کہ سوراجیہ کی صدا ہندوستان کے ہر گوشہ و کونہ و قریہ

قصبہ میں گونجنے لگی۔ جو قوت اس تحریک کو دو سال کے اندر حاصل ہوئی وہ چالیس سال میں بھی پیدا نہیں ہو سکتی تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر ہمارے خرمنِ مراد پر یہ بجلی نہ گرتی، تو ہم اب تک خوابِ خرگوش کی طرح پڑے سویا کرتے۔ جس شے نے ہم کو جگایا وہ ہمارے جائز حقوق کی پامالی، انصاف کا خون، ہماری قومی توہین اور ذلت تھی۔ گرم جماعت کے اکثر حضرات اب بھی استدلال کرتے ہیں کہ جب تک ہم کو سوراج حاصل نہ ہوگا، توہین آمیز واقعات آئے دن برابر وقوع میں آتے رہیں گے، بجائے اس کے کہ ہم شروع ہی سے سوراجیہ کو اپنے کل امراض کی دوا سمجھ کر اسے حاصل کرنے میں منہمک ہو جاتے ہم کو غفلت سے بیدار کرنے کے لئے ایسے تازیانے کی ضرورت پڑی۔

گورنمنٹ کو نیچا دکھانے کے لئے اور اپنی قومی آبروریزی کا داغ مٹانے کے لئے مہاتما جی نے ہم کو یہ مشورہ دیا کہ ہم گورنمنٹ سے ترکِ موالات کر لیں۔ اس تحریک کے مختلف پہلو تھے، جن میں سے چند امور قراردادِ نکلی صورت میں بہ اتفاق آراء کلکتہ کے اسپیشل کانگرس نے بزمِ علاوہ آمد نافذ کیے وطن پرست عزیزانِ وطن کو ہدایت کی گئی کہ وہ جدید کونسلوں میں شریک نہ ہوں، سرکاری خطابات کو واپس کر دیں، سرکاری اور نیم سرکاری مدارس میں طلبا کو تعلیم نہ دلوائیں۔ سدیشی تحریک کو ترقی دیں، وکلا وکالت کے پیشہ کو ترک کر دیں۔

نو مہینہ کے عرصہ میں اس تحریک کے کسی پہلو کو معمولی کامیابی بھی نصیب نہ ہوئی۔ بجز اس کے کہ عارضی ہنگامہ اور شور و شغب میں ایک گونہ اضافہ ہو گیا اور بس۔ عوام الناس کا ذکر نہیں، خود تعلیم یافتہ گروہ نے ان احکامات اور قراردادوں کی کہاں تک پیروی کی؟ اس کا جواب زبانِ حال سے اس تحریک کے مختلف شعبے دے رہے ہیں۔ ہندوستان کے مختلف صوبوں میں صرف معدودے چند وکلا و بیرسٹر نے اپنے پیشہ کے کاروبار کو ملتوی کر دیا ہے۔ اگر وکالت پیشہ جماعت کا ایک ثلث حصہ بھی ان قراردادوں کی پیروی کرتا تو ہم ترکِ موالات کی تحریک کو کامیاب سمجھتے۔ اسی طرح کونسل کی ممبری کا حال ہے۔ یہ سچ ہے کہ چند نیشنلسٹ اصحاب نے کونسل کی ممبری کو خیرباد کہہ دیا مگر کیا کسی صوبہ کی کوئی بھی مجلس واضع قانون ایسی ہے جس میں ممبروں کی کمی کی وجہ سے کوئی جگہ بھی خالی رہ گئی ہو۔ جن حضرات نے سرکاری خطابات واپس کر دیئے ان کی تعداد بھی شاید ملک بھر میں دس بیس سے زیادہ نہ ہو۔ سدیشی تحریک کا حال بھی حوصلہ شکن ہے۔ جون ۱۹۲۰ء تک ایک کروڑ ممبرانِ کانگرس ایک کروڑ نقد رقم اور بیس لاکھ چرخہ کی تعداد پورا کرنے کا اعلان کیا گیا ہے ابھی تک اس جدید سعی میں بھی جو کامیابی حاصل ہوئی ہے، وہ ناظرین سے مخفی نہیں۔ دور کیوں جایئے ہمارے صوبہ میں اب تک تلک سوراج فنڈ کے لئے ۱۶ ہزار سے زائد رقم فراہم نہیں ہوئی۔

ع   ببیں تفاوت رہ از کجاست تا بہ کجا

ان سطور سے ظاہر ہے کہ ترک موالات کی تحریک کا کوئی جز کامیاب نہیں رہا۔ اس سے ہم کو انکار نہیں کہ عوام الناس اور کم عقل جماعتوں کے بے ہوئے جذبات کو مشتعل کرنے اور نفرت اور نا رواداری کی آگ بھڑکانے میں ایک حد تک اس تحریک کے حامی اور کار پرداز ضرور کامیاب ہوئے۔ مگر ہمارا خیال ہے کہ یہ اثر بھی دیر پا نہیں رہے گا اور کچھ عرصہ کے بعد فنا ہو جائے گا۔

اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ تحریک ناکامیاب کیوں رہی۔ اس کے بار آور نہ ہونے کا اصلی سبب کیا ہے۔ ہماری رائے میں خاص و عام بوجہ جہالت اس تحریک کے حقیقی مفہوم کو ذہن نشین کرنے سے قاصر ہیں۔ ان میں اس تحریک کے طریقۂ عمل سمجھنے کی استعداد وہ قابلیت نہیں۔ جب تک ان کو تعلیم دینے کی کوشش نہ کی جائے گی اس تحریک کو عرصہ دراز تک کامیابی نہیں ہو سکتی۔ ستیہ گرہ اور ترک موالات کے اصول کو وہی شخص سمجھ سکتا ہے جو صحیح معنوں میں با اخلاق ہو، با اصول ہو۔ خود غرضی کا عادی نہ ہو، مضبوط کیرکٹر رکھتا ہو۔ وطن پرستی کے جذبات اس کے دل میں موجزن ہوں۔ مارچ ۱۹۱۹ء میں ستیہ گرہ کی تحریک کا آغاز بمبئی میں کیا گیا۔ راقم الحروف اپنے عینی مشاہدہ کی بنا پر عرض کرتا ہے کہ بجز چند اصحاب کے جو فطرتاً یا عادتاً نیک خصلت، با اصول اور راست باز تھے بقیہ اور حضرات جو بڑے شوق سے ممبر ہوئے تھے بیس طرح کے بہانے ڈھونڈھ کر کنارہ کش ہو گئے۔ بعضوں کا یہ خیال تھا کہ وہ محض مقاومت مجہول کی غرض سے شریک ہوئے ہیں۔ انہیں ستیہ گرہ کے اصول سے کوئی دلچسپی نہیں۔

یہ امر بھی قابل غور و تامل ہے کہ سوراجیہ حاصل کرنے کا جذبہ اہل ہند کے اندر خود بخود پیدا نہیں ہوا۔ غیر قوم کے افراد نے ہم کو بیدار کرنے میں معتد بہ حصہ لیا اور خارجی اثرات نے ہم کو جگایا۔ یہ ظاہر ہے کہ جب تک ہم کو سوراج حاصل نہ ہوگا ہم ذلت و خواری کے غار میں ہمیشہ پڑے رہیں گے۔ سوراج کی حقیقی خواہش، حب الوطنی کے خالص جذبات ہمارے دلوں میں اس حد تک موجزن نہیں جس قدر کہ ہماری نجات کے لئے ضروری ہیں۔ وطن پرستی یکجہتی ایثار کے رنگ میں رنگنے کے لئے یہ لازمی ہے کہ ہم قومی تعلیم، قومی روایات اور زمانہ کے رفتار کے ساتھ چلیں۔ ہماری سیاسی ترقی کا راز صرف ایک لفظ تعلیم میں مخفی ہے۔ ہم کو یہ دیکھ کر سخت قلق ہوتا ہے کہ ہمارے ہادیانِ قوم نے عارضی جوش کے اثر میں آکر طلبا کو تعلیم ترک کر دینے کا مشورہ دیا۔ بعض اصحاب نے تو یہاں تک صلاح دی کہ جاہل رہنا مغربی تعلیم حاصل کرنے سے بہتر ہے: ع   بریں عقل و دانش بباید گریست

مندرجہ بالا سطور میں ہم یہ ثابت کر چکے ہیں کہ ترک موالات کی تحریک ملک میں تعلیم کی کمی کی وجہ سے ناکامیاب ہوئی، اور نیز یہ کہ ہمارے سیاسی نجات اور آزادی کا راز تعلیم کی اشاعت میں مخفی ہے۔ اب ہم یہ دکھانا چاہتے ہیں کہ موجودہ مغربی طرز تعلیم جو ہمارے ملک میں عرصہ سے رائج ہے اُس کے نقائص و فوائد کیا ہیں۔ انصاف پسند اشخاص اس امر کے تسلیم کرنے سے انکار نہیں کر سکتے کہ باوجود چند نقائص یہ مغربی تعلیم ہی کا نتیجہ ہے کہ ملک میں ہر جگہ چند وطن پرست اصحاب نظر آتے ہیں۔ ہمارے ملک میں دیش بھگتی مفقود تھی۔ الشیوربھگتی مفقود تھی۔ رفاہ عام، سوشل سروس، قومی خدمت کا رواج جس قدر فی زمانہ ہو چلا ہے پہلے اس قدر نہ تھا۔ جو لوگ ترک موالات کے ارباب حل و عقد سمجھے جاتے ہیں وہ بھی اسی تعلیم کے طفیل میں آج اپنی کارگذاریوں کے جوہر دکھا رہے ہیں۔

ہمارے ناظرین میں اکثر ایسے اصحاب ہوں گے جنہوں نے انگریزی مدارس میں اعلیٰ درجہ تک تعلیم پائی ہوگی وہ خود انصاف کریں۔ ابتدا سے انتہا تک ان مدارس کے نصاب کا کوئی ایسا حصہ نظر نہیں آتا جس میں غلامی کی تعلیم دی جاتی ہو یا مذہب اخلاق، وطن پرستی کے خلاف تلقین کی جاتی ہو۔ انگریزی علم ادب، تاریخ، جغرافیہ، ریاضی، عربی، فارسی، سنسکرت، سائنس، فلسفہ، اقتصادیات وغیرہ علوم و فنون کی تعلیم اسکول اور کالج میں دی جاتی ہے۔ ان میں سے کون سا ایسا مضمون ہے جو ہمیں بد اخلاقی، بد وضعی، غلامی کی تلقین کرتا ہے برخلاف اس کے ان مضامین کے مطالعہ سے ہم لوگوں نے ذہنی و اخلاقی کافی ترقی کی ہے۔ موجودہ طرز تعلیم میں چند نقائص ضرور ہیں جن کی اصلاح کی کوشش کی جا رہی ہے۔ جدید یونیورسٹیاں قائم ہوئی ہیں۔ علم و فنون کی اشاعت میں پہلے کے بہ نسبت اب بہت زیادہ روپیہ صرف کیا جا رہا ہے۔ جدید آئینی اصلاح نے محکمۂ تعلیم کو ہندوستانی وزرا کے طرف منتقل کر دیا ہے۔ اب ہم کو اختیار ہے کہ جس طرح چاہیں ابتدائی، ثانوی اور اعلیٰ تعلیم کے معیار و نصاب میں اصلاح و اشاعت کریں۔ اگر ہم یہ دیکھیں کہ موجودہ مدارس میں مذہبی، اخلاقی اور قومی تعلیم علی العموم نہیں دی جاتی تو ہم رائے عامہ کے زور سے ان مضامین کو نصاب تعلیم میں داخل کرا سکتے ہیں۔ ہندوستان میں جبری تعلیم کا اجرا بھی چند سال کے اندر ضرور ہو جائے گا۔ تین چار صوبوں میں میونسپلیٹیوں کو جبری تعلیم جاری کرنے کی اجازت دیدی گئی ہے اگر ہم ان مراعات سے فائدہ نہ اٹھائیں تو خود ہم قابل الزام ٹھہرائے جائیں گے۔ جس قدر تعلیمی سہولتیں گورنمنٹ کے ذریعہ ہم کو مل رہی ہیں ان کو بے قدری کی نگاہ سے نہ دیکھنا چاہیئے۔ بلکہ جہاں تک ممکن ہو تعلیم کی اشاعت میں سرگرم کوشش کرنا چاہیئے۔

اگر ہم واقعی سوراج کے مستحق ہیں، تو ہم کو سرکاری مدارس کے علاوہ غیر سرکاری اور قومی مدارس کا بھی

اجرا کرنا چاہیئے۔ قومی مدارس میں ہم جس طرح کی تعلیم چاہیں طلبا کو دے سکتے ہیں۔ گورنمنٹ مزاحم ہرگز نہ ہوگی۔ اس وقت جس قدر قومی اسکول و کالج قائم کیے گئے ہیں ان میں سے ایک بھی اچھے پیمانہ پر چلایا نہیں جاتا۔ کچھ تو سرمایہ کی کمی کی وجہ سے اور کچھ ممبروں کی عدم توجہی کی وجہ سے ان مدارس میں باقاعدہ تعلیم کا انتظام نہیں۔

سرکاری درس گاہوں میں صنعت و حرفت اور روٹی کمانے کی تعلیم کم دیجاتی ہے۔ ہماری تعلیم کا عملی پہلو بہت گرا ہوا ہے۔ ہندوستانی زبان، قومی روایات، قومی علوم و فنون کے احیا و تبلیغ کا کوئی انتظام نہیں۔ ہمارے طرز معاشرت کے نظام کا اثر بھی طلبا کی تعلیم و تربیت پر بہت کچھ پڑتا ہے۔ ہمارا فرض ہے کہ قومی مدارس اور دارالعلوم میں ان کو جاری کرنے کی کوشش کریں اور اُن کے ذریعہ سے وطن پرستی کے جذبات اُبھارنے کی سعی کریں۔

ہمیں یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ جب تک ہم اپنی قابلیت اور کارپردازی کا عملی ثبوت نہ دیں گے انگریز ہماری قوت کا لوہا نہ مانیں گے۔ محض ہمارے شور و غوغا سے مرعوب نہ ہوں گے۔

سوراج کی منزل مقصود تک پہنچنے کے لئے ہم کو بڑے صبر و استقلال، ایثار اور مسلسل جد و جہد کی سخت ضرورت ہے۔ ہم محض قدیم تمدن کی ازسرنو تقلید سے موجودہ مشکلات کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ اگر ہم دنیا میں معزز اور خود دار قوم بن کر زندہ رہنا چاہتے ہیں تو ہمارا فرض ہے کہ علوم جدیدہ کو حاصل کریں۔ کسی ایک مغربی زبان کو بغیر حاصل کئے ہوئے ہم جدید سائنس کے مفید اختراعات و انکشافات کو نہیں سیکھ سکتے۔ اگر ہم کو سوراج بھی مل جائے تو ہم کو انگریزی یا فرانسیسی یا جرمن زبان کو ضرور حاصل کرنا پڑے گا۔ چین، جاپان، ایران وغیرہ میں مغربی زبانیں حاصل کی جاتی ہیں۔

اس لئے ہم کو چاہیئے کہ ہم مغربی علوم و فنون سے اظہار نفرت نہ کریں اور نہ ان کی تحصیل علم کو قوم پرستی کے منافی سمجھیں۔ موجودہ مشکلات کو پیش نظر رکھتے ہوئے ہم بتدریج سوراج کو حاصل کرنے کے لئے کیا کر سکتے ہیں۔

اول یہ مسلم الثبوت امر ہے کہ جمہوری سلطنت قائم کرنے کے لئے قوم کے افراد میں قدرے تعلیم لکھنے پڑھنے اور قومی فرائض کے سمجھنے کی استعداد پیدا کرنا ضروری ہے۔ یہ اسی وقت ممکن ہے جب ہم اپنے سرمایہ اور وقت کا زیادہ حصہ تعلیم عامہ کی تبلیغ میں صرف کریں۔ ہم نے اکثر موقعوں پر خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ بوجہ جہالت بیچارے غریب کسان اور عوام الناس ہماری سیاسی گفتگو کو مطلق نہیں سمجھ سکتے۔

دوسری کوشش ہمکو سودیشی تحریک کے کامیاب بنانے میں صرف کرنا چاہیے۔ خواہ ہم نرم جماعت سے تعلق رکھتے ہوں، خواہ گرم جماعت کے حامی ہوں۔ ہر ہندوستانی کا فرض ہے کہ جب تک ہندوستان کا بنا ہوا مال ہم کو مل سکے ہم غیر ملک کے بنے ہوئے اشیا کو اپنے اوپر حرام سمجھیں۔ مشترکہ کمپنیاں قائم کریں۔ مردہ حرفتوں کو از سر نو زندہ کریں۔ اپنی ذات پر بھروسہ کرنا سیکھیں۔

تیسرے تنباکو نوشی اور مے نوشی کو یکقلم ترک کردیں۔ اس ذریعہ سے نہ صرف ہماری مفلس قوم کا اخلاق درست ہوگا بلکہ فضول خرچی سے ہم بچ سکیں گے۔

چوتھے پنچایت قائم کریں اور مقدمہ بازی میں اپنی دولت کو برباد کریں۔ یہ وہ ذرائع ہیں کہ اگر ہم ان پر عمل پیرا ہوں تو گورنمنٹ مزاحم نہیں ہو سکتی۔ اس کے علاوہ ہندو مسلمان اپنی اخلاقی، مذہبی اور معاشرتی اصلاح بغیر امداد غیرے کر سکتے ہیں۔ یہی وہ سیدھا راستہ ہے جس پر چلنے سے کچھ عرصہ میں ہم کو سوراج مل جائیگا۔

سیلی صاحب کا بیان ہے کہ انگریزوں نے ہندوستان کو خود ہندوستانیوں کی مدد سے فتح کیا۔ اگر ہندوستانی فوج ان کا ساتھ نہ دیتی تو آج یہ ہندوستان پر حکومت کرتے ہوئے نظر نہ آتے۔ اسی طرح ہم ہندوستانیوں کو چاہیے کہ ہم مغربی طرز حکومت کے اصولوں کو ذہن نشین کریں اور موجودہ طرز حکومت میں اپنے حسب منشا تغیر و تبدل پیدا کردیں۔ ع

بہ مقصود می رسد جو یائے کام آہستہ آہستہ

(مئی ۱۹۲۱ء)

ڈاکٹر تیج بہادر سپرو

سیلف ڈٹرمینیشن
یعنی
حق انتخاب حکومت

تقریباً دو مہینے ہوئے کہ ہوس آف لارڈز میں جب آئینی اصلاحات ہند کے متعلق مباحثہ ہوا تھا تو لارڈ کرزن صاحب نے بھی ایک تقریر منجانب گورنمنٹ فرمائی تھی۔ اس تقریر کے دوران میں جناب ممدوح نے یہ فرمایا تھا کہ یہ غیر ممکن ہے کہ جنگ کی بدولت ہندوستان کے خیالات میں ایک تغیر عظیم واقع نہ ہو۔ یہ خیال نیا نہیں ہے اکثر ارباب الرائے اس دو تین برس کے اندر اسی قسم کے خیالات مختلف پیرایہ میں اور مختلف موقعوں پر ظاہر کر چکے ہیں تاہم ان خیالات کی اہمیت اس سے معلوم ہوتی ہے کہ لارڈ کرزن کے سے آہستہ خرام بلکہ محترم مدبر نے بھی ان تغیرات کے وجود کو تسلیم کیا۔ ہندوستان میں لارڈ کرزن کی طرف سے کسی شخص کو اطمینان نہیں ہے لیکن یہ بھی اکثر لوگوں کو معلوم ہے کہ ان کو اصولاً اصلاحی تجاویز کے عمل پذیر ہونے میں اختلاف نہیں ہے۔ جو اعلان کہ ۲۰ اگست ۱۹۱۷ء کو ہوا تھا وہ جہاں تک معلوم ہے ان کی رضامندی اور اتفاق رائے سے ہوا ہے۔ یہ ممکن ہے کہ ان کے خیال میں جو تجاویز پیش کیے گئے ہیں اور جو اس وقت انگلستان اور ہندوستان میں معرض بحث میں ہیں ضرورت سے زیادہ وسیع ہوں یا جیسا کہ اکثر لوگوں کا خیال ہے کہ ہندوستان کے ضروریات کے لیے قطعی ناکافی ہیں۔ بہرحال ان تجاویز کے متعلق کچھ لکھنا اس مضمون میں مجھے منظور نہیں ہے۔ میں اپنے خیالات ناقص کو چند بار مختلف طریقوں سے اور مختلف موقعوں پر ظاہر کر چکا ہوں مگر ان تجاویز کے سلسلے میں چند اہم سوالات ملک کے سامنے چند اکابران قوم نے پیش کیے ہیں۔ اس بارے میں کچھ لکھنا چاہتا ہوں۔ ان حضرات کی نیک نیتی یا حب الوطنی میں کوئی کلام نہیں ہو سکتا البتہ یہ امر قابل غور ضرور ہے کہ ان معاملات میں کہاں تک

غور و فکر سے کام لیا گیا ہے اور کہاں تک ان میں جوش بے جا یا غلط فہمی کا دخل ہے۔ ایک سوال جو پیش کیا گیا ہے یہ ہے کہ ہر ملک کو یہ اختیار ہونا چاہیے کہ اپنی مرضی کے مطابق جیسی اور جس طرح کی حکومت چاہے ملک میں قائم کرے۔ یہ دعوی پریسیڈنٹ ولسن صاحب کے مشورے اور معروف لفظ "سلف ڈٹرمینیشن" (حق انتخاب حکومت) پر مبنی ہے۔ ممکن ہے میرا خیال غلط ہو مگر جہاں تک کہ میں غور کرتا ہوں اس مسئلہ کو اُن ملکوں سے تعلق نہیں ہو سکتا کہ جہاں کوئی حکومت قائم ہے اور محض اندرونی اصلاحات کا سوال پیش ہے۔ البتہ اگر کسی ملک میں انقلاب حکومت کے آثار پیدا ہیں یا موجودہ حکومت دوسری سلطنت کے حملے سے پامال ہو چکی ہے تو وہاں کے باشندوں کو یہ حق ہو سکتا ہے کہ وہ کہیں کہ پرانی حکومت کے تابع رہیں گے یا فاتح سلطنت کی حکومت کو پسند کریں گے یا یہ کہ وہ اپنی قومی حکومت قائم کریں گے۔ مثلاً افریقہ کی نو آبادیاں جو کہ زیر حکومت جرمنی تھیں یا عراق عرب کہ جو ترکوں کے زیر حکومت تھا اس قسم کا دعوی کریں تو اس کا تعلق سلف ڈٹرمنیشن (حق انتخاب حکومت) کے مسئلہ سے ہو سکتا ہے لیکن اگر فرانس کے مقبوضات مثل مراکش اور تونس یہ کہیں کہ اب ہم فرانس کے تابع نہیں رہیں گے تو یہ محض سلف ڈٹرمنیشن ہی نہیں بلکہ فرانس حکومت کے خلاف علم بغاوت بلند کرنا ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ اندرونی اصلاحات کے معاملے میں ہر ملک کو یہ اختیار ہے کہ اپنی موجودہ گورنمنٹ سے یہ کہے کہ اس کو خاص قسم کی اصلاحات کی ضرورت ہے اور ان اصلاحات کو گورنمنٹ کو قبول کرنا چاہیے تو اس میں شک نہیں کہ یہ حق اس ملک کے باشندوں کو ضرور حاصل ہے اور ہر دانشمند گورنمنٹ ملک کی رائے عامہ کی قوت اور جمہور کے احساسات کو مدنظر رکھنا اپنا فرض عین سمجھے گی لیکن ایسی صورت میں جو نزاعات ہو سکتے ہیں وہ گورنمنٹ اور رعایا کے مابین ہو سکتے ہیں اور اُن کا تعلق کسی اور تیسرے فریق یا غیر سلطنت سے نہیں ہو سکتا۔ ان ملکی نزاعات سے سلف ڈٹرمنیشن (حق انتخاب حکومت) کے مسئلہ کو کوئی تعلق نہیں۔ اگر فرض کیجیے کہ ہمارے سامنے یہ سوال پیش ہوتا کہ آیا ہم انگلستان یا کسی اور قوم سے ملکی تعلق رکھیں گے یا یہ کہ اپنی حکومت بلا واسطہ غیر قائم کریں گے تب ضرور سلف ڈٹرمنیشن کا مسئلہ اس پر عائد ہو جاتا لیکن موجودہ صورت معاملہ کی یہ نہیں ہے۔ اصلاحات کے متعلق اگر ہم کو اعتراض ہے کہ وہ ناکافی ہیں یا ہمارے

مطالبہ سے کمتر ہیں یا ہمارے ملک کی شان اور قدامت کے خلاف ہیں تو یہ تمام اعتراض ہم استحقاقاً موجودہ گورنمنٹ کے مقابلہ میں پیش کر سکتے ہیں۔ یہ دوسرا سوال ہے کہ یہ اعتراضات جائز ہیں یا ناجائز۔ اس کے بابت اختلاف رائے ہونا غیر ممکن نہیں ہے۔ لیکن فرض کیجیے کہ ہم نے گورنمنٹ کی کسی تجویز کو نامنظور نہیں کیا، بلکہ اپنی تجویز کو پیش کیا اور یہ کہا کہ یہی بشکل قانون نافذ ہو جائے۔ ایسی صورت میں بھی بلا گورنمنٹ کے وسیلہ ہم اپنی تجویز کو قانون کا اثر نہیں دے سکتے اگر گورنمنٹ کے وسیلہ کو ہم نظرانداز کر دیں تو گورنمنٹ کا خاتمہ ہو جائے گا اور جو تعلقات آئینی اور قانونی قائم ہیں ان کو کسی اور طریقہ پر نامزد کرنا پڑے گا۔ خلاصہ یہ کہ جب تک کہ موجودہ حکومت قائم ہے اس وقت تک ہم کو استحقاق ہے کہ اس پر اخلاقی طور پر جس قدر چاہیں زور ڈال سکتے ہیں کہ اصلاحات ہماری مرضی کے مطابق ہوں لیکن ہمارا زور اخلاقی زور سے زیادہ نہیں ہو سکتا۔ فی زمانہ جتنی آئینی حکومتیں قائم ہیں وہ بھی اپنا فرض سمجھتی ہیں کہ جہاں تک ممکن ہو سکے رائے عامہ کا لحاظ اور پاس کریں۔ جہاں تک میرا خیال ہے کہ کوئی فریق ہندوستان میں یہ تو کہتا نہیں کہ ہم کو موجودہ حکومت سے قطع تعلق کرنا منظور ہے ہاں البتہ ہر فریق اپنی رائے کے مطابق چند اصلاحات چاہتا ہے اور گورنمنٹ اپنی رائے کے مطابق چند اصلاحات پر عمل کرنا چاہتی ہے جس سے ان اصلاحات کے اوپر نزاع ہونا ممکن ہے مگر سلف ڈٹرمنیشن کے لفظ کو اس پر عائد کرنا میرے خیال میں اس لفظ کو غلط معنی میں استعمال کرنا ہے۔

اگر سلف ڈٹرمنیشن کے معنی وہی ہیں جو ہمارے تیز رفتار مدبروں نے بالعموم سمجھ رکھے ہیں تب اصول کی بحث کو چھوڑ کر چند سوالات اور بھی پیدا ہوتے ہیں۔ ہندوستان میں کس کس فریق کو سلف ڈٹرمنیشن کا اختیار حاصل ہوگا۔ ہندوؤں کو، مسلمانوں کو، سکھوں کو، عیسائیوں کو، پارسیوں کو، زمینداروں کو، کسانوں کو، نیچ ذاتوں کو؟ اور اختلاف رائے ہو تو اس کا تصفیہ کون کرے گا۔ علاوہ بریں اس کا اطمینان کیوں کر ہو کہ عوام الناس جو ابھی ملکی مسائل کے ہر پہلو سے واقف نہیں ہیں وہ تعلیم یافتہ طبقہ کی رائے سے کہاں تک اتفاق کریں گے۔ سب سے بڑا سوال یہ ہے کہ موجودہ حالت میں ہم کو کیا اطمینان ہو سکتا ہے کہ عوام الناس آزادانہ طور پر بلا خوف اپنے سلف ڈٹرمنیشن کو ظاہر کر سکیں گے۔ میرے خیال میں اگر مسئلہ کے ان پہلوؤں پر غور کیا جائے اور محض فوری جوش سے نہ کام لیا جائے تو یہ ظاہر ہو جائے گا کہ

محض اس لفظ کی بنیاد پر اپنی امیدوں کی عمارت کا کھڑا کرنا خالی از خطرہ نہیں ہے۔

عرصے سے میں سُن رہا ہوں کہ اکثر لوگوں کو یہ امید ہے کہ پریسیڈنٹ ولسن ہندوستان کی نجات کا ذریعہ ہوں گے یہ ممکن ہے کہ پریسیڈنٹ ولسن اور امریکہ کا اخلاقی اثر انگلستان اور دیگر ملکوں پر دائرہ آزادی کی وسعت دینے کے موافق پڑے مگر اس کا کیا ثبوت ہے کہ پریسیڈنٹ ولسن کو ہندوستان کے ساتھ خصوصیت سے اُنس ہے اور وہ ہندوستان کی بھی حمایت ویسی ہی کریں گے جیسی کہ بوجوہ مختلف وہ آئرلینڈ کی کریں۔ علاوہ بریں یہ میری سمجھ میں نہیں آسکتا کہ پریسیڈنٹ ولسن اس قدر آمادہ بعند ہو جائیں کہ وہ انگلستان کو دھمکی دیں کہ اگر تم ہندوستان کو قطعاً آزاد نہیں کرنے دیتے ہو تو امریکہ تم سے دوستانہ تعلقات قطع کر دے گا۔ ایسی دریا دلی اور حق پرستی شاید اگلے زمانہ میں ہوا کرتی ہو تو ہو مگر اس زمانہ تو نایاب ہے۔ علاوہ بریں پریسیڈنٹ ہندوستان سے قطعی واقفیت نہیں رکھتے بیچارو ناچار اُن کو ہندوستان کے بارے میں انگلستان سے ہی رجوع کرنا پڑے گا۔ اور کوئی معقول آدمی میرے خیال میں یہ نہیں تصور کر سکتا کہ پریسیڈنٹ ولسن اس بات پر آمادہ ہو جائیں کہ بجائے انگلستان کے خود کوئی اصلاحی تجاویز ہندوستان کے واسطے پیش کریں یا انگلستان کو اس بات پر مجبور کریں کہ تم اپنی تجاویز کو بالائے طاق رکھو اور ہندوستانیوں نے جو تجاویز پیش کیے ہیں اُن کو بلا کم و کاست منظور کرو۔ میرے خیال میں اصلاحی تجاویز کے مباحثہ کو ان باتوں سے مخلوط کر دینا اصل معاملہ کو اُلجھانا ہے اور اپنے واسطے مایوسی کے اسباب پیدا کرنا ہیں۔ اگر ہم بچشم غور دیکھیں تو نہ غیرت قومی اس بات کی متقاضی ہے کہ ہم دوسری قوموں کے سامنے فریادی کی حیثیت سے جائیں ~

حقا کہ با عقوبت دوزخ برابر است
رفتن بپائے مردی ہمسایہ در بہشت

نہ عملی طور پر یہ قرین قیاس معلوم ہوتا ہے کہ اور قومیں کہ جن سے ہم اور ہم سے کوئی قومی مذہبی یا تاریخی واسطہ نہیں وہ ہمارے لیے مفت کا سودا مول لیں۔ نہ میری یہ سمجھ میں آتا ہے کہ برٹش گورنمنٹ دوسری قوموں کے استحقاق مداخلت کو ماننے کے لیے تیار ہوگی۔ البتہ میں اس بات کے ماننے کے لیے تیار ہوں کہ ہم کو قانوناً و اخلاقاً استحقاق حاصل ہے کہ آئینی طور پر جس قدر زور

ہم حکومت پر ڈال سکتے ہیں ڈالیں۔ یہی طریقہ ہمارا پچھلے تیس یا چالیس برس میں رہا ہے۔ اور کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکتا کہ ہم اس میں قطعاً ناکام رہے ہیں۔ یہ ضرور ہے کہ ہماری ترقی اس سے کم عرصہ میں زیادہ پیمانہ پر ہو سکتی تھی مگر باوجود اس کے ۱۸۹۲ء سے لے کر اس وقت تک اگر دیکھا جائے تو اس قدر فرق ہے کہ جن باتوں کو ہم دس یا پندرہ برس پہلے مثل خواب و خیال کے سمجھتے تھے وہ اب ہمارے پیش نظر ہیں۔ شاید ۱۹۰۹ء اور ۱۹۱۰ء میں لارڈ مارلے نے اپنی ایک تقریر میں کہا تھا کہ جہاں تک کہ وہ زمانہ مستقبل پر نگاہ ڈال سکتے ہیں ہندوستان میں کبھی ایسا زمانہ نہیں آئے گا کہ یہاں دستوری یا آئینی حکومت قائم ہو سکے۔ دس برس سے کم میں مسٹر مانٹیگو نے کہ جو اس وقت اُن کے نائب تھے ہمارے دعوے کو تسلیم کر لیا اور اسی کی بنیاد پر اپنے تجاویز پیش کیے ہیں۔ اُن تجاویز کو میں خود خالی از نقص نہیں سمجھتا ہوں لیکن جو لوگ یہ کہتے تھے کہ ہندوستان میں کبھی آئینی حکومت قائم ہی نہیں ہو سکتی اُن کا دعویٰ باطل ہو گیا اور اب کون ہے جو یہ کہہ سکتا ہے کہ آئندہ دس برس میں کیا نہ ہو جائے گا۔

صرف استقلال اور ہمت کی ضرورت ہے۔ محض دور از عقل اور خیالی جنگ و جدل کے سامان مہیا کرنے سے یہ ممکن ہے کہ چند روز کے لیے نوجوان طبیعتیں برانگیختہ ہو جائیں مگر اصلی ترقی کے میدان میں قوم کے قدم نہیں بڑھ سکتے۔

(فروری ۱۹۱۹ء) ●●

جے۔ آر۔ رائے

ہندوستان میں جمہوریت کا آغاز

دورِ جدید اور ہمارا مستقبل

اس امر کا بہت کم لوگوں کو گمان ہوگا کہ سالِ نَو کے آغاز کے ساتھ ہندوستان کی حکومتی تاریخ میں ایک انوکھے باب کی ابتدا ہوتی ہے اور اس دنیا کی تاریخ کے ایک نہایت اہم واقعہ کا آغاز بغیر دھوم دھڑکے اور تزک و احتشام ہوا ہے۔ ۱۹۲۰ء دم دبا کے جب کہ مشرقی دنیا خواب و راحت میں مست پڑی تھی، بغیر شور و غل رخصت ہو گیا۔ اور اس کا جانشین بغیر نمود و نمائش اس کی خالی گدی پر مسلط ہو گیا۔ مشرقی دنیا نے ان دو حکمرانوں کی آمد و رفت کا اپنی عادت قدیمہ کے مطابق ذرا بھی خیال نہ کیا، مگر مغربی دنیا نے اپنے دیرینہ دستور کی رو سے نووارد کی آمد آمد اور پیر فرتوت کی روانگی کو منتظر اور پُرشوق نگاہوں سے دیکھا۔ ایک کو الوداع اور دوسرے کو خوش آمد کہا۔ ہم میں سے اہلِ ہند کے دل میں اس بات کا مطلق خیال نہ گذرا ہوگا کہ اس برق سرعت آمد و رفت کا ہماری سیاسی قسمتوں پر کیسا عظیم الشان اور دوامی اثر ہوگا۔ سالِ نَو آیا۔ ملازموں نے ایک روز کام سے فراغت پائی۔ طلباء نے اسکولوں سے تعطیل اڑائی۔ تجارت پیشہ جماعتوں نے احتیاط کے ساتھ اپنے بہی کھاتہ میں ردوبدل کیا اور ۱۹۲۰ء کے بجائے ۱۹۲۱ء لکھ کر گذشتہ سال کو رخصت اور سالِ نَو کی پیشوائی کی۔ مگر مؤرخوں اور عالموں اور مدبروں کی نگاہوں میں اس آمد و رفت کے عاجلانہ واقعہ میں ایک انقلاب ہندوستان کے لئے وقوع پذیر ہوا کہ جس کا اثر نہ صرف ہندوستان ہی پر ہوگا، بلکہ ایشیا اور دنیا پر بہت گہرا ہوگا۔ تاریخ عالم کے ایک نئے باب کی ابتدا ہوتی ہے۔ آنے والے زمانہ کے مورخین ان اسباب پر دماغ سوزی کریں گے کہ جو اس کے مخرج اور محرک سمجھے جاتے ہیں۔ اس مضمون کا مقصود اولیٰ ان واقعات اور نتائج پر بحث کرنا نہیں ہے کہ جو تاریخِ عالم میں شروع میں باطل و ادنیٰ سمجھے گئے تھے، مگر بعد ازاں ان کے باعث رفتار زمانہ کا رخ ہی

پلٹ گیا۔ ماہ جولائی ۱۷۸۹ء میں پیرس شہر کے شوریدہ پشتوں اور شہریوں نے شورش کی۔ یہ ایک معمولی بات تھی۔ مگر اس وقت اس کا گمان کتنے آدمیوں کو تھا کہ یہ انقلاب فرانس ملک فرانس میں صدیوں کی مطلق العنان سلطنت اور امراء کے جابرانہ دستور کے خلاف غصہ کا سیلاب اور یورپ میں جمہوریت کی تخم ریزی کی ابتدائی کارروائی ہے۔ نپولین توپ خانہ کا ایک ادنیٰ افسر تھا۔ ۱۷۹۴ء میں ڈائرکٹری فرانس کا اول قونصل اور پھر جمہوری شہنشاہ بن گیا۔ دنیا کا سب سے بڑا جرنیل اور سپہ سالار اور یورپ میں جمہوریت کو سب سے زیادہ آشنا دینے والا اور پرانی حکومتوں کا دشمن ثابت ہوا۔ پلاسی کا معرکہ معمولی لڑائی تھی۔ مگر اس وقت کس کو یہ خیال تھا کہ یہ ایک فیصلہ کن جنگ ہے اور اس کے باعث تاریخ ہند پر کیسا اثر ہوگا۔ غرض اس قسم کے بیسیوں واقعات تاریخ عالم میں ایسے ہیں کہ جو ابتدا میں حقیر اور ناچیز سمجھے جاتے تھے، مگر بعد ازاں ان کا اثر دنیا پر بہت گہرا ہوا۔ حال کا واقعہ لیجئے۔ ۲۸ جون ۱۹۱۴ء کو آسٹریا کے صوبہ ہرزی گوینہ اور بوسینیا کے دارالصدر میں آسٹریا کا ولی عہد آرچ ڈیوک فرانس اور ان کی بیگم صاحبہ ماری گئیں۔ اس وقت کس کو یہ خبر تھی کہ یہ تاریخ عالم کے سب سے بڑے ہنگامہ اور بے نظیر جنگ عظیم کا بانی ہوگا۔ ساڑھے چار سال تک دنیا کے مہذب ترین حصہ پر خوب کشت و خون ہوئے۔ آخری فتح ایک سے زیادہ مرتبہ ترازو میں لرزتی رہی۔ اسی طرح ۱۹۲۱ء کا آغاز خاص کر ۹ فروری کا دن تاریخ ہند کے انوکھے باب اور واقعات کا پیش خیمہ ہے۔ ہندوستان کی پارلیمنٹ کا افتتاح برطانیہ کے شاہی خاندان کے سب سے معمر اکسی لعلیٰ ہز رائل ہائینس ڈیوک آف کناٹ کے دست مبارک سے ہوا۔ گویا برطانیہ نے اپنے نصف صدی سے زائد وعدے کو عرفہ العین میں پورا کر دیا اور اہل ہند کی حسب خواہش نیابتی حکومت کا معتد بہ حصہ عطا کر دیا اور آئندہ کے وعدوں کی ضمانت اس قانون میں دے دی گئی کہ جو ۱۹۱۹ء میں پاس ہوا تھا۔ ۹ فروری کو دورِ جدید کی ابتدا ہوئی۔ یہ دور تمام سابقہ دوروں سے نرالا ہوگا۔ انگریزی راج کا پہلا مطلق العنان حکومت کا تھا کہ جس کے دوران میں اہل ہند کے حسب منشا نہیں بلکہ حکام کے حسب منشا حکومتی پالیسی ترتیب و ترکیب پاتی رہی۔ اس دور کا خاتمہ بالخیر ہو لیا اور دوسرے دور کا آغاز مبارک ہوا کہ جس کے دوران میں جمہور ہند کی مرضی حکومت میں غالب رہے گی۔ ۹ فروری کا دن اس وجہ سے تاریخ میں مشہور و ممتاز رہے گا کہ اس دن ہندوستان میں جمہوری حکومت کی ابتدا ہوئی۔ اہل ہند کو وہ نعمت حاصل ہوئی جس سے وہ صدہا سال سے محروم تھے۔ اہل ہند کو ذری آزادی میسر آئی۔ اہل ہند کی جو مشکل حقیقی تقسیم کی گئی۔ اہل ہند

کی نصف صدی کی سیاسی کشاکش بارآور ثابت ہوئی اور ان کی تمنا پوری ہوئی۔ دادا بھائی نوروجی مرحوم بزرگ ہستی ہند کر جن کی مساعی حسنہ اور نیک نظر سے ہندوستان کی پولٹیکل زندگی میں انقلاب عظیم پیدا ہوا۔ اور وہ لوگ جو دادا صاحب کے ساتھ اہل ہند کے لئے خاص مراعات کے طلبگار تھے۔ ان کی روحوں کو اب تسکین ہوئی ہوگی کہ ان کی دردبھری محنت رائیگاں نہ گئی۔ اس تمہید کے بعد اب ہم اپنے مضمون کی طرف رجوع ہوتے ہیں۔

سب سے پہلے مناسب ہے کہ اس بات پر غور کیا جائے، آیا جمہوریت ہندوستان کے واسطے غیر ہے۔ بعض بنگالی محقق اور علماء چند سال سے اس بات کے ثابت کرنے کی کوشش کر رہے ہیں کہ قدیم ہندوستانی جمہوریت سے ناآشنا نہ تھا۔ پرانی کتابوں کی چھان بین کی گئی ہے اور ان میں بعض محاورات ایسے پائے جاتے ہیں جن کی تعبیر اور تشریح ایسے طور پر کی جاتی ہے کہ جمہوریت کا گمان ہوتا ہے۔ ہم اس مسئلہ پر بحث کرنے کو تیار نہیں ہیں کیونکہ اس کے لیے جداگانہ مضمون درکار ہوگا۔ اور یہ بحث موجودہ مقصد سے سراسر خارج ہے۔ فقط یہی کہنا ہے کہ ہندوستان مشرقی دنیا میں واقع ہے اور ایشیا میں شروع ہی سے مطلق العنان اور شخصی حکومت رائج چلی آتی ہے۔ ہندوستان میں بھی جب سے معتبر تاریخ شروع ہوئی ہے، شخصی حکومت چلی آتی ہے۔ ایسے نشانات اصول اور طریقہ حکومت میں نہیں پائے جاتے کہ جس سے جمہوریت کا گمان ہو۔ مقامی حکومت چاہے کیسی ہو مگر مرکزی حکومت جمہوری طریقہ کی کبھی رائج نہ ہوئی تھی۔ مورخوں کے نزدیک بابل کی تہذیب سب سے پرانی ہے اور وہاں سنہ عیسوی سے چار ہزار پہلے باضابطہ شخصی حکومت قائم تھی۔ دو تین سال ہوئے کہ شہر بواس کے کھنڈر برآمد ہوئے جو قیصریہ مغرب میں واقع تھا۔ جسے آسوریوں اور بابلیوں نے بسایا تھا۔ وہاں سے خشتی لوحیں برآمد ہوئیں۔ ان سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ بواس اور اس کے قرب وجوار کے لوگ بادشاہ بابل کو خراج دیتے تھے مگر مقامی حکومت جمہوری تھی۔ باشندے اپنے اعمال کارکرد اور منتخب خود بذریعہ انتخاب مقرر کر دیا کرتے تھے۔ اس کے سوا ایشیا میں ابھی کسی اور جگہ جمہوریت کے آثار نمایاں نہیں ہوئے تھے۔ قصہ کوتاہ یہ ہے کہ ایشیا عظیم الشان حکومتوں کا مسکن ہے اور شروع ہی سے شخصی حکومت چلی آتی ہے۔ ہندوستان عام قاعدہ سے مستثنیٰ نہیں ہو سکتا۔ مگر ہندوستان میں ایک بات عرصہ سے دیکھنے میں آتی ہے اور وہ پنچایت ہے۔ یہ صدیوں سے رائج ہے۔ یورپی مورخوں اور عالموں کو اس میں جمہوریت نظر آتی ہے۔ بلکہ سرہنری مین نے یہ بیان کیا ہے کہ ہر ایک گاؤں بجائے خود چھوٹی سی جمہوری حکومت تھا اور دوسروں کا محتاج نہ تھا۔ اپنی جملہ ضروریات کا خود انتظام کرتا تھا۔ پنچایت اب بھی ہے مگر

جو صورت پرانے زمانہ میں تھی وہ بدل گئی ہے۔
ہندوستان کے دیہات اور ملکوں کے گاؤں سے مختلف واقع ہوئے ہیں، جو یہاں کے لوگوں کے خیالات اور روایات کے مطابق ہیں۔ دوسرے ملکوں کے گاؤں اس ملک سے نرالے واقع ہوئے ہیں۔ لیکن گاؤں یا قصبہ کے جمہوری انتظام سے یہ نتیجہ نہیں نکل سکتا کہ وسطی حکومت بھی جمہوری تھی۔
جمہوریت کی ابتدا مغرب میں ہوئی تھی اور تاریخِ عالم سے یہ ثابت ہے۔ سرزمین یونان کے باشندے قومیت کے دلدادہ تھے۔ یہ ملک اس تاریک اور دور افتادہ زمانہ میں کئی چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں منقسم تھا۔ اور سپارٹا سب سے زیادہ مشہور تھا۔ وہاں کے باشندے بہادری اور جرأت میں ضرب المثل تھے۔ ان کے نمونے کا اثر باقی ہمسایہ ریاستوں اور قوموں پر بھی بہت ہوا کہ جس سے تمام یونان میں شجاعت کی لہر بہنے لگی۔ لیونی داس اور اس کے تین سو جواں مردوں کا ایثار درہ تھرمالپی سارے جہان میں مشہور اور وطن پرست بہادروں کے واسطے اشتیاق حریت کا بہترین نمونہ کہا جاتا ہے۔ دنیا کا سب سے پہلا فیصلہ کن معرکہ مراتھون کا سمجھا جاتا ہے۔ تھی بھر مگر بہادر یونانیوں نے اپنے کاروان اور آزادی کے دیوتا سپہ سالار ملطیہ داس کے زیر کمان ۴۹۰ ق م میں میدان مراتھون میں نہایت شاندار کامیابی حاصل کی اور ایرانی سپاہ کو مار کر ایسا ہراساں کیا کہ پھر اسے یونان کو زیر کرنے کا حوصلہ بھی نہ ہوا۔ گو ایران بہت شاندار اور وسیع سلطنت تھی۔ ایشیائے کوچک پر اس کا تسلط ہو چکا تھا اور مشرق کی طرف بھی پھیل گئی تھی۔ دارا کا لشکر کاروان اور شمار میں ملطیہ داس کے وطن پرست بہادروں سے کئی گنا زیادہ تھا۔ مؤرخوں کا بیان ہے کہ دس ہزار بہادر قومی آن رکھنے کو تیر اور تبر لے کر مراتھون میں اُترے تھے۔ ایک لاکھ ایرانی تھے۔ مگر یونانی جنرل کی ہنرمندی سے دس ہزار بہادر ایک لاکھ سپاہ کے لیے بھاری ہو گئے۔ تھرمالپی کا زمانہ تین سو آدمیوں کی بہادری کا خانہ تھا کہ جس نے کئی ہزار ایرانیوں کے دانت کھٹے کیے تھے۔ مطلب یہ ہے کہ یونان کے لوگ قدیم زمانے میں بڑے آزادی پسند اور دلاور واقع ہوئے تھے۔ گو یہ ملک ہمارے دو بڑے بڑے اضلاع سے بھی چھوٹا تھا (اور اب بھی ہے) تاہم وہاں پر کئی خود مختار ریاستیں تھیں۔ ان کا کوئی بادشاہ نہ تھا۔ جمہوری طریقہ پر ہر ایک صوبہ کا انتظام تھا۔ افلاطون نے اپنی "ری پبلک" (جمہوریت) اور ارسطو نے اپنی "پلے ٹکس" (حکومت) میں فنِ حکومت سے بحث کی ہے۔ جس سے بالواسطہ بھی نتیجہ پیدا ہو سکتا ہے کہ اس کے سامنے اپنے ملک کا جمہوری انتظام تھا۔ مگر اس میں کچھ نقص تھے اس وجہ سے اس حکیم نے اپنی سمجھ کے مطابق قابل نمونہ حکومت قائم کرنے کے باب میں دماغ سوزی کی۔

اور یہ فیثاغورث کی کتاب وجود میں آئی۔

روما کی حکومت بھی شروع میں جمہوری تھی اور کچھ عرصہ تک رہی اور پرانے زمانہ میں روما کی حکومت جمہوری نہایت مشہور اور با اقتدار تھی۔ گویا یونان کی جمہوری حکومت کے بعد اسے سب سے زیادہ فروغ نصیب ہوا۔ شہر کارتھیج روما کا حریف تھا، وہاں پر بھی جمہوری حکومت تھی۔ اس نے روما کو زیر کرنے کیلئے بڑی کوشش کی۔ ایک دوسرے پر بڑے بڑے حملے ہوتے رہے۔ ہنی بال کا کارنامہ پرانے زمانہ میں جرنیلوں میں سب سے زیادہ مشہور ہے۔ جب نپولین نے مصر سے واپس جاکر آسٹریا والوں سے دوسری جنگ کی اور بھرے جاڑے میں کوہستان الپس کو روند کر آسٹریائی سپاہ کے عقب پر جا پڑا اور اپنے اس کارنامہ کو ہنی بال کے کارنامہ سے تشبیہ دی تھی کہ جو جبل الطارق (جبرالٹر) کو عبور کرکے ہسپانیہ کے جنوب مشرقی اور فرانس کے جنوبی ساحل کے ساتھ ساتھ شمالی اٹلی میں جا نکلا اور پھر سیلاب کی طرح روما پر جا گرا۔ نپولین نے مرنگو کے میدان میں اپنی لاثانی سپہ سالاری کا جھنڈا قائم کرکے تمام یورپ کو ہراساں کیا تھا۔ رومن جمہوری حکومت اس اعتبار سے تھی کہ اس کا کوئی بادشاہ نہ تھا اور حکومت کے کاروبار سینیٹ انجام دیتی تھی کہ جس میں روما کے مقتدر شہری شریک ہوتے، قانون بناتے اور دیگر حکومتی مہمات طے کرتے تھے۔ مگر ملک گیری کے عام مرض میں وہ بھی مبتلا تھے۔ اس وجہ سے رومن سپاہ دور نزدیک جاتی اور اغیار کو زیر کرکے جشن مناتی تھی۔ رومیوں کی جمہوریت کچھ عرصہ کے بعد شاہیت میں جذب ہوگئی اور یورپ کے باقی ملکوں کے لئے نمونہ اور تحریک نابود ہوگئی۔ اس کے بعد کچھ عرصہ تک یورپ میں شاہ پرستی کا جبر اور اقتدار رہا۔ جمہوریت کے نام لیوا مٹ گئے۔ کئی صدیوں کے بعد پھر سرزمین اٹلی میں جمہوریت کی ابتدا ہوئی، جس کا ذکر سسمنڈی نے اپنی تاریخ میں اس قدر تفصیل اور خوبی سے کیا ہے۔ مگر قرون وسطیٰ میں وینس کی جمہوریت سب پر ممتاز سمجھی گئی تھی، جو وہاں کے سوداگروں نے قائم کی تھی اور اسے سب سے زیادہ عروج اور اقتدار نصیب ہوا تھا۔ انگلستان میں تھوڑے عرصہ کے بعد آلیور کرام ویل نے جمہوری حکومت قائم کردی تھی۔ مگر اس کے انتقال کے بعد پھر شاہی خاندان بحال ہوگیا اور جمہوریت مٹ گئی۔ لیکن اصل یہ ہے کہ یونانیوں اور رومیوں کی وراثت سیکسن قوم کو ملی تھی کہ جس کے افراد حریت کے شیدا اور ہر قسم کے حکومتی جبر سے دور بھاگتے تھے۔ ان کے یہاں نہایت سادہ قسم کی جمہوریت تھی۔ ان کی مجلس یا پنچایت ملک کا انتظام کرتی تھی، جو وٹ تلوع موٹ کہلاتی تھی۔ برٹش پارلیامنٹ اس سے نکلی تھی۔ کیونکہ سیکسن نسل کے لوگ انگلستان میں جا بسے، تو وہ اپنے ساتھ اپنے

رسم و رواج اور عادات اور خیالات بھی لیے گئے۔ سب سے پہلے وہاں کے جاگیرداروں (بیرنوں) نے آزادی کے لئے ہاتھ پاؤں مارے اور اپنے بادشاہ جان کو مجبور کیا اور جون ۱۲۱۵ء کو رنی میڈ میں میگنا چارٹا یعنی آزادی کا پروانہ لکھوایا۔ اس کی تصدیق اور تائید اب تک ۳۰ مرتبہ کر چکی ہے۔ اس کی منجملہ دیگر قراردادوں کے ایک یہ ہے کہ کسی آزاد شہری کو اس کی آزادی اور حقوق شہریت سے محروم نہ کیا جائے تاوقتیکہ ملکی قانون مروجہ کے مطابق اسے آزادی سے محروم کرنے کی خاص وجوہات نہ دیکھیں۔ دوسری قرارداد یہ تھی کہ باشندگان ملک کی جان و مال کی آزادی قائم رکھی جائے۔ ہاؤس آف کامنز یعنی دارالعوام ۱۲۵۸ء میں قائم ہوا تھا کہ جس میں رعایا کے نمائندے لیے گئے تھے۔ اس اعتبار سے یہ دنیا کی سب سے پہلی پارلیمنٹ تھی اور جمہوریت نے اس سینیٹ کی طرح انگلستان میں کئی سو سال کے بعد جنم لیا تھا۔ اس نے جو اقتدار حاصل کیا ہے وہ کئی سو سال کے بعد نصیب ہوا ہے۔ برٹش پارلیمنٹ ہی دنیا کے پانچویں حصہ پر حکمران اور سلطنت برطانیہ کا حقیقی حکمراں ہے۔ کیونکہ تمام قوانین، ضوابط، اعلانات وغیرہ پارلیمنٹ بناتی ہے۔ گو بادشاہ ہے، مگر وہ صرف دستخط کرنے کے واسطے ہے۔ اسے کوئی اختیار نہیں کہ وہ اپنی مرضی کے مطابق کام کرے۔ اس کے جملہ اختیارات کی بخوبی تشریح کر دی گئی ہے۔ گو یہ شاہی حکومت کہی جاتی ہے مگر اسے "محدود الاختیار شاہی" کہتے ہیں اور دوسرا نام "تاجدار جمہوریت" ہے۔ جو اختیارات حکومت برٹش پارلیمنٹ کو حاصل ہیں وہ شاید دنیا کے کسی اور نیابتی مجلس کو حاصل نہ ہوں گے۔ اسی وجہ سے تمام مہذب ملکوں نے برطانیہ کے آئین کی نقل کی ہے۔ اٹلی، ہالینڈ، ڈنمارک، سویڈن، ناروے وغیرہ کی حکومتیں برطانیہ کے نمونہ پہ قائم ہوئی ہیں۔

فرانس میں جمہوریت نے اٹھارہویں صدی میں جنم لیا تھا۔ فرانس کے عقل پرست اس کے بانی اور محرک تھے۔ خاص کر روسو کی کتابوں سے مساوات کا خیال پیدا ہوتا تھا۔ فرانس میں اُمرا اور بادشاہ کا اختیار مطلق العنانی تھا۔ عوام غلاموں سے بدتر تھے۔ جو لوگ جمہوریت سے تحریک پذیر ہوئے انہوں نے اہل فرانس کو یہ امر ذہن نشین کرا دیا کہ ان کی پست حالی اور غربت کا اصل باعث اُمرا ہیں۔ کہ جنہوں نے زمینوں پر قبضہ کر رکھا ہے اور سرکاری عہدے بھی ان ہی کے لئے مخصوص ہیں۔ چنانچہ عوام کے دلوں میں اُمرا کے خلاف زہر بھر گیا۔ آخرکار یہ پھوٹ نکلا۔ جولائی ۱۷۸۹ء میں جمہور پیرس شاہی محل پر جا چڑھے۔ یہ انقلاب فرانس کا آغاز اور فرانس میں جمہوری حکومت کی ابتدا تھی۔ کئی برسوں تک کشت و خون ہوتا رہا۔ انقلاب فرانس کے

کہ نظام تمام دنیا میں مشہور ہیں۔ مگر اسے نپولین بوناپارٹ کی بدولت استقلال نصیب ہوا اور یورپ میں مساوات کا خیال پیدا ہو گیا جس سے اُمرا اور تاجدار دونوں گھبرا گئے۔ آخر کار انہوں نے نپولین کو فرانس سے نکال کر دم لیا۔ لیکن جو تخم ریزی کی گئی تھی وہ آخر کار پھل لائی۔ چند سال بعد دوسری جمہوری حکومت قائم ہوئی۔ پھر ۱۸۷۲ء میں تیسری مرتبہ قائم ہو گئی اور وہ اب تک بدستور چلی آتی ہے۔ فرانس کے بعد یورپ میں سوئٹزرلینڈ کی جمہوری حکومت مشہور ہے۔ مگر انیسویں صدی میں جمہوریت کو سب سے زیادہ فروغ نصیب ہوا تھا۔ یورپ اور امریکہ دونوں براعظم میں اس کا رواج ہو گیا ۱۸۴۸ء کا سال تاریخ یورپ میں سب سے زیادہ عجیب ہے کہ جب ایک ساتھ تمام یورپ میں انقلابی تحریک پیدا ہو گئی۔ فرانس میں دوسری بار جمہوری حکومت قائم ہوئی کہ جس کا پریسیڈنٹ لوئی نپولین منتخب ہوا تھا۔ اسی سال روما میں بھی جمہوریت کا اعلان کیا گیا تھا۔ مگر اس صدی کے اختتام کے وقت یورپ میں صرف دو جمہوری حکومتیں اور کئی محدود الاختیار بادشاہتیں اور روس ترکی میں شخصی مطلق العنان حکومتیں پائی گئی تھیں۔ مگر نئی دنیا کی داستان نرالی ہے۔

نئی دنیا میں سب سے پہلی جمہوری حکومت اضلاع متحدہ امریکہ میں قائم ہوئی تھی کہ جسے برطانیہ کے باشندوں نے آباد کیا تھا۔ چونکہ وہ اپنے آبائی ملک سے تمدنی خیالات لے کر گئے تھے۔ اس وجہ سے حریت کا مادہ ان کے رگ و ریشہ میں پایا جاتا تھا۔ جب برطانیہ کی جابرانہ حکومت کا بوجھ نہ اٹھا سکے، تو اسے اٹھا کر پھینک دیا۔ اور اپنی آزادی کا اعلان ۴ جولائی ۱۷۷۶ء میں کر دیا۔ پھر پانچ چھ برس تک نوآبادکار برطانیہ سے برسرِ پرخاش رہے۔ آخر کار برٹش پارلیمنٹ نے امریکہ کی آزادی تسلیم کر لی۔ جنوبی امریکہ میں ہسپانیہ اور پرتگال کے نوآبادکار آباد ہوئے تھے۔ کچھ عرصہ کے بعد ۱۹ویں صدی میں شمالی اور جنوبی امریکہ میں جمہوری حکومتیں قائم ہو گئیں۔ صرف برازیل میں پرتگال کے شاہی خاندان کا ایک رکن جا کر حکمران بن گیا تھا۔ مگر وہاں پر بھی بعد ازاں جمہوری حکومت قائم ہو گئی۔ اب نئی دنیا سب سے زیادہ جمہوری حکومت کا گھر ہے۔ پرانی دنیا میں یورپ بھی جمہوریت کا شیدا پایا جاتا ہے۔ مگر ایشیا ہنوز شاہ پرستی کا دلدادہ اور مطلق العنان حکومتوں کا مسکن ہے۔ زمانہ حال میں ایشیا میں جمہوریت کا آغاز جاپان میں ہوا تھا۔ مکاڈو نے اپنی خوشی سے اپنے شخصی اختیارات سے دست برداری اختیار کی اور جمہور کے نمائندوں کو حکومت کا حصہ چند ہی سال میں انقلاب سے نہایت مفید نتائج برآمد ہوئے۔ ٹرکی میں بھی یہی دیکھنے میں آیا تھا کہ اوائل خود اپنی رعایا کی حالت سدھارنے کا

خواہاں تھا اس وجہ سے وہ آزاد ہی نہ ہوئی بلکہ اس نے تمدن میں نہایت شاندار ترقی کر لی۔ تقریباً نصف صدی کے بعد اہل ایران کو یورپ کی دیکھا دیکھی جاپان کی ایسی ایسی کرنے کا خیال پیدا ہوا۔ جن نوجوانوں نے مغرب کی یونیورسٹیوں میں تعلیم پائی تھی انہوں نے شخصی حکومت کو تہ و بالا کرنے کا مصمم ارادہ کر لیا اور ۱۹۱۶ء میں انقلاب ایران ۱۹۰۸ء میں نوجوان ترکی نے سلطان عبدالحمید کو برطرف کر کے محدود الاختیار آئینی حکومت قائم کر لی اور چار سال بعد چینی انقلاب پسندوں نے صدیوں کے پرانے حکمراں خاندان مانچو کے آخری جانشین کو تخت سے اتار اور خالص جمہوری حکومت قائم کر لی۔ یہ ایشیا کی پہلی جمہوری حکومت ہے۔ جاپان، ایران اور ترکی کی نئی حکومتیں نیم جمہوری اور آئینی ہیں۔

بیسویں صدی کی دنیا کا عقیدہ تمدنی اور سیاسی جمہوریت ہے۔ اسے انیسویں صدی میں بہت رواج حاصل ہوا تھا اور اٹھارہویں صدی میں اس کی ولادت ہوئی تھی۔ اب انقلاب حکومت جمہوریت کے ہم معنی ہے۔ کیونکہ جب پرانی حکومت کو تہ و بالا کیا جاتا ہے تو اس کی جگہ جمہوری حکومت قائم کی جاتی ہے۔ جمہوریت حریت، قومیت، وطنیت، ترقی اور خوشحالی کی مترادف ہے۔ جزائر فلپائن میں حال ہی میں جمہوری طریقۂ حکومت رائج کی گئی ہے۔ اس سے پیشتر چینیوں نے بھی پرانی حکومت پر جمہوریت کا پیوند لگایا۔ مارچ ۱۹۱۷ء میں اب سے چار سال پہلے روسی قوم پرستوں نے بھی جب مہذب دنیا کی آخری مطلق العنان حکومت کو تہ و بالا کر کے جمہوری حکومت قائم کی تھی اور اب جنگ کے بعد جرمنی اور اس کی باقی ماندہ ریاستوں نے بادشاہوں کو ملک بدر کر دیا اور ان کی جگہ پر نیابتی حکومت قائم کر لی۔ آسٹریا اور ہنگری میں بھی شاہی حکومت کے بجائے جمہوری حکومت قائم ہو گئی ہے۔ برخلاف اس کے شریف مکہ شاہ حجاز اور اس کے بیٹے دو اور ملکوں کے بادشاہ مانے جاتے ہیں۔ آرمینیا اور کاکیشیا میں بھی جمہوری حکومتیں قائم ہو گئی ہیں۔ ترکستان وسطی ایشیا، شیام، تبت وغیرہ کی حکومتیں پرانے فیشن کی ہیں۔ ان میں انقلاب واقع نہیں ہوا ہے کیونکہ وہاں کے لوگ زمانہ حال کی ترقی اور اصلاح اور روشنی اور تعلیم سے ہنوز بے بہرہ ہیں۔ مگر شیام کے نوجوان یورپ میں تعلیم پانے کو جاتے ہیں۔ جب ان کی تعداد کافی ہو جائے گی تو وہ غالباً جمہوری حکومت قائم کرنے کی کوشش کریں گے۔ گویا اس زمانہ میں جمہوریت کا بول بالا ہے اور واقعی بات یہ ہے کہ صدیوں کے تجربے کے بعد اب یہی طریقۂ حکومت مفید ترین ثابت ہوا ہے اور حکومت کے ارتقا کو جو مرحلے پیش آئے ہیں اس کا آخری مرحلہ یہی جمہوریت تھا۔ حکومت کی اور کوئی صورت ایسی نہ تھی کہ جو ارتقائے تمدن میں اس منزل پر رونما ہوتی کہ جسے عوام شرف قبولیت عطا کر کے دیوی بنا کر پوجتے۔ شاہ پرستی اور دیگر صورتوں

وہ مقصد حاصل نہیں ہوتا جو حکومت کا اصل منشا ہے۔ حکومت کے ارتقا ہی سے یہ ظاہر ہے کہ یہ صورتیں ناکام ثابت ہوئیں وہ تمدن کے رفتار کے ساتھ قدم نہ بڑھا سکیں۔ اس وجہ سے پیچھے رہ گئیں اور ضروریات زمانہ سے دوسری صورت پیدا ہو گئی۔ صدیوں کے تجربے کے بعد جمہوری طریقہ حکومت نے سب سے زیادہ نیک نامی اور ہر دلعزیزی حاصل کر لی۔ نیابتی حکومت اس کا دوسرا نام ہے۔ اسے کئی قسم کی دشواریوں سے دوچار ہونا پڑا۔ سیکڑوں برس کی ترقی کے بعد اسے یہ مقبولیت حاصل ہوئی ہے۔ جمہوریت کو کس طرح یہ فروغ حاصل ہوا اور حکومت کی صورتیں کس طرح انقلاب قبول کرتی چلی آئی ہیں اس کا مختصر تذکرہ خالی از لطف نہ ہوگا۔

حکومت کا کیا مقصود ہوتا ہے اور وہ کس طرح پورا ہو سکتا ہے۔ یہ سوال اس سارے مضمون کی جان ہے اور فلسفۂ سیاسیات اسی کے سلجھاؤ کے لئے مخصوص ہے۔ حکومت کی ابتدا خاندان کے سرگروہ کے ساتھ ہوتی ہے۔ اس لحاظ سے خاندان ایک ننھی سی حکومت ہے۔ کیونکہ اس کی ضروریات اور اہتمام وسیع پیمانہ پر سلطنت کہلاتی ہے۔ فرق صرف مردم شماری کا ہوتا ہے۔ خاندان میں صرف چند اشخاص ہوتے ہیں سلطنت میں اس سے ہزاروں گنا زیادہ پائے جاتے ہیں۔ اگر خاندان کا سرگروہ زبردست شخصیت کا آدمی اور جہاد کی سے تحریک پذیر ہو تو وہ چند خاندانوں کا لیڈر بن جاتا ہے۔ ابتدا میں چند خاندان قبیلہ میں شامل کیے جاتے تھے۔ اور اب بھی افریقہ اور وسطی ایشیا اور سرحد ہند پر ایسے قبائل ہزاروں کے شمار میں پائے جاتے ہیں جو خون کے رشتے سے باہم گر وابستہ ہوتے ہیں۔ اگر قبیلہ کی اصلیت پر غور کیا جائے تو ظاہر ہوتا ہے کہ کچھ عرصہ پیشتر اس کا جد امجد ایک تھا۔ پس ایک خاندان کا زبردست گروہ بعض اوقات سارے قبیلہ پر اور اگر اس سے بھی زبردست ہو تو کئی قبائل پر جو اس کے ارد گرد رہتے ہیں حکمراں بن جاتا ہے۔ سردار قبیلہ چند قبائل پر حکمراں ہونے کی وجہ سے سردار یا حکمراں کہلاتا ہے۔ مگر جب کوئی بہت ہی زبردست آدمی دس بیس قبائل کے بجائے سیکڑوں قبیلوں اور لاکھوں آدمیوں پر حکمراں ہو، تو وہ بادشاہ کے نام سے ملقب ہوتا ہے۔ حکومت کی ابتدائی صورت شخصی اور مطلق العنان تھی، اسے شاہی حکومت کہتے ہیں۔ یہ شروع میں سب سے زیادہ مقبول اور مشہور تھی۔ اس طریقۂ حکومت کا مقصود خود غرضی تھا۔ چونکہ اس کا مدار شخصی غلبہ اور تحکم پر تھا۔ اس وجہ سے حکمراں اپنی رعایا کو اپنے مقاصد کے حصول اور راحت و آرام کے اسباب مہیا کرنے کا وسیلہ سمجھتا تھا۔ اسی وقت تصور حکومت یہ تھا کہ رعایا بادشاہ کی کامرانی کے واسطے ہے۔ لیکن جب تمدن میں ترقی ہوئی تو خیالات نے پلٹا کھایا۔ بعض خطوں کے لوگ بڑے زبردست اور آزادی پسند واقع ہوئے تھے۔ انہوں نے کسی خاص سردار

یا حکمران کی اطاعت سے گریز کیا اور اپنے معاملات کا انتظام اپنے ہاتھ ہی میں رکھا۔ اس قسم کے لوگ سپارٹا میں تھے اور بعد ازاں روما میں بھی پائے گئے اور کارتھیج کے باشندے بھی اسی قسم کے واقع ہوئے تھے۔ شخصی حکومتوں میں ایک استثنا بھی تھا اور وہ امرائی حکومت تھی۔ مگر اسے شاہی حکومت کی طرح عروج و قبولیت عامہ حاصل نہ ہوئی۔ شخصی حکومت سے جمہوری حکومت میں منتقل ہونا صرف ایک ہی قدم تھا۔ مگر یہ سوائے یونان، روما اور کارتھیج کے اور کسی جگہ اقتدار نصیب نہ ہوا۔ لیکن شاہی حکومت شروع میں ملک بابل میں تھی کہ جس کی معتبر تاریخ خشتی تحریروں اور رخط میخی کے کتبوں سے چار ہزار سال سنہ عیسوی سے پہلے کی ثابت ہوتی ہے۔ وادی مغرب میں ایک کتبہ چند سال ہوئے پایا گیا تھا اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مصر کا پہلا بادشاہ ہنس ۴۴۰۰ ق۔م میں تھا۔ آسوریہ بابل کا حریف اور ہمسر تھا۔ وہاں پر بھی صدہا سال تک شاہی حکومت رہی۔ ایران اور مغربی ایشیا شاہی حکومتوں کے مسکن تھے۔ اہل چین کی تاریخ ہندوؤں کی طرح قدامت کی دبیز ظلمت میں مستور ہے اس سے چین کے پرانے بادشاہوں کا پرانا سلسلہ اسی طرح نمایاں ہے کہ جس طرح براسیکا نے بابل اور مصر کے بادشاہوں کا شجرۂ نسب مرتب کر کے سیکڑوں بادشاہ ان ممالک میں حکمران بنا دیے۔

ابتدائی مقصد حکومت خود غرضانہ تھا۔ کیونکہ حکمراں ایک فرد واحد تھا وہ اپنے محکوموں کو اپنے غلام اور اپنی راحت کے اسباب مہیا کرنے والے سمجھتا تھا۔ فرمانروا بادشاہ اپنا فرض یہ نہ سمجھتا تھا کہ اپنی رعایا کی بہتری کا خیال رکھے۔ اسے اپنے تاج و تخت کی حفاظت کی فکر دامنگیر رہتی تھی اس وجہ سے رعایا اس کی حفاظت کا کام لیا کرتا تھا مگر تمدنی ترقیوں کے ساتھ ساتھ ذہن کے افق نے بھی وسعت اختیار کی۔ اور تصور حکومت نے پلٹا کھایا۔ اہل فکر اور آزادی کے شیدائیوں کو یہ بات گوارا نہ ہوئی کہ ایک فرد واحد کے لیے سب کچھ ہو۔ لاکھوں آدمی ایک شخص کے مفاد اور اغراض کی سرانجام دہی میں مصروف ہوں۔ اس وجہ سے خیال کی رجعت قہقہہ ذہنی ارتقا کے ساتھ لازم آئی اور تصور حکومت بدل گیا اور اس کے ساتھ مطلق العنانی کا کوس رحلت بھی بج گیا۔ اسے جدید خیال قرار دینا چاہیے۔ حکومت کا مقصود اولیٰ محکوم کی فلاح بہترین قرار پایا۔ کیا یہ مقصد شخص واحد اور اس کے چند معاونین اور احباب پورا کر سکتے ہیں (اس سے مراد ایک بادشاہ اور اس کے چند وزرا تھے) اس کا جواب تاریخ عالم نفی میں دیتی ہے۔ چند اشخاص لاکھوں آدمیوں کی فلاح بہترین پورا کرنے میں قاصر ثابت ہو چکے ہیں۔ تاریخ سے یہ امر بخوبی ثابت ہے کہ شاہی اور شخصی حکومت مقصود حکومت میں ناکام ثابت ہو چکی ہے۔ بادشاہ اور اس کے ارکان دولت رعایا کی فلاح کا اہتمام نہیں کر سکتے۔ گویا

تاریخ کا فیصلہ شاہیت کے خلاف ہے۔

انقلاب زمانہ سے حکومت کا مقصود فلاح بہترین قوم پایا۔ اس کے ساتھ ہی پرانا تصور بھی بدل گیا۔ پرانا خیال یہ تھا کہ حکومت کا مدار اور ادنیٰ جز خاندان ہے۔ مگر نیا خیال یہ ہے کہ حکومت کا ادنیٰ جز، جزو خاندان نہیں؛ فرد واحد ہے۔ اگلے وقتوں میں خاندان اور قبائل حکومت کے لئے تھے۔ مگر اب یہ خیال الٹ گیا ہے۔ اب افراد حکومت کے لیے نہیں بلکہ حکومت افراد کی بہتری کے لئے ہے۔ اس وجہ سے صدیوں کے تجربے اور واقعات کے بعد یہ ثابت ہوا کہ شخصی حکومت سے فلاح بہترین مرتب نہیں ہو سکتی بلکہ افراد خود اپنے چیدہ نمائندوں کی وساطت سے یہ مقصود حاصل کرنے کی قدرت رکھتے ہیں۔ بادشاہ اور اس کے وزرا ایک خاص گروہ سے متعلق ہوتے ہیں۔ وہ اپنے طبقہ کی ضروریات سے واقف ہیں۔ مگر رعایا دوسرے طبقہ سے ہوتی ہے۔ اس لئے وہ اس کے خیالات اور ضروریات سے بے بہرہ ہوتے ہیں۔ اس وجہ سے وہ اپنے مقصود میں ناکام ثابت ہوتی ہے۔ صدہا سال کے تجربے کے بعد یہ امر بخوبی روشن ہو گیا کہ مقصود حکومت چند افراد کے وسیلے نہیں بلکہ جمہور کے چند سرچیدہ افراد پیدا کرنے کی قدرت رکھتے ہیں۔ اس سے جمہوریت منتج ہوتی ہے۔ جس سے مراد یہ ہے کہ جب حکمران گروہ جمہور میں سے ہو اور اس کی خواہشات اور ضروریات سے کماحقہ آشنا ہو تو فلاح بہترین کا مقصد اولیٰ حاصل ہو سکتا ہے۔

جمہوری حکومت کی تشریح یوں ہو سکتی ہے "جمہور کا نظام حکومت جمہور کی فلاح بہترین کے واسطے" بلکہ یوں کہنا مناسب ہے کہ جب جمہور کے ہر گروہ اور ہر طبقہ کے اشخاص حکومتی کاروبار اپنے خاص نمائندوں کے سپرد کرتے ہیں تو فلاح بہترین منتج ہوتی ہے۔ حقیقی جمہوری حکومت یہی ہے کہ ابنائے ملک کے ہر فرد اور ہر نسل کے لوگ نظام حکومت قائم کریں۔ فلاح بہترین کے افلاطونی معنی پر ہم بحث کرنے کے خواہاں نہیں ہیں۔ کیونکہ یہ اس مضمون کے مقصد سے بیگانہ ہے۔ ہم اس محاورہ کے عامیانہ معنی لگاتے اور اسی خیال سے بحث کرتے ہیں۔ سیکڑوں برس کی حکومتی انقلاب اور ارتقا کے بعد جمہوریت بہترین طریقۂ حکومت ثابت ہوئی ہے۔ اسی وجہ سے اب یہ قومیت اور قربت وطنیت اور ترقی کے مترادف بن گیا ہے۔ جن لوگوں نے اصول حکومت اور تاریخ کا گہری نظر سے مطالعہ نہیں کیا ہے اور جمہوری طریقۂ حکومت کو تمام کثافات کا علاج حکمی تصور کرتے ہیں اس طبقہ کے لوگوں کا یہ خیال ہے کہ جمہوریت کو رواج دینے سے ملک اور قوم اپنے ادبار و فلاکت سے طرفۃ العین میں رستگاری حاصل کر کے ترقی کے تمام مدارج طے کر کے متمدن اور ترقی یافتہ اقوام کی صف اولین میں نظر آئیں گے۔ اسی بہتان میں ہمارے ملک کو ایجی ٹیشن کے پرجوش حامی مبتلا ہیں اور نادانستہ ابنائے وطن کو تباہی کے جہنم میں کودنے کی تحریک کر رہے ہیں۔

اسی خطرناک ناواقفی کے اسیر چینی قوم پرست تھے کہ جنہوں نے چشم زدن میں صدیوں کی شاہی حکومت کو دریا بُرد کر دیا اور امریکہ کے نمونہ کی جمہوری حکومت قائم کر لی۔ واقعات عالم اور سائنس کی سطحی واقفیت رکھنے والے حضرات ایسی بطلان میں گرفتار ہیں کہ جمہوریت سنگ پارس، الہ دین کا چراغ اور طلسم اعظم ہے کہ جس کے وسیلہ سے طرفۃ العین میں قومی آفات و مصائب کا دفعیہ ممکن العمل ہے۔ مگر یہ محض خام خیال ہے جیسا کہ واقعات اور نظائر سے بخوبی ثابت ہے۔ جب تک افراد قوم کی تمدنی اور اقتصادی حالات مطالبہ نہ کریں انقلاب حکومت کسی ملک کے لیے مفید نہیں ہو سکتا۔ فرانس، ایران، ٹرکی اور چین اس کی سب سے بڑی مثال اور تازہ ترین نظیر انقلاب روس ہے جو لوگ سطح سے نیچے نظر بصیرت سے دیکھنے کی قوت سے بہرہ اندوز ہیں وہ خوب جانتے ہیں کہ ہندوستان جہالت اور خرافات پرستی و فلاکت میں مبتلا ہے اور یہ کہ افراد ہند کسی قسم کی فوری انقلاب حکومت کے لیے آمادہ نہیں ہیں تاہم چند شوریدہ سر لوگ ایک سال کے اندر سوراج حاصل کر کے ملک ہند کو ہر قسم کی آفتوں اور مصیبتوں سے رہائی دلانے کے لیے بے حد خواہاں ہیں۔ یا تو یہ سوراج کے معنی سے ناآشنا ہیں یا اپنی کردار کی ماہیت اور انجام سے محض نابلد ہیں یا شائد دونوں سے بے بہرہ خواب کی دلخوش کن باتوں پر شیدا اور حقائق سے چشم پوشی کرتے ہیں۔ تاہم قوم و ملک کے طالبانِ خیر کو چاہیے کہ وہ اس خطرناک تحریک کے حشر کو ابھی سے سمجھ کر اس کے رفع و دفع کا تہیہ کریں اور اپنے غریب اور بیچارے نادان ہموطنوں کو آنے والے آفات سے بچائیں ورنہ بیگناہوں کا خون ان کی گردن پر ہوگا۔ ہندوستانی جمہوریت کے لیے تیار نہیں ہے۔ اس وجہ سے [illegible] کو اس کی قبولیت کی تحریک کرنا جان بوجھ کر اسے آفات اور مصائب میں پھینکنا ہے؟ کیا قوم پرستی اور خیر طلبی وطن کا اقتضا ہے؟ ہرگز نہیں، ہرگز نہیں!

اب ہم اس امر پر بحث کرنے کے خواہاں ہیں کہ انگریزی راج نے ہندوستان میں کیا انقلاب دیکھا اور گزشتہ ڈیڑھ سو سال کی حکومتی تاریخ کا کیا رخ اور کیا صورت رہی۔ ماہ ستمبر ۱۵۹۹ء میں لندن میں اولوالعزم سوداگروں نے ۳۰ ہزار پاؤنڈ کے سرمایہ سے ایک کمپنی مشرقی ممالک سے تجارت قائم کرنے کے واسطے قائم کی۔ جیسا کہ اس سے پہلے پرتگیزوں اور ولندیزوں نے بھی مشہور ملکوں کی تجارت سے ہاتھ رنگنے کی غرض کر سے سرمایہ سے کمپنیاں تیار کی تھیں۔ اس وقت انگلستان میں مشہور ملکہ الزبتھ اور ہندوستان میں جلال الدین اکبر سریر آرائے تخت تھے۔ پہلے پہل انہوں نے مغل صوبہ داروں کی اجازت سے سورت میں کوٹھیاں بنوائیں اور تجارت کرنے کا اجارہ لیا۔ ابتدا میں کامیابی نہیں ہوئی تھی مگر رفتہ رفتہ اس کے قدم جم گئے۔ شاہجہاں کی بیٹی کا علاج کرنے کے صلے میں ڈاکٹر بامٹن

نے کئی اور رعائتیں حاصل کیں۔ پھر مدراس میں بھی کارخانے کھل گئے۔ ۱۶۶۱ء میں شاہ پرتگال نے بمبئی اپنی بیٹی کو جہیز میں دی اور شاہ انگلستان نے اسے دس پونڈ سالانہ پر کمپنی کے حوالے کر دیا۔ اس طرح اس کمپنی نے کہ جس کا نام بعد ازاں تاریخ ہند میں "ایسٹ انڈیا کمپنی" مشہور ہوا تھا ہندوستان کے چند ساحلی مقامات پر تجارتی کوٹھیاں بنانے میں کامیابی حاصل کی۔ ایسٹ انڈیا کمپنی تجارت کرنے کو قائم ہوئی تھی۔ مگر ہندوستان میں اورنگ زیب کے بعد سلطنت مغلیہ کو بہت تیزی سے زوال لاحق ہو گیا اور دور افتادہ صوبوں کے حاکم کوشش کرنے لگے کہ وہی بادشاہ بن جائیں اور اپنے ہم چشموں اور حریفوں کو زیر کرنے کی کوشش میں معروف ہو گئے۔ انہوں نے کمپنی سے استمداد چاہی اور اسے بھی کامیابی کی حالت میں علاقہ اور دیگر قسم کا صلہ دینے کا لالچ دے کر اپنے منصوبہ میں شریک کر لیا۔ اس طرح پر کمپنی کو ملکی معاملات میں دخل دینے کی ترغیب ہوئی۔ ہوتے ہوتے کمپنی کے ہاتھ کئی علاقے آ گئے۔ کمپنی سوداگروں کی جماعت تھی۔ تجارت اور حکومت کے اغراض ایک دوسرے کے نقیض ہوتے ہیں۔ اول الذکر میں سراسر خود غرضی اور موخر الذکر میں ایثار سے کام لینا پڑتا ہے۔ تجارت میں صرف چند اشخاص کے منافع کا خیال غالب رہتا ہے اور آخر الذکر میں ہزاروں اور لاکھوں کی بہتری ملحوظ رہتی ہے۔ جب سوداگروں کو حکومت بھی کرنا پڑی جس میں انہوں نے بنیاگری قاعدہ سے کام لیا۔ یہ ظاہر ہے کہ اس سے بنیاؤں کی حکومت میں طرح طرح کی خرابیاں پیدا ہو گئیں جن کے دفعیہ کے لئے پارلیمنٹ نے دخل دیا اور ۱۷۷۳ء میں ایک مسودہ پاس کیا کہ جس کی رو سے کمپنی کے تمام علاقے ایک گورنر جنرل اور اس کے چند مشیروں کے سپرد ہوئے اور کلکتہ اس کا صدر قرار پایا۔ گورنر جنرل کو صلح اور جنگ اور کمپنی کی سپاہ پر بھی اختیار دیا گیا اور یہ بھی قرار پایا کہ ہر بیس سال کے بعد کمپنی کے معاملات کی چھان بین ہونے کے بعد پٹہ کی تجدید ہوا کرے۔ یہ ہے انگریزی راج کی ابتدائی صورت جسے "گورنر جنرل با اجلاس کونسل" کی حکومت کہتے ہیں اور اسے آپ یورپی ڈھنگ کی مطلق العنان حکومت ہی قرار دے سکتے ہیں۔ اس سے پہلے کمپنی کے انتظام کی یہ صورت تھی کہ لندن میں دو کمیٹیاں ڈائرکٹروں اور حصہ داروں کی تھیں اور ان کے سر پر ایک گورنر یعنی مہتمم اعلیٰ تھا مگر ہندوستان میں مقامی کمیٹیاں تھیں کہ جن میں کمپنی کے پرانے کارندے شریک ہوا کرتے تھے اور وہ مقامی بیوپار کے کام کے ماسوا اردگرد کے علاقے کا بھی انتظام کرتے تھے۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کے انتظام سے کس قدر قباحتیں اور بد نظمیاں پیدا ہو جاتی ہیں اور فی الواقع بہت سی خرابیاں وقوع میں آ گئیں کہ جن کا رفع کرنا ضروری تھا اور یہ ۱۷۷۳ء کے قانون سے ہو گیا۔ یہاں پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ انگلستان میں اس سے کئی سو سال پہلے پارلیمنٹ اور جمہوری

حکومت قائم ہو گئی تھی۔ پھر مدبرانِ برطانیہ نے ہندوستان میں ایسی حکومت قائم کی کہ جو جمہوری حکومت کے خلاف تھی، اس کا جواب دینا محال ہے۔ مگر مختصر یہ ہے کہ یورپی قومیں اغیار پر حکومت قائم کرنے میں اس اصول سے ہدایت پذیر ہوا کرتی ہیں کہ محکوم جن باتوں کے پہلے سے عادی ہوں وہی باتیں برابر قائم رہیں۔ جب انگریز آئے تو ہندوستان میں مغلوں کی مطلق العنان اور جابر حکومت تھی۔ انہوں نے گمان کیا کہ صدیوں سے ہندوستان والے اسی کے عادی ہیں۔ اس وجہ سے اسی طرز حکومت قائم کی۔ دوسرا خیال شاید یہ بھی ہوگا کہ ایشیائی قومیں جمہوریت سے ناآشنا ہیں۔ اس وجہ سے انہیں مغربی باتوں سے آشنا کرنے میں کئی قسم کی دقتیں پیش آئیں گی۔ تیسرا خیال یہ ہوگا کہ اہل ہند کے تمدنی حالات اور پرانی قومی روایات کا یہ مطالبہ نہیں ہے کہ ایسی طرز حکومت قائم کی جائے کہ جو مروجہ حالات اور خیالات کے لئے غیر ہو۔ مگر سب سے بڑھ کر یہ بات ہے کہ اس وقت مدبران برطانیہ اور کارکنان کمپنی کو اس بات کا گمان بھی نہ تھا کہ ہندوستان پر مستقل قبضہ کیا جائے گا اور کسی دن یہ تاج برطانیہ کا سب سے زیادہ بیش قیمت جوہر سمجھا جائے گا۔ مگر اس دور افتادہ زمانہ میں مدبران برطانیہ کی ہندوستان کی نسبت کوئی مقررہ پالیسی نہ تھی اور نہ ان کے خیالات نے کوئی خاص صورت قبول کی تھی۔ ۱۸۳۳ء میں ایک اور قانون پاس ہوا کہ جس کی رو سے مدراس اور بمبئی کے احاطوں کے واسطے گورنر مقرر ہوئے اور دو دو اہلکار مشیر بنے۔ انہیں اپنے اپنے احاطے کے انتظام کے لئے وسیع اختیارات عطا کئے گئے۔ مگر اس ابتدائی عہد میں بعض دور اندیش اور نیک دل مدبر حکام بھی تھے کہ جو ہندوستان میں انگریزی راج کے منشا کی نسبت خاص خیال رکھتے تھے۔ مگر بدقسمتی سے ایسے نیک دل مدبر بہت تھوڑے تھے۔ سر چارلس منرو پہلے گورنر مدراس تھے کہ جنہوں نے ۱۸۲۰ء میں ایک مدبرانہ مراسلہ میں یہ سوال اٹھایا تھا "ہماری حکومت کا ہندوستان میں کیا منشا ہے" اس قسم کے سوالات کے جواب لکھتے ہیں "ہمیں ہندوستان میں اس وقت تک قبضہ رکھنا چاہیئے تا وقتیکہ باشندگان ملک اپنے پرانے توہمات سے رستگاری حاصل کر کے اور نیز تعلیم و تجربہ سے اپنے معاملات کا انتظام اپنے ہاتھ میں لینے کے قابل ہو جائیں" یہ خیال سر چارلس منرو ایسے دور اندیش اور انصاف پرست حاکم کے ہر طرح شایان تھا۔ اس کے کچھ عرصہ بعد دوسرا مدبر ڈچیل گورنر بمبئی اور مشہور مؤرخ نے انگریزی راج کے مقصود کی نسبت یہ خیال ظاہر فرمایا تھا "سمجھدار انگریزوں کو یہ بات ذہن نشین کر لینا چاہیئے کہ سلطنت گورنمنٹ اہل ہند کو سکھانا ہمارا مقصود اولیٰ ہے کہ جس کے قیام اور حصول کے لئے انتظامی پالیسی مرتب کی جاتی ہے" اور اس کے ایک اور سولین آنریبل جے۔ بی۔ نارٹن صاحب نے ایک تقریر کے دوران یہ خیال ظاہر کیا تھا "قوم کی تاریخ میں واقعات

عجلت کے ساتھ وقوع میں نہیں آئے کہ جس سرعت کے بعد فرد واحد کی زندگی میں ہجوم کے ساتھ واقع ہوتے ہیں۔" سر ریچرڈ ٹمپل نے "انڈیا ان ۱۸۸۰ء" میں یہ لکھا تھا "امپریل انتظام کا دستور العمل یہ ہونا چاہیے کہ عجلت سے پیش قدمی کی جائے مگر یہ پر وثوق قوت ہونا چاہیے کہ جو ترقی کا سب سے بڑا محرک ہوتا ہے۔ مگر اس کے ساتھ ہی دور اندیشی اور احتیاط سے کام لینا چاہیے کہ کامیابی کے لیے لازمی ہے۔" سر ہنری مین مشہور ماہر قانون اور سیاسیات اپنی "جمہوری حکومت" میں لکھتے ہیں "یہ امر مسلم ہے کہ بنی آدم کے ایک بہت بڑے حصہ نے اس بات کی ذرا بھی خواہش ظاہر نہیں کی کہ اس کی حکومت اور دستور میں ترمیم اور اصلاح ہو جس کا مطلب غالباً یہ ہے کہ بنی آدم اپنی حالت میں اصلاح کے خواہاں نہیں ہیں۔ بلکہ گبریلہ کی طرح اپنی پرانی باتوں کے شوق میں مست رہتے ہیں۔ گویا سر چارلس منرو اور سر ریچرڈ ٹمپل نے ان ہی کے خیال سے تحریک پذیر ہو کر انگریزی راج کا مقصود اولی سلف گورنمنٹ قرار پایا۔ اس میں عام حکام نے اس نصب العین کو قبول نہ کیا۔ انہوں نے عملاً اس کی تردید کی۔ کمپنی نے کبھی اس مقصود کو اپنے سامنے نہ رکھا اور نہ اس سے تحریک پذیر ہوئی کبھی نہ کیونکہ اس کے حصول کے لیے کبھی کوشش نہ کی گئی۔ بلکہ اپنی مرضی کے مطابق جو جی میں آیا کرتے رہے۔

سر چارلس منرو کا خیال اور انگریزی راج کا نصب العین صرف دو صورتوں میں پورا ہو سکتا تھا۔ اول اہل ہند کو متعلقہ حالات کے انتظام میں تجربہ حاصل کرنے کا موقع دیا جاتا اور پھر انہیں ذمہ داری کے اعلیٰ عہدے عطا کیے جاتے۔ دوم اشاعتِ تعلیم سے ان کی صدیوں کی جہالت دُور کی جاتی اور وہ روشن خیال بن کر اپنے ملک کا انتظام اپنے ہاتھ میں لیتے۔ مگر کمپنی اور اس کے لیڈروں نے ان دونوں پہلوؤں میں سے ایک بھی نہیں کی۔ گویا سر چارلس ممدوح کے قائم کردہ نصب العین سے گریز کرتے رہے۔ اور اہل ہند کو انکی جہالت اور خرافات پرستی میں منہمک رہنے دیا۔ ۱۸۳۳ء میں جب معاہدہ کی ۲۰ سال کے بعد تجدید ہوئی، تو پرانے انتظام میں کچھ تغیر واقع ہوا۔ کمپنی کو ہدایت ہوئی کہ سب بیوپار موقوف کر کے شاہ برطانیہ کی طرف سے حکومتِ ہند کی امین بنے اور حکومتی کاروبار خوش اسلوبی سے انجام دے۔ گورنر جنرل کو وسیع ترین سول اور فوجی معاملات پر اختیار کلی دیا گیا اور ان کی کونسل کو ہر قسم کے ضوابط بنانے کا مجاز دیا گیا۔ دوسری یہ قرارداد تھی کہ اہل ہند کو ذمہ داری کے اعلیٰ عہدوں پر مامور کیا جائے۔ مگر کمپنی کے کارندوں نے اس کی کوئی پرواہ نہ کی۔ ۱۸۵۳ء کے پٹہ کی تجدید کے وقت اس قرارداد پر پھر زور دیا گیا مگر کمپنی نے پھر بھی اس کا خیال نہ کیا۔ غدر کے بعد حکومتِ ہند براہ راست تاج برطانیہ کے ماتحت منتقل ہو گئی۔ ۱۸۵۸ء میں ملکہ معظمہ انجہانی نے ایک

موکرتا آج تاریخی اعلان اہل ہند کے نام نافذ کیا کہ جس میں اس بات کا اعلان کیا گیا کہ اہل ہند کو بلا امتیاز مذہب اور نسل اعلیٰ عہدے دیے جائیں گے۔ مگر شاہی حکومت کمپنی کے انتظام پر بمنزلہ پیوند کے تھی۔ انتظام کی پرانی خود غرضانہ روایات جو بنیاگری حکومت میں پیدا ہو گئی تھیں نئے انتظام کے ورثہ میں آئیں۔ باوجود ملکہ کے اعلان کے اہل ہند کو کوئی عہدہ ذمہ داری کا نہ دیا گیا۔ حکومت میں شرکت کی کیفیت یہ ہے کہ ۱۸۶۰ء میں سول سروس باقاعدگی کے ساتھ قائم ہوئی اور دوسرے سال قانون کونسل ہائے ہند پاس ہوا، جس کی رُو سے یہ قرار پایا کہ گورنر جنرل کی انتظامی کونسل میں بارہ زائد اراکین قانون بنانے کے واسطے مقرر ہوں۔ بنگال میں بھی کونسل بنی۔ گورنران مدراس اور بمبئی کی انتظامی کونسلوں میں بھی نو نو زائد اراکین قانون سازی کے لیے مقرر ہوئے کہ جن میں آدھے ہندوستانی تھے۔ آخر الذکر کو گورنمنٹ نامزد کیا کرتی تھی۔ ۱۸۷۰ء میں چند بنگالی جوان سول سروس کے واسطے ولایت گئے، اور وہاں سے تین چار کامیاب ہو کر واپس آئے۔ ان میں آر۔ سی۔ دت۔ سر سریندر ناتھ بنرجی۔ سر کرشن گوپال گپتا اور مسٹر ڈے وغیرہم تھے۔ شائد اس سے پہلے بھی دو چار بنگالی یا مدراسی ولایت گئے ہوں گے۔ پھر ۱۸۹۲ء میں لارڈ لینسڈاون کے زمانہ میں قانون کونسل ہائے ہند میں توسیع ہوئی۔ زائد اراکین کا شمار سولہ ہوا اور چند پولیٹکل انجمنوں کو اپنے نمائندوں کے نام پیش کرنے کا استحقاق دیا گیا۔ یہ انتخابی اصول کا رواج تھا اور غیر سرکاری اراکین کو سوالات پوچھنے کا اختیار دیا گیا۔ صوبۂ شمالی مغرب سرحد میں ایک کونسل قائم ہوئی۔ مگر پنجاب اور برہما کو ۱۸۹۷ء میں قانون بنانے کی کونسلیں عطا کی گئیں۔ گو ۸۵ سال کمپنی کی حکومت کے اور ۴۲ سال شاہی طرز حکومت کے گزر گئے۔ مگر اہل ہند کو نیابتی طرز حکومت سے آشنا ہونے کا موقع نہ دیا گیا۔ آخر کار بیسویں صدی کی عالمگیر انقلاب تحریک اور نئے خیالات سے اثر پذیر ہو کر لارڈ منٹو اور مسٹر مارلے نے ۸۵ سال کی کمپنی کی اور ۵۰ سال کی شاہی حکومت کے بعد اوّل مرتبہ اہل ہند کو مغربی طرز جمہوریت سے روشناس کرنے کے لئے ۱۹۰۹ء میں حکومت ہند میں اصلاح کی اور نیابتی طرز حکومت کا ابتدائی مرحلہ مرتب کیا کہ جس کی رو سے اوّل مرتبہ اہل ہند کو ۵۰ سال کے بعد اعلیٰ ذمہ داری کے عہدے دیے گئے۔ وزیر ہند کی کونسل میں دو ہندوستانی مسٹر ایس پی سنہا (لارڈ سنہا گورنر بہار) حضور وائسرائے کی کونسل میں مشیر قانون اور گورنران مدراس و بمبئی کی انتظامی کونسلوں میں ایک ایک ہندوستانی شامل کیا گیا۔ ۱۹۱۲ء میں بنگال اور بہار کی کونسلوں میں بھی دو ہندوستانی شریک کیے گئے۔ ملکہ معظمہ کے اعلان کے ۵۰ برس بعد ہندوستانی اعلیٰ عہدوں کے قابل سمجھے گئے۔ اس پر لارڈ چیمسفورڈ

کو ناز ہو تو ہو۔ مگر مورخ اور مبصر بجا انصاف سے کام لینے کے عادی ہوں یہ فتویٰ صادر کیے بغیر نہیں رہ سکتے کہ انگریزی راج میں اہل ہند کو نئے معاملات کے لائق بنانے کی کوشش میں پرلے درجہ کا بخل ظاہر کیا گیا۔ ایسے انگریز مدبر جیسے جے۔ پی نارٹن اور سر جے۔ ڈی ٹمپل وغیرہ اس کو احتیاط، معاملہ فہمی اور دوراندیشی قرار دیں گے مگر ہم اسے ایسٹ انڈیا کمپنی کی خود غرضی اور محکوم کے فوائد سے بے پرواہی کا ورثہ قرار دیتے ہیں۔ ایسے کار ناروا پر کوئی قوم جائز کرنے میں حق بجانب نہیں ٹھہر سکتی۔ اس بات کو فراموش نہ کرنا چاہیے کہ اہل ہند نے اس زمانہ میں اقتصادیات، سیاسیات اور دیگر علوم و فنون میں سب سے زیادہ کمال حاصل کیا تھا کہ جب یورپی قوموں کے اجداد پہاڑوں کی کھوہوں میں سردی سے پناہ لینے کو چھپ رہا کرتے تھے۔ ایسی قوم کو نیابتی اور ذمہ دارانہ حکومت کے ناقابل سمجھنا فطرتِ انسانی، معاملہ فہمی، تدبر اور تاریخ عالم کی ہدایات کو دیدہ و دانستہ پامال کرنا ہے۔

اب لوکل سلف گورنمنٹ کی کیفیت ملاحظہ ہو: ۱۸۴۲ء میں کسی انگریز حاکم نے اپنے بھائیوں کو غیر ضروری بوجھ سے سبکدوش کرنے کے لیے بنگال میں میونسپل کمیٹیاں قائم کیے جانے کا قانون پاس کرا دیا۔ مگر گورنر جنرل کی باقاعدہ منظوری کے بعد اسے پرانے کاغذات کے انبار میں ڈال دیا اور اسے ہوا نہ لگنے پائی۔ گویا مسودہ پاس ہو کر عدم آباد کو سدھار گیا۔ ۱۸۵۰ء میں دوسرا اور قانون پاس ہوا۔ اس کا ذرا سا اثر ہوا۔ مگر لارڈ ناتھ بروک نے پہلے پہل لوکل سلف گورنمنٹ بڑے بڑے شہروں میں قائم کیے جانے کے قواعد ۱۸۷۴ء ۷۳-۱۸۷۲ء میں نافذ کیے۔ مگر یہ لارڈ رپن بہادر کے لیے مخصوص تھا کہ وہ لوکل سلف گورنمنٹ سر چارلس سڑز کے حسب منشا قائم کر کے اہل ہند کو حکومت کے قابل بناتے۔ چنانچہ ۱۸۸۲ء اور ۱۸۸۴ء میں باوجود حکام کی متفقہ مخالفت کے میونسپل بورڈ اور ڈسٹرکٹ بورڈ قائم کیے جانے کے احکام نافذ ہو گئے۔ مگر حکام کی سرد مہری اور تعلیم یافتہ گروہوں کی بے اعتنائی سے اس تجربہ میں ناکامی ہوئی۔ حکام اپنے اختیارات اور دست اندازی سے باز نہ آئے اور تعلیم یافتہ حضرات نے مقامی معاملات میں دخل دینے اور دلچسپی لینے میں اپنی کسر شان سمجھی۔ مگر وہ یہ بھول گئے کہ مغرب میں جتنے بڑے بڑے مدبر گزرے ہیں ان میں بہت ایسے تھے کہ جنہوں نے مقامی معاملات میں تجربہ حاصل کیا تھا اور نیز یہ کہ روم کی شہری حکومت ہی نے اس قدر پاؤں پھیلائے کہ تین برہائے عظمیٰ پر چھا گئی۔ کارتھج اور ٹائر اور وینس کی شہری حکومتیں بھی بہت مشہور اور با اقتدار تھیں۔ ۱۹۰۹ء کی اصلاحات میں میونسپل بورڈ اور ڈسٹرکٹ بورڈ حلقہائے انتخاب قرار پائے تھے اور مقامی کونسلوں میں غیر سرکاری اراکین کا غلبہ قائم کیا گیا تھا۔

اب تعلیم کی کیفیت ملاحظہ ہو۔ کلکتہ کا مشہور اور تاریخی مدرسہ ۱۷۸۱ء میں عربی فارسی کے ادبیات کے لئے قائم کیا گیا اور سنسکرت کالج بنارس سنسکرت کے علوم کے واسطے ۱۷۹۲ء میں کھولا گیا تھا۔ کیونکہ کمپنی کے ذمہ دار کارندے یہ گمان کرتے تھے کہ مشرقی علوم وفنون کو ہی اشاعت دینا مناسب ہے۔ ۱۷۹۳ء میں چند نیک دل ممبران پارلیمنٹ نے کمپنی کے پٹہ میں یہ شرط قائم کرنا چاہا کہ باشندگانِ ہند کی تعلیم اس کا فرض اولیٰ ہے۔ مگر مخالفوں کی کثرت رائے سے یہ قرارداد مسترد ہو گئی۔ ۱۸۱۳ء میں پارلیمنٹ نے یہ قرار دیا کہ کمپنی ایک لاکھ روپیہ تعلیمی مقاصد پر خرچ کرے۔ کمپنی نے اس ہدایت کی رو سے ایک لاکھ روپیہ علیحدہ تو کر دیا مگر ایک پیسہ بھی تعلیم پر خرچ نہ کیا۔ آخرکار اس سال بعد گورنر جنرل باجلاس کونسل کے حکم ۱۸۲۳ء میں ایک تعلیمی کمیٹی اس مقصد سے مقرر ہوئی کہ وہ اشاعتِ تعلیم کی تجاویز وضع کر کے گورنر جنرل کے نوٹس میں لائے۔ ۱۸۳۳ء میں گورنر جنرل نے یہ قرار دیا کہ تعلیم کے لئے جو رقم مخصوص ہے وہ انگریزی ادبیات کی تعلیم پر خرچ ہوا کرے۔ گویا پہلی مرتبہ مغربی علوم بزبانِ انگریزی پڑھانے کا اعلان کیا گیا۔ ۱۸۳۴ء میں لارڈ میکالے نے مشہور مراسلت مرتب کی کہ جس میں نہایت زور سے اجتہاد کیا گیا کہ مغربی علوم وفنون انگریزی زبان میں اہل ہند کو پڑھانے ہی سے ان کی کایا پلٹ ہو سکتی ہے۔ چنانچہ گورنر جنرل باجلاس کونسل نے ۱۸۳۵ء میں باقاعدہ اعلان کے ساتھ انگریزی تعلیم رائج کر دی اور مدارس قائم ہو گئے۔ لارڈ میکالے کی یہ مراسلت معرکۃ الآرا اور انقلاب انگیز تھی۔ لارڈ ممدوح نے ہندوستان پر بہت بھاری احسان کیا کہ جس سے اہل ہند کبھی سبکدوش نہیں ہو سکتے۔ کیونکہ ہندوستان کا انقلاب اور اس کی بیداری کے بانی مشیر قانونی لارڈ میکالے ہی ہیں۔ جن نتائج کا اپنی چشم بصیرت سے اندازہ کیا تھا وہ اب نمایاں ہو گئے۔ والیسرائے بہادر نے ۹ فروری کو ہندوستان کی پارلیمنٹ کا افتتاح کرتے وقت ایک تقریر میں ہندوستان میں نیابتی اصول حکومت کی رفتار دھیمی ہونے کے حق میں یہ استدلال کیا کہ تعلیم کے وسیلے سے اہل ہند کے درمیان انقلاب اور جمہوریت کی تمنا پیدا کرنا مقصود تھا۔ مگر اشاعت تعلیم میں بھی وہی بخل ظاہر کیا گیا کہ جو اعلیٰ عہدے دینے یا لوکل سلف گورنمنٹ کے رواج میں ظاہر کی گئی تھی۔ لارڈ ہارڈنگ کی گورنمنٹ نے ۱۸۴۴ء میں اس مضمون کا اعلان کیا تھا کہ سرکاری عہدے ترجیحاً ایسے آدمیوں کو دینے چاہئیں کہ جو انگریزی سے واقف ہوں کہ جس سے حصول تعلیم کا جیاگری منشا قرار دیا گیا۔ سر چارلس ووڈ کے ۱۸۵۴ء کے مراسلہ سے تعلیم کی ابتدائی پالیسی میں معتدبہ ترمیم ہوئی۔ تعلیمات کی نگرانی ڈائرکٹروں کے سپرد ہوئی اور امدادی اسکولوں کا دستور قائم ہوا۔ بعد ۱۸۵۷ء میں کلکتہ، مدراس،

اور بمبئی میں تین یونیورسٹیاں قائم کی گئیں۔ کیونکہ یونیورسٹی کی تعلیم پر خصوصیت سے زور دیا گیا۔ پنجاب یونیورسٹی ۱۸۸۲ء میں اور الہ آباد میں ۱۸۸۷ء میں قائم ہوئی تھی۔ اتنا بڑا ملک اور اس میں صرف پانچ یونیورسٹیاں ۱۹۰۰ء تک قائم ہوئیں۔ گذشتہ چند سال میں اور بھی زیادہ ترقی ہوئی ہے۔

قصہ کوتاہ انگریزی راج کے قیام سے لے کر اب تک جو کچھ ہوا اس پر نظر ڈالنے سے عیاں ہوتا ہے کہ حکومت کے ابتدائی مرحلہ میں خودغرضی اور حکمرانی کی کامرانی کا جو تصور وجود میں آیا تھا وہ مدبران برطانیہ نے اس ملک میں بھی رائج کیا۔ ایک ایشیائی مطلق العنانہ حکومت کے بدلے یورپی مطلق العنان حکومت قائم کی اور اس بات کو صاف بھول گئے کہ اہل ہند دنیا کی سب سے پرانی اور بہترین تہذیب کے وارث اور نیابتی طرز حکومت سے مستفیض ہونے کے ہر طرح سے مستحق ہیں۔ بعض نیک دل انگریز مدبران ہند نے جو اعلیٰ اور پاکیزہ خیالات انگریزی راج کے نصب العین اور مقصود کی بابت ظاہر کیے تھے ان سے عام حکام سراسر ناآشنا اور محض بیگانہ تھے۔ گو اہل ہند کی ترقی اور فلاح بہبود بظاہر حکومت کا مقصد تھا، مگر عملاً اس کی تردید ہوتی رہی۔ اہل ہند کو ارتقائے زمانہ کے سپرد کر دیا گیا اور ناعاقبت اندیشی اور خودپرستی کے باعث یہ امر جاننے میں قاصر رہے کہ اہل ہند میں عظیم الشان انقلاب پیدا ہو گیا ہے۔ اس وجہ سے حکومت میں بھی رفتار اور ضرورت زمانہ کے تناسب سے اصلاح ہونا چاہیئے۔ آخرکار ایسے اسباب پیدا ہو گئے کہ جس سے حکومت ہند میں بنیادی تغیر لازم آیا، جس کا انجام ۱۹۱۷ء کا تاریخی اعلان ہے۔

سال رواں سے دورِ جدید شروع ہوتا ہے۔ پرانا دور جو مطلق العنان حکومت کا تھا وہ سال گذشتہ کے ساتھ ختم ہو گیا۔ نیا دَور جمہوریت اور آزادی کا ہے۔ وسیع اختیارات اہل ہند کے سپرد کیے جاتے ہیں کہ جن کی بدولت وہ ابنائے وطن کی حالت سدھار کر چند سال میں انہیں مغربی قوموں کے ہم پلہ بنا سکتے ہیں۔ صوبوں کی حکومت میں سب سے بڑا اقتدار اور وسطی حکومت میں معتدبہ اختیار حاصل ہوتا ہے۔ گویا ڈیڑھ سو سال کی انگریزی حکومت کے بعد اب جمہوری طرز حکومت قائم کی گئی ہے۔ اب ہمارا یہ فرض ہے کہ اس تجربہ کو ہر طرح سے کامیاب بنائیں اور اگلے مرحلہ کے لئے تیار ہوں۔ مہذب دنیا بھی اشتیاق کی نگاہوں سے دیکھ رہی ہے کہ اس انوکھے تجربہ کا کیا حشر ہوتا ہے اور اہل ہند اپنی نئی ذمہ داریوں کو کس طرح انجام دے کر سرخروئی حاصل کرتے ہیں۔ اس وجہ سے محبان وطن کا یہ فرض مقدم ہے کہ جمہور دور کو کامیاب اور ابنائے ملک کے لئے نفع آور بنائیں۔ مستقبل ہمارے ہاتھوں میں ہے جیسا چاہیں بنا سکتے ہیں۔

(مئی ۱۹۲۱ء) ●●

مولوی عبدالماجد

مہاتما گاندھی اور ان کی تعلیم

فطرت الٰہی کا یہ ایک ازلی و ابدی قانون ہے کہ جب کوئی قوم یا جماعت تنزل، انحطاط، ذلت و پستی کے انتہائی عمیق غاروں میں گر چکی ہے، تو اس قوم کا نجات دہندہ، اس قوم کو راہ نجات دکھانے والا اُسی قوم یا جماعت سے پیدا کیا جاتا ہے اور اصلاح و رہنمائی کا کام کسی غیر شخص کے ہاتھوں نہیں بلکہ اُسی گمراہ جماعت کے کسی فرد سے کرایا جاتا ہے۔ ہندوستان میں جب چھتریوں نے اپنا دھرم چھوڑ دیا اور ان میں راجہ کنس اور دریودھن سے شقاوت مجسم حکمراں پیدا ہونے لگے، تو اُسی طبقہ بلکہ اسی خاندان میں آریہ ورت کے مصلح اعظم سری کرشن نے جنم لیا۔ قوم عاد کی نفس پرستی و خدا فراموشی جب حد سے بڑھ گئی تو اصلاح و ہدایت کا منصب اسی برادری کے ایک فرد ہود[1] کے سپرد کیا گیا۔ سرچشمۂ توحید حضرت ابراہیمؑ کہاں پیدا ہوئے؟ نہ صرف بت پرستوں کی قوم میں بلکہ اُس شخص کے گھر میں جو ایک مشہور بُت تراش تھا۔ منبع عرفان و تقدیس "ختم رسلؐ" کی بعثت کہاں ہوئی؟ اس خاندان قریش میں جس کی جہالت و بدکاری حد انسانیت سے گزر چکی تھی[2]۔ عین اسی سنت ایزدی کے مطابق آج جبکہ دنیا پر زر و سیم کی حکومت قاہرہ مسلط ہے۔ جبکہ زر پرستی اقوام و جماعت کے رگ و ریشہ میں پیوست ہو گئی ہے اور جبکہ مذہب، اخلاق، سیاسیات و معاشرت ہر شے کا آخری بنیاد تجارت، بیوپار اور کاروبار قرار پا گئی ہے غیرت حق نے اس بت کو توڑنے کے لئے تیشہ و تبر ایک ایسے شخص کے ہاتھ میں دے دیا ہے جو نہ برہمن ہے نہ چھتری، بلکہ ویش ذات کا ایک جز ہے جس کا موروثی پیشہ تجارت و کاروبار، لین دین اور بیوپار ہے۔ یعنی موہن داس کرم چند گاندھی۔

---

[1] قرآن پاک میں ہے کہ "ہم نے قوم عاد کی طرف اُن کے ایک بھائی ہودؑ کو پیغمبر بنا کر بھیجا"۔

[2] قرآن پاک میں ہے کہ "عرب کفر و نفاق میں سب سے بڑھ کر ہیں"۔

دنیا کے ہر حصہ میں آج کل جس قدر شورشیں اور ہنگامے برپا ہیں، اگر تحلیل کی جائے تو ان سب کی بنیاد حب زر ٹھہرے گی۔ اسٹرائکیں اس کثرت سے کیوں ہوا کرتی ہیں؟ اس لئے کہ مزدوروں کا بیشتر گروہ اضافہ مزدوری چاہتا ہے، اور سرمایہ دار اس صرف زر کو اسراف سمجھتے ہیں۔ سلطنتوں میں باہمی آویزش و جنگ و جدل کیوں ہوتی ہے؟ اس لئے کہ ہر سلطنت زیادہ سے زیادہ مالی نفع کی حرص رکھتی ہے۔ اخبارات نے کیوں جادۂ راستی کو چھوڑ کر اپنی اپنی پارٹی کی بیجا بالا خوانی شروع کر دی ہے؟ اس لئے کہ عموماً ہر اخبار کی باگ کسی سرمایہ دار شخص یا سرمایہ دار کمپنی کے ہاتھ میں ہے۔ اور اخبار کو لامحالہ اسی پالیسی کی اتباع کرنا ہوتا ہے جس سے مالک کے مقاصد و منافع کو تقویت پہونچے۔ غرض اسی طرح آج جتنی ابتریاں اور خرابیاں نظر آرہی ہیں ان سب کی آخری بنیاد نظام سرمایہ داری ہی نکلتی ہے۔ اسی نظام کو مٹانے کے لئے دست قدرت نے اپنے قدیم قانون کے مطابق ایک سرمایہ دار و تجارت پیشہ خاندان کے شخص گاندھی کو پیدا کیا تاکہ گھر میں آگ گھر ہی کے چراغ سے لگے۔

گاندھی صاحب کے نام سے آج ہندوستان کا بچہ بچہ واقف ہے، مگر صرف اس حیثیت سے کہ وہ حکومت انگریزی کے سب سے بڑے اور کامیاب دشمن ہیں۔ حالانکہ ان کی سیاسی ناموری محض ایک ضمنی و فروعی شے ہے اور ان کو اس حیثیت سے پہچاننا بالکل ایسا ہی ہوگا، جیسے ہندو کرشن جی اور مسلمان حضرت یوسفؑ کے تمام روحانی کمالات و اخلاقی فضائل چھوڑ کر محض ان کے ظاہری حسن و جمال کا راگ گانے لگیں۔ اس سے انکار نہیں کہ گاندھی صاحب کی شہرت ایک سیاسی شخص کی حیثیت سے منظر عام پر بہت نمایاں رہنے لگی ہے لیکن درحقیقت یہ ان کی زندگی کا سب سے بڑا کارنامہ نہیں، ان کی عظمت کا اصلی راز اُن کے اُن روحانی، و اخلاقی اصول میں مضمر ہے جن کی تعلیم انھوں نے دنیا کو دی اور جن پر عملدرآمد کا بہترین و کامل ترین نمونہ خود اُن کی ذات میں موجود ہے۔ صفحات ذیل میں اُن کے انہیں حکیمانہ اور درویشانہ تعلیمات کی مختصر تشریح کی جاتی ہے۔ تفصیل سے لکھنے کے لئے صدہا صفحات کی ضرورت ہوگی۔

جسم و جان، مادہ و روح کی کشمکش آج سے نہیں، مدت سے چلی آرہی ہے۔ دنیا کے موجودہ دَور میں جب سے کتب تاریخ ضبط تحریر میں آئی ہوئی موجود ہیں عموماً مادیت ہی

کو وقت و غلبہ حاصل رہا ہے، لیکن ہر زمانہ میں جب مادیت کا زور حد سے بڑھ گیا اور انسان روحانیت سے بالکل غافل ہو گیا تو اصلاح و ہدایت کے لیے ہمیشہ کسی پیمبر یا روحانی پیشوا کا ظہور ہوا ہے جس نے اپنی قوم کو غفلت و گمراہی کے راستہ سے ہٹانا چاہا ہے اور جب اس قوم نے اس کے نصائح پر کان نہ دھرا تو وہ قوم کسی نہ کسی مصیبت یا عذاب سے تباہ ہو گئی ہے۔ کوروؤں نے سری کرشن کی بات نہ مانی تو آتشِ جنگ نے ان کی خاکستر تک باقی نہ چھوڑی۔ فرعون نے موسیٰؑ کا پیام نہ سنا، تو مع ساز و سامان کے سمندر میں غرق ہو گیا۔ یہودیوں نے حضرت عیسیٰؑ کی تکذیب کی، تو آج تک نکبت و ادبار کی لعنت میں مبتلا چلے آ رہے ہیں۔

اسلامی عقیدہ کے لحاظ سے دنیا میں پیمبروں کے آنے کا سلسلہ ختم ہو چکا ہے۔ اب کوئی جدید پیمبر نہیں آ سکتا۔ تاہم نائبانِ پیمبر، عام ہادیانِ راہِ حق کا سلسلہ قیامت تک نہیں ختم ہو سکتا۔ گاندھی صاحب بھی ایک خاص پیامِ حق لے کر دنیا کے سامنے آئے ہیں اور وہ پیام مختصر الفاظ میں وہی ہے جو ہمیشہ سے داعیانِ حق کی زبان پر رہا ہے۔ یعنی "دنیا کو دین کے ماتحت رکھو۔ جسم پر جان کو مقدم سمجھو۔ مادیت کو ہٹاؤ۔ روحانیت کو بڑھاؤ۔ ہوش کو سلاؤ روح کو جگاؤ۔ آرائش و نمائش کو ترک کرو۔ خلوص و ایثار کو اختیار کرو۔ ظاہریت و خارجیت کو فنا کرو۔ باطنیت و معنویت کو زندہ کرو۔ خود کو بھلاؤ خدا کو مناؤ۔"

اس وقت مادیت و ظاہریت کا سب سے زیادہ پر شوکت مظہر موجودہ تمدن ہے۔ اسی لئے گاندھی جی سب سے زیادہ اسی کے دشمن ہیں۔ جس شے کو آج ترقی کی دلیل سمجھا جا رہا ہے اُن کی نظر میں وہ تمام چیزیں پستی و تنزل کی علامت ہیں۔ سائنس، جدید آلات، اختراعات، اکتشافات، تہذیب، شائستگی، پارلیمنٹ اور جمہوریت، یہ کل چیزیں بجائے انسان میں ملکوتیت پیدا کرنے کے بہیمیت و حیوانیت پیدا کرنے والی ہیں اور اس لئے "قطعاً قابلِ نفرت ہیں۔ ہندوستان کے دوسرے لیڈر کہتے ہیں کہ مغربی تعلیم حاصل کرو اور مغربی تمدن سے مستفید ہو۔ لیکن مہاتما کا ارشاد ہے کہ یوروپین قوموں کی تقلید سے بچو، کہ ان کا تمدن خود انہیں کے حق میں زہر ثابت ہو رہا ہے۔ فرماتے ہیں:۔

"جدید تہذیب برائے نام تہذیب ہے۔ اس تمدن کے اثر سے یوروپین قومیں

روز بروز ذلیل و خوار اور تباہ ہوتی چلی جاتی ہیں۔"[1]

مہاتما جی فرماتے ہیں کہ یہ تمدن ایک قسم کا مرض ہے جو عالمگیر ہوتا جاتا ہے۔ پھر اس اعتراض کے جواب میں کہ خود ہم کو اس کا احساس کیوں نہیں ہوتا۔ وہ فرماتے ہیں کہ

"انسان خود اپنی مخالفت شاذ و نادر ہی کرتا ہے۔ جو لوگ خود ہی اس تمدن کے نشہ سے سرشار ہو رہے ہیں، وہ کیوں کر اس کی مخالفت میں قلم اٹھا سکتے ہیں۔ وہ لوگ جو قدرتاً اس تلاش میں رہتے ہیں کہ جو واقعات و دلائل اس کی حمایت میں مل سکتے ہیں، انہیں کو پیش کریں۔ اس لئے کہ وہ لوگ اپنے بے خبری میں اس کو اچھا سمجھ رہے ہیں۔ خواب کی حالت میں انسان خواب کو بالکل واقعہ سمجھتا رہتا ہے۔ یہ تو بیدار ہونے کے بعد احساس ہوتا ہے کہ وہ خواب تھا۔ جو لوگ نشۂ تمدن میں مدہوش ہیں وہ بھی گویا عالم خواب میں ہیں۔ ہم لوگ جن اشخاص کی تصانیف کا مطالعہ کرتے رہتے ہیں وہ وہی اشخاص ہیں جو خود حامیان تمدن سے ہیں۔ ان کی تصانیف ہمیں مسحور کر دیتی ہیں اور اس طرح غفلت کی تہ بر تہ جمتی چلی جاتی ہے۔"[2]

آگے چل کر وہ تمدن کا مفہوم بیان کرتے ہیں اور اس کے ضمن میں اُس کے (دکھڑا) بھی ظاہر کرتے جاتے ہیں۔ فرماتے ہیں[3]

"پہلے اس پر غور کرنا چاہیے کہ "تمدن" کا اطلاق کن حالات پر ہوتا ہے۔ تمدن کی اصلی شناخت یہ ہے کہ جو لوگ اس میں مبتلا ہو جاتے ہیں وہ راحت جسمانی کو اپنی زندگی کا نصب العین بنا لیتے ہیں۔ اس کی چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔ یورپ کے باشندے آج جن مکانات میں رہتے ہیں وہ اُن سے بہتر ہیں جیسے کہ سو برس پیشتر ہوتے تھے۔ یہ شے تمدن کی ایک علامت سمجھی جاتی ہے اور اس سے ہماری راحت مادی میں اضافہ ہوتا ہے۔ ایک زمانہ میں یہ لوگ پوستین پہنتے تھے اور

---

[1] "انڈین ہوم رول" مصنفہ مہاتما گاندھی صفحہ ۲۵۔
[2] " " " " " " " ۲۵ و ۲۶
[3] " " " " " " " ۲۶ تا ۲۷

آلات حرب میں محض برچھے رکھتے تھے۔ اب پتلون پہننے لگے ہیں اور بالائی جسم کو مختلف و متعدد پوششوں سے ملبوس رکھتے ہیں اور بجائے برچھوں کے اب ریوالور رکھتے ہیں جس میں پانچ پانچ یا اور زائد خانے ہوتے ہیں۔ دوسرے ممالک کے لوگ جو زیادہ پوششوں، بوٹ وغیرہ کے استعمال سے ناآشنا ہوتے ہیں جب وہ مغربی لباس زیب تن کرنے لگتے ہیں، تو سمجھا جانے لگتا ہے کہ اب وہ دور توحش سے نکل کر متمدن ہو گئے۔ پیشتر یورپ میں کسان اپنے ہاتھ سے ہل چلاتے تھے، اب ایک شخص انجن کی مدد سے نہایت وسیع رقبہ کاشت کر سکتا ہے، اور اس طرح بہت کچھ دولت جمع کر سکتا ہے۔ یہ شے بھی تمدن کی علامت سمجھی جاتی ہے۔۔۔۔

۔۔۔۔ پہلے لوگ بیل گاڑیوں یا گھوڑا گاڑیوں پر سفر کرتے تھے اب وہ ایک دن میں چار چار سو میل یا اس سے بھی زائد سفر کر سکتے ہیں۔ اور ریل تمدن کی سب سے بڑی برکت قرار دیا جاتا ہے۔ اور یہ کہا جاتا ہے کہ جوں جوں ترقی ہوتی جائے گی لوگ ہوائی جہازوں کی مدد سے ہر حصۂ ارض تک چند گھنٹوں میں پہنچ سکیں گے[1] رفتہ رفتہ انسان کو اپنے ہاتھوں پیروں کے استعمال کی ضرورت باقی نہ رہ جائیگی۔ صرف ایک بٹن دبا دینے سے ان کا لباس ان کے پاس آ جائے گا۔ دوسرا بٹن دبا دینے سے اخبار آ جائے گا۔ تیسرا بٹن دبانے سے موٹر کار موجود ہوگا۔ اسی طرح انواع اقسام کے لذیذ کھانے خود بخود موجود ہو جائیں گے۔ غرض ہر ضرورت مشینری کے ذریعہ سے انجام پائے گی۔ اگلے زمانہ میں جب دو فریق جنگ کا قصد کرتے تھے تو پہلے اپنی اپنی جسمانی قوت کا اندازہ کرتے تھے لیکن اب فرد واحد پہاڑی کی آڑ سے توپ چلا کر ہزاروں جانیں لے سکتا ہے۔ یہ سب کچھ تمدن کے مظاہر ہیں۔ ایک وہ زمانہ تھا جب لوگ اپنے حسب پسند وسیع کشادہ میدانوں میں کام کرتے تھے۔ اب ہزارہا مزدور پیشہ افراد کو اپنا پیٹ پالنے کے لئے کارخانوں میں کام کرنا

---

[1] واضح رہے کہ کتاب کا یہ بیان تصنیف ۱۹۰۱ء ہے جس وقت تک ہوائی جہازوں کا وجود محض تخیل بنا ہوا تھا۔

ہوتا ہے۔ ان کی حالت حیوانات سے بھی ابتر رہتی ہے۔ انہیں اپنی جان پر کھیل کر نہایت خطرناک قسم کے کام کروڑپتی سرمایہ داروں کی خاطر کرنا ہوتے ہیں پہلے لوگ جسمانی سزاؤں کا خوف دلا کر غلام بنائے جاتے تھے، اب روپیہ کا، اور ان تعیشات کا جو روپیہ سے خریدے جا سکتے ہیں۔ لالچ دلا دلا کر غلام بنائے جاتے ہیں۔ اب امراض نئے نئے پیدا ہونے لگے ہیں، جن کا نام بھی پہلے سننے میں نہیں آیا تھا اور ڈاکٹروں کی ایک فوج ان کے مقابلے کے لئے تیار رہتی ہے اور اسپتالوں کی تعداد بڑھتی جاتی ہے .... اگلے لوگ دن رات میں صرف دو یا تین مرتبہ سے زائد کھانا نہیں کھاتے تھے۔ اور وہ کھانا کیا ہوتا تھا، محض ترکاریاں اور گھر کی بنی ہوئی روٹیاں، لیکن اب کھانے کی ضرورت ہر دو گھنٹہ کے بعد ہونے لگی ہے اور دوسرے کاموں کے لیے فرصت ہی نہیں رہتی .... یہ سارے جلوے تمدن ہیں۔"

ان تصریحات کے بعد فرماتے ہیں[1]

"اس تمدن کو اخلاق مذہب سے کوئی واسطہ نہیں۔ اس کے علمبردار سنجیدگی کے ساتھ کہتے ہیں کہ ہمارا کام مذہب کی اشاعت کرنا نہیں اور ان میں سے بعض تو مذہب کو محض وہم پرستی سمجھتے ہیں۔ بعض ایسے بھی ہیں جو مذہب کی ظاہری آڑ رکھتے ہیں اور اخلاق کا بھی دعوی کرتے ہیں۔ لیکن میں اپنے بیست سالہ تجربہ کے بعد اس نتیجہ پر پہونچا ہوں کہ عموماً اخلاق کے پردہ میں بد اخلاقی کی تعلیم دی جاتی ہے۔ تمدن کے جو خصوصیات میں نے اوپر بیان کیے ہیں ان سے ایک بچہ بھی سمجھ سکتا ہے کہ اس تعلیم میں اخلاق کی کوئی گنجائش نہیں۔ تمدن محض جسمانی آسائش کو مد نظر رکھتا ہے اور اس مقصد میں بھی قطعاً ناکام رہتا ہے۔"

اقتباسات بالا میں جن عبارات کو زیر خط کر دیا گیا ہے ان سے صاف معلوم ہوگا کہ گاندھی کا پیام مذہب و اخلاق ہی کا پیام ہے۔ وہ تمدن جدید کو اس لئے مٹانا چاہتے ہیں کہ اس میں تزکیۂ النفس

---

[1] انڈین ہوم رول مصنفہ مہاتما گاندھی صفحہ ۲۹، ۳۰

دلنگین روح کا کوئی سامان نہیں اور موجودہ تہذیب شائستگی کے اس لئے دشمن ہیں کہ جو چیزیں اخلاق اور روحانیت کی جانب لے جانے والی ہیں ان کا وجود یہاں مفقود ہے۔ آگے چل کر ان کا بیان اور زیادہ صاف ہو جاتا ہے[۱]۔

"یہ تمدن تہذیب کا نام ہے۔ اس کی گرفت یورپ والوں پر ایسی سخت ہو گئی ہے کہ وہ لوگ مخبوط ہو کر رہ گئے ہیں۔ وہ لوگ جسمانی قوت و جرات سے بھی معرّیٰ رہ گئے ہیں۔ اپنی قوت قائم رکھنے کے لئے وہ نشہ میں رہا کرتے ہیں۔ تنہائی میں ان کا دل نہیں لگتا۔ عورتیں جنہیں گھر کے اندر رہنا چاہیے تھا ادھر ادھر سڑکوں پر گھومتی یا کارخانوں میں غلامی کرتی پھرتی ہیں۔"

ایک دوسرے موقع پر جہاں مہاتما جی اس جدید و ملعون تہذیب کی معائب شمار کرنے کے بعد صحیح و قلیل قبولی تمدن کی تعریف بیان کرتے ہیں وہاں اخلاق یا دھرم کو سب پر مقدم رکھتے ہیں[۲]۔

"تمدن کے صحیح معنی اس نظام عمل کے ہیں جو انسان کو اُس کے دھرم کا راستہ بتائے۔ دھرم کو پورا کرنا اور قانون اخلاق کی پابندی کرنا، مرادف الفاظ ہیں۔ پابندی اخلاق کے معنی یہ ہیں کہ ضبط نفس و سکون جذبات حاصل کیا جائے ایسا کرنے سے ہم خود شناسی (عرفان نفس) حاصل کر سکیں گے۔ گجراتی زبان میں جو لفظ تمدن کے بجائے مستعمل ہے اُس کے لغوی معنی حسن عمل کے ہیں۔"

ہندوستان قدیم میں اسی قسم کا تمدن شایع تھا۔ اسے جدید تمدن سے کوئی مناسبت نہ اتحاد۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ اس وقت

"سلاطین اور شمشیر سلاطین سے بھی بالاتر قوت شمشیر اخلاق کی تھی اور اس وقت دنیوی فرمانرواؤں کی قدر و منزلت رشیوں اور درویشوں سے کمتر تھی[۳]۔"

قدیم ہندوستانی تمدن اور جدید مغربی تمدن کے درمیان فارق یہ ہے کہ

"ہندوستانی تمدن انسان کی اخلاقی زندگی کو بلند کرنا چاہتا تھا بخلاف اس کے

---

[۱] [۲] [۳] انڈین ہوم رول مصنفہ مہاتما گاندھی صفحہ ۳۰، ۶۹، ۷۱

مغربی تمدن اسے بداخلاقی کی جانب لیجارہا ہے۔"

اور تو اور، اپنی خالص سیاسی و ملکی تقریروں میں بھی گاندھی صاحب مذہب و اخلاق کو فراموش نہیں کرتے۔ بلکہ ان کے سیاسی راگ کی بھی ہر تان آکر مذہب و اخلاق ہی پر ٹوٹتی ہے۔ حال میں کلکتہ میں وہ تجارت پیشہ طبقہ کے سامنے تقریر کر رہے تھے اور اسی سے مالی ایثار کے لیے اپیل کر رہے تھے۔ اس میں فرماتے ہیں[1]:

" میں صرف دو تین باتیں چاہتا ہوں۔ ایک یہ کہ گاندھی کو دستانے، گاندھی جی کی جے کے نعرے نہ بلند کیجے۔ اس کو اپنے اوپر حرام سمجھیے، دوسرے ... آپ جو کچھ دیں اس کو انکسار و فیاضی کے ساتھ دیں۔ جس طرح میں خدا سے التجا کرتا ہوں کہ اپنے مذہبی جذبہ کو منور کیجے ..... خدا سے دعا کرتے رہیے کہ وہ آپ کو اور مجھے سوراج حاصل کرنے کی طاقت عطا فرمائے، اور آپ پر اپنی رحمت نازل کرے "

کلکتہ میں ایک دوسرے جلسہ میں طلبہ کے سامنے ان کی حوصلہ افزائی کرتے وقت کہتے ہیں[2]:

" خدا سے دعا کرتا ہوں کہ وہ بنگال کے نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کو کافی اہمیت، کافی اعتماد اور کافی امید عطا فرمائے، تاکہ وہ ایثار، خلوص، پاکیزگی کے مقدس امتحان کو پوری طرح پاس کر سکیں۔ خدا آپ لوگوں کی مدد کرے"

اسی تقریر کے دوران میں ایک جگہ یہ بھی فرماتے ہیں: کہ

" یہ جنگ (یعنی ترک موالات کی پُر زور اشاعت) ایک مذہبی جنگ ہے اس کا مقصد یہ ہے کہ سیاسیات میں انقلاب پیدا کر دیا جائے۔ سیاسیات کو روحانی بنا دیا جائے۔"

اسی تقریر میں یہ بھی ارشاد ہے کہ:

" میں مغربی تمدن کا دشمن نہیں ہوں۔ جدید تمدن کا دشمن ہوں، وہ جدید تمدن

---

[1] انڈین ہوم رول [2] ص ۳ [3] تقریر بمقام کلکتہ ۲۷ و ۲۳ جنوری ۱۹۲۱ء

جو مادی و حیوانی قوت کی پرستش کرتا ہے۔ وہ جو جدید تمدن جو تمام تر مادیت وخالص مادیت کے مرادف ہے۔"

۲۴ دسمبر ۱۹۱۶ء کو گاندھی جی نے مدراس کرسچین کالج میں ستیاگرہ آشرم پر تقریر کی تھی اس میں ایک مقام پر فرمایا تھا کہ:

"میرا اصل اصول زندگی یہ ہے کوئی انسانی کام، خواہ اس کا فاعل کتنی ہی بڑی شخصیت رکھتا ہو۔ ہرگز فلاح یاب نہیں ہو سکتا تا وقتیکہ اس کی بنیاد مذہب پر نہ ہو۔ لیکن مذہب کیا ہے؟ وہ کتابوں کے مطالعہ سے نہیں ہو سکتا۔ اس کا تعلق دماغ سے نہیں، دل سے ہے۔ وہ شئے ہمارے خارج میں نہیں بلکہ ہمارے اندر ہے۔"[1]

کچھ دور آگے چل کر ارشاد ہوتا ہے:

"خوف کرنے کے قابل صرف ایک ہی ذات ہے (بشرطیکہ لفظ "ذات" استعمال اس موقع پر جائز ہو) یعنی وہ صرف ذات باری ہے، جو لوگ خدا سے ڈرتے ہیں انہیں بڑی سی بڑی ہستیوں کی بھی پروا نہیں رہتی۔"[2]

اسی لکچر کے خاتمہ پر کہتے ہیں:

"سیاست کو اگر مذہب سے الگ کر لیا جائے تو اس کے کوئی معنی ہی نہیں رہتے۔ اگر ہندوستان کے تمام سیاسی پلیٹ فارم طلبہ سے پُر ہو جائیں تو یہ میرے نزدیک قوم کی صحیح ترقی کی دلیل نہیں ہو سکتی...... سب سے پہلے مذہبی روح کی بیداری لازمی ہے۔ اور جب ہم اس میں کامیاب ہو لیں، اس وقت ہمارے لئے اور سب میدان کھلے ہوئے ہیں۔"[3]

الٰہ آباد کے ایک عام جلسہ میں مسئلہ تعلیم قدیم و جدید پر لکچر دیتے ہوئے مہاتما جی کے الفاظ یہ تھے:

"ہندوستان کا قدیم تمدن جس کی بنیاد روحانیت پر ہے مادی قوتوں سے کہیں افضل ہے۔ ہندوستان کی آب و ہوا میں مذہب سرایت کئے ہوئے ہے

---

[1] و [2] و [3] مجموعہ تقاریر گاندھی ص ۲۸۴ و ص ۲۹۳

مذہبی پابندی ہر ہندوستانی کا اولین و آخرین فرض ہونا چاہیے۔ ہمیں اپنی
ساری طاقت کا ماخذ روح و خدا کو بنانا چاہیے۔ اس وقت سوراج بات
کہتے مل جائے گا[1]"

۱۹۰۹ء میں انہوں نے جنوبی افریقہ سے انڈین کانگریس کے نام ایک پیام بھیجا تھا۔ اس میں اپنی
اور اپنی جماعت کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے:

"ہم لوگ کوشش کرتے ہیں کہ عداوت کو محبت سے مسخر کریں۔ ہم لوگ
جسمانی و حیوانی قوت کا مقابلہ روحانی سے کرتے ہیں۔ ہمارا اعتقاد یہ ہے
کہ تمام دنیوی حکام و جماعات کے احکام سے بالاتر و مقدم تر احکام الٰہی کی
پابندی ہے۔ چنانچہ احکام خداوندی کی تعمیل میں ہمیں جو کچھ بھی درد و دکھ
پہنچتا ہے ہم اسے صبر و شکر کے ساتھ برداشت کرتے ہیں[2]"

دسمبر ۱۹۱۶ء میں صوبہ سنٹرل کالج الہ آباد کے جلسہ طلبا کے سامنے اقتصادی ترقی اور اخلاقی
ترقی پر ایک مبسوط لکچر دیا تھا۔ اس کا ماحصل یہ تھا کہ ہر قسم کی ترقیاں اخلاقی زندگی پر منحصر و
موقوف ہیں۔ آخر میں کہتے ہیں:

"جس وقت ہم میں دولت سے زیادہ راستبازی، زرپرستی و جاہ پرستی سے
زیادہ بے خوفی اور خود پسندی سے زیادہ خاکساری پیدا ہو جائے گی، اس
وقت ہماری قوم روحانیت سے آشنا ہوگی ..... سب سے پہلے ہمیں الٰہی
بادشاہت اور رضائے الٰہی کی تلاش کرنا چاہیے۔ اس کے بعد وعدۂ برحق
یہ ہے کہ سب کچھ ہمیں حاصل ہو جائے گا"

گاندھی صاحب جب جنوبی افریقہ میں جیل خانہ بھیجے گئے اور قید بامشقت کی سختیاں جھیلنا پڑیں
ہیں اس وقت انتہائی شدائد و مصائب کا سامنا تھا۔ جیل خانہ سے ڈیڑھ میل کے فاصلہ پر
جاکر انہیں پھاوڑا لے کر زمین کھودنی ہوتی تھی جو نہایت سخت تھی اور سپاہیوں کو تاکید یہ
تھی کہ ہاتھ رکنے نہ پائے۔ گاندھی کو کام کرتے ہوئے کئی گھنٹے ہو چکے تھے۔ جسم میں بالکل سکت

---

[1] مجموعۂ تقاریر گاندھی ص ۲۹۹ [2] انڈین ریویو (مدراس) دسمبر ۱۹۱۶ء

انہیں باقی رہی تھی۔ پھاوڑا ایک من کا وزنی معلوم ہوتا تھا۔ اس پاس کے رفقا کو غش آ رہا تھا۔ ہاتھوں میں آبلے پڑ گئے تھے اور ان سے پانی برابر جاری تھا۔ وارڈر کی ڈانٹ ڈپٹ اس پر تازیانہ تھی۔ عین اس وقت گاندھی جی فرماتے ہیں کہ:

"میں نے خدا سے دعا مانگی کہ مجھے استقامت کی توفیق اور میرے اعضا جسم کو اس قدر قوت عطا ہو کہ کام جاری رکھ سکوں۔ میں نے خدا پر نظر رکھی اور کام میں مشغول رہا۔"[1]

ایک اور موقع پر انہوں نے اپنی تقریر میں کہا کہ:

"جس شخص کی زندگی کی بنیاد مذہب پر نہیں اس کی بنیاد کسی اصول پر نہیں اور جس زندگی کی بنیاد کسی اصول پر نہیں وہ مثل اس کشتی کے ہے جو بغیر پتوار کے ہو۔ ایسی کشتی ہمیشہ بحرِ حوادث میں ہچکولے کھاتی رہے گی اور باوجود انتہائی سعی کے کبھی ساحل مقصود تک نہ پہنچ سکے گی۔"

چند سال ہوئے جب وہ مظلومان ٹرانسوال کی چارہ جوئی کے سلسلے میں انگلستان جا رہے تھے، تو جہاز پر ایک رفیقِ سفر نے ان سے کچھ سوالات کیے جن کے جوابات اخبارات میں شائع ہوئے۔ ان کے ضمن میں انہوں نے فرمایا:

"سب سے زیادہ مقدس و محترم وہ انسانی جذبہ ہے جو اپنے خالق سے وابستہ و مربوط رکھتا ہے۔ اس مقدس جذبہ کے احترام کی خاطر اگر ان کی جان جاتی ہو تو انہیں بے تامل دے دینا چاہیے۔ جو لوگ خدا پر ایمان رکھتے ہیں انہیں کسی قسم کا خوف نہیں باقی رہ جاتا۔[2] جو لوگ خدا کی فرماں برداری کرنا چاہتے ہیں انہیں دنیا سے دست بردار ہو جانا چاہیے اور دنیوی طمع و خوف کو چھوڑ کر اپنے خدا سے اس طرح چمٹ جانا چاہیے جیسے شیر خوار بچہ اپنی ماں کے سینے سے چمٹا رہتا ہے۔"[3]

انگلستان پہنچ کر لندن میں "امرسن کلب" کے سامنے انہوں نے جو تقریر کی اس میں انہوں نے موجودہ تمدن کے معائب و نقائص کا سرچشمہ اس امر کو بیان کیا کہ:

"یہ انسان کو خارجی مشاغل میں اس قدر منہمک کر دیتا ہے کہ اس کے پاس اپنے

---

[1] انڈین ریویو (مدراس) دسمبر ص ۱۱۵
[2] مسلمان ناظرین قرآن پاک کی یہ آیت یاد کریں: "جو لوگ خدا کو دوست رکھتے ہیں انہیں کوئی خوف یا غم نہیں ہوتا۔"
[3] مجموعہ تقاریر ص ۱۹۵

باطن اور اپنی اصلیت پر غور کرنے کا کوئی وقت ہی نہیں باقی رہ جاتا ہے۔ وہ مقصدِ حیات سے بالکل غافل ہو جاتا ہے اور روح پر جسم کو مقدس سمجھنے لگتا ہے۔ مقصدِ حیات یہ ہے کہ انسان ایمان راسخ و عمل صالح کے ساتھ زندگی بسر کرے۔ اور انسان جتنا زیادہ جسم و تن کی فکر میں پڑا رہتا ہے اسی قدر روح کو وہ فنا کرتا جاتا ہے۔[1]"

تصریحات بالا سے جن کے مثل صدہا مزید اقتباسات گاندھی جی کی تحریروں اور تقریروں سے دیے جا سکتے ہیں، ہر شخص کو نظر آ سکتا ہے کہ اُن کا اصلی پیام اخلاق اور روحانیت کا پیام ہے۔ خدا اور روح کا نام ہر موقع پر اور ہر وقت ان کی زبان اور زبانِ قلم پر رہتا ہے۔ وہ خواہ طلبہ کے سامنے تقریر کر رہے ہوں، خواہ تاجروں کے سامنے، خواہ تعلیم کے مسئلہ پر گفتگو کر رہے ہوں، خواہ سیاسیات پر، خواہ اخبار میں مضمون لکھ رہے ہوں، خواہ کتاب تصنیف کر رہے ہوں۔ ذکرِ خدا سے کسی وقت ان کی زبان خالی نہیں رہتی۔ جیل خانہ میں جب وقت انہیں ناقابلِ برداشت مصائب سے دوچار ہونا پڑا اُس وقت انہوں نے خدا ہی کو یاد کیا (جس کا حوالہ اوپر گزر چکا ہے)۔ اسی طرح پچھلی کانگریس میں (بہ مقام ناگ پور) جب انہیں انتہائی کامیابی حاصل ہوئی، تو فرطِ مسرت میں بھی انہوں نے سب سے پہلے خدا ہی کو یاد کیا اور اپنے اخبار میں ایک لیڈنگ آرٹیکل انکسار و فروتنی کی اشد ضرورت پر شائع کیا جس کے ابتدائی فقرے یہ تھے:

"عدم تشدد لازمی طور پر انکسار کی جانب لے جاتا ہے۔ عدم تشدد کے معنی ہی یہ ہیں کہ خدا پر آسرا لگایا جائے جس کا آسرا کبھی غلط نہیں ثابت ہوا۔ لیکن اس کی بارگاہ میں حضوری فروتنی اور خضوع قلب ہی کے ساتھ ممکن ہے۔ حامیین ترکِ موالات کو کانگریس میں اپنی نمایاں کامیابی پر قطعاً مغرور نہ ہونا چاہیے۔ نہیں جوں جوں کامیابی حاصل ہوتی جائے ہم کو شجر ثمردار کی طرح زیادہ جھکتے جانا چاہیے۔[2]"

گاندھی صاحب کو ایک طرف پر ہندو مذہب کا پابند کہہ سکتے ہیں، مگر کون ہندو مذہب؟ وہ بگڑا ہوا مذہب نہیں جس میں صدہا رسوم و قیود شامل ہو گئے ہیں اور بت پرستی جس کا ایک لازمی جزو سمجھ لی گئی ہے۔ بلکہ ہندوستان کا وہ قدیم ترین مذہب، جو اپنی بالکل خالص و فطری شکل میں تھا جس کی تعلیم خالص توحید

---

[1] مجموعہ تقاریر صفحہ ۱۹۔ یہ آخری فقرہ مشہور صوفی اسلام مولانا رومی کے اس شعر کا گویا ترجمہ ہے:
شعر: تا تو تن را چرب و شیریں میدہی ۔ جوہر جان را نہ بینی فربہی [2] "ینگ انڈیا" مورخہ ۱۲ جنوری ۱۹۲۱ء

کی تعلیم تھی اور جس میں شرک و بت پرستی کا نام تک نہ تھا[1]۔ وہ اپنی ذات سے خالص موحد ہیں اور تمام کو صادق و منجانب اللہ سمجھتے ہیں۔ اُن سے جب ان کے مسیحی سوانح نویس نے سوال کیا کہ وہ کس خاص مذہب کو سب سے بہتر سمجھتے ہیں تو انھوں نے جواب دیا کہ ان کی نظر میں تمام مذاہب کی یکساں وقعت ہے اور وہ حضرت محمدؐ و امام حسینؓ، حضرت موسیٰؑ، حضرت عیسیٰؑ، زردشت، گوتم بدھ، سری رام چندر و سری کرشن، گرو نانک، کبیر داس وغیرہ مختلف مذاہب کے بزرگوں، پیمبروں اور رہنماؤں کی تعلیمات کی دل سے عزت و تکریم کرتے ہیں[2]۔ اپنے اخبار "ینگ انڈیا" نیز دوسری تحریروں میں جس طرح وہ سری کرشن و سری رام چندر کے حوالے دیتے رہتے ہیں، اسی عقیدت کے ساتھ وہ کثرت سے حضرت مسیحؑ، آنحضرتؐ و امام حسینؓ کی زندگی کے واقعات بھی اسناد و استشہاد میں پیش کیا کرتے ہیں اور سچے داعی حق کی ایک بڑی خصلت یہ بھی ہے کہ وہ اپنے کسی پیش رو کی تکذیب و توہین نہیں کرتا، بلکہ ان کے سب پیامات و تعلیمات کی تائید و تصدیق ہی کرتا رہتا ہے۔

مسلمان ناظرین اس سلسلہ میں اس واقعہ کو یقیناً دلچسپی سے سنیں گے کہ جنوبی افریقہ میں جب گاندھی صاحب کو قید بامشقت جھیلنا پڑی ہے، تو اس وقت اپنے ہمراہ جیل خانہ میں چند کتابوں کو وہ خاص طور پر اجازت حاصل کر کے لے گئے ہیں۔ اُن میں انجیل اور ہندوؤں کی بعض مذہبی کتابوں کے علاوہ قرآن (مترجم) اور ایک مولوی صاحب کی کوئی مذہبی کتاب بھی تھی[3]۔ جیل خانہ میں ان کا معمول یہ تھا کہ صبح وہ بھگوت گیتا کا مطالعہ کرتے تھے۔ دوپہر کو قرآن کی تلاوت میں مشغول رہتے تھے اور شام کو انجیل کا درس دیتے تھے[4]۔

اسلام کا سب سے بڑا کارنامہ اشاعتِ توحید ہے۔ اسلام کا اصل الاصول صرف یہی عقیدہ توحید ہے۔ باقی اور تمام مسائل و عقائد اسی کی فروع ہیں۔ اسلام نے جس قدر افراد کو ہادیانِ حق تسلیم کیا ہے ان سب میں شرک و بُت پرستی کی تردید اور توحید کی ترویج ہی مشترک رہی ہے۔ یہ خدمت تنہا پیمبروں کے لئے مخصوص نہیں، بلکہ اب تک جس قدر بھی اولیاء، صوفیہ، کاملین و عارفین گذرے ہیں

[1] "لائف آف گاندھی" مؤلفہ ریورنڈ ڈوک صفحہ ۹۳ [2] ڈوک صاحب کی "لائف آف گاندھی" کے علاوہ ان کی تحریروں میں متفرق مقام پر بکثرت ملتے ہیں [3] مجموعہ تقاریر صفحہ ۱۱ [4] ایضاً

سب اپنے اپنے رنگ میں اور ملک و زمانہ کے مقتضیات کو ملحوظ رکھ کر اسی خدمتِ توحید پرستی کو انجام دیتے رہے ہیں۔ گاندھی صاحب کی تعلیم اس معیار پر بھی حرف بحرف پوری اترتی ہے۔ ان کی تعلیمات و مساعی عمل کا ماحصل ظاہر یہ ہے کہ دنیا سے شرک کی بیخ کنی کی جائے اور توحید کو از سرِ نو رواج دیا جائے۔

یہ دعویٰ اول نظر میں نہایت عجیب نظر آئے گا۔ لیکن اگر شرک و بت پرستی کا صحیح مفہوم پیش نظر ہو تو یہی دعویٰ اس قدر بدیہی ہو جائے گا کہ پھر کسی دلیل کی حاجت نہ باقی رہے گی۔ عام مسلمان بت پرستی و شرک کے یہ معنی لیتے ہیں کہ پتھروں کی مورتیں بنا کر انہیں پوجیں انہیں خدا یا ہمسرِ خدا سمجھا جائے۔ اس میں شبہ نہیں کہ یہ بھی ایک مفہوم ہے۔ لیکن اگر ان اصطلاحات کا حصر صرف اس مفہوم پر کر دیا جائے، تو دنیا میں بجز ان لوگوں کے جو بالکل ہی کم عقل و جاہلِ مطلق ہیں اور کسی پر شرک و بت پرستی کا اطلاق نہ ہو سکے گا۔ کیونکہ بجز اس طبقہ کے اور کوئی شخص بھی پتھر کی مورتوں کے خدا ہونے کا یقین نہیں رکھتا۔ حالانکہ قرآن کی بیّن شہادت موجود ہے کہ جاہل وحشی قومیں نہیں بلکہ وہ قومیں شرک میں مبتلا تھیں جو تہذیب و شائستگی میں نہایت بلند پایہ تھیں۔ مدتوں سے حکومت و سلطنت کی مسند آرا تھیں۔ صنائع و فنون میں کامل دستگاہ رکھتی تھیں اور قوت و شوکت میں اپنا جواب نہیں رکھتی تھیں۔ ان مہذب و متمدن و شائستہ اقوام کا شرک کیا ہوتا ہے؟ مورتوں کی پرستش، ان کی بت پرستی کیا ہوتی ہے؟ مورت پرستی نہیں، بلکہ زر پرستی، زن پرستی، جاہ پرستی، قوت پرستی، شہوت پرستی، عیش پرستی، دولت پرستی اور نفس پرستی، یہی توحید و خدا پرستی کی راہ کے اصل موانع کون ہوتے ہیں؟ پتھر کی مورتیں نہیں بلکہ یہی ملک و مال، زر و زمین، زن و فرزند، اعزہ و احباب کے اوہام و خیالاتِ فاسدہ۔ سرخیلِ صوفیائے کرام، عارف رومی ایک جگہ انہیں معبودانِ باطل کی جو جادۂ حقیقت کے لئے سنگِ راہ کا کام دیتے ہیں، اپنے مخصوص حکیمانہ انداز میں تفصیل کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

گہ خیالِ فرجہ[۱] و گاہے دکان — گہ خیالِ علم گاہے خان و مان
گہ خیالِ مکتب و سوداگری — گہ خیالِ تاجری و داوری
گہ خیالِ نقرہ و فرزند و زن — گہ خیالِ بوالفضول و بوالحزن
گہ خیالِ آسیا و باغ و راغ[۲] — گہ خیالِ میغ[۳] و ماغ[۴] و بیغ[۵] و للاغ[۶]

---

[۱] تن آسانی [۲] دامن کوہ [۳] ابر [۴] ایک پرندہ خوشنما [۵] افسردگی و بددلی [۶] زندہ دلی و خوش دلی

گہ خیالِ آشتی و جنگہا　　　گہ خیال ناہما و ننگہا
گہ خیال کالہ دکانہا ے معاش　　　گہ خیال ملک و شہ کاہ بے فراش

(مثنوی دفتر دوم)

انسان کا سب سے بڑا شرک اس کی خود پرستی ہے اور اس کا سب سے بڑا بت خود اس کا نفس ہے۔ مولانا فرماتے ہیں:

مادر بتہا بتِ نفسِ شماست　　　زانکہ آن بت مار و این بت اژدہاست

پتھر کی مورتوں کو توڑ دینا آسان ہے، لیکن اس بت کو توڑنا نہایت دشوار کام ہے اور جو لوگ اسے معمولی درجہ کی چیز سمجھتے ہیں وہ سخت گمراہی میں مبتلا ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے:

بت شکستن سہل باشد نیک سہل　　　سہل دیدن نفس را جہل است جہل

گاندھی صاحب نے بھی اپنی زندگی کا مشن انہیں مشرکانہ اعمال و حالات کو مٹانا رکھا ہے۔ جن کا مجموعی نام تہذیب و تمدنِ جدید ہے۔ سائنس اور تعلیم، ریل و تار، ملیں اور کارخانے، بینک اور تجارتی کوٹھیاں، ہسپتال اور شفاخانہ، لیبوریٹریاں اور یونیورسٹیاں، موٹر اور آلات ہوائی، غرض اس طرح تمدن و ترقی کے جس قدر بھی مظاہر ہیں اور اس بتکدے کے جتنے اصنام کہہ ہیں ان سب کو وہ ایک ایک کر کے توڑنے کے لئے پیدا ہوئے ہیں اور ان سب کے وہ یکساں دشمن ہیں۔

یورپ اور خصوصاً انگلستان کی زندگی عموماً ہمارے لئے باعثِ رشک ہے۔ محبانِ وطن کا بلند ترین نصب العین یہ ہے کہ جن برکاتِ تمدن (شہری آزادی، سیاسی حقوق، معاشرتی سہولتیں وغیرہ) سے انگلستان مستفید ہو رہا ہے ہندوستان کے حصہ میں بھی جلد سے جلد وہ نعمتیں آنے لگیں، اور ہندوستان آزاد مرفہ الحال و پُررونق ہو کر ایک دوسرا انگلستان بن جائے۔ گاندھی صاحب اس تخیل کے ایک ایک جزیہ کو مٹانا چاہتے ہیں۔ ان کے نزدیک انگلستان کی حالت بجائے قابلِ تقلید و قابلِ رشک ہونے کے مستحقِ ہمدردی و رحم ہے اور ہندوستان کو بجائے اس کی تقلید کے ہمیشہ خدا سے دعا مانگتا رہنا چاہیئے کہ اس حالت سے محفوظ رہے۔ پارلیمنٹ جسے تمام آزاد انسٹیٹیوشنوں کی ماں سمجھا جاتا ہے، اس کی صحیح تمثیل صرف ایک بازاری کسبی سے دی جا سکتی ہے جس کے نہ کوئی مضبوط اصول ہیں اور نہ کوئی اعلیٰ اخلاق ہے اور جو آج اگر ایسکویتھ صاحب کے قبضہ میں ہے، تو کل بالفور صاحب کے۔ دعویٰ یہ کیا جاتا ہے کہ اس کے ارکان بہترین اہلِ ملک منتخب ہو کر آتے ہیں، جو بلا معاوضہ محض

ملکی خدمات کے لئے ایثار کے ساتھ کام کرتے رہتے ہیں۔ لیکن واقعہ یہ ہے (اور اس واقعہ کی صحت سے کسی کو جائے انکار نہیں) کہ یہ ارکان عموماً خود غرض و منافق ہوتے ہیں اور ان کی کسی رائے کو ثبات و استقلال نہیں۔ وزرا جن کے ہاتھ میں وقتی طور پر پارلیمینٹ کی باگ ہوتی ہے، راشی و مرتشی ہوتے ہیں۔ یہ رشوت روپیہ کی نہیں، بلکہ جاہ و اقتدار، خطاب و اعزاز کی ہوتی ہے اور اس کے لینے اور دینے والے دونوں صداقت و دیانت سے بیگانہ ہوتے ہیں۔ عام رعایا اپنے اخبارات کے بیانات کو وحی و الہام کے مرتبہ پر رکھتی ہے اور یہ اخبارات خود اپنی اپنی پارٹی کے اغراض کے لئے حق و صداقت سے یہ مراحل دور، بالکل یکطرفہ خبریں چھاپتے رہتے ہیں۔ اس تاسف انگیز اخلاقی پستی کی ذمہ داری انگریزی قوم پر نہیں، بلکہ جدید تمدن پر ہے، جو روز بروز تمام اقوام یورپ کو تباہ و برباد کرتا جا رہا ہے۔[1]

گاندھی صاحب انگریزی حکومت سے بالذات مطلق مخالفت نہیں رکھتے۔ انہیں اصلی دشمنی موجودہ تمدن سے ہے جس کے بار سے ہندوستان پسا جا رہا ہے اور اس دشمنی کا اصلی باعث یہ ہے کہ یہ تمدن خدا پرستی و مذہب کا منکر ہے۔ یہ دعوٰی چونکہ نہایت اہم ہے اس لئے ہم گاندھی صاحب کے اصل الفاظ اردو میں منتقل کئے دیتے ہیں:

> "یہ میری قطعی رائے ہے کہ ہندوستان انگریزی حکومت سے نہیں بلکہ جدید تمدن کے بلا سے کچلا جا رہا ہے ..... مجھے مذہب عزیز ہے اور میرا پہلا شکوہ یہی ہے کہ ہندوستان روز بروز لامذہب ہوتا جا رہا ہے۔ مذہب سے میری مراد ہندوؤں، مسلمانوں یا پارسیوں کا کوئی مخصوص مذہب نہیں، بلکہ وہ مذہب جو تمام مذاہب کی اصل ہے۔ ہم خدا سے دور ہوتے جا رہے ہیں۔[2]"

ایک سطر آگے بڑھ کر اس کی مزید توضیح سنئے:

> "ہم ہندوستانیوں پر یہ الزام ہے کہ ہم لوگ کاہل و پست ہمت ہیں۔ درآنحالیکہ اہل یورپ چست باہمت ہیں۔ ہم نے اس الزام کو تسلیم کیا ہے اور اس کے مطابق اپنی حالت بدلنا چاہی ہے (یعنی اہل یورپ کی سی مستعدی و ہمت حاصل کرنا چاہی ہے) حالانکہ اسلام، مسیحیت، بودھیت، ہندویت وغیرہ جملہ مذاہب کی یہ تعلیم ہے کہ ہمیں امور دنیوی میں سست اور امور مذہبی میں مستعد رہنا چاہیے اور دنیوی

---

[1] انڈین ہوم رول صفحہ ۲۵ [2] ایضاً صفحہ ۳۶-۳۷

حوصلہ مندیوں کو محدود اور دینی حوصلہ مندیوں کو غیر محدود رکھنا چاہیئے۔ چستی و مستعدی کا مصرف اعمال مذہبی ہی کو رکھنا چاہیئے[1]۔

ریل، عدالتیں اور اسپتال تمدن جدید کے نمایاں ترین مظاہر اور برکات تمدن کے عنوانات جلی ہیں۔ گاندھی صاحب کا اگر بس چلے تو یہ تینوں چیزیں ایک لمحہ بھی باقی نہ رہنے پائیں۔ وہ ان کے خلاف وعظ کہتے ہیں اور نہایت پُرزور وعظ کہتے ہیں اور حسب عادت دلائل مذہبی و اخلاقی ہی لاتے ہیں۔ ریل کے سلسلہ میں فرماتے ہیں کہ خدا نے انسان کے شوق نقل و حرکت کی ایک حد مقرر کر دی ہے اور اسی حد کے متناسب اس کے قویٰ اور اعضائے جسم بنائے ہیں، لیکن انسان ان حدود یعنی اپنے پیروں کی محدود قوت پر قانع نہیں رہتا اور اسی بلند پروازی کا یہ نتیجہ ہے کہ اسے انواع و اقسام کے مصائب سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔

"خدا نے انسان کو عقل عطا کی تھی کہ اس سے معرفتِ خالق حاصل ہو۔ انسان نے اس کے برعکس اسے اپنے خالق کی فراموشی میں صرف کیا۔ اسی طرح ہر فرد کی خلقت اس طرح واقع ہوئی ہے کہ وہ محض اپنے ہمسایوں کی خدمت کر سکتا ہے۔ اپنی حد سے قدم باہر رکھ کر انسان کو مختلف طبائع و مختلف مذاہب کے افراد سے سابقہ پڑتا ہے اور وہ بدحواس ہو کر رہ جاتا ہے ...... اس لحاظ سے ریلوے انسان کو اس کے خالق سے دور کرنے میں اور معین ہوتی ہے[2]۔"

اس کے آگے پیشۂ وکالت، پیشۂ ڈاکٹری اور محکمۂ عدالت وغیرہ دیگر "برکاتِ تمدن" کی پردہ دری[3] کے بعد جہاں جہاں اپنے تخیل کے مطابق صحیح نظام تمدن کا خاکہ کھینچے ہیں، وہاں خداپرستی و روحانیت پر زور دینے کے ساتھ جس کی بابت متعدد اقتباسات اوپر گذر چکے، فرماتے ہیں کہ:

"نفس انسانی ایک مضطرب پرندے کے مانند ہے جس قدر اس کی خواہشیں پوری کی جاتی ہیں اس کی حرص بڑھتی جاتی ہے اور پھر بھی تسکین نہیں ہوتی۔ ہم اپنے جذبات کی جس قدر سیری کی فکر میں رہتے ہیں اسی قدر وہ مطلق العنان ہوتے جاتے ہیں۔ جذبات پروری کو حدود کے اندر رہنا چاہیئے۔ مسرت و راحت تمامتر ایک ذہنی شے ہے۔

---

[1] انڈین ہوم رول ص ۳۷ [2] ایضاً ص ۴۷ [3] ایضاً ۵۶ تا ۶۵

انسان کے لئے امارت کی بنا پر راحت اور افلاس کی بنا پر غم لازمی نہیں، بلکہ عموماً یہ دیکھا گیا ہے کہ راحت غربا کے حصہ میں اور غم امرا کے حصہ میں رہتا ہے اور دنیا کی بڑی آبادی ہمیشہ غریب ہی رہے گی۔ انہیں حقائق کو پیش نظر رکھ کر ہمارے دوراندیش اسلاف نے ہماری عیش پسندیوں اور نفس پرستیوں کے لئے حدود و قیود مقرر کیے ہیں اور زندگی کو ہر طرح پر سادہ رکھنے کی تاکید کر گئے۔ "کسب معاش کے لئے معمولی ہل"۔ رہنے کے لئے چھپر اور جھونپڑے اور نشوونما کے لئے سادہ قسم کی تعلیم بالکل کافی ہے۔ صحیح نظام تمدن سے مقابلہ و کشمکش حیات کے طریقوں کو قطعاً فنا ہو جانا چاہیے۔ ہر فرد کو باطمینان و قناعت اپنے اپنے پیشہ یا کام میں لگے رہنا اور معمولی اجرت لیتے رہنا چاہیے۔ آلات اور مشینری کے قصے سے الگ ہی رہنا چاہیے۔ اس لئے کہ ان چیزوں پر توجہ کا یہ لازمی نتیجہ ہوتا ہے کہ شیرازۂ اخلاق درہم برہم ہو جائے گا اور ہم اپنی آزادی نفس کھو بیٹھیں گے۔ انسان کی اصلی مسرت و راحت خود اپنے ہاتھوں، پیروں کے استعمال میں ہے، نہ کہ مشینری سے کام لینے میں۔ زندگی دیہات میں بسر کرنا چاہیے۔ بڑے بڑے شہر بداخلاقیوں کا گھر ہوتے ہیں۔ چوروں اور ڈاکوؤں، طوائفوں اور آوارہ منش لوگوں کے گروہ شہر ہی میں بستے ہیں۔ اور غربا پر امرا کے مظالم شہر ہی میں ہوتے ہیں۔ دیہاتی زندگی بہترین زندگی ہوتی ہے۔ حکومت کو ہمیشہ اخلاق اور روحانیت کا مطیع رہنا چاہیے اور حکام و سلاطین کو کبھی فقرا و اہل باطن کے احکام سے سرتابی نہ کرنا چاہیے۔ عدالتوں، ڈاکٹروں اور وکیلوں کا وجود قائم رہ سکتا ہے لیکن ماتحت رہ کر، افسر بن کر نہیں۔ ڈاکٹروں اور وکیلوں کو عام رعایا کے خدمت گزار کی حیثیت سے رہنا چاہیے نہ کہ ان سے دولت گھسیٹنے اور انہیں تباہ کرنے کے لئے۔ عدالتوں اور مقدمہ بازی سے ہمیشہ دور رہنا چاہیے۔ وکیلوں کے دلالوں کو قطعاً فنا ہونا چاہیے۔ عام رعایا کو بغیر کسی جھگڑے میں پڑے ہوئے سکون کے ساتھ اپنی کاشتکاری میں مشغول رہنا چاہیے۔ قدیم ہندی تمدن میں یہ تمام خصوصیات موجود تھے۔ اسی کی جانب از سر نو رجوع کرنا چاہیے۔[1]

[1] انڈین ہوم رول ص ۶۵-۷۱

"تعلیم" جس کا جدید تمدن میں اس قدر غلغلہ بلند ہے اگر اس سے مراد محض کتابی خواندگی ہے، تو اس سے جہالت بہتر ہے۔ صحیح تعلیم سے مراد اخلاقی تعلیم ہونا چاہئے جو طلبہ میں فرض شناسی اور حقوق اللہ و حقوق العباد کی معرفت پیدا کرسکے[1]۔"

غرض انتہائی سادگی و روحانیت کے ساتھ تمدن اس طرح پھیلنا چاہیے کہ دنیا خود جنت بن جائے اور اس شعر کی پوری مصداق ہوجائے:

بہشت آنجا کہ آزارے نباشد   کسے را با کسے کارے نباشد

سب سے بڑھ کر یہ کہ یہ وقت توبہ استغفار اور گناہوں سے معافی مانگنے کا ہے[2]۔"

تصریحات بالا کے بعد کس کو اس امر میں شبہہ باقی رہ جاتا ہے کہ گاندھی صاحب کی تعلیم تمام تر روحانی تعلیم ہے۔ ان کی تعلیم وہی ہے، جو ہر ملک اور ہر زمانہ میں انبیا اولیا، کاملین، عارفین و ہادیانِ حق کی رہی ہے اور جس کا ماحصل یہ ہے کہ مادیت کو ترک کرو۔ مادی قوتوں کی پرستش سے (جو عملی شرک ہی کی ایک مثال ہے) توبہ کرو، گناہوں سے بچو۔ راست بازی، نیک چلنی، دیانت، امانت اختیار کرو۔ طبائع میں انکسار، حلم، فروتنی پیدا کرو۔ قناعت، ایثار و توکل کی عادت ڈالو۔ عدل و انصاف کے راستہ پر چلو۔ حرص و ہوس، شہوت پرستی، ظلم و سخت گیری، مکر و فریب، زر پرستی، جاہ پرستی کو دوزخ کا دروازہ سمجھو۔ خدا پر بھروسہ رکھو اور ہر وقت اسی پر نظر رکھو اور جو کچھ کرو وہ رضائے الٰہی کے لیے کرو۔ روح کی زندگی کو جسم کی زندگی پر مقدم رکھو۔

یہ ہیں گاندھی کی تعلیم کے مرکزی اصول۔ رہا یہ امر کہ اب کچھ عرصہ سے وہ سیاسی تحریکات میں کیوں اس انہماک کے ساتھ حصہ لینے لگے ہیں؟ سو اس کا جواب یہ ہے کہ جن شیطانی قوتوں کو وہ مٹانا چاہتے ہیں ان کی سب سے زیادہ قوی و زبردست حامی اس وقت انگریزی حکومت ہے۔ اس لیے لامحالہ وہ سب سے پہلے راستہ سے اس بھاری پتھر کو ہٹانا چاہتے ہیں۔ ان کے اصول پر ایمان رکھنے والوں کے لیے یہ ضروری نہیں کہ وہ ان کے سیاسی پروگرام کے ایک ایک جزئیہ سے بھی اتفاق کریں۔ ان کی بعض سیاسی کارروائیاں راقم ہذا کی فہم سے بالاتر ہیں[3] لیکن اس سے ان کے اصول کی صحت میں (جو دراصل ان کے

---

[1] انڈین ہوم رول ص ۱۰۸-۱۱   [2] الفیا ص ۱۳۳   [3] ان کے بعض سیاسی متبعین ان کا نام لے کر ملک کے مختلف حصوں میں جو اصول اخلاق و روحانیت کے بالکل منافی کارروائیاں کر رہے ہیں انہیں گاندھی صاحب کی جانب منسوب کرنا ایسا ہی ہے جیسے موجودہ مسیحی اقوام کی بداعمالیوں کا ذمہ دار حضرت مسیح اور انجیل کی تعلیمات کو قرار دیا جائے۔

ذاتی اصول نہیں ہیں بلکہ قدیم سے برگزیدہ شخص کے اصول چلے آ رہے ہیں) کوئی فرق نہیں آسکتا۔ موجودہ تمدن کی عمر اب قریب ختم ہے۔ لیکن کوئی قوم اس وقت تک نہیں مٹتی جب تک پہلے اُسے غفلت سے بیدار کرنے والے اس میں پیدا نہیں ہو لیتے۔ گاندھی صاحب موجودہ زمانے میں بھی اس فرض کو سب سے پہلے ادا کرنے والے ہیں۔ یورپ میں متعدد اشخاص زمانۂ حال میں ان کے پیشرو ہو چکے ہیں۔ جن میں سب سے مشہور روس کا مشہور درویش ٹالسٹائے ہوا ہے۔ ٹالسٹائے کی متعدد تصانیف میں جو حکمت معرفت سے لبریز ہیں اور ان میں بعینہ اسی قسم کی صوفیانہ درویشانہ تعلیم ہے جو گاندھی صاحب کی ہے اور جس سے مستفید ہونے کا خود گاندھی صاحب نے بلا اعتراف کیا ہے انگلستان کے مشہور ادیب رسکن اور ایک اور مصنف ایڈورڈ کارپنٹر کی بھی یہی تعلیم رہی ہے۔ معاصرین میں اڈمنڈ ہومس کے خیالات بھی بہت کچھ گاندھی صاحب سے ملتے جلتے ہیں۔ یہ اصحاب جہاں تک عقلی و ذہنی حیثیت کا تعلق ہے گاندھی صاحب سے فائق ہوں لیکن جہاں تک عملی حیثیت کا تعلق ہے گاندھی کی شخصیت ان سب سے ممتاز ہے۔ ممکن ہے گاندھی کی شخصیت اس وقت نہ صرف ہندوستان میں بلکہ تمام دنیا کے پبلک اشخاص میں (زاویہ نشیں بزرگوں کا ذکر نہیں) بے نظیر ہے۔ لیکن یہ ایک علٰحدہ بحث ہے جس پر لکھنے کے لئے ایک مبسوط مضمون کی ضرورت ہوگی۔

بعض ظاہر آلود مسلمان احباب کی جانب سے ممکن ہے کہ یہ اعتراض ہو کہ اگر گاندھی صاحب واقعۃً ایک باکمال روحانی معلم ہیں تو باضابطہ مسلمان کیوں نہیں ہو جاتے۔ ان احباب کی خدمت میں التماس ہے کہ گاندھی کی اعلیٰ ترین توحید پرستی کا ثبوت تو صفحات گذشتہ میں گذر چکا۔ محبت رسولؐ کا ثبوت بھی ان کے اقوال و اعمال دونوں سے بدرجہ اتم مل سکتا ہے۔ رہا ان کا "باضابطہ اسلام" سو ایک مرتبہ خود حقائق سنجان اسلام نے تسلیم کیا ہے، جہاں پہنچکر کفر و اسلام کے ظاہری امتیاز فنا ہو جاتے ہیں:

عارف ہم از اسلام خراب است و ہم از کفر ‌ ‌ ‌ پروانہ چراغ حرم و دیر نداند

اسی عالم میں پہنچکر شمس تبریز کی یہ صدا آنے لگتی ہے:

چہ تدبیر اے مسلماناں کہ من خود را نمی‌دانم ‌ ‌ ‌ نہ ترسا و یہودیم نہ گبرم نی مسلمانم

زیادہ سے زیادہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ گاندھی صاحب اظہار خیال ہمیشہ انہیں اصطلاحات میں نہیں کرتے جو مسلمانوں میں مقبول و مروج ہیں لیکن ظاہر ہے کہ اختلاف اصطلاحات اہل نظر کے نزدیک قطعاً بے حقیقت ہے۔ راہ راست کی ہدایت خواہ عربی زبان میں کی جائے، خواہ سنسکرت میں اور خواہ انگریزی میں بہرصورت

یکساں ہے۔ سلطان العارفین سلطان ابوسعید ابوالخیر نے اسی موقع کے لئے فرمایا ہے:

روی تو بہر دیدہ کہ بینند نکوست　　　نام تو بہر زبان کہ گیرند خوش است

رومی "پیمبر بے کتاب" کا ارشاد ہے کہ بارگاہ ایزدی میں الفاظ و اصطلاحات کے اختلافات سے کچھ نہیں ہوتا۔ یہاں جو شے دیکھی جاتی ہے، وہ محض نیت ہوتی ہے نہ کہ الفاظ و اصطلاحات:

ہر کسی را سیرتی بنہادہ ایم　　　ہر کسی را اصطلاحی دادہ ایم

ہندیان را اصطلاح ہند مدح　　　سندھیان را اصطلاح سندھ مدح

ما بروں را ننگریم و قال را　　　ما دروں را بنگریم و حال را

چند ازیں الفاظ و اضمار و مجاز　　　سوز خواہم سوز، با آں سوز ساز

ملت عشق از ہمہ دینہا جدا ست　　　عاشقاں را مذہب و ملت خدا ست

گاندھی جی بھی اسی "ملت عشق" کے پیرو و راہ نما ہیں اور اس لئے ان کا مذہب تمام مذاہب و ادیان سے جدا ہے۔

(مارچ ۲۱ ۱۹ء) ●●

بشیر حسین زیدی

مذہب اور وطن پرستی

تاریخ کا مطالعہ بتلاتا ہے کہ جب کبھی پرانے اور بوسیدہ طریق زندگی کی بنیادیں گرائی جاتی ہیں اور ان پر نئی معاشرت و سیاست کی شاندار عمارتیں قائم کی جاتی ہیں تو نئی اصلاحیں، تغیرات اور اضافے اپنے ساتھ بہت سی غلطیاں اور نقائص بھی لایا کرتے ہیں۔ وہ وقت جب کہ قومی زندگی کا ایک عہد ختم اور دوسرا دور شروع ہوتا ہے درحقیقت بہت نازک اور بے حد غور و احتیاط اور دور اندیشی برتنے کا زمانہ ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر انسانی زندگی کو لیجئے جس وقت کہ بچپن کا تابناک اور پراز انبساط زمانہ مع اپنی سادگی اور بھولے پن کے رخصت ہوتا ہے اور جوانی کا ہلکا ہلکا احساس شروع ہونے لگتا ہے۔ جب کہ شباب کی تمنائیں اور آرزوئیں قلب کو آہستہ آہستہ گدگداتی ہیں اور انسان خود اس تیز گام آنے والی زندگی سے اچھی طرح واقف نہیں ہوتا۔ یہی وہ زمانہ ہوتا ہے جب کہ لڑکے کے والدین استاد اور بزرگوں کے فرائض بہت بھاری اور اہم ہو جاتے ہیں کیوں کہ اس وقت کے اثرات و خیالات عموماً کبھی نہ مٹنے کے لئے پیوستہ ہو جاتے اور ہمیشہ کے لئے انسان کے مستقبل کا فیصلہ کر دیتے ہیں۔ چند ضروری استثناؤں کے بعد یہی مثال قومی زندگی پر صادق آتی ہے۔ قومیں بالعموم عہد جدید کی ہر نئی چیز کو لذیذ سمجھ کر دست شوق دراز کیا کرتی ہیں۔ مگر نئی رو موتیوں کے ساتھ خس و خاشاک بھی بہا لایا کرتی ہے۔ اس وقت قوم کے ارباب دانش اور صاحبان بصیرت کا فرض ہوتا ہے کہ وہ اوروں کی رہنمائی کریں اور ان کو اچھے اور برے، کھوٹے اور کھرے میں امتیاز کرنا سکھلائیں تاکہ وہ خس و خاشاک کے بدلے بے خبری میں اپنے لعل و گہر نہ دے بیٹھیں۔

بیسویں صدی کا آغاز مشرق کی تاریخ میں بہت بڑی اہمیت اور دلچسپی کا زمانہ ہے۔ یہ وہ وقت ہے جب کہ سوتے ہوؤں نے کروٹ لی۔ صدیوں کا لباس کہن اتار اگیا اور تاریخ نے ایک نیا ورق پلٹا۔ خود داری و خود مختاری کی رو چاروں طرف پھیل گئی۔ قومی حریت و آزادی

نے قلوب کو گرمایا اور برِ اعظم کی دشت دجبل میں حب وطن کے ترانے پھیلنے شروع ہو گئے ایشیا نے عہد قدیم کے اثر اور استبداد سے رہائی پاکر نئے نصب العینوں کی طرف قدم بڑھایا اور وہ زمانہ شروع ہوا جس کو ہم عہد جدید کے نام سے پکارتے ہیں۔

ہندوستان بھی جذبات وخیالات کے اس انقلاب اور عمل سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ اور بھارت ورش کے سپوتوں نے اس نئے پیغام پر آواز لبیک بلند کی۔ ایک نئی صدا بانگ درا بن کر کاروانِ خفتہ تک پہونچی جس نے ملک کی آنکھیں کھول دیں۔ خودداری اور قومیت کی نبض تیزی سے چلنے لگی اور ملک کی ترقی وبہبودی تمام روشن خیال افراد کا تنہا مقصود حیات بن گئی۔ غیرت کے پردے اٹھے۔ صدیوں کے قبضے اور تفرقے مٹنے لگے اور دریائے حیات میں حب وطن کی لہریں اٹھنے لگیں۔ موجودہ زمانے میں ملک کے تمام لیڈر اس امر کی سر توڑ کوشش کر رہے ہیں کہ ہندوستان کے مختلف فرقوں اور ملتوں کو رشتۂ اتحاد میں منسلک کر کے ایک متحد کر لیمیٹ فارم پر لے آئیں۔ بجائے خود یہ ایک قابل قدر اور اعلیٰ مقصد تھا مگر انسان اکثر اوقات کسی خاص نقطۂ خیال کا اس قدر گرویدہ ہو جاتا ہے اور اس کی قدر وقیمت اس درجہ مبالغہ کرتا ہے کہ وہ اور چیزوں کی ضرورت اور اہمیت کو خواہ اس سے زیادہ گراں قدر اور عالی منزلت بھی کیوں نہ ہوں فراموش کر دیتا ہے۔ انقلاب فرانس (۱۷۸۹ - ۱۸۱۵) کے زمانے میں "حریت، مساوات، اور اخوت" کا سیاسی عقیدہ اس طرح زبان زد خلائق ہو گیا اور فرانس کے لوگ اس قدر جوش اور دیوانے پن کے ساتھ اس کے پیرو بنے کہ اس کے علاوہ دنیا کی ہر ایک اچھی یا بری چیز فراموش کر دی گئی۔ جہاں صدیوں پرانے طریقے اور قاعدے آن واحد میں مٹا دیے گئے وہاں مذہب کی بنیادوں کو بھی متزلزل کر دیا گیا۔ معابد اور کلیساؤں کی علانیہ بے حرمتی کی گئی۔ اخلاقی قیود اور بندشوں کو بالکل توڑ دیا گیا۔ وہ روحانی تعلیم جو اُن سے زیادہ زبردست اور روشن دماغوں سے نکلی تھی پس پشت ڈال دی گئی اور ہر شخص اپنی انفرادی عقل کو رہبر کامل اور خضر راہ سمجھنے لگا۔ اگر عہد انقلاب فرانس آنے والی نسلوں کی تعریف اور شکریہ کا اس لیے مستحق ہے کہ اُس نے قیمتی اور گراں قدر سیاسی اصولی تعلیم دی ہے تو اس کے ماتھے پر یہ کلنک کا ٹیکہ بھی ہمیشہ چمکتا رہے گا کہ اس نے مذہب اور روحانیت کی تعلیم کو حقارت کے ساتھ ٹھکرا کر مادیت اور نفس پرستی کو انتہائی درجہ پر پہونچا دیا۔ اس کا جو کچھ نتیجہ ہوا

وہ تاریخ داں حضرات پر روشن ہے اور دیگر اقوام کے لیے سبق آموز۔

آج جہاں مغربی تعلیم کے زیر اثر ہم اپنی خودداری کو مٹا چکے ہیں وہاں اپنے خزانہائے روحانی کو بھی بہلے بادۂ اغیار بنا چکے ہیں۔ ہندوستان قدیم کا جو فلسفۂ مذہب ہمیں ورثے میں ملا تھا ہم نے اُسے مغربی مادیت پر نثار کر دیا۔ بیشک ہم نے حب وطن کا سبق یورپ سے سیکھا لیکن یہ ایک زبردست غلطی ہوگی اگر ہم اس کے ساتھ ساتھ مذہب کی اہمیت کو فراموش کر دیں۔ آج کل ہندوستان میں یہ خیال عام طور پر ظاہر کیا جاتا ہے کہ "ہم ہندوستانی پہلے ہیں۔ اور ہندو یا مسلمان بعد میں ہیں" غور کرنے پر معلوم ہوگا کہ یہ قول بہت کچھ صداقت کے ساتھ ساتھ ایک بہت بڑی غلطی پر مشتمل ہے۔ اگر یہ فقرہ مذہبی تعصب اور تنگ نظری کے برخلاف اظہار نفرت اور اس سے بالا رہنے کی ہدایت کرتا ہے تو ہمیں اس کی صداقت ماننے میں کوئی تامل نہیں۔ مگر یہ اس حد سے بہت آگے نکل کر ایک بڑے قومی خطرے کی صورت پیدا کرتا ہے اور مذہب کو ثانوی حیثیت دے کر سیاست کو اُس سے بلند تر قرار دیتا ہے۔ ہمیں ایک لمحہ کے لئے بھی فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ قومیت محض سیاسی بنیاد پر کبھی قائم نہیں ہو سکتی۔

"میزینی" اٹلی کا مشہور محب وطن جس کی تمام زندگی اپنے ملک کے لئے ایک طویل قربانی تھی اپنی تحریروں میں ہمیشہ اس امر پر سب سے زیادہ زور دیتا رہا ہے کہ خدا کو ماننے اور اس پر بھروسہ کرنے کے بغیر سیاست مضبوط اور مستحکم بنیادوں پر ہرگز قائم نہیں ہو سکتی۔ اس کا مقولہ تھا کہ "قومی زندگی کی بنیاد خدا اور صداقت کی پرستش ہے"۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ہمارا طرز عمل کیا ہونا چاہیے؟ ہم روزمرہ دیکھتے ہیں کہ مذہبی تفرقے ترقی کے راستے میں مسلسل رکاوٹیں بن رہے ہیں اور ادنیٰ ادنیٰ باتوں پر کشت و خون کا باعث ہوتے ہیں۔ ایسی صورت میں مذہب روح وطن پرستی کو پیدا کرنے میں کیا امداد دے سکتا ہے؟

میرا جواب یہ ہے کہ وطن پرستی سیاست کے معاملے میں مذہب کی قدر و قیمت گھٹانے سے نہیں پیدا ہوگی۔ بلکہ خود مذہبی جذبات کو پاکیزہ بنانے سے۔ مذہب نفرت و حقارت اور قتل و تقسیم کا سبق نہیں سکھاتا۔ مذہب محض رسم پرستی یا کسی خاص طریقے سے خالق کی پرستش کرنے

پرستش نہیں ہے کیوں کہ مختلف روحانی پیشواؤں نے مختلف زمانوں میں پیدا ہو کر اپنی قوم کی ضروریات وروایات کے مطابق مختلف طریقہ ہائے عبادت تعلیم کیے تھے۔ مذہب کی اصلی اور بنیادی تعلیم یہ ہے کہ اپنی ذات، بنی نوع انسان اور خدا کے متعلق ہمارے کیا فرائض ہیں۔ مذہب عبد اور معبود اور واجب و ممکن کے درمیان ایک تعلق پیدا کر کے ہمیں بتلاتا ہے کہ ہم دنیا میں کن فرائض کو انجام دینے آئے ہیں اور ہم کو نیکی اور پاکیزگی، محبت اور ہمدردی کا سبق پڑھاتا ہے۔ مذہب ایک محرک روح ہے جو ہمارے قلب کو نئی امیدوں اور مقاصد عالیہ سے پُر کر دیتی ہے اور ہمیں کشمکش حیات میں سے کامیاب نکلنے کی قوت عطا کرتی ہے۔ مذہب ہمیں بتلاتا ہے کہ تمام بنی آدم آپس میں بھائی بھائی ہیں اور خالق کائنات ان سب سے بلا امتیاز مذہب و ملت محبت کرتا ہے پس حقیقی اور سچا مذہب ہمارے اتحاد اور ترقی میں کسی طرح مانع نہیں ہوگا بلکہ اس کے حصول کا واحد مکمل اور قوی ذریعہ۔ وطن پرستی ہمیں یہ سکھاتی ہے کہ ہم ذاتی منفعت کی تنگ حدود سے نکل کر ابنائے ملک سے ہمدردی کریں اور یہ مذہب اور صرف مذہب ہی ہے جو ہمیں بے نفسی اور بے غرضی کی مکمل تعلیم دے سکے گا۔ ایک اعلیٰ اور پاکیزہ مذہب میں کوئی بات ایسی نہیں ہو سکتی جو بلند ترین قومی جذبات اور تمناؤں کے برخلاف ہو۔ جس طرح کہ کوئی باعقیدہ شخص ملک کو مذہب سے مقدم نہیں سمجھے گا اسی طرح مذہب کا اعلیٰ اور گراں قدر نام ہرگز اس تعلیم پر صادق نہیں آسکتا جو حب وطن جیسے مقدس جذبے کی منکر ہو۔ آج ہندوستان کو جو شے درکار ہے وہ یہ نہیں کہ مذہب کو ثانوی حیثیت دے کر قومیت کو اس سے بڑھا دیا جائے بلکہ خود مذہبی جذبات و خیالات کو اس بلندی تک پہنچانا چاہیے کہ قومیت جزو مذہب بن جائے۔ ہندوستان کو کم مذہب کی ضرورت نہیں بلکہ ایک زیادہ اور روشن خیال مذہب کی۔ آج ہمیں اس چیز کی ضرورت ہے جو یورپ کی تاریخ میں رفارمیشن (عہد اصلاح مذہب) اور رینیاسنس (عہد احیائے علوم) کے ناموں سے یاد کی جاتی ہے۔ اس ملک کے باشندوں کے درمیان جو جہالت بت پرستی اور رسوم و قیود کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہیں اور مختلف مذہبوں، گروہوں ذاتوں اور گوتوں میں تقسیم ہو کر تنگ نظری و محدود خیالی کی حد کو پہنچ گئے ہیں مذکورہ بالا اصلاح مذہب اور احیائے علوم کو عمل میں لانا ایک بے حد مشکل اخلاقی اور دماغی جدوجہد ہوگی لیکن اگر ہم اس میں کامیاب ہوگئے

تو یہ انعام بھی مناسب ہوگا کیوں کہ مذہبی جذبات ہی کو حرکت میں لاکر ہم تیس کروڑ ہندوستانیوں کے قلوب تک پہنچ سکتے ہیں۔ اصلاح مذہب ہی ہمارے ملک کی ہر گیر نجات کا باعث ہو سکتی ہے اور کسی قوم کی اخلاقی اور روحانی ترقی تمام سچے طالبان خدا کا حقیقی اور بیش قیمت انعام ہوتا ہے۔ ملک کے عمیق النظر لیڈر اس بات کو خوب اچھی طرح سمجھ چکے ہیں۔ گوکھلے آنجہانی ہمیشہ اسی امر پر زور دیا کرتے تھے کہ وطن پرستی کی عمارت مذہبی جذبات پر قائم ہونی چاہیئے۔ اور آج مہاتما گاندھی، تلک مہاراج، محمد علی و شوکت علی اور مولانا حسرت موہانی کی شخصیتوں میں ہم اس کی عملی مثال پا سکتے ہیں۔

ہندوستان ہمیشہ سے مذہب پسند رہا ہے اور آج سے ہزاروں برس پہلے اس کے فرزندوں نے وہ وہ باریک روحانی نکات حل کیے ہیں جو آج مادہ پرست عقلوں کو حیرت میں ڈال رہے ہیں۔ آج بھی بھارت ورش ایک روحانی پیغام کا حامل ہے اور دنیا کو ازلی صداقت کا راستہ دکھانے پر مامور ہے۔ میری دعا ہے کہ ہمارا مذہبی عقیدہ اور روحانی احساسات زمانۂ ماضی سے کم نہیں بلکہ زیادہ ہوں اور ہم دنیا میں اس اعلیٰ مقصد کو حاصل کر سکیں جو قضا و قدر ہمارے لئے مقرر کر چکی ہے۔

(اکتوبر ۱۹۱۹ء) ●●

نوٹ:۔ جس مسئلہ پر صاحب مضمون نے سرسری نظر ڈالی ہے وہ نہایت دقیق بحث چاہتا ہے ہم اس وقت اس بحث کو چھیڑنا نہیں چاہتے ہیں صرف اس قدر عرض کر دینا ضروری ہے کہ مسٹر گوکھلے کے بارے میں یہ خیال غلط ہے کہ "وہ ہمیشہ اس امر پر زور دیا کرتے تھے کہ وطن پرستی کی عمارت مذہبی جذبات پر قائم ہونی چاہیے"۔ بخلاف اس کے مسٹر گوکھلے کی تمام زندگی اس امر کی بین مثال ہے کہ انھوں نے مذہب اور سیاست دونوں کو ایک دوسرے سے جدا رکھا۔ غالباً صاحب مضمون کو مسٹر گوکھلے کے اس مقولے سے غلط فہمی ہوئی ہوگی کہ ہماری پبلک لائف ایسی پاک و صاف ہونی چاہیے کہ اس میں روحانیت کی تاثیر پیدا ہو اور لوگوں کو حب وطن ایسا ہی عزیز ہو جیسا کہ مذہب۔ ظاہر ہے کہ وہ خیال جو صاحب مضمون نے اوپر بیان کیا ہے اس بیان سے قطعی مختلف ہے۔ ایڈیٹر ؔ امید

جے۔ آر۔ رائے

ہند کا افلاس کیوں کر دور ہو؟

کیا ہندوستان مفلس ہے؟ یہ بڑا معرکۃ الآرا سوال ہے۔ اور اس کے جواب جو بہم پہنچائے جاتے ہیں وہ بھی مختلف ہیں، مگر اس کی بابت دو خیالات ہیں۔ ایک گروہ یہ کہتا ہے کہ ملک ہند بہت غریب اور کنگال ہے۔ دنیا کا اور کوئی مہذب ملک اتنا مفلس نہیں جتنا کہ ہندوستان ہے۔ اس خیال کو پہلے پہل ولیم ڈگ بی انجہانی اور دادا بھائی نوروجی نے قائم کیا تھا۔ بعد ازاں اور لوگ بھی اس خیال کے معتقد ہو گئے، جن میں بیشتر ہندوستان کے ملکی لیڈر ہیں۔ آر۔ سی۔ دت مرحوم، دادا بھائی نوروجی کے شاگرد رشید نکلے اور ان کی کتابوں کا موضوع اولی افلاس ہند تھا جو تجارت کی بربادی، مالگزاری کے بار گراں پر مبنی قرار دیا گیا تھا۔ اس وقت بھی ہمارے سیاسی اور ملکی لیڈروں اور قومی دردمندوں کی جماعت کثیر اسی خیال کی معتقد ہے۔ اپنی تقریروں اور لیکچروں اور تحریروں میں افلاس ہی کا ذکر کرتی ہے۔ پچھلے سال ان ہی دنوں مسٹر شکرن نائر بہادر نے جو گورنمنٹ ہند کے صیغۂ تعلیمات کے مہتمم اعلیٰ تھے۔ لندن میں مسودۂ اصلاحات پر غور کرنے والی مشترکہ کمیٹی کے سامنے شہادت دیتے وقت اس امر پر خصوصیت سے زور دیا کہ افلاس ہند دن بدن بڑھتا جاتا ہے جو زراعت اور حرفت پیشہ گروہوں کی اقتصادی حالت سے بخوبی عیاں ہے۔ بعد ازاں آپ نے مسٹر بلسنٹ کے نو زائیدہ اخبار "یونائٹڈ انڈیا" میں ایک مفصل مضمون لکھ کر اس امر پر سب سے زیادہ زور ڈالا کہ ہندوستان دن بدن غریب ہوتا جاتا ہے اور یہ کہ اس کے متعلق گورنمنٹ ہند کے پاس زبردست ثبوت اور معلومات موجود ہیں جنہیں وہ شایع کرنا نہیں چاہتی۔ اس سے ظاہر ہے کہ ہندوستان کے نامی گرامی لیڈر اور محبان وطن روز افزوں افلاس کے قائل ہیں۔ اور گورنمنٹ کو اس کے انسداد کی تاکید کرتے ہیں۔ برخلاف اس کے دوسرا فریق

افلاس ہند کا قائل نہیں ہے، بلکہ اس کا یہ دعویٰ ہے کہ ملک دن بدن آسودہ ہوتا جاتا ہے۔ اور اس کے ثبوت میں تجارت کی کثرت اور دیگر امور پیش کیے جاتے ہیں۔ اس گروہ کے اراکین میں زیادہ تر انگریز ہیں۔ ہندوستانیوں کا شمار قلیل ہے۔ قصہ کوتاہ ہر دو فریق اپنے دعوے کے ثبوت میں دلائل اور اعداد پیش کرتے اور ایک دوسرے کی تردید میں مصروف رہتے ہیں۔

سر ولیم ہنٹر اور ایک سابق گورنر مدراس اور ایک دو اعلیٰ عہدے دار انگریزوں نے ستر سال ہوئے بیان کیا تھا کہ ہندوستان اس قدر مفلس ہے کہ کئی کروڑ آدمی رات کو خالی پیٹ سوتے ہیں۔ اس بیان کی بنا پر بعض انگریزوں اور ہندوستانی سیاست دانوں نے یہ نظریہ قائم کیا کہ ہندوستان افلاس کے بوجھ کے نیچے دبا جاتا ہے۔ مسٹر نوروجی نے جو کتاب افلاس ہند پر لکھی تھی اس کے شروع ہی میں ذکر ہے کہ یہ کتاب اس عرض داشت پر مبنی ہے جو ۱۸۷۳ء میں مالیۂ ہند کی تحقیقات کرنے والی کمیٹی کے روبرو پیش کی گئی تھی۔ اس کے شمار و اعداد اب سے پچاس برس پہلے کے ہیں۔ اس وقت کی اقتصادی حالت کی روشنی میں مسٹر نوروجی کے کئی دعاوی اور خیالات درست ثابت ہوں گے۔ مگر موجودہ حالات بلاشبہ پچاس سال قبل کے حالات سے بالکل ہی مختلف ہیں۔ انیسویں صدی کے پرانے اعداد اس وقت صحیح ثابت نہیں ہوں گے۔ مسٹر آر۔ سی۔ دت کی مشہور کتاب "اکانمک ہسٹری آف انڈیا" ۱۹۰۰ء کی تصنیف ہے اور جو اعداد اس میں مندرج ہیں وہ طباعت سے دس پندرہ بیس سال بیشتر کے پرانے ہیں۔ گویا دت صاحب کی بحث اب سے تیس چالیس سال بیشتر کے حالات کی روشنی میں تھی اور بڑی حد تک برحق تھی۔ کیا اس سے کسی معاملہ فہم واقف کار کو انکار ہو سکتا ہے؟ موجودہ حالات گذشتہ دس سال کی نسبت بہت مختلف ہیں۔ شرح اجرت دوگنی اور تگنی ہو گئی ہے۔ مویشیوں کے دام بھی اسی تناسب سے بڑھ گئے ہیں۔ دودھ کی قیمت دوچند اور گھی تگنی ہو گئی ہے۔ اناج کی قیمت میں ساٹھ فی صدی سے کر نوے صدی تک بیشی ہو گئی ہے۔ قصہ کوتاہ ضروریات زندگی کی قیمت گذشتہ دس سال کے عرصہ میں بالاوسط دوچند ہو گئی ہے۔ اگر تجارت درآمد و برآمد

کے اعداد پر غور کیا جائے تو وہ بھی اس کی بیشی دو چند کے قریب ظاہر کرتے ہیں۔ ہم مسئلہ افلاس کی نسبت کسی خاص رائے کا اظہار نہیں کرنا چاہتے اور نہ ہی یہ بتانے کو تیار ہیں کہ مذکورۃ الصدر دونوں گروہوں میں سے کون راستی پر ہے اور کون غلط راستہ پر ہے۔ ہم فقط اتنا کہنا چاہتے ہیں کہ ہندوستان غریب ملک ہے۔ جس سے مفہوم یہ ہے کہ اقتصادی اور اضافی معنی میں ملک ہند مفلس ہے۔ لیکن ہم اس بات کے قائل نہیں ہیں کہ کروڑوں آدمی رات کو بھوکے پیٹ سوتے ہیں۔ اضافی اور اقتصادی صورت میں ہندوستان ضرور غریب ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ اگر ہندوستان کی سالانہ آمدنی اور قومی تمول کا مہذب ممالک کے ساتھ مقابلہ کیا جائے تو اول الذکر کا درجہ بہت ہی ادنیٰ ظاہر ہوگا۔ نیچے اعداد ملاحظہ ہوں جو ڈاکٹر جے۔ سی اسٹیمپ کی مشہور اور مستند تصنیف سے جس میں دنیا کی بڑی بڑی قوموں کی تمول آمدنی سے بحث ہے اور جو چند ماہ ہوئے طبع ہوئی تھی ماخوذ ہیں۔ مصنف مذکور کے بیان کی رو سے متحدہ امریکہ دنیا کا سب سے دولتمند ملک ہے کہ جس کی قومی دولت بیالیس ارب پونڈ اور سالانہ آمدنی کا اوسط ۷۲ پونڈ ہے۔ جرمنی کی قومی دولت برطانیہ سے زیادہ مگر سالانا آمدنی اس سے کہیں کم ہے۔ اس کی مجموعی قومی دولت ساڑھے سولہ ارب اور سالانا آمدنی بالاوسط ۳۰ پونڈ ہے۔ برطانیہ کی قومی دولت ساڑھے چودہ ارب اور سالانہ آمدنی ۴۸ پونڈ۔ آسٹریا ہنگری کی قومی دولت چھ ارب بیس کروڑ اور اوسط آمدنی اکیس پونڈ۔ روس کی قومی دولت بارہ ارب پونڈ۔ اٹلی کی چار ارب ۸۴ کروڑ اور آمدنی کا اوسط ۲۲ پونڈ ہے۔ ہسپانیہ کی دو ارب نوے کروڑ اوسط آمدنی گیارہ پونڈ۔ جاپان کی دو ارب چالیس کروڑ۔ سالانہ آمدنی چھ پونڈ فی کس ہے۔ ڈنمارک نہایت چھوٹا سا ملک ہے جس کا رقبہ ۱۶ ہزار اور آبادی ساڑھے ۲۷ لاکھ اور سالانہ آمدنی کے اوسط میں برطانیہ سے اتر کر یورپ میں دوسرا اور دنیا میں تیسرا درجہ ہے۔

یہ بھی بتا دینا مناسب ہے کہ "قومی دولت" کے اجزا کیا ہیں۔ ایک مشہور امریکن مصنف نے اپنی کتاب موسومہ "ویلتھ اینڈ انکم آف امریکن" میں قومی دولت کے اجزا حسب ذیل بیان کیے ہیں۔

زمین اور جائداد غیر منقولہ ، مویشی ، آلات کشاورزی ، سونے چاندی کی اینٹیں اور
سکے ، ریلوے لائن ، کارخانوں کی کلیں ، تار اور ٹیلی فون کے تار ، جہاز اور راہبار ، زمین کی پیداوار ،
کانوں کی پیداوار ، کپڑے اور زیورات ، سامان آرائش اور موٹر کاریں یا بگھیاں ۔ ایک جرمن ماہر
نے اپنی قومی دولت کے اجزائے اعظم یہ قرار دیے ہیں ۔ جائداد غیر منقولہ ، شہروں کی زمین
دیہات کی زمین ، کانیں ، ریلوے اور جنگلات ۔ جو چیزیں شخصی ملکیت کے اجزا ہیں ، وہی قومی
دولت کا حصہ ہیں ۔ ہماری تنگ دستی کے چند اسباب ہیں جن کی وجہ سے ہماری سالانہ آمدنی
مہذب ممالک میں بہت کم ہے یعنی دو پونڈ سالانہ اور قومی دولت تین ارب پونڈ ہے ۔ یہ تخمینہ ماہر
بیس پچیس برس ہوئے کیا تھا ۔ اس وقت چیزوں کی قیمت بہت ہلکی تھی جو اب چوگنی اور
پچگنی ہو گئی ہے ۔ دنیا کے مہذب ممالک میں اتنی بیکار اور مفت خور آبادی نہیں ہے کہ جتنی
ہندوستان میں پائی جاتی ہے ۔ مفت خوروں کا سب سے بڑھا ہوا ہے ۔ ۱۹۱۱ء کی مردم شماری کا
کی رو سے کام کرنے والے آدمی ۴۸ فی صد ہیں اور ان کی کمائی مفت اڑانے والے ۵۲ فی صدی
ہیں ۔ برطانیہ میں صرف ۱/۲ آبادی بیکار ہے اور ممالک میں ۱/۲ اور ۱/۵ کے درمیان پائی جاتی ہے ۔ اس
کے سوا ایک اور قباحت یہ ہے کہ جس تناسب سے آبادی ترقی کرتی ہے اسی تناسب سے وسائل
دولت میں ترقی نہیں ہوتی ۔ قیصر ہند میں ۲۵ کروڑ ایکڑ اراضی مزروعہ ہے اور بالاوسط ۲۲ کروڑ
ایکڑ زیر کاشت ہے ۔ اس رقبہ میں سال بسال ترقی نہیں ہوتی ۔ گو کھانے والوں کا شمار ہر سال بارہ
لاکھ کے قریب بڑھ جاتا ہے ۔ اس ضمن میں ایک امر اور قابل غور ہے اور وہ یہ ہے کہ آمدنی ہمیشہ
ضروریات کے تعلق میں شمار ہوتی ہے ۔ یورپ میں ایک مہذب آدمی ہوٹل میں دو ڈھائی روپیہ
ایک وقت کے کھانے کے واسطے خرچ کرتا ہے تب اس کی طبیعت سیر ہوتی ہے ۔ ہمارے
یہاں اسی حیثیت کا آدمی چھ آنے دے کر عمدہ کھانا ہوٹل میں کھا کر پیٹ بھر سکتا ہے ۔ کام
کرنے والے دو ڈھائی آنے میں ایک وقت پیٹ بھر کر کھانا کھا سکتے ہیں ۔ اور یورپ
کے اہل محنت کا پیٹ سوا روپیہ سے کم میں نہیں بھر سکتا ۔ گویا ہندوستان میں جتنے پیسے
ایک وقت کے کھانے میں خرچ کرنا پڑتے ہیں برطانیہ ، فرانس ، جرمنی وغیرہ میں اس قسم
کے کھانے کے واسطے اس سے چھ گنا زیادہ خرچ کرنا پڑتا ہے ۔ وہاں سخت سردی پڑتی

ہے۔ سرد کپڑے موسم گرما میں بھی درکار نہیں پڑتے اور موسم سرما میں مکان گرم رکھنے کے واسطے علاوہ دن کو کوئلہ جلانا پڑتا ہے۔ شراب اور گوشت خوراک کا لازمی جزو ہے۔ موٹے بھاری بوٹ اور بہت موٹے گرم کپڑوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ ہمارے یہاں گرم و خشک آب و ہوا میں ان باتوں کی ضرورت نہیں ہوتی۔

اس سے یہ امر واضح ہو گیا ہو گا کہ آمدنی ضروریات زندگی کے تعلق میں شمار ہوتی ہے۔ ہماری قلیل آمدنی والے یورپ کی کثیر آمدنی والوں سے زیادہ آسودہ ہیں اور آرام و آسائش کی زیست گذارتے ہیں[1]۔ اب سوال یہ ہے کہ آبادی کا کون سا گروہ سب سے زیادہ مفلس ہے۔ اس کے جواب میں یہ گذارش کیا جاتا ہے کہ اہل حرفہ اور اہل محنت جیسے اب فارغ البال ہیں ویسے پہلے کبھی نہ تھے۔ سیانے آدمی کہتے ہیں کہ جتنا روپیہ ان گروہوں کے پاس اب پایا جاتا ہے اتنا اس سے قبل ان کے پاس کبھی جمع نہ ہوا ہو گا۔ اگر کوئی تنگ حال گروہ ہے تو وہ پڑھے لکھے نوکری پیشہ ادنیٰ طبقہ کے لوگ ہیں جن کے پاس خاندانی شرافت کے سوا کچھ اور نہیں ہے۔ آمدنی قلیل اور اخراجات بہت ہیں۔ نہیں جانتے کہ کس طرح زندگی بسر کریں۔ لیکن ہماری دانست میں سب سے تنگ حال اور مفلس گروہ کسانوں اور کاشتکاروں کا ہے جو صرف زمین کی پیداوار پر دارومدار کلی رکھتے ہیں۔ جاگیردار اور زمیندار اور زمین کے مالکوں کا شمار چند لاکھ سے زیادہ نہ ہو گا لیکن کسان اور کاشتکار کروڑوں کی تعداد میں ہیں۔ زراعت پیشہ آبادی اور زمین سے روزی حاصل کرنے والوں کا شمار بائیس اور تیئیس کروڑ کے درمیان ہے اور کل آبادی ۴۴ر۷۲ فی صدی اسی جماعت سے تعلق رکھتا ہے۔ صنعت و حرفت والے ۶ر۱۱ اور اہل تجارت ۵ فی صدی۔ اور باربرداری کا کام کرنے والے بھی اسی قدر ہیں۔ ملازمت پیشہ ۷ر۱ فی صدی ہیں۔ کاشتکار اور کسان آبادی کا جزو اعظم ہیں اگر ملک کو آپ خوش حال بنانے کی فکر میں ہیں تو سب سے پہلے کسانوں کی مالی حالت سدھارنا چاہیئے۔ کیونکہ جب تک اس جماعت کا ادبار اور افلاس دفع نہ ہو گا ملک کبھی خوشحال

---

[1] اس عجیب و غریب رائے میں صاحب مضمون سے بہت کم لوگ اتفاق کریں گے۔ (اڈیٹر)

نہیں ہو سکتا۔ اگر ملک کو سوشیل اور اقتصادی خرابیوں سے آزاد کرنے کے درپے ہو تو سب سے پہلے کاشتکاروں کی خبر لو۔ اور جب تک یہ نہ ہوگا آپ ملک کو ترقی کی شاہراہ پر ڈالنے میں ہرگز کامیاب نہیں ہو سکتے۔ کسان لوگ مفلس اور تباہ حال ہیں۔ انہیں کسی معنی میں بھی دولتمند نہیں قرار دیا جا سکتا۔ دولت کے جو اجزا اور وسائل ہیں ان میں وہ تہیدست ہیں۔ گو دولت پیدا کرنے کی صلاحیت سے بے بہرہ نہیں ہیں۔

ماہرین اقتصادیات نے جو معیار آسودگی اور عدم وجود افلاس کے مقرر کر رکھے ہیں ان میں سے کسی معیار کی رو سے بھی کاشتکار لوگ دولت مند نہیں ثابت ہوں گے۔ ۱۸۸۰ء کے قحط کمیشن نے تحقیقات کے بعد یہ نتیجہ نکالا تھا کہ کاشتکاروں کا ۱/۳ حصہ قرضہ میں اس قدر مستغرق ہے کہ وہ اس سے رستگاری حاصل نہیں کر سکتا۔ اور ۱/۳ حصہ ایسا ہے کہ جو باسانی اس سے نجات حاصل کر سکتا ہے۔ چند برس ہوئے گورنمنٹ نے یہ بیان شایع کیا تھا کہ دیہاتی آبادی کا کل قرضہ تین ارب روپیہ ہے اور زرِ رہن کا ڈیڑھ ارب ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ یہ گروہ کس قدر مفلوک الحال ہے۔ اگر اس کی اقتصادی حالت سدھر جائے تو ہندوستان آپ سے دولت مند اور خوش حال بن جائے گا۔ اہل زراعت کی تباہ حالی اس کی قرضداری سے عیاں ہے۔ اس کے کئی وجوہ ہیں جن میں سے تین بہت بڑے ہیں۔

(۱) **سوشیل اسباب:**۔ بیاہ کی تقریب پر فضول نمایش میں بہت روپیہ خرچ ہوتا ہے اور یہ روپیہ ساہوکاروں کے بھائیوں سے ڈیڑھ دو روپیہ سیکڑہ ماہوار سے لے کر تین چار روپیہ سیکڑہ کی شرح پر لیا جاتا ہے۔ ساہوکار لوگ بے درد اور اپنے پیشہ میں ماہر ہوتے ہیں۔ مگر کسان لوگ سادہ لوح، دل کے نیک، مہاجنی پیچ سے سراسر بے خبر ہوتے ہیں۔ اسی وجہ سے جب ایک مرتبہ کوئی آدمی ان کے ہتھے کھاتہ میں پھنس جاتا ہے تو پھر وہ عمر بھر نہیں چھوٹ سکتا۔ سود در سود بھرتے بھرتے اس کی چندیا گنجی ہو جاتی ہے۔ بسا اوقات اس طبقہ کے لوگ اپنا در پیر سال قرضہ وصیت کر جاتے ہیں۔ پھر جب لڑکا پیدا ہوتا ہے یا گھر میں کوئی سیانا مر جاتا ہے تو پرانی مذموم رسم کی غلامانہ پیروی میں بے دریغ روپیہ اڑایا جاتا ہے۔

(۲) **نظام زمینداری:**۔ ملک کا بہت ہی بڑا حصہ زمینداروں اور مالکوں اور جاگیرداروں

بٹا ہوا ہے۔ جیسے بنگال کے زمیندار اور اودھ کے تعلق دار ہیں۔ اور دوسرے صوبوں میں بھی قریب قریب یہی تماشہ دیکھنے میں آتا ہے۔ البتہ دکن اور مدراس کی حالت دگرگوں ہے جہاں رقبہ چھوٹے چھوٹے مالکوں میں بٹا ہوا ہے۔ وہ ملکیت کے حقوق سے بہرہ ور ہیں اور براہ راست سرکار کو لگان ادا کرتے ہیں۔ یہ طریقہ رعیت داری کہلاتا ہے۔

نظام زمینداری میں یہ قباحت ہے کہ ملکیت کے حقوق ایک آدمی کو حاصل ہیں اور وہ کاشتکاروں سے کاشت کراتا ہے، جو مزارع کہلاتے ہیں اور پیداوار کا نصف حصہ خود لیتا ہے۔ زمیندار جب چاہتا ہے زمین چھین کر دوسرے کو دے دیتا ہے۔ اس وجہ سے کاشتکار کبھی خوشحال نہیں ہونے پاتے۔

(۳) یہ کہ کھیتی کا انحصار تمامی بارش پر ہے۔ اگر موقع پر پانی پڑ جائے تو وارے نیارے ہیں اگر ایسا نہ ہو تو خشک سالی اور قحط کا سامنا ہے۔ ہندوستان کے افلاس کا ایک بڑا سبب موسمی ہوا کا تلون ہے۔ امساک باراں سے فصل نہیں ہوتی اس وجہ سے کسان تباہ ہو جاتے ہیں۔ یہ بڑے سبب زراعت پیشہ آبادی کی تباہ حالی اور ناداری کے ہیں۔ کیا ان کی اصلاح ممکن ہے؟ اس کا جواب ہم اثبات میں دیتے ہیں۔ کاشتکاروں کے درمیان جو سوشیل خرابیاں ہیں وہ دور نہیں ہو سکتیں تاوقتیکہ ان کے دل و دماغ روشن نہ ہوں۔ لاکھ جتن کرو، وعظ اور نصیحت کا ان سادہ لوح قدامت پرست لوگوں پر کوئی اثر نہیں ہو سکتا۔ جب تک کہ ان کے درمیان تعلیم نہ پھیلائی جائے۔ ہندوستان کی جہالت آپ سے آپ دور ہو جائے گی اگر کاشتکاروں کو تعلیم دی جائے، ان کے درمیان جو فضول دستور اور تباہ کن رسمیں ہیں ان کا انسداد نہ اس صورت میں ہو سکتا ہے کہ کسانوں کو تعلیم دی جائے۔ مگر تعلیم کیسی ہو یہ کسانوں کی خاص ضرورت کے اعتبار سے رائج کی جائے۔ اگلے سال سے تعلیمات اور زراعت ہمارے ہاتھ میں آ جائے گی۔ اس لئے سوچ سمجھ کر ایسی اسکیم مرتب کی جائے کہ جس سے زراعت پیشہ آبادی زیادہ سے زیادہ فائدہ حاصل کرے۔ زمینداری نظام کی اصلاح کی اشد ضرورت ہے۔ گو یہ مسئلہ بہت نازک اور پیچیدہ ہے۔ صدیوں کے تعصبات کا مقابلہ ہے تو بھی اگر ملک کے مدبر اور وطن پرست مل جل کر کوشش کریں تو یہ مہم سر ہو سکتی ہے۔ اس بات کی ضرورت ہے کہ

کاشتکاروں کے فوائد اور حقوق کی حفاظت ہو اور پیداوار کا ایک بڑا حصہ کاشتکار کا حق معین ہو جائے۔ اگر اہل تجارت بنکوں اور مہاجنوں سے روپیہ لے کر اپنا کام چلاتے اور نفع کماتے ہیں اور اس کے بدلے تھوڑا سا سود ادا کرتے ہیں تو اسی اصول پر زمیندار کی زمین سے کاشت کا فائدہ اٹھانے کے مستحق ہیں اور اول الذکر معاوضہ کے حق دار ہیں بارش انسان کے حیطۂ قدرت سے باہر ہے تاہم اس کا علاج ہو سکتا ہے۔ ایسے وسائل واضح ہو سکتے ہیں کہ جن کی بدولت بارش کی احتیاج قطعی موقوف ہو سکتی ہے اور یہ کام گورنمنٹ انجام دے رہی ہے۔ قحط کا قرار واقعی علاج کرنے کے واسطے کئی برس ہوئے دریاؤں کے پانی سے آب پاشی کا مفید کام لینا شروع ہوا تھا۔ ۱۸-۱۹۱۹ء کی سرکاری رپورٹ کی رو سے ۶۶ ہزار ۲ سو میل نہریں جاری تھیں اور کئی نہریں زیر تجویز ہیں۔ ان کے زیر اثر سوا پانچ کروڑ ایکر رقبہ ہے۔ گو سیراب ڈھائی کروڑ ایکڑ ہوئے تھے۔ اس میں کہاں تک کامیابی ہوئی ہے وہ اس امر سے ظاہر ہے کہ ۱۹۱۹ء میں پنجاب کی نہروں سے ۹۰ لاکھ ایکڑ اراضی سیراب ہوئی جس سے ۵۵ کروڑ روپیہ کی فصلیں پیدا ہوئی تھیں اور سرکار کو سوا کروڑ سے زائد آمدنی وصول ہوئی اور ان نہروں پر ۲۲ کروڑ روپیہ خرچ ہوئے تھے جو علاقہ صدیوں سے غیر آباد پڑا ہوا تھا وہاں پر اب سبزہ زار اور لہلہاتے کھیت ہیں۔ پنجاب کے نہایت گنجان آباد اضلاع سے ۳۰ لاکھ آبادی وہاں پر بس گئی جو اب نہایت خوشحال اور اقبال مند ہے۔ سرمایہ دار تالاب اور نہریں کھدوا کر ملک کو بے حد فائدہ پہونچا سکتے اور خود نفع اٹھا سکتے ہیں۔ نہر سویز ایک کمپنی کی ملکیت ہے اسی طرح یورپ اور امریکہ کی بہت سی نہریں پرائیوٹ اشخاص کی کوششوں سے تیار ہوئی تھیں وہ بڑا نفع حاصل کر رہی ہیں۔ تالاب یا نہر کھود کر کاشتکاروں کو پانی بہم پہونچانے سے زراعت کو نفع عظیم پہونچ سکتا ہے۔ یہ بیوپار بڑا نفع مند ثابت ہو اگر اہل سرمایہ اور محبان وطن مل جل کر کوشش کریں اور یہ کام ہمارے کرنے کا ہے۔ خیر یہ تجاویز بیحد مفید ہیں اور ان سے نہ صرف زراعت پیشہ آبادی ہی کو نفع کثیر پہونچنے کی توقع ہو سکتی ہے بلکہ اہل حرفہ اور اہل تجارت اور دیگر گروہوں کو بھی بہت فائدہ پہونچے گا۔ مگر یہ دور کی باتیں ہیں اور ضرورت اس بات کی ہے کہ کسانوں کی حالت ابھی سے سدھاری جائے

اور انہیں تباہی سے بچایا جائے۔ اس لئے اس بات کی ضرورت ہے کہ ابھی ان کی اقتصادی حالت سنوارنے کے لئے عملی کام شروع کیا جائے۔ ہماری مراد باہمی امداد کی انجمنوں سے ہے اگر زراعت پیشہ اور نیز ملک ہند کی فلاکت اور غربت دور کرنے کی خواہش ہو تو باہمی امداد کی سوسائٹیوں کو ترقی دو۔ ان ہی کی بدولت ہندوستان کی اقتصادی نجات ممکن ہے۔ ان ہی کی برکت سے زراعت پیشہ آبادی اور اہل حرفہ کی تباہ حالی دور ہو سکتی ہے کیوں کہ ان انجمنوں کے وسیلہ سے برطانیہ، جرمنی، فرانس اور ڈنمارک وغیرہ کے کاشتکاروں اور صنعت پیشہ گروہوں کی مالی حالت سدھر گئی۔ وہ فلاکت سے نکل کر خوشحالی سے دوچار ہوئے اور اب دنیا کی دولتمند آبادیوں میں شمار ہوتے ہیں۔ پھر کیا وجہ ہے کہ ہندوستان کی آبادی کا حصہ اکثر ان انجمنوں کے وسیلہ سے اپنی قرضداری سے مخلصی حاصل نہ کرے۔ باہمی امداد کی انجمنوں کی ابتدا پہلے پہل برطانیہ میں ہوئی۔ ان کا مقصود اعلیٰ غریب اور محنت پیشہ جماعتوں کی اقتصادی حالت سدھارنا تھا۔ بعد ازاں اسی تحریک کی نقل فرانس میں کی گئی اور چند سال جرمنی میں بھی اس کا اعادہ ہوا۔ رفتہ رفتہ اس نیک اور مفید تحریک کی سودمندی کے سب گروہ قائل ہو گئے اور سب ملکوں میں باہمی امداد کی سوسائٹیاں قائم ہو گئیں۔ برطانیہ اور جرمنی میں ان انجمنوں نے بڑی ساکھ قائم کی۔ اہل حرفہ اور اہل محنت کی کایا پلٹ ہو گئی۔ جرمنی کی زراعتی بنکوں کی بدولت جرمنی کے کسان غربت سے رستگاری پا کر ترقیاں مندی کے ساتویں آسمان پر پہنچ گئے ہیں اور ڈنمارک میں کاشت کاران ہی انجمنوں کے وسیلہ سے اپنا ادبار دور کر کے یورپ کے دوسرے درجہ کی دولتمند قوم بن گئے۔ ہم اس آخر الذکر ملک کا ذکر خصوصیت سے کرنا چاہتے ہیں، کیوں کہ ہندوستان کو چھوڑ کر اگر مہذب دنیا میں کوئی ملک اب ہے کہ جو زراعت پر بسر اوقات کرتا ہے تو وہ ڈنمارک ہے کہ جس کی آبادی کا حصۂ اعظم زمین سے آزوقہ حاصل کرتا ہے۔ اب ذرا یہ امر ملاحظہ ہو کہ اس ملک کے باشندوں نے ضلالت سے نکل کر کس طرح معراج اوج حاصل کیا ہے۔ پچاس برس پہلے جب پرشیا نے حیلہ سازی اور فریب سے جنگ مول لی تو آخر کار شلیزوگ اور ہالسٹائن کے دو نہایت زرخیز اور آباد صوبے پرشیا سے ملحق کرنے پڑے۔ ان کا

رقبہ ۱۴ ہزار اور آبادی ۲۰ لاکھ کے قریب تھی۔ گویا نصف ملک جو نہایت عمدہ تھا غنیم نے مکر و فریب اور خونریزی سے حاصل کر لیا۔ آدھا ملک کا حصہ باقی رہ گیا جس کے بہت بڑے حصے پر ریت کے ٹیلے تھے اور کچھ علاقہ دلدلوں سے گھرا ہوا تھا۔ اس وقت یہ خیال کیا گیا تھا کہ ڈنمارک ہستی سے حرف غلط کے مانند معدوم ہو جائے گا کیونکہ تاوان اور الحاق علاقہ کے علاوہ اپنے جنگی مصارف بھی برداشت کرنے پڑے تھے۔ مگر اہل ڈنمارک بڑے عالی حوصلہ، دور اندیش اور کفایت شعار تھے اور ہیں۔ اس لئے اس مردانگی اور ہمت مردانہ سے کام لینے لگے پہلے ریت کے ٹیلے صاف کر کے دس لاکھ ایکڑ اراضی مزروعہ رقبہ میں شامل کی۔ پھر مویشیوں کی نسل بڑھانے کے لئے سلیز ویگ کے علاقہ سے اعلیٰ قسم کے بیل، گائے اور مویشی لائے۔ مکھن ڈنمارک کی بڑی بھاری صنعت ہے۔ ایک مشین کے اختراع سے جس سے منٹوں میں بالائی چھاچھ سے الگ ہو جاتی ہے، کام لیا گیا۔ کارخانے میں کسان لوگ دودھ لاتے اور مکھن نکلوا کر لے جاتے۔ اس سے اس کی صنعت میں بجلد ترقی ہوئی۔ سائنس دانوں نے سوچ سمجھ کر کاشتکاروں کے واسطے تعلیمی اسکیم وضع کی اور نیز نظام زمینداری میں بھی اصلاح ہوئی۔ لیکن سب سے زیادہ فائدہ باہمی امداد کی سوسائٹیوں سے پہونچا جو برطانیہ، فرانس اور جرمنی کی دیکھا دیکھی جاری کی گئیں۔ لیکن اب یہ دنیا کی بہترین اور قابل نمونہ انجمنیں شمار ہوتی ہیں اور قومیں ان کی نقل کرتی ہیں۔ اب وہاں پر ہر مقصد کے لئے باہمی امداد کی انجمنیں موجود ہیں۔ مویشی اور پرندے پالنے والی انجمنیں ہیں۔ کھاد، تخم، آلات کشاورزی بہم پہونچانے والی جانوروں کے بیمہ کے لئے مکھن پنیر انڈے فروخت کرنے کے واسطے گایوں کے دودھ کا حساب رکھنے والی انجمنیں الگ ہیں۔ ایک کا شمار ۵ ہزار سے اوپر ہے۔ ملک کی نصف تجارت درآمد و برآمد ان ہی سوسائٹیوں کی وساطت سے طے ہوتی ہے۔ نمکین گوشت بھی کروڑہا روپیہ کا تیار ہوتا ہے۔ ایک ایک کسان آٹھ آٹھ دس دس سوسائٹیوں کا ممبر ہوتا ہے۔

ڈنمارک کا نمونہ اہل ہند کے واسطے بہت ہی نیک ہے۔ کیونکہ دونوں ملکوں کے تمدنی اور اقتصادی حالات میں کچھ موافقت پائی جاتی ہے۔ اگر اپنے ملک کے حالات کو مدنظر رکھ کر ڈنمارک کی باہمی امداد کی سوسائٹیوں کی نقل کی جائے تو چند برس میں افلاس ہند بھاگتا نظر آئے۔ اس بات کی ضرورت ہے کہ زمینداری بنک اور باہمی امداد کی انجمنیں ہر بڑے گاؤں میں قائم کی جائیں۔ اور

قصبوں اور شہروں میں اہل حرفت اور اہل تجارت کو قائم کرنا چاہئے۔ لیکن دیہاتیوں کی اقتصادی حالت سدھارنا سب سے مقدم بات ہے۔ بیس بائیس برس ہوئے کہ زراعتی بنک قائم کیے گئے اور چند باہمی امداد کی انجمنیں بھی ۱۸۹۸ء میں قائم ہوئیں۔ ان سے ملک کو کس قدر فائدہ پہونچ سکتا ہے اسکی بابت عوام کو عرصہ تک کچھ معلوم نہ ہوا۔ مگر رفتہ رفتہ باہمی امداد کی تحریک سود مند ثابت ہوئی۔ ۱۹۱۴ء میں باہمی امداد کی سوسائٹیوں کے متعلق ایک قانون پاس ہوا۔ اور پھر ۱۹۱۲ء میں بھی ایک قانون نافذ ہوا۔ ۱۹۱۶ء کے آخر میں ملک ہند میں مع میسور اور ٹراون کے پونے اکیس ہزار زراعتی بنک اور پندرہ ہزار کے قریب باہمی امداد کی سوسائٹیاں تھیں۔ زمینداری بنکوں سے جہاں جہاں ہیں کاشتکاروں کو بیحد نفع پہونچ رہا ہے کیوں کہ انہیں ضرورت کے وقت دس فیصد شرح پر قرض مل جاتا ہے حالانکہ ساہوکاروں سے ۲۴ فیصدی سے ۴۰ فیصدی شرح سالانہ قرض تک اٹھانا پڑتا ہے۔ اس کا اندازہ اس امر سے ہو سکتا ہے کہ اگر کاشتکار باہمی امداد کی سوسائٹیوں سے ایک کروڑ روپیہ قرض لیں تو ایک سال میں ساہوکاروں سے قرض لینے کی نسبت دس لاکھ روپیہ کا نفع رہتا ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ زمینداری بنک کیسے مفید ہیں۔ لیکن پانچ لاکھ دیہات میں پونے اکیس ہزار بنک آٹے میں نمک کے برابر بھی نہیں ہیں۔ اگر کاشتکاروں کی مالی نجات ہو سکتی ہے تو صرف زمینداری بنک اور باہمی امداد کی انجمنوں کے وسیلہ سے ہو سکتی ہے۔ اگر ملک ہند کی بہتری مقصود ہو اور اگر اس ملک سے ادبار اور افلاس دور کرنے کی حقیقی خواہش دلوں میں جوش زن ہو تو کاشتکاروں کی حالت سدھارنے کے لئے باہمی امداد کی سوسائٹیاں قائم کیجائیں۔ نہ صرف زمینداری بنک ہی درکار ہیں۔ بلکہ تخم اور ضروری و مفید آلات اور مویشی کی نسل سدھارنے کے واسطے سوسائٹیاں قائم کی جائیں کہ جس سے کاشتکاروں کی حالت بہت جلد سدھر سکتی ہے کیونکہ ان وسائل سے زراعت ترقی پکڑتی ہے۔ زمینداری بنک کاشتکاروں کو روپیہ قرض دینے کے واسطے ہوں مگر سوسائٹیاں عمدہ قسم کے تخم، کاشتکاری کے آلات اور پانی کھینچنے کے پمپ اور کلیں مہیا کریں۔ مویشیوں کی نسل بڑھانا ضروری ہے۔ اسی وجہ سے باہمی امداد کی سوسائٹیاں قائم کی جائیں۔ اب زبانی جمع خرچ کا وقت نہیں ہے اور نہ فصاحت و بلاغت بگھارنے کی ضرورت ہے بلکہ ضرورت اس بات کی ہے کہ عملی کام اہل ملک کی بہتری کے واسطے ہونا چاہئے۔ اس لئے محبان

وطن کو چاہیے کہ دل و جان سے کوشش کی جائے اور ہر بڑے گاؤں میں بنک اور سوسائٹی قائم کی جائے۔ اگر ہر پانچ پانچ دس دس میل کے فاصلہ پر سر دست بنک اور سوسائٹیاں قائم ہوں تو ان کا بڑا اثر ہوگا کیوں کہ قدامت پرست اور جاہل آپ کی خوشنما تقریروں پر اعتبار نہ کریں گے لیکن جب وہ اپنے قرب میں ایک مفید سوسائٹی اور اس کا استفادہ دیکھیں گے تو آپ سے آپ یہ لوگ اسی قسم کا زمینداری بنک اور باہمی امداد کی سوسائٹی قائم کرلیں گے۔ اس سے ملک کو بجد نفع پہونچ سکتا ہے۔

(اگست۔ستمبر ۱۹۲۰ء) ●●

عبدالرزاق ندوی

مسئلۂ مصر

مصر کی اہمیت : ملک مصر جس کی آبادی ایک کروڑ بیس لاکھ ہے، براعظم افریقہ کے شمالی مشرقی حصہ میں واقع ہے۔ اس کے شمالی ساحلوں سے بحر متوسط شب و روز ہم آغوش رہتا ہے، اور مشرق میں بحر احمر اس کی گود میں کھیلتا ہے، جس کی ایک پتلی سی چیٹ طور سینا کو اُس سے جدا کرتی اور نہر سویز ہی کے ذریعہ بحر متوسط میں مل جاتی ہے۔ باقی دو طرف اس کے خشکی ہے۔ مغرب میں طرابلس ہے اور جنوب میں سوڈان کی تپتی ہوئی زمینیں اس کی پشت پناہی کرتی ہیں۔ نیز مشرق و مغرب کی سمت سے دو عظیم الشان صحرا یعنی صحرائے عرب اور صحرائے لیبیا اسے گھیرے ہوئے ہیں، جن کی چیرہ دستیوں سے محفوظ رکھنے کے لئے قدرت نے دونوں جانب دو پہاڑی دیواریں کھڑی کر دی ہیں، جنہوں نے اُسے اپنے دامنوں میں چھپا لیا ہے۔ ان کے درمیان میں مبارک دریائے نیل موجزن ہے جو مصر کو جنت نشان بناتا ہے اور جس کی بدولت اس میں حضرت انسان کی صورت نظر آتی ہے ورنہ کُل ملک ریگستان ہونے کی وجہ سے ناقابل سکونت و زراعت تھا۔ نیل نے بھی باوجود اپنی پوری فیاضی کے صرف بارہ ہزار مربع میل کو گلزار بنایا ہے، حالانکہ ملک کا کل رقبہ چار لاکھ مربع ہے۔ اس لحاظ سے مصر ایک حقیر ملک معلوم ہوتا ہے جس کی بنا پر ناظرین کو تعجب ہوگا کہ چہار دانگ عالم میں اس کی اس قدر دھوم کیوں مچی ہوئی ہے اور دول عظمیٰ عرصہ سے کیوں اس کے لئے کشاکش میں مبتلا ہیں؟

لیکن واقعہ یہ ہے کہ یہی حقیر ملک اپنے نیل اور چھوٹے سے قطعہ زمین کی حیرت انگیز زرخیزی کی وجہ سے سونا اُگل رہا ہے، جس پر حریفوں کی للچائی ہوئی نظریں ہمیشہ سے پڑ رہی ہیں! علاوہ ازیں وہ اپنے جغرافی موقعہ کے لحاظ سے اس قدر اہمیت رکھتا ہے کہ دنیا کا کوئی دوسرا ملک بمشکل اس کی ہمسری کا مدعی ہو سکتا ہے: وہ تین براعظموں کے ڈانڈے پر واقع ہے۔ افریقہ اس کی ایڑی کے نیچے ہے، ایشیا اس سے شانہ سے شانہ جوڑے کھڑا ہے اور یورپ اس کی آنکھوں کے سامنے موجود ہے۔ مصر کو دنیا کا

دروازہ کہا گیا ہے جہاں سے تمام عالم پر کامیابی سے حکمرانی کی جاسکتی ہے خصوصاً آب نہر سویز کے جاری ہو جانے کے بعد سے تو تمام کرۂ زمین گویا اس کی مٹھی میں آگیا ہے۔ اسی لئے قدیم سے آج تک جتنی اولوالعزم قومیں عالمگیر فتوحات حاصل کرنے کے لئے اٹھیں وہ مجبور ہوئیں کہ پیشتر اس گذرگاہ عالم پر قبضہ حاصل کرلیں۔ چنانچہ آغاز تاریخ سے نہیں معلوم کتنی قوموں نے باری باری اُسے پائمال کرکے اپنی ہوس ملک گیری کو پورا کیا۔ ایرانی، یونانی، رومی، اسرائیلی، عرب، بربر، کرد، چرکس، ترک، فرنچ، انگریز غرضیکہ سب ہی نے تو اس میں کوس ہمچو من دیگرے نیست بجایا اور یہی وجہ ہے کہ اول مرتبہ مغلوب ہو جانے کے بعد پھر کبھی اسے بہشت آزادی کی ہوا کھانا نصیب نہ ہوا اور وہ برابر غلامی کی مصیبتیں برداشت کرتا رہا۔ اسلامی نقطۂ نظر سے مصر کو اور بھی زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ ممالک اسلامیہ کے ساتھ اُسے وہی تعلق ہے جو قلب کو جسم کے ساتھ ہوتا ہے، اسی لئے اسلامی سیاست کی اصطلاح میں اسے "قلب اسلام" سے تعبیر کیا جاتا ہے کیونکہ اس پر کسی قوم کے مسلط ہو جانے کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ تمام دنیائے اسلام اس کے زیر اثر آجائے۔ خصوصاً جزیرۃ العرب اور ارض حجاز (جس میں حرمین شریفین واقع ہیں) کا تو اُس سے چولی دامن کا ساتھ ہے۔ مصر فتح کر لینے کے بعد حجاز کا سر کر لینا کتنی بڑی بات ہے۔ اسی بنا پر تو پیغمبر علیہ السلام نے فرمایا تھا " اذا فتح اللہ علیکم بعدی مصر فاتخذوا فیھا جندا کثیفا فانھا خیر اجناد الارض ؛ جب میرے بعد خدا مصر فتح کرادے تو اس میں بہت بڑی فوج رکھنا، وہ فوج خدا کے نزدیک دنیا کی پسندیدہ ترین فوج ہوگی۔ حضرت ابوبکرؓ نے عرض کی "یہ کیوں یا حضرت؟ فرمایا" لانھم فی رباط الی یوم القیامۃ: کیونکہ انہیں قیامت تک مسلح رہنا ہے" لیکن وائے بر حال ما! ہم نے اپنے ہادی کی نافرمانی کی اور اپنے اس جگر گوشہ کو غیروں کے حوالہ کر دیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

.... (ملا) ہندوستانیوں کے لئے .... مسئلہ بالشان بنا دیا ہے کیونکہ اب ہماری اور مصریوں کی مصلحتیں مشترک ہیں اور ہم میں سے ہر ایک کا دوسرے کے معاملات سے متاثر ہونا بالکل یقینی ہے۔ انہیں وجوہ سے مسلم لیگ امرتسر نے سیاسی حیثیت سے اور خلافت کانفرنس کلکتہ نے مذہبی حیثیت سے مصر پر

لہ کتب صحاح میں یہ حدیث موجود نہیں ہے۔ لیکن تاریخ مقریزی کی جلد اول صفحہ ۲۱ میں عبداللہ بن لہیعہ بن عمر

برطانوی قبضہ کے برخلاف صدائے احتجاج بلند کی ہے۔ لیکن تعجب ہے کہ مہاتما گاندھی نے خلافت کانفرنس کی اس تجویز کو پسند نہ کیا حالانکہ ہندوستان کا مستقبل بڑی حد تک مصر کی آزادی پر موقوف ہے اور مسئلہ خلافت تو اس وقت تک اطمینان بخش طریقہ سے حل ہی نہیں ہو سکتا جب تک کہ مصر یورپین اثر سے نکل نہ جائے، کیونکہ اس کے بغیر جزیرۃ العرب خلافت اسلامیہ اور سلطنت عثمانیہ کا بقا یورپ کی مرضی پر ہوگا جیسا کہ گذشتہ بیان سے معلوم ہو چکا ہے۔ علاوہ ازیں بکثرت صحیح حدیثیں موجود ہیں جن میں مصر کی فتح اور اس کے باشندوں کے ساتھ مسلمانوں کو حسن سلوک کی وصیت کی گئی ہے اور اس کی علت یہ بیان کی گئی ہے کہ خاندانِ نبوت سے مصریوں کا ننھیالی اور سسرالی رشتہ ہے (دیکھو بخاری وغیرہ) ننھیالی اس طرح کہ حضرت ہاجرہ جو حضرت اسمٰعیلؑ کی والدہ ہیں مصری تھیں اور حضرت ماریہ قبطیہ مقوقس شاہ مصر کی طرف سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ہدیۃً پہنچی تھیں اور آپ کے صاحبزادے "ابراھیم" کی والدہ تھیں۔ نیز مصر میں اہل بیت اور صحابہ کے مزار اس کثرت سے ہیں کہ ہم اسے منجملہ مقامات مقدسہ کے سمجھتے ہیں۔ کم از کم اُس کے جزو خلافت اسلامیہ ہونے میں تو شبہ نہیں ہو سکتا۔ اس لئے اگر مسئلہ خلافت کے ساتھ مصر کو بھی مسلمان شامل کرتے ہیں تو کیا بیجا ہے۔ خیر یہ بحث تو ضمناً آگئی تھی۔ ہم تطویل کے خوف سے مصر کی تاریخی عظمت سے قطع نظر کرتے ہوئے اب اصل مسئلہ پر گفتگو کرنا چاہتے ہیں۔

مصر اور برطانیہ: یوں تو مسئلہ مصر تمام سلطنتوں کے لئے قابل بحث رہا ہے، لیکن قبضۂ ہندوستان کے بعد سے برطانیہ کو اُس سے خالص تعلق رہا اور وہ ہمیشہ اُس پر بُری نظریں ڈالتا رہا ہے مگر چونکہ اس میں پیشتر اتنی سکت نہ تھی کہ مصر پر قبضہ کرکے، فرانس، ٹرکی اور خود مصری حکام ممالیک سے جنگ کر سکتا۔ اس لئے وہ برابر خاموشی سے موقع کا منتظر رہا، جو لوگ انگریزی ڈپلومیسی سے کما حقہٗ واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ کسی ملک پر قبضہ کرنے سے کتنی مدت پہلے انگریز پیش بندیاں شروع کرتے اور کس طرح بتدریج اپنے قدم جماتے ہیں۔ ہندوستان کی مثال ہماری آنکھوں کے سامنے موجود ہے اور عراق کا معاملہ تو ابھی بالکل تازہ ہے، جہاں اُنہوں نے ڈیڑھ سو سال قبل سے ڈورے ڈالنے کے بعد اب قبضہ کیا ہے۔ مصر کے ساتھ بھی ان کا یہی طرز عمل تھا۔ اُنہوں نے اپنی آئندہ اسکیم کے خیال سے کبھی گوارا نہ کیا کہ یہ ملک کسی زبردست سلطنت کے ماتحت رہے، چنانچہ ۱۷۹۸ء میں جب نپولین نے اسے فتح کیا تو انگلستان میں ہلچل پڑ گئی اور اُس نے اپنی پوری بحری قوت سے فرنچ بیڑہ پر اسکندریہ کے قریب خلیج ابوکر میں حملہ کرکے اُسے برباد کر دیا صرف یہی

نہیں بلکہ اُس نے ٹرکی، روس، اسٹریا، سارڈینیا اور نیپلس کو شریک کر کے ایک خوفناک جتھا قائم کیا اور عثمانیہ و روسی بیڑوں اور سپاہیوں کی مدد سے آخر فرانس کو مجبور کر دیا کہ اکتوبر ۱۸۰۱ء میں وہ مصر کو خالی کر دے۔

مصر اور محمد علی :- فرانسیسیوں کے نکلتے ہی برطانیہ کو ایک دوسری مصیبت کا سامنا کرنا پڑا اور وہ یہ کہ مصر کی باگ محمد علی پاشا ایک البانی النسل ترکی افسر کے فولادی ہاتھ میں آگئی جس نے باوجود امی محض ہونے کے اس طرح انتظام شروع کیا کہ سرزمین فراعنہ میں پھر جان پڑ گئی اور برطانیہ کو یقین ہوگیا کہ یہ شخص نہایت قوی دست ہے اور ممکن ہے کہ وہ کبھی اس کے بغلی گھونسہ مار دے۔ چنانچہ اُس نے اس اولوالعزم سردار کے توڑنے کی تدبیریں شروع کیں۔ سب سے پہلے ۲۰ مئی ۱۸۰۷ء میں اس نے اسکندریہ میں فوجیں اُتار کر ملک پر قبضہ کرنے کی عبث کوشش کی، کیونکہ محمد علی نے ایک ہی حملہ میں انہیں سمندر میں ڈھکیل دیا۔ لیکن اس کے بعد ۱۸۲۷ء میں اُس نے مصر پر ایسا کاری وار کیا جس سے اس کی کمر ٹوٹ گئی اور اس کے لئے آئندہ کارروائیوں کا راستہ کھل گیا۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ ۱۸۲۱ء کی بغاوت یونان میں مصر کا عظیم الشان بیڑہ سلطنت عثمانیہ کی اعانت کے لئے ابراہیم پاشا کی زیر قیادت یونان گیا تھا اور بغاوت پر پورا قابو پالیا ہی کو تھا کہ انگلستان، فرانس، اور روس حامیان یونان کے متحدہ بیڑوں کے مشترک امیر البحر "کو درنگٹن" نے بندرگاہ "نادرین" میں مصر اور ترکی جہازوں پر اچانک حملہ کر دیا اور سب کو یکے بعد دیگرے غرق کر دیا۔ مگر لطف یہ ہے کہ سارا الزام ابراہیم پاشا کے سر تھوپا گیا کہ "ان کے ایک مصری سپاہی نے ایک انگریزی ملاح کو قتل کر ڈالا تھا" صرف یہی نہیں بلکہ انگریزوں نے مصریوں اور ترکوں میں پھوٹ ڈالنے کی بھی پوری کوشش کی۔ چنانچہ خود ابراہیم نے انگریزی تہمتوں کے برخلاف سخت احتجاج کیا اور فرنچ کمانڈر "میو بوگل" سے کہا کہ انگریز کہتے ہیں کہ میں نے معاہدہ التوائے جنگ کے خلاف کیا لیکن میں لنڈن اور پیرس جانے کے لئے بالکل آمادہ ہوں کہ وہاں اپنے بیانات دوں اور اصلی مجرموں کو ظاہر کر دوں۔ مجھے امید ہے کہ آپ اپنے ہم قوم امیر البحر سے میری گفتگو حرف بحرف نقل کر دیں گے۔ آپ ان سے یہ بھی کہئے گا کہ واقعہ نادرین کے دوسرے دن انگریزی امیر البحر نے ترکی امیر البحر کو اپنے جہاز پر طلب کر کے کہا کہ "ابراہیم نے مجھے بہت بڑی رشوت دینا چاہی تھی تاکہ میں انہیں مصر کی آزادی میں مدد دوں!" نیز اس سے خواہش کی کہ میری ہوئی انگریزی جہازپر بھیج دے۔"

مصر کی اندرونی خودمختاری: اب تک مصر سلطنت عثمانیہ کا ایک صوبہ اور اس کا دست راست تھا، اگرچہ جنگ یونان میں وہ اپنی بحری قوت سے محروم ہو گیا تھا مگر بری طاقت اب بھی اس کے پاس کافی تھی جس سے وقت پر ٹرکی کام لے سکتا تھا لیکن یہ ایک ایسا امر تھا جسے ہندوستان کے خیال سے برطانیہ کسی طرح بھی پسند نہ کر سکتا تھا، چنانچہ ۱۸۳۲ء میں اُس نے مصریوں اور ترکوں کو باہم ٹکرا دیا اور دونوں میں ایسی خونریزی ہوئی کہ اس سے اب تک صفحات تاریخ سرخ ہیں۔ لیکن پالا مصریوں ہی کے ہاتھ رہا اور محمد علی کو مصر کے علاوہ شام اور صوبہ اطنہ کی گورنری بھی مل گئی جس سے اس کی ہمت و قوت میں اور بھی اضافہ ہو گیا۔ مگر انگلستان کو اس کی سرسبزی کب بھا سکتی تھی، اُس نے فوراً جوڑ توڑ کر کے ۱۸۳۹ء میں پھر ٹرکی سے اعلان جنگ کر دیا۔ لیکن ابکی بھی فتح مصریوں ہی کے حصہ میں تھی۔ مقام "نصیبین" میں آخری معرکہ ہوا جس میں ترکوں کو شکست فاش ہوئی اور محمد علی کی مظفر و منصور فوجیں بصورت سیلاب آگے بڑھیں جس سے انگلستان کو اور بھی زیادہ تردد ہوا اور اُس نے ۱۵ جولائی ۱۸۴۰ء میں دول یورپ سے ساز باز کر کے لندن میں ایک یادداشت تیار کی جس کا مضمون یہ تھا کہ "محمد علی کے قبضہ میں مصر وراثۃً رہے گا، صوبہ عکا پر حین حیاتی اس کا تصرف ہوگا اور باقی جتنا ملک اس نے فتح کیا ہے وہ سب ترکوں کو واپس کرنا ہوگا" محمد علی نے اس تجویز کو ناقابل قبول سمجھ کر رد کر دیا اور "لوئس فلپ" شاہ فرانس نے بھی اس کی مخالفت کی اس پر انگریزوں کو موقع مل گیا۔ ایک طرف تو انہوں نے سلطان معظم سے محمد علی کی معزولی کا فرمان صادر کرا دیا اور دوسری طرف ان کا جنگی بیڑہ سواحل شام پر گولہ باری کرنے لگا۔ آخر بڑی کشاکش کے بعد ۱۰ مئی ۱۸۴۱ء میں یہ فیصلہ ہوا کہ ٹرکی کی زیر سیادت مصر محمد علی اور اس کے خاندان کے ماتحت رہے گا، فوج ۱۸ ہزار سے زیادہ نہ ہوگی، ٹرکی کو وہ سالانہ خراج دیا کرے گا جس کی مقدار پیشتر کم تھی مگر ۱۲۸۳ھ میں اس کی مقدار ۷۵۰۰۰۰ پونڈ عثمانی ہو گئی) اور باقی تمام معاملات میں اُسے خودمختاری حاصل ہوگی۔

ظاہر ہے یہ فیصلہ ٹرکی اور مصر دونوں کے لئے مضر تھا، کیونکہ اگرچہ برائے نام ترکوں کی سیادت اس پر رہی، مگر عملاً وہ اس کے ہاتھ سے نکل گیا اور ۱۸ ہزار فوج کی قید سے مصریوں کے بھی ہاتھ پیر کٹ گئے! البتہ انگلستان کو اس سے سراسر فائدہ ہوا اور یہ دیرینہ پالیسی کہ مصر نہ خود قوی ہو اور نہ کسی قوی سلطنت کے ماتحت رہے پورے طور پر کامیاب ہو گئی۔

مصر میں انگریزوں کی مداخلت: اس اطمینان دہ نتیجہ پر پہنچنے کے بعد ۱۵ سال تک انگلستان خاموش رہا۔ یہاں تک کہ جب ۱۸۵۶ء میں سعید پاشا خدیو مصر نے فرنچ کمپنی کو نہر سویز کا ٹھیکہ دیا تو اس نے بھی ایک قدم آگے بڑھایا اور اسکندریہ سویز ریلوے کا ٹھیکہ حاصل کر لیا۔ اس کے بعد جب ۱۸۶۳ء میں اسمٰعیل پاشا تخت نشین ہوا، تو انگلستان نے خوب ہاتھ پاؤں نکالے، اسمٰعیل اوّل درجے کا عیاش اور مسرف واقع ہوا تھا۔ سب سے پہلے اُس نے مفلس مصری خزانہ پر ہاتھ صاف کیا پھر نہر سویز کے مصری حقوق اور مصری حصوں کو جو ۱۷۷۶۲ فرنک کے تھے ۴ ملین پونڈ میں انگریزوں کے ہاتھ فروخت کر ڈالا (حالانکہ ۱۹۰۶ء میں ان کی قیمت ۴۱ ملین پونڈ تخمینہ کی گئی تھی) اور جب اس سے بھی اس کی بہیمیت کو تسکین نہ ہوئی، تو اس نے یورپین مہاجنوں کے سامنے دستِ سوال دراز کیا جنہوں نے دل کھول کر اُسے بھاری سود پر قرضہ دینا شروع کیا۔ یہاں تک کہ آخر میں اس کی مقدار ۹۱ کروڑ دس لاکھ پونڈ تک پہنچ گئی۔ اسی دوران میں اس پر یہ ایک مصیبت پڑی کہ یورپین صلاح کاروں کے اشارہ سے اس نے بیگار کے طریقہ کو اٹھا دیا جس سے نہر سویز کی کمپنی کو مزدور ملنا موقوف ہو گئے اور اس نے اپنے نقصان کا دعویٰ اسمٰعیل پاشا پر کر دیا۔ نپولین ثالث شاہ فرانس حکم بنے جنہوں نے ترکی کو اسمٰعیل سے ۳۸۰۰۰۰۰۰ فرنک ہرجانہ اور ۴۶۰۰۰۰۰۰ فرنک جرمانہ دلا دیا! اس ناگہانی مصیبت اور قرضہ کے بوجھ نے اس کی گردن یورپ کے سامنے جھکوا دی اور وہ مجبور ہوا کہ ابطالِ غلامی کے لئے انگریزوں کو بحر احمر میں مصری جہازوں کی تلاشی کا حق دے، (مالی معاملات کی نگرانی کے لئے ایک انگریز اور ایک فرانسیسی افسر کو مقرر کرنے اور مجلس وزرا کی کارروائیوں پر برطانوی و فرنچ سفیروں کی منظوری حاصل کیا کرے۔ ظاہر ہے کہ ایسی پابندیاں تھیں جنہیں اسمٰعیل پاشا جیسا خوددار خدیو گوارا نہ کر سکتا تھا چنانچہ اس نے ارادہ کیا کہ شاہی خاندان کے جواہرات فروخت کر کے قرضہ سے گلو خلاصی حاصل کرے مگر یورپ نے اسے منظور نہ کیا۔ صرف یہی نہیں بلکہ اسے گستاخ دیکھ کر سلطانی فرمان کے ذریعہ سے معزول بھی کرا دیا۔

اسمٰعیل کے بعد توفیق پاشا تخت نشین ہوا، جو اول تو فطرتاً نہایت کم ہمت ضعیف الارادہ اور بزدل تھا۔ دوسرے ملک کی مالی حالت اس قدر ابتر تھی کہ بیان سے باہر اور پھر انگریزی ڈپلومیسی کا جال پھیلا ہوا تھا جس سے ظاہر ہے کہ توفیق جیسا انسان عہدہ برآ نہیں ہو سکتا تھا، چنانچہ عام ابتری

اور بے چینی کے آثار ہویدا ہونے لگے۔ مصریوں اور چرکسیوں میں پھوٹ پڑ گئی اور مشہور افسر عرابی بے نے اپنی قوم کی حمایت میں "عثمان رفقی" چرکسی وزیر جنگ کے برخلاف خدیو توفیق پاشا کے روبرو ایک درخواست پیش کی۔ یورپین مشیروں نے خدیو کو نصیحت کی کہ مصریوں کی عرضداشت کو رد کر دے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا اور عرابی وغیرہ قید کر دیے گئے، جس پر فوج بگڑ گئی اور اپنے افسران کو جبراً جیل سے نکال لائی۔ جس کے بعد ہی عرابی نے خدیو سے ملاقات کی جنہوں نے اسے مطلع کیا کہ عثمان رفقی علیحدہ کر دیا گیا ہے اور اس کے بجائے "محمود پاشا سامی" وزیر جنگ مقرر کیے جاتے ہیں جو مصری پارٹی سے تعلق رکھتے تھے۔ اس کارروائی سے فتنہ دب گیا اور فوج میں سکون پیدا ہو گیا۔ لیکن فوراً ہی پھر فتنہ جگایا گیا۔ خدیو کے ایک ملازم کے ذریعہ سے فوج میں تحریک کرائی گئی کہ وہ عرابی وغیرہ کو قتل کر ڈالے۔ نیز محمود پاشا معزول کرائے گئے اور ان کی جگہ پر داؤد پاشا وزیر جنگ ہوئے جنہوں نے سربرآوردہ مصری افسروں کو ان کے مکان میں نظربند کر دیا اور فوج پر ہر طرح سختی کرنی شروع کی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ریاض پاشا کی وزارت سے عام نفرت پیدا ہو گئی اور ۹ ستمبر ۱۸۸۱ء میں عرابی پاشا کی زیر قیادت مصری فوجیں خدیو محل کے سامنے میدان عابدین میں جمع ہوئیں اور مطالبہ کیا کہ وزیر اعظم ریاض پاشا برطرف کیے جائیں، پارلیمنٹ قائم کی جائے اور سلطانی فرمان کے مطابق فوج کی تعداد ۱۸ ہزار کر دی جائے۔ انگریزی سفارت خانہ کے مشورہ کے مطابق خدیو نے یہ مطالبات قبول کر لیے اور شریف پاشا کو وزیر اعظم مقرر کر دیا۔

انگریزوں نے اس موقع پر جو طریقہ اختیار کیا وہ نہایت عجیب و غریب تھا۔ ایک طرف تو وہ خدیو کے دوست بنے ہوئے تھے اور ان سے کہہ رہے تھے کہ ترکی نے یہ شورش پیدا کی ہے تاکہ مصر پر دوبارہ تسلط حاصل کرے۔ دوسری طرف باب عالی کو انہوں نے یہ سمجھایا تھا کہ توفیق مصر کو کامل خود اختیار بنانا چاہتے ہیں۔ چنانچہ انہیں کے مشورہ کے مطابق ۱۸۸۱ء میں ملک کی حالت دریافت کرنے کے لیے ترکوں کا ایک وفد مصر آیا جس کے پہنچتے ہی برٹش و فرنچ بیڑہ بھی اسکندریہ میں آ کر لنگر انداز ہو گیا جس سے خدیو کو انگریزوں کی صداقت کا یقین ہو گیا۔ اور تیسری طرف انہوں نے مصری قوم پرست جماعت "عرابی" وغیرہ کو باور کرا دیا کہ خدیو ان کے برخلاف ہیں اور انگریز مصریوں کی حمایت کرنا چاہتے ہیں۔ چنانچہ انگریزی اخباروں نے "عرابی" کی پارٹی کی خوب پیٹھ ٹھونکی اور ۱۳ جنوری ۱۸۸۲ء کی اشاعت میں ٹائمس نے انکا دستور العمل اور مقاصد شائع کر کے ان کی تائید و تحسین کی۔ قوم پرست پارٹی کے اصول یہ تھے کہ (۱) ترکی سیادت کا اعتراف

(۲) خدیو کی اطاعت جب تک کہ وہ ستمبر ۱۸۸۱ء کے وعدوں پر قائم رہیں۔ (۳) انگلستان و فرانس کی خلعت کا اعتراف (۴) امن وامان کا قائم رکھنا۔ (۵) مذہبی و سیاسی آزادی، قانون کی نظر میں تمام مصریوں کی مساوات اور پارلیمنٹ کا قیام (۶) تعلیم کی تعمیم۔ جب انگریزوں نے دیکھا کہ قومی پارٹی قوی ہوگئی ہے عرابی وزیر جنگ کا سکریٹری مقرر ہوگیا ہے اور خدیو کا پہلو کمزور ہو رہا ہے، تو انہوں نے فرانس کی مشارکت سے خدیو کو سرکاری طور پر مطلع کیا "کہ انگلستان فرانس دونوں اُن کے پُشت پناہ ہیں کیونکہ وہ تخت مصر پر ان کے وجود کو ضروری سمجھتے ہیں"! اس مداخلت بیجا پر باب عالی نے ۱۲ جنوری ۱۸۸۲ء کو سخت احتجاج کیا کہ "معاملات مصر میں اس قسم کی مداخلت کا حق صرف سلطنت عثمانیہ کو حاصل ہے"! مگر کون سنتا ہے؟ اس کے بعد ہی شریف پاشا کی وزارت مستعفی ہوگئی اور اس کے بجائے خالص قوم پرست وزارت قائم ہوئی جس کے صدر محمود پاشا سامی اور وزیر جنگ خود عرابی پاشا تھے۔ اس انقلاب سے انگلستان و فرانس دونوں سخت برہم ہوئے اور یہ مشہور ہوگیا کہ یورپین آبادی خطرہ میں ہے اور وزیر اعظم خدیو کو قتل کرنا چاہتے ہیں۔ اتنا حیلہ کافی تھا چنانچہ فوراً ہی اسکندریہ میں انگریزی اور فرانسیسی بیڑہ توپیں تانے ہوئے آموجود ہوا تاکہ امن وامان قائم رکھے!

بیڑہ کے اسکندریہ میں وارد ہوتے ہی مذکورۂ بالا دونوں سلطنتوں نے خدیو سے مطالبہ کیا کہ:

(۱) عرابی جلاوطن کیا جائے۔

(۲) علی فہمی اور عبدالعال اندرون ملک میں کہیں دُور نظر بند کیے جائیں۔

(۳) وزیر اعظم مستعفی ہوں۔

خدیو نے ان احکام کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دیا۔ مگر عرابی نے اُن کے قبول کرنے سے انکار کر دیا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ خدیو اور وزیر جنگ میں علانیہ مخالفت ہوگئی۔ خدیو کے مددگار انگریز و فرانسیسی تھے اور وزیر جنگ کی حمایت کے لئے تمام قوم اور فوج تیار تھی۔

اسکندریہ میں بلوہ: اسی دوران میں انگریزی کونسل خانہ نے اسکندریہ کے تمام انگریزوں، یونانیوں اور مالٹیوں کو ہتیار دینا شروع کیے جن کی دیگر سفراء نے اعتراض بھی کیا کہ اس سے ملک میں بے چینی پیدا ہوگی۔ مگر اس نے کوئی پرواہ نہ کی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۱ جون ۱۸۸۲ء کو اسکندریہ میں خون ریزی واقع ہوئی اور انگریزی اخباروں اور مدبروں نے شور مچا دیا کہ مصری مسلمان متعصب ہیں اور عیسائیوں کا قتل عام کرنا چاہتے ہیں

حالانکہ فساد کی ابتدا خود انگریزی کونسل خانہ کے ایک چپراسی کے بھائی نے کی تھی اور مسلمانوں کو بلاوجہ تنگ کیا تھا۔ مسلمانوں کی بے گناہی کی سب سے بڑی دلیل فرانسیسی وزیر اعظم کی تصریح ہے جو اس نے ۱۲ جون ۱۸۸۲ء کو پارلیمنٹ میں کی کہ "اسکندریہ کی خونریزی سے چند روز پیشتر مالٹیوں میں ہتھیار تقسیم کیے گئے تھے اور بلوہ کو مذہبی تعصب کی جانب منسوب کرنا شدید غلطی ہے۔"

برطانوی امیر البحر کی تہدید: اس ہنگامہ کے چند روز بعد انگریزی امیر البحر "سیمور" نے مصری گورنمنٹ کو لکھا کہ اسکندریہ کے قلعوں کی مرمت کی جا رہی ہے اگر وہ فوراً موقوف نہ کر دی گئی تو برٹش جہاز شہر پر گولہ باری کریں گے۔ چنانچہ قلعوں کی مرمت روک دی گئی۔ اس کے بعد پھر اس نے ایک اور نوٹ روانہ کیا کہ "مصری عمال آبنائے اسکندریہ کو پتھروں سے بند کر رہے ہیں اگر وہ اس سے باز نہ آئے تو گولہ باری کی جائے گی!" غریب مصری گورنمنٹ نے جواب دیا کہ "اس قسم کی کارروائی کا گورنمنٹ کو مطلق علم نہیں ہے اور امیر البحر کو اختیار ہے کہ وہ جسے ایسا کرتا دیکھے گرفتار کر لے۔" اس کے بعد پھر ۱۰ جولائی سن رواں کو اس نے لکھا کہ "اسکندریہ کے قلعوں پر توپیں چڑھائی جا رہی ہیں جن سے انگریزی بیڑہ کی نقصان رسانی مقصود ہے۔ لہٰذا قلعوں میں جتنے ہتھیار ہیں سب برطانوی امیر البحر کے حوالہ کر دیے جائیں۔" اس مطالبہ پر مصری حکومت از حد پریشان ہوئی اور اس نے وزیر خارجیہ و مالیہ کے ذریعہ سے تردید کرائی اور خواہش کی کہ امیر البحر بذات خود قلعوں کا معائنہ کر کے اطمینان کر لے۔ مگر اس نے ایک نہ سنی اور اپنی ضد پر قائم رہا جس پر ۱۰ جولائی کو خدیو نے سرکاری طور پر جواب دیا کہ "مصری حکومت نے کوئی ایسی کارروائی نہیں کی ہے جس کی بنا پر برٹش بیڑہ کے لئے اسکندریہ پر گولہ باری کرنا ضروری ہو اور چونکہ ہتھیاروں کے حوالہ کرنے میں انتہائی ذلت ہے اس لئے گورنمنٹ اسے ہرگز منظور نہیں کر سکتی اور وہ بلا کسی خطا و قصور اور اعلان جنگ کے مصری قوم پر اس قسم کی زیادتی سے بالکل بری الذمہ ہوتی اور انگریزی امیر البحر کی اس کارروائی کو بین الاقوامی قوانین اور اصول جنگ کے سراسر مخالف تصور کرتی ہے۔"

اسکندریہ پر گولہ باری: ادھر یہ گفت و شنید ہو رہی تھی اور ادھر فرنچ بیڑہ اسکندریہ کو انگریزوں کے رحم پر چھوڑ کر واپس جا رہا تھا اور یورپ میں برٹش گورنمنٹ دول عظمیٰ سے کہہ رہی تھی کہ انگریزوں کی اسکندریہ پر گولہ باری محض اپنی مدافعت کے لئے ہوگی اور وہ مصر کے برخلاف ذرا بھی بدنیتی کو دخل نہ دیں گے!" ۱۰ جولائی کو یورپ میں یہ اعلان کیا گیا اور ۱۱ جولائی ۱۸۸۲ء کو بہادر انگریزی امیر البحر

نے اسکندریہ کے قلعوں پر اپنی توپوں کے دہانے کھول دیے! جنکے برباد کرنے کے بعد ۱۲ جولائی کو شہر پر گولہ باری شروع ہوگئی جس پر طلب امان کے لئے سفید جھنڈا بلند کیا گیا اور انگریزی امیر البحر نے اس شرط پر اسے منظور کیا کہ تین بجے تک اسکندریہ کے دو قلعے اس کے سپرد کر دیے جائیں! اس پر مصری گورنمنٹ نے اس سے منت کی کہ اور کچھ مہلت دے تا کہ سلطان المعظم سے استفسار کر لیا جائے کیونکہ خدیو کو بذات خود اس قسم کی کارروائی کا اختیار نہیں ہے۔

نیز توفیق پاشا نے جو کہ اسوقت اسکندریہ ہی میں موجود تھے عرابی پاشا کو حکم دیا کہ "میدان طابیۃ العجم" کی جانب جا کر شہر کی حفاظت کرے مگر اُسنے اس بنا پر انکار کر دیا کہ وہاں فوج انگریزی جہازوں کی زد میں ہوگی اور خدیو محلسرائے کے گرد اپنی سپاہ جمع کرنا شروع کی جس سے خدیو کو اپنی جان کا خطرہ ہوا اور انگریزی مشیروں کے کہنے سے وہ برطانوی بیڑہ پر جا کر پناہ گزیں ہو گئے!!

انگریزوں سے جنگ اور مصر پر ان کا قبضہ :- توفیق پاشا نے برٹش پناہ میں آنے کے بعد پہلا کام یہ کیا کہ "عرابی پاشا" کو مطلع کیا کہ انگریزوں سے صلح ہوگئی ہے اسلئے جنگی تیاریاں موقوف کر دی جائیں اور خود خدیو سے آکر ملاقات کرے" عرابی نے شرائط صلح طلب کیں کہ اگر وہاں شرائط ہوں تو بھیجے جائیں؟ چنانچہ ان کے بجائے ۲۰ جولائی کو عرابی کے پاس اس کی موقوفی کا فرمان پہنچا جسے اُس نے مسترد کر دیا اور اپنی فوجوں کو سواحل مدافعت پر روانہ کرنے لگا لیکن قبل اسکے کہ وہ وہاں تک پہنچیں خدیو کی اجازت سے انگریزی بیڑہ نہر سویز پر قابض ہوگیا اور ۲۰ اگست ۱۸۸۲ء کو "یونین جیک" شہر سویز پر لہرانے لگا! اسی دوران میں مصری فوجیں بھی پہنچ گئیں اور مقام "تل الکبیر" میں آخری معرکہ ہوا جس میں مصریوں کو شکست ہوئی اور شیر دل رچرڈ کی ہم قوم فوجیں ۱۴ ستمبر ۱۸۸۲ء میں قاہرہ پہنچ گئیں اور بلا مزاحمت صلاح الدین ایوبیؒ کے قلعہ پر چڑھ گئیں! عرابی گرفتار کیا گیا، عدالت میں پیش ہوا اور وہ چند سال کے لئے جزیرہ لنکا کو جلا وطن کر دیا گیا! یہ تھا مسئلہ مصر کا وہ "معقول حل" جس کے لئے انگلستان سالہا سال سے کوشاں تھا اور جس میں آخر ۱۸۸۲ء میں اس نے پوری کامیابی حاصل کی!

(۲)

چونکہ یہ قبضہ کوئی معمولی واقعہ نہ تھا اور اس پر تمام دول یورپ خصوصاً ترکی اور فرانس کو خاص طور پر اعتراض کا موقع تھا اس لئے اس قبضہ کے بعد ایسی پالیسی اختیار کی جو صرف اسی کا حق تھا اور جس میں یقین نہیں کہ دنیا کی کوئی اور قوم یا سلطنت اسکی ہمسری کا دعویٰ کر سکے۔ انگلستان کی ڈپلومیسی شہرہ آفاق ہے لیکن اس شاطر نے بساط مصر پر جو چالیں چلی ہیں انکی مثال پیش کرنے سے تاریخ عاجز ہے۔ مقام حیرت ہے کہ مصر جیسے عظیم الشان ملک پر برطانیہ ہاتھ صاف کرے، اس کا اصلی مالک ترکی شور و غل کرے، خود مصری فریاد و واویلا کریں، فرانس برافروختہ ہو اور تمام دول یورپ بلکہ دنیا بھر ناک بھوں چڑھائے مگر برطانیہ سب کو خاموش کر دے۔ تلوار کے زور سے نہیں بلکہ محض اپنی چرب زبانی اور سیاسی چالبازی سے اور وہ خاموشی بھی ایسی جس کے ساتھ ہر فریق کو کچھ نہ کچھ امید اور اطمینان، اور پھر موقع آتے ہی سب کو اس طرح دکھا بتا دے کہ کسی سے کچھ بن نہ پڑے! بیشک یہ اعلیٰ درجہ کی ڈپلومیسی ہے جس پر اہل دنیا کا اظہار نفرت کرے مگر وہ برطانیہ کی تاریخ میں وہ مذہبی حرف ہے کہ جو کلاں

ہم نہیں چاہتے کہ تمام واقعات کو بالاستیعاب بیان کر کے مضمون کو بیجا پھیلا دیں بلکہ ذیل میں صرف چند تصریحوں کے درج کرنے پر قناعت کرتے ہیں جو برطانیہ کلاں کے مایۂ ناز فرزندوں اور اس کے مشہور ترین وزیروں اور مدبروں کی زبان و قلم سے وقتاً فوقتاً صادر ہوئی ہیں جن سے ناظرین کو ہمارے مذکورۂ بالا قول کی تصدیق ہو جائے گی۔

ہم نے سابق مضمون میں کہا تھا کہ اسکندریہ پر برٹش بیڑہ کی گولہ باری سے صرف ایک روز قبل یعنی ۱۰ر جولائی ۱۸۸۲ء کو برطانیہ نے تمام یورپ میں یہ پیام گشت کرایا تھا کہ "اسکندریہ پر انگریزوں کی گولہ باری محض اپنی مدافعت کے لئے ہوگی اور وہ مصر کے برخلاف ذرا بھی بدنیتی کو دخل نہ دیں گے" اس اعلان سے دنیا کو یقین ہو گیا تھا کہ اگرچہ انگریزی بیڑہ ناخواندہ مہمان کی طرح سواحل مصر پر پہنچ گیا ہے اور محض اپنی مدافعت و سلامتی کے لئے ممکن ہے کہ اسکندریہ کے شہر پر آگ برسائے لیکن ایسا اندھیر تو وہ نہ کرے گا کہ مصر میں انگریزی فوجیں اُتار دے۔ مگر چند ماہ بعد جب یہ خبر مشتہر ہوئی کہ انگریزوں نے قاہرہ پر قبضہ کر لیا تو اس وسیع زمین پر کوئی متنفس نہ تھا جو فرطِ حیرت سے انگشت بدنداں نہ رہ گیا ہو۔ انگریزوں نے جب دیکھا کہ ان کی اس حرکت سے کوئی خوش نہیں ہے، تو انہوں نے فوراً ہی اعلان پر اعلان کرنا شروع کیے کہ "قبضہ مصر سے ہماری غرض الحاق مصر ہرگز نہیں ہے۔ بلکہ صرف باغیوں کی سرکوبی اور خدیو کے تخت کی حفاظت کے لئے یہاں آئے ہیں۔ جوں ہی یہ مقصد پورا ہو جائے گا ہم جہاں سے آئے ہیں وہیں چلے جائیں گے"

چنانچہ انگریزی امیر البحر "سیمور" نے اسکندریہ کی گولہ باری کے بعد خدیو توفیق پاشا کو سرکاری طور پر لکھا کہ "میں برٹش امیر البحر ہونے کی حیثیت سے مناسب سمجھتا ہوں کہ حضور والا سے بتاکید کہہ دوں کہ برطانیہ مصر کو فتح کرنا نہیں چاہتا اور نہ مصریوں کے مذہب اور آزادی میں کسی قسم کی مداخلت کرنا چاہتا ہے! اُس کی غرض صرف اس قدر ہے کہ حضور والا اور مصری قوم کی باغیوں سے حفاظت کرے"

(۲) لارڈ گرانویل وزیر خارجیہ انگلستان اپنے رسالہ مصر ۱۸۸۳ء میں فرماتے ہیں "مصر سے متعلق ملکہ معظمہ کی گورنمنٹ کی پالیسی صرف یہ ہے کہ یہ ملک ترقی کرے اور سلطانی فرمانوں کے رُو سے جو آزادی اسے حاصل ہوئی ہے اس سے پوری طرح متمتع ہو"

(۳) ۱۳ر جون ۱۸۸۳ء کو لارڈ ڈفرن نے دول عظمیٰ سے مصر کے متعلق جو معاہدہ کیا تھا اس میں

لکھا گیا تھا" جن سلطنتوں کے نمائندے اس معاہدے پر دستخط کر رہے ہیں وہ عہد کرتے ہیں کہ مسائل مصر کے طے کرنے سے ان کی غرض ہرگز ملک گیری کی نہیں ہے۔"

(۴) سر چارلس ۱۸۸۲ء میں پارلیمنٹ میں تقریر کرتے ہیں "ملکہ معظمہ کی حکومت کی خواہش ہے کہ مصر کو فوجی استبداد سے نجات دلائے اور اسے موقع دے کہ وہ اپنا انتظام خود ہی کرے۔ ہماری اور مصر کی مصلحت اسی میں ہے کہ اس کی حکومت آزاد نظام پر مبنی ہو نہ کہ استبداد پر، ہم نہیں چاہتے کہ مصر کو اپنے نظام حکومت کے قبول کرنے پر مجبور کریں۔ بلکہ اسے آزادی ہے جو نظام چاہے منتخب کرے۔ ہمارے ملک پر بمقتضائے شرافت ضروری ہے کہ مصر کے ساتھ وہی برتاؤ کرے، جو اس کے قابل قدر اور آزاد نظام کے مطابق ہو۔"

(۵) مسٹر گلاڈسٹون صاحب اُسی سال پارلیمنٹ میں ارشاد فرماتے ہیں کہ "میں معزز ممبر کا اس سوال پر کہ کیا قبضۂ مصر غیر معین زمانہ تک ہوگا ؟ جواباً کہتا ہوں کہ کچھ ہی کیوں نہ ہو لیکن قبضۂ مصر غیر معین زمانہ تک نہ ہوگا! کیونکہ یہ ملکہ معظمہ کی گورنمنٹ کے اصول و مقاصد اور ان بین الاقوامی معاہدات کے قطعی برخلاف ہے جن کے ہم پابند ہیں!!"

(۶) لارڈ ڈفرن اپنے ۹ دسمبر کے خط میں لکھتے ہیں "مسئلہ مصر کے بارے میں جن لوگوں نے میرے خیالات معلوم کرنا چاہے ہیں میں نے اُن سے صاف صاف کہہ دیا ہے کہ ہماری ہرگز یہ نیت نہیں ہے کہ جو اختیارات ہمیں وہاں حاصل ہو گئے ہیں انہیں اپنے ہی ہاتھ میں رکھیں! البتہ ہم مصری قوم سے ایسے تعلقات پیدا کرنا چاہتے ہیں کہ جن کی بدولت وہ ہمیں فطری نظروں سے دیکھے اور ہمیں اپنا سب سے زیادہ مخلص دوست اور مصلح کار تصور کرے۔ اسی لئے ہم اُسے ہرگز اپنی رائے کے قبول کرنے پر مجبور نہیں کرنا چاہتے"

(۷) لارڈ گرانفیل ۲۹ دسمبر ۱۸۸۲ء کو انگریزی معتمد متعینہ مصر کو سرکاری طور پر لکھتے ہیں "تم ضرور بالضرور حکومت کو مطلع کر دو کہ ملکہ معظمہ کی گورنمنٹ اپنی فوجوں کو آہستہ آہستہ مصر سے واپس بلالیگی اور جوں جوں ملک میں امن و امان قائم ہوتا جائے گا انگریزی سپاہ اُسے خالی کرتی جائے گی! ملکہ معظمہ کی گورنمنٹ کو امید ہے کہ انگریزی فوج بہت تھوڑی مدت مصر میں رہے گی۔"

(۸) ۶ فروری ۱۸۸۳ء کو لارڈ ڈفرن اپنے رسالہ میں فرماتے ہیں کہ "وادی النیل (مصر) پر لندن سے حکومت نہیں کی جاسکتی اور اگر ہم ایسا کریں بھی تو لامحالہ مصری ہم سے نفرت کریں گے اور مصر ہمارے

برخلاف سازشوں کا مرکز بن جائے گا، اس وقت ہم مجبور ہوں گے کہ یا تو اُسے خالی کر دیں اور یا اُس پر دائمی قبضہ کرلیں!" ــــ پھر اُسی رسالہ میں آگے چل کے لکھتے ہیں کہ "اگر مصر کا انتظام ہندوستان کی طرح کیا جائے تو انگریزی ایجنٹ کا فولادی ہاتھ پانچ سال کی مدت میں سب انتظام درست کر سکتا ہے لیکن ایسی صورت میں مصریوں کو حق ہوگا کہ وہ اُن فوائد کو بہت گراں تصور کریں جو ہمارے ذریعہ سے اُنہیں پہونچیں کیونکہ اُن کی آزادی اِس طرح زائل ہو جائے گی۔ لیکن ملکہ معظمہ کی گورنمنٹ کی مستقل رائے ہمیشہ اس کے برخلاف ہے۔"

(۹) ۲۵ فروری ۱۸۸۵ء میں لارڈ ڈربی نے دارالامرا (ہاؤس آف لارڈس) میں کہا تھا کہ "ہماری پہلے بھی، اب بھی اور آیندہ بھی یہی نیت رہے گی کہ مصر پر محض عارضی قبضہ رکھیں۔ کیونکہ ہم نے خود اُس ملک اور تمام یورپ سے ایسے ہی معاہدے کیے ہیں جن کے خلاف ہماری روش نہیں ہو سکتی۔"

(۱۰) لارڈ سالسبری نے ۱۰ جولائی ۱۸۸۷ء میں دارالامرا میں ارشاد فرمایا تھا "ہم مصر کی حکومت کا بار اپنے کاندھوں پر اٹھانے کی قدرت نہیں رکھتے۔ کیونکہ ملکہ معظمہ کی گورنمنٹ بارہا وعدے کر چکی ہے کہ وہ ایسا نہ کرے گی۔ آج سابق معزز محترم لارڈ نے خوب کہا ہے کہ "وہ وعدہ ہمارے پیش نظر رہے گا۔" یہ بالکل یقینی ہے کہ مصر میں ہمارے خلاف معاہدات موجودگی سے سلطان کی رعایا میں ہماری جانب سے ایسے شکوک پیدا ہو گئے ہیں جن کے ہم دراصل مستحق نہیں ہیں۔"

(۱۱) پھر ۱۲ اگست ۱۸۸۹ء میں لارڈ ڈون کو مخاطب کرکے فرماتے ہیں کہ "مجھ سے پہلے میرے جن دوست لارڈ نے مطالبہ کیا ہے کہ مصر میں ہمیں اپنی پوزیشن محافظ کے بجائے مستقل مالک کی کر دینا چاہیئے، میں نہیں خیال کرتا ہوں کہ انہوں نے اُن مقدس عہد ناموں کا لحاظ رکھا ہے جن کے ہم سختی کے ساتھ پابند ہیں۔ ایسے مسائل میں ہم یہ نہیں دیکھتے کہ ہماری مصلحت زیادہ کس میں ہے۔ بلکہ ہماری روش یہ ہوتی ہے کہ ہم اپنے وعدوں اور بین الاقوامی قوانین کی پابندی کریں۔"

(۱۲) یکم مئی ۱۸۹۳ء کو پارلیمنٹ میں حضرت گلاڈسٹون زمزمہ سرائی کرتے ہیں کہ "میں یہ ظاہر کرنے پر مجبور ہوں کہ میری رائے اس قول کے بالکل موافق ہے کہ قبضہ مصر ہم پر ایک ثقیل بار ہے اور دائمی قبضہ تو کسی طرح بھی ہماری سیاسی روایات، مصر کی اصلی حکمران سلطنت عثمانیہ کے اخلاص اور یورپین قوانین کے احترام کے مطابق نہیں ہے۔ میں نہایت تاکید سے کہتا ہوں کہ میں اس نظریہ کی جانب ہرگز ملتفت

نہیں ہو سکتا جس کا منشا یہ ہے کہ "چونکہ ہمیں ایک اچھا موقع ہاتھ آگیا ہے اس لئے اُن تمام معاہدوں کو پسِ پشت ڈال دینا چاہیئے جن کے ہم اپنے اختیار سے پابند بنے تھے۔ کیونکہ اگر ہم اسے تسلیم نہ کریں گے کہ ہم بہت سے معاہدوں کے پابند ہیں اور قبضۂ مصر کو غیر معین زمانہ کے لئے وسعت دے دیں گے یا موجودہ قبضہ کی کوئی ایسی تشریح یا تاویل کریں گے جس کا مقصد معاہدوں کی خلاف ورزی ہو تو ہمارا فعل ہرگز شرافت کے موافق نہ ہوگا۔"

(۱۳) اس سے بھی بڑھ کر قابل غور آپ کا وہ اعلان ہے جو آپ نے ۹ اگست ۱۸۸۳ء کو پارلیمنٹ میں کیا تھا کہ "جو لوگ مصر پر دائمی قبضہ اور اُسے برٹش امپائر سے ملحق کر لینے کے حامی ہیں اُن کی وجہ سے بعض ذہنوں میں شکوک پیدا ہو رہے ہیں۔ حالانکہ یہ ایک ایسا خیال ہے جس کی مخالفت کا ہم نے نہایت مضبوطی سے مصمم ارادہ کر لیا ہے ہم الحاقِ مصر کے مخالف ہیں۔ اور ہر اس صورت، خیال اور قول کے مخالف ہیں جس کا نتیجہ الحاق مصر ہو! ہم اس کے اس لئے مخالف ہیں کہ یہ انگلستان کی مصلحت کے خلاف ہے۔ ہم اس لئے مخالف ہیں کہ یہ مصر کے متعلق ہمارے فرائض کے خلاف ہے۔ ہم اس کے اس لئے مخالف ہیں کہ یہ اُن معاہدوں کے صریح خلاف ہے جن کا ہم نے اپنے تئیں پابند کیا ہے اور جن کی تقدیس و تعظیم ہم پر فرض ہے۔ ہم اپنے کو دھوکہ دینا نہیں چاہتے۔ ہمیں معلوم ہے کہ اگر یہ عارضی قبضہ طوالت پذیر ہوگا تو ممکن ہے کہ اس کا نتیجہ الحاق ہی ہو۔ اسی لئے ہم پوری کوشش کریں گے کہ یہ قبضہ الحاق کی صورت نہ اختیار کرنے پائے البتہ ہم تخلیہ مصر کی کوئی تاریخ معین نہیں کر سکتے۔ لیکن ہم حتی الوسع جلد نکلنے کی کوشش کریں گے۔ جس کے شرائط صرف یہ ہیں کہ امن و امان قائم ہو جائے اور خدیو کی حفاظت کا مناسب سامان ہو جائے۔"

(۱۴) ۳ مارچ ۱۹۰۷ء میں انگریزی معتمد لارڈ کرومر مصر کے متعلق اپنی سالانہ رپورٹ میں لکھتے ہیں: "مصر پر برطانیہ کے دائمی قبضے کے خلاف شدید اعتراضات موجود ہیں جنہیں دور کرنا بہت مشکل ہے۔ کیونکہ اس کے معنی یہ ہوں گے کہ مصر کے سیاسی نظام کی بالکل کایا پلٹ کر دیا جائے حالانکہ خود برٹش فرینچ معاہدہ ۸ اپریل ۱۹۰۴ء میں بالتصریح مذکور ہے کہ "برطانیہ مصر کے سیاسی نظام میں مطلق تغیر و تبدل نہیں کرنا چاہتا۔"

(۱۵) ۱۳ اکتوبر ۱۹۰۸ء کو سر گورسٹ برطانوی ایجنٹ متعینہ مصر نے سرکاری طور پر مصری اخبار "المقطم" کے اڈیٹر سے کہا تھا کہ "آپ اس خیال کی پوری زور کے ساتھ تردید کر دیجئے کہ برطانیہ مصر پر دائمی قبضہ کرنا چاہتا ہے۔ کیونکہ اس نے سلطنت عثمانیہ اور دول عظمٰی سے بہت سے معاہدے کیے ہیں جن میں وعدہ کیا ہے کہ وہ اس ملک پر سلطانی سیادت کا ہمیشہ احترام کرے گا۔ نیز ۱۹۰۴ء کے معاہدہ فرانس میں بھی ان وعدوں کی تجدید کر دی گئی ہے۔"

جس کے بعد ظاہر ہے کہ نہ گورنمنٹ برطانیہ اور نہ برطانوی قوم ان سے پھرے گی۔"

یہ اور اسی قسم کی دوسری شہادتیں بھی موجود ہیں جن کے بعد کون کہہ سکتا تھا کہ دنیا کی یہ سب سے بڑی سلطنت اس طرح اپنے تمام حلفی وعدوں کو پس پشت ڈال کر سارے عالم کی آنکھوں میں خاک ڈال دے گی اور اتنی دیدہ دلیری سے غریب مصر کی مقدس آزادی کو پامال کر ڈالے گی۔ اور لطف تو یہ ہے کہ ایک مرتبہ تو تخلیہ مصر کی تاریخ بھی مقرر کر دی گئی۔ چنانچہ لارڈ گرانفیل صاحب نے ۱۶ جولائی ۱۸۸۴ء یعنی قبضۂ مصر کے دو سال بعد تصریح کی کہ "ملکہ معظمہ کی گورنمنٹ بالکل آمادہ ہے کہ جولائی ۱۸۸۸ء میں مصر سے اپنی فوجیں واپس کر لے" لیکن یہ وعدہ بھی محض ایک نمونہ کے سوا اور کچھ ثابت نہ ہوا۔ کاش کہ ملکہ وکٹوریہ آج زندہ ہوتیں یا شاہ ایڈورڈ ہفتم موجود ہوتے اور دیکھتے کہ ان کے نام سے جو تاکیدی وعدے کیے گئے تھے وہ کس طرح شکست کر ڈالے گئے اور ان کے وزرا نے کس طرح چہار دانگ عالم میں برطانیہ عظمیٰ کی نیک نامی پر دھبہ لگایا۔ مگر نہیں، ملکہ وکٹوریہ اور شاہ سابق کی جانب سے جو عہد نامے کیے گئے تھے صرف وہی نہیں ردی کی ٹوکری میں ڈالے گئے بلکہ موجودہ شاہ انگلستان جارج پنجم کی طرف سے بھی دوران جنگ میں جو وعدہ مصریوں سے ہوا تھا اور جس کی بنا پر ہی جنگ میں اتحادیوں سے شانہ سے شانہ ملا کر لڑے تھے، وہ بھی انتہائی دلیری سے فراموش کر دیا گیا۔ بلکہ قصور معاف ہو! اگر ہم یہ کہیں کہ وہ وعدہ خود شاہ نے اپنے سرکاری خط بنام حسین کامل کے ضمن میں کیا تھا۔ چنانچہ ۱۹ دسمبر ۱۹۱۴ء کے شاہی خط میں آپ فرماتے ہیں "مجھے کامل یقین ہے کہ آپ اپنے وزرا کی مدد اور برطانیہ کی پشت پناہی سے ان خطروں پر غالب آ جائیں گے جو مصر کی خود مختاری کو ختم کرنے والے ہیں۔" مگر اس عہد پر چند سال بھی نہ گذرنے پائے تھے کہ ۱۹۱۹ء میں مصر کے الحاق کا اعلان کر دیا جاتا ہے اور جنوری ۱۹۲۰ء کو لارڈ کرزن اسی پارلیمنٹ میں جس میں اس ملک کی آزادی کے محفوظ رکھنے کے حلف اٹھائے جا چکے تھے شان جلالی سے ارشاد فرماتے ہیں "برطانیہ معاملات مصر کی رہنمائی کرنا چاہتا ہے اور مصر کی مکمل آزادی کے خیال کی انگلستان میں کوئی ہمت افزائی نہ کی جائے گی۔"

انگریزی قبضہ سے مصر کو نفع ہوا یا نقصان

اس ناجائز قبضہ سے قطع نظر کرنے کے بعد یہ سوال پیش ہوتا ہے کہ اس ۴۸ سال کے اندر یعنی جب سے انگریزوں نے قبضہ کیا ہے مصر کو نفع ہوا یا نقصان؟ اس بحث میں داخل ہونے سے پہلے ایک اور اصولی

سوال پیدا ہوتا ہے جس پر غور کرنا ضروری ہے اور وہ یہ کہ نفع کسے کہتے ہیں اور نقصان کیا ہے؟ اور سب سے بڑی مضرت غلامی ہے۔ خصوصاً قوموں کے حق میں تو آزادی زندگی ہے اور محکومی موت ہے۔ اگر ایک قوم دوسری کی حریت کو سلب کرنے کے بعد اُسے زر و جواہر سے مالا مال کردے اور اس کے ملک کو بہشت بنا دے جب بھی وہ قوم محسن نہ شمار کی جائے گی بلکہ وہ عدل و انصاف اور ایمان کی نظر میں ستمگر و قزاق قرار پائیگی اور اس کے تمام احسانوں کو اگرچہ وہ احسان تسلیم بھی کر لیے جائیں ٹھکرا دینا اور اس کے برخلاف ہر قسم کی جدوجہد کا اختیار کرنا بالفعل جائز و مستحسن بلکہ واجب و فرض ہوگا۔ کیونکہ حریت لینے کے بعد کوئی نیکی نیکی نہیں ہے اور نہ کوئی سلوک قابل قبول و قابل شکریہ ہے۔ عربی شاعر نے کیا ہی خوب کہا ہے:؎

لا تسقنی ماء الحیاۃ بذلۃ — واسقنی بالعز کاس الحنظل

آبِ حیات ذلت کے ساتھ نہ پلا — بلکہ عزت کے ساتھ جام حنظل مرے منھ سے لگا دے

ماء الحیاۃ بذلۃ کجہنم — وجہنم بالعز اطیب منزل

کیونکہ یہ ذلت کا آب حیات جہنم ہے — اور عزت کی جہنم بہترین مقام ہے

قرآن مجید بھی ہمیں یہ تعلیم دیتا ہے کہ سلب حریت کے بعد احسان کوئی وقعت نہیں رکھتا۔ چنانچہ جب فرعون مصر کو موسیٰ علیہ السلام نے آڑے ہاتھوں لیا، تو اس نے انہیں احسان جتا کر خاموش کرنا اور اپنی مخالفت سے باز رکھنا چاہا، اس نے کہا،

قال الم نربک فینا ولیدا ولبثت فینا من عمرک سنین وفعلت فعلتک التی فعلت وانت من الکافرین ؟

فرعون نے کہا "ہم نے بچپن سے تمہاری پرورش نہیں کی۔ کیا تم ہمارے یہاں عرصۂ دراز تک نہیں رہے اور کیا تم نے ناشکری کے ساتھ وہ حرکت نہیں کی جو (یعنی ایک ہم قوم کو قتل کرکے) تم سے سرزد ہوئی تھی؟ (لیکن ہم نے اس سے بھی چشم پوشی کی)۔

اس کے جواب میں موسیٰ علیہ السلام کے الفاظ قابل غور ہیں، آپ فرماتے ہیں: " وتلک نعمۃ تمنھا علیّ ان عبدت بنی اسرائیل " بنی اسرائیل کو غلام بنانے کے بعد مجھ پر تمہارا یہ احسان جتانا بھی خوب ہے! تمہاری دشمنی اور سب سے بڑی بدتمیزی میرے ساتھ تو یہی ہے کہ تم نے میری قوم کی آزادی سلب کرلی اور اسے غلام بنا ڈالا۔ بھلا اس کی موجودگی میں میری ذات پر تمہاری مہربانیاں کیا قیمت رکھ سکتی ہیں؟

اور ان کے یاد دلانے سے مجھ پر کیا اثر پڑ سکتا ہے؟"

اس مختصر بحث سے معاملہ صاف ہو جاتا ہے۔ اگر انگریزوں نے اپنے قبضہ کے بعد مصر کو کوئی ایک فائدہ یا لاکھ فائدے پہنچائے ہیں تو ان کے تسلیم کر لینے کے بعد بھی انگریزوں کی کوئی تعریف نہیں کی جا سکتی اور نہ حصول حریت کے لئے مصریوں کی جد وجہد پر ملامت کی جا سکتی ہے کیونکہ اس ملک پر قبضہ کرتے ہی انگریزوں نے اس کی حریت توڑ ڈالی ہے اور بس یہی وجہ بالکل کافی و وافی ہے کہ مصری ان سے اُنس نہ کریں اور ان کا کوئی احسان نہ مانیں! اس بحث کو ہم محکوم ہندوستان کی آب وہوا میں شاید کما حقہٗ نہ سمجھ سکیں۔ لیکن انگلستان کے باشندے اُسے خوب سمجھ سکتے ہیں بلکہ ہم تو تمام تر حصر انہیں پر کئے دیتے ہیں، وہ ایمان سے بتائیں کہ اگر جرمنی ان کے وطن مقدس پر قبضہ کر لینے کے بعد اس کی زمین کو سونے سے منڈھ دیتا تو کون انگریز ہوتا جو اسے پسند کرتا، جرمنی کی خدمات کا اعتراف کرتا اور اس کے برخلاف جہاد عظیم نہ برپا کر دیتا؟ میرے خیال میں ایک انگریز بھی اسے گوارا نہ کرتا۔ بلکہ اس کا تصور بھی اپنے ذہن میں کبھی نہ کرتا۔ پھر کیا وجہ ہے کہ جو کچھ اپنے لئے نہیں پسند کرتے وہ دوسروں کے لئے پسند کرتے، بلکہ اسے ان اپنی جرار فوجوں اور کوہ شکن جہازوں سے واجب اور ضروری قرار دیتے ہو؟

یہ ایک اصولی بحث تھی جس کے بعد ہمیں دیکھنا ہے کہ برطانیہ اور اس کے مداحوں کے ان طویل و عریض دعووں کی کیا حقیقت ہے کہ برٹش قبضہ کے دوران میں مصر نے نہایت عظیم الشان ترقیاں کی ہیں کہ جو بغیر اس صورت کے کسی طرح ممکن نہ تھیں۔ سب سے پہلے غور طلب یہ امر ہے کہ کسی ملک یا قوم کے ترقی کرنے کے کیا معنی ہیں؟ ملک کی ترقی مندرجہ ذیل باتوں سے معلوم ہوتی ہے:

(۱) صنعت و حرفت (۲) تجارت (۳) زراعت (۴) امن عام

اسی طرح قوم کی ترقی کے یہ معنی ہیں کہ اس کی عقلی، تعلیمی اور اخلاقی حالت درست ہو، صحت عمدہ ہو اور آبادی میں اضافہ ہو رہا ہو۔ ورنہ وہ ملک اور وہ قوم غیر ترقی یافتہ شمار ہوگی۔ کیونکہ کسی ملک میں صرف بڑے بڑے بازار بنا دینا، عالی شان عمارتوں کو تیار کر دینا، کشادہ سڑکیں جاری کر دینا اور جا بجا باغ اور پارک تمام کر دینا ترقی نہیں ہے بلکہ بسا اوقات یہ چیزیں بربادشدہ قوم کے لئے اور زیادہ بربادکن ہو جاتی ہیں۔ ہم دعوی سے کہتے ہیں کہ انگریزی قبضہ کے دوران میں مصر میں کوئی ترقی نہیں ہوئی۔ بلکہ تنزل ہوا ہے۔ ممکن ہے کہ کہا جائے کہ قاہرہ اور اسکندریہ جیسے عظیم الشان شہروں

کی موجودگی مصر کی ترقی کا مجسم ثبوت ہے لیکن اول تو ہم اسے ترقی تسلیم ہی نہیں کرتے اور اگر تسلیم بھی کرلیں تو ان شہروں کی رونق و آبادی میں انگریزوں کا کوئی حصہ نہیں ہے۔ یہ چیزیں ہمارے ایسے تھے۔ خدیو اسمٰعیل پاشا نے مصر کو جنت بنادیا تھا اور قاہرہ کو تو اس نے پیرس کے ہم پلہ کردیا تھا۔ کیونکہ اس کا یہی خیال تھا کہ ایسے بارونق شہروں کی موجودگی بس مصر کی ترقی کے لئے کافی ہے۔ چنانچہ اس کے اسی خبط کا نتیجہ یہ ہوا کہ مصر برباد ہوگیا۔ یعنی اس پر قرضہ کا ناقابل برداشت بوجھ لد گیا جس کی وجہ سے بالآخر اس کی آزادی سلب ہوگئی۔ پس یہ قاہرہ و اسکندریہ کی آبادی اسمٰعیل پاشا اور اُن اہل فرنگ کا کارنامہ ہے جو مصر میں مختلف زمانوں میں آباد ہوتے رہے جن میں کچھ انگریزی نسل کے لوگ بھی تھے۔ لیکن اس میں انگریزی قبضہ اور انگریزی انتظام کو کوئی دخل نہ تھا۔ بلکہ واقعہ ہے کہ انگریزوں نے آنے کے بعد قاہرہ کی رونق کو کم کردیا ہے۔ چنانچہ قصر النیل کا باغ کہ جس کا سلسلہ میلوں چلا گیا تھا اب چند بیگھ زمین میں محدود ہوکر رہ گیا ہے اور اُن عالیشان محل سراؤں کے مقام پر اب خاک اُڑ رہی ہے جن میں اسمٰعیل کی مجالس (کذا) بزم و نشاط برپا ہوا کرتی تھیں۔ بیشک انگریزوں نے اپنی فوجوں کے قیام کے لئے ایک دو چھاؤنیاں ضرور تعمیر کی ہیں۔ مگر قرب اسٹیشن کی چھاؤنی برطانیہ عظمیٰ کی پیشانی پر ہمیشہ داغ رہے گی۔ کیونکہ وہ اس سرزمین پر قائم کی گئی ہے جہاں خدائے واحد کی پنجوقتہ تسبیح و تقدیس کے لئے ایک عظیم الشان مسجد "جامع متبولی" کے نام سے موجود تھی جسے انگریزوں نے میرے زمانہ قیام مصر میں ڈھایا اور جن بزرگ (متبولی) کا مزار اس سے ملحق واقع تھا اُن کی ہڈیاں کھود کر دوسری جگہ منتقل کردیں اور اس طرح ایک ہی وقت میں دو دل آزاریاں مسلمانوں کی ہوئیں!

مضمون طویل ہوگیا ہے اس لئے آئندہ نمبروں میں بالتفصیل دکھایا جائے گا کہ ملت آزاد مصری قوم نے انگریزی قبضہ سے نفع حاصل کیا ہے یا نقصان۔

(۳)

آزادیٔ مصر کی جد و جہد کا ہیجان

"صبح امید" کے معزز صفحات پر "مسئلہ مصر" کے عنوان سے میرے دو مضمون شائع ہوچکے ہیں

تیسرے نمبر میں یہ دکھانے کا خیال تھا کہ انگریزی قبضہ سے مصر کو نقصان پہنچا یا نفع۔ لیکن درمیان میں "ملنر کمیشن" نے مصر کے متعلق وہ اصول شائع کر دیے ہیں جن پر مصریوں سے برطانیہ معاملہ طے کر سکتا ہے۔ اسی لیے میں نے ارادہ کیا کہ مصریوں کی اس جدوجہد اور جہاد عظیم کا بیان "صبح امید" کے ذریعہ سے اپنی قوم تک پہنچا دوں کہ جس کے بعد وہ اس نتیجہ تک پہنچ سکے ہیں جو ملنر کے اصول کی صورت میں ظاہر ہوا ہے۔ شاید کہ ہندوستانیوں میں بھی وہی روح پیدا ہو جائے جو مصریوں میں حلول کر گئی ہے اور شاید اسی طرح اس جنت نشان ہندوستان میں بھی صبح امید کا طلوع ہو۔ اور شام مایوسی اور فلاکت و نکبت کی شب دیجور دور ہو جائے۔

مصریوں کی کامیابی کی خبر ہندوستان میں بشارت عظمیٰ کے طور پر سنی گئی ہے۔ اس سے پژمردہ دلوں میں تازگی پیدا ہو گئی ہے۔ اداس چہروں پر تبسم ظاہر ہونے لگا ہے اور جو ضعیف الایمان ہستیاں اب تک کی جدوجہد کو ایک لغو و عبث حرکت سمجھتی تھیں اب وہ بھی اپنا چولہ بدل رہی ہیں اور اب ہمیں بہت ایسے ہاتھ کام کرتے نظر آتے ہیں جن میں اگر کبھی حرکت ہوتی بھی تھی تو اپنے ہی پاؤں پہ کلہاڑی مارنے کے لیے اور کیوں نہیں جبکہ مصر مشرقی دنیا کی ناف میں واقع ہے اور اس کی فلاح و بہبودی اور آزادی مشرق کی فلاح و بہبودی اور آزادی ہے۔

پس ملنر کمیشن کی قراردادوں کا ہندوستان میں دلچسپی اور تعلق دلی سے دیکھا جانا بالکل بجا ہے۔ لیکن اس سے پیشتر مصریوں کی ان کوششوں کو معلوم کر لینا ضروری ہے جن کا وہ ثمرہ ہیں۔ اسی لیے پہلے ہم انہیں بیان کریں گے اور پھر ان قراردادوں پر بحث کریں گے۔

آزادی مصر کی اول جدوجہد

۱۸۸۲ء میں جب برطانیہ نے مصر پر قبضہ کیا ہے تو اس وقت ملک میں مصلحین کی ایک جماعت موجود تھی جو خدیو اسماعیل پاشا کے فسق و فجور اور ظلم و استبداد کو روکتی اور قوم میں تعلیم و تربیت عام کر رہی تھی۔ اس مبارک جماعت کے قائم کرنے اور اس کی رہنمائی کرنے والے حضرت سید جمال الدین افغانی تھے، جو اپنے عہد کے سب سے بڑے مشرقی مصلح اور موجودہ اسلامی بیداری کے ہیرو تھے۔ اسماعیل پاشا کی معزولی اور ان کے ولی عہد توفیق کی تخت نشینی کے بعد یہ واقعہ پیش آیا کہ خدیو نے سید صاحب کو جلاوطن کر دیا لیکن سید صاحب بھلا ایسے کچے نہ تھے کہ خارج البلد ہونے کے بعد خاموشی کے ساتھ بیٹھ رہتے۔ انہوں نے فوراً ہی اپنی مصلحانہ کوششوں کا رخ دوسری طرف پھیر دیا۔ مسئلہ مصر پر بحث کرنے کے لیے انہوں نے یورپ کا سفر کیا۔ سربرآوردہ یورپین اور مشرقی اخبارات میں معرکہ آرا مضامین لکھے۔ دورہ کر کے جابجا لکچر دیے۔ پُرزور کوششوں سے منافع کیے اور خاص اس مسئلہ کے لیے ۱۸۸۴ء میں

پیرس سے اپنا شہرۂ آفاق اخبار "عروۃ الوثقیٰ" جاری کیا۔ جو اگر کچھ عرصہ تک زندہ رہ جاتا تو یقیناً مصر کا معاملہ کہیں پہلے ہی طے ہو چکا تھا۔ کیونکہ اس نے اپنی لاثانی فصاحت و بلاغت اور زبردست قوت استدلال سے تمام عالم کو مصر کی جانب متوجہ کر دیا تھا اور تمام مشرق میں بیداری پیدا کر دی تھی مگر دنیا کی تمام مستبد سلطنتوں نے اس کا داخلہ اپنے مقبوضات میں ممنوع قرار دیا اور ۱۹ نمبروں کے بعد یہ اخبار ہمیشہ کے لئے بند ہو گیا۔ یہ اخبار ہفتہ وار تھا اور لاکھوں کی تعداد میں چھپ کر مفت شائع ہوتا تھا۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ سید صاحب کو مسئلہ مصر کا کس قدر اہتمام تھا۔

دوسری جد و جہد

شیخ محمد عبدہ سید صاحب کے جانشین تھے۔ انہوں نے عروۃ الوثقیٰ کے بند ہوتے ہی پیرس کو خیرباد کہا اور چندے ملک شام میں قیام کرنے اور اپنی جلاوطنی کے منسوخ ہونے کے بعد پھر وطن محبوب کی طرف رُخ کیا۔ مگر اب یہاں کا نقشہ بدل گیا تھا۔ خوف و دہشت ہر قلب پر طاری تھی اور جہالت و حماقت نے ہر سمت مُردنی پیدا کر دی تھی۔ اس لئے انہوں نے علانیہ ایجی ٹیشن کے بجائے مدارس کی طرف توجہ کی۔ جامع ازہر جو قدامت پرستی اور جمود و غفلت کا مرکز تھا اُس میں روشن خیالی اور زندہ دلی کا چرچا کیا اور دو عظیم الشان مذہبی مدرسے "دارالعلوم" اور "مدرسۃ القضا" جدید اصول پر قائم کرائے اور ان کے طلبا میں آزادی کی روح پھونکنا شروع کی۔ چنانچہ اول الذکر مدرسے کے ایک ثمر نونہال "شیخ عبدالعزیز شاویش" ہیں جن کی تجرعلمی مسلّم، جن کی فصاحت و بلاغت بےنظیر، جن کی علوم جدیدہ میں دستگاہ لاثانی اور جو جد و جہد حریت کے ایک عظیم الشان ہیرو ہیں۔

تیسری جد و جہد

شیخ محمد عبدہ اور ان کی جماعت نے اگرچہ اپنی اس دوسری زندگی میں سیاست اور پالٹکس میں پڑنے سے ہمیشہ انکار کیا مگر درحقیقت وہ ہر لحظہ اسی میں مشغول رہے اور اندر اندر ایسے مواد جمع کرتے رہے جن کا کبھی نہ کبھی پھوڑا بن کر ابھرنا ضروری تھا۔ چنانچہ انہیں کی زندگی میں مصری نوجوانوں کی ایک جماعت میدان میں آ گئی جس کا سر ایک ۱۸ سالہ محب وطن "مصطفیٰ کامل" تھا جس کا ہاتھ پیر شیخ "عبدالعزیز شاویش" اور "محمد بک فرید" تھے اور جس کا قلب خود ملک کا نوعمر حاکم "عباس ثانی" تھا۔ نوخیز دلوں کی اس جماعت نے بڑی مستعدی اور تن دہی سے اپنا سیاسی کام شروع کیا اور سنہ ... میں ایک کانگریس "حزب الوطنی"

کے نام سے قائم کی جس کا مقصد ملک کو آزاد کرنا تھا۔ عربی، فرنچ، اور انگریزی زبانوں میں متعدد اخبار جاری کیے۔ ممالک یورپ میں پے در پے وفد روانہ کیے۔ اندرون ملک میں ہر جگہ جلسے اور کانفرنسیں منعقد کرنا شروع کیں اور سیاسی واعظوں و مبلغوں کی جماعتیں دورہ کرنے کے لئے مقرر کیں۔ غرضکہ تمام ملک میں آزادی کی تحریک پھیلا دی اور آبادی کے بڑے حصہ کو اجنبی قبضہ کے برخلاف کر دیا لیکن افسوس ہے کہ مصطفےٰ کامل پاشا کی عمر نے زیادہ وفا نہ کی اور وہ ۳۴ سال کی عمر میں دنیا سے کوچ کر گئے۔

ان کے انتقال کے بعد محمد بک فرید لیڈر رہے لیکن مرحوم مصطفےٰ کی وفات ملک کے لئے شدید نقصان رساں ثابت ہوئی۔ محمد بک فرید کے جہاد عظیم سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا لیکن اُن سے بڑی غلطی یہ ہوئی کہ انہوں نے خدیو کو باسانی مجبور کر لیا کہ "پریس ایکٹ" جاری کر کے اخبارات کی آزادی ختم کر دیں اور محمد فرید کو محض معمولی باتوں کی بنا پر قید کریں۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا جس سے اس تحریک کو سخت نقصان پہنچا اور اخبارات کی زبان تقریباً بند ہو گئی۔ محمد بک فرید نے رہا ہونے کے بعد اگرچہ پھر ایجی ٹیشن جاری کیا لیکن اب کام کرنا محال تھا۔ چنانچہ فوراً ہی ان پر دوسرا مقدمہ قائم ہو گیا جس کی پیروی نتیجہ معلوم کی وجہ سے عبث تھی۔ اس لئے ۱۹۱۲ء میں وہ یورپ کو فرار ہو گئے اور وہیں سے اپنی کوششیں کرنے لگے جیسا کہ آگے بیان ہو گا۔ ان کے بعد شیخ عبدالعزیز کی باری تھی جنہیں بھی مجبوراً قسطنطنیہ بھاگنا پڑا۔ ان دونوں لیڈروں کے بھاگنے کے بعد مصر تقریباً خالی ہو گیا۔ اگرچہ بہت سے دوسرے لوگ موجود تھے۔ اخبارات و رسائل بھی تھے اور نیز کانگرس بھی باقی تھی مگر اصل کارکن گروہ کی غیر حاضری سے کسی تحریک کو جتنا صدمہ پہنچتا ہے وہ ظاہر ہے۔

دوران جنگ میں جدوجہد

دوران جنگ میں خود سرزمین مصر میں کسی بڑے پیمانہ پر آزادی کی جدوجہد نہ ہوئی جس کی وجہ یہ تھی کہ تمام محبان ملک ایک ایک کر کے نظر بند کر لیے گئے تھے۔ آزاد نگار اخبارات بند کر دیے گئے تھے اور معتدل اخباروں پر بھی سنسر قائم کیا گیا تھا جو شائع ہونے سے قبل ہی اُن کی قطع و برید کر دیا کرتا تھا۔ میں نے جنگ کے ابتدائی تین سال مصر ہی میں بسر کیے ہیں اور میں اس جبر و تشدد کو اب تک یاد کر کے حیران ہوتا ہوں۔ حالت یہ تھی کہ کسی شخص کی بھی آزادی اور عزت محفوظ نہ تھی۔ خفیہ پولیس کا ایک جال تھا جو تمام ملک میں پھیلا دیا گیا تھا۔ ہر شخص کی نگرانی ہوتی تھی اور ادنیٰ سی بات پر نظر بندی یا سزا دی جاتی تھی۔ بھلا غریب الوطن اور مفلوک الحال ہندوستانی مصر میں رہ کر کیا نقصان پہنچا سکتے تھے۔ لیکن انہیں بھی

چین سے نہ بیٹھنے دیا گیا اور جیل خانوں میں نظر بند کر دیا گیا۔ اُن میں سے اکثر نو امی محض تھے اور ایک نابینا فقیر بھی تھا۔ میں اگرچہ نظر بند نہ ہوا لیکن شاید سب سے زیادہ تکالیف مجھ ہی کو برداشت کرنا پڑیں۔ کیونکہ میرے یہ گن، بہت بڑے تھے کہ میں آغاز جنگ میں قسطنطنیہ میں تھا۔ وہاں اخبار "جہان اسلام" کو ایڈٹ کرتا تھا۔ میرے کاغذات سے انجمن خدام کعبہ کی رسیدیں برآمد ہوئی تھیں اور تحصیل علم کے لیے مصر آیا تھا۔ میری مصیبت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ ایک زبردست ہندوستانی جاسوس "صغیر بیگ" ایم اے (ایڈنبرا یونیورسٹی) میرے ساتھ مکان میں رہا کرتا تھا اور میں اس کے اندرونی حالات سے بالکل ناواقف تھا۔ اس شخص کی کارروائیاں اس قدر خوفناک تھیں کہ اگر رحمت الٰہی شامل حال نہ ہوتی تو میں آج زندوں میں نہیں بلکہ مُردوں میں ہوتا۔ اُس نے عین عید کے روز ۱۵ معزز مصریوں کو نظر بند کرایا تھا جس سے قاہرہ میں ہر طرف سنسنی پھیل گئی تھی اس کے علاوہ اور بھی بہت سے ہندوستانی "سی۔ آئی۔ ڈی" کے افسر تھے اور بے شمار ہندوستانی فوجیں مصر میں موجود تھیں۔

۱۹۱۴ء میں برطانیہ نے خدیو عباس پاشا کو معزول کر کے ان کے چچا "حسین کامل" کو تخت نشین کیا۔ اس واقعہ سے عام مصریوں کے خیالات میں زبردست انقلاب ہوا۔ وہ جدید سلطان سے بھی سخت نفرت کرنے لگے۔ عام طور پر بازاروں میں اُن کی نسبت توہین آمیز کلمات استعمال کیے جانے لگے۔ مساجد میں بہت سے اماموں نے خطبۂ جمعہ میں اُن کے حق میں دعا کرنے سے انکار کر دیا اور جن جن مدارس میں وہ معائنہ کے لیے گئے طلبہ نے علی الاعلان اُن کی توہین کی۔ حالانکہ غریب حسین کامل ایک حیثیت سے اس کا مستحق نہ تھا۔ کیونکہ اُس نے مجبوراً تخت مصر کو قبول کیا تھا اور اگر وہ ایسا نہ کرتا تو آج "آغا خان" کے نام کا سکہ مصر میں چلتا ہوتا۔

اسی دوران میں انگریزی اعلیٰ افسر نے مارشل لا جاری کر کے مصریوں کو اور بھی بدظن اور ناراض کر دیا۔ اور قاہرہ میں ہتھیاروں کے بازار کو لوٹ کر انگریزی سپاہیوں نے تمام ملک میں سخت جوش پیدا کر دیا۔

جس بات نے سب سے زیادہ مصریوں کو مشتعل اور تحریک آزادی کو بہت آگے بڑھا دیا وہ فوج میں اُن کی جبریہ بھرتی تھی۔ آغاز جنگ میں انگریزوں نے مصری گورنمنٹ اور قوم سے یہی وعدہ کیا تھا کہ وہ مصر سے کسی قسم کی جنگی مدد نہ لیں گے۔ مگر بعد میں وہ بدل گئے اور ۱۲ لاکھ مصریوں کو جنگ اور جنگی کاموں کے لیے بھرتی کر لیا۔ حالت یہ تھی کہ بھرتی کرنے والے ہر چہار طرف گشت کرتے پھرتے تھے اور جسے پا جاتے فوجی کیمپ لے جاتے جہاں سے اُسے گیلی پولی، طور سینا اور دیگر جنگی میدانوں کو بھیج دیا جاتا جہاں وہ شدید محنت، سخت سردی اور فاقہ کشی سے ہزاروں کی تعداد میں مر گئے۔ ان واقعات نے

تمام ملک میں آگ لگادی اور ساری آبادی انقلاب کے لیے پوری طرح آمادہ ہوگئی۔

بیرون ملک میں جدوجہد

ادھر مصر میں آگ سلگ رہی تھی اور اُدھر بیرونی ممالک میں مصری محبانِ وطن سر توڑ کوششیں کر رہے تھے اور یورپ کی عام رائے کو اپنے موافق بنانے میں شب و روز ایک کر رہے تھے۔ ان کوششوں کے مرکز سوئڈن، ڈنمارک، سوئٹزرلینڈ اور جرمنی تھے جہاں انہوں نے اپنی بڑی بڑی انجمنیں قائم کی تھیں جن کے جلد جلد جلسے ہوا کرتے تھے۔ وہ سربرآوردہ اخبارات میں مضامین شائع کراتے، بڑے بڑے مدبروں سے ملاقاتیں کرتے اور قیامِ امن و امان کے لیے سوشلسٹوں کی جو کانفرنسیں ہوتی تھیں ان میں بڑی شد و مد سے مسئلۂ مصر کو پیش کیا کرتے تھے۔

جنگ کے ابتدائی تین سال تو جنگی کارروائیوں میں صرف ہو گئے (جیسا کہ آئندہ بتایا جائے گا) اور جب اُن سے کوئی کامیابی نہ ہوئی تو یہ سیاسی جدوجہد شروع کی گئی جس کا اجمالی بیان یہ ہے کہ ۱۰ / اکتوبر ۱۹۱۷ء میں مصری لیڈر محمد بک فرید نے اسٹاکہام سے فریقینِ جنگ کو تمام یورپین زبانوں میں ایک یادداشت لکھ کر مسئلۂ مصر کی جانب متوجہ کیا جس پر دنیا کے تمام سربرآوردہ اخبارات نے اظہارِ خیال کیا اور اسٹاکہام کے گورنر نے مصر اور سوئز قنال کی آزادی کی زبردست حمایت کی۔ ساتھ ہی سوویٹ روس نے بھی مسئلۂ مصر کو بہت اہمیت دی اور اپنی صلح کے بنیادی شرائط میں اسے داخل کر کے "سیوسکو بلیف" کو اس پر تیار ہونے کے لیے مقرر کیا تاکہ بوقتِ صلح وہ اس پر پوری بحث کر سکیں۔

اس کے بعد ۹ نومبر ۱۹۱۷ء کو مصریوں کی ترغیب سے "سیو کارل لنڈھاحن" گورنر اسٹاکہام اور "لیگ امن" کے سکریٹری نے محکوم مشرقی اقوام کی ایک کانفرنس منعقد کی جس میں مراکش، الجزائر، ٹیونس، طرابلس، مصر، قوقاز، ہندوستان اور طورانی قوموں کے ۷۰۰ نمایندوں نے شرکت کی جن میں سے ہر ایک نے اپنے ملک کے مطالبات علیحدہ علیحدہ قلمبند کر کے پیش کیے جنہیں طبع کر کے تمام مہذب دنیا میں تقسیم کیا۔

پھر اسی سال جب روس اور جرمنی کے مابین "برسٹ لوٹو فسک" میں کانفرنس صلح ہوئی تو اس میں بھی مصریوں نے ایک یادداشت کے ذریعہ سے مسئلۂ مصر کو پیش کیا جس کی "لینن" نے نہایت بلند آہنگی سے یہ کہتے ہوئے حمایت کی کہ "جب تک مصر اور اس کی نہر آزاد نہ ہو گی، اُس وقت تک دنیا میں امن نہ قائم ہو گا۔"

ادھر برلن میں اور کوششوں کے علاوہ ۱۹۱۷ء کے آخر میں مصریوں نے ایک کلب قائم کیا جو اپنی شان و شوکت اور آراستگی کے لحاظ سے برلن میں ایک تھا۔ وہاں کے مشاہیر کا اس میں اکثر جمگھٹا رہتا تھا جو فرصت کے اوقات گذارنے اور اپنے سیاسی جھگڑے طے کرنے کے لیے اس میں جمع ہوا کرتے تھے۔ چنانچہ مشہور جرمنی مدبر "زفنشلو" اور اس کے حریف "برناڈی" کے جا حضے اسی میں ہوتے تھے اور "ترپیرز" وزیر بحریہ اور "زمرمان" کی بھی اسی میں نشست رہتی تھی۔

برلن کے اخبارات پر بھی مصری قوم پرستوں کا بڑا اثر تھا، اور وہ ان سے اپنے موافق مضامین لکھوایا کرتے تھے۔ چنانچہ اسی اثنا میں جب سرحد تھریس کے متعلق ٹرکی اور بلغاریہ میں تنازعہ ہوا تو ٹرکی نے اسی مصری کلب سے درخواست کی تھی کہ وہ اس کی حمایت میں برلن کے اخبارات سے مضامین شائع کرائے۔ صرف یہی نہیں بلکہ ۱۹۱۸ء میں مصریوں نے برلن میں ایک انجمن "آزادی مصر کی لیگ" کے نام سے قائم کی جس کی عظمت کا یہ عالم تھا کہ قیصر جرمنی کے حقیقی بھائی "ڈیوک دی ہلسٹن" اس کے صدر تھے اور اعزازی عہدہ دار جرمنی اور ٹرکی کے جلیل القدر لوگ تھے چنانچہ اول الذکر میں پرنس "لغنشطاین" امیرالبحر "ترپیرز"، "کنزرویٹو پارٹی کے لیڈر "کونٹ وستارپ" "لبرل پارٹی کے لیڈر "سٹرزیمان" "ڈیوٹس پارٹی کے لیڈر "ڈاکٹر فرموت" اور جنرل "مان ٹیوبہ" وغیرہم تھے! اور ثانی الذکر میں انور پاشا، طلعت پاشا، حقی پاشا (ترکی سفیر متعینہ جرمنی) اور رفعت بک صدر مجلس اعیان وغیرہم تھے۔ لیکن جرمنی کی جنگی حیثیت گر جانے کی وجہ سے یہ انجمن زیادہ کام نہ کر سکی۔

اسی زمانہ میں مصریوں نے برلن میں ایک عظیم الشان کانفرنس منعقد کی جس میں مشاہیر وقت نے مسئلہ مصر پر اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

غرضیکہ یورپ میں مصریوں نے اس قدر جدوجہد کی کہ وہاں کی عام رائے بڑی حد تک ان کے ساتھ ہو گئی جس کی شہادت ایک مشہور یورپین مدبر "کونٹ رفنتلو" نے ان الفاظ میں دی ہے کہ "مصری کانگریس (حزب الوطنی) تمام دنیا کے سامنے بجا طور سے فخر کر سکتی ہے کہ اس نے یورپ کی رائے عامہ کو اپنے موافق بنانے اور مدبروں کے ہموار کرنے میں بے نظیر سعی سے کام لیا ہے!" اور جرمنی میں تو خصوصیت سے اُن کے سب ہی طرفدار تھے۔

چنانچہ اسی زمانہ میں جرمن وزیر اعظم "تمان بالوگ" نے پارلیمنٹ میں کھڑے ہو کر کہہ دیا کہ

"مصر کی آزادی ضروری ہے۔ کیونکہ تجارت اور سمندروں کی آزادی اسی پر موقوف ہے۔ انگلستان کو مصر کے متعلق اپنے کثیر وعدوں کی پابندی لازم ہے"۔ اس تقریر کا انگلستان پر بڑا اثر ہوا اور انگریزی مدبر اس کے جواب پر مجبور ہوئے۔ چنانچہ مسٹر بالفور نے کہا "انگلستان مصر کو ترکوں کے پنجے میں دوبارہ نہ جانے دے گا۔ کیونکہ یہ مصر کی مصلحت کے قطعاً برخلاف ہے!" اور بونر لا نے کہا "انگلستان مصر سے اسی وقت دست کش کرے گا جب وہ بالکل مجبور ہو جائے"۔

یہ ہے مصریوں کی یورپ میں کوششوں کا ایک ہلکا سا خاکہ جس کے مقابلہ میں مسلم لیگ کو مخاطب کرنا بھی نادانی ہے۔ البتہ آل انڈیا نیشنل کانگریس بتلائے کہ اس نے اپنی پوری ۴۰ سالہ زندگی میں کیا کیا ہے؟ ہندوستانی یہ معلوم کر کے حیران ہو جائیں گے کہ مصری کانگریس کے صدر محمد بیگ فرید نے ۱۹۱۲ء سے ۱۹۱۹ء تک یعنی سات سال کی مدت میں سرزمین یورپ میں مسئلہ مصر کے متعلق ۳۵ زبردست لکچر دیے، سو مرتبہ سے زیادہ مدبروں سے گفتگو کی اور مصری، مارکی ایجنسی، جزائری، شامی اور یورپین اخبارات میں مضامین لکھے۔ انہوں نے صرف فرنچ زبان میں مصر کے متعلق دو ہزار صفحہ سے زائد لکھے ہیں۔

التوائے جنگ کے بعد جد و جہد

۱۹۱۸ء میں جب التوائے جنگ ہوا اور دنیا نے دیکھ لیا کہ جرمنی اور اس کے اتحادی مغلوب ہوئے اور برطانیہ غالب، اور ان طویل و عریض وعدوں کے پورا کرنے کا وقت آیا جو برطانیہ نے دنیا سے کیے تھے تو مصریوں نے بھی اپنی حقوق طلبی کی اور ان کے وزیر اعظم "رشدی پاشا" نے پیرس جانے اور صلح کانفرنس میں مسئلہ مصر کے پیش کرنے کی تیاریاں کیں۔ لیکن انگریزوں نے انہیں اس شرط پر جانے کی اجازت دی کہ کانفرنس میں اسی حیثیت سے شرکت کریں جس حیثیت سے ہندوستانی نمائندے "مہاراجہ بیکانیر اور لارڈ سنہا" شریک ہوں گے۔ یعنی بطور انگریزی ماتحت اور رعایا کے۔ رشدی پاشا نے اسے نامنظور کیا اور اس لئے انہیں سفر کرنے کی اجازت نہ ملی جس پر انہوں نے وزارت سے استعفا دے دیا اور گورنمنٹ سے قطع تعلق کر لیا۔ اس پر تمام ملک میں سخت بے چینی پھیلی اور مصر کے نامور وزیر تعلیم "سعد پاشا زغلول" نے ۱۲ نومبر ۱۹۱۸ء کو صلح کانفرنس میں شریک ہونے کے لئے ایک قومی وفد مرتب کیا اور تمام مصریوں سے اپنے وکالت نامہ پر دستخط لینا شروع

کیے تاکہ اُن کی نمایندگی میں اتحادیوں کو کسی قسم کا شک یا شبہہ نہ ہو۔ انگریزوں نے بیشتر تو بڑی سختی سے وفد کو روکنا چاہا مگر جب اُس میں کامیابی نہ ہوئی تو انہوں نے "سعد پاشا" اور ان کے رفقا "محمود پاشا سلیمان" "ابراہیم سعید پاشا" اور علی بک ماہر کو گرفتار کر کے نظر بند کر دیا اور اول الذکر کو مالٹا جلاوطن کیا۔ ان کی اس کارروائی سے یکلخت تمام ملک مشتعل ہو گیا۔ بازار بند ہو گئے بیشتر پیشہ وروں نے اپنے پیشے ترک کر دیے۔ وکلا نے عارضی طور پر وکالت چھوڑ دی۔ طلبا نے مدرسوں میں ہڑتال کر دی اور ہر ہر جگہ جلسے اور مظاہرے ہونے لگے، جنہیں گورنمنٹ نے جبراً روکنا چاہا اور ہر جگہ پولیس اور برطانوی فوج نے مداخلت شروع کی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ خون ریزی شروع ہو گئی۔

برطانیہ نے جب یہ دیکھا کہ سعد پاشا وغیرہ کی نظر بندی سے جوش دب جانے کے بجائے برابر بڑھ رہا اور شورش بغاوت کی شکل اختیار کر رہا ہے تو اُس نے نظر بندوں کو فوراً رہا کر دیا تاکہ سکون و خاموشی پیدا ہو جائے۔ لیکن اُس کی یہ تدبیر بھی کارگر نہ ہوئی اور مصری پوری مستعدی سے ایجیٹیشن کرتے رہے۔ کیونکہ اب آزادی کی تحریک تحریک نہیں رہی تھی بلکہ مصریوں کے لیے روح بن گئی تھی کہ جس کے بغیر انہیں کسی طرح چین نہ آ سکتا تھا۔ چنانچہ سعد زغلول نے رہا ہوتے ہی فوراً پیرس کا رخ کیا۔ لیکن افسوس ہے کہ اُن کے پہونچنے سے دو روز پیشتر ہی کانفرنس صلح مصر کے متعلق اپنا فیصلہ صادر کر چکی تھی اور فرشتۂ صلح پریسیڈنٹ ولسن مصر پر برطانیہ کے پروٹیکٹوریٹ کو اپنی کمال ضعف مزاجی سے تسلیم کر چکے تھے ظاہر ہے کہ مصری وفد کو اپنی اس ناکامی پر بڑی ہی مایوسی ہوئی ہوگی، مگر اُس نے ہمت نہ ہاری اور صلح کانفرنس اور اتحادی حکومتوں کو برابر احتجاجی نوٹ پر نوٹ روانہ کرنے لگا۔ نیز فرانس، اٹلی، انگلستان اور امریکہ میں اپنے نمایندے بھیج کر اس قدر ہنگامہ اور شور برپا کیا کہ ان ملکوں کی عام رائے مسئلہ مصر کو اہمیت دینے لگی۔ ادھر مصر میں ایجیٹیشن برابر ترقی کرتا جاتا تھا۔ آخر اس سب کا نتیجہ یہ ہوا کہ برطانیہ نے اپنی ڈپلومیسی کا ایک کرتب دکھانا چاہا کہ شاید مصری اُس میں مشغول ہو کر بہل جائیں چنانچہ اس مقصد کے لیے اس نے اپنے یہاں کے ایک مشہور سیاسی بازی گر "لارڈ ملنر" کو منتخب کیا اور وہ اپنے پورے طائفہ کے ساتھ ۷ دسمبر ۱۹۱۹ء کو قاہرہ پہنچ گئے۔

لیکن برطانیہ اور لارڈ ملنر کو یہ کیا معلوم تھا کہ اب مصر وہ مصر نہیں رہا ہے جو لارڈ کرومر کے زمانہ میں تھا اور نہ وہ ہندوستان ہے جہاں مسٹر مانٹیگو اُن سے تھوڑی ہی مدت پہلے ایک کامیاب پارٹ کر گئے تھے۔ لارڈ ملنر اور ان کا طائفہ اگرچہ خوب روپ بھر کر گیا تھا مگر مصریوں نے اسے فوراً پہچان لیا۔ اور صاف اعلان کر دیا کہ وہ لارڈ ملنر سے پیام و سلام کے لئے تیار نہیں ہیں۔ ساتھ ہی مصری کانگریس نے اعلان کیا کہ "مصری قوم ملنر کمیشن کا حسب ذیل قانونی وجوہ کی بنا پر بائیکاٹ کرتی ہے۔

(۱) مسئلہ مصر ایک بین الاقوامی مسئلہ ہے۔ اگر مصری کمیشن سے گفت و شنید کرنا منظور کرلیں گے تو اس کے معاملہ کی بین الاقوامی حیثیت جاتی رہے گی اور وہ برطانیہ کا اندرونی معاملہ ہو جائے گا۔

(۲) ملنر کمیشن برطانوی پروٹیکٹوریٹ کو تسلیم کرتے ہوئے گفت و شنید کرنا چاہتا ہے، حالانکہ مصری قوم نے ہمیشہ اس کے تسلیم کرنے سے انکار کیا ہے اور اپنی کامل آزادی پر اصرار کیا ہے۔

(۳) ہر وہ استصواب رائے جو مارشل لا کے ماتحت عمل میں آئے ناجائز ہے اس لئے مارشل لا کی موجودگی میں ملنر کمیشن سے گفتگو ناجائز ہے پس انگریزی گورنمنٹ کا اس کمیشن کے ذریعہ سے اپنی مطلب برآری کر لینا ناممکن ہے، کیونکہ مصری قوم اپنے مطالبۂ کامل آزادی پر جمی ہوئی ہے۔ اور جب تک وہ خود انگریزی حمایت کو تسلیم نہ کرے اس وقت تک کسی بین الاقوامی قانون کی رو سے انگریزی پروٹیکٹوریٹ جائز نہیں ہو سکتا، اگرچہ تمام اتحادی سلطنتیں اُسے منظور بھی کر لیں......"

اس اعلان کا اثر بہت زبردست ہوا اور ملنر کمیشن کا بائیکاٹ اس قدر مکمل ہوا کہ اس کی نظیر مشکل سے کسی دوسری قوم میں ملے گی۔ حالت یہ تھی کہ سارے ملک میں اس کمیشن کے آنے پر ناراضی پھیل گئی تھی۔ ہر ہر مقام پر تقریباً روزانہ عام ہڑتالیں ہوتی تھیں اور ہزارہا آدمی مل کر مظاہرے کرتے تھے۔ انگریزوں نے لاکھ لاکھ کوشش ان مظاہروں کے روکنے کی کی مگر انہیں مطلقاً کامیابی نہ ہوئی۔ مصریوں نے ملنر کمیشن پر صدائے احتجاج بلند کرنے سے رک جانا کسی طرح بھی منظور نہیں کیا۔ یہ جوش صرف تعلیم یافتہ طبقہ ہی تک محدود نہ تھا بلکہ ادنیٰ سے ادنیٰ کاشتکار اور غریب سے غریب آدمی میں بھی موجود تھا حتیٰ کہ عورتوں میں بھی۔ جو اپنے علیحدہ مظاہرے نکالتی تھیں۔

سب سے زیادہ جوش اسکولوں کے طلبہ میں تھا جنہوں نے تعلیم گاہوں کو خیرباد کہہ دی تھی اور ہر طرف آزادی کی تحریکیں اور جدوجہد کو رکھی تھیں۔ دیکھتے دیکھتے شہروں سے گزر کر قصبوں اور دیہاتوں تک میں پھیل گئے تھے اور سب کو اس جدوجہد میں شرکت کی دعوت دیتے تھے اور جو بزدلی یا خیانت کی وجہ سے شرکت کرنے سے گریز کرتا تھا اس کا قافیہ تنگ کر دیتے تھے۔ انہوں نے تمام ملک میں اپنی دھوم مچادی تھی۔

اس زمانہ میں چھ ماہ تک حکومت بلا وزارت کے رہی۔ یہ تحریک اول اول ابتدائی مدارس میں پیدا ہوئی تھی لیکن جب انہوں نے اپنی کامیابی کو مشتبہ پایا تو فوراً مذہبی یونیورسٹی جامع ازہر کی طرف متوجہ ہو گئے اور اس کے طلبہ اور اساتذہ میں وہ جوش اور سرگرمی پیدا کر دی جس کی نظیر ازہر کی ہزار سالہ تاریخ میں نہیں ملتی اور جس کی بدولت مصریوں کو اپنی جدوجہد کو کامیاب بنانے کا موقع ملا۔

ہم نے نومبر ۱۹۱۹ء کے "صبح امید" میں "جامع ازہر اور سیاست" کے عنوان سے جو مضمون لکھا تھا اور اس پر جو پیشگوئی کی تھی وہ حرف بحرف پوری ہوئی۔ اس میں سے یہ عبارت ملاحظہ ہو کہ "یہ امر واقعہ ہے کہ جس سلطنت نے اس دارالعلوم (ازہر) سے بگاڑ کیا اس کو بڑی سخت مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ چنانچہ ممالیک کی بربادی اور فرانسیسیوں کی برطرفی میں یقیناً اس کا زبردست ہاتھ بھی کام کر رہا تھا۔ میرے خیال میں موجودہ گورنمنٹ نے ان سوتی ہوئی بھڑوں کو جگا کر سخت غلطی کی ہے۔ اس کو گزشتہ تاریخ سے سبق حاصل کرنا اور ازہر کی قوت کا اندازہ کرنا چاہئے۔ کیا اس کو معلوم نہیں کہ اس دارالعلوم کا تمام ملک پر کتنا مذہبی اقتدار ہے؟ شاید ہی کوئی قصبہ ایسا ہو جس میں اس کے تعلیم یافتہ موجود نہ ہوں۔ ظاہر ہے کہ ایسی حالت میں اس سے جو صدا نکلے گی اس کی بازگشت گاؤں گاؤں سے سنی جائے گی ......!"

چنانچہ بالکل ایسا ہوا۔ برطانیہ نے ازہر کی سوتی ہوئی بھڑوں کو جگا دیا اور ازہر نے وہ تمام سنتیں پوری کر دیں جو فرانسیسیوں نے کی تھیں اور جو ان کی تباہی کا بڑا سبب ہوئیں یعنی برطانیہ نے بھی ازہر والوں پر تشدد کیا:

"تمام مصری قوم اپنے قدرتی اور شرعی حق یعنی کامل آزادی کے مطالبہ پر جمی ہوئی ہے اور اس کے حاصل کرنے میں اپنی تمام طاقتیں صرف کر رہی ہے لیکن برطانیہ اس کے اس حق کے تسلیم کرنے پر مطلق آمادہ نہیں ہے۔ جس کا نتیجہ ہیں وہ تمام ہنگامے اور بے چینیاں جن کی وجہ سے مصالح عامہ وخاصہ کو نقصان پہنچ رہا ہے۔ جامع ازہر کے علماء و مشائخ پورے غور و خوض کے بعد اعلان کرتے ہیں کہ برطانیہ اور مصر کے

مابین صلح اور امن قائم ہونے کی صرف یہی ایک صورت ہے کہ "انگلستان اپنے وعدوں کو وفا کرے اور مشرق کے اس عظیم الشان ملک کی آزادی کو تسلیم کرے جس کے بعد امن و امان قائم ہو جائے گا ......"

اس مذہبی اعلان کا اثر تمام ملک خصوصاً دیہاتوں پر بہت زبردست ہوا اور کوئی شخص سرزمین مصر پر ایسا نہ رہا جو برطانیہ کے خلاف جدوجہد میں شریک نہ ہو گیا ہو۔ ازہر کے علماء و مشائخ اور طلبا ہر طرف گشت کرتے پھرتے اور قوم کے تمام افراد میں مذہبی روح پھونکتے اور انہیں آزاد ہونے کی دعوت دیتے پھرتے تھے۔

یہ امر بھی قابل غور ہے کہ ملنر کمیشن کے بائیکاٹ اور آزادی کے مطالبہ میں ساری قوم بلا تفریق ملت و مذہب ایک ہو گئی تھی۔ مسلمان اور قبطی سب بھائی بھائی ہو گئے تھے۔ کسی کو کسی سے کوئی تعصب و مخاصمت نہ رہی تھی۔ قبطیوں کے لیڈر مساجد کے ممبروں پر کھڑے ہو کر لیکچر دیتے تھے اور مسلمان رہنما قبطیوں کے گرجوں میں سب سے زیادہ مقدس مقام پر سے تقریریں کرتے تھے اور کسی کو اعتراض نہ ہوتا تھا۔

غرض کہ جب لارڈ ملنر نے دیکھا کہ ان کے کمیشن کو مصریوں نے بائیکاٹ کر دیا ہے اور کوئی ان کی طرف متوجہ نہیں ہوتا تو انہوں نے خود سربرآوردہ مصریوں کے مکانوں پر ناخواندہ مہمان بن کر جانا شروع کیا کہ شاید کہیں سے مطلب برآری ہو۔ مگر جب کسی نے بھی انہیں منہ نہ لگایا تو وہ شیخ محمد بخیت "مفتی مصر" کے یہاں گئے جو ایک زمانہ دراز سے ہندوستان کے شمس العلماؤں کی پالیسی پر چل رہے تھے۔ ملنر صاحب کو یقین کامل تھا کہ یہ "پیر مرد" ضرور ان کی ہمنوائی کریں گے اور برطانیہ کی حمایت کر کے سرخروئی حاصل کریں گے۔ مگر انہیں یہ دیکھ کر سخت حیرت ہوئی کہ ان کا رنگ بھی بدلا ہوا ہے اور یہ بھی اپنے سر میں دوسرا سودا رکھتے ہیں۔ لارڈ اور مفتی میں جو گفتگو ہوئی وہ نہایت دلچسپ ہے۔ ذیل میں ہم اسے ملاحظہ کیجیے:

لارڈ : آپ مصر کے نہایت جلیل القدر اور صاحب الرائے لوگوں میں سے ہیں۔ مصر نے اگرچہ بہت کچھ ترقی کر لی ہے۔ تاہم اس میں آپ جیسے معاملہ فہم اور مدبر صاحب کی ذات نہایت غنیمت ہے میں چاہتا ہوں کہ مسائل حاضرہ کی نسبت آپ کے خیالات سے مستفید ہوں۔

مفتی : میں آپ کے حسن ظن کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ لیکن میں افسوس کے ساتھ یہ ظاہر کرنے پر مجبور ہوں کہ مسائل حاضرہ پر میں اپنے خیالات آپ کے سامنے نہیں پیش کر سکتا۔ کیونکہ یہ میری قوم کے متفقہ فیصلہ کے خلاف ہے۔ لیکن اگر میرا کچھ نہ کچھ کہنا ضروری ہی ہو تو میں بس دو بات

عرض کیے دیتا ہوں کہ "مصر بغیر کامل آزادی حاصل کئے ہوئے کسی طرح چین سے نہ بیٹھے گا"

لارڈ: تعجب ہے کہ آپ جیسے سنجیدہ حضرات بھی مصر کے اس مطالبہ کی حمایت کرتے ہیں۔ حالانکہ ہماری علیحدگی مصر کے لئے سخت نقصان رساں ہو گی۔ کیونکہ اس میں ابھی خود مختار ہونے کی صلاحیت نہیں ہے۔

مفتی: لیکن ابھی آپ فرما چکے ہیں کہ مصر نے بہت کچھ ترقی کر لی ہے جس کی موجودگی میں مصریوں کا مطالبہ آزادی بالکل حق بجانب ہے آپ ہمارے نقصان کی فکر میں نہ گھلیئے۔ ہم خود اپنے نفع و نقصان کو اچھی طرح سمجھتے ہیں۔ خدا نے آپ کو تمام دنیا کا ٹھیکہ دار نہیں بنایا ہے کہ "پست اقوام" کی ترقی کی ذمہ داری آپ کے سر ہو اور اگر بنایا ہے تو براہ مہربانی وہ ٹھیکہ نامہ دکھا دیجئے جس کے بعد ہم بخوشی آپ کی غلامی ہی میں رہیں گے۔ آپ مصر میں ۰ ہم سال سے "تمدن و تہذیب" پھیلا رہے ہیں مگر اب تک آپ یہی کہتے ہیں کہ مصر میں حکومت خود اختیاری کی صلاحیت نہیں پیدا ہوئی ہے اسی طرح ہندوستان کے متعلق دعویٰ ہے جہاں ڈیڑھ صدی سے اس "الٰہی مشن" کو پورا کر رہے ہیں۔ پھر بتائیے کہ پست اقوام آپ کی زیر نگرانی کتنی مدت رہیں کہ ان میں یہ صلاحیت پیدا ہو جائے۔

لارڈ: جناب اس قدر تنگ نظری سے کام نہ لیجیے۔ مصر میں ہماری موجودگی سے آپ کو یہ فائدے ہونگے کہ ...

مفتی: میں آپ سے دریافت کرتا ہوں، کہ اگر یہی فائدے آپ کو جرمنی سے حاصل ہوں تو کیا اس کی ماتحتی کو آپ کی قوم قبول کر لے گی؟

لارڈ: نہیں ہم اسے ہرگز قبول نہیں کر سکتے!

مفتی: پھر اُسے ہمارے لئے کیوں پسند کرتے ہیں؟

لارڈ: مصر اور انگلستان میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ انگلستان قرنہا قرن سے آزاد ہے اور مصر غلام، بھلا دونوں میں مساوات کیونکر قائم ہو سکتی ہے؟

مفتی: اگر یہ صحیح بھی ہو کہ مصر ہمیشہ سے غلام ہے تو اس سے یہ کب لازم آتا ہے کہ وہ آئندہ بھی رہے اور پھر آپ ہی کی غلامی میں رہے؟ یاد رکھیے کہ ہم اس وقت تک نہ خود چین لیں گے اور نہ آپ کو چین لینے دیں گے جب تک آزاد نہ ہو جائیں! یہ میرے آخری الفاظ ہیں۔ آگے میں کچھ نہ کہوں گا!"

مجبوراً لارڈ ملنر کو انتہائی مایوسی و حسرت سے رخصت ہونا پڑا۔ اس کے بعد انہوں نے شہر کو چھوڑ کر دیہاتوں کا رخ کیا کہ شائد وہاں کی جاہل آبادی اُن سے تبادلہ خیالات کرے۔ مگر وہاں کی یہی حالت تھی۔ ہر کاشتکار ان سے اسی طرح گریز کرتا تھا جس طرح تندرست خارشت والے سے گریز کرتا ہے۔ اس سلسلہ میں ایک یہ دلچسپ حکایت مصری اخبارات میں نظر سے گذری ہے کہ ایک دن لارڈ ملنر مضافات "جیزہ" میں دریا کے کنارے چہل قدمی کرتے ہوئے ایک کھیت تک پہنچے جس میں ایک کاشتکار ہل چلا رہا تھا۔ ملنر صاحب نے بڑی خندہ پیشانی سے دریافت کیا کہ "تمہاری کاشت میں کتنی زمین ہے" اُس نے جواب دیا کہ "زغلول پاشا سے پوچھو" پھر انہوں نے سوال کیا "تمہارے کتنے بچے ہیں؟" جس کا جواب بھی اُس نے یہی دیا "زغلول پاشا سے پوچھو"

اس مایوس کن حالت کو دیکھ کر آخر یہ شاطر سیاست مجبور ہوا کہ اپنی تماشاگاہ کو بند کر کے واپس جائے۔ چنانچہ وہ نہایت شرمندگی و ناکامی کے ساتھ انگلستان پہنچے اور اپنے معلم اول حضرت کرزن سے ساری داستان بیان کر دی۔ انہوں نے پھر اُن کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرا اور اپنی زنبیل سے کچھ اور اوزار نکال کر دیئے کہ ان سے کام لو، کامیابی ہوگی۔ چنانچہ اب کی مرتبہ انہوں نے مصری قوم پر نہیں بلکہ مصری وفد اور اس کے صدر سعد پاشا زغلول پر منتر پڑھ پڑھ کر دم کرنا شروع کیے اور اس کو بہت سے سبز باغ دکھائے۔ مگر جمال الدین افغانی کے اس شاگرد پر اس کا کیا اثر پڑ سکتا تھا، جبکہ اس کے استاد نے گلاڈسٹون جیسے شخص کے دام سیاست میں پھنسنے سے انکار کر دیا تھا۔ سعد پاشا نے صاف جواب دے دیا کہ جب تک برطانیہ اپنے "حمایۃ مصر" پر زور دے گا اس وقت تک ملنر کمیشن سے کسی قسم کی گفت و شنید نہیں کی جائے گی اور نہ مصر کا ایجی ٹیشن ختم ہوگا۔ آخر کئی ماہ تک سخت رد و قدح کے بعد ملنر صاحب نے اُسے منظور کر لیا اور سعد پاشا مع اپنے رفقا کے لنڈن پہنچے جہاں دونوں میں کئی ہفتہ تک اس طرح گفتگو ہوتی رہی جس طرح دو آزاد قوموں کے نمایندوں میں ہوتی ہے اور بالآخر لارڈ ملنر نے چند اصول پیش کیے کہ جن پر برطانیہ مصر سے معاہدہ کر سکتا ہے۔ وہ اصول حسب ذیل ہیں:۔

(۱) برطانیہ مصر کی خود مختاری تسلیم کرے گا اور مصر کی ہر بیرونی حملہ سے حفاظت کا ذمہ دار ہوگا۔

(۲) مصر میں برطانیہ کی پوزیشن ممتاز رہے گی۔

(۳) حالت جنگ میں مصر برطانیہ کو اپنے یہاں فوجیں اُتارنے میں ہر قسم کی مدد دے گا۔

(۴) ان ممالک خارجیہ میں مصری سفراء ہیں گے جہاں مصر کا تجارتی کاروبار ہے اور باقی ممالک میں برطانوی سفرا اور ایجنٹ مصری مصالح کے ذمہ دار ہوں گے۔

(۵) مصر اپنے خارجی معاملات و تعلقات میں آزاد ہوگا لیکن اسے برطانوی پالیسی کے خلاف معاہدہ کرنے کا حق نہ ہوگا۔

(۶) نہر سویز کی حفاظت کے لیے ایک برطانوی فوج رہے گی جس کا مقام غالباً "قنارہ" میں ہوگا۔

(۷) اجنبی امتیازات منسوخ ہو جائیں گے اور انگریزی ہائی کمشنر کو اُن قوانین اور ان کے عملدر آمد کی نگرانی اور ان کے منسوخ کردینے کا حق ہوگا، جن کا تعلق غیر مصری باشندوں سے ہے۔

(۸) جتنے انگریزی مشیروں کے عہدے اس وقت ہیں وہ اٹھا دیے جائیں گے۔ البتہ ایک انگریزی اعلیٰ افسر قرضہ کے محکمہ میں رہے گا اور دوسرا اُن قوانین کی نگرانی کرے گا جن کا تعلق اجنبی باشندوں سے ہے۔ مصری حکومت اگر چاہے گی تو اسے ان دونوں افسروں سے مشورہ لینے کا حق ہوگا۔

(۹) مصر میں اس وقت جتنے انگریزی ملازم اور عہدیدار ہیں ان میں سے جنہیں مصری گورنمنٹ علیٰحدہ کرے گی یا جو خود جدید نظام حکومت کے ماتحت رہنا پسند کریں گے اُنہیں فراخدلی سے معاوضہ دے کر رخصت کیا جائے گا۔"

یہ وہ بنیادی اصول ہیں جن کے متعلق اول مصری وفد اپنے ملک کی عام رائے معلوم کرے گا جس کی اکثریت نے اگر انہیں پسند کر لیا تو برطانوی و مصری پارلیمنٹوں کی منظوری کے بعد ایک مفصل معاہدہ لکھا جائے گا جس کی رو سے مصر ایک خود مختار سلطنت اور برطانیہ کا حلیف ہو جائے گا۔ مصر کی آخری خبروں سے معلوم ہوتا ہے کہ مصری وفد آج کل پبلک نمائندوں سے تبادلۂ خیال کر رہا ہے اور غالباً ہفتہ عشرہ میں انگلستان واپس جائے گا۔ 'پائنیر' کے مصری نامہ نگار کی چٹھیوں اور مصر کے نیم سرکاری اخبار 'المقطم' سے بھی یہ معلوم ہوا ہے کہ مصری وفد اور ملک کی اکثریت ان اصول کو پسند کر رہی ہے۔ لیکن شاہی خاندان کے اکثر ممبر اور مصری کانگرس انہیں مسترد کرتی ہے۔ ہم نہیں کہہ سکتے کہ یہ واقعہ کیا ہے لیکن اتنا تو مذکورہ بالا اصولوں پر ہی نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جس معاہدے کے وہ بنیادی اصول ہوں گے ان کی رو سے مصر کامل طور پر خود مختار نہ ہوگا، بلکہ اپنے اندرونی اور بیرونی معاملات میں نیم خود مختار۔ کیونکہ کسی آزاد ملک میں دوسری سلطنت کے ہائی کمشنر اور فوج کے رہنے کے کوئی معنی نہیں ہیں اگرچہ وہ محدود رقبہ ہی میں کیوں نہ ہو۔

اسی طرح کوئی خود مختار سلطنت اپنے بیرونی تعلقات میں کسی دوسری سلطنت کی پالیسی کے تابع ہونا ہرگز قبول کرے گی۔ لیکن اگر مصری وفد اور ملک کی عام رائے ان اصولوں کو پسند کرتی ہے تو یہ شاید اس وجہ سے کہ مصر بہ نسبت سابق کے بہت بہتر حالت میں ہو جائے گا، کیونکہ اسے اپنے اندرونی انتظام میں کامل آزادی ہوگی، اس کا روپیہ ملک سے باہر نہ جائے گا، اس کی تعلیم اس کے ہاتھ میں ہوگی اور اسے اپنے ابنائے ملک پر کامل اختیارات حاصل ہوں گے۔ البتہ اجنبی باشندوں کے قوانین اور ان کے عمل درآمد کی نگرانی برطانوی افسر کرے گا اور قرضے کے محکمہ میں ایک برطانوی اعلیٰ عہدہ دار ہوگا۔ مصری اسے بھی انگیز کر سکتے ہیں کیونکہ پیشتر جو حالت تھی اس سے یہ غنیمت ہے۔ رہا نہر سویز پر برطانیہ کا جنگی قبضہ تو یہ بھی تمام ملک پر موجودہ قبضہ سے بہر حال بہتر ہے۔ البتہ جو امر بہت زیادہ قابل غور ہے اور جس کی طرف ماسبق اصولوں میں کوئی اشارہ نہیں ہے، وہ مصری فوج کا معاملہ ہے۔ مصری فوج سابق معاہدوں کی رو سے ۱۸ ہزار سے زائد نہ ہونا چاہیے جو ظاہر ہے کہ ملک کی مدافعت کے لئے قطعاً ناکافی ہے۔ اگر مصریوں کو اپنی فوج کے حسب منشا رکھنے اور تیار کرنے کا حق ہو تو پھر وہ ان اصولوں پر برطانیہ سے بخوشی معاہدہ کر سکتے ہیں۔ ورنہ وہ ہر لحظہ اس کے رحم پر ہوں گے۔ اس سے بھی بڑھ کر اہم ملک سوڈان کا معاملہ ہے جس سے گذر کر دریائے نیل مصر پہنچتا ہے جو درحقیقت مصر کی زندگی ہے۔ کیونکہ ملک میں بارش مطلق نہیں ہوتی اور زراعت کا دار و مدار نیل کی پوری طغیانی پر ہے۔ سوڈان کی موجودہ حیثیت یہ ہے کہ وہ برطانیہ اور مصر کی ملک مشترک ہے۔ لیکن مصریوں کو اس کے معاملات میں کوئی دخل نہیں ہے۔

یہ اور اس کے علاوہ اور بہت سی غور طلب باتیں تھیں۔ مگر مضمون اس قدر طویل ہو گیا ہے کہ اس میں ان پر بحث نہیں ہو سکتی۔ علاوہ ازیں یہ بحث قبل از وقت بھی ہے کیونکہ مصری اور برطانوی پارلیمنٹوں نے ان اصولوں پر غور نہیں کیا ہے اور نہ وہ آخری معاہدہ مرتب ہوا ہے جس کی رو سے مصر کی قسمت کا آخری فیصلہ ہوگا۔ اس لئے اس کا انتظار کرنا چاہیے جب کہ بعد انشاء اللہ تعالیٰ اس موضوع پر مفصل بحث ہوگی۔ ہم نہیں کہہ سکتے کہ مصر کو اپنی اس جد و جہد میں کامیابی ہوگی یا ناکامی، مگر اتنا ضرور کہیں گے:

شکست و فتح نصیبوں سے ہے ولے اے میر
مقابلہ تو دل ناتواں نے خوب کیا

ع۔ن

(زمانہ، جولائی تا اکتوبر ۱۹۲۰ء)

ابوالخیر مودودی

مصر انگریزی احتلال سے پہلے

(آغاز کلام)

کوئی شک نہیں کہ مصر میں انگریزوں کی مداخلت بعض حیثیات سے مفید ثابت ہوئی لیکن ان فوائد کے مقابلہ میں اسے بہت کچھ نقصان بھی اٹھانا پڑا۔ انگریزوں نے اسے جو کچھ دیا اس سے زیادہ لے لیا۔ بقول مسٹر بلنٹ کے انگریزوں کی وہ نوازشہائے بیجا ان بہت زیادہ ہیں جن سے مظلوم مصر سرگراں ہے اور برطانوی نشتر کی ان جنبشوں کی کوئی انتہا نہیں جن سے غریب مصر کا جسم خون ہو رہا ہے۔

۸۲ء سے پہلے مصر ایک علانیہ آزاد اور خود مختار تھا۔ اگرچہ وہاں مزدوروں اور کارخانہ داروں کی حکومت نہ تھی اشتراکین کو غلبہ نہ تھا اور نہ حریت و آزادی کی خوشنما صورت اور ذمہ داری و خود مختاری کی نظر فریب لباس میں استبداد اور شخصیت کی فرمانفرمائی تھی۔

بلاشبہ وہ ایک صوبہ کی حیثیت رکھتا تھا اور دولت علیا کو اس پر کامل اقتدار تھا۔ لیکن جب انگریزوں نے قدم جمائے اور اپنی اجارہ دارانہ حکومت کا سنگ بنیاد رکھا تو بظاہر اس کی سابقہ حیثیت بھی علی حالہٖ قائم تھی۔ کیوں کہ انگریزوں نے ادائے خراج کے ساتھ اور بھی معاہدے کیے تھے جو تاریخ میں ہمیشہ محفوظ رہیں گے:

۱۔ مصر ہر حال میں زمانۂ جنگ میں دولت علیا کی مدد پر مجبور تھا۔

۲۔ ملکی انتظامات، خارجی مسائل، عہدہ داروں کے عزل و نصب کے لئے منشائے سلطان لازمی تھا۔

۳۔ قاضی و مفتی کے تقرر کا اختیار صرف آستانۂ خلافت کو تھا۔

۵۔ تمام کاغذات اور سرکاری مراسلات میں دولت علیا کا نشان حکومت ثبت

ہونا ضروری تھا۔

لیکن کیا ان معاہدوں کی پابندی بھی کی گئی؟ اس کا جواب الفاظ نہیں واقعات دیں گے۔ اس سے زیادہ ایک اور ضروری اور اہم سوال ہے کہ انگریزوں نے جس غرض سے مصر میں احتلال کیا تھا اس میں کہاں تک کامیاب ہوئے اور تہذیب و شائستگی کے فرائض کس حد تک انجام دیے۔

کہا جاتا ہے کہ انگریزوں سے پہلے مصر میں بدعملی و طوائف الملوکی تھی۔ لیکن واقعات شاہد ہیں کہ انگریزوں کی تاجرانہ اصلاحات اور آزاد طرزِ حکومت سے اس کی بے اصولی و بدنظمی ہزار درجہ بہتر و مستحسن تھی۔ رزنر نے سچ کہا ہے کہ ۸۲ء کے بعد کا مصر ایک قبرستان ہے جس میں اس کی شاہانہ عظمتیں اور حاکمانہ شوکتیں دفن ہیں۔ ۸۲ء کے بعد کا مصر ہندوستان سے زیادہ تر بدتر ہے۔ آزادی کے دعویداروں نے اس کے حقوقِ بشریت غصب کر لیے ہیں۔ انصاف کے علم برداروں نے اس کی خود مختاری سلب کر لی ہے۔ وہ ایک حلقۂ چشم ہے محروم بینائی، ایک جسم ہے جو اصلاحات کے خنجر کی جراحتوں سے خونچکاں ہے، ایک گلا ہے جسے غلامی کے طوق نے گھونٹ رکھا ہے، ایک ہاتھ ہے جو محکومی کی زنجیروں میں گرفتار ہے اور ایک زبان ہے جو عدل و انصاف کے چاقو سے نہایت دیانت سے کاٹ دی گئی ہے کہ حرفِ شکایت بھی بیان نہ ہو سکے۔

لیکن بابِ عالی نے ایسا کیوں ہونے دیا۔ اور جب معاہدات و شرائط اس قدر وزنی تھیں تو کس لئے اپنے حاکمانہ اختیارات سے غفلت کی؟ انگریزوں کے قبضۂ مصر کی خفیہ تاریخ شاہد عادل ہے کہ اختیارات کی یہ وسعت صرف لکھنے کے لئے تھی، عمل کے لئے نہیں۔ ذمہ دارانہ معاہدے قلم و صفحۂ کاغذ تک محدود تھے۔ کیونکہ انگریزوں نے جس مقصد سے مصر پر قبضہ کیا تھا وہ ان شاندار اظہاروں سے مختلف بالکل ایک دوسری چیز تھی جس کی پابندی انکی خواہشوں کے خون کے مرادف تھی۔ دولتِ علیہ نے بارہا اپنے اختیارات کام میں لانے چاہے مگر معاملات کی رفتار ایسی آپڑی تھی کہ وہ بالکل مجبور تھی اور انگریزوں کی ڈپلومیسی نے شش جہت سے ایسا فشار دیا تھا کہ خاموشی کے سوا چارہ نہ تھا۔

نپولین کا حملہ

انگریزوں کے قبضۂ مصر کی تاریخ نپولین کے حملہ سے شروع ہوتی ہے۔ اس لئے سب سے پہلے اس کتاب احتلال کے دیباچہ پر ایک نظر ڈالنی چاہیئے۔

جس زمانہ میں فرانسیسی فوجوں نے مصر پر حملہ کیا باب عالی اندرونی مناقشوں اور بیرونی سازشوں کے باعث کمزور ہو رہی تھی۔ وزرا کو رشوتیں دی جا رہی تھیں کہ باغی ہو جائیں اور اپنی قوم سے غداری کر دیں۔ حاکموں کو اکسایا جاتا تھا کہ سرکشی کریں اور خودمختار بن جائیں۔ عاملوں کو ظلم و ستم اور رشوت ستانی کی تلقین کی جاتی تھی کہ رعایا شورشیں کرے۔ دوسری طرف دول کے مطامع دن بدن خطرناک اور اس کے جراثیم مکائد کا نفوذ روز بروز بڑھتا جاتا تھا۔ یہودی و عیسائی مسلمانوں کی عورتیں میں ظاہر ہو رہے تھے۔ حرم سراؤں میں یورپین عورتیں پہونچ گئی تھیں اور وہ خائن اور غدار حکام و عمال جنکے پاؤں طمع کی زنجیروں میں گرفتار تھے، اور جن کے گلوں میں الفت زر کے طلائی طوق پڑے تھے نگرانی کے خوف اور احتساب کے ڈر سے آزاد تھے۔ دشمنان ملت اسلامیہ ان کے پشتیبان تھے۔ دوست نما دشمنوں اور انسان نما بھیڑیوں نے انہیں اپنے مقاصد و مطامع کا آلۂ عمل بنا رکھا تھا اور یہ دول اقتضائے انسانیت اور فطری استقلال خواہی و انتظام پسندی کے شریف جذبہ سے مجبور تھے کہ ایسے اضلاع اور صوبوں کو اپنے زیر اثر لائیں اور نشر اصلاح و تہذیب کے لئے مجبوراً انکا انتداب قبول کرلیں!

ان مقدس معاملات میں انگریزوں کے مطامع کا آشیانہ ہمیشہ سے بلند اور دول میں سب سے بالاتر رہا ہے۔ وہ دوست بن کر ظاہر ہوئے مگر دشمنوں سے زیادہ خون کے پیاسے رہے۔ انہوں نے اصلاح و انتظام اور حریت و استقلال کے پرزور مرافعے کئے۔ علوم و معارف اور انصاف و انسانیت کے اعلیٰ اصولوں پر وعظ کہا۔ لیکن قومیت و وطنیت کے جذبات کو بزور شمشیر دبا دیا۔ تعلیم کے بجائے فوجی مقاصد پر روپیہ صرف کیا۔ حریت پرستان مراکش نے صدائے استقلال بلند کی تو انگریزوں نے ان کی سرکوبی کے لئے اپنی جبل الطارق کی فوجوں کو طنجہ میں اتار دیا، حالانکہ فرانس اپنی پوری قوت سے ان کو پامال کر رہا تھا۔ سلطان استنبول نے جبل الدروز

کے قبضہ کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی تو انگلستان نے اپنی فوجوں سے ان کے دلولۂ وطن پرستی کو دبا دیا، ویسٹ یارک شائر سے فوجیں بھیج دیں۔ ہندوستان میں حقوق بشریت کا مطالبہ کیا گیا تو ہزاروں آدمی قید کر دیے گئے۔ سیکڑوں کو پھانسی دی گئی اور ہزاروں بعبور دریائے شور بھیجدیے گئے۔ زیادہ سرفروشی کی گئی تو ظالمانہ قوانین اور احکام عسکری کا سے جذبات انصاف و انسانیت روندے گئے۔ مشین گنوں سے گولہ باری اور ہوائی جہازوں سے بمباری کی گئی۔ مصر میں مرحوم مصطفٰے کامل نے صدائے حریت بلند کی تو ڈھائی ہزار سے بڑھا کر فوج کی تعداد چھ ہزار کر دی گئی اور طے کیا گیا کہ مالٹا کے بجائے اسکندریہ کو فوجی مرکز بنایا جائے۔

مصر کو انگریز مدت سے للچائی نظروں سے دیکھ رہے تھے کہ وہ عرب و ہندوستان کا دروازہ اور جسم اسلامی کا قلب تھا۔ نپولین نے فوج کشی کی کہ مصر پر قبضہ کر کے اپنی انتہائی قوت سے ہندوستان پر حملہ کر دے گا۔ انگریز بھی غافل نہ تھے۔ وہ دیکھ رہے تھے کہ فرانس ان کے مقبوضات پر حملہ کرنا چاہتا ہے اور ان کی بادشاہی کے تاج کو پامال کرنے کی فکر میں ہے لیکن انہیں مسرت تھی کہ جس زریں وقت کا انہیں انتظار تھا وہ آ گیا۔

فرانس کے پاس صرف ایک نپولین تھا۔ لیکن اگر دس نپولین بھی ہوتے تو انگریزوں کے داؤ و سیاست اور ڈپلومیسی سے شکست کھاتے اور ان کی زندگیاں سینٹ ہلینا کے زنداں و حصار میں بسر ہوتیں۔

یاد رہے کہ مصر پر نپولین کے حملہ کا زمانہ ٹھیک وہی زمانہ تھا جب ہندوستان میں یورپ کی یہ دونوں قومیں باہم دست و گریبان تھیں اور ہر ایک کی یہی خواہش تھی کہ کسی صورت ہندوستان کی مالک و مختار ہو جائے۔ بالآخر انگریزوں کی فتح ہوئی۔ فرانسیسی شکست کھا کر بھاگے۔

نپولین قبضۂ مصر کے شاندار تخیل کو لئے آگے بڑھا۔ انگریزوں نے اس کی عزم و ہمت کی تعریف کی۔ فرانسیسی فوجیں مصر پر حملہ آور ہوئیں ممالیک نے اپنی طاقت سے زیادہ ان کا مقابلہ کیا۔ مگر نپولین کی یلغار کے آگے نہ ٹھیر سکے۔ قدم اکھڑ گئے۔ نپولین نے انہیں گرفتار کیا اور مصر فرانسیسی مقبوضات میں شامل ہو گیا۔

باب عالی کی مدافعت

حملہ سے پہلے باب عالی فرانس کی طیاریوں اور دول کی پُر راز دوستی سے ناواقف تھی لیکن جب دوست نما دشمنوں کی عیاریاں معلوم ہوئیں اور ہمدردانہ تعلقات کی غرابت آفریں حقیقت کا پتہ چلا تو اس نے نہایت عجلت سے ایک فوج مرتب کی جس نے نپولین کے قبضہ سے مصر کو آزاد کرایا۔

محمد علی

اس فوج کا سپہ سالار ایک معمولی سپاہی زادہ تھا جو مقدونیہ کے شہر قولہ میں پیدا ہوا اور اپنی شجاعت و فراست اور ذہانت و چالاکی سے فوج کا سپہ سالار ہوا اور پھر مصر کے تخت حکومت کا مالک ہو گیا۔

وہ ابتدا سے شغل نظامی کو پسند کرتا تھا۔ اس کے اعضاء قوی فوجی ترتیب کے لئے موزوں اور مناسب تھے لیکن قابلیت اور حسن انتظام سے معلوم ہوتا تھا کہ اس کا دماغ صرف وحشی فوجیوں کی طرح خون ریز اور سفاک ہی نہیں بلکہ مصلحوں کی طرح اصلاح فرما مجددوں کی طرح تجدید بخش اور اخلاق و عواطف شاہانہ سے بھی متصف ہے۔

وہ فوج میں معمولی سپاہیوں کی طرح بھرتی ہوا تھا لیکن صرف اپنی ہی شجاعت و فراست کے بوتے پر اعلیٰ افسروں کے درجہ تک ترقی کی۔ جب مصر پر حملہ کے لئے فوج مرتب ہو رہی تھی وہ البانی فوج کا یوزباشی تھا۔ لیکن حملہ کے وقت قیادت و سپہ سالاری کی تلوار اسی کے ہاتھ میں تھی۔ نپولین کے جرار لشکر کے مقابلہ میں اس نے اپنی تلوار کے جوہر دکھائے اور اس میدان کارزار میں اس نے شجاعت و بسالت دلیری و بہادری اور سپاہیانہ سرفروشی و جانبازی کا بوجیر العقول نمونہ پیش کیا تمام ہمراہی فوجیں اور فوجوں کے افسر انگشت بدنداں تھے۔ نپولین اپنی ہزیمت پر سوگوار تھا اور تمام اہل مصر محمد علی کی قابلیت کے معترف و مداح تھے۔

محمد علی مصر کے تخت حکومت پر

فرانسیسی فوجیں شکست کھا کر بھاگیں تو محمد علی کے سامنے معراج و ترقی کا ایک

وسیع میدان تھا۔ اس نے کہا خدا نے شکر نعمت کا زریں موقع دیا ہے۔ اس کی قدر کی تو فیروزمندی اور قابلیتوں کا عملی شکریہ ہوگا ورنہ غفلت کا نام کفران نعمت ہے۔

اس کے لئے میدان بالکل صاف تھا۔ فوج کے دوسرے افسروں میں کوئی نہ تھا کہ مانع و مزاحم ہوتا اور اپنی حکومت کے قیام و تاسیس کے لئے جنگ کرتا۔

اس نے سوچا اگر باب عالی نے کوئی نااہل حاکم مقرر کیا تو اس تہذیب قدیم کے گہوارہ اور دنیا کے ابتدائی عمران و تمدن کے آخری تاریخی شہر اور اسلامی فتوحات اور شان و شوکت کے مقر کی حالت اور تباہ ہو جائے گی۔ اس کے مقاصد اور طریق عمل نہ جانے کیسے ہوں اور سب سے زیادہ اغیار کی جادوگری سے مسحور نہ ہو۔ اس خیال سے اس نے ۱۸۰۵ء میں اپنی حکومت کا اعلان کر دیا۔

دولت علیا اس کے عزائم سے بالکل ناواقف تھی۔ اگرچہ اسے اس قدر ضرور علم تھا کہ محمد علی کی فطرت عام فطرتوں سے بلند تر ہے کیوں کہ وہ بدایت عمر سے بہت ہی جفاکش، فرض شناس، اسلام پرست اور ملک و ملت کا غمخوار تھا۔ وہ خود غرض حاکموں کی طبیعت نہیں رکھتا تھا جو ملک و قوم کی اصلاح و ترقی کی طرف سے غافل اور روز و شب عیش و نشاط کی بزموں میں منہمک رہتے ہیں۔ جوہر شناس نظریں پہلے ہی جانچ چکی تھیں اور عارفان سیاست نے پیشین گوئی کر دی تھی کہ شغل نظامی کا یہ دلدادہ نوجوان کسی دن حکومت و فرماں فرمائی کے تخت سلطنت کا مالک ہوگا۔

محمد علی کے اعلان حکومت پر دولت علیا چاہتی تو ایک دوسری فوج بھیجکر بغاوت و سرکشی کی سزا دے سکتی تھی لیکن وہ جانتی تھی کہ ایسا کرنا دونوں کے لئے مضر اور خطرناک ہوگا۔ کیا مضائقہ اگر مصر کی حکومت ایک مسلمان اور ملت اسلامیہ کے غمخوار فرزند کے پاس چلی جائے۔ اس نے چشم پوشی کی اور اپنی انتہائی رواداری و ہوشمندی کا ثبوت دیا اور محمد علی کو ایک با اختیار صوبہ دار ظاہر کرتے ہوئے فرمان سلطانی سے اسکی حوصلہ افزائی کی

ترقی کا آغاز

مصر کی تاریخ کا یہ وہ زمانہ تھا جب ہر طرف فلاکت و تباہی کے بادل ساون

کی گھٹاؤں کی طرح منڈلا رہے تھے۔ راہزنوں اور لیٹروں سے شرفا تنگ آ گئے تھے خود غرض حاکموں اور ظالم عاملوں کے دست حرص دراز سے دم ضیق میں تھا اور بیرونی آفات و بلیات بھی اپنے مطامع سیاسیہ کے لئے روز نئے شگوفے کھلاتی تھیں۔

محمد علی نے سب سے پہلے ظالم اور جفا پیشہ حاکموں کی گوشمالی کی۔ ہوسناک عاملوں کی مفسد اور لالچی عادتوں کا علاج کیا۔ ملک کی فلاح و بہبود کے وسائل پر عمیقانہ نظر ڈالی۔ ذرائع آمدنی کی اصلاح کی۔ مالی حالت کو درست کیا۔ لیٹروں اور قزاقوں کی سرکوبی کو اضلاع و قصبات کے گوشہ گوشہ میں فوجیں بھیجیں۔ راستوں کا انتظام کیا۔ سڑکوں پر پولیس کے پہرے مقرر کیے اور برسوں کا کام ہفتوں اور مہینوں کا کام دنوں میں اس طرح کر دیا کہ یورپ کے مدعیان تہذیب و شائستگی اور خواہشمندان سلطنت و فرمان فرمائی بھی انگشت بدنداں رہ گئے اور ان کی کوئی فتنہ پردازی کارگر نہ ہو سکی۔

وہابیوں سے لڑائی اور مصری حکومت کی وسعت

۱۸۱۱ء میں محمد علی کو حضرت خلیفۃ المسلمین کے حکم کی تعمیل میں وہابیوں سے لڑنا پڑا۔ جس کا سلسلہ پانچ سال تک جاری رہا۔ جنگ کی طوالت اور وہابیوں کی فتنہ انگیزیوں سے تنگ آ کر محمد علی نے ایک آخری اور فیصلہ کن جنگ کا حکم دیا اور اعلان کر دیا کہ وہابی جب تک اپنی حرکات شنیعہ و سیئہ اور بغاوت و سرکشی سے باز آ کر مطیع و منقاد نہ ہو جائیں جنگ جاری رکھی جائے۔ اس اعلان سے وہابیوں کی سرکش و باغی ہمتیں پست ہو گئیں۔ انہوں نے شکست کھا کر اطاعت کا حلف لیا اور ملک میں امن و امان قائم ہو گیا۔

اس سے نجات ملی تو قرب و جوار کے علاقوں اور مفسد قبائل کے انتظام و اہتمام کی غرض سے ڈنگولہ، بربر، سنار، کردوفان، دارفور وغیرہ کی طرف فوج کشی کی اور مصری حکومت کا نشان و علم ان ممالک کی فضاؤں میں بھی لہرانے لگا جو گزشتہ حکومت کے حدود سلطنت کی اس آخری وسعت سے بھی زیادہ تھا جہاں ہنوسام کے نقش قدم پائے جاتے ہیں۔ بالفاظ دیگر سوڈان میں عرض شمالی کے چوتھے درجہ تک اس کی حکومت وسیع تھی جس کی مسافت اس مسافت کے بالکل متوازی ہے جتنی مصر

اور پٹیرو گرا ئم کے درمیان ہے

اکتشافات علمیہ

اسی سلسلہ میں یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ ان تمام فتوحات اور فوج کشیوں کا مقصد صرف توسیع حکومت اور تسخیر ممالک و امصار ہی نہ تھا بلکہ اس سے بالاتر ایک اور مقصد بھی تھا جسے دنیا اکتشافات کے نام سے یاد کرتی ہے۔ یہ وہ مقصد تھا جسے ہماری آنکھیں یوروپین فوج کے افسروں کی "علم پرست خدمات" کے صفحات میں دیکھتی ہیں۔ مگر ادعائے فضل و یکتائی کے مقابلہ میں ایک دھندلا سا نقش بھی نہیں پاتیں۔

اس حقیقت کو سب سے پہلے محمد علی کی فوج نے روشن و بے نقاب کیا کہ نیل کا منبع اصلی بحرابیض ہے حالانکہ اس سے پہلے مشہور تھا کہ دریائے نیل کی موجوں اور روانیوں کی اصلی نہر عطیرہ کی لہریں ہیں۔

جنگ یونان اور محمد علی کی وفاداری

قریب قریب اسی زمانہ میں یونان اور باب عالی کے درمیان معرکۂ کارزار گرم ہوا۔ محمد علی نے آٹھ ہزار سپاہی مع سامان حرب اپنے آقا کی مدد کے لئے بھیج دیے۔ فوج کا سپہ سالار اس کا بیٹا (ابراہیم) تھا جس نے جزیرہ موریا پر اپنی شجاعت و بہادری کا پرچم اڑا دیا جس سے یورپ اس کے فنون سپہ گری و معارف حرب کے علم و واقفیت کی خبریں سن کر متوحش و لرزہ براندام ہو گیا۔ جو سلطنتیں اسلام کی ترقی سے خائف رہتی تھیں اس کی بیخ کنی کی تدابیر سوچنے لگیں۔ جوع الارض کے مریضوں نے حکومت اسلامیہ مصریہ کے انتزاع و استیصال کی تیاریاں کیں۔ روس، فرانس اور برطانیہ کے جنگی بیڑے قومی حمایت کے نام سے متحرک ہو گئے، اور یونان کی عفو تقصیر کرائی۔ ورنہ ابراہیم اور ادہم کی فوجیں یونان کے پایۂ تخت سے کچھ دور نہ تھیں۔

باہمی کشیدگی

لیکن صیاد کمین گاہوں میں بیٹھے تھے۔ نااتفاقی کے جال بچھ رہے تھے۔ طرفین میں کچھ غلط فہمیاں ہو گئیں اور اغیار کو نشتر زنی اور نمک پاشی کا موقعہ ملا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ تعلقات کا گل تو

گھلا گیا اور باہم بہت ہی ناگوار کشیدگی ہو گئی۔

کشیدگی کی وجہ یہ بتلائی جاتی ہے کہ محمد علی نے اپنی خدمات اور وفاداریوں کے صلہ میں آستانہ سے درخواست کی کہ وہ مصری تاجروں کی آمد و رفت کے لئے (جو براہ شام بغداد جاتے ہیں) یا پروانۂ راہداری دیدے کہ وہ آسانی سے اپنا مال تجارت لا سکیں، یا ایک اعلان شائع کردے کہ شام کی چنگی کے افسران کی مزاحمت نہ کریں۔ باب عالی منظور کر دینے کو تیار تھی مگر والی عکہ نے مخالفت کی۔ محمد علی کو مخالفت کا علم ہوا تو اس نے جنوبی شام کی حکومت طلب کی۔ باب عالی مبہم سادعدہ کر کے خاموش ہو گئی۔ محمد علی نے دو سال تک ایفا کا انتظار کیا اور آخر مجبور ہو کر ۱۸۳۱ء میں ابراہیم کے ماتحت شام کی طرف فوجیں بھیجدیں اور ساتھ ہی ایک عریضہ ارسال کیا جس میں اپنی مایوسی اور مصری تاجروں کی مشکلات ظاہر کرتے ہوئے حملہ کی وجہ لکھی اور عہد واثق کیا کہ اگر آستانہ نے اس کی درخواست منظور کر لی تو وہ اپنی فوجیں واپس بلائے گا اور اس تاوان کا روپیہ بھی ادا کر دے گا جو دول یورپ نے جنگ کریمیا میں دولت علیہ پر مقرر کیا تھا[1]۔ لیکن باب عالی والی عکہ کی فریب کاریوں اور بحرآفرینیوں سے مسحور تھی۔ اس عریضہ کو بھی ردی کی ٹوکری میں ڈال دیا۔ دشمن پہلے ہی موقعہ کے منتظر تھے۔ ساعت منتظرہ آئی تو اپنی کمین گاہوں سے نکلے باب عالی کو جنگ پر آمادہ کیا اور ابراہیم کے مقابلہ کے لئے فوجیں بھجوا دیں۔ حالانکہ محمد علی اور باب عالی مصالحت کے لئے تیار تھے۔

ابراہیم معمولی آدمی نہ تھا۔ اس کی قابلیتوں نے بڑی بڑی سلطنتوں کے ہوش بگاڑ دیے تھے۔ سپہ سالار اس کے مقابلہ میں آتے جھجکتے تھے۔ یورپ اس کی ہیبت سے مضطر ہو رہا تھا اور اس کی شجاعت و بسالت ناقابل تسخیر! وہ بڑھا اور ترکی فوجوں کو اس سے مقابلہ میں پسپا ہونا پڑا۔ یہاں تک کہ مصری فوجیں قسطنطنیہ کے دروازوں تک بڑھی چلی گئیں۔ پے در پے ہزیمتوں اور علی الاتصال شکستوں اور مغلوبانہ کیفیتوں سے باب عالی

---

[1] تاوان کی رقم ۱۹۲ لاکھ ۵ ہزار تھی۔

ہوش میں آئی تو ایک جرار لشکر بھیجا کہ اگر ذرا بھی غفلت کی گئی تو عثمانیوں کی ہستی کا چراغ جو تند باد کفر سے محفوظ رہا ہے مبادا محمد علی کے ہاتھ اسے نہ بجھا دیں۔

باب عالی کی فوجوں نے ۲۴ جون ۱۸۳۹ء کو حلب کے صوبہ تربب پر ابراہیم کو شکست دے کر اپنے ملک سے نکال دیا اور مقامات مستحکم کر لیے۔ اس فتح کے بطل اعظم حافظ پاشا اور ان کے شریک کار یوزباشی مالٹکی[1] تھے۔

محمد علی اور یورپ

محمد علی کی فتوحات اور اس کی شوکتوں کو یورپ کس نظر سے دیکھتا تھا، اس کا جواب ٹرلیس (وزیر خارجہ فرانس) کے اس خط سے ملتا ہے جو اس نے جیٹرڈ (سفیر فرانس متعینہ لندن) کو لکھا تھا کہ محمد علی اپنی ایک حرکت سے لڑائی کی آگ بھڑکا سکتا ہے۔ اسکندریہ یا قطر مصری میں کوئی بدامنی پیدا کی گئی یا کوئی انقلاب انگیز ہیجان رونما ہوا تو محمد علی طارس کے سلسلہ کوہ کی بلندیوں سے ایسا سخت حملہ کرے گا کہ تمام یورپ کی زندگی معرض ہلاکت میں پڑ جائے گی"

لیکن محمد علی کی روزافزوں شان و شوکت فرانس سے زیادہ انگریزوں کے لیے خطرناک تھی کہ اس سے ان کی مشرقی مقبوضات کے نکل جانے کا اندیشہ تھا جن میں سب سے زیادہ ہندوستان کا مسئلہ تھا۔ انگریزوں نے آسٹریا کو بازی دے کر اپنے ساتھ ملا لیا اور ایک عظیم الشان جنگی بیڑا آراستہ کیا جس نے شام میں داخل ہو کر ابراہیم کو اعلان جنگ

---

[1] مالٹکی ۱۸۰۰ء میں برلن میں پیدا ہوا۔ اس کا باپ جرمنی فوج میں کپتان تھا۔ مالٹکی نے برلن کے مدرسہ حربیہ میں فوجی تعلیم پائی۔ ۲۲ء میں ملازم ہو گیا۔ دو سال میں کپتان کے عہدہ پر ممتاز ہوا۔ اسی زمانہ میں قسطنطنیہ کا سفر کیا۔ صدر اعظم خسرو پاشا سے ملاقات کی۔ انہوں نے ترکی فوجوں کے لئے اس کی خدمات حاصل کر لیں اور دردانیال کی حفاظت اس کے سپرد کی۔ ۳۹ء میں جنگ تربب کے بعد وہ اپنے وطن گیا۔ جرمنی فوجوں کی نظم و ترتیب اس کے سپرد کی گئی۔ ۱۸۷۰ء کی جنگ (جرمنی اور فرانس) میں وہ پیش پیش تھا۔ جرمنی فتح کے صلہ میں فیلڈ مارشل بنایا گیا۔

دیا۔ وہ ان عیارانہ تیاریوں سے بے خبر شام کے انتظام میں مشغول تھا۔ فوجیں انتظامی اغراض سے منتشر تھیں تاہم اس نے اسی وقت فوجوں کے جمع و انضباط کے احکام جاری کئے اور اعلان جنگ کا جواب بھی دے دیا۔ لیکن جو کچھ ہوا تھا انتہائی سراسیمگی و پراگندگی کی حالت میں ہوا تھا۔ اور انگریزوں نے اپنی متحدہ فوجی قوت کے علاوہ شام کی جاہل اور طماع قوموں کو بھی زریں وعدہ کر کے اور سونے چاندی کا مینہ برسا کر بغاوت اور اپنی امداد و اعانت پر آمادہ کر لیا تھا جس میں شام کے عیسائی پیش پیش تھے۔ اس لئے جنگ کا نتیجہ شکست تھا اور وہی ہوا یعنی اسے مجبور کیا گیا کہ وہ اپنی فوجیں شام سے ہٹائے کہ ہماری راہ منفعت میں سنگ راہ ہیں۔

اصلاح عسکری اور فوجی مدارس

شکست سے متاثر ہو کر محمد علی کو اصلاح عسکری کا خیال ہوا۔ اس نے فوج کو ترقی دی۔ جیوش و عساکر کا جدید اسلوب پر انتظام کیا۔ فرانس سے فنون جنگ کے ماہر بلائے جن میں جنرل سیف (جو بعد کو سلیمان کے نام سے مشہور ہوا) اپنی جنگی قابلیتوں اور خدمات کے لحاظ سے سب سے ممتاز تھا۔ مختلف حصص ملک میں مدارس قایم کیے جن میں معمولی اور ابتدائی تعلیم کے علاوہ اخلاقی تربیت بھی لازمی قرار دی گئی اور فنون جنگ کے علاوہ خاص طور سے طب اور جراحی کا درس بھی دیا جاتا تھا۔ توپ اور جہاز سازی کے کارخانے افتتاح کیے۔ فوجوں کی تعداد میں اضافہ کیا جو ۱۸۴۱ء میں دو لاکھ ۹۰ ہزار تھیں (اسی میں ۱۲ ہزار بحری فوج بھی شامل ہے)

جنگی بیڑہ بارہ جہازوں اور آٹھ کشتیوں سے عبارت تھا۔ جس میں چار چھوٹے اور آٹھ بڑے جہاز تھے۔ چھوٹے جہازوں میں سے ہر جہاز پر بائیس بائیس توپیں اور بڑے جہازوں پر ساٹھ ساٹھ توپیں بار ہو سکتی تھیں۔ کشتیوں کی توپوں کی بھی تعداد یہی تھی۔

یہ اعداد ۱۸۴۱ء کے ہیں جب کہ کارخانوں میں جہاز کشتیاں اور توپیں بڑی تعداد میں زیر تعمیر تھیں۔

ملکی اصلاحات

ان ضروری کاموں سے فارغ ہو کر بیرونی آفات و بلیات اور مفسدوں کی فتنہ انگیزیوں سے حفاظت وصیانت کے لئے لازمی سے محمد علی اصل کار کی طرف متوجہ ہوا۔ نظام سلطنت میں جو نقائص باقی رہ گئے تھے ان کی اصلاح کی جدید اصول سیاست و حکمرانی پر سلطنت کی تاسیس کی۔ عدالتوں کا انتظام درست کیا اور طرق واسالیب حدیثہ کی بنیادوں پر ممالک محروسہ کی ترتیب و تہذیب اور تنظیمات کی عمارت تعمیر کی۔ اصلاحات کی راہ میں اسے قدم قدم پر مالی دشواریوں سے دوچار ہونا پڑا مگر اس کا مقصد حقیقۃً اصلاح اور رعایا کی فلاح و خوشحالی تھا۔ وہ تاجر نہ تھا ورنہ اپنے مقاصد کی طول طویل فہرست شایع کر دیتا۔ بچوں کو خوش کرنے کو کمیشن مقرر کرتا اور اور امن وانصاف کے نام سے جس قدر ظلم وستم کر سکتا تھا کرتا اور غریب و مفلس رعایا سے ٹیکس وصول کرتا۔ لیکن وہ ملک و قوم کا سچا دردمند، ملت اسلامیہ کا حقیقی غمخوار اور نوع انسانی کا مخلص دوستدار تھا۔ وہ اپنی قوم کو سوا طبع کمال پر فائز اور اپنے ملک کو عرصۂ حیات میں کامیاب و فتح مند دیکھنا چاہتا تھا۔ اللہ نے اس کے ہاتھ میں زمام حکومت و بادشاہی دے دی تو وہ اٹھا اور جو کچھ چاہتا تھا جو باتیں اس کے دل میں تھیں پر زبان تک نہیں آتی تھیں، جنہیں وہ مدتوں سے اپنے دل و دماغ میں پرورش کر رہا تھا عملی صورت میں ڈھالنے کے لئے تیار ہو گیا۔ رسمی پابندیوں کی دشواریوں نے اس پر ہجوم کیا۔ جہلا نے جو پستی وجمود اور نکبت و ذلت کے عادی ہو گئے تھے برہمی کے ساتھ خروج کیا مگر اس کی اولوالعزمانہ بلند ہمتیوں نے سب کا خاتمہ کر دیا اور مصر بالکل ایک نئی صورت میں بدل گیا۔

زراعتی ترقی

مزارعین کی دقتیں اس کے پیش نظر تھیں۔ تجارت کی بیچارگی کو وہ ہر وقت محسوس کرتا تھا۔ ملک کی حرفتی کمزوری اس کے دل میں کانٹے کی طرح کھٹکتی تھی اس لئے اس نے پوری قوت سے اس طرف توجہ کی۔ مزارعین کی مشکلات کا انسداد کیا تجارت و صنعت کو ترقی بخشی حرفتی اور زراعتی مدارس قائم کیے۔ آلات جدیدہ کو رواج دیا۔ جس کی وجہ سے مصر کی زراعتی

حالت میں بہت ترقی ہوئی اور رو ئی کی کاشت جو قریب قریب مٹ چکی تھی محمد علی کی مسیحائی سے دوبارہ زندہ ہو گئی۔

محمد علی سے پہلے مصر میں عشر اور خراج کا عجیب قاعدہ تھا۔ حکومت کی طرف سے چند آدمیوں کو مختلف اضلاع دو سال کے لئے اجارہ پر دیدیے جاتے تھے۔ وہ ان دو سالوں میں غریب کسانوں اور کاشت کاروں پر اس قدر ظلم و ستم کرتے کہ لوگ زراعت کے نام سے ڈرنے لگے تھے۔ محمد علی نے اس رسم کی بیخ کنی کی اور ۱۸۱۳ء میں آراضی کی پیمائش کر کے مختلف حصوں میں تقسیم کیا اور مزارعین کو ایک مستقل شرح مالگذاری پر زمینیں دیدیں۔ لیکن فلاحوں کی بہبود کے لئے صرف یہی ایک اصلاح کفایت نہیں کر سکتی تھی کہ مصر کی زراعتی کمزوری کی سب سے بڑی وجہ نہروں کا عدم وجود تھا۔ حالت یہ تھی کہ جب دریائے نیل میں طغیانی ہوتی آراضی کی پیاس بجھ سکتی اور اس کے بعد کھیت بالکل چٹیل میدان ہوتے اور پینے کے لئے بھی زمین پر پانی کی تلاش بے سود ہوتی پھر طغیانی کے زمانہ میں بھی صرف وہی زمینیں اور کھیت سیراب ہو سکتے تھے جو نیل کے کناروں پر تھے۔ یا ان زمینوں کو طغیانی سے کچھ حصہ مل سکتا تھا جو ساحل سے قریب تھیں۔

اس مصیبت کو دور کرنے کے لئے تالاب بنوائے جن میں بارش اور طغیانی کے زمانہ میں پانی جمع کر لیا جاتا اور ان کے ذریعہ سے پھر خشک زمینوں اور کھیتوں کی آبیاری کی جاتی تھی۔ لیکن فلاحوں کی آسانی اور زراعت کی ترقی کے لئے تالابوں سے زیادہ نہروں کی ضرورت تھی۔ تاکہ ہر جگہ آبپاشی کی جا سکے۔ نہروں کی تعمیر کا سلسلہ شروع کیا گیا۔ نہر محمودیہ اسی سلسلہ کی سب سے پہلی نہر ہے جسے پانچ ہزار دو سو معماروں نے تیار کیا تھا۔

صنعتی ترقی

اسی زمانہ میں مصر میں ایسی ایسی مصنوعات کی ابتدا ہوئی جن کے نام سے بھی مصری ناآشنا تھے۔ شکر سازی کا انتظام کیا گیا۔ چمڑے کو دباغت دینے، ریشمی اور سوتی کپڑا بننے اور مشین بنانے کے کارخانے قائم کیے گئے۔ کاغذ اور رنگ سازی کے دارالصناعہ بنائے گئے جو یورپ کے کارخانوں سے کسی طرح کم نہ تھے۔

محمد علی نے اسی پر اکتفا نہ کی بلکہ اپنے صرف خاص سے ایک عظیم الشان دار الطباعۃ کا افتتاح کیا جس کے ذریعہ دنیا نادر الوجود کتابوں سے واقف ہوئی جن کے لئے اہل نظر اپنی جانیں نذر کرنے کو تیار تھے اور جو صرف محمد علی کے مطبعہ امیریہ کی وجہ سے منظر عام پر آگئیں ورنہ نقیدالوجود ہوتیں۔

رفاہ عام

آمد و رفت اور بار برداری کے لئے بیشمار پل بنوائے۔ سڑکیں تعمیر کرائیں۔ سراؤں کی بنیاد ڈالی۔ تجارتی ترقی کے لئے بندرگاہیں اور جہازوں کی گودیاں بنوائیں۔ رزنر کا بیان ہے کہ ان کاموں میں کم از کم دس ملین فرانک خرچ ہوئے۔

ترقی تعلیم

ہر ترقی خواہ ملک اور استقلال طلب قوم اپنے معاملات اور لائحہ ترقی کے بنانے اور جدید طریقوں پر عمل پیرا ہونے کے لئے بیرونی امداد کی محتاج ہوتی ہے اس لئے مقر اور اہل مصر کی اصلاح و ترقی کے لئے محمد علی کو بھی اپنے پر قوت دست و بازو کی تلاش ہوئی۔ مغرب کی طرف نظر ڈالی۔ برلن اور پیرس وغیرہ سے نیک دل اور آزمودہ کار ماہرین فن بلائے۔ علما اور اہل الصناعۃ کے لئے آسانیاں پیدا کیں۔ علوم جدیدہ کو رواج دیا۔ میکانک اور کیمیا کی درس گاہیں تاسیس کیں۔ بڑے پیمانے پر مدارس قائم کیے جن میں صرف نقالی ہی نہ تھی بلکہ ملک کی ضرورت و احتیاج کے موافق جدت و اختراع بھی تھی۔ ارسالیات خارجہ کا انتظام کیا، چنانچہ ۱۸۴۰ء میں سو سے زائد مصری نوجوانوں کو تکمیل فنون و تحصیل علوم کی غرض سے پیرس بھیجا اور جب وہ کامیاب واپس آئے تو اکثر جلیل القدر عہدے ان کے سپرد کیے۔ ملک کی اصلاحی عمارت کی بنیادوں کو مضبوط کیا اور دوسرے نوجوانوں میں بھی ترقی علم و فضل اور تحصیل فنون و معارف کا ولولہ پیدا کر دیا۔

اسی زمانہ میں اس نے مختلف مقامات پر سو سے زائد اعلیٰ پیمانہ کے مدارس تاثیر و درشد یہ کا افتتاح کیا جو اپنی اعلیٰ تعلیم اور بلند ترتیب و تہذیب میں یورپ کے اعلیٰ ترین مدارس سے کم نہ تھے اور جن میں پہلے ہی برس ۹ ہزار لڑکے زیر تعلیم تھے۔

تیسرا مصر کی تین ملین آبادی کے لئے جو بالکل جاہل اور وحشی تھی اس نے مفت اور جبری تعلیم کا انتظام کیا اور طلبہ کے ساتھ اس قدر مراعات کیں کہ ان کے ذاتی اخراجات سے گذر کر ان کے مربیوں، سرپرستوں اور والدین کو بھی تعلیم دلانے کے وظیفے اور روزینے دیے۔ ۱۸۴۶ء میں مردم شماری ہوئی تو ان جاہل اور وحشی اقوام و قبائل کے تعلیم یافتہ اور فارغ التحصیل نوجوانوں کی تعداد ڈیڑھ ہزار تھی جنہیں حکومت نے اکثر عہدوں پر مامور کر دیا تھا۔ مدارس کا انتظام بھی انہیں کے سپرد تھا۔ وہ اپنے قبیلوں میں پھرتے اور تعلیم کے فوائد اور منافع پر وعظ کہتے تھے۔ چنانچہ ۱۸۴۲ء میں ان ہی مدارس سے دو ہزار لڑکے کامیاب ہوئے اور پانچ ہزار مختلف مکاتب تعلیمی اور مدارس حرفتی میں زیر تعلیم و تربیت تھے۔

تعلیم نسواں

قوموں اور ملکوں کی ترقی مردوں کے ساتھ عورتوں کی بھی ممنون احسان ہوتی ہے۔ تمہاری کوئی عمارت مکمل نہیں ہو سکتی جب تک اینٹ اور چونا استعمال نہ کرو۔ محض اینٹوں کا انبار لگا دینا یا چونے کے تودے ہی کفایت نہیں کرتے۔ دنیا کی کوئی قوم اور نیلگوں آسمان کے نیچے کا کوئی ملک اس وقت تک ترقی نہیں کر سکتا جب تک طبقۂ نسواں میں بھی اپنی ذلت و نکبت اور پستی و تنزل کا احساس پیدا نہ ہو۔ قوموں کے عروج و زوال کی تاریخ اٹھا کر دیکھو۔ ہر ترقی خواہ قوم کی عورتوں میں صحیح آزادی، حقیقی تحفظ و بیداری اور ترقی اصلاح کی روح کارفرما پاؤ گے۔ محمد علی اس حقیقت سے واقف تھا۔ مردوں کے ساتھ عورتوں کی عمومی تعلیم کا فرمان جاری کیا۔ سلطنت کی طرف سے مدرسے افتتاح کیے اور عورتوں کو گرفتاریوں سے نجات دلائی۔ وہ پردہ کا مخالف نہ تھا۔ لیکن ان نا روا پابندیوں بیجا بندشوں اور غیر مساویانہ معاشری طریقوں کا حقیقی دشمن تھا۔ وہ یورپی آزادی کی تقلید و اتباع کو بری نظر سے دیکھتا تھا مگر اس نامنصفانہ امتیاز کو جو عورتوں اور مردوں کے درمیان پیدا کر دیا گیا ہے۔ اس ظلم کو جو عورتوں پر روا رکھا جاتا ہے اور اس پردہ کا جو بعض ممالک اسلامیہ میں رائج ہو گیا ہے سخت مخالف تھا۔ وہ اس راہ میں پوری جد و جہد کرنی چاہتا تھا اور اس کی مخالفت بالکل حق بجانب تھی کہ کتاب و سنت اور آثار سے اسقدر

قشدد ثابت نہیں اور یہ انسانی فطرت اور الٰہی احکام سے صریح لغی و عدوان ہے۔ بلکہ ایک لحاظ سے موجودہ پردہ عہد بربریت کی یادگار ہے اعراب جاہلیت اپنی لڑکیوں کو پیدا ہوتے ہی دفن کر دیتے تھے۔ ہمارے عزیزان ملت نے اس میں اس قدر جدت کی کر زندہ رکھتے ہیں مگر ذلت اور بیماریوں کی مصیبت میں مبتلا رکھنے کے لیے تنگ و تاریک قبروں میں دفن نہیں کرتے۔ یہ بڑی بڑی قبروں میں دفن کرتے ہیں۔ پہلے قتل و غارتگری عام نہ تھی اب عمومیت کی بھی انتہا نہیں۔ صورت گو بدل گئی، ظاہر حالت میں گو انقلاب ہو گیا مگر اصلیت میں فرق نہ آیا روح حقیقت ایک ہی ہے۔

محمد علی نے عورتوں کی تعلیم و تربیت میں زیادہ تر تہذیبیت کا خیال رکھا تھا۔ اسی اپنی قوت و اثر اور مہربانی سے رعایا کو توجہ دلائی۔ امرا کو مجبور کیا، رؤسا پر زور ڈالا اور سب کو مخاطب کر کے کہا۔ "عورت و مرد انسانی چہرے کی دو آنکھیں ہیں۔ دونوں کو عزیز رکھنا چاہیے۔ ایک میں انگلی مار لینا دوسری کے لئے مفید نہیں۔ چہرہ کی خوبصورتی دونوں پر منحصر ہے۔"

اس کی حکومت میں امرا و اعیان سلطنت کا فرض تھا کہ ہر شخص اپنی لڑکیوں اور بی بیوں کو اعلیٰ تعلیم دلائے اور ان کے ساتھ اپنی قوم کی غریب و مفلس مخدرات کی تعلیم سے بھی غفلت نہ کرے۔

(۲)

محمد علی کی خدمات اور اُسکی خصوصیات

اصلاح ملک و ملت کی راہ میں محمد علی کی زبردست جد و جہد اور شبانہ روز مساعی ایسی نہ تھیں کہ انصاف پسند اور اصلاح پرست دنیا تعریف نہ کرتی۔ وہ دن رات اسی فکر میں غرق رہتا کہ کسی صورت مصر کو اس قدر ترقی دیجئے کہ وہ عہد ماضی کی طرح زمانۂ حال میں بھی سمائے حضارت و عمرانیت کا اختر تابان بن کر چمکے۔

وہ حقیقت آشنا تھا اور اس کا مزاج فطرتاً جمہوریت پسند تھا جسے نہ انگلستان کی آزاد خیالی سے کوئی تعلق تھا نہ فرانس کی جمہوریت سے۔ اس کے دل میں اپنی قوم کی ہمدردی

کا سچا درد تھا۔ وہ اپنے قافلہ جہانبانی کی بربادی کے درد کی ایک کراہ تھا اور اپنے پہلو میں وہ دل رکھتا تھا جو اسلامیوں کی فلاکت پر مضمحل پستی وجود پر سراسیمہ اور تباہی پر نالاں و گریاں تھا۔ لیکن اضطراب و بیتابی میں اس کے پائے عزم و ہمت سست اور بازوے قوت و عمل شل نہ تھے بلکہ ہردم مستعد و آمادہ کار تھے۔ وہ ملک و ملت کا سچا غمخوار تھا۔ اسکی آنکھیں حیران تھیں۔ زبان ساکت و صامت تھی مگر درد و غم سے ہر آن دل گریاں اور زبان بھی ہر لحظہ محشر بداماں تھی!۔ اس کی وضع و معاشرت بہت ہی معمولی اور سادہ تھی۔ وہ ایک کسان اور کاشتکار کی طرح محنتی اور جفاکش تھا اور اس قابل کہ دنیا اس کے قدموں کو چوم کر اپنی کھوئی ہوئی فرزدگی کامرانی حاصل کرے۔ وہ ایک سپاہی زادہ تھا اور کوئی شک نہیں کہ ناجائز طور پر خود مختار بن گیا تھا، مگر حقیقتاً اس کا مستحق تھا کہ دردمند دنیا ترجیحاً خواہ قوموں کے زعیم اس سے اپنی مصیبت و فلاکت کی دوا پاتے۔ وہ بادشاہ تھا مگر اس کی طبیعت شاہانہ غرور کی دشمن تھی۔ وہ آزاد و با اختیار فرمانروا تھا مگر ظلم و ستم اور عیش و عشرت کی بزموں سے یکسر قلم بے تعلق و ناواقف۔ اس نے کہا جب تک بادشاہ اور اس کے ہم نشیں اپنی رعایا کی طرح عام سطح کی معاشرت کے عادی ہوتے ہیں۔ مساوات اور احترام حقوق ان کی طبیعت ہوتی ہے اور جفاکشی مایۂ خمیر، تو ترقی و خوشحالی بھی بارش کی طرح دشت و چمن اور باغ و صحرا پر یکساں برستی ہے۔ لیکن جب عشرت و سرور کی شراب کے دور چلتے ہیں، جب نشاط و عیش کا دور دورہ ہوتا ہے، جب بادہ و ساغر کی باری آتی ہے، جب خزانوں کے دروازے بجائے رفاہ عام اور رعایا کی فلاح و بہبود کے انتظام و اہتمام کے فوجوں کی ترتیب، ظالم حاکموں کی بیش قرار تنخواہوں قشلاق و ییلاق[1] کے سفر دار تحال اور شاہانہ عیش و نشاط کے لئے کھل جاتے ہیں، جب شاہزادوں کے استقبال کے لئے غریب و مفلوک الحال رعایا سے زبردستی چندے لئے جاتے ہیں اور مفلس ملک کا روپیہ پانی کی طرح بہایا جاتا ہے تو عزم و ہمت اور جفاکشی کے فرشتے اپنے گھروں سے نکلتے ہیں اور حکومت و سلطنت کی دولت و نعمت کو

---

[1] سردی کے موسم میں رہنے کے مقام کو قشلاق اور گرمی کے زمانہ میں رہنے کی جگہ کو ییلاق کہتے ہیں۔

ایک دوسری قوم کے آغوش میں ڈال دیتے ہیں جو اس کی قدر کرتی ہے۔ اس کا احترام کرتی ہے اور یہ قانون نوبت بہ نوبت ہر قوم پر آتا ہے۔ تبدیلی کو دخل نہیں۔ ولن تجد لسنة الله تبدیلا۔

محمد علی مصر کا مطلق العنان فرمانروا تھا۔ اسے کسی محتسب کا خوف تھا نہ حاکم بالا کی دار و گیر کا ڈر۔ وہ اگر چاہتا تو ایسے ہی فسق و فجور میں مبتلا ہو سکتا تھا جس میں آج دنیا کی متمدن اور تہذیب و شائستگی کی دعویدار قومیں اور سلطنتیں گرفتار ہیں لیکن وہ کسی ضلالت عمل اور خبث نفس کی کثافت میں نہیں گرا۔ اس نے وطن چھوڑا۔ رات کا آرام دن کی آسائش اپنے اوپر حرام کی مہینوں ممالک محروسہ کا دورہ کیا۔ رعایا کی مشکلات و مصائب کو اپنے کانوں سے سنا اور آنکھوں سے دیکھا۔ حاکموں اور عاملوں کے انتظامی اسقام کی اصلاح کی اور جب تک زندہ رہا بغیر کسی شان تبرقع و نقاب آرائی کے شاہانہ فرائض انجام دیتا رہا وہ کہتا تھا، بادشاہ کچھ نہیں ہے مگر اپنی رعایا کا خادم۔ جو اگر اپنے فرائض انجام دے تو اس قابل ہے کہ تخت حکومت پر بیٹھے، ورنہ اس قابل کہ فوراً ہلاک کر دیا جائے۔"

ایک مبصر کی رائے

اس کی انہی جانفروشیوں اور محنتوں کو دیکھ کر جرمن قنصل نوبمان اپنی کتاب "مصر الحدیثہ" میں لکھتا ہے:

"محمد علی ایک بیدار مغز فرمانروا اور اسلامی دنیا میں اٹھارویں صدی کا ایک بہترین مصلح اور رہنما تھا۔ اس نے مصر کو جس قدر ترقی دی اپنی قوم کی فلاح و بہبود کی راہ میں جس قدر محنتیں اور مشقتیں اٹھائیں اور ملک کی اصلاح و ترقی کے لئے جس قدر کوششیں کیں موجودہ عہد نشاط و اقتدار پسندی میں اس کی نظیر ملنی مشکل ہے۔ اس سے پہلے مصر کی جو حالت تھی، ملت اسلامیہ جس قدر تباہ و برباد ہو گئی تھی اس کا اظہار تحصیل حاصل ہے۔ مگر یہ ایک واقعہ ہے کہ محمد علی نے جانوروں کو انسان اور شیطانوں کو فرشتہ بنا دیا۔ اور بلا مبالغہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ اس کی انتظامی قابلیت کا نتیجہ ہے کہ اگر ایک شخص قاہرہ سے خرطوم دیار تخت سوڈان تک چلا جائے اس طرح

کہ اس کا جیب و دامان لعل و گہر سے بریز ہو تو اسے کوئی خوف و خطر لاحق نہیں ہوتا۔ وہ اپنی جان و مال کو چوروں اور قزاقوں سے محفوظ رکھ سکتا ہے اسلئے کہ ہر شخص متمدن اور مہذب ہے اور جانتا ہے کہ زندگی کا مقصد لوٹ مار نہیں۔"

اٹھارہویں صدی کا وہ ظہور اصلاح جس نے راہزنوں اور ڈاکوؤں کو شریف انسان اور شیطانوں کو فرشتہ بنا دیا، جس نے ایک ایسے ملک میں جو اپنی بدنظمیوں اور خانہ جنگیوں کے اعتبار سے وحشی جانوروں اور خوفناک درندوں کا جنگل تھا، جو اپنی تباہی اور بربادی کی وجہ سے ڈھئی ہوئی عمارتوں گرے ہوئے مکانوں اور شکستہ دیواروں کا ایک ویران و حسرت نصیب شہر تھا جو بدحال انسانوں اور غلاکت وجود کی متحرک تصویروں کے مسکن کے لحاظ سے زندہ انسانوں کا قبرستان تھا، اسے انسانوں کی آبادی، تہذیب و تمدن کا آشیانہ اور حضارت و عمرانیت کا نشیمن بنا دیا۔ اس نے نہ صرف امن عامہ کے مفید کام انجام دیے، امور نافعہ کا اجراء و نفاذ کیا اور مزارعین کے لئے آسانیاں پیدا کیں، تاجروں اور صناعوں کے لیے سامان تجارت فراہم کیا اور طالب علموں کے لئے مدرسے اور کتبخانے قائم کیے، حفظان صحت اور خیراتی شفاخانوں کا انتظام کیا۔ یہاں تک کہ رعایا کی خوشحالی و ترقی کی خاطر اپنے اوپر عیش و آرام حرام کر لیا اور امت مرحومہ کی تباہی و بربادی کا اپنے دل میں ایسا درد محسوس کیا کہ خود تصویر درد اور ہمہ تن رنج و ماتم بن گیا۔ تمام عمر اس کا سر بالش راحت سے محروم اور اس کا جسم لطف و مسرت کے پھولوں کی سیج و بالین سے ناآشنا رہا۔ وہ مجاہد اصلاح وکارافی جسے خدا نے اس لئے بھیجا تھا کہ امت مرحومہ کی اصلاح کرے، ایسا دل و دماغ لے کر آیا تھا جو قدرت ہر کس و ناکس کو نہیں دیتی۔ اس کے فکر و دماغ نے جہاں تک رسائی کی اور جو تماشے دیکھے ممتدنان جزیرہ نشین اور اس کے حریفان سلطنت ان کے سننے کی صلاحیت بھی نہ رکھتے تھے۔ وہ ایک انسان تھا مگر یکسر دماغ و عمل! وہ ایک ہاتھ تھا۔ سرتاسر ہاتھ! وہ ایک آواز تھی جو بیابان عصری فضا میں بلند کی گئی اس لئے کہ ایک شاندار اسلامی حکومت قائم کر دے، مسلمانوں کے قافلۂ پریشان کو فرش مذلت سے عرش عزت و کامرانی پر سربلند کر دے کہ ان العزت للہ ولرسولہ و للمومنین کے معنی سمجھ میں آجائیں۔

مشکلات کے متعلق اس کا بیان

لیکن کیا اس کی راہ خارزار مشکلات و مصائب اور صحرائے دشواری سے خالی تھی؟ کیا عوائق نے اس کے دوش شاہی پر تازیانے نہیں لگائے؟ موانع کی خلیج اس کی راہ میں حائل ہوئی۔ مزاحمتوں کے پہاڑ اس کے سامنے اٹل ہو گئے۔ دشواریوں کی فوجوں نے اس کے آگے پرے جمائے۔ یورپ اگرچہ اس کے نام سے کانپ اٹھتا تھا کہ اس کے ہاتھ کی تلوار نام نہاد مسیحیت کی دشمن تھی، اس کا خنجر دراز دستیوں اور وعدہ خلافیوں کے خون کا پیاسا تھا، اور اسی لئے تمام مسیحی قوتیں علانیہ و در پردہ اس کی مخالف تھیں۔ فرانس کا وزیر خارجہ اگرچہ اس کی قوت و شجاعت سے خائف تھا، مگر بغض و حسد کی ایک بے پناہ چھری تھا۔ انگلستان کا ایوان حکومت اگرچہ بہت ہی انصاف پسند اور بے انتہا اسلام دوست تھا[1] کہ اس کی قلمرو حکومت میں دس کروڑ مسلمانوں کی آبادی ہے۔ مگر اس کو تباہ کر دینے اور اس کے تخت و سلطنت کو تاراج کرنے کی فکریں سب سے زیادہ اسی کے زیر غور تھیں۔ وہ ایک اصلاح پسند بادشاہ تھا اور مسلمانوں کے گم کردہ راہ قافلہ کے لئے شعاع امید۔ اس لئے اس کی مخالفت فرزندان مسیح پر لازم اور مجاہدین صلیبی کا اولین فرض۔ مگر اس نے تمام دشمنوں کی مخالفتوں اور تمام جاہلوں اور ناعاقبت اندیشوں کی مزاحمتوں سے بے پروا ہو کر اپنا کام شروع کر دیا۔ خود لکھتا ہے۔

> "مجھے اصلاحات کے نفاذ اور ترقی و بہبود کی راہ میں جن دشواریوں کا مقابلہ کرنا پڑا ان کی داستان بہت طویل ہے۔ داخلی مشکلات سے زیادہ خارجی مزاحمتیں میرے لئے مصیبتوں اور پریشانیوں کا باعث ہوتی تھیں۔ اگر بیرونی آفات اور بلیات پیش نہ آتیں اور اگر حریت و آزادی کے وہ علمبردار جو اگرچہ اصلاح و فلاح کے بہت ہی یکتا و بے ہمتا داعی ہیں مگر حقیقتہً اصلاح و مساوات کا دشمن، اخلاق و انسانیت کے پاک اصولوں کا دم گھوٹنے اور انصاف

---

[1] انگریزوں کی اسلام دوستی کے لئے دیکھئے مولوی ابوالاعلیٰ صاحب کا مضمون "انگریزی کی لغت میں دوستی کے کیا معنی ہیں"۔

و آزادی کے لئے جنگل کا کوئی بھیڑیا ان سے زیادہ خطرناک نہیں۔ وہ اگر اسی حرص و طمع اور خواہش ملک گیری کی وجہ سے میری مخالفت نہ کرتے تو میں بڑی حد تک اپنے مقاصد میں کامیاب ہو جاتا اور میرے دل میں آئندہ کی کامیابیوں کی امید کے بجائے مسرتیں ہوتیں۔ تاہم مصر کی زمین میں جو بیج میں نے ڈالا ہے اس کا پھل عزیزان ملت اور اہل ملک مدت دراز تک اٹھائیں گے اور جس خزاں رسیدہ باغ کی میں نے آبیاری کی ہے اسکی بہار و نکہت سے میری آنے والی نسلیں مستفید ہوں گی۔ خدا میری امیدوں کو اور اہل مصر کی ترقی و خوش حالی کی آرزوؤں کو جنہیں میں اپنے ساتھ قبر کے گوشہ میں لئے جاتا ہوں پورا کرے۔"

دوسری جگہ لکھتا ہے۔

"مصر کی عنان حکومت اللہ نے میرے ہاتھ میں دی تو اس کی حالت بہت زیادہ نازک تھی۔ وہ اگرچہ دنیا کی سب سے قدیم تہذیب اور پرانی ترقی کا گہوارہ ہے لیکن اس کی تمام ترقیاں غیروں نے چھین لیں۔ تباہی کے ہاتھوں نے اس کی شوکتوں کو مٹایا۔ دست خزاں نے بیدردی سے اسکی بہار کے سامان لوٹے۔ کچھ صبا نے سرد و نشاط کو منتشر کیا اور کچھ خود چمن والوں نے اپنے کاشانۂ حیات میں آگ لگا دی۔ تا آنکہ جس زمانہ میں مَیں نے مصر پر اپنی حکومت کا علم بلند کیا اس کی تمام آبادی جاہل اور حیوانوں کی طرح وحشی تھی۔ اسے نہ حضارت و مدنیت سے کوئی تعلق تھا نہ عروج و ترقی سے سروکار۔ ہر طرف تباہی و بربادی نمایاں، پستی و جمود ہویدا، اور نکبت و نحوست کے آثار پیدا تھے۔ لیکن میری زندگی کا مقصد جھوٹی حریت پرستی کا اعلان، نمائشی انصاف و مساوات کا ادعا اور ناجائز حکومت و اصلاح کا نشر نہیں ہے۔ اور نہ چند روزہ عیش و آرام اور پادشاہی پر مغرور ہونا پسند کرتا ہوں۔ یہ تمام باتیں شیطانوں کو مسرت بخشتی اور اللہ کو ناراض کرتی ہیں۔

میں نے مصر کی اصلاح و ترقی کے لئے جو کوششیں کیں، اہلِ مصر کی فلاح و بہبود کا جو کام شروع کیا سمجھتا ہوں کہ بحیثیت فرمانروا اور مسلمان ہونے کے میرا فرض تھا جسے نہ ادا کرتا اور اس سے غفلت کرتا تو اللہ اور اُس کے رسول کی نافرمانی کرتا۔ لیکن یہ بات میرے لئے وجہ مسرت ہے کہ اللہ نے میری مساعی کو قبول کر لیا اور مصر عرصہ کی وحشت و بربادی کے بعد ترقی کی شاہراہ پر آ گیا۔"

قابلیت علمی

ان تمام خدمات پر نظر کرتے ہوئے تم سوال کروگے کہ اس نے لندن اور امریکہ کے کس جامعہ میں تعلیم پائی؟ کس شاہی درسگاہ میں ان معارف کا درس لیا؟ فنون اصلاح کی کہاں تکمیل کی؟ لیکن یہ سن کر تم تعجب کروگے کہ اس کی قابلیت علمی بہت معمولی تھی۔ اس نے نہ کسی کامل الفن استاد کے آگے زانوے شاگردی تہ کیا، نہ کسی دارالعلوم کی سند حاصل کی، نہ جامع کی عمارتوں کی سیر کی اور نہ اصول جہانبانی و طریق مملکت کی تحصیل کے لئے ملکوں کے سفر کیے۔ تاہم ؎

نگار ما کہ بہ مکتب نہ رفت و خط نہ نوشت

بغمزہ صد مسئلہ آموز صد مدرس شد

باوجود اپنی کم علمی و نادانی کے ہزاروں عالم اور صناع پیدا کر دیے۔

ایک یورپین سیاح نے اکتسابات علمی دریافت کیا تو جواب دیا:

"میری ابتدائی تعلیم بہت ادنیٰ اور معمولی ہے۔ مجھے معمولی زندگی میں اس سے مدد نہیں ملی۔ میں نے جو کچھ سیکھا، استاد ازل سے سیکھا۔ مجھے یاد نہیں کہ اپنی زندگی میں کسی مدرسہ میں داخل ہوا اور مسلسل و باقاعدہ کسی استاد سے پڑھا۔ البتہ مدتوں عروج و زوال، ترقی و تنزل اور انقلاب و تطوّر کے لازوال قوانین کا مطالعہ کیا ہے اور برسوں میرا تخیلہ و دماغ اسی فکر میں منہمک رہا کہ ملت اسلامیہ کس طرح ترقی کر سکتی

ہے اور اس کی فوز و فلاح کے لئے کیا وسائل ہیں ؟ میری زندگی کی کائنات
علم حرف اسی قدر ہے اور یہی موجودہ زندگی کی روح رواں ہے۔"

ایک اعتراض اور اُسکا جواب

محمد علی کے خلاف جس قدر زہر اگلا گیا ہے وہ اس کے ان مخالفین کے زخم دل و جگر کی خون چکانیاں ہیں جو سیاسی عصبیت اور خواہش ملک ستانی کی وجہ سے اسکے دشمن ہیں۔ ایک گروہ اس کی خود مختاری کے اعلان سے آتش بداماں ہے۔ دوسرے کے ترکش کا تیر ممالیک کے قتل کا واقعہ ہے تیسرا گروہ باب عالی سے بغاوت و سرکشی کے باعث قابل دار سمجھتا ہے اور اس کے سارے خدمات اور تمام جانبازیاں حرف غلط کی طرح مٹا دینا چاہتا ہے لیکن جن حضرات نے اُس عہد کی سیاسی تاریخ کا مطالعہ کیا ہے اور غائر نظر سے محمد علی اور باب عالی کے تعلقات پر نظر ڈالی ہے وہ جانتے ہیں کہ غلطی صرف محمد علی کی نہ تھی۔

تاہم وہ فرشتہ نہیں انسان تھا۔ فوج کے ادنیٰ سپاہی سے حکومت و شہنشاہی تک پہونچا اور اس سفر میں کسی کے دست و بازو کی اعانت کا طلبگار نہ ہوا۔ وہ معارف جدیدہ و فنون مدرسہ نتر لیقہ کا ماہر نہ تھا۔ اس نے شائستگی کے کسی دارالتہذیب میں تربیت نہیں پائی تھی۔ اس نے جو کچھ کیا اگر اس سے زیادہ کرتا اور اس کا دامن گرد باد شوائب سے آلودہ ہوتا تو ان مدعیان حق و انصاف سے زیادہ قابل قدر تھا۔

اس کا سب سے بڑا اور ناقابل معافی جرم مصر کی حکومت کا اعلان اور ممالیک کے قتل کی خونیں داستان ہے۔ لیکن یہ بھی ایک ناقابل انکار واقعہ ہے کہ خود ممالیک نے اسے اس حرکت شنیعہ پر دعوت دی۔ واقف کار جانتے ہیں کہ محمد علی نے سب سے پہلے اُن کو اپنی حکومت پر رضامند کرنے کی ترغیب دی اور کوشش کی کہ وہ اپنے امن شکن خیالات سے باز آکر اس کے شریک کار ہو جائیں۔ انہوں نے انکار کیا اور مسلسل ایسے تدابیر میں مشغول رہے جن سے قیام امن و نفاذ اصلاحات میں دشواریاں پیدا ہوئیں۔ انہوں نے مسلح بغاوتوں کے انتظام کیے۔ لائحہ اصلاحات کی زبان و عمل سے مخالفت کی دشمنوں سے ساز باز کیے۔ اس نے ابتداءً تعزیری احکام سے راہ راست پر لانے

کی کوشش کی۔ مگر وہ باز نہ آئے۔ یہاں تک کہ پیمانۂ صبر لبریز ہوگیا اور اس نے مجبور ہو کر انہیں جلاد کے سپرد کیا۔

ظاہر ہے کہ ایسے درندوں اور خود غرض و دشمن اصلاح انسانوں کا اس سے بہتر کوئی علاج نہ تھا۔ اور کوئی منصف مزاج اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتا کہ اصلاح و ترقی کے لئے ایسا کیا جانا ضروری و لازمی تھا۔

لیکن اگر اس کا یہ گناہ ناقابل معافی اور سنگین ترین جرم ہے تو علم و دانشمندی اور دانش و بصیرت کی زبان ایک سوال کرتی ہے کہ وہ جو تہذیب و شائستگی کے تنہا دعویدار ہیں، وہ جو حریت و مساوات کے واحد مدعی ہیں، اور وہ جو حق و انصاف کے بلند آہنگ علمبردار ہیں کوئی ایسی بادشاہت، کوئی ایسی حکومت کوئی ایسی سلطنت بتلا سکتے ہیں جس کا دامن مفتوح قوموں اور بے بس انسانوں کے خون سے رنگین نہیں؟ گذشتہ پانچ سالہ صلیبی جنگ (جسے حق و انصاف کی جنگ بتلایا گیا تھا) کے نتائج ہمارے پیش نظر ہیں۔

محمد علی بلا شبہ ظالم و ستمگر تھا، اس نے ممالیک کو قتل کیا جو یورپ کے شیاطین حکومت کے آلۂ عمل تھے۔ لیکن گذشتہ سال ہندوستان میں کیا ہوا، اور اب تک مصر اور آئرلینڈ میں کیا ہو رہا ہے؟ کس لئے ہر آئرش کی زبان پر یہی الفاظ جاری ہو رہے ہیں کہ انگلستان کا دشمن آئرلینڈ کا دوست ہے، اور ہر مصری یہی کہتا ہے کہ جب تک ایک انگریز بھی حاکمانہ مصر کی سرزمین پر موجود ہے راحت و آرام ہمارے لئے حرام ہے؟ سمرنا اور تھریس میں کس کے ہاتھ قتل و خونریزی میں مصروف ہیں؟ عراق اور شام میں کس نے آگ اور خون کا تماشا کیا ہے؟ اور وسط ایشیا میں اپنے استیلائے حکومت کے لئے خون کی ندیاں کون بہا رہا ہے؟ سب سے زیادہ بیسویں صدی کی وہ مہذب ترین حکومت جس کے ہاتھ باغیوں اور سرکشوں کے خون سے نہیں، امن پسندوں، وفاشعاروں اور مظلوموں کے خون سے سرخ ہیں اور اس کی زمین عدل و انصاف بے گناہوں کے خون سے گلنار ہے اپنے بچاؤ کی کیا دلیل پیش کرے گی؟

پھر اگر محمد علی نے بلغاو سرکش مالیک کو قتل کیا تو کیا گناہ کیا ؟

"این گناہیست کہ در شہر شما نیز کنند"

جب اطاعت کیش اور وفا شعار رعایا بے دریغ قتل کی جا سکتی ہے ۔ جب امن پسند اور نہتّی آبادی پر مشین گنوں سے گولہ باری کی جا سکتی ہے تو بغاوت شعار بھی قتل کیے جا سکتے ہیں اور انکا قتل جفا کاری نہیں، تہذیب و تمدن اور امن و عافیت کی دنیا پر احسان ہے ! اور ایسے ظلم پر دنیا کے ہزار انصاف قربان کیے جا سکتے ہیں !

لیکن اگر حقیقۃً اس سے کوئی غلطی ہوئی جس پر وہ خود شرمسار رہا تو اس کی بے مثل خدمات کے مقابلہ میں اس سے زیادہ غلطیوں اور لغزشوں کی گنجائش ہے ۔ جس طرح کوئی انسان اپنی تمام زندگی میں معائب و رذائل اخلاق سے پاک نہیں ہو سکتا اسی طرح و ترقی کے میدان میں وہ بھی صرف محاسن کا مجموعہ نہیں ۔ اس کے دامن پر چند داغ بھی ہیں مگر سیاہ نہیں !

محمد علی کے جانشیں اور اُن کی خدمات

۱۸۴۸ء میں محمد علی نے وفات کی تو ابراہیم سریر آرائے ملک و دولت ہوا ۔ اس کے بعد عباس نے جگہ لی ۔ اور عباس کے بعد سعید تخت و تاج کا مالک ہوا ۔ اگر اسلاف کے لئے اخلاف کا سعید و صالح ہونا اللہ کی بخشش و عنایت اور لطف و کرم ہے تو خوش قسمتی سے محمد علی کا دامن اس دولت سے بھی مالامال ہے ! ابراہیم، عباس، سعید تینوں نے اس طریق زندگی کو اپنا اسلوب حکومت بنانے کی پوری پوری کوشش کی اور سب کامیاب ہوئے ۔ یہ وہی جادۂ اصلاح و ترقی جو محمد علی نے اختیار کیا تھا اور یہی ذرائع فوز و فلاح جو اس کے پیش نظر تھے ان تینوں نے اسی کی تکمیل کی ۔ محمد علی نے جو عمارت بنائی تھی اُسی کے استحکام و مضبوطی کی طرف توجہ کی ۔

عباس تخت نشیں ہوا تو رفتار ترقی دیکھ کر دوڑنے کے بجائے اس نے اپنے مقاصد کی ایک فہرست بنائی ۔ اسباب و وسائل کا ایک لائحۂ طیار کیا اور اسی قدیم عمارت پر ایک منزل کا اور اضافہ کر دیا ۔ وہ انہی خیالات میں منہمک تھا کہ ترکوں اور روسیوں کے درمیان لڑائی چھڑی ۔ اس نے اپنی ذمہ داریاں اور اپنے فرائض محسوس کیے اور اسلام کے تاقلہ

شہنشاہی کے آخری تاجدار کی اعانت اور اپنے سردار کی خدمت کے لئے پندرہ ہزار فوج کا ایک جرار لشکر بھیجدیا۔ اس جنگ میں مصری فوجوں نے اپنی شجاعت و بہادری کے ایسے جوہر دکھائے کہ یورپ ایک بار پھر کانپ اٹھا اور اس نے مصر کی شاندار اسلامی حکومت کی تباہی کی تدابیر پر بہت ہی تشفف و انہماک سے عمل شروع کیا۔

عباس کے بعد سعید سریر آرائے ملک و دولت ہوا۔ اتفاق سے اس کے زمانہ میں جنگ کریمیا رونما ہوئی۔ اس وقت ترکوں کی حالت بہت ہی درماندہ تھی وہ اندرونی سازشوں اور بیرونی چالبازیوں سے پریشان و سراسیمہ تھے۔ مسلسل جنگوں نے تھکا دیا تھا۔ اور سب سے زیادہ انگلستان کے دوستانہ مشوروں نے ان کی تباہی کے سامان کئے۔ مرحوم مصطفیٰ کامل نے سچ کہا تھا کہ "دولت عثمانیہ کو جس چیز نے سب سے زیادہ نقصان پہونچایا ہے وہ انگریزوں کی دوستی اور ان پر اعتماد ہے"۔ روس نے اعلان جنگ دیدیا۔ فوجیں ترکی علاقوں میں بڑھ آئیں۔ شہر پامال کئے مگر برطانوی سفرا کا پیہم یہی اصرار تھا اور دوستانہ و شفیقانہ اصرار تھا کہ جنگ آزمائی کی ضرورت نہیں۔ صبر کرو بیکار دشمنوں ہے۔ اور انگلستان جب تک دوست ہے کسی میں ہمت نہیں کہ دولت عثمانیہ کا بال بیکا کر سکے۔ لہذا ہجوم دفاع لاحاصل۔ لیکن جب حالت زیادہ نازک ہوگئی۔ روسی فوجوں کو کافی غلبہ و تفوق حاصل ہوگیا، وہ اکثر مقامات پر قابض ہوگئے تو برطانوی سفرا سکوت مزار تھے۔ باب عالی نے عاجلانہ جنگ کی تیاریاں کیں۔ سعید کو اطلاع ملی تو اس نے ایک زبردست اور آزمودہ کار فوج بھیجی۔ اس کے تمام اخراجات خود برداشت کئے اور لکھا "سعید کا مال حضور کی خدمت و اعانت کے لئے حاضر اور اس کی جان اطاعت و وفاداری کے ذریعہ میں قربان ہونے کے لئے آمادہ ہے"۔ مصری فوجوں کی روانگی کے بعد فرانس کو بھی خیال آیا اور ما ختتام جنگ کے قریب انگلستان نے بھی اپنی نمائشی اور خادعانہ دوستی کے ثبوت میں ایک معمولی سا لشکر بھیجدیا اور اخراجات کے نام سے ایک لاکھ لیرہ[1] کا مطالبہ کیا۔

---

[1] لیرہ ترکی پونڈ ہے، جس کی قیمت تیرہ روپیہ تھوڑا آنہ ہوتی ہے۔

ہر چند اس جنگ میں ترکوں کو شکست ہوئی لیکن سعید کی امدادی فوج تائید غیبی ثابت ہوئی ورنہ انگریزوں کی دوستی نہ جانے کیا رنگ لاتی۔

نہر محمودیہ بعض جگہ سے ٹوٹ گئی تھی۔ سعید نے دوبارہ تعمیر کرائی۔ منافذ بند ہو گئے تھے۔ انہیں کھلوایا۔ سوتیں رک گئی تھیں انہیں صاف کرایا۔ آب پاشی کے جدید آلات منگوائے۔ مزارعین و اہل حرفہ حکومت کی امداد کے محتاج تھے۔ سعید نے ان کی ہمت افزائی کی۔ قاہرہ اور اسکندریہ کے درمیان سکۃ الحدید اور تار کا سلسلہ قائم کیا۔ نہر سوئیس کی تعمیر بھی اسی کے زمانہ میں ایم۔ ڈی۔ لسیپس کی زیر نگرانی شروع ہوئی اور مصر کی حکومت کو ۱۸۶۴ء میں سب سے پہلا قرض لینا پڑا۔

تعلیمات کے سلسلہ میں مدرستہ المہندسین اور مدرسۂ حربیہ کا افتتاح کیا امور ناقصہ کے قابل قدر انتظام کئے اور عجائب خانہ بنوایا۔

۱۸۶۳ء میں اسمٰعیل نے اورنگ حکومت پر قدم رکھا اور جب تک زندہ رہا اصلاحات کے نفاذ، مفید چیزوں کے اجرا اور ملک و قوم کی فلاح و بہبود کی خدمات انجام دیں۔ رزتر جو اس سے کسی قدر بدظن ہے لکھتا ہے۔

"اگرچہ اس کا نصب العین وہی تھا جو اس کے پیشرو حکمرانوں کا تھا اور وہ بلاشبہ رات دن اجرائے نافذ میں مشغول رہتا تھا۔ لیکن مصلحانہ خیالات اور وطن پرستانہ جذبات کے ساتھ عیش و آرام، سرور و نشاط اور شاہانہ تمدن و معاشرت کا عادی تھا۔ وہ جزرسی اور سادہ زندگی جو محمد علی سے سعید تک منتقل ہوئی تھی اسمٰعیل اس سے بالکل محروم اور اس خدمت سے یکسر کورا تھا۔ معاشرت کا وہ خاص اسلوب اور شاہانہ دربار کا وہ خاص طرز جو محمد علی نے اختیار کیا تھا، اور اس کے جانشینوں نے اسے زندہ رکھا، اسمٰعیل کے زمانہ میں بالکل بدل گیا۔ اس میں عظیم الشان انقلاب ہو گیا۔ لیکن اس کی یہ سب باتیں گوارا کی جاسکتی ہیں اگر وہ قرض لینے میں دلیر نہ ہوتا اور خصوصاً یورپین بنکوں سے۔"

اہل نظر اس کی افتادِ طبیعت اور مسرفانہ عادات و خیالات سے پہلے ہی واقف تھے۔

سب سے پہلا واقعہ جب کہ مصریوں نے اس کی فضول خرچیوں کا حال معلوم کیا ۱۸۶۹ء کا وہ جشن ہے جو بہ نہایت تزک و احتشام سوئیس قنال کے افتتاح میں منایا گیا تھا۔ قیصر جرمنی، امپرر اسٹریا اور دوسرے اکابر عالم خصوصاً یورپین ارباب سیاست و اقتدار کو دعوت دی۔ جس میں ۱۲۵ ملین فرانک[1] خرچ ہوا۔

اسمٰعیل پر سب سے بڑا اعتراض اس کا بیجا اسراف ہے اور اگرچہ بقول رززبلا تامل کہا جا سکتا ہے کہ خود اس نے اپنی ناعاقبت اندیشیوں اور مسرف فطرت کے ہاتھوں مصر کو محکومی اور اہل مصر کو غلامی میں مبتلا کیا۔ لیکن ناانصافی ہو گی اگر تمام ذمہ داریاں اسی پر ڈال دی جائیں۔ اس کے عیار حاشیہ نشین دوست نما دشمن غاشیہ بردار یورپین حکومتوں کے مکار عمید جنہوں نے ہمدرد اور غمخوار بن کر خروج کیا تھا اس کو اپنی چالاکیوں اور عجیب و غریب تدبیروں سے یورپ سے قرض لینے پر مجبور کر دیا۔ وہ ابتداً یورپین بنکوں سے قرض لیتے ڈرتا تھا مگر اس کے نالائق ہم نشین خائن ارکان سلطنت اور بدکردار عہدہ داروں نے یورپین بنکوں سے معاملہ کرایا اور اپنے فائدہ کی خاطر مصر کے گلے میں غلامی و محکومی کا پھندا ڈلوا دیا۔

لیکن اگر اسمٰعیل نے مصر کو نقصان پہونچایا تو اس کے فیوض و برکات بھی بے اندازہ ہیں اور اس امر واقعہ سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا کہ اسمٰعیل نے مفید اور کارآمد چیزوں کا اضافہ بھی کیا جو مصر پر اس کا ایک ناقابل فراموش احسان ہے۔ اس کے زمانہ میں علوم و فنون صنعت و حرفت اور تجارت کو اس قدر ترقی ہوئی کہ مصر کا نام ایک بار پھر زندہ ہو گیا۔ اس نے مختلف حرفتوں کے کارخانے قائم کیے۔ ملک و قوم کی فلاح و بہبود کے لئے دارالصنائع کھولے مزارعین و فلاحین کی آسانی کے لئے نہروں کا جال بچھایا۔ رفاہ عام کے لئے پل اور سڑکیں تعمیر کرائیں۔ ریلیں جاری کیں۔ جہاز رانی کے لئے روشنی کے منارے بنوائے۔ محکمۂ رسل و رسائل کا انتظام درست کیا۔ اکثر مقامات پر ڈاکخانے تعمیر کرائے اور ان کا

---

[1] ۱۲۵ ملین فرانک کے ۱۸۷۶۲۵۰۰ روپیہ ہوئے۔

ایسا انتظام کیا کہ اس زمانہ میں صرف فرانس کو نصیب تھا۔

سوڈان بالکل وحشی اور غیر متمدن ملک تھا۔ وہاں آثار تمدن بالکل مفقود و معدوم تھے، اور اس دیار کے باشندے جنگل کے وحشی جانوروں سے زیادہ خونخوار۔ اسمٰعیل نے انہیں مہذب و شائستہ بنایا۔ مدنیت کا خوگر کیا۔ وہاں تجارت گاہیں بنائیں۔ اور خرطوم سے خط استوا تک ڈاک جانے لگی۔

مصر میں تار کا انتظام ادنیٰ اور بہت ہی محدود تھا۔ اسمٰعیل نے اس قدر اسے ترقی دی اور میدان نوآف اس قدر وسیع کیا کہ صرف سوڈان میں ۳۹۴۲ کیلومیٹر[1] تار کی لمبائی تھی۔

آب پاشی کے انتظام میں کچھ نقائص رہ گئے تھے۔ کچھ تبدیلی کے طلب گار تھے ان کی اصلاح کی۔ فلاحوں کی آسانی اور ترقی کے لئے زراعتی مدرسے قائم کیے۔ جدید آلات زراعت کا استعمال سکھایا اور ان کو رواج دیا۔ نہر ابراہیمی تعمیر کرائی جس سے زراعت کو فائدہ پہونچا۔

تعلیمات کا انتظام قابل اصلاح تھا۔ عمومی تعلیم محدود تھی۔ اعلیٰ تعلیم میں دشواریاں تھیں۔ اسمٰعیل نے سب کی اصلاح کی۔ مدرسوں اور جوامع کے مدرس اور دارالفنون کے استاذ فنون و معارف سے پوری پوری طرح واقف و باخبر نہ تھے اور ہر فن کی اعلیٰ تعلیم اور بہترین تعلیم کے لئے خود اساتذہ کو بھی تربیت یافتہ ہونے کی ضرورت تھی۔ اس نے ایک مدرسۃ المعلمین تاسیس کیا جس میں یورپ سے علوم و فنون کے ماہر بلائے اور حکم دیا کہ کوئی شخص بغیر مدرسۃ المدرسین کی سند اور اُس کے امتحانات میں کامیابی کے ڈپلومہ کے کسی مدرسہ اور کسی کلیہ میں مقرر نہ کیا جائے۔ اس مدرسہ کا مدیر اور محکمۂ تعلیمات کا ناظم اعلیٰ موسیو دسوئزرلینڈ) کا ایک عالم تھا۔

اس نے طب اور فنون جنگ کی درسگاہیں بھی قائم کیں اور مختلف مقامات اور شہروں میں مدرسۃ المہندسین تاسیس کیے۔ تعلیم و تدریس کے جدید اسلوب اور تربیت یافتہ

---

[1] ایک کیلومیٹر (۱۰۸۳) گز کا ہوتا ہے۔ ۳۹۴۲ کیلومیٹر کے ۴۲۶۹۳۸۶ گز ہوئے۔

اساتذہ کی وجہ سے مصر میں بہت ہی شاندار تعلیمی انقلاب ہو گیا۔

اسی زمانہ میں عدالتیں بھی جدید اسلوب پر افتتاح ہوئیں اور ان کا انتظام درست کیا۔ بعض قوانین میں ترمیم کی اور بعض جدید آئین نافذ ہوئے۔

جدید طریقہ کی عدالتوں کے ساتھ ایک ایسی عدالت بھی تاسیس کی جس میں ہر مذہب کے منتخب علما شریک تھے اور اپنی اپنی قوم کے مقدمات کا فیصلہ مذہبی احکام کے موافق دینے کی ہدایت کرتے تھے۔ اس طرح جدید عدالتیں ایک حد تک انہی کے قبضہ و اقتدار میں تھیں۔ نوبار پاشا جو فتنہ آرمینیہ کا سرغنہ تھا اور جس سے حضرت سلطان المعظم سخت ناراض تھے اور اسمٰعیل خود بھی اس سے خوش نہ تھا، اس مجلس کا صدر تھا۔ اور چونکہ اس کی قوم نے اسے اپنا پیشوا منتخب کیا تھا اور وہ تمام عیسائیوں اور قبطیوں کا نمائندہ تھا، اس کی سیادت تسلیم کی گئی۔ زیادہ اختیارات اسی کو حاصل تھے۔

اسمٰعیل شہروں کی رونق و آرائش کا بھی شائق تھا۔ وہ اپنی رعایا کو بہت بلند معاشرت کا عادی بنانا چاہتا تھا۔ اس کی خواہش تھی کہ اس کے اہل وطن نہایت اعلیٰ طریقہ کی زندگی بسر کریں۔ وہ فطرتاً نفاست پسند تھا اور مغرب کی ہر تمدنی ادا کا دلدادہ، اس کے چہرۂ حضارت کے ہر ہر خد و خال اور زلف و ابرو کا فریفتہ۔ اس نے اپنے رہنے کے لئے خوبصورت عمارتیں اور عدالتوں کے لئے شاندار کوٹھیاں بنوائی تھیں۔ مدرسوں کے لئے پر شوکت منزلیں اور کارخانوں کے لئے جدید وضع کے مکان تعمیر کرائے تھے اور اسی پیمانہ و معیار پر شہروں کو بنانا چاہتا تھا۔ وہ اپنے سفرنامہ اسکندریہ کا ذکر کرتا ہے اس حال میں کہ اس کی دل گیر ویرانیوں سے اشک بار اور وحشت انگیز سنسانیوں کے دلدوز نظارہ سے سوگوار و فغان سنج ہے۔ وہ کہتا ہے۔

"آہ! اے عروس البلاد! اے اسکندریہ! تیری وہ شوکتیں کہاں گئیں؟ مجھے بتلا کیا تو وہی اسکندریہ ہے! تیرا وہ عیش و نشاط کیا ہوا؟ تیرے وہ تہذیب و تمدن کے ہنگامے کہاں ہیں کہ تو ایک یتیم ہے جس نے اپنے آبا و اجداد کے زمانہ میں، جس نے اپنے عہد طفلی میں عشرت

وکامرانی اور مسرت و شادمانی کی زندگی بسر کی۔ اور ان کے مرجانے سے تمھی ویران اور دنیا سے عالم کے ہاتھوں پیکر حسرت و الم اور تصویر درد و ماتم بنا دیا۔ میں کیا کہہ رہا ہوں؟ افسوس تیری حالت تو بیکس یتیموں اور بے آسرا بیوؤں سے بھی بدتر ہے!"

درد و حسرت کے یہ آنسو جو اسمٰعیل نے اسکندریہ کی عظمت و شان کے مدفن پر گرائے ہو سکتا تھا کہ ان کی جولانگاہ صرف رنج و ماتم تک وسیع ہوتی! لیکن ماتم گسار اسمٰعیل محنت و جفاکشی سے اس کی اصلاح و درستی کی طرف ہمہ تن متوجہ ہو گیا اور اسکندریہ کی حالت یہاں تک بدل دی کہ جو چہرے اس کی طرف سے موڑ لیے جاتے تھے اُس کی طرف بے اختیار پھر گئے اور جو نظریں اُس کی طرف سے ہٹالی جاتی تھیں والہانہ اُس کی طرف اُٹھ گئیں۔ اس کی تنگ و تاریک سڑکیں وسعت و روشنی سے، اس کے سنسان اور ویران کھنڈر عالی شان محلوں اور کوٹھیوں سے، اس کے خزاں رسیدہ باغ، بہار کی خوش رنگیوں سے، اس کے تاراج شدہ چمن و گلشن رونق و شوکت کی دلکشیوں سے، اس کی جاہل اور غیر مہذب آبادی تہذیب و حضارت سے عبارت ہو گئی۔ ایک زمانہ کی ویرانی و بدنصیبی کے بعد اپنا قدیم شاہانہ لباس، پوشاک کی نئی شان اور جدید تراش و خراش کے ساتھ پہن لیا۔

اس کے بعد اس نے قاہرہ کی طرف توجہ کی۔ وہ اگرچہ عاصمۂ حکومت تھا اور ایک گونہ شاندار۔ لیکن اسمٰعیل کی نظروں میں اس کی حالت بہت ہی حقیر اور ادنیٰ تھی۔ اس نے اعلان دیا کہ ہر شخص کو اس شرط پر مفت زمین دی جا سکتی ہے کہ عمارت خوبصورت بنائے اور تعمیر پر کم از کم ۲۰ ہزار فرانک خرچ کرے۔ سرکاری عمارات اور ارکان و اساطین سلطنت کے مکانات کے علاوہ اور لوگوں نے بڑی بڑی کوٹھیاں اور خوبصورت خوبصورت عمارتیں بنوائیں۔

اسمٰعیل نے فنون لطیفہ سے محبت کی۔ علوم و فنون سے عشق کیا۔ فوجوں کی اصلاح و انتظام سے لگاوٹ کی۔ یورپ سے ماہرین جنگ کو بلایا۔ آثار قدیمہ سے تعلق

گیا۔ برقی اور پیرس سے ماہرینِ آثار کی خدمات حاصل کیں۔

حاصلِ کلام

المختصر مصر انگریزی احتلال سے پہلے جس قدر ترقی یافتہ تھا اُس کی حالت جس درجہ امید افزا تھی وہ اسی قدر گر گیا اور انگریزوں نے اپنی ذاتی فوائد کے لیے اُسے اس قدر تباہ کیا، اس کی ترقی پانے والی حالت کو اس بیدردی سے پامال کیا کہ سرگزشت وحشت میں نظیر ملے تو ملے ورنہ تاریخ حضارت کے صفحات تو اس سے کم ستمرانیوں کے واقعات بھی پیش کرنے سے عاجز ہیں!

اگرچہ اس تباہی و بربادی کا ذمہ دار ایک حد تک اسمٰعیل کیا جا سکتا ہے جس نے ایک طرف مصر کو ترقی دی اور دوسری طرف اپنے اسراف و تبذیر کی غلطی و نادانی اور غیروں پر اعتبار و اعتماد سے مصر کے گلے میں ذلت و غلامی کا طوق ڈال دیا۔ لیکن جہاں اسمٰعیل مورد الزام ہے وہیں حریت و آزادی کے وہ بلند بانگ مدعی اور حقوق بشریت کے وہ خوفناک حامی بھی قابل نکوہش ہیں جن کی زبان اور عمل میں زمین و آسمان کا فرق ہے تاہم اگر دنیا سمجھتی، معمورۂ ارض کی مجموعی آبادی میں احساس باقی ہوتا تو ۱۸۸۲ء کی غاصبانہ مداخلت جس کے بعد مصر کی حالت اس درجہ دردناک ہو گئی کہ اہل بصیرت حیران رہ گئے، ایک عبرتناک سبق تھا اور دنیا کے لئے درس بصیرت!

●● (جون، جولائی ۱۹۳۰ء)

پریس کمیونک

اخبار "زمیندار" مورخہ ۲۵ فروری ۱۹۲۱ء میں ایک آرٹیکل جس کی کچھ اصلیت نہیں ہے طبع ہوا تھا اور وہی مضمون اخبار "ہندوستانی" مورخہ ۱۰ مارچ ۱۹۲۱ء میں دوبارہ شائع ہوا اس سے مسلمانوں کے فرقہ اہل تشیعہ میں اس خیال سے کہ نجف اشرف پر گولہ باری ہوئی تھی، سخت تشویش پیدا ہو گئی ہے۔ گورنمنٹ ہند نے اس معاملہ میں بغداد سے نہایت احتیاط سے تحقیقات کی ہے جس کی بنا پر جناب ہز ایکسیلنسی سر ہارکورٹ بٹلر بالقابہ نے ایک وفد کے روبرو جو ۱۵ مارچ کو پیش ہوا ان افواہوں کی تردید کی۔ صاحب موصوف نے جو بیان فرمایا ہے وہ حسب ذیل ہے:

"حاضرین! بعد خط و کتابت گورنمنٹ ہند مجھ کو اس امر کی اطلاع دیتے ہیں بہت خوشی ہے کہ جو افواہیں مجتہدوں کو زہر دیئے جانے اور نجف کے مقدس مقامات پر سرکار برطانیہ کی جانب سے گولہ باری ہونے کے متعلق پھیلائی گئی ہیں اس کی کوئی بنیاد نہیں ہے۔ یہ دونوں بیانات بالکل غلط ہیں۔ صرف دو مجتہد بوجہ ضعیف العمری اور عرصہ تک بیمار رہنے کے بعد فوت ہوئے ہیں، زہر دیئے جانے کا مطلق شبہ نہیں اور نہ نجف پر سرکار برطانیہ کی فوج نے یا کسی دیگر فوج زیر تحت برٹش افیسر نے گولہ باری کی ہے۔

افواہ مذکور یقیناً بدمعاش لوگوں نے محض اس غرض سے پھیلائی ہے کہ آپ لوگوں کی سرکار کے ساتھ خیر خواہی میں حرف آئے۔ مجھ کو اس امر کی بہت خوشی ہے کہ میں آپ لوگوں کی اس تشویش کو دور کر سکا۔"

(مارچ ۱۹۲۱ء)

۵۵

مطلب حسین

فلسفۂ انقلاب

انسانی فطرت کا مقتضیٰ یہ ہے کہ انسان اپنی حالت اور اپنے گردوپیش کے حالات میں تبدیلی پیدا کرتا رہے۔ اس کلیہ پر تمام افراد، انفرادی اور مجموعی دونوں طرح سے عامل ہوتے ہیں۔ افراد جن کو ملکی، مذہبی، تمدنی حالت سے کوئی بحث نہیں ہوتی اور جن کی زندگی کا ورق بالکل سادہ ہوتا ہے وہ بھی اس کلیہ سے مستثنیٰ نہیں۔ غریب سے غریب اور جاہل سے جاہل شخص کے دل میں بھی یہ خواہش موجود ہے کہ کسی طرح وہ اپنی حالت کو پہلے سے بہتر بنائے۔ اس طبقہ سے قطع نظر کرکے متوسط درجہ کے لوگوں پر نظر کرنے سے معلوم ہوگا کہ جب یہ لوگ دوسرے ممالک کی ترقی کرنے والی قوموں اور ترقی یافتہ افراد کے کارناموں پر غور کرتے ہیں، تو ان کو اپنی زندگی بالکل پھیکی اور بے مزہ معلوم ہوتی ہے۔ وہ دیکھتے ہیں کہ خود اُن کے ملک میں ایسے افراد موجود ہیں، جو میدان ترقی میں سرگرم رفتار ہیں۔ یہ باتیں دیکھ کر اُن کے دل میں اُمنگیں پیدا ہوتی ہیں اور وہ بھی امکانی کوشش کرتے ہیں۔ یہاں سوسائٹی کے اعلیٰ افراد کا ذکر ہم اس وجہ سے نہیں کرتے کہ وہ عموماً ترقی کر چکے ہوتے ہیں اور اُن کے دلوں میں وہ پہلی سی اُمنگ باقی نہیں رہتی جو انقلاب کے لئے انتہا ضروری ہے۔

خواہش انقلاب قدرتی ہے۔ جب انفرادی حیثیت سے افراد میں بھی یہ خواہش اتنی زبردست ہوتی ہے، تو جماعتوں کا کیا ذکر ہے۔ جماعتیں مجموعہ ہوتی ہیں چند افراد کا۔ افراد کی قوت اجتماعی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ گو ایسی جماعتوں میں افراد کی نہایت قلیل تعداد شامل ہوتی ہے، لیکن اس سے یہ سمجھ لینا کہ جماعت کی قوت بھی کم اور دائرہ عمل محدود ہے، نہایت خوفناک اور خلاف واقعہ ہے۔

بعض رہنما یہ دیکھتے ہیں کہ ایک جماعت کے افراد یا کئی جماعتیں متحدہ طور سے انقلاب کی فکر کرتے ہیں، تو وہ دوسری ایسی جماعتوں کو مقابلہ کے لئے تیار کرتے ہیں جو مدعیوں سے کہیں زیادہ طاقتور ہوتی ہیں اور اس خیال خام میں مست رہتے ہیں کہ انقلاب پسند جماعت کے خلاف دوسری قوتیں کام کر رہی ہیں اور اس طرح خطرے کا احتمال نہیں۔ لیکن زمانہ ان کی غلطی ثابت کر دیتا ہے اور صفحات تاریخ ایسے بدقسمت

پر خون کے آنسو بہاتے ہیں۔

ان بد قسمتوں کی ناکامی کے کئی اسباب ہوتے ہیں۔ اکثر تو یہ ہوتا ہے کہ انقلاب پسند جماعتیں مدتوں پہلے سے اپنے نظام عمل کو مرتب کر لیتی ہیں اور تمام کارروائی اس خفیہ طریقہ سے کی جاتی ہے کہ یہ نہیں معلوم ہوتا کہ وہ اپنا اصلی کام کب شروع کریں گی۔ انقلاب پسند جماعت اپنے حریفوں کے حرکات و سکنات کا اور خاص کر ان باتوں کا علم حاصل کرتی رہتی ہے جس کا تعلق خود ان سے ہوتا ہے اور اس طرح وہ نہایت خاموشی سے حریفوں کی چالوں کو رد کر دیتی ہے۔

اگر ملک میں کہیں شورش ہوئی یا اس قسم کے قوانین جاری کیے گئے، جن سے رعایا میں بددلی پیدا ہوئی تو انقلاب پسندوں کو بہت مدد ملتی ہے اور انکی جماعت بہت طاقت حاصل کر لیتی ہے۔ صرف یہی نہیں، بلکہ ایسا بھی ہوتا ہے اور دیکھا گیا ہے کہ اہل ملک تبادلۂ قانون یا کسی اور وجہ سے بددل ہوتے ہیں اور اس بنا پر تبادلۂ گورنمنٹ کی فکر کرنے لگتے ہیں اور جب انقلاب پسندوں کا علم فضائے سیاست پر لہراتا ہے، تو وہ اس کے سایہ کو غنیمت سمجھ کر ان کی ہر طرح مدد کرتے ہیں۔

بغاوت کے اسباب اوپر بیان ہو چکے۔ اب اُنیسویں صدی سے پیشتر کے سخت ترین انقلاب کے واقعات پر نظر ڈالنا مفید ہوگا۔ فرانس میں انقلاب ہونے سے قبل وہاں کی سیاسی، تمدنی اور مذہبی حالت پر ایک سرسری نظر ڈالنا مناسب ہے۔ انقلاب فرانس سے پہلے وہاں ایسے وزرا اور بادشاہ گذر چکے ہیں، جنہوں نے ملک سے آزادی و جمہوریت پرستی کی جڑ تک اکھاڑ ڈالنا چاہی تھی۔ یہ لوگ اپنے مقصد میں کامیاب ہوئے۔ لیکن ان وزرا کا جن میں ایک رشلو اور دوسرا میزرین تھا زبردست ہاتھ اُٹھ جانے پر وہاں کی تمدنی حالت بہت خراب ہو گئی۔ لوئی چہاردہم (۱۶۴۳ - ۱۵۱۷ء) جب تخت حکومت پر بیٹھا ہے، تو اس نے شخصی حکومت کے نشہ میں چور ہو کر آزادی اور جمہوریت پرستی کا نام تک مٹا دینا چاہا۔ لیکن حکومت رعایا کے دلوں اور دماغوں پر قبضہ نہیں کر سکی۔ اسی وجہ سے بے اطمینانی کی آگ برابر سلگتی رہی اور آخر کار ۱۷۹۳ء میں اس آگ نے شخصی حکومت کو جلا کر خاکستر کر دیا۔

انقلاب کی حالت میں اکثر یہ ہوتا ہے کہ انقلاب پسندوں کا زور رفتہ رفتہ کم ہونے لگتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جمہور مدت تک معاشرتی اور تمدنی مصائب برداشت کرتے کرتے اُکتا جاتے ہیں اور ان کے دل میں فطری طور پر دوسرے انقلاب کی خواہش پیدا ہو جاتی ہے۔ ایسے موقعوں پر دور اندیش اور فطری رہنما جمہور کی

باگ اپنے ہاتھ میں لے لیتا ہے اور مختلف جماعتوں کو آپس میں ٹکرا کر ان کی قوتوں کو زائل کرنا شروع کرتا ہے۔ جب وہ تمام جماعتیں اس طرح کمزور ہو لیتی ہیں، تو وہ اُس جماعت کو جس پر اس کا پورا قبضہ ہوتا ہے طاقتور بنانے لگتا ہے۔ آخر کار اس کی طاقت اتنی زبردست ہو جاتی ہے کہ تمام ملک اس کے سامنے سر تسلیم خم کر دیتا ہے۔

جب یہ نیا رہنما جو درحقیقت بے تاج کا تاجدار ہوتا ہے، پوری طاقت حاصل کر لیتا ہے، تو تمام جماعتیں اس کے تمام تر افعال کو ایک عرصہ تک خاموشی سے جانچتی رہتی ہیں۔ موافق جماعتیں تو اس کے ہاتھ میں آلۂ بیجان کے مانند ہوتی ہیں۔ لیکن مخالف جماعتیں موقع کی تاک میں رہتی ہیں اور اس رہنما کے فعل کو نکتہ چینی کی نظر سے دیکھتی ہیں۔ اگر رہنما کے کسی فعل سے بھی کوئی کمزوری نہ نمایاں ہوئی، تو ان تمام مخالف جماعتوں کا از خود استیصال ہو جاتا ہے اور اگر رہنما کے افعال سے ذرا بھی کمزوری ظاہر ہوئی تو مخالف جماعتیں خفیہ طریقوں سے قوت حاصل کر کے پھر انقلاب برپا کرتی ہیں۔

غیر فطری رہنماؤں سے ایسے موقعوں پر اکثر لغزشیں ہو جاتی ہیں۔ ایسا بھی ہوتا ہے کہ کچھ لوگ یا صرف دو ایک آدمی ایسے پیدا ہو جاتے ہیں جو رہنما پر حاوی ہو جاتے ہیں اور اس طرح طاقت ایک مرکز پر مجتمع نہیں رہتی بلکہ منقسم ہو جاتی ہے۔ مخالف جماعتیں اس کو فوراً تاڑ لیتی ہیں۔ رہنما اپنی کمزوری سے کسی بات پر یا کسی وجہ سے جھلا کر اکثر ایسے احکام صادر کرنے لگتا ہے، جو سراسر ناانصافی پر مبنی ہوتے ہیں۔ یہ طفلانہ حرکتیں کسی طرح چھپائے نہیں چھپ سکتیں۔ ان دونوں صورتوں میں مخالف جماعتیں بہت فائدہ اٹھاتی ہیں اور ان موقعوں سے فائدہ اٹھا کر اپنے مقاصد میں کامیاب ہو جاتی ہیں۔

جس زمانہ میں فرانس میں انقلاب کا طوفان برپا تھا اس وقت ایک فطری رہنما ظاہر ہوا۔ یہ رہنما نپولین اعظم تھا۔ اس نے رفتہ رفتہ تمام مرکزی طاقت کو اپنی مٹھی میں لے لیا۔ لیکن اپنی محنت، موقع شناسی اور فطری قابلیتوں سے مخالفین کو اُس نے اتنا موقع نہ دیا کہ وہ ذرا بھی سر اُٹھا سکتے۔ یہی راز تھا جس نے اسے کامیاب رکھا۔

تاریخ کے اوراق اور زمانہ کی آواز شاہد ہیں کہ انقلاب کے بانی صرف چند افراد خصوصاً ایسے افراد ہوتے ہیں جن کو انقلاب سے پورے طور پر متمتع ہونے کی امید ہوتی ہے۔ وہ انقلاب سے خاطر خواہ نفع حاصل کرتے ہیں۔ اس قلیل مگر کامیاب جماعت سے قطع نظر کر لیجئے تو معلوم ہوگا کہ آبادی کے ایک حصہ کثیر کو انقلاب سے بہت نقصان پہنچا ہے۔ لیکن سوال یہ ہوتا ہے کہ آیا اس انقلاب کے

رد کرنے کے کیا وسائل ہیں' جو دفعۃً اُبل پڑتا ہے۔ اس کا جواب مختصر الفاظ میں یہ ہو سکتا ہے کہ زمانہ کی نبض شناس صرف چند منتخب تجربہ کار اور دور اندیش ہستیاں ہی ہوتی ہیں۔ ان ہستیوں کا فرض ہے کہ ہر طرح انقلاب پسندوں کی جماعت کا زور توڑنے کی فکر کریں۔ اس کا سب سے زیادہ آسان طریقہ یہ ہے کہ حامیانِ انقلاب کو مجتمع نہ ہونے دیا جائے اور کسی حال میں بھی یہ لوگ ایک دوسرے سے ملکر اجتماعی طاقت حاصل نہ کرنے پائیں۔ دوسرے یہ کہ مخالفین انقلاب کو بھی اپنی طاقت پر پورا بھروسہ ہو اور وہ اپنی طاقت کو موقع موقع سے استعمال کریں۔ ([illegible] ۱۹[illegible]ء)

●●

کشن پرشاد کول

سوشلزم

(۱)

تمہید : دنیا کی نیرنگیاں ضرب المثل ہیں۔ یہ کسی ایک کروٹ چین نہیں لیتیں۔ اس معنی میں بالکل صحیح ہے کہ کسی دورِ تہذیب کو دائمی استحکام میسر نہیں۔ ایک زمانہ تھا کہ یونانی تہذیب کا آفتاب نصف النہار پر تھا۔ پھر اہلِ روما نے نہ صرف اپنی فتوحات بلکہ اپنی شائستگی اور تہذیب کا سکہ تقریباً تمام عالم پر بٹھایا۔ یہ زمانہ بھی گذر گیا اور ساسانی دور میں اسلامی تہذیب کو وہ معراجِ ترقی نصیب ہوئی کہ جس نے نہ صرف ایشیا، بلکہ ایک حد تک اہلِ یورپ سے بھی اپنا لوہا منوا لیا۔ ادھر ہندوستان کے قدیم فلسفہ اور تہذیب نے اہلِ مشرق پر اپنا وہ سکہ بٹھایا تھا کہ اس کی یادگاریں باوصف صدیوں گذر جانے کے اب تک نہیں مٹنے پائیں۔ لیکن یہ سب دور اب گذشتہ بلکہ اور قصۂ ماضی ہیں۔ جہاں تک کہ زمانۂ حال اور مابعد کا تعلق ہے بلاخوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ آثارِ زمانہ بتلا رہے ہیں کہ فتح و نصرت کا سہرا اسی دورِ تہذیب و تمدن کے سر بندھا نظر آتا ہے کہ جس کا جادو اس وقت نہ صرف مغرب پر پوری طور سے چل رہا ہے بلکہ جس کا چرچا چار دانگ عالم میں ہو رہا ہے اور جس کو ہم یورپین تہذیب کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ ان کروڑوں اہلِ ہنود اور اہلِ اسلام کے لئے کہ جو اپنی گذشتہ عظمت اور تہذیبِ پارینہ پر جائز طور سے فخر کرتے ہیں اور جن کے دلوں میں اس کے از سرِ نو زندہ کرنے اور فروغ دینے کے ارمان سینے سے نکلنے کے لئے تڑپ رہے ہیں یہ سننا یا باور کرنا کہ ماضی سے قطع نظر کر کے حال و مستقبل ان کے امکان اور قابو کے باہر ہے اور انہیں زندہ رہنے اور ابھرنے کے لئے ایسی تہذیب و تمدن کے سامنے سر جھکانا ہے کہ جسے وہ غیریت اور رقابت کی نظروں سے دیکھتے ہیں بجز تکلیف و اذیت پہنچانے کے باعثِ اطمینان نہیں ہو سکتا۔ تاہم بدیہی واقعات اور حقیقتِ حال سے چشم پوشی کرنا اور اپنے تئیں دھوکہ میں رکھنا کسی حالت میں سودمند نہیں ثابت ہوگا۔ یوں تو انگریزی دورِ حکومت کے ساتھ ہی ساتھ جس دن سے مغربی تہذیب نے ہندوستان میں رواج پانا شروع کیا اسی روز سے ہمارے تعصبات اور کوتاہ اندیشی نے اس کی طرف سے

عوام الناس میں طرح طرح کی بدگمانیاں پیدا کر دی تھیں۔ تاہم تعلیم یافتہ طبقہ کے آزاد خیال اور اعلیٰ ہمت افراد قوم نے اس دور کی اہمیت اور حقیقت کا اندازہ کر کے اس کا خندہ پیشانی سے خیر مقدم کیا اور نئے خیالات اور نئی تحریکوں کو فروغ دے کر قوم کو آج اس قابل بنایا کہ وہ بھی دوسری مہذب قوموں کے دوش بدوش شاہراہ ترقی پر قدم بڑھائے چلی جا رہی ہے اور حوصلہ و ہمت کی نگاہیں منزل مقصود کو قریب تر کرتی جاتی ہیں۔

باوصف اس کے قوم کے نہ صرف عوام الناس بلکہ تعلیم یافتہ جماعت کی بھی کثیر تعداد میں ابھی تک اس نئی تہذیب و تمدن کی جانب سے بیشمار بدگمانیاں باقی ہیں اس کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ جہاں غیر ملکی حکومت کی بے عنوانیوں اور زیادتیوں نے اور اکثر مغرور اور بدتمیز اینگلو انڈین حضرات کی فرعونیت نے رعیت کے دل دکھا کر چھوڑ دیئے ہیں، وہیں اس تہذیب و تمدن کی خوبیوں اور سچائیوں کی جانب سے بھی ہندوستانیوں کو بدظن کر دیا ہے کہ جس کا تعلق ان کی قوم اور ملک سے ہے۔ پھر اس ہنگامۂ قیامت خیز نے کہ جو سرزمین یورپ پر تقریباً ۵ سال برابر برپا رہا اس مغربی تہذیب و تمدن کے عیوب کو کچھ اس طرح چن چن کر دکھلایا کہ دنیا کی نظروں سے اس کا روشن پہلو تو بالکل اوجھل ہو گیا اور تاریک رُخ نہایت مہیب اور بھیانک شکلیں بنا بنا کر ہم کو سہماتا رہا۔ لابدی طور پر اس کا یہ نتیجہ نکلنا چاہیئے تھا کہ لوگ مغربی تہذیب و تمدن کی ایسی بھیانک شکلیں دیکھ کر اس سے خائف و بیزار ہو جائیں۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا اور جو لوگ کہ پہلے سے ہی اس کی جانب سے بدگمان تھے ان کو آج یہ کہنے کا موقع ملا کہ اس "مادہ پرستی" اور "ناخدا ترسی" کی تہذیب کا حشر بجز اس بربادی اور تباہی کے کہ جو پچھلے ۵ سال میں دیکھنے میں آئی اور جس کا سلسلہ ابھی ختم ہونے پر نہیں آتا اور کیا ہو سکتا تھا۔ مغربی تہذیب و تمدن کے خلاف جو ناموافق فیصلہ اس وقت صادر کیا جا رہا ہے وہ ایک حد تک تو برحق ہے، لیکن زیادہ تر نا واجب۔ اگر اس کا منشا یہ ہے کہ ان لوگوں پر کہ جو یورپین تہذیب و تمدن کے دلدادہ اور فریفتہ ہیں یہ واضح کیا جاوے کہ اس تصویر کا علاوہ روشن رخ ہونے کے ایک تاریک پہلو بھی ہے اور اس کی شائستگی کے دامن پر بھی بہت سے ایسے کثیف اور بدنما داغ لگے ہوئے ہیں کہ جن کو اگر فوراً ہی دھو نہ ڈالا گیا تو اس کے متن کا وہ اُجلا رنگ کہ جو اب تک دیدہ زیب رہا ہے، قائم نہیں رہ سکتا یا یہ کہ اس جید تناور اور سایہ دار درخت کی جڑوں میں جو جا بجا گھن لگ رہا ہے اگر اسے فوراً ہی دور نہ کیا گیا، تو پھر اس کا کھڑا رہنا دشوار بلکہ غیر ممکن ہو گا۔ تب تو ہم کو اس سے اختلاف کرنے کی کوئی وجہ نہیں۔ لیکن اگر اس ناموافق فیصلہ صادر کرنے کے معنی یہ ہیں کہ آپ اس نئے تہذیب و تمدن کو

کلیتہً رد و باطل قرار دیتے ہیں اور اس کے مقابلہ میں زمانۂ پارینہ کے ان دوروں کو از سرِ نو زندہ کرنے کے متوقع اور دعویدار ہیں کہ جن کو پیوندِ خاک ہوئے بھی آج صدیاں گذر گئیں، تو ہم اس سے اتفاق نہیں کر سکتے۔

سائنس کی نئی معلومات نے پچھلے ڈیڑھ سو برس میں جو حیرت انگیز انقلاب زندگی کے ہر شعبہ میں پیدا کر دیا ہے، دنیا کی معلومات میں جیسا کچھ اضافہ کیا ہے، وسائل سفر و بین الاقوامی ارتباط میں جیسی کچھ آسانیاں پیدا کر دی ہیں اور ہمارے آرام و آسائش کے سامان مہیا کئے ہیں وہ آج تمام عالم کی تحسین و استعجاب کا باعث ہو رہے ہیں۔ اسی طرح سے دخانی و برقی قوت کے ذریعہ سے مشنری کے عام طور سے رواج پانے نے دنیا کے مال و اسباب میں جو اضافہ کیا ہے، اور پریس کے وسیلہ سے جمہور کے علم و آزادی کا دائرہ جیسا کچھ وسیع ہوا ہے وہ محتاجِ بیان نہیں۔ پھر نظامِ حکومت میں دستورِ نیابت کے جاری ہونے سے دنیا کی روشِ سیاست کی جیسی کچھ کایا پلٹ ہوئی ہے، اور عوام الناس کی حیثیت اور اقتدار میں جو خاطر خواہ فرق نمایاں ہے، کون کہہ سکتا ہے کہ یہ ہماری آئندہ ترقی و بہبودی کی بہترین ضمانت نہیں۔ منجملہ دیگر اسباب کے یہ چند باتیں ہیں کہ جو مغربی تہذیب و تمدن کو پرانے دوروں پر فوقیت اور فضیلت کا مرتبہ دیتی ہیں کیا تاریخ ماضی و حال کی شہادت کی بنا پر اس دعوے کی تردید کی جا سکتی ہے؟ چونکہ گذشتہ طوفانِ جنگ میں جان و مال کے برباد کرنے کے لئے سائنس کی معلومات سے بھی مدد لی گئی تھی اس لئے اس تمام ترقی و تہذیب پر کہ جو آج سائنس کی بدولت میسر ہوئی ہے خاک ڈالنا، چونکہ فیکٹریوں، کانوں اور کارخانوں میں مزدور پیشہ ان دیکھی حالت سرمایہ داروں کی حرص و ہوس کے باعث ابھی تک زبوں تر ہے، لہٰذا دنیا کے تمام اس مال و اسباب دولت و حشمت کو کہ جو آج مشنری کے رواج پانے اور دخانی و برقی قوت کے بدولت دنیا کے کثیر حصہ جمہور کے آرام و آسائش کا باعث ہے قابلِ نفریں ٹھہرانا یا عوام الناس کی تعلیم، پریس کی آزادی اور جمہوری طرزِ حکومت کو اس بنا پر مردود کرنا کہ ہندوستان میں ہم کو اب نوکر اور خدمتگار بدقت میسر آتے ہیں، ملک میں انارکسٹ پیدا ہوتے جاتے ہیں اور یورپ میں بالشوزم کا طوفان برپا ہو رہا ہے، قرینِ انصاف نہیں۔ یہ اعتراض البتہ جائز طور سے کیا جا سکتا ہے کہ اس تہذیب و تمدن کی اکثر نعمتوں اور برکتوں کا ہم نے بعض حالتوں اور صورتوں میں بیجا استعمال کیا ہے۔ آزادی برابری اور برادری کے ان اصولوں کو کہ جن پر نئی تہذیب کی بنیاد رکھی گئی ہے ابھی اور زیادہ وسعت دینے کی ضرورت اور گنجائش ہے اور باوصف اس کے کہ ہمارے اصول ومقاصد نہایت اعلیٰ وارفع

اور ہمارے مقاصد اچھے اور سچے ہیں۔ دنیا میں اب بھی خود غرضی اور بے ایمانی، حرص و طمع، فساد و عناد، جبر و تشدد کافی طور پر موجود ہے کہ جس کے مٹانے کے لئے از سرِ نو کوشش بلیغ کی ضرورت ہے۔ لیکن اس سے یہ نتیجہ نہیں نکالا جا سکتا کہ یورپ کی خانہ جنگی نے جو صدمہ مغربی تہذیب و تمدن کو پہنچایا ہے وہ اس کا پیمانۂ عمر لبریز کر کے چھلکا دیا اور اب اس کی زندگی کے دن قریب اختتام ہیں۔ دورانِ جنگ اور اس کے بعد سے جو جذبات اور خیالات، تحریکیں اور کوششیں یورپ کے باخبر حلقوں میں ظہور میں آرہی ہیں جس بے چینی کے ساتھ صاحب دماغ اہلِ فرنگ سوسائٹی کی از سرِ نو شیرازہ بندی کے اصول و قواعد کا رد و قدح کر رہے ہیں، سیاسیات کی بنیادیں جس طرح پر سنبھالی جا رہی ہیں۔ نئے نئے اصولوں کی اشاعت اور تازہ ترین خیالات و جذبات کا نشو و نما آج وہاں جس طرح ہو رہا ہے اور قومیں زندگی اور ابھرنے کے ارمان جس تڑپ کے ساتھ نکالنے پر آمادہ ہیں، یہ سب امور اس بات کی دلیل اور ضمانت ہیں کہ مغربی تہذیب و تمدن کا بول بالا ابھی عرصہ تک رہے گا اور دنیا کا مستقبل اس کے ساتھ وابستہ ہے۔

برطانوی تسلط اور برطانوی عہد حکومت سے ہندوستان کو اور کچھ فائدہ پہنچا ہو یا نہ پہنچا ہو اس بحث سے تو اس موقع پر ہم کو سروکار نہیں لیکن یہ امر یقینی ہے کہ انگریزی اور حکومت نے ہندوستان کو جگا دیا اور یورپ کی ساددھی سے جگا کر جیتی جاگتی دنیا میں پھر ایک مرتبہ لا کر کھڑا کر دیا جس کے معنی یہ ہیں کہ دنیا کی عروج و ترقی کی جدوجہد میں یہ ملک بھی اب علیحدہ اور ساکت کھڑا نہیں رہ سکتا۔ اگر اس کو اپنی ہستی قائم رکھنی ہے تو کشمکش عالم میں اس کو بھی ہاتھ پیر مارنے پڑیں گے اور شاہراہ ترقی پر چلنا پڑے گا۔ جو حوادث و سوانح کہ مغرب میں گذر رہے ہیں کل ہم کو بھی ان کا سامنا کرنا ضروری ہوگا۔ لہٰذا معمولی سمجھ کی بات ہے کہ ہم خواب غفلت سے بیدار ہو کر ان خیالات و جذبات اور ان تحریکوں اور کوششوں سے کہ آج یورپ میں رونما ہو رہی ہیں واقف ہونے کی کوشش کریں اور سوسائٹی کی از سرِ نو شیرازہ بندی کے جدید اصولوں امن و صلح قائم کرنے کی ان پیش بندیوں اور نظام حکومت کے ان مباحث اور مشوروں میں کہ جو مغربی تہذیب و تمدن میں نئی اور تازی روح پھونکنے کی غرض سے پیش کئے جا رہے ہیں کافی اور عملی حصہ لیں۔ کم از کم غور و فکر اور باہمی بحث و مشورے کے بعد اپنے لئے صحیح راستہ تجویز کر لیں تاکہ آئندہ کی منزلیں آسان ہو جاویں۔

مغربی تہذیب و تمدن کے نکتہ چین تو اس کی گردن پر گناہوں کا ایسا بھاری بوجھ لادتے ہیں کہ جس کی وہ کسی حالت میں سزاوار نہیں تاہم اس کے بعض پہلو ضرور ناخوشگوار صورتیں ظاہر کرتے ہیں اور اس کے

اعتراف کرنے میں تکلف نہ ہونا چاہیئے کہ جہاں اس نے زندگی کے بہت سے دشوار مسائل اور اُلجھی ہوئی گتھیوں کو نہایت خوش اسلوبی سے سلجھایا ہے بعض اُلجھنوں کے دور کرنے میں ایسی ٹھوکریں بھی کھائی ہیں کہ جو اس کے لئے باعث شرم ہیں۔ راقم الحروف کی رائے میں مغربی تہذیب جن مسائل کے خاطر خواہ طے کرنے میں اسوقت تک ناکام رہی ہے اور جو اس وقت اس کے ترقی کے راستہ میں حائل ہو رہے ہیں حسب ذیل تقسیم کئے جا سکتے ہیں۔ (۱) مسئلہ زر و زمین یعنی دنیا کے مال و دولت کی واجبی اور حصہ رسدی تقسیم یا دوسرے الفاظ میں سرمایہ داروں اور مزدور پیشہ طبقہ کے قضیوں کا واجبی فیصلہ۔ (۲) آزادی اناث یعنی عورتوں اور مردوں کے تعلقات میں تامنصفانہ برتاؤ کے دستور کی اصلاح اور عورتوں کے واجبی سوشل اور پولیٹکل حقوق کی دادرسی (۳) فرنگی سلطنتوں کے اپنی محکوم ایشیائی یا افریقی رعایا کے ساتھ غیر واجبی اور نامنصفانہ برتاؤ کی اصلاح (۴) تجارت پھیلانے اور دولت کمانے کی دھن میں پسماندہ قوموں کے ساتھ زیادتی اور ظلم کا دُور کرنا جہاں تک کہ آخرالذکر دو امور کا تعلق ہے ان پر ہماری فوری توجہ ضروری اور لازمی نہیں کیونکہ جس حالت میں کہ ہم خود ابھی دوسروں کی محکومی سے آزاد نہیں اور تجارتی اور اقتصادی حالات کے لحاظ سے بہت پیچھے ہیں، تو اس کا اندیشہ خواب پریشاں سے زیادہ نہیں کہ ہم دوسروں پر دست تظلم دراز کر سکیں گے اور جو بدعتیں کہ فرنگی قوموں نے حکومت اور تجارت کی دھن میں ایشیا اور افریقہ کی بدنصیب اور بیچارہ قوموں پر ڈھائی ہیں۔ ہم بھی انہیں سے اپنا دامن آلودہ کریں گے۔ زر، زمین، زن کے مسائل البتہ ایسے اہم، دشوار اور پیچیدہ واقع ہوئے ہیں کہ روز ازل سے جو یہ گتھیاں اُلجھی ہیں تو آج تک سلجھانے میں نہیں آئیں۔ ہر سوسائٹی کی شیرازہ بندی کے لئے ان کی واجبی ترتیب نہایت ضروری اور لازمی ہے۔ اہل مغرب اس وقت جبکہ وہ اپنے نظام معاشرت کی ترتیب از سر نو کر رہے ہیں اور اپنے تہذیب و تمدن میں تازہ اور نئی روح پھونک رہے ہیں انہیں مسائل کو سب سے زیادہ فوقیت دیتے اور انھیں پر غور و فکر کرنے میں دماغ لڑا رہے ہیں۔ اوّل تو آج بھی ہمارے قوم و ملک کو ان مسائل کی پیچیدگیوں کی جانب سے بے فکری نہیں، بلکہ یہ یاد رہے کہ جوں جوں زمانہ گذرتا جاوے گا اور ہم نئے خیالات اور نئی تہذیب سے متاثر ہوتے جاویں گے، ان مسائل کی دشواریاں روز افزوں ہوتی جائیں گی۔ لہٰذا قرین مصلحت ہے کہ ہم ابھی سے ان پر کافی توجہ مبذول کریں اور واقف ہوں کہ وہ لوگ کہ جو اسوقت تہذیب و تمدن کی رفتار میں سب سے آگے ہیں ان کے خیالات و جذبات کیا ہیں؟ وہ کن اصولوں پر چل رہے ہیں؟ انھوں نے ان گتھیوں کے سلجھانے کی کیا سبیلیں سوچی ہیں اور

سوسائٹی کے شیرازہ باندھنے اور اس کے منتشر ہونے کی کیا ترکیبیں نکالی ہیں۔ اسی خیال کو مدنظر رکھ کر یہ ارادہ کیا گیا ہے کہ "صبح امید" کے آئندہ نمبروں میں Labour اور Sex prob-lem پر ایک سلسلہ مضامین شائع کیا جاوے کہ جو اردو دان پبلک کی واقفیت اور دلچسپی کا باعث ہو۔ چونکہ پہلے Labour Problem سے شروع کریں گے لہذا اس مضمون کا عنوان سوشلزم قرار دیا گیا ہے

سترھویں صدی کے ان انقلابات حکومت نے کہ جو انگلستان میں ۱۶۴۹ء اور ۱۶۸۸ء میں ظہور پذیر ہوئے آئینی و جمہوری حکومت کی وہ نئی راہیں نکالیں کہ جن کے وسیلہ سے اہل مغرب نے اٹھارھویں صدی میں انقلاب فرانسیسی اور امریکن جنگ آزادی کی مختلف منزلیں طے کر کے انیسویں صدی کے اختتام تک آئین و طریق حکومت کو اس حد تک بدل ڈالا کہ اس وقت تمام یورپ اور امریکہ میں جمہوری حکومت کا دور دورہ ہے۔ اس کا ماحصل یہ کہا جا سکتا ہے کہ قوت و اقتدار حکومت روسا کے اعلیٰ طبقہ سے نکل کر متوسط درجہ کے لوگوں کے ہاتھوں میں آ گیا۔ نہ صرف یہی بلکہ جہاں تک کہ ووٹ دینے کا تعلق ہے عوام الناس بھی نیابتی طرز حکومت کے فیض سے محروم نہیں رہے۔ تاہم باوصف اس کے کہ عوام الناس کو اس وقت تمام مغربی ممالک میں ووٹ دینے اور حکومت پر اپنا کافی اثر ڈالنے کا موقع حاصل ہے اس امر سے چشم پوشی نہیں کی جا سکتی کہ اصلی قوت و اقتدار حکومت متوسط درجہ کے لوگوں میں اب تک محدود ہے۔ ماسوا یہ بھی امر واقعی ہے کہ اس جمہوری طرز حکومت اور دنیا کی ترقی مال و دولت نے جہاں تک کہ ادنیٰ درجہ کے عوام الناس کا تعلق ہے ان کی جسمانی یا اخلاقی حالت کو بہت کم نفع پہنچایا ہے اور وہ اب بھی اسی قعر ذلت میں پڑے ہوئے ہیں کہ جس میں پیشتر تھے۔ وسط انیسویں صدی میں درحالیکہ سیاسی اور اقتصادی انقلابات کے اثرات کافی ظاہر ہو چکے تھے جب عوام الناس نے یہ محسوس کیا کہ ان سے ان کی حالت میں کچھ زیادہ فرق یا بہتری نمایاں نہیں ہوئی اور نہ ہوتی نظر آتی ہے تو لازمی طور سے ان میں بے اطمینانی اور وحشت پیدا ہونے لگی اور اعلیٰ اور متوسط طبقوں کے خلاف نفرت اور مخالفت کے جذبات اور تحریکیں نمایاں ہونی شروع ہوئیں۔ جن خیالات و جذبات نے اصولوں و طریقوں نے باقاعدہ اور مستقل تحریک کی شکل اختیار کی اور عوام الناس کے دلوں کو مسخر کر کے ان پر اپنا پورا سکہ جما یا وہ آج سوشلزم کے نام سے موسوم کی جاتی ہے۔

سوشلزم کو اگر اس کے وسیع معنوں میں استعمال کیا جاوے تو اس کا اطلاق ہر اس تحریک پر ہو سکتا ہے کہ جس کا مدعا اور مقصد یہ ہو کہ حکومت اور سوسائٹی کو ایسے سانچوں میں ڈھالا جاوے کہ جس سے تمام زر و زمین اور مال و اسباب کا تمام رعیت اور افراد قوم میں بلا کسی تفریق کے برابر سے تقسیم ہونا ممکن اور لابدی ہو۔ مختصراً سوشلزم کی غرض یہ ہے کہ امیر و غریب کی موجودہ تفریق مٹا دی جاوے اور قوم و ملک کا سب زر و دولت برابر سے تقسیم کیا جاوے۔ سوشلزم اپنے محدود معنوں میں صرف اُس تحریک کے لئے استعمال کیا جاتا ہے اور اس کو collectivism بھی کہتے ہیں) کہ جس کا اصول و مقصد یہ ہے کہ تمام زر و زمین بجائے انفرادی ملکیت ہونے کے حکومت کی ملکیت قرار دیجائے اور اس کے قبضہ میں رہے۔ تمام صنعت و حرفت اور تجارت پر حکومت کا قبضہ اور قابو ہو اور حکومت ہی تمام اشیاء اور ملک کی تقسیم حصہ رسدی کیا کرے۔ یعنی ہر شخص کو اس کی محنت اور مزدوری کے مطابق معاوضہ دیا جاوے۔ معاوضہ ضروریات زندگی یا استعمالی چیزوں کی شکل میں ہو سکتا ہے نہ کہ زر و زمین کی شکل میں کہ جس سے کوئی شخص روپیہ پیدا کرکے، یا تجارت کرکے اپنے مال و دولت میں اضافہ کر سکے۔ جائداد یا ترکہ چھوڑنے کا حق بھی باقی نہ رہ سکے گا بجز اس کے کہ آرام و آسائش کا صرف ایسا سامان کہ جس سے مال و دولت میں اضافہ نہیں ہو سکتا بلکہ جو صرف ذاتی کام میں لایا جا سکتا ہے ایک یا دو نسل تک ورثہ میں مل سکے گا۔

سوشلزم کی تحریک نے موجودہ زمانہ میں کئی مختلف صورتیں اختیار کی ہیں اور ان میں سے ہر ایک کو مختلف نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ اوّل اسٹیٹ سوشلزم State socialism دوئم کلکٹوزم collectivism سوئم سنڈیکلزم syndicalism چہارم کمیونزم communism اسٹیٹ سوشلزم کا مقصد و مدعا یہ ہے کہ دنیا کی بڑھتی دولت میں کہ جس پر اس وقت تک صرف سرمایہ دار اور اُمراء قابض ہیں اور جس سے صرف وہی مستفید ہوتے ہیں مزدور پیشہ اور ادنیٰ درجہ کے عوام الناس بھی فائدہ اٹھاویں اور وہ بھی حصہ بٹا سکیں۔ اس کی کوشش یہ نہیں کہ سرمایہ داروں اور اُمراء کے وجود اور حیثیت کو قطعی مٹا کر سب کو یکساں حالت پر لے آیا جاوے۔ اسٹیٹ سوشلزم ذاتی ملکیت اور جائداد کے قائم رکھنے کے خلاف نہیں۔ نہ یہ سب زر و زمین صنعت و حرفت اور تجارت کو حکومت کے قبضہ میں دینے اور منافع کے حصہ رسدی تقسیم کئے جانے کے موافق ہے۔ اسٹیٹ سوشلزم رائے عامہ اور قوانین سلطنت کے ذریعہ سے بتدریج ایسی تبدیلیاں چاہتی ہے کہ جس سے

عوام الناس کی موجودہ مالی و اخلاقی حالت بہتر ہو سکے۔ اس کا مطالبہ یہ ہے کہ اُمرا اور سرمایہ داروں پر زیادہ سے زیادہ ٹیکس لگایا جاوے اور غربا اور عوام الناس کی حالت اس سے بہتر بنائی جاوے۔ چنانچہ انگلستان کی رائے عامّہ اور وہاں کے جدید آئین و قوانین کا رجحان فی زمانہ اسی جانب ہے۔ بڑھاپے کی پنشن اور بیماری یا اتفاقیہ موت کے بیمہ کا قانون آٹھ گھنٹے یومیہ سے زیادہ کام نہ کرنے کا مطالبہ اور کم از کم اُجرت یا مزدوری مقرر کئے جانے کا سوال، بچوں کی پرورش اور تعلیم حکومت کے ذمہ کئے جانے کا مسئلہ و دیگر اور بہت سے ایسے مسائل کہ جو اس وقت اہل برطانیہ کے سامنے پیش ہیں جن میں سے بعض حل ہو چکے اور بعض کا فیصلہ امروز فردا میں ہو کر رہے گا، ثبوت اور مثالیں ہیں اس امر کی کہ اسٹیٹ سوشلزم کا اثر انگلستان کی حکومت پر کیسا کچھ ہو رہا ہے۔ لیکن روس اور جرمنی کے کٹر سوشلسٹ اس قسم کی سوشلزم کو دھوکا اور فریب بتاتے ہیں اور اس کو سوشلزم کے زمرہ سے خارج کرتے ہیں۔ ان کی رائے میں سوشلزم کی اصلی تحریک وہی ہے جس کا دوسرا نام Collectivism کلکٹوزم ہے اور جس کی تعریف اوپر کی جا چکی ہے۔ اس تحریک کے حامی بھی دو فریق میں تقسیم کئے جا سکتے ہیں۔ یعنی نرم و گرم۔ ایک فریق کا خیال یہ ہے کہ جو تبدیلیاں وہ چاہتے ہیں وہ بتدریج ہی ہو سکتی ہیں اور صلح و امن کے ساتھ جد و جہد کرنا واجب ہے۔ دوسرا فریق انقلاب پسند ہے اور صرف شورش و خونریزی ہی کو کامیابی کی کنجی قرار دیتا ہے۔ اوّل الذکر ایولیوشنری سوشلسٹ Evolutionary socialist اور آخر الذکر ریولیوشنری سوشلسٹ Revolutionary Socialist کے نام سے مشہور ہے۔

اسی ریولیوشنری سوشلسٹ فرقہ نے روس میں بالشویک کا نام اختیار کیا ہے۔ سنڈیکلزم Syndicalism کے اغراض و مقاصد بھی کلکٹوزم Collectivism سے زیادہ مختلف نہیں، لیکن ان کے طریق عمل میں فرق ہے۔ مثلاً سنڈیکلسٹوں کا خیال ہے کہ تمام صنعتیں و حرفتیں بجائے حکومت کے قابو و قبضہ میں رہنے کے مختلف پیشہ وروں کے خود قبضہ و اختیار میں رہنی چاہئیں، اور ہر پیشہ پیشہ ور اپنے اپنے حلقہ میں سیاہ و سفید کے مالک ہونے چاہئیں۔ ماسوا ان کا آلۂ حرب صرف اسٹرائک یا ہڑتال ہے، وہ کسی اور دوسرے طرز عمل کے قائل نہیں۔ کمیونزم یا انارکزم کی پرداخت ان سب سے بڑھ چڑھ کر ہے۔ وہ مساوات اور حریت کی دھن میں نہ صرف ذاتی ملکیت اور جائداد کے حقوق ہی کے دشمن ہیں

بلکہ خود حکومت کے آئین و دستور کو ہی جڑ سے اڑا دینا چاہتی ہے۔

یوں تو حریت و مساوات کے وہ خیالات و جذبات کہ جو سوشلزم کی تہ میں پائے جاتے ہیں کسی نہ کسی شکل میں کم و بیش تقریباً ہر ملک و ہر زمانہ میں ایک وقت میں رائج رہے تھے لیکن اس قسم کی سوشلزم کہ جس نے آج نہایت طاقتور اور عالمگیر تحریک کی صورت اختیار کی ہے نئی تہذیب و تمدن کا ہی ثمرہ ہے۔ پہلے پہل ان خیالات کی اشاعت فرانس کے نامی فلاسفر روسو نے اپنی مشہور کتاب "سوشل کونٹریکٹ" social contract کے ذریعہ سے کی تھی اور انقلاب فرانسوی کے دور میں ان خیالات کا کافی چرچا ہوا۔ لیکن جدید سوشلزم کا بانی فرانس کا ایک مشہور فلاسفر سینٹ سائمن مانا جاتا ہے۔ سینٹ سائمن نے انقلاب فرانسوی کے دوسرے دور یعنی ۱۸۲۰ء میں پہلے مرتبہ اپنے فلسفہ کو تحریک کی شکل میں فروغ دینا چاہا۔ لیکن زمانہ کی آب و ہوا نے کچھ زیادہ موافقت نہ کی اور سوشلزم کو جیتی جاگتی تحریک کی شکل میں فروغ دینے کا سہرا جرمن فلاسفر مارکس کے سر بندھا۔ مارکس کی سوشلزم کلکٹوزم Collectivism کے اصولوں پر تھی۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ کلکٹوزم کے اصولوں اور اس کے فلسفہ کا موجد مارکس تھا۔ کمیونزم یا انارکزم کا سیاسی پہلے پہل بوکینن نامی روسی فلاسفر نے دنیا کے سامنے پیش کیا اور ان کے اصولوں کی اشاعت زیادہ تر ایک دوسرے روسی نامور پرنس کروپوٹکن کی ذات سے وابستہ ہے۔

اسٹیٹ سوشلزم کا اثر و اقتدار انگلستان کے باہر بہت کم ہے۔ کلکٹوزم کا سکہ زیادہ تر جرمنی اور روس پر خوب بیٹھا ہوا ہے۔ سنڈیکلزم نے فرانس اور امریکہ میں کافی زور باندھا ہے۔ لیکن ابھی تک کمیونزم یا انارکزم کو بہ حیثیت معیار یا فلسفہ کے کافی شہرت پا چکی ہے اور اس کے پیرو کار بھی خال خال اکثر ممالک میں پائے جاتے ہیں (بالخصوص روس میں) لیکن بہ حیثیت جیتی جاگتی تحریک کے اس نے اپنا تسلط ابھی کسی خاص ملک یا قوم پر نہیں جمایا ہے اور عملی سیاسیات کے نقطۂ نظر سے اس کو زیادہ اہمیت نہیں دی جاتی ہے۔

●●

(۲)

کلکٹوزم : سوشلزم کے غیر مانوس اور وسیع مضمون پر کافی روشنی ڈالنے اور تفصیلی بحث کرنے کے لئے تو ضرورت اس امر کی ہے کہ اس پر ضخیم کتابیں لکھی جائیں کیونکہ رسالے کے مضامین میں اس کی کافی داد نہیں دیجا سکتی۔ تاہم ان مضامین کے ذریعہ سے اس امر کی کوشش کی جاویگی کہ اس مسئلہ کے متعلق موٹی موٹی باتیں بتائی جاسکیں۔ اسٹیٹ سوشلزم اور سنڈیکلزم کے متعلق تو مختلف وجوہ کی بناپر کہ جن میں سے بعض کی جانب اشارہ کیا بھی جاچکا ہے ہماری رائے میں زیادہ لکھنے کی ضرورت نہیں۔ لہٰذا اس مضمون میں ہم زیادہ تر کلکٹوزم اور کمیونزم کا تذکرہ کریں گے۔ اول الذکر کا اس لحاظ سے کہ یہی وہ تحریک ہے کہ جو سوشلزم کے نام سے اس وقت اطراف عالم میں اپنا رنگ جمارہی ہے اور اس کی ذات سے آئندہ کی اکثر تبدیلیاں وابستہ ہیں۔ آخرالذکر کا بیان اس لحاظ سے ضروری ہے کہ بلحاظ معیار و فلسفہ کے یہ کلکٹوزم سے مختلف ہے اور غالبًا ایک زمانہ وہ آنیوالا ہے کہ جب یہ موجودہ سوشلزم کی جگہ لیگی۔

برٹرینڈ رسل نے اپنی تازہ تصنیف "آزادی کی راہیں" میں سوشلزم کی تعریف یوں کی ہے۔

"زر و زمین کا قومی ملکیت قرار دینا سوشلزم ہے اگر ملک کا زر و زمین جمہوری حکومت کے قبضہ و اختیار میں ہے تو اس کا شمار قومی ملکیت میں ہوسکتا ہے۔ لیکن اگر ایسی حکومت کے قبضہ و اختیار میں ہے کہ جو جمہوری نہیں تو اس کو قومی ملکیت نہیں کہہ سکتے۔ اس معنی میں بھی اسے قومی ملکیت کہہ سکتے ہیں کہ جن معنی میں "کمیونسٹ" اس لفظ کو استعمال کرتے ہیں یعنی بجائے حکومت کے سب زر و زمین افراد قوم کی ایسی آزاد اور شرکا انجمنوں کے قبضہ میں ہو کہ جن کو جبر و حکومت کے اختیارات حاصل نہ ہوں۔ بعض سوشلسٹ کا خیال ہے کہ دفعتًہ ایک انقلاب آئے گا اور سب زر و زمین قومی ملکیت ہوجائے گی۔ دوسروں کا خیال ہے کہ یہ تغیر و تبدل بتدریج ہوگا۔ پہلے ایک حصہ پر قبضہ ہوگا، پھر دوسرے پر اور علیٰ ہٰذا القیاس۔ لیکن دو باتوں پر سب متفق ہیں یعنی جمہوریت قائم ہونی چاہیئے اور ذاتی ملکیت و جائداد کا طریق نیست و نابود کرنا چاہیئے۔ سوشلسٹ کمیونسٹ اور سنڈیکلسٹ میں فرق یہ ہے کہ ایک ایک طرح کی جمہوریت کا قائل ہے اور دوسرا دوسری

طرح کی جمہوریت کا۔ سوشلسٹ فریق پارلیمنٹری ڈیموکریسی سے مطمئن ہے اور یقین کرتا ہے کہ ذاتی ملکیت اور جائداد کے حقوق متروک ہوجانے سے اس طرز حکومت کے موجودہ نقائص سب دور ہوجائیں گے۔ بخلاف اس کے کمیونسٹ اور سنڈیکلسٹ پارلیمنٹری حکومت کے قطعی دشمن ہیں اور قوم کے معاملات بالکل دوسری طرح طے کیا چاہتے ہیں۔"

سوشلزم کا موجودہ وقار و اقتدار بہت کچھ مارکس کی ذات سے وابستہ کیا جاتا ہے۔ لہذا اس نامور بانی سوشلزم کے متعلق چند واقعات کا بیان بے محل نہ ہوگا۔ مارکس بمقام ٹریوس جرمنی میں ۱۸۱۸ء میں پیدا ہوا۔ اُس نے مختلف جرمن یونیورسٹیوں میں فلسفہ علم الاقتصاد اور تاریخ کی تعلیم پائی اور تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد سیاسیات کی طرف رجوع ہوا۔ ۱۸۴۲ء میں اس نے ایک اخبار شائع کرنا شروع کیا کہ جس کی آزادانہ اور بے باکانہ طرز خیالات و انداز بیان سے خائف ہو کر حکومت وقت نے اس کو جرمنی سے جلاوطن کیا۔ ایک سال اس نے پیرس میں قیام کیا۔ لیکن وہاں سے بھی شہر بدر ہونا پڑا۔ ۱۸۴۵ء میں مارکس پیرس سے برسلز پہنچا۔ جہاں اُس نے جرمن پیشہ وروں اور مزدوروں کی ایک انجمن قائم کی اور اپنے خیالات کی اشاعت کے لئے ایک اخبار جاری کیا۔ اس عرصہ میں اس نے کافی شہرت حاصل کر لی تھی۔ ۱۸۴۷ء میں جرمن کمیونسٹ لیگ، پیرس نے اس کو "کمیونسٹ مینیفسٹو" نکالنے پر آمادہ کیا کہ جس میں اس نے سوشلزم کے اُصولوں اور تحریک کی واضح طور سے تشریح کی ہے۔ جنوری ۱۸۴۸ء میں یہ مینیفسٹو شائع ہوا اور فروری میں اتفاقاً فرانس اور جرمنی میں انقلاب حکومت برپا ہوا کہ جس کے خوف سے برسلز کی حکومت نے بھی مارکس کو شہر بدر ہونے پر مجبور کیا۔ پھر دوبارہ جرمنی میں آ کر مارکس نے اپنی تحریک کو فروغ دینے کی کوشش کی۔ لیکن گورنمنٹ نے اُسے چین نہ لینے دیا اور آخر کار وہ انگلستان پہنچ کر وہاں مستقل طور سے مقیم ہوا اور مرتے دم تک یعنی ۱۸۸۳ء تک وہیں رہا۔ انگلستان ہی سے اُس نے اپنی مشہور تصنیف کیپٹل بھی شائع کی کہ جس میں اس نے سوشلزم کے اصولوں کو نہایت وضاحت سے بیان کیا ہے اور مخالفین کے اعتراضات کی رد و قدح کی ہے۔

مارکس کی منطق اور سوشلزم کے فلسفہ کی تہ میں سب سے پہلا اور خاص اصول یہ ہے کہ تمام دولت محنت و مزدوری سے پیدا ہوتی ہے۔ لہذا جو کچھ نفع یا فائدہ صنعت و حرفت یا تجارت سے ہو وہ پیشہ وروں اور مزدوروں کا حق ہے نہ کہ سرمایہ داروں کا۔ کیونکہ مارکس کی منطق کے مطابق وہ تمام سرمایہ کہ جو اس وقت

کثیر تعداد میں جمع ہو گیا ہے اور جس پر سود اور نفع حاصل کیا جاتا ہے۔ پیشہ وروں اور مزدوروں کو ناکافی اور کم مزدوری اور معاوضہ دے کر اور ان کی کمزوری سے بیجا فائدہ اٹھا کر اکٹھا کیا گیا ہے۔ ماسوا کاروبار کے انتظام اور نگرانی کا معاوضہ تو ہونا چاہیئے لیکن نہ کہ اس قدر زیادہ کہ جیسا مالکان کارخانجات نفع کی شکل میں فی زمانہ حاصل کرتے ہیں۔ مارکس کی رائے میں انتظام و نگرانی کا معاوضہ یا یوں کہیئے کہ دماغی محنت کا معاوضہ معمولی محنت و مزدوری سے زیادہ نہ ہونا چاہیئے۔ اگر یہ منطق صحیح مان لی جائے اور سوشلسٹ اس کو قطعی صحیح و واجب یقین کرتے ہیں تو پھر نہ سرمایہ برقرار رہنا چاہیئے نہ سود اور نہ نگرانی و انتظام کا وہ بعید معاوضہ کہ جو اس وقت حاصل کیا جاتا ہے۔ اسی دلیل کی بنا پر سوشلسٹ کہتے ہیں کہ تمام زر و زمین قوم کی ملکیت ہونا چاہیئے نہ کہ خاص خاص چند افراد کی۔ اور قوم کی جانب سے اس کا قبضہ و انتظام حکومت کے اختیار میں رہنا چاہیئے کہ جو اپنے طریق و آئین کے لحاظ سے جمہوری ہوگی۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ذاتی ملکیت اور جائداد نیست و نابود ہو جانی چاہیئے۔ جب ملکیت اور جائداد نہ رہی تو ورثہ اور ترکہ بھی باقی نہیں رہتا اور نہ سود اور نفع قائم رہ سکتا ہے۔

سوشلسٹ کی اسکیم یہ ہے کہ تمام زر و زمین، مال و مسالا، فیکٹریاں، کارخانے، کوٹھیاں، مشینری، ریلوے، جہاز غرضکہ تمام ملک و جائداد کی مالک قوم بحیثیت مجموعی یا دوسرے الفاظ میں حکومت ہونی چاہیئے۔ تمام صنعت و حرفت و تجارت کا انتظام حکومت ہی کرے۔ مال و اسباب جو بنے یا پیدا ہو حکومت کی زیر نگرانی کوٹھیوں اور کارخانوں میں جمع رہے۔ تمام مزدوروں، پیشہ وروں منتظمین اور دوسرے اہل کاروں کو ان کی محنت اور قابلیت کے لحاظ سے حکومت معاوضہ دے۔ دماغی محنت یا اعلیٰ قابلیت کا معاوضہ معمولی مزدوری سے چند گنا زیادہ ہوگا۔ معاوضہ چک یا ہنڈیوں کی شکل میں ملے گا اور انہیں ہنڈیوں اور چکوں کے فولت کوٹھیوں، کارخانوں اور دکانوں پر پیش کرنے سے حسب حساب مال و اسباب دستیاب ہو جایا کریگا۔ اس طرح سے کثیر تعداد آبادی کی ضروریات زندگی کی طرف سے بے فکر با آسائش بسر اوقات کر سکا کرے گی اور قلیل تعداد عیش و تکلف سے بھی زندگی گذار سکے گی۔ لیکن کسی کے قبضہ میں لاتعداد دولت یا قارون کا خزانہ نہ رہ سکیگا اور نہ لوگ بھوکے مرا کریں گے۔

چونکہ کچھ لوگوں کو معاوضہ بہ نسبت دوسروں کے زیادہ ملے گا لہٰذا کچھ مال و اسباب ان کی ذاتی ملکیت ہو جائے گا اور وہ اس کو وراثتہً اپنی اولاد کے لئے چھوڑ بھی سکتے ہیں۔ لیکن زر و زمین چونکہ کسی کی

ذاتی ملکیت نہیں رہے گی لہذا ورثہ اور ترکہ کے حقوق بھی باقی نہ رہیں گے۔ صنعت و حرفت اور تجارت کے علاوہ باقی اور پیشوں میں بھی یہی دستور ہوگا کہ حکومت کام لیگی اور معاوضہ دے گی۔ یعنی ڈاکٹر، وکیل اسکول ماسٹر اور پروفیسر، پولیس مین، سپاہی، مصور، ایکٹر وغیرہ سب سرکاری ملازم یا سرکاری افسر ہوں گے اور اوسط درجہ کا اپنی قابلیت کے مطابق معاوضہ پاویں گے لیکن ان کو آزادانہ طور سے ایک دوسرے کے مقابلہ میں روپیہ کمانے اور آزادہ پیشہ ور ہونے کا کوئی حق باقی نہ رہے گا۔ سود پر روپیہ دینا، کرایہ پر مکان اٹھانا یا اور چیزوں کا کرایہ پر چلانا غیر ممکن ہوگا۔ اسی طرح سے چاندی، سونا، روپیہ، سکہ، آڑھت، ساہوکارہ وغیرہ کا بھی وجود باقی نہ رہے گا۔

یوں تو سوشلزم کے اس خاکے میں کہ جو اوپر کھینچا گیا ہے، بہت کچھ اضافہ کرنے کی گنجائش باقی ہے اور اس کے بہت سے ایسے پہلو ہیں کہ جو تشریح طلب ہیں لیکن جگہ کی قلت ہمکو مجبور کرتی ہے کہ اسی پر اکتفا کریں۔ سوسائٹی کی اس نئی اور انوکھی شیرازہ بندی کے اصولوں اور طریقوں پر بلا مبالغہ اس وقت تک سیکڑوں اعتراضات کیے جا چکے ہیں اور اس بحث میں خدا جانے کس قدر وقت صرف ہوا اور کتنے ہی رسالے اور کتابیں لکھی جا چکی ہیں۔ ان سب کا تذکرہ تو ہمارے امکان سے باہر ہے۔ تاہم بعض ان خاص خاص اعتراضات کا تذکرہ کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ جو پیش پا افتادہ ہیں۔ ان اعتراضات کے پیش کرنے اور ان کے ان جوابات کے تحریر کرنے میں کہ جو سوشلسٹ فریق کی طرف سے دیے جاتے ہیں راقم الحروف اس موقع پر اپنی ذاتی رائے کو دخل نہ دیگا۔ اعتراضات کے صحیح ہونے اور جوابات کے کافی یا ناکافی ہونے کا فیصلہ مناسب ہے کہ ناظرین خود ہی کریں۔ پہلا اعتراض یہ ہے کہ جب تمام زر و زمین حکومت کے قبضہ میں رہے گی اور اس کا انتظام سرکاری احکام اور کارکنوں کے اختیار میں ہوگا تو مال و اسباب کے تیار کرنے میں ایسی یکسانی پیدا ہو جائے گی کہ کسی قسم کی تفریق کی گنجائش ہی باقی نہ رہے گی۔ انواع و اقسام کا سامان میسر نہ آسکے گا اور اعلیٰ قسم کے اسباب و سامان کا میسر آنا بھی کہ جو آج ہمارے بازاروں کی زینت اور محلات کی آرائش کا باعث ہوتا ہے غیر ممکن ہو جائے گا۔ اس کا جواب یہ دیا جاتا ہے کہ مختلف اسباب و سامان کے بنانے میں جمہور کی رائے اور ان کی ضروریات کا لحاظ رکھا جائے گا۔ سب سے پہلے ضروریاتِ زندگی پوری کی جاویں گی پھر آسائش اور تکلفات پر توجہ دی جائیگی اور اس طرح سے معمولی آرام و آسائش کی زندگی کا سامان کافی مہیا ہو سکے گا۔ البتہ نہایت اعلیٰ طبقے کے معدودے چند افراد کے عیش و عشرت کے لیے جو ہزاروں اور لاکھوں کسانوں اور مزدوروں کو خون پسینہ

ایک کرنا پڑتا ہے، یہ صورت قائم نہ رہے گی اور اس کا دور ہو جانا قابل افسوس نہیں۔۔۔ دوسرا اعتراض یہ ہے کہ جب مال و دولت پیدا کرنے کی امید و موقع ہی باقی نہ رہا تو صاحب دماغ اور اولوالعزم افراد قوم کو کیا وجہ باقی رہ جائے گی کہ وہ اپنا دماغ اور کوشش رائیگاں صرف کریں۔ جن لوگوں کے دل و دماغ کے فیض سے کل دنیا کی تمام ترقی و عروج ظاہر ہو رہا ہے، جب ان کی توجہ و کوشش ہی باقی نہ رہی، تو پھر دنیا کی ترقی و بہبودی معلوم۔ اس کا جواب یہ دیا جاتا ہے (خواہ کافی سمجھا جائے یا نہ سمجھا جائے) کہ انسان کو صرف ایک دولت پیدا کرنے کی ہوس ہی کوشش و ہمت بلیغ پر آمادہ نہیں کرتی بلکہ برابر والوں کی نگاہوں کی وقعت حاصل کرنا اور نام و نمود کی خواہش بھی اس معاملہ میں بہت کچھ اثر رکھتی ہے۔ ماسوا سوشلزم کی یہ تحریک سب کے لئے بلا تفریق یکساں معاوضہ نہیں تجویز کرتی بلکہ ہر شخص کی قابلیت اور مرتبہ کے مطابق معاوضہ دینا قرار دیتی ہے۔ یہ بات دوسری ہے کہ وہ معاوضہ بھی اس قدر نہ ہوگا کہ جتنا بعض کاروبار والے فی زمانہ حاصل کرتے ہیں۔ تیسرا اعتراض یہ ہے کہ سوسائٹی کی اس شیرازہ بندی میں دائرہ آزادی بہت محدود ہو جائے گا۔ اس اعتراض میں بہت کچھ مبالغہ سے کام لیا جاتا ہے۔ سوشلزم کسی کو اس بات پر مجبور نہیں کرتی کہ مختلف لوگ ساتھ رہیں، کھائیں پئیں یا زندگی بسر کریں۔ ہر شخص کو اختیار ہوگا کہ جو کام یا پیشہ چاہے اختیار کرے اور اپنے معاوضہ کو جس طرح چاہے صرف کرے۔ جہاں چاہے بود و باش اختیار کرے اور جس قدر چاہے کام میں صرف کرے یا آرام کرے اور کاہل رہے۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو موجودہ حالت میں آزادی اور فرصت بہت کم حاصل ہے اور نئے دور میں مقابلتہً زیادہ ہوگی۔ مزدور پیشہ طبقہ کو لیجئے اور دیکھئے کہ ان کو کیا اور کس قدر آزادی حاصل ہے۔ دن کا جس قدر زیادہ حصہ نہایت تکلیف دہ صورتوں میں اور غیر معقول خاص پیشوں اور کاموں میں ان کو صرف کرنا پڑتا ہے اور پھر بھی پیٹ بھر کھانا اور کافی آسائش سے زندگی بسر کرنا میسر نہیں ہوتا۔ غلامی کی بدترین مثال ہے۔ امرا کو بھی باستثنائے معدودے چند کو برائے نام آزادی حاصل ہو، لیکن روپیہ پیدا کرنے کی دھن اور پیشہ کی مصروفیتیں دم لینے کی مہلت نہیں دیتیں۔ سوشلزم کے دور میں اگر ایک جانب بعض پابندیاں ہوں گی، تو دوسری جانب کم از کم اپنے اور خاندان کی گزر اوقات کی طرف سے تو اطمینان حاصل ہوگا۔ البتہ سوشلسٹ فریق کے پاس اس اعتراض کا کوئی جواب نہیں ہے کہ مثل اور مال دولت اور پیشوں کے اگر حکومت نے پریس پر بھی اپنا قبضہ کلی کر لیا تو پھر آزادی خیال و آزادی رائے کہاں اور کس طرح باقی رہ سکے گی اور شبہ نہیں کہ یہ بہت بڑی مصیبت ہوگی۔ ایک اور

اعتراض یہ ہے کہ جب خیالات و جذبات میں یکرنگی اور حالات زندگی میں یکسانی ہوگی، سب ایک ہی رنگ میں رنگے ہوئے اور ایک ہی درجہ کے لوگ ہوں گے، تو تفریق اور خیالات کی گنجائش بہت کم رہ جائے گی۔ رائے عامہ کا جبر اور دنیا کا ایک چلن ان لوگوں کی ہمتوں کو توڑ دے گا کہ جو نئی راہیں نکالنا چاہیں گے اور مختلف راستے تجویز کریں گے۔ نہ موجدان سائنس و آرٹ کے نشو و نما کے لئے آب و ہوا موافق ہوگی، نہ ماہران فن اور کاملانِ ہنر کی ترقی و عروج کی گنجائش باقی رہے گی اور نہ شائستگی اور تکلفات زندگی کے رواج پانے کا کوئی موقع و محل ہوگا۔ اس کا جواب یہ دیا جاتا ہے کہ جب موجودہ افلاس اور جہالت کی حالت میں تھوڑی سی تعلیم اور محدود طبقہ کی دولت و ثروت نے یہ نتائج پیدا کیے کہ بڑے سے بڑے نامور شعراء، نقاش، مصنف، فلاسفر، سائنس داں اور دوسرے موجدانِ ہنر اور ماہرانِ فن پیدا ہو سکے تو جس حالت میں کہ تمام عوام الناس خاصی اچھی تعلیم سے بہرہ ور ہوں گے اور تمام مخلوق خدا فارغ البالی سے زندگی بسر کرتی ہوگی، تو علوم و فنون کی نشو و نما، شائستگی اور تکلفات زندگی کی ترقی کا اب سے کس قدر زیادہ موقع اور گنجائش نہ ہوگی۔ یہ خیال صحیح نہیں کہ ان سب باتوں میں صرف دولت کے سہارے سے ترقی ہوئی۔ اکثر نامور ماہرانِ فن اور صاحبانِ کمال کی پرورش اور ان کے کمالات کا نشو و نما افلاس اور مختلف قسم کی دقتوں اور مصیبتوں کے وسط اور مقابلہ میں بھی ہوا ہے اور ان کی قدر و منزلت صرف امرا کے طبقے ہی نے نہیں کی ہے۔ پھر سوشلزم کے دور میں امرا کی جگہ خود حکومت لے لیگی کیونکہ حکومت کی طرف سے ایسے لوگوں کی امداد اور قدر افزائی ہوتی رہے گی۔ اس وقت بھی جہاں جمہوریت کا دار و دورہ ہے۔ مثلاً فرانس یا پیرس کی مثال سامنے رکھیے تو یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہاں علوم و فنون کی قدر نہیں یا شائستگی اور تکلفاتِ زندگی مفقود ہیں۔ گو یہ صحیح ہے کہ جمہوریت کا فرانس سوشلزم کے فرانس سے بہت کچھ مختلف ہوگا۔ یہاں تک تو ہم نے ناظرین کو کلکٹوزم یا سوشلزم سے واقف اور متعارف کرانے کی کوشش کی ہے۔ اب کومیونزم یا انارکزم کا مختصراً تذکرہ کرنا مقصود ہے کہ جسے یقین ہے کہ ناظرین دلچسپی سے پڑھیں گے۔

کومیونزم

کومیونسٹ یا انارکسٹ کی خوش اعتقادی انسانی فطرت کی جانب سے خواہ کیسی ہی مضحکہ خیز کیوں نہ ہو اور ان کی اسکیم موجودہ حالاتِ زندگی کو مدنظر رکھتے ہوئے کیسی ہی ناقابل عمل کیوں نہ قرار دی جائے ان کے دلائل اور منطق کے بہت بڑی حد تک صحیح اور لاجواب ہونے میں شبہ نہیں۔ کومیونسٹ کی دلیل یہ ہے کہ انسانی تہذیب و تمدن کے شروع زمانہ میں ایک وقت وہ تھا کہ

جب زمین کسی خاص شخص کی ملکیت نہ تھی۔ تمام مخلوق خدا حسب ضرورت اپنی محنت و مشقت سے پیداوار حاصل کرتی اور اپنا پیٹ پالتی تھی۔ پھر چند زبردست و جنگجو افراد یا فرقوں نے امن و انصاف کے طریقوں کو خیر باد کہکر زمین پر قبضہ کرنا شروع کیا اور قبضہ حاصل کر لینے کی بنا پر اس کو اپنی ذاتی ملکیت قرار دیا۔ جو لوگ پیٹ پالنے کے وسیلے کے چھن جانے سے محتاج ہو گئے تھے ان کو مجبوراً ان زبردست لیڈروں اور فرقوں کا دست نگر ہونا پڑا اور کسان اور زمیندار کی تفریق پیدا ہوئی اور امیر و غریب سرمایہ داروں اور مزدوروں کی علیحدہ علیحدہ جماعتیں بن گئیں۔ جو دولت اور روپیہ کہ اس طرح زبردستی حاصل کیا گیا تھا اس سے سود و تجارت کے ڈھنگ ڈالے گئے لیکن اس میں بھی اگر بنظر غور دیکھا جائے تو سرمایہ داروں اور مزدوروں کا حق مساوی ہے۔ کیونکہ کوئی صنعت و حرفت اگر بغیر سرمایہ کے قائم نہیں کی جا سکتی تو بغیر مزدوروں کے ایک دن بھی قائم نہیں رہ سکتی اور اس وقت دنیا نے جس قدر ترقی او عروج حاصل کیا ہے خواہ مال و اسباب کی ساخت، خواہ کانوں سے لوہا، کوئلہ اور دوسری چیزوں کا حاصل کرنا خواہ ریلوے، تار برقی، بجلی جہاز، یا مشینری کا بنانا، ان سب میں مزدوروں کا خون و پسینہ ایک ہوا ہے۔ پھر کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی کہ جو مال و دولت اور عروج و ترقی آج دنیا میں پائی جاتی ہے۔ اس میں ایک فریق کو تمام منافع اور دولت حاصل ہو اور دوسرے کو پیٹ بھر کھانا اور اطمینان سے زندگی بسر کرنا بھی میسر نہ آئے۔ اسی دلیل کی بنا پر کومیونسٹ کہتے ہیں کہ تمام زر و زمین یا مال و دولت سب جمہور عام میں یکساں اور برابر تقسیم ہونا چاہیئے۔

سوشلسٹ جماعت سے ان کا اختلاف یہ ہے کہ سوشلسٹ دنیا کے مال و دولت کی تقسیم حصہ رسدی کرتے ہیں یعنی ہر ایک کو بقدر اس کی محنت و مزدوری کے دینا چاہتے ہیں۔ بخلاف اس کے کومیونسٹ قطعی مساوی تقسیم کے دعویدار ہیں اور کسی قسم کی تفریق قائم رکھنا نہیں چاہتے۔ ان کا اصول یہ ہے کہ ہر شخص کو بقدر اس کی ضرورت کے ملنا چاہیئے اور ضروریات زندگی حاصل کرنا ہر شخص کا پیدائشی حق ہے۔ خواہ وہ محنت و مزدوری کرے یا نہ کرے۔ اس اعتراض کا جواب کہ اگر ہر شخص بقدر اپنی ضرورت یا خواہش کے ضروریات زندگی میں حصہ بٹانا چاہیگا اور مزدوری اور محنت کرنا بھی اپنے پر واجب نہ سمجھے گا تو ضروریات زندگی میسر کیونکر ہونگی کومیونسٹ فریق کی جانب سے یہ جواب دیا جاتا ہے بلکہ پرنس کروپٹکن نے اپنی تصنیف میں اس کے ثابت کرنے کی نہایت کامیابی کے ساتھ کوشش کی ہے کہ اگر دنیا کی آبادی کا کثیر حصہ صرف ۴ یا ۵ گھنٹہ روزانہ بھی معمولی محنت و مزدوری میں وقت صرف کرے تو سائنس اور مشنری کی نئی ایجادوں کی مدد سے تمام دنیا کے لئے کافی سے

زیادہ کھانا اور کپڑا میسر آسکتا ہے۔ یعنی اتنا اناج، پھل اور ترکاریاں پیدا کی جاسکتی ہیں کہ جو اگر لاپروائی سے ضائع بھی کردی جائیں تب بھی تمام مخلوق کی ضروریات کے لئے کافی ہوسکتی ہیں۔ اسی طرح کپڑے و دیگر ضروریاتِ زندگی کی کیفیت ہے۔ رہا یہ امر کہ جب محنت و مزدوری کرنا واجب و لازم نہیں تو لوگ بجائے کاہل رہنے اور آرام کرنے کے کام کریں گے کیوں؟ اس کا جواب یہ دیا جاتا ہے کہ یہ انسانی سرشت نہیں کہ مسلسل طور سے کاہل و بیکار رہے۔ اس وقت بھی جن لوگوں کو کھانے اور پہننے کو کافی میسر ہے کافی کام اور محنت کرتے ہیں اور دنیا کے کاموں کا زیادہ حصہ انہیں لوگوں کے ہاتھوں سے طے پاتا ہے کہ جن کو کھانے پینے اور پیٹ پالنے کی جانب سے فارغ البالی ہے۔ پھر اگر خال خال لوگ ایسے بھی نکل آئے کہ جو کاہل ہی رہنا پسند کریں گے، تو اول تو برابر والوں کی نگاہوں میں گر جانے کا خوف آخر کار ان کو کام کرنے پر مجبور کرے گا ورنہ چند ایسے لوگوں کا وجود بھی کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ دنیا کے تقریباً تمام جھگڑے اور قضیئے، جرم و گناہ اسی زر و زمین کی بدولت پیدا ہوتے ہیں اور انہیں کے دفعیہ کے بہانے سے زبردست شخصیتیں لوگوں کی آزادی میں مخل ہوکر اُن پر حکومت کرتی ہیں اور پولیس، عدالت وغیرہ سیکڑوں بدعتیں اور پیدا ہوجاتی ہیں۔ جب سب کو پیٹ بھر کھانا اور تن ڈھانکنے کو کپڑا اور دوسری معمولی آسائشیں میسر آجاویں گی، تو گناہ و جرم بھی تقریباً مفقود ہوجائے گا، نہ پولیس اور عدالت کی ضرورت ہوگی اور نہ حکومت کی اور انسان آزادی کی زندگی بسر کرنے لگیں گے۔ دنیا کا تمام کاروبار اور پیشے رضامندی کے ساتھ مشترکہ انجمنیں اور پنچائتیں قائم کرکے چلائے جاویں گے، جیسا کہ تجارت اور صنعت و حرفت میں ہوتا ہے جبکہ ضروریات کے میسر کرنے میں صرف ۲ یا ۳ گھنٹے روزانہ صرف ہوں گے، تو بقیہ وقت فرصت لوگ اپنے دوسرے شوقوں اور شغلوں میں بآسانی صرف کرسکیں گے اور وہ علوم و فنونِ لطیفہ کہ جن سے تہذیب و تمدن کی زینت و رونق ہے بھرنے اور ضائع نہ ہونے پائیں گے۔ انارکسٹ یا کمیونسٹ کا دعویٰ ہے کہ اس وقت بھی عوام الناس ان کے فلسفہ اور اسکیم کو کہ جو نہایت سادہ اور آسان ہے۔ بدرجہا بہتر اور بلا دقت سمجھ سکتے اور سمجھتے ہیں بہ نسبت سیاسیات اور اقتصادیات کی اُن الجھی ہوئی گتھیوں کے کہ جن میں اُن کا دماغ پریشان کیا اور رکھا جاتا ہے اور اگر ابھی تک ان پر کمیونزم اور انارکزم کا جادو پورے طور سے نہیں چلا ہے، تو اس سے یہ دھوکا نہ کھانا چاہئے کہ انقلاب برپا ہونے میں صدیاں یا جگوں لگیں گے۔ جس وقت انقلاب برپا ہوگا وہ سوسائٹی اور حکومت کی موجودہ شیرازہ کو منتشر کرنے میں چند دنوں سے زیادہ نہ لگیگا اور پھر نئی دنیا کی داغ بیل نہایت مضبوط ڈال کر

وزم کی عمارت ہر ملک، ہر شہر اور قصبہ میں کھڑی کر دے گا۔ پرنس کروپٹکن نے اپنی اس تصنیف میں کہ جس کا حوالہ اوپر دیا گیا ہے اس مضمون پر جس وضاحت، تفصیل اور جوش کے ساتھ بحث کی ہے، وہ بہر نوع قابل غور ہے۔ لیکن مجھے تعجب ہے کہ تمام دلائل کی ردو قدح کرنے میں اس امر کا نہ کہیں تذکرہ کیا گیا ہے اور نہ کوئی جواب دیا گیا ہے کہ مردوں اور عورتوں کے قدرتی تعلقات اور نظام معاشرت کی ترتیب میں ان تعلقات کے باعث سے جو جھگڑے اور قضیے پیدا ہوتے اور گناہ و جرم کا ارتکاب ہوتا ہے اگر حکومت و عدالت کا سلسلہ باقی نہ رہا، تو اس کا فیصلہ و تصفیہ اور انسداد کیونکر ہوگا۔ ز روز مین کے تصفیہ دو بر پا ہوں۔ لیکن اس کی کیا گارنٹی ہے کہ کومیونزم کے دور میں ان کے متعلق جو فسق و فجور اور کشت و خون ہوتا ہے، وہ بھی دنیا سے ایک دم مٹ جائے گا۔

٣

برٹرینڈ رسل نے اپنی تازہ تصنیف میں کہ جس کا حوالہ پیشتر دیا جا چکا ہے ایک مقام پر لکھا ہے کہ ان لوگوں کے راستہ میں کہ جو سوسائٹی کو نئے اور بہتر سانچے میں ڈھالنا ضروری سمجھتے اور تہذیب و تمدن کی بوسیدہ ہڈیوں میں تازہ روح پھونکنا چاہتے ہیں، دو قسم کی رکاوٹیں حائل ہوتی ہیں۔ ایک جانب سے عناصر قدرت راستہ روکتے اور طرح طرح کی مشکلیں پیدا کرتے ہیں۔ دوسری جانب سے وہ بیڑیاں جو خود حضرت انسان نے اپنے پاؤں میں ڈال رکھی ہیں، قدم بڑھانے کی اجازت نہیں دیتیں۔ قدرتی رکاوٹوں اور مشکلوں کا راستہ سائنس کے ذریعہ سے صاف کیا جا سکتا ہے اور وہ گتھیاں جو خود حضرت انسان کی ڈالی ہوئی ہیں نظام معاشرت اور سیاست کی اصلاحات سے سلجھائی جا سکتی ہیں۔ روز ازل سے آج تک کی تہذیب و تمدن کے نشو و نما کی تاریخ پر اگر ایک سرسری نظر بھی ڈالی جائے تو اس قول کی حقیقت کا ثبوت اس کے ہر صفحہ سے مل سکتا ہے۔ چند صدیوں پیشتر کون شخص تھا جو خواب و خیال میں بھی اس بات کا ارمان رکھ سکتا تھا کہ یہ انسان جس کی ہستی مشت خاک سے زیادہ نہیں کسی وقت میں قدرت کی قوتوں پر وہ قابو اور اختیار حاصل کرے گا کہ یہ اس کے اشارہ پر کام کریں گی یا دنیا کی وہ اولوالعزم ہستیاں کہ جن کو اپنے تاج و تخت کا غرہ اور خدائی کا دعویٰ تھا جمہور عالم کے ہاتھوں میں کٹ پتلیوں کی طرح ناچیں گی اور ان کا بننا یا بگڑنا جمہور یا عوام الناس کی انگلیوں اور انگلیوں

پر موقوف ہوگا۔ تاہم یہ معجزہ اور کرشمہ آج دیکھنے میں آرہا ہے۔ سائنس نے دنیا کی کایا پلٹ کر دی اور آج ہمارا نظام معاشرت و تمدن انہیں لوگوں کا جامہ پہنے ہوئے ہے کہ جن کو چند صدیوں پیشتر دنیا ہنستی اور بناتی تھی جو اپنے ہمعصروں کے طعن و تشنیع کا نشانہ بنتے تھے اور جو اس لئے مورد عتاب و عذاب ہوئے کہ نابینا و بے بصیرت دنیا اس وقت اس جگمگاتی ہوئی روشنی کی تاب نہ لا سکی کہ جس کو ان کی ذات نے روشن کیا تھا اور جو بالآخر آج تمام عالم کو منور کئے ہوئے ہے۔ اگر دنیا کے لئے اپنی رفتار ترقی میں آج ان منزلوں تک پہنچ جانا ممکن ہوگیا کہ جن کا چند صدیوں پیشتر سان و گمان بھی نہ تھا، تو اس خیال کرنے کی کیا کافی وجہ ہو سکتی ہے کہ سوشلسٹ یا انارکسٹ آج جس معراج ترقی کا خواب دیکھ رہے ہیں، جو اعلیٰ معیار ہمارے سامنے پیش کر رہے ہیں اور سوسائٹی کو جس نئے اور مکمل سانچے میں ڈھالنا چاہتے ہیں وہ اب سے چند صدیوں بعد ہماری کایا پلٹ کر کے دنیا کی صورت کو نہیں بدل دے گا۔ ممکن ہی نہیں بلکہ امر یقینی ہے کہ دنیا اس وقت انارکسٹ کی اسکیم اور اصولوں پر کاربند ہونے کے لئے تیار نہیں۔ مغربی تہذیب ممالک میں بھی انارکزم تو در کنار۔ سوشلزم کے سانچے میں بھی سوسائٹی یا حکومت کا ڈھلنا ابھی عرصہ دراز تک باتیں ہی باتیں ہیں۔ تاہم کوئی وجہ نہیں کہ محض اس بنا پر کہ انارکزم یا سوشلزم کو چونکہ آج عملی جامہ نہیں پہنایا جا سکتا ہے تو ہم اس معیار کی بلندی، ان اصولوں کی سچائی اور اس سانچے کے سادے، سڈول اور خوبصورت ہونے سے بھی منحرف ہوں کہ جو انارکسٹ اور سوشلسٹ ہمارے سامنے پیش کرتے ہیں۔ عقل سلیم تو اس امر کی مقتضی ہے کہ ہم یہ دیکھیں کہ انارکسٹ اور سوشلسٹ جو معیار اور اصول ہمارے سامنے پیش کر رہے ہیں ان میں سچائی اور انصاف کہاں تک ہے۔ ان کے اصول منطق اور دلیل کی کسوٹی پر کسے جا سکتے ہیں کہ نہیں۔ سوسائٹی کا نیا سانچہ جو وہ ہمارے سامنے پیش کر رہے ہیں آیا وہ سادہ سڈول اور خوبصورت ہے کہ نہیں۔ اگر یہ سب اوصاف ان کی اسکیم میں موجود ہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ ہم محض ہٹ دھرمی، خود غرضی اور کم ہمتی کے خیال سے اپنی موجودہ بیڈھنگی رفتار پر قائم رہیں اور انارکسٹ یا سوشلسٹ کی اسکیم کی فضیلت سے انکار ہی کئے جائیں۔ بخلاف اس کے اگر ہم یہ ماننے کے لئے تیار ہیں کہ سوسائٹی کا یہ نیا سانچا سادہ، سڈول اور مکمل تو ضرور ہے لیکن موجودہ حالت میں کارآمد، قابل قبول یا ممکن العمل نہیں تو پھر اس مسئلہ کو ان چند الفاظ کے ساتھ اس لاپروائی سے ٹالا نہیں جا سکتا۔ بلکہ ہمارا فرض ہوتا ہے کہ ہم یہ دیکھیں اور غور کریں کہ ان نئے اصولوں کو کس حد تک اور کس شکل میں ہم اس وقت قبول کر سکتے ہیں۔ یہ نئی اسکیم کس ترمیم و تنسیخ کے بعد ہمارے اس پرانے سانچے میں ٹھیک بٹھائی جا سکتی ہے کہ سوسائٹی

کا موجودہ شیرازہ درہم برہم بھی نہ ہونے پائے اور نئے اصولوں کی نشو و نما کے لئے گنجایش بھی نکل آئے۔

پہلی بات قابل غور یہ ہے کہ انارکسٹ یا سوشلسٹ جو معیار اور اصول ہمارے سامنے پیش کرتے ہیں، وہ سچائی اور انصاف کی ترازو میں پورے اترتے ہیں یا کہ نہیں۔ تمثیلاً زمین کے مسئلہ کو لیجئے۔ انارکسٹ اور سوشلسٹ کہتے ہیں کہ زمین کسی کی ذاتی ملکیت نہیں۔ یہ تو قدرت یا خدا کی دین ہے کہ جس پر تمام بنی نوع انسان کا برابر کا حق اور دعویٰ ہے۔ زمین کسی خاص انسان کی بنائی یا پیدا کی ہوئی نہیں کہ کسی خاص شخص کا ترکہ یا ورثہ ہو سکے۔ اگر چند شخصوں نے بزور و زبردستی زمین کے وسیع رقبوں اور خطوں پر قبضہ کر لیا، تو محض اس وجہ سے ان کی ملک نہیں کہی جا سکتی ورنہ اس اصول پر تو وہ تمام مال و دولت بھی کہ جو قزاقی اور ڈاکو لوٹ کر لے جاتے ہیں ان کی ملک شمار ہو سکتی ہے۔ زمین اگر ملک ہے تو تمام بنی نوع کی یا اگر جغرافی اور قومی حدود کا لحاظ رکھا جائے تو بحیثیت مجموعی اُن مختلف اقوام کی کہ جو مختلف ممالک میں آباد ہیں۔ اس سادی اور سچی بات کے سمجھنے اور ماننے میں دشواری نہ ہونی چاہیے لیکن صدیوں کے رواج اور دنیا کے موجودہ رویہ نے ہم کو زمین کی ذاتی ملکیت کے خیال کا اس قدر پابند کر دیا ہے کہ اس کے دُور کرنے کے لئے طویل بحث اور مستند اسناد کے پیش کرنے کی ضرورت پڑتی ہے۔ قانونی حیثیت سے بھی اگر دیکھئے تو بڑے بڑے مقنن اس خیال کی تائید کرتے ہیں اور مورخین نے اسے تواریخ سے ثابت کیا ہے کہ زمانہ سلف میں زمین ذاتی ملکیت نہیں سمجھی جاتی تھی، بلکہ سلطنت کی ملکیت مانی جاتی تھی اور مختلف فرقے اور لوگ مشترکہ حیثیت سے زمین بوتے اور جوتتے تھے۔ یہ بات دوسری ہے کہ اس زمانہ میں سلطنت اور حکومت بادشاہ کی ذات واحد تک محدود تھی اور سوشلسٹ فریق سلطنت یا حکومت اور قوم کو مترادف معنی میں استعمال کرتا ہے۔ بہرحال قانونی حیثیت سے اس میں فرق نہیں پڑتا۔ نامور انگریزی مقننین میں ایڈورڈ کوک، ولیم بلیک اسٹن، کولرج، فریڈرک پولک، ہنری مین، اس خیال کی تائید کرتے ہیں مشہور فلاسفروں میں مِل، کارلائل، ارنسٹ رینان، رسکن، ٹالسٹائی، رسل والیس اسی خیال کے حامی ہیں۔ یہ تو اصولی بات تھی۔ سوشلسٹ فریق کی اسکیم بھی بے معنی نہیں۔ نہ وہ اس کے عمل درآمد میں انصاف کو ہاتھ سے دیتے ہیں۔ ان کی تجویز ہے کہ حکومت زمینداروں اور تعلقہ داروں کو واجب معاوضہ دے کر زمین خریدے اور تمام افراد قوم کو حسب ضرورت ہر شخص اس سے فائدہ اٹھانے کا موقع دے اور زمین کا لگان جو وصول ہو وہ رعیت کے آرام و آسائش کی باتوں پر صرف کیا جائے۔ اس کثیر رقم کے بہم

پہنچانے کے ذرائع اور سبیلیں بھی کہ جو زمین کے خریدنے کے لئے ضروری ہوں گی نہایت معقول بتائی جاتی ہیں کہ جن کا تفصیلی بیان باعث طوالت ہوگا۔ کیا کوئی سمجھدار آدمی ان اصولوں کے انصاف اور سچائی یا دلیل و منطق سے انکار کر سکتا ہے؟ انارکسٹ اور سوشلسٹ کا دوسرا دعویٰ یہ ہے کہ اگر وہ تمام زمین کہ جو امراء و رؤسا کے مختلف مشاغل کے لئے اس وقت مخصوص ہے اور زراعت کے کام میں نہیں آتی کاشت میں لائی جائے اور زراعت کے اُن تمام نئے طریقوں کو برتا جائے کہ جن پر سائنس نے جلا کر دی اور چار چاند ڈال دیے ہیں تو دنیا کی پیداوار خام میں اس قدر اضافہ ہو سکتا ہے کہ تمام اہل دنیا کی ضروریات زندگی بآسانی پوری ہو سکتی ہیں اور کوئی بھوکا یا ننگا نہیں رہ سکتا۔ پرنس کروپوٹکن نے اپنی تصنیف (Con-quest of Bread) میں اس اہم مسئلہ پر نہایت وضاحت سے بحث کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

کہ لوگ جب کاشتکار کا تذکرہ کرتے ہیں تو ان کے سامنے ایک ایسے شخص کا نقشہ کھنچا ہوتا ہے کہ جو بڑے حالوں کر چلاتا ہو، پرانا اچھا یا برا جیسا بھی میسر آئے بیج کھیت میں لاپرواہی سے بکھرا جاتا اور ابر باراں کی اٹکھیلیوں پر تن بتقدیر بیٹھا زندگی کے دن کسی نہ کسی طرح کاٹا کرتا ہے اور جس کے بال بچوں کو صبح سے شام تک کی مشقت کا صرف یہ انعام ملتا ہے کہ روکھی سوکھی روٹی، ٹوٹی چھان اور کھردری چارپائی میسر ہو جاتی ہے اور ان مصیبت زدہ لوگوں کے لئے سوسائٹی جب بہت فیاضی سے کام لیتی ہے تو یہ تجویز کرتی ہے کہ ان کا محصول یا لگان کم کر دیا جائے۔ لیکن اس نئے دور کے کاشتکار کے خیالات اور ارمان زیادہ بڑھے چڑھے ہیں۔ وہ اپنے اور اپنے خاندان کے گذارے کے لئے ایک ایکڑ زمین کا خفیف سا حصہ چاہتا ہے۔ جس قدر زمین کہ صرف ایک مویشی کے لئے چارہ پیدا کرنے کے لئے کافی ہوتی تھی اس کا دعویٰ ہے کہ وہ اسی قدر زمین سے ۲۵ مویشیوں کی پرورش کر سکتا ہے۔ وہ اپنے کھیت آپ تیار کرتا ہے وہ موسم اور بارش کی بے اعتدالیوں سے لاپرواہ اور آزاد ہے۔ وہ اپنے پودوں کو خود گرمی اور نمی پہنچانے کا انتظام کرتا ہے اور ۵۰ ایکڑ کی پیداوار ایک ایکڑ میں پیدا کرتا ہے اور پھر مقابلۃً محنت و مشقت بھی کم کرتا ہے اور بآسائش زندگی بسر کرتا ہے۔ [illegible] کے جنوبی فرانس اور مغربی امریکہ کے کاشتکار پرانے طریقوں سے اس زرخیز زمین سے ۱۱ سے لے کر ۱۵ بشل فی ایکڑ تک سے زیادہ پیداوار ایک فصل میں حاصل نہیں کر سکتے بخلاف اس کے نئے سائنٹفک طریقوں سے شمالی فرانس میں اس وقت بھی ۳۱ سے لے کر ۵۵ بلکہ ۶۰ بشل فی ایکڑ تک پیداوار حاصل کی جاتی ہے اور ایک شخص کے لئے سال بھر کا گذارہ

چوتھائی ایکڑ زمین سے بھی کم میں میسر آجاتا ہے۔ اس طرح کے واقعات کی موجودگی میں وہ شائستہ طرز کہ امر جو ہونی ہے کہ جس کا نمونہ بھی کیا گیا کون انکار کر سکتا ہے؟ سوشلسٹ فریق کی ایک اور دلیل یہ ہے کہ جس حالت میں دنیا کا تمام کاروبار اور صنعت و حرفت مزدور پیشہ جماعت اور سرمایہ داروں کی متفقہ کوشش سے ہی بار آور ہو سکتی ہے، تو یہ کہاں کا انصاف ہے کہ مزدوروں کو تو معمولی ضروریات زندگی کا سامان بھی میسر نہ آسکے اور سرمایہ دار اپنے گھروں میں قارون کا خزانہ جمع کرتے جائیں۔ وہ مانتے ہیں کہ ماہران صنعت و حرفت اور صاحبان کاروبار کو ان کی قابلیت، استعداد اور اعلیٰ اوصاف کے لحاظ سے معمولی مزدوروں کے مقابل میں زیادہ معاوضہ دیا جاوے لیکن دولت کی تقسیم میں جو زمین آسمان کا فرق اس وقت مزدوروں اور سرمایہ داروں میں پایا جاتا ہے وہ کسی طرح روا نہ رہنا چاہیے اور نہ زر و مال کسی کی شخصی ملکیت ہونا چاہیے۔ کیا یہ دلیل بے معنی ہے؟ کیا یہ مطالبہ قرین انصاف نہیں؟ اسی طرح سے سوشلسٹ فریق کی اس بحث میں بھی بہت کچھ وزن اور سکت ہے کہ لوگ محض روپیہ پیدا کرنے کے خاطر ہی محنت و مشقت نہیں کرتے بلکہ نام و نمود، اختیار و حشمت کے خاطر اس وقت بھی دنیا کا بہت سا کام ہوتا اور نکلتا ہے۔ پھر جبکہ سوسائٹی بالکل نئے سانچے میں ڈھل جاوے گی اور زر و مال شخصی ملکیت ہی باقی نہ رہے گا اور یہ فساد کی جڑ ہی مٹ جاوے گی تو لازمی طور پر لوگوں کی آرزوئیں اور ارمان بھی بہ نسبت زر و مال کے نام آوری اور شہرت کی جانب زیادہ مائل ہوں گے۔ یہ ہیں سوشلسٹ اور انارکسٹ فریق کے بعض اصول اور دلائل کہ جن کی سچائی یا معقولیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ ان کے اور بعض دلائل بھی ہیں کہ جن کا ذکر باعث طوالت ہوگا ضرور ایسے ہیں کہ جن کو اگر عقل و انصاف کی کسوٹی پر کسا جائے تو کھرے ثابت ہوں گے۔ نہ صرف یہی بلکہ ان کی اسکیم کے بارے میں بھی وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ اگر کسی طرح سے کوئی طوفان نوح اس دنیا کو آج غرق آب کر دے اور پھر اس امر کا موقع ہو کہ سوسائٹی کی داغ بیل انارکسٹ فریق کے اصولوں پر از سر نو ڈالی جائے تو سوسائٹی کا یہ شیرازہ کہ جو اس سانچے میں ڈھل نکلے گا اس میں شبہ نہیں کہ ہمارے موجودہ نظام معاشرت و تمدن سے کہیں زیادہ سادہ، خوبصورت اور استوار ہوگا۔ یہاں تک تو انارکسٹ یا سوشلسٹ فریق کی منطق بالکل صحیح اور بجا ہے۔ جو غلطی یہ کرتے ہیں وہ یہ ہے کہ یہ اس امر کو نظر انداز کر دیتے ہیں کہ اس مجموعہ ارتقائے تمدن کو جس کے روز ازل سے لے کر اب تک نصف سے زیادہ باب لکھے جا چکے ہیں، گو ہمارے لئے اس امر کی گنجائش ہے کہ ہم اس میں دو چار نئے باب کا اور اضافہ کر دیں، پچھلی غلطیوں کی تصحیح کر کے ترمیم کر دیں اور جو کچھ لکھیں

ان کی عبارت متابلتہً زیادہ سلیس ہے، اس کا خط نسبۃً زیادہ نستعلیق اور اس کا مضمون زیادہ دلکش اور سبق آموز ہے۔ لیکن یہ ہماری قدرت اور امکان کے باہر ہے کہ پچھلی نسلیں جو کچھ اب تک لکھ گئی ہیں ہم اس کو حرف غلط کی طرح مٹا دیں یا دھو ڈالیں یا مربوط و سلسلہ مضمون سے منھ موڑ کر از سر نو کوئی ایسا عنوان شروع کریں کہ جو قطعی بے تعلق نیا یا انوکھا ہو۔ انارکسٹ یا سوشلسٹ فریق کے لوگ طوفان خیز انقلابوں کے مؤید ہیں اور قانون قدرت کی اس حقیقت پر غور نہیں کرتے کہ نظام معاشرت و تمدن کا نشو و نما یا ترقی کی صورت بھی بالکل درختوں کے مثل ہے۔ پہلے زمین تیار کی جاتی ہے، بیج بویا جاتا ہے، پودوں کو پانی دیا جاتا ہے، پھر رفتہ رفتہ وہ تناور درخت بنتے اور پھل پھول لاتے ہیں۔ اگر ایک نسل بیج بوتی ہے تو دوسری نسل کو پھل کھانا نصیب ہوتے ہیں۔ جس طرح ایک تناور درخت کو اکھاڑ کر اس کی جگہ فوراً دوسرا درخت نہیں لگایا جا سکتا اسی طرح موجودہ نظام معاشرت و تمدن کو یک لخت خیرباد کہہ کر اس کی جگہ انارکسٹ یا سوشلسٹ اسکیم رائج نہیں کی جا سکتی۔ البتہ زمین تیار کی جا سکتی ہے۔ بیج بویا جا سکتا ہے۔ آئندہ نسلیں اس کی آبیاری کر سکتی ہیں۔ اور کسی زمانہ میں سوشلزم ایک تناور درخت کی طرح بارآور ہو کر اپنے سایہ اور پھل پھول سے جمہور عالم کے لئے نعمت اور رحمت ثابت ہو سکتی ہے۔ روزمرہ کا تجربہ ہے کہ مذہبی یا اخلاقی و سوشل یا پولیٹیکل مباحثوں میں کسی ایک شخص کا دوسرے شخص کو اپنا ہم خیال بنا لینا یا خاص اصول و عقیدہ قبول کرا دینا کس قدر کوشش اور وقت چاہتا ہے۔ لوگ اول تو آسانی سے نئے اصول اور عقیدہ کے قائل نہیں ہوتے اور اگر کسی طرح قائل بھی ہو گئے تو ان عقائد اور اصولوں پر کاربند ہوتے ہوئے ایک زمانہ بلکہ عمر گزرتی ہے۔ [illegible] دل کی سیدھی بات کا سمجھنا اور اس پر عمل پیرا ہونا کیوں اس قدر دشوار ہے اور ایسا نہیں ہونا چاہئے۔ یہ تو دوسری بات ہے۔ اگر واقع یہ ہے کہ ایسا ہوتا ہے فطرتِ انسانی ہی کچھ اس طرح واقع ہوئی ہے۔ سوشلسٹ یا انارکسٹ فریق کی تمام اسکیموں اور ان کے دلائل کی سب سے بڑی کمزوری یہی ہے کہ وہ انسانی فطرت کو ہرگز نظر انداز کر دیتے ہیں۔ وہ نہیں دیکھتے اور نہیں سمجھتے کہ جب بنی آدم کو اپنی وحشیانہ کینچلی بدل کر خلعت انسانیت کا جامہ پہننے میں ہزاروں اور صدیاں لگیں تو انسانیت کے جوہر پیدا کرنے اور فرشتہ سیرت انسان بننے میں کیا کچھ زمانہ نہ لگیگا۔

انارکزم کا فلسفہ تو یورپ میں بھی اس وقت تک خواب و خیال سے زیادہ نہیں لیکن سوشلزم رفتہ رفتہ اپنے قدم مغربی ممالک میں مضبوطی سے جماتی جاتی ہے۔ اس وقت قریباً تمام یورپ میں یہ سب سے زیادہ قبول عام تحریک سمجھی جاتی ہے۔ لیبر پارٹی کی شکل میں اس کا اثر اور دخل ہر ایوان حکومت میں موجود ہے۔

بالخصوص برطانوی قوانین British Legislation اور British Finance بیانات کا تمام تر رجحان
سوشلزم کی جانب ہے۔ لندن لیبر پارٹی کا اثر اور رسوخ انگریزی سیاسیات میں روز افزوں ہے۔ اور وہ دن زیادہ
دور نہیں کہ برطانوی حکومت کی باگ لیبر پارٹی کے ہاتھوں میں ہوگی۔ بلکہ امر واقع تو یہ ہے کہ روس میں سوشلزم یا
بولشوزم نے اپنا پورا پورا قابو اور اختیار جما لیا ہے۔ حکومت کی باگ اسی کے ہاتھ میں ہے اور تمام ملک میں اسی
کا سکہ جما ہوا ہے۔ لیکن انقلاب روس اور اس نئے تجربہ کے حسن کا حشر معلوم نہیں کہ کیا ہو کوئی خاص نتیجہ نہیں
نکالا جا سکتا۔ سوشلزم کے موافق و مخالف دونوں اس کی مثال سے اپنی دلائل کو مضبوط کر سکتے ہیں۔ تاہم
قطع نظر اس کے سوشلزم کا مستقبل یورپ میں مشکوک نہیں۔ بلکہ صاف و صریح طور پر فتح و نصرت کے نشانات ظاہر
کر رہا ہے۔ مگر ہم کو اپنے ملک سے زیادہ سروکار ہے۔ ایک ایسے ملک میں جو قدامت پرستی کا گہوارہ، غیر قوم
کے تابع اور جہالت و تاریکی میں پڑا ہوا ہے۔ جہاں دستوری حکومت اور جمہوری مجالس کا عہد طفولیت ہے
اور لوگ ابھی ان سے اچھی طرح صورت آشنا بھی نہیں۔ جس ملک میں صنعت و حرفت کی جگہ زراعت نے
لے رکھی ہے اور زمیندار و تعلقہ دار قوم کے سردار اور رہنما کہے جاتے ہیں۔ ایسے ملک میں سوشلزم کا
چرچا محض مضحکہ خیز ہوگا۔ یہاں تو ابھی آئینی و جمہوری حکومت ہی کی پہلی منزل طے کرنی باقی ہے سوشلزم
کا تو ذکر ہی کیا۔ تاہم اس ملک میں بھی اب زندگی کے آثار نمایاں ہو چلے ہیں۔ یہاں بھی بےچینی پھیلتی جاتی
تھی۔ تمام عالم کے ساتھ ہمارا غریب ملک بھی کروٹ بدل رہا ہے اور جو ہوا اس وقت تمام عالم میں چل رہی
ہے اس کے اثر سے ہم بھی محفوظ نہیں۔ پچھلے دس سال میں کس تیزی سے یہاں بھی ہر شعبۂ زندگی میں تبدیلیاں
نمایاں ہوئی ہیں اور ہوتی جاتی ہیں وہ حیرت انگیز ہیں۔ ان کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ مزدور پیشہ
جماعت کی انجمنیں اور کسان سبھائیں اس وقت تمام اطراف ملک میں قائم ہوتی جاتی اور اپنا اثر دکھا رہی
ہیں۔ ۵ سال قبل کسی نے ان کا نام بھی نہ سنا تھا۔ ہڑتالوں کی وہ بھرمار ہے کہ کوئی مہینہ بلکہ ہفتہ مشکل سے
خالی جاتا ہوگا کہ کہیں نہ کہیں سے ہڑتال کی خبر نہ آتی ہو۔ ۵ سال قبل ان کا چرچا مشکل سے کہیں سننے
میں آتا تھا۔ ہمارے سیاسیات کی روش میں اسی تیزی سے تبدیلیاں ہو رہی ہیں کہ کانگریس بلا مبالغہ ہر سال بلکہ
ششماہی ایک نیا رنگ بدلتی اور جگہوں کی منزلیں دنوں میں طے کیا چاہتی ہے۔ کل تک صرف ہوم رول یا
Provincial Autonomy صوبوں کی خود مختاری کا مطالبہ تھا۔ آج کل ہندوستان کی خود مختاری کا
سوال ہے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ کل کامل آزادی کا شور نہ برپا کیا جائے گا۔ آج سرکار سے قطع تعلق کا

فتویٰ دیا گیا ہے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ کل انقلاب کا علم نہ بلند کیا جائے گا۔ کانگریس کے فتوے، زمینداروں کی پنچایتوں اور کسانوں کی سبھاؤں کے رزولیوشن گو نمائندگی کا ادا کرتے مخلوق ہند کی آواز اور رائے نہیں تاہم بہت کچھ نہیں کہتے ہیں اور ان کو کوئی دانشمند نظرانداز نہیں کرے گا۔ جس طرح کہ حکومت وقت کے لئے کانگریس اور کانفرنس وغیرہ کے موجودہ مطالبات پر ٹھنڈے دل سے غور کرنا اور ان کی اہمیت کو سمجھ کر مناسب طریق عمل اختیار کرنا لازمی ہے تاکہ رعیت کا اطمینان ہو اور ملک میں بدامنی نہ پھیلے۔ اسی طرح ان لیڈروں کے لئے کہ جو اپنے ہم وطنوں کی رہنمائی کرتے ہیں یا عامتہ الناس کے خیالات اور رایوں کو بدلتے اور نئے سانچوں میں ڈھالتے ہیں لازم ہے کہ ان تبدیلیوں پر غور کریں، ہوا کے رخ کو پہچانیں اور سوسائٹی کے چلن کو اس طرح بدلیں اور اس کی باگیں اس طرح موڑیں کہ سوسائٹی نیا چلن اختیار کرلے اور اس کا شیرازہ بھی تتر بتر نہ ہونے پائے۔

ممکن ہے بلکہ یقینی ہے کہ انارکزم یا سوشلزم کی اسکیم ہمارے ملک کی موجودہ حالات میں ناممکن العمل ہے۔ لیکن اسی کے ساتھ سوسائٹی کی بے ڈھنگی رفتار بھی کہ جس سے ملک کی تمام دولت امرا کے محدود حلقے اور سوسائٹی کے اعلیٰ طبقے ہی کی طرف ڈھلتی چلی جاتی ہے اور غربا اور ادنیٰ درجہ کے لوگ ضروریات زندگی کی گرانی سے تنگ آکر اور آثار زمانہ سے متاثر ہو کر اپنا حصہ بٹانے کے لئے مجبور اور بے چین ہو رہے ہیں زیادہ عرصہ تک قائم نہیں رہ سکتی۔ دو ہی نتیجے نکل سکتے ہیں۔ یا تو آپ خود غرضی سے مجبور رہ کر اپنی ضد پر اس وقت تک قائم رہ سکتے ہیں کہ جس وقت تک کشمکش یہ صورت اختیار کرلے کہ عوام الناس مجبور ہو کر آپے سے باہر ہو کر فساد پر آمادہ ہو جائیں اور سوسائٹی کے موجودہ شیرازے کو تتر بتر کر ڈالیں۔ یا یہ کہ آپ عقل و ہوش سے کام لے کر آثار زمانہ سے سبق حاصل کرکے موجودہ بے چینی کے دور کرنے کی غرض سے ابھی سے وہ تدابیر سوچیں اور عمل میں لائیں کہ جن سے عوام الناس کی حالت بہتر ہو، ان کی شکایات دور ہوں اور بے چینی کم ہو۔ ہندوستان زراعتی ملک ہے اور یہاں زمین کا مسئلہ سب سے زیادہ اہم ہے۔ گو ایک معنی میں ملک کی زمین سلطنت و حکومت کی ملکیت ہے کیونکہ حکومت ہی اس کا لگان یا محصول وصول کرتی ہے۔ لیکن اس معنی میں قوم کی ملکیت نہیں کہ جس معنی میں سوشلسٹ ذرعی زمین کو قوم کی ملکیت بنانا چاہتا ہے۔ کیونکہ حکومت قوم کی حکومت نہیں ہے۔ نہ ہمارے لئے ابھی وہ وقت آیا ہے کہ زمینداروں اور تعلقداروں سے زمین واپس لے کر اس کو حکومت اور قوم کی ملکیت بنایا جاوے نہ یہ وقت اس وقت تک آسکتا ہے کہ جس وقت تک حکومت ہند اصل اور صحیح معنوں میں جمہوری حکومت ہو جاوے۔ پس زمین کو حکومت یا قومی ملکیت بنانے کا وقت تو ابھی بہت دور ہے تاہم کاشتکاروں

کے حقوق اور دخل کو تسلیم کرے اور سرکار اور زمینداروں پر ان کی بہبود کی ذمہ داری عائد کرنے کا وقت آ گیا ہے۔ پہلی کوشش اس امر کی ہونی چاہیے کہ کاشتکار کے دخیل کار بننے کا زمانہ نسبتاً کم کیا جائے اور اس کو بے دخل کرنے کی شرائط زیادہ محدود اور سخت قرار دی جائیں تاکہ کاشتکار کی حیثیت بلحاظ زمین کے زیادہ بہتر اور اس کی حقوق محفوظ ہو سکیں۔ موجودہ حالت ناقابل اطمینان ہے۔ اس وقت تک بندوبست اور اضافہ مالگذاری کے متعلق حکومت کو اختیار تھا کہ وہ جب چاہے جس طور اور جن شرائط کی رو سے بندوبست اور اضافہ کرے۔ رعیت اور نائبان رعیت کی آواز کو اس میں کچھ دخل نہ تھا۔ نئی اصلاحات کی رو سے اب ہر بندوبست کے موقع پر یہ سوال کونسل میں اٹھایا جائیگا اور کونسل جن اصول اور قواعد پر بندوبست اور اضافہ مالگذاری کا اختیار حکومت کو دے گی انہیں اصولوں اور قواعد کی رو سے بندوبست ہو سکے گا۔ ہماری رائے میں نائبان رعایا کا فرض ہے کہ وہ کونسل میں اس مسئلہ کے متعلق یہ اصول قرار دیدیں کہ جب تک کاشتکار اور زمین کی حالت سنبھل نہ جائے حکومت وقت وہ خاص اصلاحیں عمل میں نہ لائے کہ جن کا رائے عامہ مطالبہ کر رہی ہے، اس وقت تک بندوبست یا اضافہ مالگذاری ملتوی رہے۔ نیز یہ کہ ان اصلاحوں کے عمل درآمد کے لئے جو کثیر صرفہ کی ضرورت ہوگی وہ اگر اور دوسرے ذریعوں سے مہیا نہ ہو سکے تو یہ لازمی قرار دیا جائے کہ آمدنی صیغۂ مال کا ایک خاص حصہ اس صرفہ کے لئے مخصوص کر دیا جاوے۔ جن اصلاحوں کی فوری عملدرآمد کی ضرورت ہے ان میں ایک یہ ہونی چاہیے کہ حکومت نہروں کے نکالنے میں اب بہت زیادہ توجہ دے اور کسی حالت میں نہروں کے نکالنے پر اس سے کم نہ صرف کیا جاوے کہ جس قدر ریلوے پر صرف کیا جاتا ہے تاکہ کاشتکار موسم اور بارش کی بے اعتنائیوں کے تردد اور مصیبت سے آزاد ہو جائے۔

دوسرے یہ کہ ہر ضلع میں ایسی چھوٹی چھوٹی ریلوے لائنیں نکلنی چاہئیں کہ جو ضلع کی مختلف تحصیلوں میں سلسلۂ آمدورفت کو آسان بنا دیں۔ ہر دس میل کے حلقے میں ابتدائی تعلیم کے درجہ کا ایک مدرسہ ہونا چاہیے کہ جس میں تعلیم مفت اور لازمی ہو۔ اسی طرح سے ہر ایک حلقہ میں ایک Model Farm (نئے طریق کی کاشتکاری کا نمونہ) ضرور ہونا چاہیے کہ جہاں کاشتکاروں کے لڑکوں کو کاشتکاری کے نئے طریقے سکھائے جائیں اور ان کے سامنے ایک نمونہ موجود ہو کہ جس کے ذریعہ سے نئے طریقوں کا کام میں لانا سیکھیں۔ اسی کے ساتھ ایک کوآپریٹیو کریڈٹ سوسائٹی اور کوآپریٹو اسٹور بھی ہونا چاہیے کہ جہاں سے کاشتکاری کے نئے تخم کھاد اور آلات ملنے میں سہولت ہو۔ علاوہ بریں دیہات میں مکانوں اور حفظان صحت کا بہتر انتظام ہونا بھی ضروری اصلاحوں میں

شمار کیا جانا چاہیئے۔ جہاں تک کہ آخر الذکر اصلاحوں کا تعلق ہے یہ تو زیادہ تر زمینداروں کی کوشش اور خود کاشتکاروں کے خیالات اور عادات کے بہت کچھ تبدیل ہونے پر منحصر ہیں اور اس کے لئے غیر سرکاری احباب کو لکچروں اور پمفلٹوں کے ذریعہ سے دیہات میں تعلیم کی روشنی پہنچانی چاہیے۔ لیکن جہاں تک کہ کاشتکاروں کی دخیل کاری یا نہروں اور ریلوں کے نکالنے اور اسکولوں اور فارموں کے قائم کرنے کا تعلق ہے ان کی ذمہ داری قطعی طور سے حکومت کی ہے۔ حکومت رائے عامہ کی تابع ہوتی ہے۔ لہٰذا ضرورت اور وقت ہے کہ وہ لوگ جو کہ مصلح قوم بننے کا دعویٰ رکھتے ہیں یا جن کے دل میں رعیت کا درد موجود ہے، جو آج کسان سبھاؤں کے قائم کرنے اور اس سلسلے کے پھیلانے کے مؤید ہیں بجائے اس کے کہ کسانوں کو کانگرس میں لے جا کر نون کو اپریشن پر ان سے ووٹ دلوائیں ہزار درجہ بہتر ہوگا کہ ان مسائل پر توجہ کریں۔ ہزاروں اور لاکھوں کسان سبھائیں قائم کرا کر ان کے ذریعہ سے حکومت پر زور ڈالیں کہ وہ یہ اصلاحیں کرنے پر کہ جن کا تذکرہ کیا گیا مجبور ہو اور ان نمائندگان رعیت کو بھی کہ جو کونسلوں میں ان سوالوں کو اٹھائیں گے ان سے تقویت پہنچے۔

جہاں اس قیامت خیز جنگ نے کہ جس کا سلسلہ اب بھی پورے طور سے ختم ہونے پر نہیں آتا، دنیا کو تہ و بالا کر کے برباد کر دیا اور عوام الناس پر تباہی لائی، وہیں شبہ نہیں کہ یہ جنگ سرمایہ داروں، کارخانہ داروں اور کاروبار والوں کے لئے باران رحمت ثابت ہوئی۔ ہزاری لکھ پتی بن گئے اور لکھ پتی کروڑ پتی ہو گئے۔ تجارت اور صنعت و حرفت میں نہ صرف غیر ملک والوں کو بلکہ ہندوستانیوں کو بھی لاکھوں اور کروڑوں کے فائدے ہوئے لیکن مزدور پیشہ جماعت اور کاریگروں کی حالت پھر بھی خاطر خواہ بہتر نہ ہوئی۔ یہ سچ ہے کہ مزدوروں اور کاریگروں کی اجرتیں یہاں بھی اب بہ نسبت سابق کے بہت بڑھ گئی ہیں۔ لیکن جب ضروریات زندگی کی گرانی پر نظر کی جاتی ہے، تو معلوم ہوتا ہے کہ ان لوگوں کی حالت اگر اس گرانی سے بدتر نہیں ہوئی ہے، تو زیادہ بہتر بھی نہیں ہوئی ہے اور تقریباً وہ تمام منافع اور کثیر دولت کہ جو تجارت میں حاصل ہوئی سرمایہ داروں اور کارخانہ داروں کے ہی حصہ میں آئی قدرتی طور پر مزدور پیشہ جماعت میں بے اطمینانی اور بےچینی ہے۔ ہڑتالوں کا سلسلہ جاری ہے اور ان ہڑتالوں کی وجہ سے مزدوروں اور کاریگروں کی اجرت میں کچھ اضافہ بھی ہو رہا ہے۔ لیکن ان جزوی باتوں سے مستقل علاج یا اصلاح ممکن نہیں جب تک اصولی طور پر یہ نہ مان لیا جائے گا کہ مزدوروں اور کاریگروں کا حصہ بھی تجارت و صنعت و حرفت کے منافع میں برابر کا ہے اور ان کی بہتری اور بہبودی بھی اسی قدر فرض اور ضروری ہے کہ جس قدر رعایا کے اور طبقوں کی اس وقت تک مستقل اصلاح ممکن نہیں۔ مزدور

پیشہ جماعت کی بہتری اور بہبودی کے لئے جن اصلاحوں کا ہونا ضروری اور جن مطالبات کا پیش کرنا لازمی ہے ان میں چند خاص کا تذکرہ اشارۃً کیا جاتا ہے۔ مثلاً خاص عمر تک کے بچوں کا فیکٹریوں اور کارخانوں میں کام کرنا ممنوع ہونا چاہیے۔ کام کرنے کے گھنٹے بجائے ۱۲ کے ۹ مقرر ہونے چاہئیں۔ مزدوروں کی اجرت میں اضافہ ہونا چاہیے۔ فیکٹریوں اور کارخانوں میں حادثہ ہو جانے یا زخمی ہو جانے سے مزدوروں یا ان کے پسماندگان کو جو نقصان پہنچتا ہے اور وہ آئندہ روزی کمانے سے ناکارہ ہو جاتے ہیں ان کی تلافی ہونی چاہیے۔ فیکٹریوں اور کارخانوں میں حفظان صحت کے اصولوں اور قاعدوں کی کافی پابندی ہونی چاہیے اور مزدوروں کے لئے ہاسپٹل، اسکول، ریڈنگ روم، اور ان کی بود و باش کے لئے مکانوں کا بہتر انتظام ہونا چاہیے اور سب سے زیادہ بڑی اور ضروری بات یہ ہے کہ یہ اصول تسلیم کیا جاوے کہ سرمایہ کا سود، مزدوروں کی اجرت اور نگرانی اور انتظام کے اخراجات ادا کرنے کے بعد جو منافع کاروبار میں ہو سرمایہ داروں اور مزدوروں میں برابر سے تقسیم ہونا چاہیے۔ ان میں سے بعض اصلاحوں کو عملی جامہ پہنانے کے لئے تو قانون نافذ کرانے اور حکومت کی امداد کی ضرورت ہوگی۔ لیکن بعض محض سرمایہ داروں اور کارخانہ داروں کی خوش فہمی اور انصاف پسندی پر منحصر ہیں۔ بہر صورت، بہر حال رائے عامہ کا تبدیل کرنا اور ان اصلاحوں کے موافق بنانا سب سے پہلا کام ہے۔ جہاں تک ممکن ہو اس کام میں سرمایہ داروں اور کارخانہ داروں کی ہمدردی بھی اگر ہمارے ساتھ ہو تو بہتر ہے ورنہ اگر مخالفت ہونی لازمی اور ضروری ہے تو اس کا مقابلہ بھی کرنا پڑے گا۔

آخر میں ہمیں دو ایک باتیں ان لوگوں کے بھی گوش گذار کرنا ہے کہ جو نشۂ دولت و اقتدار میں مست یہ سمجھتے ہیں کہ دنیا کے تمام زر و زمین، مال و اسباب اور قوت و اقتدار کے وہی دائمی ٹھیکیدار ہیں اور موجودہ نظام معاشرت و تمدن وہ نقش کالحجر ہے کہ جو کبھی مٹائے نہ مٹ سکے گا، ان کو آثار زمانہ سے سبق حاصل کرنا چاہیے اور ہوا کا بدلا ہوا رخ پہچاننا چاہیے۔ اگر پچھلے حوادث جانکاہ و عبرت انگیز نظاروں سے کوئی سبق حاصل ہوتا ہے تو یہی کہ ہوا کا رخ بدل چکا اور اب موجودہ صورت حال یعنی نظام معاشرت اور تمدن کی بلا ترمیم و اصلاح کسی طرح قائم نہ رہ سکے گی۔ تمہارے سامنے اس وقت دو صورتیں ہیں ایک تو یہ کہ جمہوریت اور انصاف کے قائل ہو کر اس دولت و اقتدار میں کہ جس پر تم اس وقت بلا شرکت غیرے قابض ہو، اب از روئے انصاف بتدریج صحیح لیکن یقینی طور پر ان دوسروں کو بھی اپنا حصہ دار بناؤ کہ جو واجبی طور پر اس کا مطالبہ کر رہے ہیں اور اس طرح سے جمہوریت و انصاف کے حامی ہو کر امن و صلح کے پیامبر بنو، یا دوسری

صورت یہ ہے کہ تم اپنی جگہ سے جنبش نہ کرو اور دوسرے زبردستی تم سے اپنا حصہ وزن کر چھین لیں اور تمہارے ساتھ ملک کا امن و امان اور قوم کا شیرازہ بھی تباہ و برباد ہو۔ تیسری اور کوئی صورت نہیں۔ بلا کا طوفان ابھی ابھی ہمارے سروں سے گذر چکا ہے۔ کالی اور گھنگھور گھٹائیں برس کر اب منتشر ہو گئی ہیں۔ بجلیوں کی چمک اور بادلوں کی کڑک بھی مدھم پڑ گئی ہے اور اس طوفانی اور بھیانک رات کی تاریکی بھی اب رفتہ رفتہ کم اور نور کے تڑکے کے آگے کافور ہوتی جاتی ہے۔ صبح امید کا آفتاب افق عالم پر جلوہ افروز ہے اور نسیم سحری کے ہلکے ہلکے جھونکے پژمردہ دلوں کو شگفتہ کر رہے ہیں۔ کون ہے جو فیض قدرت کے اس دل لبھانے والے منظر کا حظ نہ اٹھانا چاہے گا۔ تاہم اگر تمہارے نحیف و لاغر جسم اور تمہاری کمزور طبیعتیں نمود سحر کی اس چمک دمک اور ہوا کے ان خوشگوار جھونکوں کی بھی تاب نہیں لا سکتیں اور تم پر فضا میدانوں کی سیر سے اپنے تئیں معذور سمجھتے ہو تو اپنے گھروں کے گوشۂ عافیت ہی میں بیٹھے رہو، لیکن للہ کمرے کے دروازوں اور دریچوں کو بند نہ کرو، روشنی اور ہوا کو آنے دو، ورنہ ان پرانے دقیانوس مکانوں کا اندھیرا اور سیل ان کو بیماری اور موت کا گھر بنا دے گی اور تمہاری بربادی کا باعث ہو گی۔

(مئی؛ جون، اگست، ستمبر ۱۹۲۰ء) ●●

بالشیوزم

بالشیوک اغراض اور نصب العین نے روس میں جو انقلاب عظیم پیدا کیا ہے اور جس سرعت کے ساتھ قدیم نظام حکومت تمدن و معاشرت کو درہم برہم کیا ہے۔ اس کی کیفیت نہایت خوفناک ہے۔ اندرونِ روس بلکہ تمام اطراف عالم میں بالشیوک اغراض اور نصب العین نے طرح طرح کے اندیشے، وسوسے بلکہ حالت اضطراب پیدا کر دی ہے۔ روس میں بالشیوک جماعت نے جو طوفان انقلاب برپا کیا ہے اس سے قطع نظر کر کے منظر کشت و خون، جبر و تشدد، تباہی امن و نظام، اخلاق و تمدن کی تخریب، مذہبی احکام کی بے حرمتی اور پابندیوں کی تنسیخ اور اس کے ساتھ ملک گیری اور توسیع اثرات بالشیوزم کی دہشت ناک خبریں آئے دن امن پسند پابند مذہب اور با اخلاق باشندگان عالم کو دم بخود بنا رہی ہیں۔ آج اگر اخبارات میں یہ خبر نظر سے گذرتی ہے کہ بالشیوک اثرات ایران اور ترکستان میں پھیل رہے ہیں تو کل افغانستان میں ان کی کامیاب ریشہ دوانیوں کی ترقی ہے۔ یعنی کہ ہندوستان بھی بالشیوک اثرات سے مبرا نہیں سمجھا جاتا۔ اخبار "پائنیر" کی ایک لندنی تار برقی منظر ہے کہ "بالشیوک شمالی ہندوستان میں داخل ہوئے تھے، وہ مہاتما گاندھی اور ان کے رفقا کے شریک ہو کر کام کر رہے ہیں"۔ اگرچہ یہ خبر قابل وثوق نہیں ہو سکتی لیکن اہل ہند کے دلوں میں بالشیوک اغراض و نصب العین کی ہیبت پیدا کرنے کے لحاظ سے بہت کچھ معنی رکھتی ہے۔ مزدوری پیشہ جماعت کی بے چینی۔ آئے دن کی ہڑتالیں، مزدوری میں اضافہ ہونے پر اصرار، اپنے حقوق کی حفاظت کا حس، حکومت کو نیچا دکھانے کے لئے ترک موالات، یہ ایسے واقعات ہیں، جو ہندوستان میں بھی بالشیوک اثرات جاگزیں ہونے کا خیال پیدا کرتے ہیں۔ کیونکہ بالشیوکوں نے اپنا جو پروگرام قرار دیا ہے، وہ اسی حد تک نہیں ہے کہ صرف روس کی مزدور پیشہ جماعت آسودہ حال، خود مختار اور آزاد ہو جائے، بلکہ وہ تمام عالم کی مزدوری پیشہ جماعت کو سرمایہ داروں کی سخت گیری سے نکال کر آزاد بنانے کا تہیہ کئے ہوئے ہیں۔ بالشیوکوں کا بیان ہے کہ ان کی غرض بین الاقوامی طوفان انقلاب سے و شاہنشاہی حکومت کو بزور شمشیر زیر کر کے مزدوری پیشہ جماعت کو مالک و مختار بنانا چاہتے ہیں۔

حالانکہ بالشیوزم یا بالشیوک اغراض اور نصب العین پر انگریزی اور اردو اخبارات کے ذریعہ سے

بہت کچھ روشنی پڑتی ہے۔ تاہم اہل ہند کو اس وقت تک پورے طور پر یہ معلوم نہیں ہے کہ تحریک بالشیوزم کی نوعیت کیا ہے؟ اس کے بانی مبانی کس پایہ کے اشخاص ہیں اور اس تحریک کے حقیقی اغراض اور نصب العین کیا ہیں؟ تحریک بالشیوزم کے متعلق ہمکو جو کچھ معلوم ہو سکتا ہے۔ اس کا ذریعہ خاص بالعموم اخبارات اور بالخصوص وہ ولایتی اخبارات ہیں، جو اس تحریک کے مخالف ہیں۔ لیکن کیفیت یہ ہے کہ مخالفین کی آرا بھی بعض سیاسی امور میں جن کا تعلق بالشیوکوں کے ساتھ ہی بالشیوزم کی متضاد واقع ہوئی ہیں۔ مثلاً ولایتی اخبارات کا وہ طبقہ بالشیوکوں کا خاص طور سے مخالف نظر آتا ہے، جو سرمایہ داروں کا دم بھرتا ہے اور تجارتی حقوق کا حامی ہے اور یہ امر محتاج بیان نہیں ہے کہ یہ طبقہ مزدوری پیشہ جماعت کے ساتھ مراعات کسی طرح پسند نہیں کر سکتا۔ چونکہ اس طبقہ کو قدیم نظام حکومت اور معاشرت کے ساتھ ہمدردی ہے۔ پس وہ بالشیوک تحریک کی مذمت میں بعض اوقات حد اعتدال سے تجاوز کر کے دہشتناک کیفیت پیش کرنے سے دریغ نہیں کرتا۔ دوسری جانب مزدوری پیشہ جماعت کے ہمنوا اخبارات بالشیوکوں کو جمہوری حکومت کا مستحق ثابت کرنے اور ان کے تمام عیوب پر پردہ ڈالنے کی کوششوں میں منہمک رہتے ہیں۔ غرض اہل ہند کو خطرناک تحریک بالشیوزم کی مستند اور یک گونہ مفصل کیفیت معلوم ہونے کی اشد ضرورت محسوس ہو رہی ہے۔ اگرچہ اس ضرورت کے پورا کرنے کے لئے یہ سلسلہ مضامین کسی طرح کافی نہیں ہو سکتا۔ تاہم یہ کوشش کی جائے گی کہ مستند اور معتبر ذرائع سے جو حالات معلوم ہو سکتے ہیں ان کی بنا پر ابنائے وطن کو مختصراً یہ بتا دیا جائے کہ اس تحریک کی ابتدا کیونکر ہوئی اور جو لوگ روس میں اس تحریک کے بانی مبانی ثابت ہوئے ہیں، ان کے اغراض اور نصب العین کیا ہیں:

بالشیوزم کی ابتدا: روس میں سوشل ڈیموکریٹک تحریک کا آغاز کب اور کیونکر ہوا اس کا پتہ چلانا ناممکن ہے۔ مارچ سنہ ۱۹۱۷ء میں روس میں انقلاب عظیم نمودار ہوا۔ اس کے قبل روسی اخبارات سخت ترین بندشوں میں جکڑے ہوئے تھے۔ سنسر کی سخت گیری کا خوف ان کی زبان بند کئے ہوئے تھا۔ خفیہ پولیس ہر وقت اس جستجو میں سرگرم رہتی تھی کہ سوشلسٹ ایجی ٹیشن کس ڈھنگ سے چل رہا ہے۔ ایسی حالت میں کسی غیر ملکی سیاح کے لئے نہ تو کسی امر کی تحقیقات کا موقع تھا اور نہ اس کے قبضہ میں وہ دلچسپ کاغذات آ سکتے تھے جن سے اس تحریک کی پردہ دری ہوتی۔ اگرچہ مارکس کے عقائد روشن ضمیر روسی طبقات پر کئی سال سے اپنا اثر جمائے ہوئے تھے۔ لیکن تمام تر روس کی ایک سوشل ڈیموکریٹک پارٹی قائم کرنے کی صریح کوشش کا آغاز ۱۸۹۸ء سے ہوا۔ یعنی ۱۸۹۸ء میں اس تحریک کے مختلف دلدادہ جنہوں نے بمقام منسک یکجا ہو کر اپنی ایک پارٹی بنائی جس کا

نام "روس کی سوشیل ڈیموکریٹک لیبر پارٹی" قرار پایا۔ اس کانگرس میں ایک مرکزی کمیٹی بھی مقرر ہوئی تھی جس کو حکومت نے فوراً گرفتار کر لیا۔ لیکن باایں ہمہ پانچ سال کے اندر اس پارٹی نے معقول ترقی کی اور تمام تر روس میں اس کی شاخیں نہایت سرعت کے ساتھ پھیلنے لگیں۔ حتیٰ کہ اس پارٹی نے اس درجہ اقتدار حاصل کیا کہ انقلاب عظیم کے قبل روس کا ایک ایک مزدور سوشلزم کا حامی بن گیا تھا۔ اس پارٹی کی کانگریس کا دوسرا اجلاس جولائی و اگست ۱۹۰۳ء میں پہلے بروسلز اور پھر لندن میں منعقد ہوا۔ اس کانگریس میں حاضرین کی بہت بڑی تعداد موجود تھی۔ کیونکہ کانگریس کے سامنے ایک یہ اہم کام درپیش تھا کہ اپنی پارٹی کی تنظیم کے لئے قواعد اور آئین مرتب کئے جائیں اور سیاسی جدوجہد کا پروگرام تیار کیا جائے، جس کے مطالبات خاص میں ڈیموکریٹک ری پبلک اور کانسٹی ٹیوشنٹ اسمبلی کا قائم ہونا تھا۔ اس کانگرس میں دوران مباحثہ نہایت گرما گرمی رہی اور پارٹی کے نظام کے متعلق بہت کچھ اختلاف رائے ہوا۔ ایک پارٹی نے جس کا سرغنہ لینن تھا اپنے اس مطالبہ پر زور دیا کہ مرکزی کمیٹی میں تمام اختیارات مرکوز رہیں۔ انفرادی جدوجہد نہایت سختی کے ساتھ رد کا جائے اور اس پارٹی کا ممبر بنانے کے لئے سخت ترین مجوزہ قواعد مرتب کیا جائے۔ دوسرا فریق جس کا رہنما مارتف تھا اگرچہ پارٹی کے ڈماکریٹک اصول کا حامی تھا ساتھ ہی ساتھ اس کی یہ خواہش تھی کہ مقامی انجمنوں کی آزادی میں اضافہ ہونا چاہیئے۔ کانگرس میں یہ سوال بھی اٹھایا گیا کہ اگر انقلاب کی تحریک کامیاب ثابت ہوئی تو اس پارٹی کی پالیسی کیا ہوگی؟ اس کے متعلق بھی اختلاف رائے ہوا۔ مارتف کے حامیوں کی رائے تھی کہ آزاد خیال امراسے برائے چندے مزاحمت نہ کی جائے۔ لیکن لینن اس بات پر زور دیتا رہا کہ زار کی حکومت کو امرا کی مدد سے پلٹنا اور اس کے بجائے ڈیموکریٹک ری پبلک قائم کرنا سرمایہ داروں کا زور بڑھنا ہے۔ اس اختلاف رائے کا نتیجہ یہ ہوا کہ ڈیلیگیٹوں کی تعداد غالب یا "بالشنستو" نے لینن کے موافق ووٹ دیئے، جو بالشیوکی کے نام سے نامزد ہوئی اور تعداد قلیل یا منشنستو۔ منشی وکی کہلائی۔ غرض بالشیوکون کی اصلیت یہی ہے، جو اوپر بیان کی گئی ہے۔ یہ بیان سراسر لغو ہے کہ بالشیوزم کے معنی تعداد غالب یا جمہور کی حکومت ہیں اور جو لوگ ایسا خیال کرتے ہیں، وہ بالشیوزم کی نوعیت سے ناواقف ہیں۔

۱۹۰۵ء کے انقلاب عظیم میں دونوں پارٹیوں کو متحد کرنے کی مزید کوشش اگرچہ ایک حد تک کامیاب ہوئی لیکن منشیوک اخبارات کی زبان بندی اور سوویٹ سے منشیوک لیڈروں کے اخراج کی کارروائیوں نے باہمی اختلاف دور کرنے کے بجائے اس کو اور زیادہ پائیدار بنا دیا۔ ۱۹۰۵ء سے بالشیوکون کی انقلاب انگیز جدوجہد بڑھتی گئی

چنانچہ ایک بالشیوک لیڈر کا بیان ہے کہ بالشیوک اور منشیوک میں یہ فرق ہے کہ ایک میں اپنے عقائد پر قائم رہنے کی ہمت ہے اور دوسرے میں نہیں ہے۔ زیادہ واضح الفاظ میں یوں سمجھنا چاہیئے کہ منشیوک کے رہنما ڈیموکریٹک اصول میں اور وہ اس کے حامی ہیں کہ نوع انسان کو اپنی مرضی آزادی کے ساتھ ظاہر کرنے کا موقع ملنا چاہیئے لیکن بالشیوکوں کی رائے ہے کہ ڈیموکریسی سے سرمایہ داروں کو زک نہیں پہنچیگی بلکہ یہ سوشیل ترقی کے حق میں واقعی ایک سدِ راہ پیدا ہو جائے گی۔ چنانچہ بالشیوک جماعت نے اپنی پارٹی کے نام سے ڈیموکریسی کا لفظ حذف کر دیا ہے اور اس کی پالیسی یہ ہے کہ بزورِ شمشیر فوراً کمیونزم قائم کی جائے۔ منشیوک جماعت خانہ جنگی کے دردناک مظاہروں سے دور بھاگتی ہے۔ لیکن بالشیوک جماعت کو اس سے دریغ نہیں ہے کہ اُمرا اور سرمایہ داروں کو مزدوری پیشہ جماعت نہایت بیدردی کے ساتھ پامال کرے اور بین الاقوامی بالشیوک انقلاب کا طوفان برپا رہے۔ ایک بالشیوک سرغنہ نے نہایت وضاحت کے ساتھ بتایا ہے کہ بالشیوک اور دیگر سوشلسٹ جماعتوں میں کیا فرق ہے، وہ لکھتا ہے:

"جنگ نے سوشل ڈیموکرٹک پارٹیوں میں بے نظیر تفرقہ پیدا کر دی ہے اور اب ہم کو تین گروہ نظر آتے ہیں۔ ایک گروہ وہ ہے، جو مزدوری پیشہ جماعت کے ساتھ نمک حرامی کرتا ہے، وہ جنرلوں کے ایسے بوٹ صاف کرتا ہے، جو مزدوری پیشہ جماعت کے خون سے آلودہ ہیں۔ فرانس اور انگلستان میں اس قسم کے بہت سے حضرات موجود ہیں۔ دوسرا گروہ وہ ہے، جو اپنی حکومتوں کے خلاف جد و جہد تو کرتا رہتا ہے لیکن انقلابی جد و جہد جاری کرنے کی اہلیت نہیں رکھتا۔ وہ مسلح ہو کر جد و جہد کرنے سے ڈرتا ہے۔ حالانکہ صرف اسی طریقہ سے سوال زیرِ بحث حل ہو سکتا ہے۔ تیسرا گروہ غیر ملکی بالشیوکوں کا ہے۔ ان کی حکمت عملی اور رائے وہی ہے جو ہماری ہے۔"

بالشیوکوں کا ایک خاص طریقہ یہ ہے کہ جو لوگ اُن کے ہمنوا اور ہمخیال نہیں ہیں۔ اُن کو وہ ہرگز نہیں بخشتے۔ بالشیوک سوشلزم کے سوا وہ ہر قسم کی سوشلزم کو مزدوری پیشہ جماعت کا دشمن سمجھتے ہیں۔

بالشیوک لیڈر: ایک مشہور فرانسیسی عالم کا قول ہے کہ "انقلاب انگیز کشمکش میں رعایا جو حصہ لیا کرتی ہے وہ ہر موقعہ پر قریب قریب یکساں ثابت ہوا ہے۔ رعایا نہ تو انقلاب کے تدابیر سوچتی ہے اور نہ اس کی رہنمائی کرتی ہے۔ لیڈروں کے ذریعے رعایا کی سرگرمی میدان عمل میں نمودار ہوتی ہے۔"

چنانچہ روس کے حق میں جہاں ۸۰ فیصد آبادی ناخواندہ ہے یہ مقولہ نہایت صادق آتا ہے اور اس لئے یہ بتا

دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ جن حضرات نے روس میں طوفان انقلاب برپا کیا ہے۔ وہ کس رنگ اور کس پایہ کے آدمی ہیں۔ ایک اہل الرائے کا بیان ہے کہ "بالشویک لیڈر چاہے کیسے ہی ملحد کیوں نہ ہوں لیکن وہ اپنے عقائد کے پکے ہیں ان میں بہت سے ایسے ہیں جنہوں نے سالہا سال تک جلاوطنی اور قید کی زحمتیں خندہ پیشانی کے ساتھ اٹھائی ہیں اور بعض نے جان دیدی۔ لیکن اُن کے عقائد میں لغزش ہونے نہ پائی۔ بعض کی یہ کیفیت ہے کہ اگرچہ وہ دولتمند خاندانوں کے افراد ہیں لیکن انہوں نے اپنے مقاصد کی کامیابی کے لئے دولت اور ثروت کو لات مار دی۔ چونکہ انہوں نے نہ کسی کے ساتھ رحم کیا نہ ان کو یہ توقع ہے کہ جب ان کی قسمت برگشتہ ہوگی، تو کوئی شخص اُن کے رحم کرے گا۔ بہت سے لیڈر ایسے ہیں جو بغاوت پیشہ رہے ہیں اور جو طرح طرح کی تکلیفیں برداشت کرتے کرتے زندگی سے بیزار ہو رہے ہیں۔ یہ ظاہر ہے کہ ایسے لوگوں کو کس کی پرواہ اور کس بات کا لحاظ ہو سکتا ہے۔ ان کو نہ اپنے ملک کی فکر، نہ اہل وطن کا درد۔ تمام عالم اُن کا ملک ہے جہاں ان کو عیش و آرام کے ساتھ دن گذارنے کا موقع ملے، وہی ان کا ملک ہے۔ انقلاب برپا ہونے میں وہ اپنا نفع سمجھتے ہیں کہ بہت دن مصیبت میں گزرے، خیر اب تو کچھ روز راحت کے ساتھ گذریں گے۔ عاقبت کی خبر خدا جانے"۔ بالشویک جماعت کے کارکن طبقہ میں یہودیوں کا اقتدار بھی بڑھا ہوا ہے۔ اگرچہ تحریک بالشویزم روشن ضمیر اور تعلیم یافتہ گروہ کی دماغ سوزی کا نتیجہ ہے اور متوسط الحال فرقوں کو اس پر اقتدار کامل حاصل ہے جنہوں نے کبھی محنت مزدوری نہیں کی ہے لیکن مزدوری پیشہ جماعت میں اس کے حامیوں کی بہت بڑی تعداد پائی جاتی ہے اور یہ وہی جماعت ہے جس کو [illegible] روس میں بالشویک خفیہ طور سے اپنے مطلب کی تعلیم دیا کرتے تھے اور آج وہ دل و جان سے لینن [illegible] پر فدا ہے اور ان دونوں لیڈروں کے احکام کی تعمیل داخل مذہب فرض بھی ہے اور بلا حجت اور چون و چرا لیڈروں کے احکام کی تعمیل کیا کرتی ہے اور ایک فرقہ بھی بالشویکوں کا حامی ہے جو اُن کے [illegible] کو تو پسند کرتا ہے لیکن ان کا طرز عمل پسند نہیں کرتا۔ بلکہ یہ کہنا چاہیئے کہ وہ رفتار واقعات کا ساتھ دے رہا ہے۔ یعنی جب اس نے دیکھا کہ بالشویک کامیاب ہو رہے ہیں، تو وہ ان کا حامی بن گیا۔ لیکن اس گروہ میں ضروری انسانیت موجود ہے۔ وہ غارت گری اور خونریزی کا مخالف ہے۔ مگر مشکل یہ ہے کہ اس میں جرأت اور ہمت نہیں ہے اور بدیں وجہ اپنے دلیر اور ذی ہمت ہم جلیسوں کی زبردست قوت کے سامنے دم مارنے کی تاب نہیں رکھتا وہ ہمیشہ تعداد غالب کا ساتھ دیتا ہے۔

ایک واقف کار کا بیان ہے کہ "اگرچہ تحریک بالشویزم کے مجرمانہ عناصر کے متعلق اخبارات نے بہت

کچھ لکھا ہے۔ لیکن ان کے بیانات خالی از مبالغہ نہیں ہیں اور اگرچہ سب لیڈر بے تاہم اُن کی تعداد عظیم پاک دامن ہے۔ یہ امر محتاجِ بیان نہیں ہے کہ تمام مہذب سوسائٹیوں میں اچھے اور بُرے بداخلاق اور جرائم پیشہ افراد پائے جاتے ہیں اور روس اس بارے میں اپنے ہمسایہ ممالک سے بہتر نہیں ہو سکتا۔ انقلاب عظیم نے اس فرقہ کو انوکھا موقع دیا اور بالشیوک اسامیوں پر مامور ہو کر اس نے خوب بغلیں بجائیں۔ چنانچہ بالشیوکوں کو خود اس کا اعتراف ہے اور بالشیوک اخبارات میں آئے دن سوویٹ اہل کاروں کی بددیانتی، چوری اور دغابازی کے واقعات شائع ہوا کرتے ہیں۔ روس جیسے غیر تعلیم یافتہ ملک میں جہاں بددیانتی کا بازار ہمیشہ گرم رہتا ہو یہ کیونکر ممکن تھا کہ بالشیوک تمام عیوب کو اس قدر جلد دور کر دیتے۔ اب بھی یہ کیفیت ہے کہ بالشیوک اہل کار بندۂ زر ہیں۔ اگر ان کا ہاتھ گرم کر دیجئے تو جو چاہے کرا لیجئے۔ بالشیوک تحریک اور پارٹی کا روح رواں صرف ایک شخص ہے جس کا نام لینن ہے۔ اس میں چاہے جو عیوب اور کمزوریاں ہوں لیکن وہ ایک عجیب و غریب ہستی ہے۔ قرینہ غالب یہ ہے کہ لینن ایک نہ ایک دن جلیل القدر شخص کی حیثیت سے دنیا میں دائمی شہرت حاصل کرے گا۔ اس کے عروج کا باعث انقلاب عظیم کی کامیابی یا اس کی قوتِ گویائی نہ ہوگی جس کے ذریعہ سے وہ بڑی سی بڑی جماعت کو آناً فاناً اپنا ہم نوا اور ہم خیال بنا لیتا ہے بلکہ اس میں ایک یہ خاص وصف ہے کہ وہ بہت بڑی ہمت کا آدمی ہے اس کی جسارت جرأت افزا ہے اور وہ جو رائے قائم کرتا ہے اس پر اس کو اس درجہ وثوق ہوتا ہے کہ کسی کے [illegible] نہیں ہٹتا۔ چونکہ اپنے ہم جلیسوں میں سب سے بہ لحاظ عمر بڑا ہے لہٰذا وہی تمام تر تحریک کا رہنما اور ہادی ہے وہ عام جلسوں میں شاذ و نادر ہی نظر آتا ہے لیکن گوشۂ تنہائی میں بیٹھا ہوا اپنی حکومت کے ہر ایک صیغہ پر نہایت خوبی کے ساتھ قابو رکھتا ہے۔ اس میں شبہ نہیں ہے کہ اس کے ہم جلیس بھی اس کی دلی عزت کرتے ہیں اور یہ لینن ہی کا اثر ہے کہ اس وقت تک اس کی پارٹی متحد ہے۔ یہاں رشک، حسد اور رقابت کا دخل نہیں ہے جو روسی پارٹیوں کا ایک عام خاصہ ہے۔ لینن کو بےشک اس بات کا فخر ہو سکتا ہے کہ وہی پہلا شخص تھا جو چار سال کی متواتر جنگ سے پیدا ہونے والی بےچینی اور اضطراب کی تہ تک پہنچا۔ جس روز سے جنگ چھڑی تھی وہ یہ سمجھا تھا کہ یہ لڑائی ایک نہ ایک دن ضرور رنگ لائے گی اور شاخِ گل جھونکا کھائے گی۔ چنانچہ اس نے اپنے مقاصد میں کامیاب ہونے کے لئے اسی روز سے تیاریاں شروع کر دی تھیں۔ ماہ مارچ ۱۹۱۷ء میں روسی انقلاب عظیم اس کے حق میں تائید ایزدی ثابت ہوا۔ لینن نے یہ رائے قائم کر لی تھی کہ سرمایہ ہی تمام خرابیوں کی جڑ ہے۔ جس ملک میں سرمایہ دار برسرِ اقتدار ہوں گے۔ وہاں کبھی سوشلسٹوں کی تحریک حب وطن کا فروغ ناممکن ہے چنانچہ

اس کی تمام تر کوشش اور قابلیت اس میں صرف ہوتی رہی کہ روس کسی طرح جرمنی کے ساتھ صلح کرے اور بعد ازاں وہ اپنے پوزیشن مستحکم بنا کر شاہنشاہی جنگ کو خانہ جنگی میں تبدیل کر دے۔ لینن اور زنووف اپنی ایک تصنیف کی تمہید میں لکھتے ہیں :

"ایک موقع پر یہ بحث اٹھائی گئی تھی کہ اگر دورانِ جنگ میں انقلاب عظیم برپا ہوا تو مزدوری پیشہ جماعت کو کیا کرنا چاہئے۔ ہم نے یہ جواب دیا تھا کہ ہم تمام برد آزماؤں کے ساتھ اس بنا پر صلح کر لیں گے کہ وہ نو آبادیوں اور تمام محکوم اور پامال اقوام کو آزاد کر دیں۔ جرمنی، فرانس اور انگلستان بحالت موجودہ ہماری اس شرط کو قبول نہیں کریں گے۔ ہم بعد ازاں جرمنی کے ساتھ علیحدہ صلح کر کے قطعی تدابیر کے ساتھ اپنا پروگرام شروع کر دیں گے اور باقاعدہ طور سے ان تمام ممالک کی رعایا میں بغاوت کے شعلے بھڑکائیں گے جن پر روسی حکام ظلم توڑ رہے ہیں، نیز نو آبادیوں اور محکوم ممالک ایشیا، ہندوستان چین و ایران وغیرہ میں۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کریں گے کہ یورپ کی سوشلسٹ مزدوری پیشہ جماعت کو ان کی حکومتوں کے خلاف اُبھاریں گے۔ اس میں شبہ نہیں ہے کہ روس میں مزدوری پیشہ جماعت کی فتح ایشیا اور یورپ میں طوفان انقلاب برپا ہونے کے لاثانی اور مفید حالات پیدا کر دیگی۔"

روس میں بالشیوک تحریک کی آزمائش کے لئے جرمنی اور اتحادیوں کے ساتھ سلسلہ جنگ جاری رہنا ضروری تھا کیونکہ اس میں بالشیوک تحریک کی کامیابی مقصود تھی اور جرمنی کے ساتھ روس کا علیحدہ صلح کر لینا لینن ہی کا کارنمایاں تھا۔ ۱۹۱۸ء میں بہت سے بالشیوک جرمنی کے ساتھ لڑائی چھیڑنے پر آمادہ تھے لیکن لینن اس بات پر اڑا رہا کہ روس کا مالدار سے مالدار حصہ کیوں نہ ہاتھ سے نکل جائے لیکن جرمنی کے ساتھ صلح قائم رہے اصلیت یہ ہے کہ لینن اس تاک میں تھا کہ روسی سپاہ اور رعایا جب جنگ و جدل سے بیزار ہو جائے تب اس کو جنگ سے نجات دلوا کر اپنا مرید اور ممنون بنائے، چنانچہ لینن عوام الناس سے یہ کہا کرتا تھا۔ "تم کیا چاہتے ہو؟ اگر زمین چاہتے ہو تو لے لو۔ کیا کارخانوں پر قبضہ کرنا چاہتے ہو، وہ تو تمہاری جائداد ہے۔ روپیہ درکار ہو تو بینک تمہارے ہیں۔ بیشک صلح فوراً ہو جانی چاہیئے اور ملک میں امن و امان قائم ہونا چاہئے۔" لینن ہی بالشیوک قانون وضع کرتا ہے۔ تمام احکام اسی کے پیشگاہ سے جاری ہوتے ہیں اور بالشیوک دستور العمل اسی کی دماغ سوزی کا نتیجہ ہے اور بدیں وجوہ ہم بالشیوک اغراض اور نصب العین معلوم کرنے کے لئے تصنیفات لینن ہی کی

ورق گردانی کریں گے۔

بالشیوک مقاصد: لینن کا ایک خاص مقصد یہ ہے کہ تمام تر بلاد یورپ میں بین الاقوامی بالشیوک انقلاب کے ذریعہ سے کمیونزم قائم ہو جائے۔ لینن "تمام تر بلاد یورپ" پر خاص طور سے زور دیتا ہے کیونکہ اس کو اس بات کا اعتراف ہے کہ کمیونزم کا پابند روس سرمایہ داروں کے حامی یورپ کے سامنے پیش نہیں پا سکتا دسمبر ۱۹۱۸ء میں لینن نے اپنی ایک تقریر کے ضمن میں کہا ہے:

"مغربی اطراف یورپ اور نیز روبہ ترقی ممالک کی مزدوری پیشہ جماعت کے ساتھ ہماری خاص امیدیں وابستہ ہیں اور اس جماعت کا ہم کو خاص طور سے سہارا ہے۔"

لینن کا ہمیشہ سے ایک یہ خاص سیاسی عقیدہ رہا ہے کہ اُمرا کے ساتھ ہرگز مصالحت نہ کی جائے۔ سوویت دستور العمل کے پیراگراف نمبر ۳ میں یہ الفاظ درج ہیں:

"تمام ممالک میں سوشلزم کی فتح"

اور یہی سوویت ری پبلک کا مقصد خاص ہے۔ بالشیوک سوشلزم میں کوئی جدت نہیں ہے۔ ایک بالشیوک لیڈر کہتا ہے:

"ہم نے وہی نام رکھا ہے جو کارل مارکس کی انقلاب انگیز پارٹی کا نام تھا۔ بالشیوکوں کا منزل مقصود کمیونزم کی دلدادہ ریاست ہے، جو ہر قسم کی حکومت کو برباد کر دے گی حتّٰی کہ ڈیموکریٹک حکومت کو بھی باقی نہ رکھے گی۔"

لینن اپنی ایک تصنیف میں لکھتا ہے:

"تمام تر تواریخ عالم میں ہر قسم کی حکومت دولتمند فرقہ کے ہاتھ میں زبردست فرقوں کی پامالی کا ہتھیار ہے۔ زبردست فرقے جب فتحیاب ہوں، تو ان کے ہاتھ میں بھی ایسا ہی ہتھیار آنا چاہیے۔ حتّٰی کہ کسی قسم کی مخالفت کا نام و نشان ہی باقی نہ رہے۔"

کمیونسٹ پارٹی کے آئندہ نظام میں کسی شخص کو یہ کہنے کا استحقاق حاصل نہیں ہے کہ فلاں جائداد اس کی نجی کی جائداد ہے۔ تمام دولت سوسائٹی کی ہے نہ کہ متفرق فرقوں کی یا مختلف اشخاص کی۔ حکومت کا نام و نشان باقی نہیں رہے گا۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایک مرکزی بیورو قائم رہے گا جو یہ:

"فیصلہ کرے گا کہ کتنے بوٹ اور پاجامے ہر سال تیار ہوں، کتنا گیہوں بویا جائے، کتنا تیار

کیا جائے۔ کتنے بھائی کھیتوں پر کام کریں۔ کتنے کارخانوں میں اور کتنے دکانوں پر۔ ہر چیز ٹھیک حساب سے پیدا کی جائے گی۔"

یہ ظاہر ہے کہ روس کے سے جاہل اور ناخواندہ ملک میں دفعتاً بزور شمشیر کمیونزم قائم کرنے کی کوشش ایک آفت ناگہانی ثابت ہوئی ہوگی۔ لیکن باایں ہمہ بہت لوگ کمیونزم کے نصب العین پر مٹے ہوئے ہیں۔ بالشیوکوں نے نہ صرف بنکوں، کارخانوں اور زمین کو قوم کی ملک قرار دیا ہے بلکہ تمام پرائیوٹ جائداد اور دکانات حتیٰ کہ کتابوں پر بھی دست تظلم دراز کیا ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ تمام ملک میں خانہ جنگی جاری ہے۔ لیکن بالشیوک جو ارادہ کر چکے ہیں اس پر قائم ہیں۔ وہ ایسے مستقل مزاج ہیں کہ ان کو کسی بات کی پرواہ نہیں۔ وہ اپنے دشمنوں کو ہر طرح سے دبانے اور اُن کی زبان بند کرنے کی کوششوں میں ہمہ تن معروف ہیں۔

بالشیوک آئین: تعلیم یافتہ فرقے بالشیوکوں کے مخالف ہیں۔ تمام سوشلسٹ پارٹیاں حتیٰ کہ انارکسٹ بھی ان سے علیحدہ ہیں اور کسانوں کی تعداد عظیم ان کے دام تزویر میں اس وقت تک نہیں پھنسی ہے۔ بالشیوک آئین سے واضح ہوتا ہے کہ جن فرقوں کی جانب سے اندیشے ہیں، ان کو ہر طرح سے بے دست و پا بنانے کی کوشش کی گئی ہے۔ بالشیوکوں کا تمام تر زور و شور شہری مزدوری پیشہ جماعت پر مبنی ہے۔ بالشیوک آئین کی چند خاص خاص دفعات ملاحظہ فرمائیے:

> آل رشین کانگریس آف سوشلسٹ کہ مالک و مختار کل ہے۔ اس کانگریس میں شہری نمائندوں کی تعداد ۲۵ ہزار ووٹروں کی جانب سے ایک ڈیلیگیٹ اور حکومت کے نمائندوں کی تعداد ایک لاکھ ۲۵ ہزار ووٹروں کی جانب سے ایک ڈیلیگیٹ کی شرح سے ملجائے گی۔ انتظامی کمیٹی میں ڈیلیگیٹوں کی تعداد دو سو سے زیادہ نہ ہوگی۔ مرکزی انتظامی کمیٹی قانون وضع کرے گی اور تمام ترنظم ونسق اور اقتدار اس کے سپرد ہوگا۔"

ووٹ دینے کا حق کن لوگوں کو حاصل ہوگا؟

> "۱۸ سال سے زائد عمر کے وہ تمام مرد اور عورتیں جو وسائل زندگی پیدا کرنے میں معروف ہیں، وہ لوگ جو خانگی کام ان لوگوں کے واسطے انجام دیں جو وسائل زندگی پیدا کرنے میں معروف ہیں مثلاً کاریگر، ہر قسم کے نوکر، جو صنعت و حرفت اور زراعت میں مدد دیں، اور کاسک جو مزدوروں سے کام نہ لیں۔ سویٹ افواج کے سپاہی، ملاح، وہ باشندے جو خود محنت و مشقت نہ کر سکتے ہوں۔

کون لوگ ووٹ نہ دے سکیں گے ؟

"جو ذاتی نفع کے لئے مزدوروں کو نوکر رکھیں گے ۔ جو دوسروں کی محنت و مشقت سے نفع اٹھائیں گے نہ کہ اپنی محنت و مشقت سے ۔ مثلاً سود خوار، صنعت و حرفت یا جائداد سے فائدہ اٹھانے والے تاجر اور تجارتی ایجنٹ ۔ گرجوں کے مالک یا مذہبی رسوم انجام دینے والے تنخواہ دار سپاہی، پولیس کے ملازم اور ایجنٹ اور شاہی خاندان روس کے تمام افراد، نیز اینٹی بالشیوک سوشلسٹ "۔

کسانوں کی جماعت دو طبقوں میں تقسیم کی گئی ہے ۔ ایک امیر اور دوسرا غریب ۔ آخر الذکر طبقہ میں اُن کسانوں کا شمار ہے جن کے پاس کافی غلہ ذاتی اغراض کے لئے نہ ہو ۔ ان کسانوں کی ۔۔۔ (افلاس) کمیٹیاں مرتب کی گئی ہیں ، جن کو دیہی معاملات کے انصرام کا اختیار برائے نام حاصل ہے ۔ کسانوں کا مسئلہ بالشیوکوں کے لئے بھی نہایت اہم اور پیچیدہ ثابت ہوا ہے ۔ لینن نے اپنی ایک تقریر میں کہا ہے :

" اس میں شبہ نہیں ہے کہ روس کے سے ملک میں جو کسانوں کا ملک ہے سوشلزم قائم ہونا مشکل ہے ۔ اس میں شبہ نہیں ہے کہ زار کی سی حکومت اور بڑے بڑے زمینداروں کے سے دشمنوں کو نیست و نابود کر دینا آسان کام تھا ۔ مرکزی مقامات پر یہ مسئلہ چند روز کے اندر حل ہو گیا ۔ تمام ملک میں چند ہفتے صرف ہوئے ۔ لیکن اب ہم جس کام میں مصروف ہیں اس کی تکمیل بہت دیر میں ہو گی اور وہ بھی سخت ترین جد و جہد کے بعد "

جن اضلاع کے کسانوں کو زمانہ جنگ میں کسی قسم کی تکلیف نہیں پہنچی تھی اور اثرات جنگ سے محفوظ رہ سکے تھے ۔ وہ بہت خوشحال تھے اور انہوں نے بالشیوکوں کی یہ دعوت نہایت جوش مسرت کے ساتھ قبول کی تھی کہ "سالہا سال سے جو زمین تم کو نہیں ملتی تھی اس پر قبضہ کر لو " لیکن ساتھ ہی جب ان کسانوں کو معلوم ہوا کہ بالشیوکوں نے یہ حکم نافذ کر دیا ہے کہ آلات کاشتکاری مویشی اور دکانوں کا غلہ سوسائٹی کا مال ہے ، تو بہت برافروختہ ہوئے لیکن کر ہی کیا سکتے تھے ۔ مزدوری پیشہ فرقوں اور کسانوں کے بچوں کی تعلیم کے لئے لینن نے حکم صادر کیا ہے کہ ان کو تعلیم مفت دی جائے ۔ اگرچہ یہ اصلاح فوراً عمل میں نہیں آسکتی تھی لیکن رعایا میں بالشیوک تعلیم پھیلانے کی معقول سرگرمی پائی جاتی ہے ۔ ماسکو میں ایک سوشلسٹ دارالعلوم بھی قائم کیا گیا ہے ، ایک واقف کار کا بیان ہے :

یہ ان اسکولوں میں کچھ بھی تعلیم نہیں ہوتی۔ البتہ کسانوں اور کاریگروں کے لڑکوں کو ایجی ٹیٹر (شوریدہ سر) بنایا جاتا ہے۔ جب وہ کچھ سیکھ جاتے ہیں کارخانوں اور دیہاتوں میں بدیں غرض بھیج دیئے جاتے ہیں کہ وہ اپنے جاہل بھائیوں کو بالشیوک مقاصد سے آگاہ کریں"

باوجودیکہ ملک میں شدید گرانی ہے۔ اجناس اور دیگر اشیا کی قلت ہے۔ آبادی گھٹ گئی ہے اور نوٹ کی قیمت بہت گر گئی ہے لیکن مزدوری پیشہ جماعت کے لئے بالشیوزم نعمت غیر مترقبہ ثابت ہو رہی ہے۔ وہ امرا کے محلوں میں رہتے ہیں۔ ان کے واسطے تھیٹر بھی ہیں اور ارزاں کتب بافراط بہم پہنچائی جاتی ہیں۔ لیکن ساتھ ہی ان کی آزادی اور عیش و آرام اس شرط کے ساتھ مشروط ہے کہ وہ بالشیوک احکام کی تعمیل بلا چون و چرا کرتے رہیں۔

بالشیوکوں نے گرجوں کو خدا اور ان میں ادا ہونے والی مذہبی رسوم کو موقوف کر دیا ہے۔ روسی جنتری منسوخ کر کے یورپ کی جنتری جاری کی ہے اور اپنی حکومت کے سال اوّل سے سنہ شروع کیا ہے۔

اس مضمون کے ابتدائی حصے میں یہ تحریر کیا گیا ہے کہ بعض اینٹی بالشیوک اخبارات نے بالشیوکوں کی مذمت میں مبالغہ سے کام لیا ہے اور اُن کے بعض آئین کو نہایت ہی خراب اور نفرت انگیز رنگ میں دکھایا ہے۔ مثلاً ایک مرتبہ یہ خبر تمام اخبارات میں گشت کر رہی تھی کہ بالشیوکوں نے باضابطہ رسم شادی منسوخ کر دی ہے کیونکہ اُن کی رائے ہے کہ اس طریقہ سے صرف امرا کو حسین بیویاں نصیب ہوتی ہیں اور غربا اس نعمت سے محروم رہ جاتے ہیں۔ چنانچہ بالشیوکوں نے عورتوں کو قومی ملک قرار دیا ہے۔ لیکن اصلیت کچھ اور ہے۔ ولایت کے ایک معزز اور مشہور ماہوار رسالہ کنٹمپوریری ریویو نے بالشیوک آئین شائع کئے ہیں۔ مثلاً شادی کے متعلق جو قانون نافذ ہوا ہے اس کے خاص خاص دفعات حسب ذیل ہیں:

"(دفعہ ۵۲) صرف سول میرج جس کا اندراج سرکاری رجسٹروں میں کیا جائے گا بیاہے ہوئے اشخاص کے حقوق اور فرائض قائم کرے گی۔ جو شادی مذہبی رسوم کے مطابق کسی ملت کے ہادیانِ دین کے ذریعہ سے ہوگی اس سے بیوی اور شوہر کے حقوق و فرائض قائم نہ ہوں گے جب تک کہ شادی کی باضابطہ رجسٹری نہ ہوئی ہو"

"(دفعہ ۶۶) بروقت شادی عورت کی عمر ۱۶ سال کی اور مرد کی ۱۸ سال کی ہونی چاہیئے۔

(دفعہ ۶۸) جن کی شادی ایک مرتبہ باضابطہ ہو چکی ہو، اُن کو پھر شادی کرنے کا استحقاق حاصل نہ ہوگا۔

(دفعہ ۶۹) ایک سلسلۂ نسب میں شاخ اور جوڑ کے رشتوں میں اور نیز بھائی بہنوں میں شادی ممنوع ہے۔

(دفعہ ۷۰) جب مرد اور عورت رضامند ہوں گے، تب ہی شادی ہوسکیگی۔

(دفعہ ۸۱) مرد یا عورت کی آزادانہ مرضی کے بغیر یا جب خوب سمجھ بوجھ کر فریقین رضامند نہ ہوئے ہوں، یا کسی دباؤ سے رضامندی ہوئی ہو تو شادی ناجائز قرار پائے گی۔

(دفعہ ۵۴) شادی علانیہ ہونی چاہیئے۔

(دفعہ ۵۵) دفتر رجسٹری کے صدر، اُس کے سکریٹری یا نائب سکریٹری کی موجودگی میں شادی ہونی چاہیئے۔ میاں بیوی کی شناخت کے لئے سارٹیفکٹ یا زبانی شہادت پیش ہونی چاہیئے۔

(دفعہ ۷۱) اختلاف مذہب شادی میں مخل نہیں ہو سکتا۔

دفعات مندرجہ بالا سے واضح ہے کہ بالشیوکوں نے اگرچہ مذہبی رسوم شادی منسوخ کردی ہے لیکن رجسٹری کی سخت پابندی عائد کی ہے اور مہذب دنیا میں نسب کی جو حرمت ہے اور جن رشتوں میں شادیاں ممنوع اور حرام ہیں اُن کو بھی قائم رکھا ہے۔

طلاق کے متعلق بالشیوکوں کا آئین حسب ذیل ہے:

"(دفعہ ۸۶) فریقین کی زندگی میں طلاق کے ذریعہ سے رشتۂ مناکحت فسخ ہو سکتا ہے۔

(دفعہ ۸۷) طلاق اس حالت میں ہو سکتا ہے کہ فریقین باہم رضامند ہوں، یا ایک ہی فریق علیحدگی چاہے۔

(دفعہ ۸۸) طلاق کی درخواست تحریر میں آنی چاہیئے۔ جس کا فیصلہ مقامی عدالت کرے گی۔

خاوند اور بیوی کا تعلق استمراری نہیں ہے بلکہ تعلق منقطع ہو سکتا ہے۔"

انگریزوں کے یہاں طلاق کے متعلق یہ شرط ہے کہ اگر عورت، مرد کی بدچلنی اور بیرحمی ثابت کرے، تب طلاق حاصل کر سکتی ہے۔ اور اگر مرد عورت کا صرف بدچلنی ثابت کردے، تو مرد اس عورت سے علیحدگی حاصل کر سکتا ہے۔ بالشیوک آئین کی رو سے محض ایک فریق یا دونوں فریق کا علیحدگی پر آمادہ ہوجانا طلاق کا باعث ہو سکتا ہے۔ بالشیوکوں نے اولاد کی جوازی اور ناجوازی قائم نہیں رکھی ہے۔ بالشیوک قانون اس بارے میں یہ ہے:

" (دفعہ ۱۳۳) جو اولاد باضابطہ شادی سے پیدا ہوئی ہو اس کے حقوق بھی وہی ہوں گے، جو رجسٹری شدہ شادی سے پیدا شدہ اولاد کے ہوں گے۔ سول میرج کے نفاذ کے قبل کی تمام اولاد ناجائز کے حق میں یہ دفعہ عاید ہوگی۔

(دفعہ ۱۳۴) رجسٹر میں جن کا نام بحیثیت ماں باپ درج ہوگا، وہی بچے کے ماں باپ قرار پائیں گے۔

(دفعہ ۱۴۰) بن بیاہی حاملہ عورت کو دفتر رجسٹری میں بچہ پیدا ہونے سے کم از کم ۲ ماہ قبل اس امر کا اقرار کرنا ہوگا کہ کس تاریخ سے نطفہ قرار پایا ہے اور بچہ کے باپ کا کیا نام ہے اور کہاں کا باشندہ ہے۔

(دفعہ ۱۳۹) اگر کوئی باپ بچہ کو اپنی اولاد تسلیم نہ کرے تو بچہ کی جانب سے اس امر کا ثبوت پیش ہونا چاہیے کہ فلاں شخص واقعی اس کا باپ ہے۔

(دفعہ ۱۴۱) باپ کو جوابدہی کے لئے تاریخ وصولیابی نوٹس سے دو ہفتہ کی مہلت دیجائے گی۔ اگر اس مدت کے اندر کوئی کارروائی باپ کی جانب سے عمل میں نہیں آئے گی تو اس کے یہ معنی ہوں گے کہ وہ بچہ کو اپنی اولاد تسلیم کرتا ہے۔

اولاد اور والدین کے فرائض اور حقوق حسب ذیل قرار دیے گئے ہیں۔

(دفعہ ۱۶۰) اولاد کو والدین کی جائداد پر اور والدین کو اولاد کی جائداد پر کوئی حق حاصل نہ ہوگا۔

(دفعہ ۱۶۱) والدین کو نابالغ معذور اور محتاج اولاد کی پرورش کرنا چاہیے۔ جب اس قسم کی اولاد زیر نگرانی حکومت آجائے گی والدین اس فرض سے سبکدوش ہو جائیں گے۔

(دفعہ ۱۶۳) اولاد کو چاہیے کہ وہ اپنے معذور اور محتاج والدین کی پرورش کرے جب تک حکومت سے ان کی پنشن مقرر نہ ہو جائے۔

(دفعہ ۱۶۵) اگرچہ طلاق ہو گیا ہو تاہم والدین اور اولاد کے فرائض مندرجۂ بالا بدستور قائم رہیں گے۔

(دفعہ ۱۶۶) اگر بروقت طلاق پرورش اولاد کی جانب فیمابین زوجین کوئی معاہدہ نہ ہوا ہو تو عدالت مجاز طلاق اور پرورش اولاد دونوں امور پر اپنا فیصلہ صادر کرے گی۔

(دفعہ ۱۸۲) متبنیٰ کرنے کی اجازت نہیں ہے۔

بالشویک جدوجہد: بالشویک جدوجہد دو قسم کی واقع ہوئی ہے۔ ایک غیر ممالک میں اور دوسری اندرونِ ملک۔ اگرچہ دونوں قسم کی جدوجہد نہایت ہوشیاری کے ساتھ جاری ہے لیکن غیر ممالک میں بالشویزم کے اغراض اور نصب العین کو ہر دلعزیز بنانے کے لئے جو مسالہ بہم پہنچایا جاتا ہے، وہ ملاکانہ ہے۔ غیر ملکی جدوجہد صرف ان عناصر تک محدود رکھی جاتی ہے، جن سے یہ توقع کی جاتی ہے کہ بالشویزم کی تقلید کے لئے بہت جلد مستعد ہو جائیں گے۔ بالشویکوں میں ایسے آدمیوں کی کمی نہیں ہے۔ جو یورپ کے مختلف مرکزی مقامات سے بخوبی واقف ہوں۔ بالشویک محکمۂ خارجہ بمقابلہ دیگر ممالک کے اس محکمہ کے مزدوری پیشہ جماعت کے حالات سے زیادہ آگاہ رہتا ہے۔ اس کو معلوم رہتا ہے کہ فلاں ملک میں کس وقت کون چال کارگر ثابت ہوگی اور کس فرد پر بالشویزم کا جادو بہت جلد اپنا اثر دکھائے گا۔ ایک جانب انہیں بالشویک اخبارات بالشویک کے مظالم کی پردہ دری کرتے ہیں۔ دوسری جانب بالشویک اخبارات یورپ والوں کے مظالم کا خاکہ اڑاتے ہیں اور یہ ذہن نشین کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ بالشویزم تحریک کی ترقی ہے۔ نوآبادیوں کے متعلق مختلف حکومتوں کی جو پالیسی ہے اس پر زیادہ توجہ رہتی ہے۔ مثلاً ہندوستان، مصر، ایران اور آئرلینڈ کی قومی تمنائیں ابھارنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ چین بھی بالشویکوں کے دائرۂ اثر میں ہے۔ بالشویک محکمۂ خارجہ میں ہر قوم اور ملت کے مرد اور عورتیں موجود ہیں۔ اندرونِ ملک میں دنیا کی سرمایہ دار حکومتوں کے خلاف جدوجہد ہوتی رہتی ہے۔ پارلیمنٹری حکومت ناقص اور آئینی جدوجہد لاحاصل بیان کی جاتی ہے۔ مزدوری پیشہ فرقوں کو یوں سمجھایا جاتا ہے کہ سرمایہ نہ صرف تمام خرابیوں کی جڑ ہے، بلکہ سرمایہ داری کا خاتمہ بزورِ شمشیر کیا جا سکتا ہے اور جب تک اس کا خاتمہ نہ ہو جائے مزدوری پیشہ جماعت کے مقسوم میں تبدیلی واقع نہ ہوگی۔ انگلستان اور امریکہ میں انقلاب برپا کرانے کی کوشش ترقی پر ہے۔ چنانچہ بالشویک اخبارات میں آئے دن طویل مضامین شائع کر کے بلاد یورپ کی مزدوری پیشہ جماعت کی حالت زار دکھائی جاتی ہے۔ افواج کو یوں سمجھایا جاتا ہے کہ "تم نے جرمنی کو فتح کیا اور اب تم تمام دنیا کو جیت لو گے۔" بالشویک حکومت کی مالی حالت نہایت ابتر ہے۔ جب کبھی یہ سوال ہوتا ہے کہ اگر یہی حالت قائم رہی، تو کیا حشر ہوگا؟ تو جواب میں یوں تسلی دی جاتی ہے:

"چند دن اور صبر کرو۔ تمہارے دن بھی پھریں گے۔ جب بین الاقوامی انقلاب

درجۂ تکمیل پر پہنچ جائے گا کمیونزم قطعی طور پر قائم ہو جائے گی۔ پھر روپیہ کی حاجت باقی نہیں رہے گی۔ اس درمیان میں روپیہ گھسیٹنے کی جو سبیل نکال سکو جائز ہوگی "

روپیہ جمع کرنے کی کیا خوب ترکیب بالشیوکوں نے نکالی ہے:

"گورنمنٹ کو یہ اعلان کر دینا چاہیئے کہ فلاں تاریخ پر سب لوگ اپنا روپیہ جدید سکوں میں تبدیل کرالیں اور اب پُرانے روپیہ کی کوئی قیمت نہیں ہے"

جب لوگ اپنا اندوختہ روپیہ بنا بر تبادلہ پیش کر دیں تب یہ ترکیب کام میں لائی جائے، کہ غربا کی رقم تو پوری پوری بدل دو۔ البتہ ایک رقم تعین کر دو کہ اس سے زیادہ جس قدر ہو اس کو گورنمنٹ اپنی ضروریات کے واسطے رکھ لے۔ مثلاً پانچ ہزار روپیہ تک دام دام تبدیل کر دو۔ بعد ازاں اگر پانچ ہزار روپیہ اور ہوں تو دسواں حصہ لے لو۔ اگر اور پانچ ہزار ہوں تو پانچواں حصہ لے لو۔ اور پھر ایک ایسی حد مقرر کر دو کہ جس پر کل باقی رقم ضبط کر لو"

ریلوے کا نظام: خانہ جنگ کے بعد سوویٹ حکومت کو ریلوے لائنوں کی تعمیر کا اہم معاملہ پیش آیا۔ کیونکہ مزدوروں اور کسانوں کی حکومت کو از سر نو ریل گاڑی کی سڑکیں تعمیر کرنی پڑی ہیں۔ بدیں غرض مزدوروں اور کسانوں کی کونسل نے یہ انتظام کیا کہ مختلف مرکزی مقامات پر جتنے ایسے لوگ رہتے تھے جو دس سال قبل ریلوے کے ملازم تھے۔ مثلاً: انجینئر، فائرمین، بوائلر ساز، سٹری ایجنٹ وسپروائزر وغیرہ دیگر اشخاص کے نام جو ۱۸ اور ۵۰ سال کی عمر کے اندر تھے، یہ حکم جاری کر دیا کہ کام کرنے کے لئے حاضر ہوں۔ بعد ازاں ان کے جتھے بنائے گئے اور ہر ایک جتھے سے ایک ایک ہفتہ کام لیا گیا۔ ولایتی اور امریکن اخبارات سے معلوم ہوتا ہے کہ اسٹھونیا اور روس کے مابین صلح ہو جانے اور اقتصادی وسوشیل حالات بتدریج قائم ہونے سے ریلوے کی حالت ایک حد تک سدھر گئی ہے۔ چنانچہ اسٹھونیا، پیٹروگراڈ اور ماسکو کے مابین سلسلہ ریلوے لائن از سر نو قائم کرنے کا انتظام کیا گیا ہے۔ روس میں ریلوے لائن ۳۳ ہزار ۳ سو ۳۳ میل تک پھیلی ہوئی ہے۔ چنانچہ اس وقت ۲۵ ہزار انجن درکار ہیں۔ اور ہر ایک ریل میں ۳۰ گاڑیوں کے اوسط کے حساب سے ۴ لاکھ ۵۰ ہزار گاڑیوں کی ضرورت ہے۔ اس وقت دس ہزار انجن اور دو لاکھ ۵۰ ہزار مال گاڑیاں موجود ہیں۔ آئندہ کے بابت یہ اندازہ کیا تھا کہ موت دس سال کے اندر باقی ماندہ تعداد انجنوں کی اور ۱۲½ سال کے اندر باقی ماندہ

مال گاڑیاں تیار ہو سکیں گی۔ مگر کوشش یہ ہے کہ دو سال کے اندر ہی سب انتظامات درست ہو جائیں۔ جدید ریلوے لائن نکالنے کا انتظام ایک کمسریٹ کے سپرد ہوا ہے جو بحر سائی کوکل، ویران اور اوسر اراضیات کی آبپاشی سن اور روئی پیدا کرنے کے لئے اور تیل نکالنے کے تدابیر عمل میں لا رہی ہے۔ جرمن ولایتی اور امریکن اخبارات سے پایا جاتا ہے کہ آج کل روس میں جدید ریلوے لائنوں کی توسیع اور پرانی لائنوں کی از سر نو درستی کا کام نہایت وسیع پیمانہ پر جاری ہے۔

کیفیت مندرجہ بالا سے بالشیوکوں کے حقیقی اغراض اور نصب العین پر کافی روشنی پڑتی ہے۔ سردست یہ بتانا مشکل ہے کہ روس کے سے ملک میں بالشیوزم کو کامیابی ہوگی یا ناکامی۔ لینن کے خیالات بالشیوزم کے مستقبل کے بابت ہنوز ظاہر نہیں ہوئے ہیں۔ ممکن ہے کہ اس کا یہ خیال ہو کہ بالشیوزم کی فتح ہوگی یا ممکن ہے کہ وہ بالشیوزم کی ناکامی محسوس کرتا ہو۔ لیکن روس کا انقلاب عظیم سرمایہ دار اور سوشلسٹ دونوں کے واسطے سبق آموز ضرور ثابت ہوا ہے۔ ساتھ ہی یہ امر محتاج بیان نہیں ہے کہ بالشیوزم نمونہ مظالم بلکہ انقلاب انگیز مظالم ہے جس کو آزادی خیالات و عمل قائم رکھنی گوارا نہیں جس کا دارومدار زبردستی اور سفاکی پر ہے۔ ایک طرف تمام عالم تازہ امیدیں اور تمنائیں پوری ہونے کی کوششوں میں منہمک ہے۔ دوسری طرف بالشیوزم، ہر قسم کی سوشلزم اور جمہوری آئین کا نام و نشان مٹانے پر تلا ہوا ہے۔ موجودہ حالت کے دیکھتے ہوئے یہی نتیجہ اخذ ہو سکتا ہے کہ یا تو بالشیوزم کا اثر برابر پھیلتا ہی رہے گا یا بہت جلد مٹ جائے گا۔ لیکن اس میں شبہ نہیں ہے کہ اس وقت نہ صرف یورپ بلکہ تمام عالم بالشیوزم کے خوف سے کانپ رہا ہے۔ کمیونزم کا نصب العین بیشک نہایت اعلیٰ ہے۔ لیکن کمیونزم کی کامیابی کے لئے ضبط و تحمل اور ایثار علی النفس درکار ہے۔ بالشیوکوں نے جس اصول کے ساتھ کمیونزم کی بنیاد قائم کی ہے اُس سے تو تباہی اور بربادی کے سوا اور کچھ ہمارے ذہن میں نہیں آتا۔

روس میں ایسے شخص کی قلت ہے، جو کاروبار حکومت خوبی کے ساتھ انجام دے سکیں۔ ہنرمند مزدور بھی کم ہیں۔ بالشیوزم روس میں سوشل عمارت کی بنیاد کھو رہا ہے۔ اندیشہ ہے کہ کہیں بالشیوک اسی میں دب کر ختم نہ ہو جائیں۔

بالشیوکوں کی تھیوری یہ ہے کہ سوشلسٹ کامن ویلتھ اقتصادی آزادی اور مساوات کا دور سوسائٹی کی ہر ایک منزل پر قائم ہو سکتا ہے۔ بشرطیکہ حکومت کی کل پر قبضہ کر لیا جائے، لیکن جبر و تشدد،

قتل و غارت گری کے ذریعہ سے حکومت کے کل پرزوں پر کیونکر قبضہ ہو سکتا ہے۔ اگر بالفرض ہو بھی جائے، تو اس کا کوئی اعتبار نہیں۔ البتہ خانہ جنگی کا دور پر آشوب قائم ہو جائے گا۔ امن و امان رخصت ہو جائے گا۔ ترقی کی راہیں مسدود ہو جائیں گی۔ ملک کی قسمت نہ معلوم کتنے پلٹے کھائے گی اور سوشلسٹ کا من و یلتھ (اقتصادی آزادی اور مساوات) کے منزل مقصود تک رسائی نہ صرف محال اور ناممکن ثابت ہوگی، بلکہ منزل مقصود ہمیشہ دور ہی نظر آئے گا۔ بہرحال اب دیکھنا یہ ہے کہ لینن اور اس کے ہم جلیسوں کی جد و جہد نوع انسان کے حق میں نعمت عظمیٰ ثابت ہوتی ہے، یا قہر۔

(جنوری ۱۹۲۱ء) ●●

کشن پرشاد کول

سوئٹ روس[1]

مارچ ۱۹۱۷ء میں جو طوفان انقلاب روس میں برپا ہوا، اس نے نہ صرف زار روس کے تخت و تاج کو اُلٹ دیا، بلکہ قوم کے شیرازے کو بھی اس طرح تتر بتر کر دیا کہ الامان والحفیظ۔ آٹھ ماہ خانہ جنگی اور طوائف الملوکی میں۔ بالآخر نومبر ۱۹۱۷ء میں بولشوزم نے اپنا رنگ اچھی طرح سے جما لیا اور باگ حکومت مشہور کمیونسٹ لنن کے ہاتھ میں آئی کہ جس نے روسا اور متوسط درجے کے طبقوں کو تباہ و پامال کر کے روس میں کسانوں، مزدوروں اور سپاہیوں کی حکومت قائم کی۔

اٹھارویں صدی میں کمیونسٹ ریپبلک کا جو تجربہ فرانس کے دارالسلطنت پیرس میں کیا گیا تھا وہ تین ماہ سے بھی کم کامیاب رہا اور اس ریپبلک کی زندگی ۷۰ یوم سے زیادہ قائم نہ رہ سکی۔ سوئٹ ریپبلک نے اس بیسویں صدی میں گذشتہ نومبر میں اپنی زندگی کے تین سال پورے کر لئے۔ گو اس دوران میں ہر قسم کی خبریں شائع ہوتی رہی ہیں کہ جن کا لب لباب یہ تھا کہ بولشوزم کا زور روس میں اب رفتہ رفتہ کم ہو جاتا ہے۔ لنن سے رعایا بالکل برگشتہ ہو رہی ہے۔ بلکہ لنن کی جان کے لالے پڑے ہیں اور وہ مفرور ہو کر اپنی جان بچاتا پھرتا ہے۔ لیکن امر واقع یہ ہے کہ یہ سخت جان ابھی نہ صرف زندہ ہے بلکہ باوصف شدید مخالفتوں اور نبرد آزمائی کے اس نے مختلف موقعوں پر فتح حاصل کی اور اپنی حکومت کو مستحکم بنا لیا ہے۔ دول اتحاد نے پچھلے دو سال میں سوئٹ ریپبلک کے دشمنوں کی امداد کرنے کا کوئی دقیقہ لنن اور بولشوزم کو زک دینے کا اٹھا نہیں رکھا۔ لیکن اس کی طاقت ور اور زبردست ہستی کے آگے کولچک، ڈینکن، یوڈینچ اور رینگل سب نے قوت آزمائی کر کے بالآخر شکست مانی۔

فرانس کی شہ سے پولینڈ نے پچھلے سال سوئٹ ریپبلک کا کافی ناطقہ بند کیا۔ لیکن بالفعل ادھر بھی سناٹا ہے۔ گو یہ تحقیق کے طور پر نہیں کہا جا سکتا کہ روس اور پولینڈ کے تعلقات اب اور آئندہ کیسے ہیں اور کیا رہیں گے۔ لیکن سوئٹ ریپبلک کے اپنے دشمنوں کے مقابلہ میں فتحیاب ہونے کا یہ اثر تو صریحاً معلوم ہو رہا ہے کہ روس کے گرد و نواح کی اُن چھوٹی چھوٹی ریاستوں نے کہ جنہوں نے اپنے تئیں آزاد کیا تھا اب سوئٹ ریپبلک سے صلح کر کے دوستانہ تعلقات قائم کر لئے ہیں اور باوصف دول اتحاد کی مخالف کوششوں کے استھونیا، لیتھونیا، لیٹویا اور فن لینڈ نے سوئٹ ریپبلک سے تجارت کا سلسلہ جاری کر لیا ہے اور خود دول اتحاد میں گو فرانس کی مخالفت روس کے خلاف اب بھی ویسی ہی ہے کہ جیسی پیشتر تھی تاہم برطانیہ کی پالیسی میں نمایاں فرق نظر آ رہا ہے۔ ایک زمانہ وہ تھا کہ برطانوی حکومت لکھوکھا روپیہ صرف کر کے ڈینکن، یوڈینچ اور رینگل کو اسلحہ اور سامان حرب کی امداد پہنچائی تھی یا اب یہ کیفیت ظاہر ہو رہی ہے کہ نہ صرف برطانوی حکومت نے سوئٹ ریپبلک

[1] یہ مختصر ایک بسیط مضمون 'مرقع عالم' سے ماخوذ ہے۔

کی مخالفت کی کوشش ترک کردی ہے بلکہ کنایتاً ان سے نامہ و پیام بھی شروع ہوگیا ہے اور قیدیوں کے تبادلہ کے متعلق سال گذشتہ مسٹر او گریڈی ممبر پارلیمنٹ کے توسط سے ایک عہد نامہ بھی لکھا گیا تھا اور آج یہ کوشش کی جارہی ہے کہ سوویٹ ریپبلک سے تجارتی تعلقات قائم ہو جائیں۔ چنانچہ مسٹر کیرسن روسی سفیر عرصۂ دراز سے انگلستان میں مقیم ہیں اور تجارتی تعلقات قائم کرنے کے بارے میں شرائط طے کر رہے ہیں۔ جہاں تک کہ فوجی اور سیاسی حیثیت کا تعلق ہے شبہ نہیں کہ سوویٹ ریپبلک نے اب اپنے قدم مضبوطی سے جمالئے ہیں۔ البتہ اقتصادی اور تجارتی صورت کے لحاظ سے روس کی حالت ضرور نازک ہے لیکن اگر برطانیہ اور امریکہ سے سلسلۂ تجارت پھر قائم ہوگیا تو غالباً چار چھ سال بھی نہ گزرنے پائیں گے کہ سوویٹ ریپبلک ملک کو سرسبز خوشحال بنالے گی۔ سوویٹ ریپبلک نے اس عرصہ میں نہ صرف اپنی بنیاد مستحکم کرلی ہے بلکہ اُس نے اپنی ریشہ دوانیوں سے مشرق وسطیٰ میں ایسے تعلقات پیدا کرلئے ہیں اور وہ رنگ جمایا ہے کہ باید و شاید۔ آذربائیجان اور جارجیا میں تو کچھ عرصہ ہوا بولشوزم نے اپنے اثر سے جمہوری حکومتیں قائم کرادی تھیں۔ اب حال کی خبروں سے معلوم ہوتا ہے کہ مظلوم آرمینیا بھی کہ جس کے لئے دول اتحاد بے حد آنسو بہایا کرتے تھے اور ان کی ہمدردی کا دریا امنڈا کرتا تھا اپنے حال زار پر چھوڑ دی گئی اور بالآخر مجبور ہوکر اس نے بھی اپنے یہاں سوویٹ ریپبلک قائم کرلی ہے۔ یہ تمام جمہوری ریاستیں کہ جہاں بولشوزم نے اپنا رنگ جمایا ہے روس کی سوویٹ ریپبلک کی حامی و مددگار ہیں۔ افغانستان اور ترکستان میں سوویٹ ریپبلک کے سفیر اپنے حکومت کا رسوخ جما رہے اور اثر پیدا کر رہے ہیں اور تازہ ترین تاروں سے یہ خبر بھی معلوم ہوئی ہے کہ ایران اور روس کی سوویٹ ریپبلک سے کوئی عہد نامہ ہونے والا ہے کہ جس کا لازمی نتیجہ یہ نکلے گا کہ ایران اور برطانیہ کے قابو کے باہر ہوجائے تو عجب نہیں۔ سیورس کے صلحنامہ کے خلاف کمال پاشا کی بغاوت اور ٹرکی کی نئی حکومت انگورہ میں قائم کرنے میں سوویٹ ریپبلک کا کیا دخل یا حصہ تھا اس کا صحیح اندازہ اس وقت تک نہیں ہوسکتا ہے۔ بہرحال مشرق وسطیٰ میں دول اتحاد کے طرز عمل اور ان کی حرص ملک گیری کی پالیسی نے جو بیزاری پیدا کی اور ابتری پھیلائی ہے اس سے روس کی سوویٹ ریپبلک فائدہ اٹھا رہی ہے اور اٹھائے گی۔ یہ ایک قدرتی امر ہے اور نہ اس کا بجز اس کے کوئی علاج ہوسکتا ہے کہ دولت اتحاد یا برطانیہ بالخصوص اپنے طرز عمل کو بدلے اور معاملات کو زیادہ ابتر نہ ہونے دے۔ اس کا تفصیلی تذکرہ مشرق وسطیٰ کے عنوان سے آگے چل کر کیا جائے گا۔

مشرق وسطیٰ

یوں تو فرنگ کے مشاق شاطروں کی حریص نگاہیں مشرق وسطیٰ کی بساط کے بے زور مہروں یعنی ایران اور ٹرکی پر عرصۂ دراز سے پڑ رہی تھیں اور غنیم کا

قلعہ توڑ کران میں سے روس برطانیہ نے بالخصوص اپنا اچھا خاصا رسوخ پیدا کر لیا تھا۔ لیکن باہمی رقابت نے مہرے پیٹنے کا موقع نہیں دیا تھا۔ جنگ یورپ نے جہاں اور بربادی اور تباہی لائی وہیں رقیب کا وجود بھی میدان مقابلہ سے مٹا دیا۔ زار روس کے وجود مٹ جانے سے تمام میدان خالی ہوگیا اور اب ایران و ٹرکی کے حصے بخرے کرنے میں کوئی دشواری باقی نہیں رہی۔ صلحنامہ سیورس اور عہد نامہ ایران وانگلستان میں دونوں سلطنتوں کی قسمت کا فیصلہ درج ہے۔ ہم پہلے انتہائی اختصار کے ساتھ ان دونوں کا تذکرہ کریں گے، پھر دول اتحاد بالخصوص برطانیہ کے آئندہ ارادوں اور منصوبوں پر سرسری نظر ڈالیں گے اور آخر میں ناظرین کو بتلائیں گے کہ ان منصوبوں کے پورے ہونے میں کیا رکاوٹیں پیش آرہی ہیں اور ہماری سرکار کو کن خطروں کا سامنا ہے اور ان رکاوٹوں اور خطروں کے سامنے ہوتے ہوئے برطانیہ کے منصوبے اور ارادے کہاں تک پورے ہوتے نظر آتے ہیں۔

صلحنامہ سیورس یعنی صلحنامہ ٹرکی کا خلاصہ چند الفاظ میں یہ ہے کہ عراق عرب یا میسو پوٹیمیا کی حکومت کا ٹھیکہ دار برطانیہ اور شام کی حکومت کا ٹھیکہ دار فرانس ہوگا۔ بندرگاہ سمرنا اور قریب کے ساحل کا علاقہ مزید برآں خاص تھریس کا کافی حصہ یعنی قسطالجہ سائنس تک کہ جس میں شہر ایڈریا نوپل بھی شامل ہے یونان یا گریس کے حوالہ کیا جائے گا اور اس کے حصہ میں آئے گا۔ ٹرکی خاص کا جو حصہ برائے نام ٹرکی کی حکومت میں چھوڑا گیا ہے اور جس کا دارالسلطنت قسطنطنیہ قائم رہے گا، مزید برآں ایشیا کوچک کا وہ حصہ بھی جو یونان کے حوالہ نہیں کیا گیا ہے اس کی صورت یہ ہوگی کہ برائے نام تو یہ ضرور سلطان ٹرکی کی حکومت اور سلطنت مانا جائے گا لیکن فی الحقیقت اس پر بھی دول اتحاد کا پورا پورا قبضہ اور اختیار رہے گا۔ فوج اور خزانہ دونوں دول اتحاد کے مقرر کئے ہوئے کمیشن کے تحت اور حکم میں ہوں گے، جو اگر چاہیں تو ٹرکی سے مشورہ لے لیں ورنہ اس کی قسمت کا فیصلہ کرنے کے لئے باختیار خود کامل طور پر مجاز ہوں گے اور یہ برائے نام ٹرکی کی حکومت بغیر ان کی اجازت کے کوئی قدم آگے نہ بڑھا سکے گی۔ یہ امر یاد رکھنے کے قابل ہے کہ دوران جنگ میں جو وعدے دول اتحاد اور بالخصوص برطانیہ کی جانب سے کئے گئے تھے اُن کی رو سے ولایت شام عرب کی آزاد سلطنت میں شامل ہونی چاہیئے تھی اور عراق عرب میں بھی جداگانہ عربی حکومت قائم ہونی لازمی تھی۔ تھریس اور ایشیائے کوچک قطعی طور سے ٹرکی کی حکومت میں رہنے چاہیئے تھے اور اس کے حصے بخرے قطعی نہ ہونے چاہیئے تھے۔ لیکن یہ وعدے اب داستان پارینہ ہیں اور توجہ کے محتاج نہیں۔ اینگلو پرشین عہد نامہ کا مفصل تذکرہ اب سے سال بھر قبل دسمبر ۱۹۱۹ء کے "صبح امید" میں "مرزا اماۃ نذرانی" کے قلم سے شائع ہوچکا ہے اس کا دوبارہ بیان بے سود ہوگا۔ صرف اس قدر کہدینا کافی ہے

کہ گو لارڈ کرزن وزیر خارجہ برطانیہ ابھی تک قسمیں کھاتے ہیں کہ ایران کی آزادی اور خود مختاری میں خلل پڑنے کی ہماری نیت ہرگز نہیں۔ تاہم یہ امر واقع ہے کہ اس عہدنامہ کی رو سے ایران برطانیہ کا مقروض ہوگا اور اس کا خزانہ و محصولات گرو ہوں گے۔ اس قرض کے روپیہ سے جو اصلاحات حکومت اور فوج میں کی جائیں گی وہ سب برطانیہ کے توسط سے اور اس کے مشورہ سے بلکہ اسی کے ہم قوموں کے ہاتھوں سے۔ یہاں بھی وہی ترکیب ہے، یعنی خزانہ اور فوج پر قبضہ ہوگا اور ملک مقروض ہوگا۔ جن لوگوں کو مصر کے دکھڑے کی رام کہانی یاد ہے، وہ ایران کے عہد نامہ سے صحیح نتیجہ نکالنے میں دھوکا نہیں کھا سکتے۔ یہ ہے لب لباب ان تمام کوششوں اور مشوروں کا جو شرق وسطی کی قسمت کا فیصلہ کرنے کی غرض سے آج تقریباً ۱۸ ماہ سے جاری ہے۔ ان مقبوضات کو حاصل کرنے کے بعد بقول مدبران برطانیہ ان ہی ذمہ داریوں کو طوعاً و کرہاً لے لینے کے بعد ان کے خاطر خواہ قائم رکھنے کی کیا سبیلیں سوچی جا رہی ہیں ان کا مختصر بیان بھی کم دلچسپ نہیں۔

توسیع حکومت کے حوصلے رکھنا اور غیر قوموں کو اپنے تحت میں لانا آسان ہے۔ لیکن ایسے تعلقات کا قائم رکھنا اور ان مقبوضات کو رقیبوں اور دشمنوں کی زد سے بچا کر اپنے قبضے اور اختیارات سے نہ نکلنے دینا زیادہ دشوار ہے۔ مدبران برطانیہ میسوپوٹیمیا پر تسلط جمانے کے بعد سے اس دشواری کو بخوبی اور کامل طور سے محسوس کر رہے ہیں دولت برطانیہ کے مقبوضات اور نوآبادیوں کے نقشہ پر سرسری نظر بھی ڈالی جائے، تو صاف ظاہر ہوتا ہے کہ دور اندیش قوموں نے بالعموم ایسے ہی ممالک یا ولایتوں پر اپنا قبضہ جمایا ہے کہ جو یا تو جزیرہ یا جزیرہ نما ہیں، یا ایسے بندرگاہیں، جہاں پر جہازوں کے ذریعہ سے باسانی پہنچ سکتی ہے اور اپنے جنگی بیڑے کے بل بوتے پر جن کا پورا تحفظ کر سکتی ہے۔ تمثیلاً ہندوستان یا مصر کی مثالیں لیجئے۔ ہندوستان کی حفاظت تین جانب سے برطانیہ جنگی بیڑا بخوبی کر سکتا ہے۔ ایک جانب جہاں وہ نہیں پہنچ سکتا قدرت نے ایسا اٹل سنتری اور پاسبان کھڑا کیا ہے کہ جس سے کوئی قوت بھی مشکل سے مزاحمت کر سکتی ہے۔ یہی حال مصر کا ہے، جو حدود جنگی بیڑے کی پہنچ کے باہر ہیں اور جن کی حفاظت اس کے ذریعہ سے نہیں ہو سکتی وہاں قدرتی مورچہ بندی ہے۔ ہندوستان کے ہمالیہ کا جواب مصر میں دشت سینا ہے۔ یہی صورت آسٹریلیا جنوبی افریقہ وغیرہ کی ہے۔ چھوٹے چھوٹے مقبوضات مثل عدن اور خلیج فارس وغیرہ کو دیکھئے کہ بجز بندرگاہوں یا قریبی ساحل کے ان اطراف میں بھی برطانیہ نے زیادہ ہاتھ پیر نہیں پھیلائے تھے اور ایسے ممالک اور ولایتوں کی تسخیر سے بالعموم گریز کیا تھا کہ جن کا قبضہ و اختیار میں رکھنا بجائے بحری قوت کے بری قوت پر منحصر تھا۔ جنگ یورپ جہاں اور

بہت سے نئے سامان اور نئی صورتیں پیدا کر دیں۔ مگر برطانیہ کو بھی اس کلیہ کی پابندی اور احتیاط سے معذور بنا کر ساحل سے دور ایران اور میسوپوٹیمیا میں وسط ایشیا کی حدود تک پہنچا دیا اور مدبران برطانیہ کے لئے ایک ایسا معمہ حل کرنے کے لئے پیدا کر دیا کہ جس سے انہیں کبھی پیشتر مشکل سے سابقہ پڑا ہو۔ میسوپوٹیمیا کی تسخیر آسان تھی اس کا تحفظ مشکل ہے۔ اسی مسئلہ اور اسی مضمون پر "مشرق وسطیٰ" کے عنوان سے ایک مبسوط مضمون انگلستان کے مشہور رسالہ "راؤنڈ ٹیبل" میں تقریباً سال بھر ہوا کہ شائع ہوا تھا جو بہ لحاظ اپنے سیاسی معلومات اور دور اندیشی و نیز اپنے دلائل اور نکتہ چینی کے نہایت اعلیٰ پایہ کا تھا۔ یہ مضمون اس وقت لکھا گیا تھا کہ جب میسوپوٹیمیا کی تسخیر مکمل ہو چکی تھی اور عہد نامہ ایران و انگلستان پر دستخط ثبت ہو چکے تھے۔ قابل مضمون نگار نے جہاں وزارت خارجیہ برطانیہ کی اس دور اندیشی کی داد دی اور اس کے اس طرز عمل پر کہ اس نے ایران سے عہد نامہ کر کے اس ملک پر اپنا قابو اور اختیار جما لیا اور اس طرح سے میسوپوٹیمیا کی مشرقی سرحد کو مستحکم بنا لیا صاد کیا تھا برطانوی حکومت کے اس طرز عمل کی کسی قدر سختی سے نکتہ چینی کی تھی کہ اس نے میسوپوٹیمیا کی ایک سرحد کے تو مستحکم بنانے کا سرانجام کیا اور فوراً اسی وقت اس کی شمالی سرحد کاکیشس سے جہاں باطوم اور باکو کی درمیانی ریلوے کی وہ نگرانی کر رہی تھی انگریزی فوج ہٹا کر واپس بلا لی۔ نیز امیر افغانستان کو ۱۹۱۹ء کے صلحنامہ کی رو سے ان شرائط اور پابندیوں سے آزاد کر دیا جو تقریباً ۴۰ برس سے اس حکومت پر برطانیہ کی جانب سے عائد کی گئی تھیں یعنی یہ کہ افغانستان اپنی خارجی پالیسی میں برطانیہ کو دخل و مشورہ دینے دے گا اور بغیر اس کی رضامندی کے غیر ممالک سے رابطہ و اتحاد نہ پیدا کرے گا۔ یہ اعتراض نہایت سچا تھا کہ اگر افغانستان نے روس یا بولشوزم سے رشتۂ اتحاد پیدا کر لیا تو ایران بجائے سہارا یا مدد دینے کے خود ایسا ناگوار بوجھ ہو جائے گا جو اٹھائے نہ اٹھے گا۔ قابل مضمون نگار نے ان متضاد فیصلوں اور طرز عمل کی وجہ یہ خیال کی تھی کہ امیر افغانستان سے صلحنامہ کے شرائط تو حکومت ہند اور صاحب وزیر ہند نے بجائے خود طے کر لیے ہوں گے۔ ایران سے عہد نامہ وزارت خارجیہ نے کیا ہے اور کاکیشس سے فوج ہٹانے کا فیصلہ غالباً وزارت جنگ نے صادر کیا ہوگا۔ اگر حکومت برطانیہ کی خارجی پولیسی بجائے مختلف ہاتھوں میں ہونے کے بہ حیثیت مجموعی وزارت سلطنت کے ہاتھ میں ہوتی تو یہ تفریق و اختلاف نہ ظاہر ہوتا اگر ان اعتراضات کو مدنظر رکھتے ہوئے ہم حالیہ کے دو تین تازہ واقعات پر توجہ کریں تو سلطنت برطانیہ کے مشرق وسطیٰ میں آئندہ منصوبوں اور ارادوں پر کافی روشنی پڑتی ہے۔ حال ہی میں یہ خبر شائع ہوئی ہے کہ آئندہ سے علاوہ وزارت خارجیہ اور وزارت نو آبادیات کے ایک نئی وزارت مشرق وسطیٰ یا امپیریل ایڈمنسٹریس کے

نام سے اور اضافہ ہونے والی ہے۔ مسٹر مانٹیگو صاحب وزیر ہند نے حال ہی میں ایک موقع پر اس امر کو بھی تسلیم کیا تھا کہ اب تک میسوپوٹیمیا کے معاملات کی ذمہ داری وزارتِ ہند وزارتِ جنگ اور وزارتِ خارجیہ میں تقسیم ہے۔ اور یہ نہایت مہمل انتظام ہے۔ دوسرا امر قابل غور یہ ہے کہ ایشر کمیٹی رپورٹ میں یہ تجویز پیش کی گئی ہے کہ ہندوستان کا محکمۂ فوج بجائے حکومت ہند یا وزیر ہند کے ماتحت رہنے کے آئندہ سے برطانوی وزارتِ جنگ کے ماتحت رہنا چاہیے اور ہندوستان کی فوج اور اس کے فوجی اخراجات میں اس لئے اضافہ ہونا چاہیے کہ مشرق وسطیٰ میں صورتِ معاملات اندیشہ ناک ہے اور وہاں کی ضروریات اس اضافہ کی محتاج ہیں۔ تیسرے یہ امر بھی بہت کچھ معنی خیز ہے کہ باوصف حکومت ہندوستان وحکومت افغانستان کے تعلقات کشیدہ ہونے اور افغانستان کے سوویٹ روس سے نامہ و پیام کرنے کے حکومت ہند نے اپنا مشن کابل بھیجنا گوارا اور پسند کیا۔ اگر ان تمام باتوں کے کچھ معنی ہیں تو صرف یہی کہ برطانیہ عظمیٰ کی پالیسی مشرق وسطیٰ میں یہ ہے اور ہو گی۔ کم از کم اس کے مدبران سلطنت کے منصوبے اور ارادے تو ضرور یہی ہیں کہ بغداد سے برہما تک برطانیہ کا ایسا سکہ بیٹھے اور دنیا کے تمام ممالک اور ولایتیں زیر سایۂ برطانیہ ایسے رشتۂ حکومت میں منسلک ہوں کہ جس کا توڑنا کسی اور کے لئے غیر ممکن ہو اور نہ جس پر کوئی خارجی اثر یا مخالفانہ دخل دینے کی جرأت کر سکے۔ ضمناً یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ ایران ومیسوپوٹیمیا کے مشکلات حل کرنے اور اس کی گتھیاں سلجھانے کے لئے ہندوستان پر کافی بار ڈالنا منظور اور اس سے اس بوجھ کو خندہ پیشانی سے اٹھانے کی توقع رکھی جاتی ہے۔

اب تک ہم نے صرف یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ دول اتحاد اور بالخصوص برطانیہ نے مشرق وسطیٰ کے کس طرح سے حصے بخرے کئے ہیں اور اپنا تسلط مشرق وسطیٰ پر قائم رکھنے کی برطانیہ کیا پالیسیاں اور منصوبے سوچ رہا ہے۔ اب ہم یہ بتانا چاہتے ہیں کہ صلحنامہ سیورس پر دستخط ہونے کے وقت اور اس کے بعد سے مشرق وسطیٰ میں کیا صورت ظاہر ہو رہی ہے۔ برطانیہ کے منصوبوں اور ارادوں کے پورے ہونے کی کہاں تک گنجائش اور امید ہے اور معاملات نے پچھلے سال میں کیا ورق پلٹا ہے۔ صلح کی کانفرنس دول اتحاد سے قطعی مایوس ہو کر ترکی کی نیشنلسٹ فریق نے جب یہ دیکھا کہ ملک اور سلطنت بالکل ہاتھ سے نکلی جاتی ہے تو انہوں نے علم بغاوت اٹھایا اور علانیہ دول اتحاد کی مخالفت بزور شمشیر شروع کی۔ نیشنلسٹ فریق کے لیڈر اور جنرل مصطفیٰ کمال پاشا کو اس میں ظاہرا اس وقت تک کافی کامیابی ہوئی ہے۔ انہوں نے اکثر موقعوں پر دول اتحاد بالخصوص فرانس اور یونان کی فوجوں کا دلیری اور کامیابی کے ساتھ مقابلہ کیا ہے اور بالآخر خود اناطولیہ میں اپنی حکومت علیحدہ قائم کرنے میں

کامیاب ہوا ہے۔ انگریزی اخبار نویس خود اس امر کا اعتراف کرتے ہیں کہ ٹرکی کی تقریباً دو ثلث سپاہ
اس کے ساتھ اور اسکی مددگار ہے اور رعیت کے تمام طبقے اور حصے علانیہ یا خفیہ طور پر اس سے ہمدردی رکھتے ہیں۔
نہ صرف یہی بلکہ سویٹ روس اس کی حمایت اور مدد پر کمربستہ ہے۔ نیشنلسٹ ٹرکی کی نئی حکومت کا دارالسلطنت
انگورہ ہے جہاں سے میسوپوٹیمیا کی مغربی سرحد کا راستہ قریب اور صاف نظر آتا ہے۔ شمال میں آذربائیجان جیورجیہ
اور آرمینیا کی سویٹ ریپبلک حکومتیں روسی سویٹ ریپبلک کا کمر پٹہ ہیں اور اس کی حامی اور مددگار ہیں۔
دول اتحاد کے نئے مقبوضات کی خود یہ کیفیت ہے کہ شام عراق عرب اور کردستان میں نہایت سنگین بغاوتیں
ابھی ابھی ہو چکی ہیں جن کو بمشکل دبایا گیا ہے۔ کس کو معلوم ہے کہ مصطفیٰ کمال پاشا کی مزید کامیابی اور
بالشویزم کا سہارا ان گرفتاروں کو پھر ایک مرتبہ اپنی زنجیریں توڑ پھینکنے پر آمادہ نہ کر دے گا۔ یہ تو ایک جانب
کی کیفیت ہوئی۔ اب دوسری جانب کی صورت ملاحظہ فرمایئے۔ دول اتحاد نے بلا سبب اور بلا وجہ جب
یونان کو ٹرکی کے حصے بخرے میں شامل کیا تو ان کو کم از کم یہ توقع ضرور رہتی کہ انگورہ کی نئی حکومت کا مقابلہ
کرنے اور اس کو شکست کرنے میں یونان ان کا دست و بازو ثابت ہوگا۔ اس کی کیفیت یہ ہے کہ یونانی
پارلیمنٹ کے تازہ انتخابات کا نتیجہ یہ نکلا کہ مسٹر وینیزلو جو دول اتحاد کے ہی ساختہ پرداختہ اور ان کے
خاص آدمی تھے کرسی وزارت سے ہٹا دیے گئے اور یونانیوں نے ٹاٹنو اپنے سابق بادشاہ کو جو قیصر ولیم
کا رشتہ دار بھی ہے اور جس کو دول اتحاد نے تخت سے ہٹا دیا تھا واپس بلا لیا۔ ظاہر ہے کہ ٹاٹنو دول اتحاد
کے ہاتھوں میں مسٹر وینیزلو کی طرح کٹھ پتلی بننا نہیں منظور کریگا۔ ماسوا یونان کی حکومت دیوالیہ اور رعیت
جنگ سے اب تنگ آگئی اور فوجوں کو باہر سے واپس بلانے پر اصرار کر رہی ہے۔ اس میں اب یہ ارمان اور
امنگ یا دم خم باقی نہیں کہ سمرنا کے لیے مصطفیٰ کمال پاشا سے جنگ آزما ہو۔ دوسرے دول اتحاد میں اٹالیہ
کی یہ کیفیت ہے کہ وہ اپنے ہمسایہ یونان کی توسیع حکومت یا اضافہ مقبوضات اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھنا
نہیں چاہتی ہے گوارا نہیں کر سکتی اور اس کو بدرجہا پسند کرتی ہے کہ تھریس اور ایشیا کوچک مسلم طور پر ٹرکی کے پاس ہی رہے اور
اس کو واپس دیدیا جائے۔ فرانس ٹرکی کا طرفدار نہیں لیکن بولشوزم کا سخت مخالف اور اس سے نہایت خائف
ہے وہ کسی طرح سے اس کو گوارا نہ کرے گا اور نہ یہ چاہتا ہے کہ ٹرکی اور سویٹ روس کسی قسم کا رشتہ اتحاد پیدا کر لیں
اگر صلحنامہ سیورے کی نظر ثانی کرنے اور تھریس اور ایشیائے کوچک ٹرکی کو واپس دینے سے وہ ٹرکی کو بولشوزم
کے خلاف کر سکے گا تو یقین رکھنا چاہیے کہ وہ اس میں تکلف نہ کرے گا۔ یہ خبریں وثوق کے ساتھ بیان کی جاتی ہیں

کہ فرانس اور اٹالیہ دونوں اصرار کر رہے ہیں کہ صلحنامہ سیورس کی نظر ثانی کی جائے اور تھریس اور ایشیائے کوچک ٹرکی کو واپس دے کر اسے سویٹ روس کی آشتی اور پیروی سے باز رکھا جائے لیکن مسٹر لائڈ جارج وزیر اعظم برطانیہ کسی طرح راضی نہیں ہوتے۔ گو مسٹر لائڈ جارج کی ایک تازہ تقریر سے اس قدر تو ضرور مترشح ہوتا ہے کہ وہ ٹرکی کی مخالفت پر اس قدر کمربستہ نہیں کہ جیسے پہلے تھے۔ اب وہ گفت و شنید کے لئے بھی تیار ہیں لیکن اس کا انتظار کر رہے ہیں کہ دیکھئے یونان میں بالآخر اونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے۔ علاوہ بریں خود انگلستان میں معزز اور مدبر احباب میں یہ تحریک قوت پذیر ہوتی جاتی ہے کہ صلحنامہ سیورس کی نظر ثانی ہونی چاہیے چنانچہ ایک یادداشت جس پر نہایت ذی اثر اور نامور اصحاب کے دستخط ہیں حال ہی میں لیگ آف دی نیشنس کے روبرو پیش کی گئی ہے جس کا لب لباب یہی ہے کہ ٹرکی کے ساتھ انصاف کیا جائے اور صلحنامہ کی ترمیم اور نظر ثانی ہو۔ پھر ہندوستان کا شور و شغب بھی کم ہونے میں نہیں آتا اور خلافت کی تحریک ہی بے اطمینانی پیدا کر رہی ہے۔ جہاں تک کہ صلحنامہ سیورس کا تعلق ہے صاف ظاہر ہے کہ جس قدر قوتیں بھی کام کر رہی ہیں سب برطانیہ کے منشا و مقصد کے خلاف اور صلحنامہ کی ترمیم و تنسیخ کے موافق معلوم ہوتی ہیں۔ پھر بھی مسٹر لائڈ جارج اور ان کے رفقاء اگر بازی لے جاویں تو واقعی معجزے سے کم نہ ہوگا اور مشرق وسطیٰ کی بدنصیبی اور بربادی میں شبہہ کی گنجائش باقی نہ رہے گی۔

مشرق وسطیٰ کے دکھڑے کی داستان بغیر ایران کے مصائب کے بیان کے پوری نہیں ہو سکتی۔ لارڈ کرزن نے شاہ ایران اور ان کی وزارت کو ہموار کر کے اور اپنا ہمنوا بنا کر عہدنامہ پر دستخط تو کرا لیے لیکن ایرانی مجلس کا صاد ہونا اور رعایا کی منظوری باقی تھی۔ وہاں صورت یہ درپیش ہے کہ رعیت اس اظہار خلوص کے معنی اب سمجھنے لگی ہے اور اس کو ۱۹۰۷ء اور ۱۹۰۸ء میں روس اور برطانیہ کی دخل اندازی کا تلخ تجربہ اچھی طرح یاد ہے نہ رعیت شاہ اور وزرا کی ہاں میں ہاں ملانے کو تیار ہے اور نہ مجلس عہدنامہ پر صاد کرتی ہے۔ وزرا اپنی شرم مٹانے کے لیے لارڈ کرزن صاحب کو یہ سمجھا رہے ہیں کہ دیر آید درست آید۔ ادھر پارلیمنٹ میں کچھ ایران کے سچے ہمدرد اور رفیق اپنے سوالوں سے لارڈ موصوف کو تنگ کرتے ہیں اور پھر برطانوی رعیت ایران اور میسوپوٹیمیا میں مفت کا دردسر خریدنے کے لیے اپنی گاڑھی کمائی کا روپیہ محض ارکین حکومت کے تفنن طبع کی خاطر برباد اور ضایع کرنے پر آمادہ نہیں ہوتی۔ لندن کا ذی اثر اور مشہور اخبار ٹائمس گورنمنٹ کی پالیسی پر آئے دن سخت سے سخت حملہ کرتا ہے۔ قصہ مختصر بیچارہ لارڈ کرزن نے دونوں جانب کی شکر گذاری سے تنگ آ کر پارلیمنٹ میں

یہ اعلان کر دیا کہ اگر ایرانی مجلس عہد نامہ پر چند ہفتوں کے اندر صاد نہیں کر دیگی تو ہم مالی امداد بند کر کے اپنی فوج ایران سے ہٹا لیں گے۔ ابھی اس اعلان کو چند ہفتے ہی گزرے ہوں گے کہ عہد نامہ پر صاد کرنا تو درکنار (ایران سے تازہ خبر یہ آئی ہے) وہاں کے امرا، وزرا اور عوام سوئٹ روس سے ساز باز کر رہے ہیں اور کوئی ایسا اقرار نامہ لکھا جانے والا ہے جس کی رو سے سوئٹ روس پرانا قرضہ معاف کر دے گا اور تمام وہ صوبجات ملک واپس دیدیگا جو پہلے اس کے تحت میں تھے۔ یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ سوئٹ روس نے باکو میں ۴۰ ہزار فوج جمع کی ہے، جو چند ماہ میں ایران میں داخل ہو کر انگریزی فوج کا مقابلہ کرے گی۔ غالباً اسی خطرے سے متاثر ہو کر برطانوی حکومت نے یہ حکم جاری کیا ہے کہ تمام انگریزی عورتیں اور بچے ایران چھوڑ دیں۔

اگر ایران کے سیاسیات نے اسی طرح کروٹ بدلی اور بولشوزم کا رنگ جم گیا، تو لارڈ کرزن کی مدت العمر کی محنت رائیگاں اور تمام بنا بنایا کھیل بگڑ جائے گا۔ اسی کے ساتھ اگر برطانوی مشن کو بھی کابل میں کامیابی نہ ہوئی تو پھر نہ صرف ایران بلکہ میسوپوٹیمیا پر قابو رکھنا اور اس کا تحفظ بھی تقریباً غیر ممکن ہو جائے گا بالخصوص جبکہ برطانوی رعایا ایران اور میسوپوٹیمیا میں توسیع حکومت کی خاطر روپیہ ضائع کرنا پسند نہیں کرتی اور ٹائمس اور ڈیلی میل کے پایہ کے سے اخبارات حکومت وقت کے ان منصوبوں اور ارادوں کی شدت سے مخالفت کر رہے ہیں اور ہندوستان سے بھی ایشر کمیٹی کی تجاویز کی سخت مخالفت اور میسوپوٹیمیا اور ایران سے ہندوستانی سپاہ واپس بلانے کا شدید مطالبہ ہو رہا ہے۔ برطانوی وزرا اب کون سی نئی چال چلیں گے، بولشوزم کا خطرہ کس حد تک بڑھے گا اور مشرق وسطیٰ کے غریب ممالک اور کمزور حکومتوں کا بالآخر کیا انجام ہوگا اس کے متعلق وثوق کے ساتھ کوئی پیشین گوئی کرنی تو سراسر حماقت ہوگی۔ بہر حال صورت معاملات کو حتی الامکان ہم نے صحیح صحیح بیان کر دیا جس سے ناظرین خود اپنی سمجھ کے موافق اندازہ کر سکتے ہیں۔

(۱۶ جنوری ۱۹۲۱ء)

انقلاب روس

(۱)

تمہید: تہذیب و تمدن کی زندگی کی تاریخ میں سیکڑوں ایسے سنگین حادثے اور بیسوں ایسے عظیم انقلاب گذرے ہیں کہ جن پر دنیا صدیوں سے عش عش کر رہی ہے۔ یونان و روما کا عروج و ادبار، اسلامی اور مسیحی معرکہ آرائیاں، ریفرمیشن کا زمانہ، انقلاب فرانسوی کا دور دفتر پارینہ کے محض فسانے نہیں بلکہ تہذیب و تمدن کی زندگی کی وہ منزلیں ہیں کہ جنہوں نے اس کی ہستی کی بنیادیں پختہ کیں۔ اس کی عمارت کھڑی کی اسے بنا بنا کر ڈھایا اور ڈھا ڈھا کر بنایا۔ یہ سلسلہ ابھی تک جاری ہے اور اس وقت جاری رہے گا کہ جب تک انسانی دماغ کا اوج کمال آسمان کے تارے نہ توڑ لائے۔ شبہ نہیں کہ اس وقت تک بڑے بڑے انقلاب گذرے لیکن یہ دعویٰ نہایت بجا طور پر اور بغیر کسی شاعرانہ مبالغے کے کیا جا سکتا ہے کہ جو دور انقلاب اس وقت دنیا کے سر سے گذر رہا ہے وہ اپنی عظمت اور وسعت کے لحاظ سے دنیا کی تاریخ میں آپ ہی اپنی نظیر ثابت ہوگا۔ جو لوگ کہ یونان اور روما کے عروج و ادبار اور تاتاریوں ساسانیوں اور نصرانیوں کی زور آزمائیوں میں سلاطین سلف کے کارناموں اور جنگ و جدل کی تاریخوں سے زیادہ اور کچھ نہیں دیکھ سکتے وہ تاریخ کے ساتھ ظلم کرتے ہیں۔ یہ صرف سلاطین کے کارنامے نہ تھے بلکہ تہذیب و تمدن کے سمندر کی موجیں تھیں کہ جو اس کے لاانتہا اور بے بہا دولت اور خزانہ کو اپنے سینہ پر لے کر اٹھیں کچھ کنارے پر چھوڑ گئیں اور باقی بہالے گئیں۔ یہ تہذیب و تمدن کی مختلف قوتیں اور صورتیں تھیں کہ جنہوں نے دنیا پر اپنا سکہ اور نقشہ جمانے کے لیے زمین اور آسمان سر پر اٹھایا اور اپنا دور پورا کر کے دوسروں کے لیے جگہ خالی کی۔ بعض کے نشان موجودہ تہذیب و تمدن کی صورت کے خال و خط میں ملتے ہیں کچھ کا صرف نام ہی باقی ہے اور بعض کا نام و نشان بھی زمانہ کی کج ادائی سے مٹ گیا۔ کلدیہ، تسیح اور بابل اس کی مثالیں ہیں:

یہ زمیں پہ جن کا تھا دبدبہ بلند عرش پہ نام تھا
انہیں یوں فلک نے مٹا دیا کہ مزار تک کا نشاں نہیں

اسی طرح جن لوگوں کی نگاہ میں ریفریشن اور انقلاب فرانسوی کے دور کے اس سے زیادہ کچھ معنی نہیں کہ مذہب اور آزادی کے نام سے لکھوکھا مخلوق خدا کا خون محض نفسانیت خودسری بغض اور تعصب کی خاطر بہایا گیا ان کی کوتاہ نظری بھی قابل افسوس ہے۔ ورنہ اول الذکر اعلان تھا رواداری کے اس اصول کا کہ جس کو دنیا نے دو صدی کے کشت وخون کے عوض نہایت سستا سیکھا اور آخر الذکر چارٹر جمہوریت کا کہ جس نے کروڑہا جمہور عالم کو اپنی ہستی اور حقیقت سے پہلی مرتبہ آگاہ کیا۔ یہ صحیح معنی ہیں ان انقلابوں کے کہ جو دنیا نے زمانہ سلف میں دیکھے۔ لہذا آج جو دورِ انقلاب ہماری آنکھوں کے سامنے سے گذر رہا ہے اس کے سمجھنے میں دھوکا نہ کھانا چاہیے۔ اس قیامت خیز جنگ کے کہ جو تقریباً چار سال تک اطراف عالم میں نار جہنم کی طرح بھڑکتی رہی اگر کوئی معنی ہیں تو صرف یہ کہ اس نے ہماری بیسویں صدی کے تہذیب وتمدن کی اس عمارت کو کہ جو دبدبۂ عالمگیری اور عیش پرستی کے اصولوں پر کھڑی کی گئی تھی پھر ایک مرتبہ تہ وبالا کر دیا اور اب سوسائٹی اور سلطنتوں کی بنیادیں قطعی نئے اور دوسرے اصولوں پر پڑنی چاہئیں۔ دنیائے مغرب میں سرے رئیس جمہور امریکہ دول فرنگ کو لیگ آف نیشنس کا پیغام دے رہے ہیں اور یورپ کی مشرقی سرحد سے بولشوزم کا جھنڈا بلند ہو رہا ہے۔ دونوں تحریکیں گو ایک دوسرے سے قطعی جدا لیکن نئے اصولوں کی اشاعت کر رہی ہیں کہ جن پر جمہور عالم اپنے اپنے خیال اور مزاج کے مطابق مہر منظوری ثبت کر رہے ہیں۔ لیکن حیرت اور افسوس ہے ان دول فرنگ کی اس دیدہ دلیری اور ہٹ دھرمی پر کہ جو خود پسندی اور خود غرضی سے اندھے ہو کر تاریخ کے واقعات سے سبق سیکھنے کے لیے تیار نہیں اور نہ حوادث عالم کی موجودہ روش پر نظر ڈالنا چاہتے ہیں اور سب سے زیادہ افسوس ان حرص وہوس کے بندوں پر آتا ہے کہ جو اُلٹا پریسیڈنٹ ولسن کا مضحکہ اڑاتے ہیں اور ان کو منہ چڑھاتے ہیں، یا جب اور کچھ بس نہیں چل سکتا بولشوزم کو گالیاں دیتے اور کوستے ہیں۔ یہ تو قرین انصاف ہے کہ آپ سوشلزم کے قطعی نرالے اصولوں پر سوسائٹی کا شیرازہ باندھنے سے جھجکیں اور بولشوزم کی زبردستی اور خطرناک

سے لوگوں کو متنبہ کریں لیکن یہ کہنا کہ بولشوزم کا نہ کوئی اصول ہے نہ ایمان اس کے کوئی معنی ہیں نہ مطلب صرف جمہور فرنگ کی ایک کثیر تعداد قزاقوں اور لیٹروں کی طرح بے آپے اور دنیا کے خون کی پیاسی ہو کر تہذیب و تمدن کو برباد کر رہی ہے محض غلط بیانی ہے۔ اٹھارھویں صدی کے آخر میں جب آزادی، برادری اور برابری کے اصولوں کی تلقین کی گئی تو جمہور عالم کو دنیا کی حکومتیں میں ووٹ کا حق ملا۔ تمام دنیا جمہوریت کی قائل ہوئی اور مورخین نے اس یادگار تحریک اور دور کو انقلاب فرانسوی کا نام دیا۔ آج وہی جمہور عالم انہیں برادری اور برابری کے اصولوں کو زیادہ وسعت دے کر جب نہ صرف حکومت میں ووٹ بلکہ ملکیت اور دولت میں بھی حصہ بٹانے کے دعوا رہے ہیں اور حکومت کا طریقہ بدلنے کے ساتھ ہی ساتھ سوسائٹی کا شیرازہ بھی از سر نو ترتیب دینے پر آمادہ ہوتے ہیں تو روسی انقلاب اور بولشوزم کا نام بھی ہمارے لیے باعث ننگ اور عار ہوتا ہے۔ جو لوگ آج زار اور زارینہ کے قتل پر آنسو بہا رہے ہیں اور بولشوزم سے پناہ مانگتے ہیں اُنہیں یاد دلانے کی ضرورت ہے کہ شہنشاہوں اور تاجداروں کو بر سر دار چڑھانے کی بڑی رسم سب سے پہلے اُنہیں کے آبا و اجداد نے نکالی تھی۔ چارلس اول، لوئی شانزدہم اور ماری انتوئنت[1] کا انگریزی اور فرانسوی انقلاب کے بھینٹ چڑھایا جانا ایسے تاریخی واقعات ہیں کہ جن سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اس وقت بھی قیصر جرمنی کو کیفر کردار تک پہنچانے کی جو سبیلیں سوچی جا رہی ہیں اُن کا سلسلہ بھی اپنی ماہیت کے لحاظ سے انہیں تاریخی حادثوں سے ملتا جلتا ہے کہ جو چارلس اور لوئی پر انگلستان اور فرانس میں گذرے تھے۔ رہا یہ امر کہ آپ نے قوم کا ووٹ اور پارلیمنٹ کا فرمان ہاتھ میں لے کر پھانسی کا پھندا گلے میں ڈالا تھا یا ڈالیں گے صرف یہ ثابت کرتا ہے کہ آپ اپنے جذبۂ انتقام کو رواج اور قاعدے کی پابندیوں کے ساتھ ظاہر کرنا سیکھ گئے ہیں کہ جو دوسرے ابھی نہیں جانتے اور انتقام کی نوعیت یکساں ہی رہتی ہے۔ انصاف اور رحم کا شائبہ نہ آپ میں تھا نہ اُن میں ہے۔ مانا کہ لینن[2] اور ٹروٹسکی[3] ایسے ہی ظالم اور سفاک ہوں کہ جیسا بیان کیا جاتا ہے۔ لیکن روبسپیر[4] اور ڈانٹن[5] کی

---

[1] ملکۂ فرانس۔ لوئی شانزدہم کی بیوی۔ ۱۶ اکتوبر ۱۷۹۳ء کو بر سر دار چڑھائی گئی۔ (بقیہ حاشیہ دوسرے صفحہ پر)

خونریزیوں کی یاد سے بھی کون ہے کہ جس کے رونگٹے اب بھی نہیں کھڑے ہوتے۔ اسی طرح سینٹ[1] بارتھولومیو کا قتلِ عام بھی اہلِ فرانس کے دامنِ شہرت پر ایک ایسا بدنما داغ ہے کہ جو باوصف صدیوں گذر جانے کے ابھی تک نہیں مٹ سکا ہے۔ لیکن ہم نے کسی صاحب الرائے کو ان چنگیں حادثوں کی بنا پر بھی تاریخ کے اس فیصلہ پر کہ جو رفرمیشن اور انقلاب فرانسوی کے بارے میں صادر کیا جا چکا ہے اور جس پر مقبول ہونے کی مُہر لگی ہوئی ہے انگشت نمائی کرتے نہیں دیکھا۔

یہاں پر اس امر کا واضح کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس تمہید اور تحریر کا مدعا نہ بولشوزم کی حمایت ہے نہ سوشلزم کی تلقین۔ جہاں تک راقم الحروف کا تعلق ہے وہ بولشوزم تو درکنار سوشلزم کے اصول و منطق کا بھی اس وقت تک نہ عقلاً نہ عملاً قائل ہے نہ موجودہ لیل و نہار کو دیکھتے ہوئے اس امر کی امید بندھتی ہے کہ وہ معراجِ ترقی کہ جس کا خواب اس وقت سوشلزم کے حامی دیکھ رہے ہیں۔ دو چار نسل بعد بھی دنیا کو نصیب ہو سکے۔ بہرصورت اور بہرحال ایسے سچے اور پاک اصولوں اور ارادوں کی تلقین بھی کہ جیسے اخوتِ انسانی اور آزادی جمہوریہ زورِ شمشیر نہ اصولاً نہ اخلاقاً جائز کہی جا سکتی ہے اور اس لحاظ سے ہمکو بولشوزم کے اصول اور طریقے سے قطعی اختلاف ہے لیکن اُسی کے ساتھ یہ دیکھتے ہوئے کہ انسان کی چشمِ بصیرت اور قوتِ فیصلہ غیر متزلزل اور غیر محدود نہیں دنیا کی تاریخ میں ایک ایسے اہم موقع پر کہ جس وقت ہماری تہذیب قطعی نئی کینچلی بدل رہی ہے ایک مدت العمر کے اصول اور طریقے ہمیں خیرباد کہہ رہے ہیں اور ترقی کی نئی نئی راہیں نکل رہی ہیں ہمارا کسی ایسی تحریک کے بارے میں کہ جس کو عالمگیر ہونے کا دعویٰ ہے اور جو اس وقت بھی آدھے سے زیادہ یورپ کے سیاسی جسم کے رگ و ریشہ میں بجلی کی طرح دوڑتی اور سرایت کرتی معلوم ہوتی ہے اور جس کے بارے میں ہماری واقفیت نہ صرف محدود بلکہ قطعی یکطرفہ اور شاید غلط بھی ہے وثوقِ کامل کے ساتھ کوئی قطعی فیصلہ صادر کرنا نہ صرف چھوٹا منھ اور بڑی بات بلکہ انسان کے لیے خدائی کا دعویٰ ہوگا۔ ہمارے بہت سے ایسے اصولوں اور عقیدوں کو جن کو پشتہا پشت سے ہم سچا

---

[2] موجودہ حکومت روس کا مدعا [3] اعظم [4] مشیر خاص [5] وحشی [6] فرانسوی انقلاب کے زمانہ میں انتہا پسند طبقہ لیڈر

[1] رفرمیشن کی تاریخ میں بھی ایسا ہیبت ناک قتلِ عام اور کبھی نہیں ہوا۔ ۲۴ اگست ۱۵۷۲ء کے تڑکے سے تین روز تک پیرس میں جس قدر بھی پروٹسٹنٹ مرد، عورت اور بچے سامنے آئے بے رحمی سے قتل کیے گئے۔

ملتوی چلے آتے تھے۔ پچھلے چار سال کے حادثوں نے جھوٹ ثابت کر دکھایا۔ مہینوں اور برسوں کی منزلیں دنوں اور گھڑیوں میں طے ہو گئیں۔ کون جانتا ہے کہ وہ منزلیں بھی کہ جن کو ہم اس وقت صدیوں اور جگوں کی منزلیں سمجھتے ہیں مہینوں اور دنوں میں نہ طے ہو جائیں گی۔ ایڈ ہفت خوان میں ابھی تک جس قدر منزلیں ہم نے طے کیں ترقی اور آزادی کی جس قدر بھی نئی راہیں اب تک کھولیں اُن کے لیے کافی خون بہایا۔ پچھلے انقلابات کا تجربہ پکار پکار کر کہہ رہا ہے کہ جو کچھ سر پر سے گذر چکا اُس سے سبق سیکھو، کشت و خون اور جنگ و جدل سے باز آؤ اور ترقی کی سیدھی راہ پر چلے جاؤ۔ یہی ہماری آرزو اور ارمان ہے اور یہی ہمارا عقیدہ اور ایمان۔ لیکن دنیا سے ہٹ دھرمی اور جہالت خود غرضی اور رعونت، کفر اور بے ایمانی اُٹھ نہیں گئی ہے۔ سیدھی راہ چھوڑ کر ٹیڑھے راستہ پر چلنے والے اب بھی موجود ہیں۔ کون کہہ سکتا ہے کہ ایسی حالت میں مثل پچھلے انقلابوں کے ترقی اور آزادی کی باقی راہیں خون آلودہ بولشوزم کے ہاتھوں ہی کھلنی نہ بدی ہیں۔ لہٰذا عقل اور انصاف اس امر کا مقتضی ہے کہ انقلاب روس یا دوسرے الفاظ میں بالشوزم کی تحریک پر ہم اپنا قطعی فیصلہ آیندہ کے لیے ملتوی رکھیں اور جس وقت تک یہ طوفان فرو نہ ہو جائے سیاسی مطلع صاف نہ ہو اور زمانہ کسی ایک کروٹ نہ بیٹھے ہم صرف آنکھوں اور کانوں سے کام لیں اور زبان بند رکھیں۔ اپنی رائے کی تائید میں ہم ذیل میں ایک اقتباس پیش کرتے ہیں کہ جس کے بارے میں صرف اس قدر کہہ دینا کافی ہوگا کہ یہ کسی روسی یا جرمن بولشوک کی تحریر نہیں بلکہ سیاسی کاربرداز ان برطانیہ کی ایک نہایت ذی اثر اور نامور جماعت کے ایک رُکن کی رائے ہے:

"روسی انقلاب کی موجودہ صورت محض تباہی اور بربادی کی ہے اور اسی وجہ سے اس پر لعنت و ملامت کرنے کو طبیعت چاہتی ہے۔ بالخصوص اس باعث سے کہ جو خطرناک صورتیں پیدا ہوئیں اُن سے ہمارے اس جنگ میں شکست کھا جانے کا اندیشہ ہے یہی وجہ ہے کہ قطعی خلاف اور آخری فیصلہ صادر کرنے کو طبیعت چاہتی ہے۔ لیکن غور کرنے سے اس ناموافق اور قطعی فیصلہ صادر کرنے ہوئے بھی شکوک پیدا ہوتے ہیں اور نہایت واجبی شکوک پیدا ہوتے ہیں کیونکہ پہلے سال کے سانحے اور حادثے کو دل و دماغ پر کافی

حیرت اور ہیبت طاری کرنے والے ہیں، آخر کار ایک غیر معلوم اور غیر محدود سلسلہ کی پہیلی ہی کر دی تو ہیں۔ امر واقعہ یہ ہے کہ روسی انقلاب ابھی تک کسی پائدار اور مستقل شکل میں نہیں ڈھلا ہے۔ یہ تو مشرقی یورپ کی ترتیب اور تعمیر کے جدید سلسلہ میں گویا صرف پہلی منزل اور شروع کا زینہ ہے۔"

"روس کا ابھرنا اور سنبھلنا تو یقینی ہے لیکن اس دور کی آئندہ منزلوں میں وہ کیا اور کون سی صورت اختیار کرے گا اس پر وثوق سے کچھ کہنا انسانی فہم اور ادراک سے بعید اور بالاتر ہے۔ اس انقلاب نے مغرب کے دل و دماغ کو سخت دھچکا دیا ہے۔ اتحادی اور جرمن دونوں یکساں طور پر اس سے عاجز آئے ہیں۔ فوجی شاطروں کے نقطۂ نگاہ سے تو یہ انقلاب ایک بلائے ناگہانی ثابت ہوا ہے لیکن اگر یہ قیامت خیز جنگ آئندہ ملکی اور معاشرتی کایا پلٹ اور نجات کا ذریعہ مانی جائے تو یہ انقلاب بھی نظام عالم کی جدید تعمیر میں بہت بڑا عنصر ثابت ہوگا۔"[1]

قصہ مختصر قبل ازیں کہ ہم انقلاب روس کے حیرت انگیز اور سبق آموز داستان پر ایک سرسری نظر ڈالیں تین باتوں کا ذہن نشین کرا دینا ضروری سمجھتے ہیں۔ اوّل یہ کہ اس انقلاب کی تہ میں جو تحریک کام کر رہی ہے اس کا اصول بھی ہے اور مقصد بھی عقیدہ بھی اور ایمان بھی۔ یہ بات دوسری ہے کہ اس کا اصول اور مقصد، عقیدہ اور ایمان ہمارے اور آپ کے اصول اور ایمان سے مختلف ہو۔ دوسرے یہ کہ یہ تحریک گو شروع روس سے ہی ہوئی ہے لیکن صرف روس پر محدود نہیں بلکہ عالمگیر ہو رہی ہے۔ تیسرے یہ کہ اس انقلاب کا دور ابھی ختم نہیں ہوا۔ زمانہ برابر کروٹیں بدل رہا ہے کسی کو نہیں معلوم کہ دنیا کس کروٹ چین لے گی اور بالآخر نظام عالم کیا

---

[1] راؤنڈ ٹیبل ستمبر ۱۹۱۸ء

صورت قرار پائے گی۔ اس لئے ہم کو قطعی فیصلہ صادر کرنے سے پرہیز کرنا چاہئے اور صرف اس کے دیکھنے اور سمجھنے اور اس پر غور کرنے میں مصروف ہونا چاہئے۔ محض گالیاں دینے اور کوسنے سے کام نہیں چل سکتا۔ اب روسوی انقلاب کی داستان سنیئے۔

اصلاح و تخریب

پچھلے ۱۲ برس میں روس نے انقلاب کے دو دَور دیکھے اول وہ کہ جو جنگ روس و جاپان کے بعد ۵-۱۹۰۴ء میں گذرا۔ دوسرا یہ کہ جو اس عالمگیر جنگ کے دوران میں ۱۹۱۷ء سے شروع ہوا جس کی کچھ منزلیں طے ہو چکی ہیں اور کچھ ابھی باقی ہیں۔ قبل اس کے کہ ہم روسوی انقلاب کے دور اول اور آخر پر کچھ عرض کریں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ روس کی پچھلی نصف صدی کی اصلاح و تخریب کی کیفیت پر بھی ایک سرسری نظر ڈالی جائے۔ روسوی انقلاب کی حقیقت سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ اس ملک کے بارے میں دو تین باتیں ہمیشہ دھیان میں رکھی جائیں۔ اوّل یہ کہ جیسی مطلق العنان حکومت روس میں ایک قائم رہی ایسی کسی فرنگی ولایت میں دیکھنے میں نہ آتی تھی۔ زار روس اور اس کے حکام اعلیٰ سیاہ اور سپید کے پورے مختار تھے اور کسی کو حکومت میں ذرہ بھر بھی دخل نہ تھا۔ دوسرے یہ کہ روسی باشندے خلقتاً اور فطرتاً سوشلزم کی طرف مائل ہوئے ہیں۔ روسی حکومت نے بھی انہیں اسی طرف جانے کے لئے مجبور کیا ہے اور قبل اس کے کہ انقلاب نے سر اٹھایا روس کے تعلیم یافتہ نوجوانوں کے خیالات اور عقائد کا میلان سوشلزم کی طرف تھا۔ تیسرے یہ کہ روس کے تاجداروں اور وہاں کے حکام بالادست کا خون انقلاب سے بہت پیشتر بھی بارہا کسی نہ کسی قاتل کے ہاتھ سے بہتا رہا ہے جیسا کہ ظلم و تعدی کی حالت میں ہوا کرتا ہے۔

جنگ کریمیا سے لے کر اول دور انقلاب کے شروع ہونے تک اصلاح و تخریب کا دور جاری رہا ہے کئی بار آیا اور گیا۔ روس میں حکومت کی نرمی و سختی کا دارومدار زیادہ تر یورپ کی آب و ہوا پر رہا ہے۔ جب یورپ میں طوفان و ہنگامہ اٹھا اور اصلاح کے آثار نمایاں ہوئے روس میں سختی برتی گئی۔ جب یورپ میں سکون بلکہ بے حسی کی کیفیت نمایاں رہی روس میں حکومت نے باگیں کسی قدر ڈھیلی کر دیں۔ بقول ایک روسی لبرل کے جب یورپ نے ڈنکا مچایا روسیوں کی چاند پر چپت پڑی۔ جنگ کریمیا کے بعد الگزنڈر نے تخت نشین ہوتے ہی اصلاح کا دور

شروع کیا۔ چنانچہ اس دور کے اصلاحوں میں خاص خاص کا مختصر تذکرہ کیا جاتا ہے۔ پہلی اصلاح تو یہ کی گئی کہ تقریباً ۵ کروڑ غلاموں کو آزاد کیا گیا اور اُن کو زمین دی گئی تاکہ کسانوں کی حیثیت سے وہ اپنی زندگی معمولی طریقے سے بسر کر سکیں۔ دوسری اصلاح یہ تھی کہ ہر کونٹی یا ضلع میں لوکل بورڈ قائم کیے گئے ان کو بمنزلہ ہندوستان کے ڈسٹرکٹ بورڈ کے سمجھنا چاہیے۔ اس کا روسی نام "زمستوا" قرار پایا۔ ۵ سال کے بعد میونسپلیٹیاں بھی قائم ہوئیں۔ تیسری اصلاح یہ کی گئی کہ فوجداری کے مقدمات جج باجلاس جوری کے سامنے فیصل ہونے لگے۔ روس میں کہ جہاں قطعی نادرشاہی حکومت تھی ملزم کے حق میں جوری ایک نعمت غیر مترقبہ تھی۔ چوتھے جبریہ فوجی خدمت کا دستور بھی جاری کیا گیا۔ آزادی تحریر و تقریر کے بارے میں کشمکش رہی لیکن بیشتر کی سختیاں کم ضرور کر دی گئیں۔ ان اصلاحوں کے بجائے تعجب نہیں کہ لوگوں کی آنکھیں کھولیں اور اب بے چینی زیادہ ہونے لگی۔ حکومت نے اصلاحوں کا الٹا اثر ہوتے دیکھ کر معاملہ کی صورت پر غور کیا۔ دو ہی صورتیں تھیں یا تو مزید اصلاح اور آزادی کی طرف قدم بڑھایا جائے یا باگیں اور زیادہ کھینچی جا دیں۔ الیگزنڈر گو نیک نیت تھا لیکن ہمت نہ پڑی۔ مشیروں نے اور معتمدوں نے داویلا مچایا اور سخت گیری کا دور شروع ہوا۔ ۱۸۶۴ء سے ۱۹۰۴ء تک سخت گیری کی پالیسی کا پورا پورا امتحان کیا گیا۔ لیکن ہر شے کی حد ہوتی ہے جنگ روس اور جاپان نے روس کی تقدیر کو پلٹا حکومت نے شکست کھائی رعایا کے بھاگ کھلے۔ قوم میں ہیجان پیدا ہونے لگا۔ بے اطمینانی اور بیداری عیاں ہونے لگی۔ ۱۸۵۶ء میں جو اصلاح کا بیج بویا گیا تھا وہ باوصف سخت گیری اور لاپرواہی کے پھل پھول لایا۔ پھر دنیا کی ہوا بدل رہی تھی۔ جاپان کی فتح نے تمام عالم کی آنکھیں کھول دی تھیں۔ حکومت روس کی قلعی بھی کھل گئی تھی۔ رعیت کے حوصلے بڑھ گئے تھے۔ ان تمام اسباب و وجوہ نے اپنا اثر دکھایا اور پہلی "زمستوا کانگریس" مسٹر شپاف کی صدارت میں نومبر ۱۹۰۴ء میں یکجا ہوئی اور رعایا روس کے دلولے اور ارمانوں نے پولٹیکل میدان میں نکلنے کے لیے گویا باضابطہ جامہ پہنا۔ مسٹر شپاف نہایت معتدل اور دوراندیش اور قابل مدبر تھے ان کی صدارت میں قوم کی آواز اور اس کا لہجہ بھی معقول پسندی کا اور جادۂ اعتدال سے نہ گذرنے پایا۔ کانگریس کے مطالبات حسب ذیل تھے۔

کسی شخص کو جب تک کہ وہ کسی خودمختار عدالت سے ملزم نہ ٹھہرے سزا نہ دی جائے۔

آزادیٔ ایمان، مذہب اور تقریر و تحریر حاصل ہوئے۔ حکام کی بے عنوانیوں کی چارہ جوئی عدالت میں باضابطہ ہو سکے۔ تمام رعایا کے حقوق یکساں اور برابر ہونا چاہئیں۔ "زمستوا" میں تمام رعیت کی نیابت یکساں ہو۔ کسی خاص فرقہ یا خاص طبقہ کے حقوق کم و زیادہ نہ ہوں۔ دیہی پنچایتیں قائم کی جائیں۔ لوکل گورنمنٹ کا دائرہ اختیار تمام لوکل معاملات پر حاوی ہو اور لوکل سلف گورنمنٹ تمام حصص سلطنت میں قرار پائے۔ آخر میں یہ استدعا کی گئی تھی کہ امپریل گورنمنٹ کو واجب ہے کہ تمام ملک کے منتخب نمایندوں کو ایک اسمبلی میں جمع کر کے اُن کے اصلاح و مشورے سے قومی ترقی کی ایسی عمارت تعمیر کرے جس کی بنیادیں انصاف اور آزادی پر رکھی گئی ہوں۔ اور جس میں رعیت اور حکومت دونوں کا حصّہ ہو۔ ان مطالبات کی حمایت میں اطراف ملک سے صدائے ہم آہنگی اٹھی اور قوم کے تمام طبقوں نے ان پر مہر منظوری ثبت کی۔ معلوم ہوتا تھا کہ گونگوں کو زبان آگئی اور مردہ قالبوں میں جان پڑ گئی۔ افسوس ہزار افسوس کہ حکومت کو عقل نہ آئی اور شورش و انقلاب نے سر اٹھایا۔

(۲)

"زمستوا کانگرس" کہ جس کا تذکرہ پہلے ہو چکا ہے۔ روس میں پہلی سیاسی مجلس تھی کہ جس نے قومی جذبات اور خیالات کو مطالبات کی شکل میں ڈھال کر ۱۹۰۴ء میں پہلی مرتبہ حکومت وقت کے کانوں تک پہونچایا۔ سیاسی قسم کی یہ پہلی مجلس تھی کہ جس کو قومی تحریک کا نقیب واجب طور سے دیا جاسکتا ہے۔ شروع شروع میں اس کا رویہ مؤدبانہ، لہجہ ملائم اور مطالبات معمولی تھے۔ لیکن ارباب حکومت کی بے اعتنائیوں نے اسے گستاخ ہونے پر مجبور کیا اور بالآخر اسی کے ذریعہ سے انقلاب کی راہیں کھلنے لگیں۔ کانگرس کا اجلاس نومبر ۱۹۰۴ء میں ہوا تھا اور اُس وقت اُس کے حامی اور مددگار معدودے چند کا بران قوم سے زیادہ نہ تھے لیکن دو ماہ میں اس کی آواز بازگشت

ملک کے ہر حصہ اور گوشہ میں گونجنے لگی۔ تقریباً تمام زمستوا کونسلوں نے اس کے تجاویز کو صاد کیا سوا تعلیم یافتہ طبقہ کے ہر گروہ نے کہ جس میں وکلا، ڈاکٹر، انجینیر، اخبار والے اور طلبا، سب ہی شریک تھے اپنے اپنے مقام پر انہیں تجاویز کو دہرایا اور منظور کیا۔ ممکن نہ تھا کہ یہ زبردست فریاد اراکین حکومت کی طبیعتوں کو بے چین نہ کرتی۔ لیکن خود سری اور فرعونیت جن کا خاصہ اور زبردستی اور خود غرضی جن کا شیوہ ہو ان کے دل مشکل سے متاثر ہوتے ہیں۔ زار روس کا ایک فرمان شائع ہوا کہ جن میں مختلف محکموں کے انتظامات میں بعض جزوی اصلاحوں کی امید دلائی گئی تھی۔ اس کے ساتھ حکومت وقت نے ایک اور مراسلہ بھی شایع کیا کہ جس میں رعب داب حکومت کا اعادہ اور شان سلطنت کا حوالہ تھا۔ شورش پسندوں پر حسب معمول لعن وطعن کی گئی تھی اور رعیت کو آنکھیں دکھلائی گئی تھیں۔ اول تو اصلاحات ہی کہ جن کا وعدہ کیا گیا تھا رعیت کے درد کی کسی طرح دوا نہ ہو سکتی تھیں پھر بھی اگر ان سے اچھا اثر پڑتا تو سرکاری مراسلہ کی لعن طعن اور اس کے درشت لہجے نے اُسے فوراً ہی زائل کر دیا۔ رعیت میں مایوسی پھیلنے لگی اور شورش نے سر اٹھایا۔ اس وقت تک یہ تحریک گو کافی قوت پذیر ہو چکی تھی، تاہم محض تعلیم یافتہ طبقہ تک محدود تھی اب اس نے ایک قدم اور آگے بڑھایا اور عوام الناس میں پھیل کر عالمگیر ہو گئی۔ مختلف فیکٹریوں اور کارخانوں میں ہڑتالیں ہونے لگیں۔ شروع شروع میں ان کے وجوہ اقتصادی بیان کیے جاتے تھے لیکن کچھ عرصہ بھی نہ گذرنے پایا کہ سیاسی رنگ غالب آگیا۔ اور نہ صرف تجارت اور کارخانے معطل اور بے کار رہنے لگے بلکہ حکومت کے کام میں بھی خلل پڑنے لگا۔ تاہم یہ امر یاد رکھنے کے قابل ہے کہ شروع کے چند ہفتوں تک جب تک کہ حکومت نے اپنی زیادتیوں اور ستم آرائیوں سے اس کو قطعی مجبور نہ کر دیا۔ اس تحریک کا دامن کشت وخون کی آلائش سے بالکل پاک وصاف تھا اور بجز حکومت خود اختیاری کے مطالبہ کے سلطنت سے علیحدہ یا آزاد ہونے کا مطالبہ کسی نے زبان پر نہ لایا تھا۔ مثل ہندوستان کی معصوم رعیت کے روسی بھی اسی خیال سے بھولے ہوئے تھے کہ محض پیسو رسسٹنس کے زور سے حکومت کو اپنے مطالبات کے منظور کرنے پر مجبور کر سکیں گے۔ ان سادہ لوح عوام الناس کو یہ گمان بھی نہ گذرتا تھا کہ حکومت وقت پولیس اور فوج کے ذریعہ سے ان کی پرامن تحریک کو کشت وخون

کے ہنگامے اور مجادلوں میں تبدیل کر سکتی ہے اور کر دے گی۔

پرنسٹ وبیٹرس نامی انگریزی تاریخ نگار نے کہ جو اس زمانہ میں خود روس کی سیاحت کے لئے گیا ہوا تھا اِس دورِ انقلاب کے اکثر واقعوں اور حادثوں کی اپنی تصنیف میں نہایت دلاویز تصاویر کھینچی ہے۔ ان میں سے ایک خاص یادگار واقعے کا مرقع ہم ذیل میں نقل کرتے ہیں وہ۔

"۱۹ جنوری ۱۹۰۵ء کو ہڑتال والوں کی ایک کمیٹی قائم کی گئی کہ جس میں اکثر کارخانوں کے لوگ شریک تھے۔ اس کمیٹی نے امداد پہونچانے کا وسیع پیمانہ پر انتظام کیا۔ ماسوا جد و جہد بھی جاری رکھی۔ جب کارخانہ داروں سے کوئی باہمی سمجھوتہ نہ ہو سکا تو کمیٹی نے یہ طے کیا کہ کثیر تعداد جمہور کی طرف سے خود زار روس کی خدمت میں عرضی پیش کی جائے۔ یہ عرضی پادری گیپن نے تیار کی۔ اس کے دو حصے تھے ایک میں اقتصادی مطالبات کا تذکرہ تھا اور دوسرے میں انہیں پولیٹیکل مطالبات کا کہ جو زمستوا کانگرس نے پیش کئے تھے۔

۲۰ جنوری کو پادری گیپن نے اپنے ساتھیوں کو مخاطب کر کے یہ ہدایت کی کہ ان کو شہنشاہ کے حضور میں جانا چاہئے لیکن مسلح نہیں بلا ہتھیار کے، کیوں کر زار وہ چور نہیں نہ ڈاکو بلکہ محسن رعایا۔ اُس نے ان سے یہ وعدہ بھی لیا کہ اگر ضرورت ہوگی تو جان دینے سے بھی دریغ نہ کریں گے۔ ۲۲ جنوری کو کثیر التعداد گروہ مزدوروں اور کاریگروں کے یکجا ہو کر جلوس کی شکل میں شہنشاہ کے محلات کی طرف روانہ ہوئے۔ ان کے ساتھ بازاری لوگ بھی بہ کثرت شریک تھے۔ شہر کے ہر ناکہ پر فوج کا پہرا تھا۔ فوج نے اس جلوس کو منتشر کرنا شروع کیا اور بعض موقعوں پر گولی چلائی۔ پادری گیپن تو راستہ ہی میں گھائل ہو کر گر پڑے لیکن لوگوں کا ایک کثیر مجمع اپنے بادشاہ کے محلات کے سامنے تک پہونچ گیا۔ فوج اور پولیس نے انہیں نشانہ بندوق بنا کر پیچھے ہٹا دیا۔ لوگ اس نشانہ بازی کے لئے تیار نہ تھے۔

متحیر ہو کر پیچھے ہٹے۔ جہاں گولی چلائی جا رہی تھی وہیں درختوں پر بعض کمسن لڑکے تماشا دیکھنے کی غرض سے بیٹھے ہوئے تھے۔ پولیس نے اُن کو بھی چُن چُن کر نیچے گرا دیا۔ اس پر لوگوں میں غصہ کی آگ مشتعل ہوئی اور بعض افسروں کی لوگوں نے کافی زدوکوب کی۔ بیگل پر پہونچ کر عوام نے مقابلہ کرنے کی کچھ کوشش کی لیکن معاملہ رفت و گذشت ہو گیا۔ شام کے وقت پبلک لائبریری اور فری اکونامک سوسائٹی کی عمارت میں متعدد احباب لبرل پارٹی نے یکجا ہو کر اظہار غم و غصہ کی تجاویز منظور کی۔

"اس حادثہ کے بعد جنرل ٹریپاف محکمۂ پولیس کا افسر اعلیٰ ماسکو طلب کیا گیا اور سینٹ پیٹرس برگ کا اول گورنر جنرل مقرر ہوا۔ اس کو خاص اختیارات دیے گئے یعنی وہ تمام سلطنت کے سیاہ و سفید کا مالک اور مختار کل بنایا گیا۔ جنرل ٹریپاف نے پہلا کام یہ کیا کہ ہر طرح کے جلسے اور عام مجمعے ممنوع کیے اور فریق لبرل کے اُن لیڈروں کو بھی کہ جن کا حادثہ مذکورہ سے کوئی واسطہ نہ تھا زیر حراست لیا۔ اس کی رائے میں انقلاب پسند اور اعتدال پسند سب ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے تھے کہ جن کے ساتھ ایک ہی سا سلوک ہونا چاہیئے تھا۔ اس کو یہ گمان بھی پیدا ہو گیا تھا کہ روس میں حکومت جمہوری قائم کرنے کی کوئی سازش موجود ہے کہ میکزم گورکی جس کا سرغنہ ہے۔ میکزم گورکی کے علاوہ اس نے اکثر ممتاز اور ذی اقتدار موڈریٹ لبرل لوگوں کو بھی گرفتار کیا۔ گو تھوڑے دن حراست میں رکھے جانے کے بعد یہ لوگ رہا کر دیے گئے۔ اس کے بعد سرکاری ایما اور اشارے سے مزدوروں اور کاریگروں کا ایک ڈیپوٹیشن ترتیب دیا گیا کہ جس کو شہنشاہ نے اپنے حضور میں باریابی کا فخر بخشا۔ ڈیپوٹیشن کی بڑی پرتکلف ضیافت کی گئی اور محلات کی سیر کرائی گئی کہ جس کے بعد یہ لوگ خوش خوش گھر واپس آئے۔ دو سرکاری کمیشن بھی

اقتصادی معاملات کی تفتیش و تحقیق کے لیے مقرر کیے گئے لیکن دونوں
ناکام ثابت ہوئے۔ گیپن کا کلب توڑ دیا گیا۔ اور کثیر تعداد کاریگروں
اور مزدوروں کی جلاوطن کر دی گئی۔ یہی باتیں ہیں کہ جنہوں نے روس
میں انقلاب برپا ہونے اور اس کی آگ بھڑکانے میں مدد دی"۔

۲۲ر جنوری کا دن اِس قومی تحریک کی تاریخ میں اِس لحاظ سے یادگار سمجھا جاتا ہے کہ اس دن سے حکومت وقت اور رعایا روس دونوں نے آئینی طریقوں کو خیرباد کہہ کر ایک نے ظلم تعدی اور دوسرے نے شورش و انقلاب کا راستہ اختیار کیا کہ جس میں کافی کشت و خون کی نوبت آ گئی۔ ۲۲ر جنوری کے حادثہ نے اِس قومی تحریک کو بجائے کسی قسم کا نقصان پہونچانے کے عوام الناس میں شہرت دی اور اب ہڑتالوں کا سلسلہ ریاست کے دور دراز مقامات تک بھی پھیلنے لگا۔ ماسوا اب ہڑتالیں بجائے دنوں کے مہینوں تک جاری رہنے لگیں اور رعیت کا کوئی طبقہ مشکل سے ایسا بچا ہوگا کہ جس میں یہ مرض نہ پھیلا ہو۔ یہ معلوم کرنا تو نہایت دشوار ہو گیا تھا کہ کس جماعت کو کیا خاص شکایت ہے اور اس کی کیا اصلیت ہے لیکن اس میں شبہہ کی گنجائش باقی نہ تھی کہ ہر کس و ناکس کو کچھ شکایت ضرور ہے۔ ہڑتالوں کے عالمگیر وبا کی طرح پھیلنے سے نہ صرف ملک کے کاروبار بلکہ حکومت کے انتظام میں بھی خلل پڑنے لگا۔ گورنمنٹ جب تک ایک قضیہ کو رفع دفع کرتی تھی دوسرا اور برپا ہو جاتا تھا۔ جب حکومت کا اس طرح ناک میں دم ہونے لگا تو جنرل ٹریپاف نے بھی بدلہ لینے کی ٹھانی۔ شروع شروع میں ہڑتالیں امن و امان کے ساتھ ہوتی تھیں رفتہ رفتہ فساد و ہنگامہ بھی معمول ہو گیا۔ جہاں کہیں ہڑتال ہوتی پولیس بر سر فساد آمادہ ہو جاتی اور شہر کے رذیل اور بدمعاش لوگوں کو یکجا کر کے بلوہ و ہنگامہ برپا کر دیتی۔ اس کے شکار زیادہ تر مدرسوں کے لڑکوں یا کالج کے طلبا ہوا کرتے اور پڑھے لکھے سفید پوش بالعموم اسکی زد میں آتے۔ پولیس اور بدمعاشوں کا یہ گروہ کہ جو فساد و ہنگامہ برپا کرتے تھے اور اب جو تقریباً سب شہروں میں رونما ہونے لگے تھے BLACK GANG کے نام سے موسوم کیے جاتے تھے۔ یہ امر اب پایۂ تحقیق کو پہونچ گیا ہے BLACK GANG خاص جنرل ٹریپاف

کی ہدایت سے وجود میں لائے گئے تھے، اور ان میں بعض نامی اور ذی اثر حکام، پادری اور روؤسا بھی شامل ہوتے تھے۔ اس طرح سے پولیس ہر قسم کا ظلم ڈھاتی اور کشت وخون سے اپنا ہاتھ رنگتا۔ جب یہ نوبت پہونچی تو رعیت کی طرف سے جواب الجواب دیا گیا کہ پولیس کے عہدہ دار بالعموم اور اعلیٰ حکام اور گورنر بالخصوص چن چن کر بمب کے گولوں سے نشانۂ موت بنائے جانے لگے۔ سب سے سنگین حادثہ شہنشاہ روس کے چچا گرانڈ ڈیوک کا قتل تھا۔ برنڑ وپیئرس اس حادثہ کو یوں بیان کرتا ہے۔

"گرانڈ ڈیوک سرجیٹس نہایت خود سر اور تشدد پسند شخص تھا۔ اس نے اعلانیہ یہ رائے ظاہر کی تھی کہ "لوگ مار کھانا چاہتے ہیں" ماسکو کے گورنر جنرل کی حیثیت سے اُس نے یہودیوں اور طالب علموں پر سخت تشدد روا رکھا تھا۔ لوگ اس سے بیزار تھے .... سرجیٹس کے قتل کا ارادہ کئی روز قبل سے کر لیا گیا تھا اور اس کو اس ارادہ سے مطلع بھی کر دیا گیا تھا۔ کیلف نامی ایک نوجوان نے اس کام کے انجام دینے کی قسم کھائی تھی۔ جوں ہی کہ ایک روز گرانڈ ڈیوک سرجیٹس کی سواری رات کے وقت سینٹ نکالس کے دروازے سے باہر نکلی کیلف نے آگے قدم بڑھا کر بمب کا ایک گولہ گاڑی پر پھینکا اور حیرت زدہ کھڑا ہوا اسکے کرشمہ کو دیکھتا رہا۔ گرانڈ ڈیوک کے پرخچے اُڑ گئے۔ رعیت نے نہ غم نہ غم ظاہر کیا۔ ۱۷ فروری کو گرانڈ ڈیوک قتل ہوئے۔ ۲ مارچ کو زار روس نے ایک تازہ فرمان شایع کیا کہ جس میں پہلی مرتبہ پارلیمنٹ قائم کرنے کا صاف صاف وعدہ کیا گیا تھا۔ شپاف کے کانگرس کو جس لاپروائی کے ساتھ ٹالا گیا تھا اور کیلف کے بمب پر جیسی کچھ توجہ کی گئی، ان دونوں کا فرق بہت کچھ معنی خیز ہے"۔

قصہ مختصر ایک جانب سے شورش وہنگامہ برپا، ہڑتالوں کا بازار گرم اور گولہ اندازی کے افسوسناک حادثے آئے دن کی باتیں تھیں۔ دوسری جانب پولیس کے غنڈوں کے فساد اور

بلوے اور مارشل لا کی ستم آریاں ارباب حکومت کا سامان تفریح اور روزمرہ تھا۔ جاپان کے ہاتھوں روس کی شکست اور سوشما میں روسی فوج اور اقتدار کی تباہی اور بربادی حکومت وقت کے لئے موے پر سو دُرّے کی تمثیل صادق ہوئی۔ حکومت کا رعب واقتدار اٹھنے لگا اور جمہور کے حوصلے اور ہمت میں ترقی ہوئی۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ حکومت کا شیرازہ بالکل تتر بتر ہو گیا تھا یا آئینی طریق جدوجہد اور باقاعدہ تحریک آزادی اپنے قدم ثابت نہ رکھ سکی تھی۔ کانگرس ہر دوسرے تیسرے مہینے اپنے اجلاس منعقد کرتی اور قومی جوش اور ولولہ سے پورا فائدہ اٹھاتی۔ اس کا دائرہ اثر برابر بڑھتا جاتا تھا بلکہ اس کی آواز پر اب معمول سے زیادہ توجہ کی جاتی تھی۔ اس شورش اور جوش کے زمانہ میں جیسا کہ لازمی تھا کانگرس میں مختلف خیال اور رائے کے گروہ اور جماعتیں پیدا ہو گئی تھیں۔ یہ چھوٹی چھوٹی جماعتوں اور باریک اختلافات سے قطع نظر کر کے کانگرس میں اس وقت تین ہی گروہ تھے۔ انگریزی اصطلاح میں اُن کو کنسرویٹو، لبرل اور سوشلسٹ سے نامزد کرنا بیجا نہ ہوگا۔ کنسرویٹو گروہ کا اثر برائے نام تھا۔ سوشلسٹ یا مزدور اور کاریگر پیشہ جماعت قوت اور اقتدار حاصل کرتی جاتی تھی لیکن ابھی تک قلیل التعداد تھی۔ لبرل فریق کہ جس کا روسی نام کیڈٹ تھا بکثرت اور برسر اقتدار تھا۔ کانگرس کا مطالبہ تھا کہ پارلیامنٹ قائم کی جاوے کہ جس کے انتخاب میں ہر فرد جمہور کو رائے دینے کا اختیار ہو اور عورتوں کو بھی ووٹ ملے۔ ارباب حکومت پارلیمنٹ کے زیر اقتدار اور اس کے روبرو اپنے اعمال کے ذمہ دار ہوں۔ حکومت وقت کی جانب سے بھی ایک اسکیم پیش کی گئی تھی کہ جس میں پارلیمنٹ قائم کرنے کا وعدہ تھا لیکن انتخاب فرقہ وار نیابت کے اصول پر تجویز کیا گیا تھا اور ارباب حکومت پارلیمنٹ کے اثر و اقتدار سے بالاتر رکھے گئے تھے۔ کانگرس نے اس تجویز کو رد کر دیا۔ لیکن حکومتِ وقت نے اسی کو عملی جامہ پہنا دیا۔ کانگرس میں پہلے بائیکاٹ کا چرچا ہوا لیکن بالآخر یہ طے پایا کہ نئے پارلیامنٹ میں سرکاری شرائط پر شریک ہونا چاہئے اور شریک ہو کر اپنی رایوں اور منصوبوں سے اس کی شکل اور صورت بدلنی اور اس کے حقوق اور اختیارات کو توسیع دینی چاہئے۔ چنانچہ ۱۰ مئی ۱۹۰۶ء کو ڈیوما یعنی پارلیمنٹ کا افتتاح ہوا۔ پہلے ڈیوما کی زندگی صرف دو ماہ دس دن کی ثابت ہوئی۔ ڈیوما نے یکجا ہوتے ہی اپنی تمام تجویزوں اور ارادوں کو جو پچھلے دو سال کے برابر کانگرس میں ظاہر کیے جا رہے تھے قانون کی شکل

میں ڈھالنا اور انہیں عملی جامہ پہنانا چاہا۔ تقریر و تحریر کی آزادی، عام حق انتخاب ارکان حکومت کی ذمہ داری، کسانوں میں اور رعایا میں ارضی کی زیادہ مساوی تقسیم اور ایسے ہی دوسرے مسئلے بعد دیگرے ڈیوما میں پیش ہوئے لیکن اراکین حکومت نے ان کے منظور کرنے یا ان پر عمل کرنے سے قطعی انکار کر دیا۔ ڈیوما نے جب یہ محسوس کیا کہ اس کا سکہ عمال حکومت پر نہیں بیٹھا اور ان کا دائرہ عمل صرف نکتہ چینی کرنے اور دھواں دھار تقریروں پر محدود رہتا ہے تو کیڈٹ اور لیبرل پارٹی کے ممبروں نے مختلف تجاویز اور مسودات قانون پیش کرتے اور ان پر تقریریں کرنے کا صرف یہ قاعدہ سوچا اور یہ غرض قرار دی کہ وہ اس طرز عمل اور اپنی تقریروں سے رعایا میں ہر دلعزیزی پیدا کریں ان میں جوش پھیلا دیں اور انہیں تیار کر کے اپنا طرفدار بنا لیں تاکہ آئندہ کی جدوجہد میں رائے عامہ کو وہ اثر اور تقویت حاصل ہو جائے کہ ارباب حکومت کو اس کے آگے بغیر سر جھکائے چارہ باقی نہ رہے۔ ڈیوما میں ان ممبروں ان منصوبوں اور ان کی تقریروں نے ملک پر اپنا جادو چلایا اور ان کا سکہ بیٹھنا شروع کیا۔ ارباب حکومت نے جب پیر تلے سے زمین نکلتی دیکھی اور ڈیوما کا دیطرہ بالکل اپنے خلاف پایا تو ان میں بجز اس کے کوئی چارہ کار نہ سوجھا کہ ڈیوما کو معزول کر دیں۔ ۲۱ جولائی کو ڈیوما کے معزول کیے جانے کا فرمان شاہی شائع ہوا۔ اور اسی روز سے جبر و تشدد کا پھر ایک نیا دور شروع ہوا۔ اخبارات بند کر دیے گیے۔ اکثر ممبران ڈیوما جلاوطن ہو گئے۔ ملک میں غم و غصہ کی آگ بھڑکنے لگی۔ ہڑتالوں کا مشغلہ پرانا اور بے سود معلوم پڑتا تھا۔ علانیہ بغاوت کے منصوبے ہونے لگے۔ دو چار جگہ کچھ آگ بھڑکی بھی لیکن اس کی ہمت نہ پڑی۔ ملک ابھی اس کے لیے تیار نہ تھا۔ آیندہ دس سال کے عرصہ ڈیوما کئی مرتبہ طلب اور معزول کیا گیا۔ رعایا اور حکومت میں برابر کشمکش جاری رہی لیکن زار روس کو ابھی دس سال اور حکومت کرنا تھی اور روس کے مصائب اور آلام کا پیمانہ ابھی لبریز نہیں ہوا تھا۔ ۱۹۱۷ء تک بھی کشمکش باقی رہی۔ بالآخر جب حوادث روزگار نے سلطنت روس کا تختہ پلٹا تو نہ زار رہا نہ تخت و تاج بلکہ بولشوک طوفان نے ڈیوما اور کیڈٹ کی قوت اور اقتدار کو بھی حرف غلط کی طرح مٹا دیا۔ پچھلے تین سال میں جو انقلاب برپا ہوا اور روس کی جیسی کچھ کایا پلٹ ہوئی اس کا تذکرہ آیندہ کے لیے باقی رکھا جاتا ہے۔

(۳)

دنیا حیرت میں ہے کہ روس کی سی جید اور زبردست سلطنت کہ جس کا دبدبہ حکومت عالم گیر اور جس کا سکہ یورپ اور ایشیا دونوں پر یکساں بیٹھا ہوا تھا کس طرح آناً فاناً تباہ و برباد ہوگئی۔ انقلاب حکومت تو دنیا نے پہلے بھی اکثر دیکھے ہیں لیکن ایسے حیرت انگیز انقلاب کی کہ جس نے چند گھنٹوں میں تخت و تاج کو اس طرح اُلٹ دیا ہو کہ جیسے روس میں دوسری مثال تاریخ بھی مشکل سے پیش کر سکتی ہے۔ اصلیت یہ ہے کہ پیٹرو گریڈ کے فوجیوں کا غدر اور انقلاب برپا کرنے والوں کا موقع کو غنیمت جان کر اس سے فائدہ اٹھانا تو محض ایک بہانہ تھا ورنہ اس عالیشان عمارت کی بنیادیں تو پہلے ہی سے بوسیدہ ہو چکی تھیں۔ اس کے آثار جنگ و جدل کے ہنگامہ کی زحمتیں برداشت کرتے کرتے خراب و خستہ ہو چکے تھے۔ رعایا اور فوج بد دل اور سرستان حکومت اپنی ناقابلیت سے مجبور اور خود غرضی و غفلت میں مخمور اس کی نازک حالت اور آنے والوں خطروں کی جانب سے لاپروا تھے۔ ایسی حالت میں اس عمارت کا عرصہ تک کھڑا رہنا ممکن نہ تھا لہذا تعجب نہیں کہ باد مخالف کے پہلے ہی جھونکے نے اسے ڈھا دیا۔ یہ امر یاد رکھنے کے قابل ہے کہ انقلاب حکومت برپا نہیں کیا گیا بلکہ فوجیوں کی سرکشی نے جب تخت و تاج الٹ دیا تو انقلاب پسندوں نے میدان خالی پا کر اس پر قبضہ کیا اور حکومت اور سوسائٹی کے شیرازے کو تتر بتر کر کے نئے نئے اصولوں کی اشاعت و آزمائش شروع کی۔

انقلاب روس کی طویل اور پُردرد داستان کے سمجھنے اور اس کی اہمیت کا اندازہ کرنے کے لیے ضروری ہے کہ چند باتیں دھیان میں رکھی جائیں۔ اوّل یہ کہ جب حوادث روزگار نے انقلاب سلطنت پیدا کیا اور زار روس کو تخت سے اتار پھینکا تو تخت و تاج کا کوئی ایسا وارث نہ تھا کہ سلطنت کی اہم ذمہ داری کے بوجھ کے اٹھانے کی اہلیت رکھتا ہو۔ مختلف مغربی ممالک کے ایسے انقلابات کی تاریخ اس امر کی شاہد ہے کہ حکومت کی تبدیلیاں بتدریج ہوتی ہیں۔ پہلے بادشاہوں اور امرا میں قبضہ حکومت کے لیے عرصہ تک جد و جہد ہوتی رہی۔ پھر امرا اور متوسط درجہ کے طبقوں میں کشمکش جاری رہا تا ب

زیادہ تر سرمایہ داروں اور عوام الناس میں جدوجہد جاری ہے۔ غرضکہ اقتدار حکومت رفتہ رفتہ ایک طبقہ سے دوسرے طبقہ میں منتقل ہوتا رہا اور اس طرح سے قوم کے مختلف طبقے اور حصے اقتدار حکومت کے عادی اور اس کے اہل بنتے گئے اور ان میں اقتدار حکومت کے چسکے کے ساتھ ہی ساتھ اسکی ذمہ داریوں کا احساس بھی پیدا ہوتا گیا۔ روس میں انقلاب تو آنا فانا ہوا ابھر یا تو یہ کیفیت تھی کہ زار روس کی فرعونی اور نادر شاہانہ حکومت تھی کہ جس میں معدودے چند حاشیہ نشینان دربار کے سوا اور کسی کا دخل نہ تھا یا یہ کیفیت پیدا ہوئی کہ عوام الناس کے ادنیٰ تر طبقہ نے اپنا سکہ بٹھانا شروع کیا۔ درمیانی منازل و مدارج سب یکسر اس طوفان بدتمیزی میں غائب ہوتے نظر آئے۔ اگر روس میں بجائے زار نکولس کے کوئی دوراندیش اور زمانہ شناس حکمراں بر سر اقتدار ہوتا اور اس نے ڈیوما کی واجبی قدر اور حوصلہ افزائی کرکے اس کو حکومت میں برابر کا حصہ دیا ہوتا اور سلطنت کی ذمہ داریوں کا بوجھ اس پر ڈالا ہوتا تو پچھلے دس سال میں اس کی نشو و نما خاطر خواہ ہوئی ہوتی اور انقلاب کے طوفان میں سلطنت کی کشتی اس طرح بے ناخدا نظر نہ آتی۔ موجودہ صورت میں یہ کیفیت ظاہر ہوئی کہ کیڈٹ پارٹی کے ممبر کہ جو پارلیمنٹری حکومت کے حامی تھے بجز حکومت کی عیب جوئی اور موقع دبے موقع مخالفت کرنے کے معاملات حکومت اور اس کی ذمہ داریوں کے احساس سے قطعی ناواقف ثابت ہوئے۔ جب وہ وقت کہ جو سلطنت کا شیرازہ سمیٹے ہوئے تھی منتشر ہوگئی اور حکومت کی ذمہ داریوں کا بوجھ دفعتاً سر پر آ پڑا تو ان کے ہوش و حواس بجا نہ رہے۔ ایک وجہ اس کی یہ بھی تھی کہ گو یہ حکومت میں حصہ چاہتے اور رعایا کے واجبی حقوق کے حامی تھے سلطنت پر بلا شرکت غیرے تصرف کلی کرنا اور اس کا پورا بوجھ ایک دم اٹھانا ان کے خواب و خیال میں بھی نہ آیا تھا اب رہی سوشلسٹ پارٹی یا انقلاب پسند تو اس کا تو باوا آدم شروع ہی سے نرالا تھا۔ یہ اپنے لیے ایک نئی زمین دنیا آسمان پیدا کرنے کے ہوائی منصوبے باندھتے اور حکومت کا تختہ الٹنے کے پھیر میں سائبیریا کے جنگلوں اور میدانوں کی عمر بھر ہوا کھانے پر مجبور ہوتے تھے ان کو حکومت کی پیچیدگیوں کا تجربہ اور ذمہ داریوں کا کیا احساس ہو سکتا تھا۔

اوّل تو یہی انقلاب کہ زار کی سی مطلق العنان اور خود سر حکومت کے بجائے ایک دم دھائے میں جمہوریت کا سکہ جما دیا جائے معمولی سی بات نہ ہوتی۔ پھر یہاں تو وہ مثل صادق آئی کہ کریلا اور

نیم چڑھا۔ روسی انقلاب کا منشا اور مقصد یہ تھا کہ ملک میں دستوری حکومت قائم ہو اور قوم من الحیث قوم حکمراں اور خود مختار ہو بلکہ اس کا منشا یہ تھا کہ قوم کے عوام الناس یعنی کسان، مزدور اور سپاہی بلا شرکت غیرے نہ صرف حکومت پر حاوی ہوں بلکہ اس پر قبضہ بھی حاصل کریں نہ صرف یہی بلکہ ملک کی تمام زمین و جائداد اور قوم کا تمام زر و ملکیت بلا شرکت غیرے ان میں تقسیم ہو جائے قصہ مختصر روسی انقلاب کا منشا و مقاصد صرف حکومت ہی کی نوعیت کا تبدیل کرنا نہ تھا بلکہ سوسائٹی کی بھی از سر نو شیرازہ بندی منظور تھی۔ یہی وجہ ہوئی کہ اس کی داستان اس قدر پُر درد، اس کی روش اس قدر خونریز اور اس کا سلسلہ اس قدر خطرناک ثابت ہو رہا ہے۔

فوج کے غدر شروع کرنے کے دوسرے دن ۱۲ مارچ ۱۹۱۷ء کو ڈیوما کی کمیٹی نے کہ جو بالعموم کیڈٹ پارٹی کے ممبروں پر مشتمل تھی عارضی طور پر عنان حکومت اپنے ہاتھ میں لینے کا تہیہ اور انتظام کرنا شروع کیا۔ اسی روز شام کو سوشلیسٹ پارٹی کے بعض ممبروں نے بھی کاریگروں اور سپاہیوں کی کونسل کے نام سے ایک جماعت کہ جو آئندہ سوویٹ کے لقب سے مشہور ہوئی قائم کی۔ سوشلیسٹ پارٹی کے لوگ اس موقع کو کہ جب ان کے راستہ میں ظاہرا کوئی روک ٹوک یا خاص دشواریاں نظر نہ آتی تھیں اور تمام سیاسی میدان ان کے سامنے کھلا پڑا تھا، ہاتھ سے نکال دینے کے لیے تیار نہ تھے وہ جانتے تھے کہ عوام الناس ان کے اصولوں اور طریقوں کی داد دیں گے خود غرضی اور نفرت کے جذبات اپنا جادو بآسانی چلا سکیں گے۔ کسانوں، کاریگروں اور سپاہیوں کی کروڑوں کی تعداد متوسط اور اعلیٰ طبقوں کے چند ہزار یا چند لاکھ لوگوں پر بہت جلد غالب آجائیگی اور اس وقت ان کو اپنے نئے اصولوں اور طریقوں کے عمل میں لانے اور حکومت کا سکہ جمانے میں کامیابی ہوگی۔ لیکن اسی کے ساتھ وہ یہ بھی محسوس کرتے تھے کہ ابھی اس امر کی ضرورت ہے کہ ان کے خیالات اور اصول عوام الناس میں پورے طور سے اشاعت پا جائیں۔ عوام الناس کے جذبات پورے طور سے برانگیختہ ہو جائیں۔ ان کے نامی لیڈر جو اطراف ملک اور نیز غیر ممالک میں منتشر پڑے تھے یکجا ہو کر اپنی جماعت کا نظام ترتیب دے سکیں اور شیرازہ باندھ سکیں قبل اس کے کہ وہ حکومت پر تصرف حاصل کریں۔ پھر یہ بھی خوف لگا ہوا تھا کہ مبادا زار اور شاہی خاندان کے حامی اور طرفدار پھر سر اٹھائیں لہذا کسی قدر کشمکش کے بعد یہ تصفیہ ہوا کہ

ڈیوما کی کمیٹی بار حکومت کی ذمہ دار قرار دی جائے تاکہ وہ نئے دور انقلاب کے دشمنوں اور زار کے ہواخواہوں کی مداخلت کرے لیکن اس شرط کے ساتھ کہ ڈیوما کی کمیٹی میں سوشلسٹ گروہ سے کے نائب اور نمائندے بھی شریک کیے جائیں۔ قصہ مختصر سوشلسٹ گروہ نے نہایت ہوشیاری سے کام لے کر حکومت کی ذمہ داریاں اور دشواریاں تو ڈیوما کی کمیٹی پر چھوڑ دیں اور جمہور قوم کے دلوں پر سکہ جمانے اور ان پر جادو چلانے کا کام اپنے ذمہ لیا اس کے ساتھ اس بات کی بھی کافی احتیاط کی کہ ڈیوما کی کمیٹی یعنی حکومت پر اپنا رعب داثر کافی جما رہے۔ ڈیوما کی کمیٹی یعنی عارضی حکومت میں زیادہ تر افراد تو کیڈٹ پارٹی کے ممبر اور بعض دوسرے گروہوں کے تھے لیکن ایک دو ممبر سوشلسٹ پارٹی کے بھی شامل تھے۔ پرنس لیووف اراکین حکومت کے صدر اعظم قرار پائے لیکن روح رواں اس کمیٹی کے ملیوکو اور کرنسکی تھے۔ اول الذکر کیڈٹ پارٹی کا ممبر تھا اور آخر الذکر سوشلسٹ پارٹی کا۔ ملیوکو سیاست و تمدن کا ماہر، تاریخ و فلسفہ کا عالم باخبر اور تجربہ کار لیکن احتیاط پسند اور کسی قدر سست رفتار تھا۔ بخلاف اس کے کرنسکی تیز فہم، جلد رفتار زمانہ ساز اور نہایت چالاک تھا۔ اوّل الذکر استقلال اور احتیاط کی روش پر چلنا چاہتا تھا۔ آخر الذکر انقلاب کی ہوا میں اُڑتا اور قدم بڑھائے ہوئے چلے جانے پر اصرار کرتا۔ یہ اجتماع ضدین محض شخصی ہی نہ تھا بلکہ دو مختلف قوتیں تھیں کہ جو برابر تگ و دو اور غلبہ حاصل کرنے کے لیے کوشاں تھیں۔

نئی حکومت نے اپنے ایمان اور عقیدے کے مطابق آزادی کا دور شروع کیا۔ پھانسی کی سزا موقوف کی۔ پولینڈ کو آزاد کیا۔ فنلینڈ میں دستوری حکومت جاری کی۔ مختلف اقوام کو اپنی قومی زبان کے استعمال کی آزادی دی۔ ہر بالغ فرد قوم کو ووٹ کا حق عطا کیا۔ تقریر و تحریر میں کامل آزادی دی۔ غرض کہ اپنے پروگرام کے مطابق تمام وہ اصلاحیں عمل میں لائیں کہ جن کا اُن کو دعویٰ تھا۔ اس میں تو حکومت قطعی کامیاب رہی لیکن جس امر میں نئی حکومت کو ناکامی ہوئی بلکہ یہ کہنا زیادہ درست ہوگا کہ جس میں وہ مجبور و لاچار رہی۔ وہ یہ امر تھا کہ حکومت کا رعب و داب بخوبی طور سے قائم نہ رکھ سکی۔ سوشلسٹ فریق کے ممبر اور اراکین یعنی سوویٹ عوام الناس میں سفید پوش اور شرفا کے خلاف نفرت و انتقام کے جذبات پھیلاتے۔ کسان و مزدوروں کو

حکومت کے خلاف در غلاتے اور یا دصف اس کے کہ غنیم قدم بڑھائے ملک پر چڑھا آرہا تھا اور تباہی ہر طرف سے نظر آرہی تھی۔ یہ فوج کو لڑنے سے منع کرتے اور سپاہ میں شورش برپا کر رہے تھے اور حکومت وقت مجبوراً ان کا کچھ نہ کر سکتی تھی۔ کیونکہ یہ سمجھوتہ تو پہلے ہی ہو گیا تھا کہ ایجیٹیشن نہ روکا جائے گا۔ حکومت آزادی کی قسم کھائے ہوئے تھی۔ پھر اہل قوم کی آزادی میں دست اندازی کرتی تو کس منہ سے۔ غرضکہ حکومت کا رعب داب روز بروز کم اور سوویٹ کا اثر و اقتدار روز بروز بڑھتا گیا۔ سوویٹ جس طرح اپنا اثر و رسوخ عوام الناس میں بڑھاتے تھے اس کی بعض تمثیلیں قابل تذکرہ ہیں۔ سوویٹ نے ایک حکم اس عنوان سے جاری کیا تھا کہ زمانۂ انقلاب میں اب سپاہی اور افسر کی کوئی تفریق قائم نہیں رہنی چاہیئے چونکہ سب برابر کے روسی باشندے ہونے کا حق رکھتے ہیں کوئی وجہ نہیں کہ افسروں کا وقار سپاہیوں کے بہ نسبت زیادہ ہو۔ لہٰذا آئندہ سے سپاہیوں کے لیے افسروں کو سلام کرنا ضروری نہیں۔ جن بعض افسران اعلیٰ نے سپاہیوں کی بے ادبی اور حکم عدولی کی ان کو سزا دی ان کے خلاف یہ خیال پھیلایا گیا کہ یہ دور انقلاب کے دشمن ہیں اور زار اور اُس کے حامیوں کے ساتھی۔ لہٰذا ان کو قوم کا دشمن سمجھنا چاہیئے۔ جنگ کے خاتمہ کرنے اور لڑائی سے انکار کرنے کی یہ وجہ بتلائی گئی کہ لڑائی دراصل مختلف اقوام کے سرمایہ داروں اور دولتمند طبقوں کے درمیان ہے ورنہ مختلف اقوام اور مختلف ممالک کے عوام الناس میں دشمنی اور جنگ کی کوئی وجہ نہیں۔ لہٰذا رعایا کو جنگ میں مدد دینی یا فتح حاصل کرنے کی کوشش کرنی محض بیکار ہے۔ بعض اوقات جب حکومت کی جانب سے سوویٹ سے اس علانیہ عہد شکنی اور زیادتی کے بارے میں جواب طلب کیا گیا تو سوویٹ کے ذمہ دار اراکین نے ان تمام باتوں کی ذمہ داری سے انکار کیا اور اس کی ذمہ داری خود عوام الناس کے سر ڈال دی۔ بہر صورت اور بہر حال ان باتوں کا اثر ہوتا رہا اور حکومت کی بیخ کنی ہوتی گئی۔

یہ تو بتایا جا چکا ہے کہ جس وقت انقلاب برپا ہوا روس میں دو مختلف پارٹیاں تھیں۔ یعنی ڈیوما یا کیڈٹ پارٹی اور سوشلیسٹ یا انقلاب پسند کہ جن کے اصول و معیار، اغراض و مقاصد ایک دوسرے سے قطعی جداگانہ تھے۔ اب یہاں پر یہ بھی ذہن نشین کر دینے کی ضرورت ہے کہ خود سوشلیسٹ فریق میں بھی دو گروہ تھے کہ جن کے اصول و مقاصد گو یکساں تھے تاہم ان میں طبائع کا فرق تھا۔

ایک نسبتاً اعتدال پسند اور کم تیز رفتار تھا۔ اور دوسرا انتہا پسند اور زیادہ تیز رفتار۔ اول الذکر مینشوک کہلاتا تھا۔ دنیا جس طرح بولشوک کے نام سے واقف و مانوس ہے مینشوک سے نہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ روس کے دور انقلاب میں بولشوک برابر گھنگھور گھٹا کی طرح چھائے رہے بخلاف اس کے مینشوک محض ایک بادل کا ٹکڑا تھے کہ آیا اور نکل گیا۔ ۱۱ مارچ اور ۸ نومبر ۱۹۱۷ء کے درمیان یعنی جس روز سے کہ دور انقلاب برپا ہوا اور جس روز تک کہ بولشوک اقتدار و تسلط پوری طرح جما۔ ان ۸ ماہ میں بھی کئی نازک موقع گذرے اور حکومت میں چھوٹے موٹے انقلاب ہوتے رہے۔ ۱۱ مارچ سے شروع مئی تک ڈیوما کیڈٹ پارٹی کا دور دورہ رہا اور پرنس لیووف اور ملیوکوف برسر اقتدار حکومت رہے۔ شروع مئی میں سوئیٹ کی ہنگامہ آرائی اور کیڈٹ پارٹی کے جنگ کے بارے میں ناقابل قبول پالیسی کی وجہ سے حکومت میں چند تبدیلیاں ہوئیں کہ جن کے رو سے سوشلسٹ پارٹی کا عنصر اور اقتدار غالب اور کیڈٹ پارٹی کی قوت اور رسوخ کم ہوگیا۔ ملیوکوف کی جگہ کرنسکی وزیر جنگ قرار پایا اور وہی اب حکومت کی روح رواں تھا۔ گو پرنس لیووف ابھی تک صدر اعظم تھے اور عارضی حکومت ڈیوما پارٹی ہی کے نام سے نامزد کی جاتی تھی۔ ۱۵ جولائی کو ایک اور انقلاب ہوا۔ پچھلے ۲ ماہ میں سوئیٹ نے اپنی جد و جہد اور کوششوں سے ملک میں ایک طوفان برپا کر رکھا تھا۔ اس کی قوت اور اس کا اثر اس وقت عالمگیر ہو رہا تھا۔ ڈیوما پارٹی اور عارضی حکومت اپنا رہا سہا اقتدار و رسوخ بھی کھو چکی تھی۔ ایک طرف سے جرمنی حملے ملک کو بدحواس کر رہے تھے دوسری جانب سے بولشوک نے علانیہ بغاوت شروع کر دی تھی۔ پرنس لیووف نے صدر اعظم کی کرسی خالی کی۔ کیڈٹ پارٹی کا وجود بھی حکومت سے غائب ہوگیا۔ کرنسکی صدر اعظم مقرر ہوا اور اب گویا سوشلسٹ پارٹی کی اعتدال پسند اور انتہا پسند جماعتوں میں اقتدار حکومت کے لیے مخالفت و جد و جہد شروع ہوئی۔ کرنسکی نے اپنے دور حکومت کے شروع شروع میں کچھ قوت اور رسوخ جمایا۔ بولشوک جماعت کو دبانے اور مغلوب کرنے کی کوشش کی۔ سپاہ کو بھی سنبھالا اور باہر کے حملوں کی بھی مدافعت کرنا چاہی۔ جنرل الکسی، کورنیلو، کیلیڈین اور کرنسکی کی متحدہ اور مشترکہ قوت اور کوشش نے اچھے نتائج پیدا کرنے

شروع کیے تھے لیکن کرنسکی اور کورنیلو کی باہمی بدگمانیوں نے معاملات کو پھر ابتر کر دیا۔ کورنیلو کی بغاوت اور اس کی خطرناک چالوں نے کرنسکی کو بولشویک فریق کی طرف جھکنے پر آمادہ کیا۔ اس کی کمزوری نے بولشویک فریق کی ہمتیں اور بھی بڑھا دیں۔ انہوں نے موقع کو غنیمت جانا اور ۷ نومبر کو سوویٹ کانگریس اور عارضی حکومت کے قیام گاہ دونوں پر ایک ہی دھاوے میں تسلط کر لیا۔ اس تاریخ سے لینن اور ٹروٹسکی کا عہد شروع ہوا اور انقلابی دور روس کی پُردرد داستان میں بولشوزم کے خونی کارناموں کے ابواب۔ اور اضافہ ہوئے۔

نومبر ۱۹۱۷ء کے بعد سے روس میں بولشوزم کا سکہ اور لینن اور ٹروٹسکی کی حکومت جم گئی اور گو اس وقت تمام ملک میں ابتری پریشانی اور طوائف الملوکی پھیلی ہوئی تھی بولشوزم کی قوت اپنے حریفوں کے مقابلہ میں کہیں زیادہ تھی۔ ظاہر ہے کہ جن قوتوں کو بولشوزم نے منتشر کیا تھا وہ اس کا مقابلہ کرنے اور بدلہ لینے کی فکر میں مبتلا ہوں لہذا کیڈٹ پارٹی اور مینشویک جماعت نے سائبریا میں پناہ گزیں ہو کر اپنا شیرازہ باندھنے کی فکر کی۔ ایک جماعت انہیں کے شمال میں روس میں بولشوزم کے مقابلہ کے لیے تیار ہونے لگے۔ ان مختلف سپہ سالاروں اور فوجی افسروں نے کہ جن کو بولشویک ریڈ گارڈ نے شکست دے کر پسپا کر دیا تھا جنوبی روس میں یک جا ہو کر اپنی فوج کو سمیٹنا اور ترتیب دینا شروع کیا۔ ادھر یوکرانی استھونی اور دوسری چھوٹی چھوٹی قوموں نے کہ جن کو نہ بولشویک پارٹی سے ہمدردی تھی نہ اینٹی بولشویک سے بلکہ جو اپنی آزادی اور خود مختاری کی خواہاں تھیں اپنی اپنی ڈیرسمامینٹ کی مجلس علیحدہ قائم کرنی شروع کی۔ اس سب کا نتیجہ یہ نکلا کہ مختلف پارٹیاں اور سیاسی جماعتیں تو اس بدامنی اور ہنگامہ آرائی میں تباہ ہو گئیں اور چند نمایاں شخصیتیں کہ جو منتشر فوجی قوت کو یکجا کر سکیں بولشوزم کے مقابلہ کے لیے تیار ہو گئیں۔ سائبریا یعنی مشرق سے ایڈمیرل کولچک، جنوب سے جنرل ڈنکن اور ان کی والنٹیئر فوج۔ نے بولشوزم پر حملے شروع کر دیے۔ اسی طرح ارچنجل یعنی شمال کی جانب سے بھی ایک فوج بولشوزم کے خلاف اٹھی۔ دول اتحاد اور بالخصوص برطانیہ نے بولشوزم کے طوفان سے گھبرا کر اور اس کے خطروں سے سہم کر جنرل ڈینکن اور ایڈمیرل

کولچک کی مخالفت کو غنیمت جانا اور اپنی فوج سامان حرب و بار برداری اور کثیر سرمایہ سے ان کی مدد کی ۔ روس کی بندرگاہوں کی اتحادی بیڑے نے ناکہ بندی کی پچھلے تقریباً ۲ برس میں جنرل ڈینکن اور ایڈمیرل کولچک کی فوجوں اور بولشوک حکومت میں برابر زور آزمائی ہوتی رہی کبھی ایک حریف کا کبھی دوسرے فریق کا سکہ جمتا نظر آیا ۔ ایک زمانہ میں تو جنرل ڈینکن اور ایڈمیرل کولچک نے بولشوک فوجوں کو اس طرح پسپا اور پریشان کیا تھا کہ دنیا پیٹروگریڈ کی تسخیر کی خبر سننے کی ہر لمحہ منتظر تھی ۔ اسی زمانہ میں ہم کو یہ بھی بتایا گیا تھا کہ بولشوزم کی قوت قطعی تباہ ہو چکی ہے ۔ لنن اور ٹراٹزکی کے ہاتھوں رعایا کا ناک میں دم ہے اور روس کا ہر فرد بشر ان شیطانوں سے پناہ مانگتا ہے ۔ لیکن آج نتیجہ اس کے بالکل برخلاف ظاہر ہوا ہے ۔ ایڈمیرل کولچک کو شکست فاش ہوئی ۔ وہ غنیموں کے ہاتھوں پڑ کر گرفتار ہوئے اور سر دار چڑھائے گئے ۔ جنرل ڈینکن کی فوج تباہ ہو چکی ہے اور وہ روس کے کسی گوشہ میں پناہ گزین ہیں ۔ یوکرانی اور لیتھونی وغیرہ قومیں بولشوزم سے کسی نہ کسی قسم کا سمجھوتہ کرنے پر آمادہ ہیں ۔ بولشوزم کا سکہ نہ صرف روس میں اب پوری طرح جم چکا ہے بلکہ سائبریا اور وسط ایشیا میں بھی اس کا پھریرا لہرا رہا ہے ۔ اور ایران و افغانستان تک اس کا جال پھیل رہا ہے ۔ جس وقت صلح کی کانفرنس میں پریسیڈنٹ ولسن نے سوویٹ گورنمنٹ سے صلح کر لینے کی تجویز پیش کی تھی تو دول اتحاد نے اس کو نہایت حقیر اور ناپسندیدگی کی نظروں سے دیکھا تھا اور خود برطانیہ میں بجز لیبر پارٹی کے کہ جو شروع ہی سے روس کے اندرونی معاملات میں دخل دینے اور اس کی خانہ جنگیوں میں شریک ہونے کے خلاف تھی تمام قوم نے روس سے صلح کرنے اور لنن اور ٹراٹزکی کی حکومت سے کسی قسم کا رشتہ قائم کرنے کی قسم کھائی تھی اور مسٹر لائڈ جارج کی پولیسی پر آواز تحسین بلند کی تھی ۔ مگر آج کولچک اور ڈینکن کا حشر ہونے کے بعد کہ جب دول اتحاد جان و مال کا کافی نقصان اٹھا چکے ہیں یہ صورت ظاہر ہو رہی تھی کہ دول اتحاد روس کی بولشوک حکومت سے تجارتی تعلقات قائم کرنے پر مجبور ہوئے ہیں اور اب صلح کی گفت و شنید بھی ہو رہی ہے ۔ مسٹر لائڈ جارج کی حکومت نے کچھ غلطیاں اس معاملہ میں کیں ان کا خمیازہ ان کو آج بھگتنا پڑ رہا ہے اور ان کی حکومت سخت بدنام ہو رہی ہے ۔ غالباً یہ خبر بہت جلد آنے والی ہے کہ سوویٹ روس

سے دول اتحاد نے صلح کرلی۔ ممکن ہے کہ اس صورت سے اس تصفیہ کا عارضی فیصلہ تو کچھ نہ کچھ ہو جائے۔
رہا بولشوزم کا آئندہ مستقبل اور اس کے وہ خطرے کہ جن کے ذکر سے دنیا پریشان اور بدحواس ہو رہی ہے بجائے خود ایک دقیق مسئلہ ہے اور تفصیلی بحث کا محتاج ہے۔

پچھلے دو برس میں کارفرمایان سیاست فرنگ اور ان کے اخبارات نے اور ریٹران کی نقل کرتے ہوئے ہمارے حکام و بعض ماہرین سیاست نے ہم کو بولشوزم کے خطروں سے آگاہ کرنے اور اس کی برائیاں ہم پر ظاہر کرنے میں کوئی دقیقہ نہیں اٹھا رکھا ہے۔ ہم کو بتایا گیا ہے کہ کوئی ظلم، سفاکی، عیاری، بداخلاقی، گناہ اور برائی دنیا کے پردہ پر ایسی نہ ہو گی کہ بولشوزم کی تحریک اور اُس کے بانی جس کے مرتکب نہ ہوئے ہوں۔ اگر لنن اور ٹروٹزکی کی ان تصاویر پر کہ جو ہمارے سامنے نہایت موقر اور معتدر فرنگی رسالے اور اخبارات آئے دن کھینچ کر پیش کیا کرتے ہیں نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ان کارپردازان حکومت روس کے سامنے ابلیس واقعی نیک فرشتہ ہے کہ جس کو ہمارے پیران طریقت اور پیشوایان مذہب نے ناحق اور مفت صدیوں سے بدنام کر رکھا ہے ورنہ شیطان نے تو پہلی مرتبہ لنن اور ٹروٹزکی کے قالب میں اب جنم لیا ہے۔ روس کی جو کیفیت بیان کی جاتی ہے اس سے یہ گمان پیدا ہونا لازمی ہے کہ کسی مصلحت سے قادر مطلق نے جہنم کی تمام نجس و ناپاک روحیں اس بدنصیب ملک میں منتقل کر دی ہیں کہ جو نہ خود چین سے بیٹھتی اور نہ دنیا والوں کو چین لینے دیتی ہیں۔ ہم بولشوزم کے حامی یا طرفدار نہیں۔ ہم اُس کے خطروں سے بھی بخوبی واقف ہیں لیکن ہمارا خیال یہ ضرور ہے کہ بولشوزم کے متعلق جو بیانات روزمرہ شایع ہوتے رہتے ہیں وہ مبالغہ آمیز ضرور ہیں اور تصویر کے تاریک رخ پر زیادہ روشنی ڈالی جاتی ہے۔ قطع نظر اس کے کہ بولشوزم کیا ہے اور اس کے بابت جو کچھ کہا جاتا ہے وہ کہاں تک صحیح اور کہاں تک مبالغہ آمیز ہے، سوال یہ ہے کہ اگر بولشوزم واقعی ایسی ہی بری چیز اور خطرناک تحریک ہے تو آخر اس میں کیا جادو ہے کہ یہ دنیا کی تسخیر کا دعویٰ کرتی ہے اور عوام الناس اس کا شکار ہوتے چلے جاتے ہیں۔ کچھ عرصہ گذرا تب ہم کو یہ امید دلائی جاتی تھی کہ بولشوزم کا طوفان اب فرو ہوا چاہتا ہے یہ آخری سانس لے رہا ہے اور غالباً اب اس کا جلد ہی خاتمہ ہو جائے گا لیکن یہ پیشین گوئیاں بھی غلط ثابت ہوئیں اور اس کے خطرات اب زیادہ عالمگیر اور قریب تر بتلائے جاتے ہیں۔ سوال

یہ ہے کہ آخر کیا وجہ ہے کہ یہ طوفان اُمنڈتا چلا آتا ہے اور کوئی تدبیر اس کے روکنے کی کارگر ثابت نہیں ہوتی۔ ہم اپنی سمجھ کے مطابق چند لفظوں میں اس کا جواب دینے کی کوشش کریں گے۔

دوران جنگ میں دنیا کے یہ ذہن نشین کرانے میں کوئی دقیقہ نہیں اُٹھا رکھا گیا کہ لکھوکھا بندگان خدا کا خون اس لئے بہایا جا رہا ہے کہ سچائی اور آزادی کی فتح ہو۔ ہم سے بار بار یہ کہا گیا کہ یہ لڑائی مظلوم قوموں کی آزادی اور پسماندہ اور ادنیٰ درجہ کی ریاستوں اور ملکوں کے تحفظ کے خاطر لڑی جا رہی ہے۔ یہ بھی یقین دلایا گیا کہ یہ لڑائی آئندہ سے کشت و خون اور جنگ و جدل کا خاتمہ کر دے گی۔ دنیا میں امن و امان اور ترقی و خوشحالی کا دور ہوگا۔ ملک گیری کی ہوس سے اب توبہ کی جائے گی۔ تجارت کے بہانے سے پسماندہ قوموں کے مال و دولت کے لوٹنے اور غارت کرنے سے پرہیز کیا جائے گا۔ جنگ کی تکالیف اور سختیوں کے بعد ارزانی اور آسائش کی صورت پیدا ہو گی۔ دنیا کی مختلف قومیں برادرانہ برتاؤ سے زندگی بسر کر سکیں گی اور تمام قضیوں کا تصفیہ انصاف اور خودداری کے اصولوں پر ہوا کریگا۔ غرض کہ آئندہ دور میں عوام الناس عالم کے لیے ایک نئی زمین دنیا آسمان پیدا ہو جائے گا اور اس نار جہنم کے فرو ہونے پر کہ جو بھڑک رہی تھی دنیا فردوس کا نمونہ بن جائے گی۔ یہ امیدیں تھیں کہ جو اہل عالم کو دلائی گئیں۔ یہ اصول تھے کہ جن کی اشاعت بلا تکان و بلا تکلف ہر ملک و شہر بلکہ ہر قصبہ و قریہ میں کی گئی۔ پس التوائے جنگ کے مہینوں بعد انتظار کرتے کرتے جب عوام الناس عالم نے یہ محسوس کیا کہ ع

خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سنا افسانہ تھا

جب صلح ہونے کے بعد بھی یہی صورت نظر آئی کہ جنگ جاری ہے۔ مظلوم ہستیاں اپنی بیڑیاں کاٹنے کے لیے اب بھی پہلے ہی کی طرح بیقرار ہوتی اور اپنے تئیں مجبور پاتی ہیں۔ پریسیڈنٹ ولسن کے چودہ زریں اصول طاق نسیاں پر رکھ دیے گئے اور لیگ آف نیشنس کے اصول فراموش کر دیے گئے۔ دول یورپ کی پولیسی اب بھی ویسی ہی پُر فریب اور سم آلود ہے کہ جیسی پہلے تھی۔ دنیا افلاس و گرانی سے اب بھی ویسی تنگ ہے کہ جیسی زمانہ جنگ میں۔ تو کیا تعجب ہے کہ پریسیڈنٹ ولسن اور لیگ آف نیشنس سے مایوس ہو کر

دنیا اپنی سادہ لوحی سے یہ سمجھتی ہے کہ ممکن ہے کہ بولشوزم میں ہی اس کی نجات ہو۔ بولشوزم کے دور میں دنیا کا خواہ کچھ ہی حشر کیوں نہ ہو یہ کون کہہ سکتا ہے کہ عوام الناس کے ادنیٰ طبقوں کو وہ اپنے اصول و عمل سے ڈھارس نہیں دیتی۔ جس وقت یہ سننے میں آتا ہے کہ بولشویک ایجنٹ دنیا کی تسخیر کے لیے چھوٹے ہوئے ہیں اور مختلف ممالک کی حکومتیں ان کی روک تھام میں مصروف ہیں تو واقعی اس کوتاہ اندیشی پر ہنسی آتی اور افسوس ہوتا ہے۔ ضرورت ہے کہ کارپردازان حکومت ایسے تدابیر اختیار کریں کہ رعایا کو بالخصوص عوام الناس کو پیٹ بھر کھانا اور تن ڈھکنے کو کپڑا میسر ہو اور حکومت کے طرز عمل سے اُن پر یہ واضح ہو جائے کہ ان کے ساتھ انصاف برتا جاتا اور ان کی حق تلفی نہیں ہوتی ہے۔ پھر دیکھنا ہے کہ کون سے بولشویک ایجنٹ ان کو ورغلا سکتے ہیں۔ لیکن افسوس کہ اس جانب سے لاپروائی برتی جاتی اور وہ تدابیر اختیار کی جاتی ہیں کہ جن کا الٹا اثر پڑتا ہے۔

کم از کم اس ملک کے بارے میں تو تجربہ سے کہا جا سکتا ہے کہ اس وقت گرانی کی شدت سے جو تکالیف عوام الناس کو برداشت کرنی پڑ رہی ہیں وہ دوران جنگ میں نہ برداشت کرنی پڑی تھیں۔ جو مظالم کہ اختتام جنگ کے بعد ہمارے ہموطنوں پر پنجاب میں ڈھائے گئے ان کا سامنا دوران جنگ میں نہ ہوا تھا۔ ہمیں معلوم ہے کہ ریفارم ایکٹ کی منظوری اور شاہی اعلان کی بدولت ہندوستان میں نئے دور کا آغاز ہو رہا ہے۔ لیکن اس کی برکتوں کو تو صرف تعلیم یافتہ طبقہ ہی سمجھ سکتا ہے۔ وہ عوام الناس جو اس وقت بھوکے مرتے اور بھیک بھی نہیں مانگ سکتے ہیں اُن کے لئے ریفارم ایکٹ کیا مانیت بخشائے گا؟ اُن کا نقطۂ نظر تو لازمی طور سے محدود ہے۔ وہ تو صرف یہ دیکھتے ہیں کہ سول اور فوجی عہدے داروں کی تنخواہیں آئے دن بڑھائی جا رہی ہیں اور عملے والوں کے متعلق تجاویز عرصہ دراز سے زیر بحث ہیں۔ رعایا افلاس اور گرانی سے تنگ آ رہی ہے اور سرکاری اخبارات اور محکمۂ پبلسٹی بورڈ اس امر کے یقین دلانے میں مصروف ہیں کہ ہندوستان میں بجائے افلاس کے خوشحالی ہے اور رعیت کا حال پہلے کے بہ نسبت اچھا ہے۔ کیا جائے تعجب ہے کہ بولشوزم کا راگ سہانا معلوم ہوتا اور حکومت کی تدابیر رائیگاں جاتی ہیں۔ ●●

(اپریل، دسمبر ۱۹۱۹ و مارچ ۱۹۲۰ء)

لاجپت رائے

نئی دنیا

کیا میرے ہموطن پوری طرح سے محسوس کرتے ہیں کہ دنیا میں اس وقت کیا ہو رہا ہے اور آئندہ کیا ہونے والا ہے۔ مجھے اندیشہ ہے کہ پیٹ کی فکر، قانون کا خوف، حکمران قوم کا سایہ، قحط و وبا کی مصیبت، آپس کے فساد، ذات پات کے تنازعا، تعلیم کی کمی، حکام وقت کی پولیٹکل چالیں میرے ہموطنوں کو دنیا کی دماغی و سیاسی حالت سے پورے طور پر واقف ہونے سے باز رکھتی ہیں۔ علاوہ ازیں صدیوں کی تنگ خیالی و ہمچو ما دیگرے نیست کا زعم اور مذہبی دلبستگی نے ہم کو ایک تنگ حلقہ کے اندر ایسا جکڑ دیا ہے کہ ہمارے لئے اس سے باہر نکلنا ازمحال ہے۔ جب کبھی ہم اس تنگ حلقہ سے باہر جانے کی کوشش کرتے ہیں، "قسمت" اور ہماری عادات جو بمثل فطرت کے ہو گئی ہیں ہم کو گھیر گھار کر پھر لکیر کے اندر واپس پہنچا دیتی ہیں۔ ہمارا دماغ اسی قسم کی تنگ کیاری کے اندر محدود ہے کہ جیسے ہم (خاص کر صوبجات متحدہ میں) اپنے چوکے کی چار دیواری کھانا کھانے کے لئے بناتے ہیں۔ جوں ہی کسی نے ہم کو چھوایا کسی کا کپڑا ہمارے کپڑے سے لگ گیا اسی وقت ہمارا کپڑا خراب ہو گیا۔ جیسے ہمارا مشر (باورچی) تھالی ہم کو دو گز اوپر سے پھینکتا ہے اسی طرح ہمارے مذہبی و دماغی رہنما ہم کو چار گز پرے سے راستہ بتاتے ہیں۔ انہوں نے ہمارے دل و دماغ کو اس قدر پیچیدگی اور بیہودگی، زعم، تعصب، توہم اور تکبر سے بھر دیا ہے کہ ہم اپنی زنجیروں کو باعث زینت اور اپنی بیڑیوں کو باعث عزت سمجھتے ہیں۔ جس قدر کہ ہمارے دماغ کی دنیا از حد تنگ تاریک ہے اسی طرح ہمارے دل کی دنیا بھی از حد تنگ و محدود ہے۔

دنیا کیا ہے۔ کیا کر رہی ہے، کس طرف جا رہی ہے، اس میں کیا کیا تبدیلیاں خیالات و حالات کی ہو رہی ہیں اس سے ہم کو نہ آگاہی ہے اور نہ ہم اپنے آپ کو آگاہ کرنا چاہتے ہیں۔ ہمارے رہبر و پیشوا خصوصاً وہ جن کے ہاتھ میں قلم کی تلوار ہے ابھی تک دنیا کو اپنے زنگ آلود ہتھیار سے سر کرنے کی فکر میں ہیں۔ ایک گروہ میں تو وہ بزرگ اور عزیز ہیں جو کسی نئے خیال کی شکل سے بھی ایسا گھبراتے ہیں کہ فوراً مصور کو مادہ پرست کہہ کر اس کی شکل و صورت سے اپنے معتقدین کو متنفر کر دیتے ہیں، کوئی بھی نیا خیال

کیوں نہ ہو محض اس کا نیا پن اُن کے لئے ہوّے، کا کام دیتا ہے نہیں نہیں! خیال چاہے نیا بھی نہ ہو، لیکن اگر وہ نئی شکل و نئے پیرایہ میں ظاہر کیا جائے تو بھی وہ اس سے کوسوں بھاگتے ہیں اور اپنے خویش و اقارب، اپنے دوستوں، خصوصاً اپنے معتقدین اور مداحوں کو اس سے دُور رکھنے کے لئے سخت کوشش کرتے ہیں۔ قدرتاً ان کو یہ فکر ہوتی ہے کہ ہمارے اس نئے خیال کا اثر ان کے اقتدار کو کم کرنیوالا نہ ہو۔ انسان کے سر پر دو جن ہر وقت سوار رہتے ہیں۔ خود بینی اور لالچ بہت سے ایسے بزرگ ہیں جنہوں نے مالی لالچ کے جن کو تو اپنے سر پر سے اُتار دیا ہے مگر خود بینی، عزت، نام آوری کا جن ابھی اپنا رسوخ جمائے بیٹھا ہے، جو اُن کو نئے خیالات پر بلا تعصب اور ایمانداری سے غور کرنے سے روکتا ہے۔ عموماً نئی چیز بھاتی ہے مگر نئے خیالات جو پُرانی عادات کے خلاف ہوں اور جو ہمارے دل نشین اعتقادات کی جڑیں کاٹتے ہوں نفرت پیدا کرتے ہیں۔ اس گروہ کے پہلوان دھرم، آتما، مکتی، ورن آشرم شاستر وغیرہ ہتھیاروں سے اپنے مخالفین کو شکست دینا چاہتے ہیں۔ جہاں کسی نے کبھی بھی نئے خیال کی اشاعت کی فوراً اُس پر وار شروع ہو جاتے ہیں۔ کوئی اس کو ناستک، کوئی اس کو مادہ پرست، کوئی ملحد کہتا ہے حتی کہ اس غل شور میں اصلی امر تنقیح گم ہو جاتا ہے اور کچھ عرصہ کے لئے "دھرم کی جے" ہو جاتی ہے۔

دوسرے گروہ میں وہ پولٹیکل پہلوان ہیں جو اپنے پولیٹکل اصول اور اپنی پولیٹکل بائبل اُن ہی لوگوں سے حاصل کرتے ہیں جن کے وہ پولیٹکل رسوخ و پولیٹکل طاقت کے دل سے مخالف ہیں۔ "پائنیر" و "لندن ٹائمز" و دیگر اسی اسکول کے اخبارات جو ہندوستانیوں کے پولیٹکل حقوق کی مخالفت کرتے ہیں اُن کے پولیٹکل استاد ہیں۔

ہندوستانی اخبارات کو پڑھ کر بیساختہ دل سے یہ آواز نکلتی ہے کہ ہم ابھی تک پرانی دنیا میں گھرے ہوئے ہیں اور دنیا کی نئی روشنی و نئے خیالات نے ابھی تک ہمارے پرانے خیالات کے قلعہ میں ایک بھی سوراخ نہیں کیا ہے۔ مجھکو اکثر اس ملک کے مزدور پیشہ جماعت کے مردوں اور عورتوں سے ملنے کا اتفاق ہوتا ہے۔ میں جب ان مزدور مردوں اور عورتوں کے ساتھ گفتگو کرتا ہوں اور اُنکی تعلیم، اُن کی منطق، اُن کی فلاسفی، اُن کی سرگرمی اور اُن کے آزادانہ خیالات کا ہندوستانی تعلیم یافتہ جماعت کے خیالات سے مقابلہ کرتا ہوں تو مجھ کو افسوس اور ایک قسم کی یاس بھی ہوتی ہے۔ اُس وقت مجھے معلوم ہوتا ہے کہ ہم میں اور ممالک مغربی میں کس قدر فرق ہے۔ امریکہ ہم سے بارہ یا چودہ ہزار میل کے فاصلہ پر واقع ہے اور یہی بُعد ہمارے اور اہل امریکہ کے مزدوری پیشہ جماعت کے خیالات میں ہے۔ ان لوگوں کے دل و دماغ زندگی کے مسائل

کی پیچیدگیوں سے بے چین ہیں۔ زندگی کا کوئی پہلو نہیں جو ان کی نکتہ رس دماغ کے حدود سے باہر ہو اور جس پر وہ سننے، سمجھنے، سوچنے، بحث کرنے کے لئے اشتیاق نہ رکھتے ہوں۔ اُن کے حلقہ میں بیٹھا ہوا انسان محسوس کرتا ہے کہ وہ ایک زندہ جماعت میں بیٹھا ہے اور زندہ انسانوں کی باتیں سُن رہا ہے۔ وہ ان سے اتفاق کرے یا نہ کرے لیکن ان کی زندہ دلی و روشن دماغی اس پر اپنا اثر کئے بغیر نہیں رہ سکتی۔ یہ لوگ ہمارے متوسط درجے کے لوگوں سے بدرجہا بہتر آمدنی رکھتے اور ان سے بدرجہا بہتر رہتے اور کھاتے پیتے ہیں۔ اُن کی آمدنیاں بمقابلہ خرچ کے اس قدر بڑی نہیں ہیں جیسی کہ وہ بادی النظر میں معلوم ہوتی ہیں۔ مثلاً جو مزدور پانچ ڈالر روزانہ کماتا ہے اس کا خرچ کبھی تین یا چار سے کم نہیں ہوتا۔ کم از کم دو یا ڈیڑھ ڈالر روزانہ تو اس کا کرایہ میں ہی خرچ ہو جاتا ہے۔ علی ہٰذا خرچ خوراک بھی ڈیڑھ یا دو ڈالر سے کم نہیں ہوتا ہے۔ جیسے مزدوری زیادہ ہے ویسی ہی چیزوں کی قیمت بھی زیادہ ہے۔ تاہم ان لوگوں کو بچانے و جمع کرنے کا چنداں خیال نہیں ہے جتنا کہ زندہ دلی سے زندگی گذارنے کا۔ پانچ ڈالر روزانہ کمانے والا مزدور کم از کم پانچ یا چھ ڈالر ماہواری خریداری کتب و اخبارات و رسالہ جات میں خرچ کر دیتا ہے۔ بعض تو تقریباً دس پندرہ ڈالر ماہواری اپنی دماغی ترقی پر خرچ کرتے ہیں۔ نئی سے نئی کتابیں پڑھتے ہیں اور جمع کرتے ہیں۔ ان لوگوں کے سوشل خیالات ان کے دلوں میں سوشل ذمہ داری کا احساس ان کے دماغ میں سوشل ترقی کے سوچ دو چار اور اُن کی انٹرنیشنل تجویزیں ایسی دلچسپ اور نئی ہیں کہ انسان اُن سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

پرانے خیال کے چار ہندوستانی جہاں جمع ہوتے ہیں، وہ دیوی، دیوتاؤں اور ذات پات کے ذکر سے اپنا وقت گذارتے ہیں۔ نئے خیال کے چار ہندوستانی جہاں جمع ہوتے ہیں وہ اپنی نئی مصیبتوں کا رونا روتے ہیں۔ آمدنی کی کمی، خرچ کی زیادتی، بچوں کی تعلیم کا خرچ ان کو ایسا دبائے رکھتا ہے کہ صرف آریہ سماج کی پارٹی کے جھگڑے اور پولیٹکل پارٹیوں کی نئی تفریق بھی اُن کے دماغوں کو صرف تھوڑی دیر کے ہی لئے اپنی ذاتی اور خانگی سراسیمگی سے بچنے میں مدد دے سکتی ہیں۔ جن لوگوں کو فارغ البالی حاصل ہے وہ اپنی فرصت کا وقت اپنے سرمائے کے بڑھانے اور جائداد کے انتظام میں صرف کرتے ہیں اور اگر کچھ وقت بچتا ہے، تو عیش و عشرت میں پڑ جاتا ہے۔ سرمایہ والوں کا تمام دنیا میں یہی حال ہے۔ صرف فرق یہ ہے کہ یورپ میں سرمایہ داروں کو آج کل رات دن اپنی جماعت کی حفاظت کی فکر دامنگیر ہے۔ وہ اپنے حقوق، اپنے سرمایہ اور اپنی طاقت کی حفاظت میں قانون، گورنمنٹ، عدالتوں، مدرسوں، یونیورسٹیوں اور عبادتگاہوں

کو استعمال کرتے ہیں۔ یورپ وامریکہ کی خیرات گاہیں ہی سرمایہ داروں کے حقوق کی حفاظت اوران کی بہتری کے ذریعے ہیں۔ جو شخص اپنے سرمایہ کی مدد سے ہزارہا اور لکھوکھا مزدور اور کام کرنے والوں کے جسم و دماغ کو استعمال کر کے لاکھوں روپیہ سال میں خرچ کرتا ہے، وہ اپنے سرمایہ کی حفاظت میں ہزار ہا روپیہ اس غرض سے خرچ کرتا ہے کہ کام کرنے والوں کے دل و دماغ بغاوت کی طرف مائل نہ ہوں۔ وہ ان کو خوش کرنے کے لئے مختلف قسم کی پبلک انسٹیٹیوشن کھولتا ہے۔ اُن کو مدرسہ و ہسپتال و تماشہ گاہ و ناچ و رنگ کے موقع بہم پہنچاتا ہے۔ ان کو مذہبی تسکین دینے کے لئے گرجا گھر بناتا ہے۔ پادری نوکر رکھتا ہے اور کبھی کبھی خود بھی وعظ کرتا ہے اور اسی غرض سے وہ مختلف قسم کے مشن قائم کرتا ہے اور غیر ممالک میں اسی قسم کے خیالات کے پرچار کے لئے مشنری بھیجتا ہے۔

مذہبی، تعلیمی، خیراتی اور قانونی انسٹیٹیوشن یہ سب اس کی مدد گار ہیں۔ مذہبی انسٹیٹیوشن لوگوں کو صبر و تحمل و بردباری سکھاتے ہیں وہ ان کے خیالات کو اس دنیا سے ہٹا کر آئندہ راہ نجات کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ اُن کا معراج عیسی و بہشت اور خدا کی بادشاہت ہے۔ وہ ان کے سامنے دولت و دولتمندوں کی حقارت کرتے ہیں تاکہ ان کے دل میں دولت پیدا کرنے والے و دولتمند بننے کی خواہش نہ پیدا ہو۔ وہ غربت و مفلسی کی تعریف کرتے ہیں۔ غریب و افلاس کو نجات کی کنجی بتلاتے ہیں۔ مختلف طریقوں سے اُن کے احساس، احسان مندی و شکریہ کو اپیل کرتے ہیں۔ وہ لالچ و دنیاوی عیش و عشرت کی بُرائی کرتے ہیں اور صبر و رضا کی تعریف کرتے ہیں۔ خود عیش کرتے ہیں۔ واعظوں اور لیکچراروں کو عیش کرنے کے لئے روپیہ دیتے ہیں۔ خود دولت کماتے ہیں اور دولت سے فائدہ اٹھاتے ہیں، مگر اوروں کو نجات کا سیدھا راستہ غربت بتاتے ہیں۔ کچھ عرصہ سے لوگوں کے دل اس قسم کی نجات کی طرف سے پھرے ہوئے دیکھ کر وہ اپنے طریقوں سے اُن کو گرویدۂ احسان رکھنے میں کوشاں ہیں۔ مثلاً گرجا گھروں میں چائے و پانی ناچ رنگ کا انتظام اپنے خرچ سے کرتے ہیں۔ غرض کہ دنیاوی و آسمانی دونوں قسم کے لالچ اُن کو گرجا میں آنے کے لئے دیتے ہیں۔ تمام ہی گرجا ایسے نہیں ہیں۔ بعض گرجا گھروں و عبادت گاہوں میں آزاد منش، و مہاتما واعظ بھی ہیں جو آتما و پرماتما کے مباحثات کو چھوڑ کر لوگوں کو مسائل وقت کے حل کرنے میں مدد دیتے ہیں۔ وہ مذہب کو اسی پہلو پر رکھتے ہیں جہاں مذہب اپنے معتقدین کو اسی دنیا میں نجات پانے کا راستہ بتاتا ہے۔ اُن کو زندہ دلی زندہ دماغی پر شار کھو سیلف رسپکٹ اور سیلف ڈیلائنس سکھاتا ہے جہاں مذہب ان کو اپنے دشمنوں سے اپنے حقوق حاصل کرنے میں مدد دیتا ہے۔ جہاں مذہب کمزوری کی جگہ طاقت، مفلسی کی جگہ فارغ البالی کی تعلیم دیتا ہے جہاں

مذہب ان کو اپنی ہر قسم کی موجودہ مشکلات کو حاصل کرنے میں رہنمائی کرتا ہے، جہاں مذہب ان کے دنیاوی مسائل میں ان کی عقدہ کشائی کرتا ہے۔ اِن واعظوں نے ان تمام بیہودہ اعتقادات کو خیرباد کر دیا ہے جو انسانوں کو ناممکنات پر یقین رکھنے پر مجبور کرتے ہیں۔ یہ واعظ نہ حضرت عیسٰی کی پیدائش کے معجزے میں اعتقاد رکھتے ہیں نہ ان کی خدائی کو مانتے ہیں اور نہ بائبل کو خدا کا کلام سمجھتے ہیں۔ ان کا مذہب بھی کہ جو نئے خیالات کا منبع ہے ترقی کرتا رہتا ہے۔ انسانوں کی ضرورتوں کو پورا کرتا ہے اور ان کے دلوں کو مضبوط اور ان کے دماغوں کو تازہ رکھنے میں مدد دیتا ہے۔ وہ مذہب کو نہ پالیٹکس سے اور نہ ایکانامکس سے علٰحدہ سمجھتے ہیں ان کے منبروں سے ہر قسم کے مضامین کا پرچار ہوتا ہے وہ رائج الوقت سوالوں میں پوری دلچسپی لیتے ہیں ایسا کرنے میں نہ ان کو رائج الوقت گورنمنٹ کا خوف ہے اور نہ سرمایہ داروں کا کیونکہ وہ اپنا خرچ اپنے ممبروں سے نکالتے ہیں ان کی خدمت کرتے ہیں اور اسی سے اوسط درجہ کا گذارہ پاتے ہیں۔ سابقہ مذہبی مجلسوں کو بھی اپنے استحکام کا اس قدر فکر دامنگیر ہے گذشتہ چھ ماہ میں سب کی سب جماعتوں نے (رومن کیتھولک، پروٹسٹنٹ، یہودی وغیرہ وغیرہ) اس قسم کے اشتہارات جاری کیے ہیں کہ جن میں نئے خیالات سے اپنی ہمدردی ظاہر کرتے ہوئے سرمایہ دار جماعت کو نئی سیاسی تبدیلیوں کے کسی حد تک قبول کرنے کی صلاح دی ہے۔

جو تبدیلی مذہبی دنیا کے سلسلۂ خیالات و سلسلۂ اشاعت میں ہو رہی ہے اس کا عکس ہم سوشل زندگی کے دیگر شعبوں میں بھی دیکھتے ہیں۔ یورپ اور امریکہ میں اس وقت نئے اور پرانے خیالات میں ایک جنگ عظیم ہو رہی ہے۔ نئے خیالات نے پرانے خیالات کے مورچے توڑ دیے ہیں اور قلعہ کی دیواریں جگہ جگہ سے گر رہی ہیں۔ قلعہ والے اب صلح پر رضامند ہیں، مگر حملہ آور نہیں مانتے۔ اس جنگ کا نتیجہ کچھ ہی ہو۔ دس سال آئندہ میں یورپ اور امریکہ کی تمام دنیا ایک نئی دنیا ہو کر رہے گی۔ نہ وہ قدیم خیالات رہیں گے نہ وہ طریقۂ زندگی۔ نہ وہ پالیٹکس اور نہ وہ طریقِ حرفت و صنعت سب کچھ بدل جائے گا۔ اس صورت میں سوال جو ہمارے سامنے ہے یہ ہے، کیا ہم بدستور پرانی دنیا میں رہیں گے، یا ہم بھی اپنے لئے نئی زمین اور نیا آسمان پیدا کر لیں گے۔ یاد رہے کہ اگر ہم پرانی دنیا میں رہے تو ہمیشہ مطیع اور مغلوب رہیں گے۔

نئے خیالات کے واعظ اور حامی ہم کو محبت و ہمدردی سے بلا رہے ہیں۔ وہ محسوس کرتے ہیں کہ بغیر ہماری شرکت کے وہ اپنی نئی دنیا قائم کرنے میں پوری طرح کامیاب نہ ہوں گے۔ اُن کی نئی دنیا میں مذہب و رنگ و نسل و قومیت کی تمیز پرانی بنیاد پر نہ رہے گی۔ سب انسان بھائی بہن کی طرح

رہیں گے۔ سب مل کر اسی دنیا کو بہشت بنائیں گے۔ ہر شخص کو، ہر قوم کو ہر طرح سے مذہبی و پولیٹکل واکنامک آزادی حاصل ہوگی۔ کوئی کسی پر جبراً حکومت نہ کر سکے گا۔ کوئی کسی کی غربت یا جہالت یا ناواقفیت سے فائدہ نہ اٹھا سکے گا۔ غریب و امیر و حاکم و محکوم میں جو اس وقت فرق ہے وہ اس قسم کا نہ ہوگا۔ حاکم حاکم نہ رہے گا بلکہ خادم ہو جائے گا۔ اس کی حکومت عارضی ہوگی۔ اس کا انحصار ہماری رضامندی پر ہوگا۔ اسی طرح اُستاد اُستاد نہ رہے گا، بلکہ دوست بن جائے گا، جو اپنے شاگردوں کو آزادانہ طریق پر سوچنا اور بحث کرنا سکھادے گا۔ جو کتابوں کے کیڑے اور امتحانوں کے شکار پیدا کرنے کی کوشش نہ کرے گا جو نوجوانوں کو آزادی کے اصول سکھا دے گا۔ اور اگر وہ اس سے اختلاف رائے کا اظہار کریں تو ان کو نہ صرف سزا نہ دے گا، بلکہ ان کے خیالات پر انصاف سے رائے قائم کرے گا۔ اس نئی دنیا میں جبر و تشدد بہت حد تک دور ہو جائے گا اور لوگ بجائے مقابلہ و مزاحمت کے ایک دوسرے کے ساتھ مل کر باہمی سمجھوتے سے کام کریں گے۔

اس نئی دنیا میں کوئی بھوک اور پیاس سے نہ مرے گا۔ سوسائٹی ایسا انتظام کرے گی کہ سب بچوں کو کافی دوا اور دودھ مل سکے۔ سب بڑوں کو کھانا و کپڑا مل سکے۔ سب کو اس قدر فرصت ہو کہ وہ دل و دماغ سے پوری فرصت حاصل کر سکیں اور آرٹ، لٹریچر اور سائنس کا لطف اٹھا سکیں۔ اس نئی دنیا میں کوئی کسی کا ملازم نہ ہوگا۔ سب حسب لیاقت حسب فرصت اپنا کام آپ کریں گے۔ کام کی تقسیم ایسی ہوگی کہ کوئی کسی کو حقارت کی نگاہ سے نہ دیکھ سکے گا۔ جو میلے کام ہیں وہ سب مشین سے انجام پائیں گے۔ باقی سب کام حسب مذاق ہوں گے۔

چار پانچسو سال کا عرصہ ہوا اہل یورپ نے امریکہ کو دریافت کیا اور اس کا نام "نئی دنیا" رکھا۔ چند ہی سالوں میں پُرانی دنیا والوں کے ایک حصہ نے اس نئی دنیا پر قبضہ کرکے اُس کو اپنی جائداد بنالیا۔ حتیٰ کہ ایشیا والوں کو وہاں جانے کی ممانعت ہوتی جاتی ہے۔ کئی باتوں میں یہ نئی دنیا، پرانی دنیا سے بھی بدتر ہوگئی ہے۔ یہ دنیا دراصل پرانی تھی۔ صرف یہ کہ یورپ والوں کو اس وقت اس کا علم نہ تھا۔ امید کی جاتی ہے کہ اب جو دنیا قائم ہوگی وہ سچ مچ نئی ہوگی۔ اس کو قائم ہونے میں شاید صدیاں گذر جائیں۔ لیکن اس کی بنیاد ڈالی جا چکی ہے۔ پرانی دنیا والے لوگ ان بنیادوں پر عمارت تعمیر کرنے کے کام میں مزاحم ہیں۔ یہ مزاحم بہت جلد ختم نہ ہوگی۔ نئی دنیا قائم کرنے والوں کو دنیا کے تمام نیک مزاج مردوں اور عورتوں کی مدد کی ضرورت ہے۔ کیونکہ دشمن بیشمار، بہت طاقتور اور زبردست ہیں۔ کیا ہندوستان کی تیس کروڑ دنیا اس کشمکش سے علیحدہ رہیگی۔ نہیں علیحدہ رہنا ناممکن ہے۔ سارا جہان اس وقت مثل شطرنج کی بساط کے ہو رہا ہے۔ کوئی مُہرہ اپنی جگہ پر مستقل نہیں رہ سکتا۔ سوال فقط یہ ہے کہ ہم اپنی رضامندی سے ہنسی خوشی سے اس کشمکش میں شامل ہوں گے اور مردانہ وار اپنے حصہ کا کام انجام دیں گے۔ یا ہم کو با دل نخواستہ اور مجبوراً اس میں شریک ہو کر کشاں کشاں جانا ہوگا؟

(جنوری۔ فروری ۱۹۳۰ء) ●●

کشن پرشاد کول

سرکار سے قطع تعلق

مہاتما گاندھی نے اپنی ستیاگرہ کی تحریک کو فروغ دینے اور ملک کی بے چینی اور حکومت کی مطلق العنانی کے مٹانے کا علاج یہ سوچا ہے کہ ترک اتحاد عمل کے طریق کو مقبول عام بنایا جائے یا دوسرے اور سادے الفاظ میں حکومتِ وقت سے ہر قسم کا قطع تعلق کیا جاوے۔ سرکار سے قطع تعلق کرنے کی ساعت و تاریخ یکم اگست قرار دی گئی تھی اور تمام ملک کی آنکھیں اس دن اور گھڑی کی طرف لگی ہوئی تھیں کہ دیکھیے کیا ہوتا ہے۔

اگر ایک جانب سے طرح طرح کے وہم و وسوسے ظاہر کئے جا رہے تھے اور بعض خطروں کا اندیشہ تھا، تو دوسری جانب سے اس یوم سعید کے ساتھ قوم کی تمام امیدیں اور ارمان وابستہ سمجھے جاتے تھے۔ یکم اگست کا دن آیا اور لاکھ لاکھ شکر کا مقام ہے کہ خیریت سے گزر گیا۔ مہاتما گاندھی کے احکام کے مطابق اس تحریک کا آغاز یا اعلان تمام ملک میں ہڑتالوں کے ذریعہ سے کیا گیا۔ نہ صرف بڑے بڑے شہروں بلکہ چھوٹے چھوٹے اضلاع اور قصبوں میں بھی کم و بیش ہڑتال ہوئی اور جلسے کئے گئے کہ جن میں اس تحریک کی تائید کی گئی۔ تقریباً ایک درجن اصحاب نے سرکار سے قطع تعلق کرنے کا عملی ثبوت بھی دیا یعنی بعض نے اپنے خطابات واپس کئے۔ ایک صاحب نے پیشۂ وکالت سے علیحدہ ہونے کا اعلان کیا اور ایک صاحب کونسل کی ممبری سے بھی مستعفی ہوئے۔ یہ واقعات گو بظاہر معمولی معلوم ہوتے ہیں، لیکن درحقیقت بہت کچھ معنی خیز ہیں اور ہر بہی خواہ قوم و نیز حکومت وقت کے لئے قابل غور و فکر ہیں۔ پہلی بات جو کہ قابل غور ہے، یہ ہے کہ حکومت وقت کے موجودہ طرز عمل نے رعیت کے دل دُکھا اور پکا کر پھوڑا کر دیئے ہیں اور سرکار کے خلاف بدگمانی اور ناراضی نہ صرف معدودے چند تک محدود ہے بلکہ اب اس کا اثر ملک کے ہر حصے اور طبقے میں صاف و صریح نظر آ رہا ہے کہ جس کا نظر انداز کرنا حکومت کے لئے خالی از خطرہ نہیں۔ دوسری بات جو کہ قابل بیان ہے یہ ہے کہ اگر رعیت کی اس کیفیت ہیجان میں حکام وقت عقل و ہوش سے کام لیویں اور پولیس بے جا دست اندازی سے باز رہے، تو اس ملک کی امن پسند رعیت خواہ مخواہ شر و فساد کے درپے ہرگز نہیں اور باوصف اپنی ناراضی اور پریشانی کے حکومت کے درپے آزار نہیں۔ تیسری بات کہ جو "قطع تعلق" کے حامیوں اور پیروکاروں کے لئے بالخصوص

قابل غور ہے یہ ہے کہ گو حکومتِ وقت کی مخالفت اور اس سے ناراضی تمام ملک میں ظاہر کی جارہی ہے اور "قطع تعلق" کی تحریک سے زبانی ہمدردی کا شور بھی ہر چہار طرف برپا ہو رہا ہے۔ یہ ناراضی اور ہمدردی ایسی اشد اور گہری نہیں کہ لوگوں کو ایثار نفس پر آمادہ اور تکلیف برداشت کرنے کے لئے مجبور کرے۔ یا "قطع تعلق" کی اصولی بحث اور زبانی ہمدردی سے گزر کر اس کو عملی جامہ پہنانے اور مدنظر نتائج پیدا کرنے میں مدد دے کیونکہ اگر باوصف مہاتما گاندھی کی زبردست شخصیت اور اس تمام شور و غوغا کہ جو پچھلے دو تین ماہ سے قطع تعلق کی تحریک کی تائید اور حمایت میں تمام ملک میں برپا ہو رہا ہے، ایک درجن سے زائد شخص تمام ہندوستان میں ایسے میسر نہ آسکے کہ جو یکم اگست کو سرکار سے قطع تعلق کا عملی ثبوت دے سکتے تو قوم کی ہمت و ایثار کی حقیقت معلوم۔ پچھلے چند ماہ سے جو ایجی ٹیشن اس تحریک کے متعلق برپا ہے اور لوگ جس آمادگی سے اس کی شرکت کے لئے تیاری ظاہر کر رہے ہیں اس سے اس امر کا دھوکا ضرور ہوتا ہے کہ اس مسئلہ کے نشیب و فراز سے بھی لوگ پوری طور سے واقف ہو گئے ہوں گے۔ لیکن امر واقع یہ ہے کہ بجز مہاتما گاندھی اور ان کے معدود سے چند خاص پیروان طریقت کے اس مسئلہ کی اہمیت اور اس کے نشیب و فراز سے لوگ بہت ہی کم واقف ہیں اور اس ہیجان اور طوفان کی حالت میں کہ جو اس وقت ملک میں نظر آرہا ہے۔ خال خال لوگوں کو بھی اس پر کامل غور و خوض کرنے کی فرصت اور نیت ہوگی۔ مسئلہ کا ایک رخ تو پبلک کے سامنے ہے۔ لیکن دوسرا رخ نگاہ اور دھیان سے قطعی اُترا ہوا ہے اور صورت یہ ہے کہ اگر مسئلہ کے ہر پہلو پر توجہ دلائی جاتی ہے اور اس کے نشیب و فراز دکھائے جاتے ہیں۔ تو خواہ مخواہ بدگمانی پیدا ہوتی ہے۔ ہمیں مہاتما گاندھی کی دل سے قدر ہے اور رائے عامہ کا احترام بھی ہم اپنے اوپر واجب سمجھتے ہیں لیکن ہمارا عقیدہ ہے کہ اگر کسی اہم مسئلہ پر رائے عامہ غلط راستہ پر جارہی ہو تو محض اس خوف سے کہ کثرت رائے کی مخالفت لعن طعن کا باعث ہوگی خاموشی اختیار کرنا حد درجہ کی بزدلی اور قوم و ملک کے ساتھ دشمنی کرنا ہے۔ ہم اس مضمون میں "قطع تعلق" کی تحریک کے اس پہلو سے بحث کرنا چاہتے ہیں کہ جو اب تک عوام کی نگاہ سے اوجھل رہا ہے اور جس سے اس کا ناقابل عمل بلکہ نقصان دہ ہونا ثابت ہوگا۔ قبل اس کے کہ ہم نفس مضمون پر بحث کریں، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ بعض جزدی باتوں کو صاف کر دیا جاوے تاکہ غلط فہمی کی گنجائش باقی نہ رہے۔

سرکار سے "قطع تعلق" کرنے کی تحریک پنجاب کے مظالم اور ٹرکی کے شرائط صلح کے سلسلہ میں

شروع کی گئی ہے۔ لہٰذا جو لوگ کہ اس تحریک میں اعتقاد نہیں رکھتے یا اس کی مخالفت کرنا اپنا فرض سمجھتے ہیں ان کے بارے میں یہ خیال کرنا کہ ان کو پنجاب کے مظالم یا ٹرکی کے شرائط صلح کے معاملہ میں اپنے دوسرے برادرانِ وطن سے کم ہمدردی ہے یا وہ سرکار کی ناانصافی اور زیادتی کی جانب سے چشم پوشی کرتے ہیں صریحاً غلط و بے بنیاد ہے۔ اصلیت یہ ہے کہ پنجاب یا خلافت کے معاملہ میں تمام ملک اور قوم یک دل و یک زبان ہے اور ہر ہندوستانی کے دل میں شرم و غصہ کے جذبات یکساں گھر کئے ہوئے ہیں۔ اس میں کسی قسم کا اختلاف نہیں۔ سوال صرف یہ ہے کہ کیا سرکار سے قطع تعلق کرنا ہمارے درد کی دوا ہوگی؟ اسی طرح سے یہ واضح کر دینا بھی مناسب معلوم ہوتا ہے کہ بحث یہ نہیں ہے کہ ستیاگرہ، پیسیو رزسٹنس، بائیکاٹ یا "قطع تعلق" کی تحریک یا تحریکیں اصولاً صحیح یا جائز ہیں یا نہیں۔ بلکہ سوال یہ ہے کہ ہندوستان کی موجودہ حالت میں یہ تحریک یا ایسی ہی دوسری تحریکیں کہاں تک قابل عمل ہیں اور ان میں کہاں تک کامیابی کی امید ہو سکتی ہے۔ بے شبہ نہیں کہ پیسو رزسٹنس اور بائیکاٹ بلکہ سرکار سے ہر قسم کا تعلق قطع بھی جس وقت تک کہ وہ شر و فساد کی صورت اختیار نہیں کرتا اور بلوے اور بغاوت سے اپنا دامن پاک رکھتا ہے آئینی جد و جہد کے دائرے میں شامل کیا جا سکتا ہے اور قانوناً اس کے جائز ہونے میں کسی شبہ کی گنجائش نہیں اور نہ معاملہ کی اس صورت سے کسی سمجھدار آدمی کو اختلاف ہو سکتا ہے اور نہ یہ نکتہ معرض بحث ہے۔ بحث تو صرف اس امر کی ہے اور عملی سیاسیات میں بحث ہمیشہ اسی امر کی ہو سکتی ہے کہ یہ تحریک کہاں تک قابل عمل ہے؟ کیا اس میں کامیابی ممکن ہے؟ اور اگر کامیابی نہ بھی میسر ہو تو کیا اس کی ناکامی سے بھی ملک کو بہ نسبت نقصان کے فائدہ زیادہ ہے؟ یہ سوالات ہیں کہ جن کی جانب ناظرین کی توجہ مبذول کرانی منظور ہے اور جن کا جواب دینے کی اس مضمون میں کوشش کی جائے گی۔

مہاتما گاندھی کا ارشاد ہے کہ تمام اہل ملک سرکاری خطابات اور سرکاری اعزازی عہدوں سے مستعفی ہو جائیں۔ لوکل بورڈز اور کونسلوں سے دور رہیں۔ طلبا سرکاری مدرسے چھوڑ دیں اور سرکاری ملازم اس ملازمت سے استعفیٰ دیدیں۔ جب ایسا ہوگا، تو سرکاری کام نہ چل سکے گا۔ حکومت مجبور ہو کر رعیت کی رضاجوئی پر آمادہ ہو جائے گی اور بلا جنگ و جدل یا قتل و خون کے ہم اپنی منزل مقصود تک پہنچ سکیں گے۔

ہمارا پہلا اعتراض تو یہ ہے کہ مہاتما گاندھی جن لوگوں سے اپنے تعمیل ارشاد کی توقع رکھتے ہیں ان میں اس قدر اولوالعزمی، ہمت، ایثار نفس اور حب الوطنی اس وقت موجود نہیں کہ جو اس تحریک کو عمل جامہ پہنا کر کامیاب بنا سکے۔ کہا جائے گا کہ جوش اور ولولہ اس وقت قوم میں موجود ہے مگر ... صرف اس امر کی ہے

کہ اس کو اُبھارا جائے۔ رفتہ رفتہ ہمت اور ایثار نفس بھی نمایاں ہونے لگے گا۔ اس حالت میں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جس وقت غم وغصہ کے اس جوش کو اُبھارا جائے گا لوگ سختیاں اور پریشانیاں برداشت کریں گے اور منزل مقصود تک پہنچنے میں دیر لگے گی، تو کیا عوام الناس سے یہ امید کی جاسکتی ہے کہ وہ صبر واستقلال کو ہاتھ سے نہ کھو دیں گے اور جامہ سے باہر ہو کر کشت وخون پر آمادہ نہ ہو جائیں گے۔ ہم اس کے یقین کرنے کے لئے تیار نہیں کہ عوام الناس بھی ایسے فرشتہ سیرت، بااصول کے پکے اور بات کے دھنی ثابت ہوں گے کہ جیسے خود مہاتما گاندھی۔ لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ شر وفساد برپا ہو اور ملک میں ہنگامہ مچے۔ بالفرض محال تھوڑی دیر کے لئے مان بھی لیا جائے کہ مہاتما گاندھی کے نام کا جادو رعیت کی طرف سے کسی قسم کا شر وفساد نہ برپا ہونے دے گا تو اس کا کیا جواب اور علاج ہے کہ حکومت خود کسی نہ کسی بہانہ سے شر وفساد برپا کرا دے گی اور تحریک کو مفسدانہ اور باغیانہ قرار دے کر بزور شمشیر دبا دے گی۔ یہ کس طرح سے امید کی جاتی ہے کہ حکومت باوصف فوج، پولیس اور دیگر ذرائع حکومت کے موجود ہوتے ہوئے ان کو کام میں نہ لائے گی اور آپ کی تحریک "قطع تعلق" کی قائل ہو کر حکومت واقتدار اپنے ہاتھ سے نکل جانے دے گی۔ کیا آج تک دنیا میں ایسا ہوا ہے؟ امریکہ میں کیا ہوا۔ قوم نے بائیکاٹ کیا، انگریزی حکومت نے بزور شمشیر اس کا خاتمہ کرنا چاہا، اور رعایا اور حکومت میں جنگ چھڑی۔ اور حسن اتفاق سے یا اس لئے کہ قوم آزادی کے لئے تیار تھی، امریکہ نے فتح حاصل کی۔ آئرلینڈ میں پہلے آئینی جد وجہد شروع ہوا۔ گورنمنٹ کی ناعاقبت اندیشی کی پالیسی نے آئرلینڈ والوں کو اس قدر بیزار و مایوس کر دیا کہ وہ بائیکاٹ اور قطع تعلق کرنے بلکہ شر وفساد کے لئے آمادہ ہو گئے اور اب تو خاصی اچھی جنگ چھڑی ہوئی ہے۔ روس میں انقلاب شروع ہونے سے پیشتر ہڑتالوں کا سلسلہ شروع ہوا۔ جب ہڑتالوں نے حکومتِ وقت کا اس قدر ناک میں دم کیا کہ سرکاری کام میں فرق آنے لگا، تو حکومت نے پولیس کو اشارہ کیا کہ فساد برپا کرایا جائے۔ چنانچہ پولیس کی شرارت بلکہ اس کی سازش سے بلوے ہونے شروع ہوئے۔ گورنمنٹ کو بہانہ مل گیا اور اس شورش کو بزور شمشیر اس وقت دبا دیا گیا۔ یہ بات دوسری ہے کہ دس سال بعد پھر انقلاب برپا ہوا۔ اور روس اب زار کی حکومت واقتدار سے آزاد ہے۔ دور کیوں جایئے، خود اپنے ملک کی مثالیں اور تجربہ بھی یہی بتاتا ہے۔ شورش بنگال کے زمانہ میں بھی بائیکاٹ کا نتیجہ کشت وخون ہوا اور ہڑتالوں اور ستیاگرہ کا نتیجہ تو جو کچھ نکلا، اس کی یاد آسانی سے سہو نہیں ہو سکتی۔ اس بحث سے مطلب برآری نہیں ہو سکتی کہ شر وفساد اور کشت وخون پہلے رعایا کی جانب سے شروع نہیں ہوا۔ عقل اور تجربہ صاف صاف

بتا رہا ہے کہ اس کا نتیجہ لازمی طور پر کشت و خون ہے۔ ایسی حالت میں کیا جہاتما گاندھی کی غرض اور مقصد پورا ہوتا ہے؟ کیا یہ امر یقینی نہیں کہ "قطع تعلق" کی تحریک انقلاب کی صورت اختیار کرلے گی؟ کہا جائے گا کہ اگر حکومت اپنے ظالمانہ اور جابرانہ طرز عمل سے رعایا کے لئے بجز اس کے کوئی چارہ باقی نہیں رکھتی کہ انقلاب برپا کیا جاوے، تو بقول شخصے مرتا کیا نہ کرتا۔ ایسا ہی کیوں نہ ہو۔ سوال پھر وہی پیدا ہوتا ہے کیا قوم ایسے سنگین مقابلہ یا معرکہ کے لئے تیار ہے؟ ایسی مثالیں تو تاریخ میں بہت کم ملیں گی کہ کسی قوم نے اپنی آزادی بغاوت اور انقلاب کے ذریعہ سے بھی پہلے ہی معرکہ میں حاصل کرلی ہو۔ انہیں بھی کئی مرتبہ ناکامی کا سامنا کرنا پڑا، لیکن جن قوموں نے بالآخر فتح حاصل کی انہوں نے اپنی ناکامیوں کو کامیابی کا زینہ بتایا کم ازکم ع "مقابلہ تو دلِ ناتواں نے خوب کیا"۔ کیا ہم ایسے مقابلہ کی بھی تاب رکھتے ہیں۔ کیا قوم اس کی اہل ہے کہ جس قدر بھی ظلم و زیادتی اس پر ہو اس کو وہ ہمت و استقلال سے برداشت کرے اور پھر بھی ابھرنے کے ارمان و آثار ظاہر کرے؟ ہر وہ سمجھدار شخص کہ جو ملک اور قوم کی موجودہ حالت سے معمولی طور سے واقف ہے، ایک ہی جواب دے سکتا ہے اور وہ یہی کہ قوم اس وقت تک کسی ایسے سنگین اور انقلاب انگیز معرکہ کے لئے تیار نہیں۔ اگر ایسا ہے اور شبہ نہیں کہ یہ امر واقع ہے تو پھر اس تمام شورش کا بجز اس کے اور کیا نتیجہ نکل سکتا ہے کہ آپ حکومت وقت کے جبر و قہر کا شکار بنیں اور قوم تباہ ہو۔ بعض احباب یہ خیال بھی ظاہر کرتے ہیں کہ پس ماندہ قوموں کی ترقی بجز اس کے اور کسی طریقہ سے نہیں ہو سکتی اور ان میں بیداری کے آثار اور اُبھرنے کی تڑپ اور ارمان اس وقت تک نکلنے کی تاب نہیں لا سکتے کہ جب تک ان پر ظلم و تشدد نہ ہو۔ جبر و تشدد حب الوطنی اور ایثار نفس کے سوتے ہوئے جذبات کو جگا دیتا ہے، ہمتیں بڑھ جاتی ہیں اور ایک دو معرکہ پیش آنے اور ناکامی کا سامنا ہونے سے بالآخر قوم آزادی کی پوری طرح سے دلدادہ ہو کر اپنی نجات حاصل کرلیتی ہے۔ لہٰذا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ حکومت وقت کے خلاف جس قدر بھی ناراضی پیدا ہو اور نفرت و حقارت کے جذبات ظاہر ہوں اس کے جواب میں حکومت کی جانب سے جس قدر بھی ظلم و تشدد روا رکھا جائے اور قوم کا جان و مال اس مقابلہ میں ضائع ہو اسی قدر اچھا اور قوم کے لئے سودمند ہوگا۔ ایک حد تک یہ خیال بالکل صحیح ہے۔ لیکن ہر حال اور ہر صورت میں ایسا ہونا لازمی نہیں بلکہ ممکن ہے کہ بالکل برعکس نتائج ظاہر ہوں۔ اگر قوم میں بیداری، حب الوطنی، ایثار نفسی اور بل بوتا ایک خاص حد تک پیدا ہو گیا ہے اور موجود ہے تو وہ مصائب اور مظالم کے مقابلہ کی تاب لا سکیگی۔ جبر و تشدد بجائے دبانے کے اس کی امنگوں اور ارمانوں کو اور

اُبھار دے گا۔ لیکن اگر قوم میں بیداری کافی نہیں ہے، اگر حب الوطنی اور ایثار نفسی کی عادت نہیں پڑی ہے اور بل بوتا بالکل نہیں ہے، تو جبر و تشدد کا اثر بالکل برعکس ہوگا اور قوم ذلیل و تباہ ہوگی۔ پولینڈ کی مثال اس خیال کی تصدیق کرتی ہے۔ ایک مرتبہ نہیں بلکہ دو تین مرتبہ اس بدنصیب ملک نے اس امر کا مصمم ارادہ کیا کہ کسی طرح زار روس کے پنجہ سے چھٹکارا حاصل کرلے۔ ایک صدی کے دوران میں تین مرتبہ علم بغاوت بلند کیا اور ہر دفعہ ناکامی ہوئی۔ حتیٰ کہ تیسرے مقابلہ میں اس کی ہستی بالکل ہی مٹ گئی اور قوم پر تباہی و بربادی نازل ہوئی۔ یہ بات دوسری ہے کہ اس ہنگامۂ یورپ میں محض اتفاقاً اس کے پھر اچھے دن پھرے ہیں اور نیا جنم شروع ہوتا ہے۔

ہمارے احباب دوران مباحثہ میں جہاں اور دلیلیں پیش کرتے ہیں وہاں روس، آئرلینڈ، کناڈا، جنوبی افریقہ وغیرہ کی بھی مثالیں پیش کر دیا کرتے ہیں اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ آخران ممالک نے بھی تو اسی طرح اپنی آزادی حاصل کی ہے۔ ہم بھی اگر اسی راستہ پہ چلتے ہیں، تو ہم کو ناکامی کی خوفناک صورتوں سے کیوں ڈرایا جاتا ہے۔ جواباً یہ عرض کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان ممالک کی حالتوں میں اور ہندوستان کی موجودہ حالت میں منجملہ اور باتوں کے سب سے بڑا فرق تو یہ ہے کہ اُن میں سے کوئی قوم ایسی محتاج و مفلوج نہ تھی کہ جیسے ہماری غریب قوم۔ یہ قومیں کہ جن کا حوالہ اوپر دیا گیا اور اکثر دیا جاتا ہے، ہتھیار بند قومیں تھیں اور ہمارے قوم کے نوجوان اور بزرگوں نے تو تین نسل سے ہتھیاروں کی شکل بھی نہیں دیکھی ہے اور بجز زور قلم یا سیف بیانی کے قوت دست و بازو کا تو بس نام ہی نام ہے۔ جب ہمارے بل بوتے کی یہ کیفیت ہے، تو مقابلہ کے وقت "قطع تعلق" یا ستیاگرہ کا منتر کیا آخر عاقبت بخشوائے گا۔

کہا جاتا ہے کہ مانا یہ تحریک عملی صورت اختیار کرتی اور کامیاب ہوتی نظر نہیں آتی۔ یہ بھی مانا کہ اگر یہ قوت پذیر ہوگی، تو اندیشہ ہے کہ اس کا نتیجہ کشت و خون ہو کہ جس کے لئے قوم ابھی تیار نہیں لیکن اس میں کیا ہرج ہے کہ جیسا کچھ ایجیٹیشن اس وقت اس کے متعلق ہو رہا ہے، وہ جاری رہے۔ زبانی جمع خرچ سے تو بجز اس فائدے کے کہ قوم میں تھوڑی سی بیداری پیدا ہوتی ہے اور گورنمنٹ بھی غفلت کی نیند سونے نہیں پاتی کوئی نقصان نہیں ہوتا، بلکہ اس قدر فائدہ ہی ہے کہ لوگوں میں گورنمنٹ کی طرف سے بے اطمینانی اور قوم کے لئے ہمت اور ایثار کے ولولے پیدا ہوتے ہیں۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اگر ہماری ترقی کے راستہ میں صرف اغیار کی حکومت ہی ایک رکاوٹ ہوتی، تب تو یہ سمجھ میں آسکتا تھا کہ اس کے خلاف جس قدر بھی بے اطمینانی

یا جذبات نفرت و حقارت پیدا ہوں، اچھا ہے۔ لیکن ہر سمجھدار شخص کو یہ ماننا پڑے گا کہ امر واقع اس سے مختلف ہے۔ ابھی ہم میں بہت سی ایسی کمزوریاں اور خامیاں ہیں کہ جن کی وجہ سے اگر ہمکو آج اس حکومت اغیار سے چھٹکارا بھی مل جائے تب بھی نجات اور آزادی میسر نہ آئے گی اور ہم اس اہم ذمہ داری کا بوجھ کہ جو ہم پر آ پڑے گی سہار نہ سکیں گے۔ جب ایسا ہے تو ہماری پہلی کوشش یہ ہونی چاہیئے کہ بجائے اس کے کہ پہلے ہم اغیار کی حکومت کا جوا کندھوں سے اٹھا کے پھینکیں، اپنی قوت و طاقت کو بڑھانے اور مجتمع کرنے کی فکر کریں۔ موجودہ ایجیٹیشن ہماری تمام توجہ اور قوت کو اُن ذرائع کی طرف سے لاپروا کر کے محض اس بیکار شور و شغب کی جانب ضائع کرنے کا باعث ہوتا ہے اس لئے نقصان دہ ہے۔ پوچھا جاتا ہے کہ پھر کیا کیا جاوے۔ ٹرکی کی شرائط صلح اور مظالم پنجاب کے متعلق حکومت وقت کا طرز عمل کسی طرح قابل اطمینان نہیں بلکہ رعیت کی نگاہ میں نمک بر جراحت ہے پھر فرمایئے کہ رعایا کے مطالبات کس طرح پورے ہوں اور اطمینان کی صورت کس طرح ظاہر ہو؟ جہاں تک کہ ٹرکی کے مسئلہ کا تعلق ہے، اس کا حل تو اب بجز اس کے کچھ نہیں کہ دول فرنگ و بالخصوص دول اتحاد پر یورپ کی رائے عامہ کے ذریعہ سے ایسا زور اور دباؤ ڈالا جائے کہ وہ اپنی موجودہ پالیسی کے بدلنے پر مجبور ہوں۔ یہ کام مسٹر محمد علی اور خلافت ڈیپوٹیشن بطریق احسن انجام دے رہے ہیں۔ ان کو مزید امداد پہنچائی جاسکتی ہے اور اس کام کو اور زیادہ وسیع پیمانہ پر جاری رکھا جا سکتا ہے۔ رہا پنجاب کا معاملہ اس کے متعلق بھی آئینی جد و جہد اور قانونی چارہ سازی کا دروازہ کھلا ہوا ہے۔ اگر سرکار نے سر مائیکل اڈوائر اور جنرل ڈائر وغیرہ کو کافی سزا دینے کی جرأت نہ کی تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ اہل ہند ان کو سزا دلواتے اور کیفر کردار تک پہنچانے کی فکر کیوں نہ کریں اور یہ ہمارے اختیار میں ہے۔ سر مائیکل اڈوائر اور جنرل ڈائر پر مقدمہ چلانے کے لئے صرف اس امر کی ضرورت ہے کہ پندرہ یا بیس لاکھ روپیہ صرف کیا جائے اور ان کو ولایت کی عدالت عالیہ میں ملزم کی حیثیت سے لا کھڑا کیا جائے۔ اس پر نہ کسی کو اختلاف ہے اور نہ یہ تجویز ایسی ہے کہ جسے عملی جامہ پہنانا دشوار ہو۔ جو قوم کہ "قطع تعلق" کی تحریک کے ذریعہ سے حکومت وقت کو معذور اور مجبور کرنے کا دعویٰ اور ارمان رکھتی ہے۔ بلاشبہ اس کے لئے چند لاکھ روپیہ چند ہفتوں میں فراہم کر لینا دشوار نہیں۔

جو دلائل کہ اُوپر پیش کئے گئے ہیں، ان کی بنا پر ہماری قطعی رائے یہ ہے کہ سرکار سے "قطع تعلق" کی تحریک اول تو عملی پہلو سے کامیاب نہیں ہو سکتی اور اگر قوت پذیرائی ہوئی بھی تو بجز اس کے کہ قوم پر آفت ڈھائے اور تباہی لائے، دوسرا اور کوئی نتیجہ اس سے نہیں نکل سکتا۔ اگر یہ ٹھوکر کر بھی رہ گئی اور

ایجیٹیشن موجودہ صورت میں کچھ عرصہ اور جاری رہا، تو اس حالت میں بھی قوم کی توجہ اور مصروفیت ضروری کاموں کی جانب سے ہٹا کر محض شور و شغب میں وقت ضائع کرنے کا باعث ہوگی۔ بہر صورت و بہر حال اس سے قوم و ملک کا کوئی فائدہ متصور نہیں۔ نقصان اور خطرے البتہ بہتیرے ہیں۔ ایسی حالت میں ہماری رائے میں ہر بہی خواہ ملک کا فرض ہے کہ اپنے ہم قوموں اور ہم وطنوں کو اس کی حمایت اور شرکت سے باز رکھنے کی کوشش کرے۔

ہندوستان کی آئندہ ترقی اور آزادی کے راستہ میں اگر کوئی مشکلیں حائل ہیں، تو صرف دو۔ اول عوام الناس کی جہالت اور اپنے سیاسی حقوق اور فرائض سے بے خبری۔ دوسرے قوم کا ہتھیار چھن جانے کی وجہ سے بے بل بوتا ہو جانا۔ جس وقت تک کہ قوم کو ہتھیار باندھنے اور فوج میں اقتدار و اختیار ملنے کا موقع نہیں ملتا اور عوام الناس اپنے سیاسی حقوق و فرائض سے بے خبر رہتے ہیں اس وقت تک ستیاگرہ یا سرکار سے قطع تعلق کسی طرح سے ہم کو نجات نہیں دلا سکتا۔ اگر اہل قوم میں ملکی خدمت کا جوش اور حب الوطنی کا ولولہ ہے، تو ان کو عوام الناس کی سیاسی تعلیم اور سرکار سے ہتھیار حاصل کرنے اور فوج میں اختیار اور اقتدار حاصل کرنے کی جانب ہمہ تن مصروف اور مشغول ہونا چاہیے پھر یہ دونوں معاملات ایسے ہیں کہ جن کے متعلق کسی فریق و پارٹی میں کسی قسم کا کوئی اختلاف نہیں۔ اگر ہم ایک دل و ایک زبان ہو کر اپنا یہ مطالبہ پیش کریں گے تو سرکار نہیں کرنے کی جرأت نہیں کر سکتی اور عوام الناس بھی اس جہالت و معذوری کی حالت میں کہ جس میں وہ ہیں نہیں پڑے رہ سکتے۔ مگر وائے برحال ما کہ ہم حقیقت کی جانب سے لاپرواہ ہو کر ہوائی باتوں میں وقت ضائع کرتے اور مصیبت کے سامان فراہم کر رہے ہیں۔

(جولائی ۱۹۲۰ء) ●●

کشن پرشاد کول

شورش پنجاب

۱۸۵۷ء کے غدر کے بعد سے پچھلے ساٹھ برس میں ہندوستان کا سیاسی مطلع کبھی اس قدر مکدر اور میلا نہ ہوا تھا کہ جیسا پچھلے دو ماہ میں ۔ باوصف اس کے کہ طوفان اب بیٹھتا جاتا ہے ۔ نہ بادلوں کی گرج میں اگلی سی کڑک ہے نہ بجلیاں ہی پہلے کی طرح سہمانے والی تاہم مطلع گرد و غبار سے کافی آلودہ ہے اور جو ہوا چل رہی ہے وہ اس قدر ناقابل اعتبار کہ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ جو کچھ اب تک سر سے گذر چکا وہ طوفان قیامت کا محض پیش خیمہ تھا یا ابر رحمت اور سہانی برسات کا پیامبر۔ اس بدنصیب ملک کے نوشتۂ تقدیر میں آئندہ از غیب جو کچھ بھی ظاہر ہو صورت حال یہ ہے کہ جس طرح سے اور جس قدر کہ موجودہ حالت ہمارے اُن مظلوم ہم وطنوں کے لئے کہ جن کے زخم ابھی بالکل ہرے ہیں اور جنہیں آنسو پونچھنے کی بھی مہلت نہیں ملی ہے دردناک، جانکاہ اور وحشت انگیز ہے اسی طرح سے اسی قدر اُن لوگوں کے لئے جو تاریخ تمدن اور فلسفۂ سیاسیات کی الجھنوں میں پڑنے کے عادی ہیں دلچسپ، معنی خیز اور سبق آموز بھی ہے۔ لہٰذا اس لحاظ سے اُن تمام حادثوں پر کہ جو اکثر اطراف ملک میں بالعموم اور بدنصیب پنجاب میں بالخصوص گذرے اگر ایک سرسری نظر ڈالی جائے تو رائگاں نہ ہوگا۔ قبل اس کے کہ نفس مضمون سے بحث کی جائے اس امر کا اظہار ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس تحریر کا مقصد نہ اُن تمام حادثوں کی کہ جو پیش آئے تصویر کھینچنا ہے نہ رعایا کے جذبات اور حسیات یا انکی شکایات کی ترجمانی نہ کرنا ہمارا یہ مدعا ہے کہ ہم فیصل بن کر سرکار اور رعایا میں قصور اور الزام کا حصہ رسدی تقسیم کر دیں یہ فرائض قوم کے پیشوا اور رہنما ولایت انگلستان اور خود ہندوستان میں بطریق احسن ادا کر رہے ہیں اور قوم کی زبان جہاں جہاں بالکل بند نہیں کر دی گئی ہے اخبارات

کے ذریعہ سے اپنی آہ و فریاد اور شدید غصہ کا اظہار کر رہی ہے اور "صبح امید" کے اڈیٹوریل کالم بھی اس امر کے شاہد ہیں کہ اُس نے اِس نازک موقع پر اپنا فرض فراموش نہیں کیا ہے۔ بالفعل ہمارا مدعا اس تحریر سے یہ ہے کہ اُن اسباب و وجوہ پر ایک سرسری نظر ڈالی جائے کہ جو موجودہ بدعت اور شورش کا باعث ہوئے ہیں اور ان کی روشنی میں اُن صورتوں اور تدبیروں کو بھی جانچا جائے کہ جو اُس کے انسداد کے لئے اختیار کی گئی ہیں اور کافی غور و بحث کے بعد اگر یہ ثابت ہو کہ مجوزہ علاج کارگر ہوتا نظر نہیں آتا تو وہ صورتیں بیان کی جائیں کہ جن سے سکون اور اطمینان پیدا ہونے کی توقع ہے۔ اول تو یہ کام ویسے ہی آسان نہیں پھر مارشل لا کی پابندیوں اور سختیوں نے پنجاب کے اصلی حالات پر جو تاریکی کا پردہ ڈال رکھا ہے اس سے مسئلہ کی اہمیت اور بڑھ جاتی ہے تاہم حتی الامکان اس امر کی کوشش کی جائے گی کہ جو کچھ معتبر ذرائع سے معلوم ہے اسی کی بنا پر بحث کی جائے اور معاملہ کی صورت صاف صاف بیان کر دی جائے۔

ان حادثوں اور ہنگاموں کی ذمہ داری کہ جو اپریل کے اوّل تین ہفتوں میں مختلف اطراف ملک اور پنجاب میں پیش آئے مختلف راویوں کے بیان کے مطابق رولٹ ایکٹ، ستیا گرہ، یا بولشوزم کے سر رکھی جاتی ہے۔ ان تینوں الفاظ کی مختصراً تشریح بھی بے محل نہ ہوگی جو لوگ تمام و کمال ذمہ داری رولٹ ایکٹ کے سر رکھتے ہیں اُن کی مراد یہ ہوتی ہے کہ یہ تمام آفتیں اس لئے برپا ہوئیں کہ رولٹ ایکٹ کا سا قانون منظور کیا گیا۔ غرضکہ رولٹ ایکٹ سے مراد سرکار کی وہ پالیسی ہے کہ جو اس کے لفظوں کی بندشوں میں شبہ اور ابہام کی صورت میں راز نہاں کی طرح پوشیدہ رکھی گئی اور جو اب سر مائیکل اوڈوائر کی زبان اور قلم سے مارشل لا کی صورت میں ظاہر ہو رہی ہے۔ اسی طرح جو ستیا گرہ کی تحریک کو اس تمام فتنہ و فساد کا باعث بتاتے ہیں اُن کا مطلب بالعموم یہ ہوتا ہے کہ ہندوستانی تعلیم یافتہ طبقہ کی تمام سیاسی تحریکیں اور مصروفیتیں خواہ ان کا تعلق مہاتما گاندھی سے ہو یا فریق نرم اور فریق گرم سے موجودہ شر و فساد کی ذمہ دار ہیں۔ جو لوگ بولشوزم کے دخل اور سازش کے قائل ہیں وہ اُس لفظ کو بہت وسیع معنی پہناتے ہیں اُن کی مراد بولشوزم کے اصول اور عقیدوں سے نہیں۔ ان کا مطلب یہ نہیں کہ ہندوستان میں جن لوگوں نے شورش برپا کی وہ سب

بولشوزم کے اصول اور عقیدوں کے پابند یا لنن اور ٹروٹزکی کے شاگرد تھے بلکہ ان کا مطلب صرف اس قدر ہے کہ برطانیہ کے دشمنوں نے جن میں اب روس، جرمنی، ٹرکی اور افغانستان سب شامل ہیں، ہندوستانی انقلاب انگیز نوجوانوں سے سازش کر کے ان کو رشوت دے کر یہ طوفان برپا کرایا تھا تاکہ دولت برطانیہ کی قوت اقتدار نام اور اقبال کو دھکا لگے۔

اگر ایک فریق موجودہ فتنہ و فساد کا ذمہ دار رولٹ ایکٹ کو قرار دیتا ہے تو دوسرا سارا الزام ستیاگرہ کے سر منڈھتا ہے۔ ان دونوں فریق کا بیان ایک معنی میں صحیح بھی ہے اور ایک معنی میں غلط بھی۔ صحیح اس معنی میں ہے کہ مختلف اسباب و وجوہ نے سامان آتشبازی مہیا کر کے اکٹھا کر دیا تھا۔ رولٹ ایکٹ نے اس میں چنگاری لگا دی اور جب آگ لگی تو ستیاگرہ کی آندھی نے اسے بھڑکا دیا۔ غلط اس معنی میں کہ اگر پہلے سے باروت اکٹھا نہ ہو گئی ہوتی تو صرف رولٹ ایکٹ کا آگ لگانا یا ستیاگرہ کا اس کو بھڑکانا غیر ممکن امر تھا۔ رہا بولشوزم سو ہم اس کے قائل نہیں۔ جب تک کہ معتبر ذرائع سے کافی ثبوت کسی قسم کی سازش کا بہم نہ پہنچایا جائے ہم اس اختراع کے ماننے کے لئے تیار نہیں نہ ہماری رائے میں موجودہ شورش اور ہنگامے کے وجوہ اور اسباب ڈھونڈھنے کے بدلے اس ہوّے کا سامنے لا کھڑا کرنا ضروری ہے۔ نہ یہ قرین قیاس ہے کہ وہ قوم کہ جو دوران جنگ میں برابر چار سال تک اپنی عقیدتمندی اور وفاکیشی میں ثابت قدم رہی اور جس کی وفاداری رفاقت اور جاں نثاری کا اعتراف ایوان سلطنت کے بلند سے بلند میناروں سے بیانگ دہل کیا گیا ایک دم کینچلی بدل کر ایسی باغی ہو گئی کہ حکومت وقت کو پنجاب میں بغاوت کا اعلان کرنا پڑا اور نہ یہ سمجھ میں آتا ہے کہ جس ملک نے اپنی مفلسی اور بیکسی کی حالت میں گاڑھی کمائی کا اربوں روپیہ بلا تکلف سرکار پر سے نچھاور کر دیا اس کا دین اور ایمان آن کی آن میں اس طرح بگڑ جائے کہ بولشوک کی چند ہزار اشرفیوں اور ان کی میٹھی میٹھی باتوں سے اس کے قدم میدان رفاقت سے فوراً اکھڑ جائیں۔ اصلیت یہ ہے کہ موجودہ شورش و ہنگامہ کے وجوہ اور اسباب پر غور کرنے کے بجائے زیادہ وسیع اور عمیق نظر ڈالنے کی ضرورت ہے۔

ہندوستان کی رعایا کے کانوں میں اگر کوئی ایک صدا دوران جنگ کے چار سال میں برابر متواتر گونجتی رہی تو وہ یہ تھی کہ برطانیہ اگر اس جنگ میں شامل ہوا ہے تو محض انصاف اور آزادی

کی حمایت میں اگر دول اتحاد اس قیامت خیز ہنگامہ میں اپنا خون پانی کی طرح بہا رہے ہیں تو محض سرویا بلجیم کی سی پس ماندہ اور چھوٹی چھوٹی ریاستوں اور قوموں کی حمایت کی غرض سے۔ یہ ایک صدا تھی کہ جو تقریباً ساڑھے چار سال تک بلا کسی شاعرانہ مبالغہ کے ہمالیہ کی چوٹی سے راس کماری تک، خلیج بنگالہ کے ساحل سے بحر عرب کے ساحل تک گونجا کی۔ مشکل سے کوئی قصبہ اور قریہ ایسا بچا ہوگا کہ جس کے باشندوں کے کان اس دل خوش کن راگ کی لذت سے نا آشنا رہے ہوں۔ قرضۂ جنگ کے جلسوں اور ہوم رول کے مجمعوں سے اگر کوئی صدا ہم آہنگی کی نکلتی تھی تو وہ یہی تھی کہ ہماری سرکار اور دول اتحاد انصاف اور آزادی کی حمایت میں اپنا خون بہا رہے ہیں۔ چونکہ ہم انصاف اور آزادی کے دلدادہ ہیں، ہم کو جان و مال سے دریغ نہ کرنا چاہئے۔ یہ پہلا سبق تھا کہ جو حریت اور جمہوریت کی کتاب سے ہندوستان کی جاہل اور غریب رعایا کو خود حکومت وقت نے بشد و مد اور سخت تاکید کے ساتھ پڑھایا۔ یہ کروڑوں لاچار اور مظلوم بندگان خدا کہ جنہوں نے صدیوں سے بجز فرمانبرداری اور اطاعت کے کوئی دوسرا دین و ایمان نہ جانا آزادی کے معنی اور مطلب کہاں تک اور کیا سمجھ سکے ممکن ہے کہ مشکوک ہو۔ اگر آج اُن سے آزادی کا مفہوم بیان کرنے کی خواہش کی جائے تو گمان غالب ہے کہ وہ ایک لفظ بھی صحیح اور بامعنی اس کے متعلق نہ بتا سکیں گے، لیکن اسی کے ساتھ اس سے انکار کرنا واقعات پر خاک ڈالنا ہے کہ ان کے خیال میں اس قدر تبدیلی ضرور ہو گئی تھی کہ اب تک جو لڑائیاں لڑی جاتی تھیں وہ زر، زمین یا زن کے لئے اور یہ لڑائی لڑی جا رہی ہے محض انصاف اور آزادی کے لئے جو یقیناً زیادہ بہتر اور اعلیٰ چیزیں ہیں۔ دوسری دل خوش کن صدا جو ہندوستان کی رعیت کے کانوں میں دوران جنگ میں برابر آتی رہی وہ یہ تھی کہ ہندوستان نے اپنی وفاداری اور جاں نثاری کی پوری پوری داد دی اور سلطنت میں برابر کا مرتبہ حاصل کیا۔ یقیناً ہندوستان کی اَن پڑھ رعایا امپیریل کانفرنس کی نوعیت سمجھنے یا مسٹر کرٹس کے نئے خواب British Commonwealth کی تعبیر کرنے سے قاصر اور معذور اُس وقت بھی تھی اور اب بھی ہے۔ لیکن سلطنت کی معیت

کے وقت سرکار کے ہاتھ بٹانے کا زعم اور اپنی وفاداری اور رفاقت کی داد ملنے کا گھمنڈ ان میں غرور پیدا ہوگیا تھا۔ انہیں اس امر کا یقین ہوگیا تھا کہ انہوں نے بھی سلطنت کے لئے کچھ کیا ہے اور ان کا بھی سلطنت پر کچھ حق ہے۔ پریسیڈنٹ ولسن کی ہنگامۂ یورپ میں شرکت، ان کے چودہ زریں اصول، ان کا یہ دعویٰ کہ اس جنگ کے بعد ایسی صلح ہوگی کہ پھر کبھی جنگ وجدال غیر ممکن ہو جائے سونے پر سہاگا ہوا۔ دنیا کے جمہور کے ساتھ ساتھ ہندوستان کے عوام الناس بھی نئی زمین اور نئے آسمان پیدا ہونے کی امیدیں باندھنے لگے اور ۲۰ اگست ۱۹۱۷ء کے اعلان کے بعد یہ یقین بھی ہوگیا کہ ان کو بھی کچھ ملنے والا ہے۔ غرضکہ جمہور ہند میں نئے نئے خیالات، طرح طرح کی امیدیں اور امنگیں پیدا ہوئیں اور وہ اُس دن کے منتظر رہنے لگے کہ ایک نہ ایک دن اختتام جنگ کے بعد اُن کی امیدیں بر آئیں گی اور ارمان نکلیں گے۔ لیکن التوائے جنگ کے بعد سے آیندہ چار ماہ میں جو کچھ ظہور میں آیا اُس نے اُن کو اس طرح چونکایا اور اُن کی آنکھیں ایسی کھولیں کہ حوصلے پست ہوگئے، امیدیں فنا ہوگئیں اور ارمان دب کر رہ گئے۔ جس التوائے جنگ کے بعد ایسی صلح ہونے کی امید تھی کہ جس سے دائمی امن دامان قائم ہو اور انصاف اور آزادی کی بنیادوں پر سوسائٹی کا شیرازہ بندھے اس کے آثار یہ بتلانے لگے کہ یہ خیال وہم وگمان سے زیادہ نہیں جو کل تک پست قوموں کی آزادی کے دعویدار اور حق و انصاف کے حامی تھے غنیم کے ملک اور ملک کے حصے بٹانے میں مصروف نظر آئے۔ ولسن کے زریں اصول طاق نسیاں پر رکھ دیے گئے اور صلح کی بنیاد اسی اصول پر رکھی جانے لگی کہ اگر آج جرمنی فتحیاب ہوتی تو شرائط صلح کیسے غضبناک ہوتے۔ جرمنی کی افریقی نوآبادیاں، ٹرکی کے مقبوضات مثل شام و عراق عرب، جنوبی افریقہ اور اسٹریلیا فرانس اور برطانیہ میں تقسیم ہوگئے۔ ان کا نام پست قوموں کی فہرست سے کاٹ دیا گیا اور سلف ڈیٹرمینیشن کا اصول ایسی صورت بدل کر اور وہ لباس پہن کر نمودار ہوا کہ خود پریسیڈنٹ ولسن انگشت بدنداں رہ گئے ہوں گے۔ آئرلینڈ کا ہوم رول کچھ ایسا سراب ثابت ہوا کہ جوں جوں نزدیک پہونچنے کی کوشش کی گئی وہ دور ہی بھاگتا نظر

نظر آیا۔ مصر کی آزادی کے دم والپسین کا خاتمہ مارشل لا اور ہوائی کشتیوں سے بم کے گولے چھوڑ کر کیا گیا اور ارباب تدبیر نے اس کی تجہیز و تکفین بھی خود پریسیڈنٹ ولسن کے ہاتھوں ہی بطریق مناسب کرادی۔ یورپ کے اتحاد ثلاثہ کو امریکہ کی شرکت سے مزید تقویت دے کر لیگ آف نیشنس کا لیبل لگا دیا گیا اور پریسیڈنٹ ولسن کو بات بنانے کا موقع اب بھی حاصل ہے۔ مانا کہ جمہور ہند کی یہ نادانی تھی کہ انہوں نے دول فرنگ کے دعووں اور دعدوں کو وہ معنی پہنائے کہ جو اس تفسیر کی رو سے کہ جو تاریخ فرنگ کی جلدوں میں قلمبند کی ہوئی پڑی ہے کسی طرح نہیں پہنائے جا سکتے تھے۔ یہ بھی مانا کہ انہوں نے ان مشکلات کو قطعی نظر انداز کر دیا کہ جو پریسیڈنٹ ولسن، مسٹر لائڈ جارج، مسیو کلیمنسو اور سینر ارلینڈو کو پیرس کانفرنس میں قدم قدم پر پیش آ رہی ہیں اور جن کا اندازہ ہر اہل بصیرت کو پہلے ہی سے کر لینا چاہیے تھا۔ یہ سب کچھ سہی مگر حقیقت کی اصلیت اس سے نہیں بدلتی۔ یعنی جمہور ہند کی ابھرتی ہوئی امیدوں اور تڑپتے ہوئے ارمانوں پر ان واقعات سے کہ جو یورپ میں بالعموم اور پیرس میں بالخصوص پیش آ رہے تھے کچھ ایسی اوس پڑ گئی کہ دل بیٹھ گئے اور جب آنکھ کھلی تو معلوم ہوا کہ ع

خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سنا افسانہ تھا

اس سے جو عوام الناس کے دل و دماغ کو دھچکا ہوا تھا جو بے چینی اور پریشانی پیدا ہوئی وہ بہت بڑا سبب تھی اس شورش کے پیدا ہونے کی جس کا اس وقت تذکرہ کیا جا رہا ہے۔

پیٹ بھرنے کا سوال بھی عوام الناس کے لئے کم تکلیف دہ اور پیچیدہ نہ تھا۔ دوران جنگ میں بسبب گرانی اشیاء جو اس وقت غربا اور عوام پر گذرا اس کا اندازہ وہ لوگ کہ جو اطمینان سے زندگی بسر کرتے ہیں پورے طور سے نہیں کر سکتے۔ گرانی کے ساتھ قحط اور وبا نے بھی جو مزید ستم ڈھائے وہ محتاج بیان نہیں یہ ہندوستان کی ہی مسکین رعیت کا ضبط و تحمل تھا کہ اس نے باوصف سخت ترین سختیوں کے اف نہ کیا ورنہ کون نہیں جانتا کہ یورپ کے بھوکے ننگوں نے کیا کیا بدعتیں نہیں اٹھا رکھی ہیں۔ مانا کہ اس میں سرکار کا کوئی قصور نہیں۔ حوادث عالم کو ہندوستان کی گورنمنٹ کس طرح روک سکتی تھی مگر غریب کسان اور مزدور کا دماغ اس منطق اور بحث سے عاری تھا وہ تو یہ سمجھتا تھا

کہ گرانی اور مصیبت جنگ کی وجہ سے ہے اور جنگ سرکار کی وجہ سے۔ پھر سرکار اسکے دکھ درد کی دوا کیا کرتی ہے؟ سرکار خود گرفتار بلا، امداد کی خواستگار تھی خزانہ خالی پڑا تھا، تو ان کے دکھ درد کی دوا کیا کرتی اور زیادہ قصوروار بھی نہیں ٹھہرائی جا سکتی مگر غلط ہو یا صحیح عوام الناس میں یہ خیال پھیلا ہوا تھا کہ ہندوستان کا مال متاع، نون تیل، اناج پانی سب میسوپوٹیمیا ڈھلا جا رہا ہے اور خالی خزانہ سے ہی انگریزی حکام کی تنخواہیں بھرپور دی جا رہی ہیں۔ یہ خیال غم و غصہ کے جذبات پیدا کرتا اور سرکار کی جانب سے بدگمانی پھیلا رہا تھا اور بھوکے ننگے غربا موجودہ حالت سے بیزار ہو کر ہر مصیبت کا سامنا کرنے کے لئے تیار بیٹھے تھے۔ پہلے اختتام جنگ سے کچھ امیدیں وابستہ تھیں جب اس کو بھی مہینوں کی مدت گزر گئی تو مایوسی نے اور بھی بیزار کر دیا۔ یہ دوسرا اہم سبب تھا عوام الناس میں شورش برپا ہونے کا۔

تیسری پیچیدگی ایک اور بھی تھی۔ یعنی ٹرکی اور برطانیہ برسر جنگ تھے ہندوستان کے مسلمان برطانیہ کی رعایا اور ٹرکی کے بھائی بند تھے۔ یہ گتھی کچھ اس طرح سے الجھی تھی کہ کسی طرح نہیں سلجھائی جا سکتی تھی۔ جنگ کا زمانہ تو بارے کسی نہ کسی طرح کٹ گیا مگر اختتام جنگ کے بعد جب یہ خبریں مشہور ہوئیں کہ دولت عثمانیہ کا وجود اب باقی رہتا نظر نہیں آتا۔ عرب، عراق عرب، شام، مصر سب ہی دول اتحاد میں تقسیم ہو جائیں گے اور غالباً قسطنطنیہ بھی بین الاقوامی بندرگاہ قرار دے دیا جائے گا۔ خلافت کا مسئلہ بھی دول فرنگ ہی بجائے خود طے کر دیں گے اور پھر اماکن مقدسہ کی بھی خیریت نظر نہیں آتی تب ہندوستان کے مسلمان میں عجیب ہیجان پیدا ہوا اور تعلیم یافتہ طبقہ اور عوام الناس دونوں کے دل و دماغ بجا نہ رہے اور مسلمانوں میں غم و غصہ کا وہ جوش ظاہر ہوا کہ جو غالباً پہلے کبھی نہ دیکھا گیا تھا۔ مانا کہ یہ ان کی قطعی حماقت ہو۔ ٹرکی نے دیدہ و دانستہ دول اتحاد کے خلاف جنگ میں شرکت کی تو شکست کھانے کے بعد اس کا خمیازہ اٹھانا لازمی تھا۔ پھر دولت عثمانیہ کے ان مظالم نے کہ جو آرمینوں پر وقتاً فوقتاً ڈھائے گئے ہیں دول فرنگ کو ٹرکی سے قطعی بیزار کر رکھا ہے کیا وجہ کہ

وہ اس موقعہ کو غنیمت جان کر اس کانٹے کو ہمیشہ کے لئے نکال کر نہ پھینک دیں۔ یہ سب صحیح لیکن فلسفۂ زندگی اور انسانی فطرت دو مختلف شے ہیں کون نہیں جانتا کہ مرنا برحق ہے اور پھر وہ شخص کہ جو اس عالم فانی میں ایک نہ ایک دن یہاں سے گزر جائے گا تاہم اپنی میت کو سب ہی روتے ہیں۔ فلسفۂ زندگی انسانی فطرت کو مٹا نہیں دیتا۔

صحیح طور پر یا غلط طور پر ہر مسلمان ہند کا یہ خیال ہے کہ ٹرکی کے ساتھ زیادتی کی جارہی ہے اور ان کے مذہبی اور قومی احساسات کا داجبی لحاظ دولت برطانیہ کی جانب سے نہیں کیا جاتا۔ یہ کیفیت بھی جہاں تک کہ مسلمانوں کا تعلق ہے موجودہ بے چینی میں اضافہ کرنے کا ایک بڑا باعث ہوئی۔

ہماری رائے میں یہ ہیں خاص اسباب کہ جنھوں نے عوام الناس کی طبیعتوں میں شورش کا میلان پیدا کر دیا تھا۔ پھر بھی یہ سوال باقی رہتا ہے کہ آخر یہ کیفیت تو بالعموم ملک کے سب ہی حصوں میں تقریباً یکساں موجود تھی پھر کون خاص وجہ ہوئی کہ شورش اور بدعت خاص طور سے پنجاب ہی میں زیادہ برپا ہوئی اور وہیں اس کا دبانا بھی زیادہ دشوار ہوا۔ ہماری رائے میں اس کی خاص وجہ یہ ہے کہ علاوہ ان اسباب کے کہ جن کا تذکرہ کیا گیا پنجاب میں ایک سبب یہ اور مزید موجود تھا کہ سر مائیکل اوڈوائر کی سخت گیری کی پولیسی نے پنجابیوں کے دل خاص طور سے پکا پھوڑے کر دیے تھے۔ کماگاٹا مارو کے سکھوں کے ساتھ واپسی پر جو بدعتیں سر مائیکل اوڈوائر نے ڈھائیں ان کی زبانی روایتیں تو وحشت ناک ہیں لیکن یہ امر بھی ثبوت کے لئے کافی ہے کہ ۱۹۱۶ء میں یعنی کماگاٹا مارو کے حادثہ کے تقریباً سال بھر بعد تک پنجاب میں نظربندوں کی تعداد تقریباً ایک ہزار تھی۔ پھر جنگ کے لئے رنگروٹ بھرتی کرنے میں جس سخت گیری کی پولیسی پنجاب میں برتی گئی اس کا ثبوت اس سے کافی ملتا ہے کہ رعایا تنگ آکر کئی مقامات پر بلوہ اور فساد کرنے پر مجبور ہوئی۔ ماسوا تعلیم یافتہ طبقہ کے ساتھ جو صاحب موصوف کا برتاؤ رہا ہے اور تحریر اور تقریر کرنے والوں کے ساتھ جیسا کچھ سلوک پنجاب میں پچھلے چند سال میں ہوتا رہا ہے وہ محتاج بیان نہیں۔ یہی خاص سبب تھا پنجاب میں شورش کے زیادہ برپا ہونے کا۔ علاوہ بریں ایک سبب

یہ بھی تھا کہ پنجابیوں کے خون میں حرارت بالعموم زیادہ ہوتی ہے اور وہ سختی اور ظلم کے متحمل اس درجہ تک نہیں ہوتے کہ جس قدر اور صوبوں کے لوگ اب بھی ہوتے ہیں۔

یہ تھیں لوگوں کی مشکلات اور مجبوریاں اور یہ تھی کیفیت ان کے دل و دماغ کی کہ جب گورنمنٹ ہند نے رولٹ بل پاس کرنے کی ٹھانی اور حضور وائسرائے نے اپنی افتتاحی تقریر میں کچھ اس انداز سے گفتگو کی کہ جس سے لوگوں نے یہ نتیجہ نکالا کہ سرکار کی نیت اب آئینی اصلاحات کے بارے میں بھی ٹھیک نہیں۔ اخبارات میں علانیہ اس امر کے اشارے ہونے لگے کہ گورنمنٹ ہند آئینی اصلاحات ہند کی رپورٹ سے بھی پھرنا چاہتی ہے اور کون کہہ سکتا ہے کہ اس معاملہ میں آوازۂ خلق نقارہ خدا کی مثال صادق نہیں آئی یا لوگوں کو جو بدگمانیاں پیدا ہوگئی تھیں وہ برحق ثابت نہیں ہوئیں۔ سوتھ برو رپورٹ اور آئینی اصلاحات کے مسئلہ پر جو مراسلات گورنمنٹ ہند نے صاحب وزیر ہند کی خدمت میں ارسال کیے ہیں اُن سے بین طور پر عیاں ہے کہ سرکار ہند دراصل کچھ قوت و اقتدار ہندوستانیوں کو نہیں دینا چاہتی اور اصلاحات کے تجاویز محض دھوکا ہی دھوکا ہیں۔ جب سرکار کے تیور اس طرح بدلتے نظر آئے تو لوگوں میں اس امر کا یقین ہوگیا کہ جب تک جنگ کا خطرہ تھا سرکار لطف و مہربانی سے ہندوستانیوں کو بہلاتی رہی لیکن اب جب کہ اُس خطرہ کی جانب سے اطمینان ہوگیا ہے سرکار بدمعاملگی اور سخت گیری کرنے میں بھی تکلف نہیں کرے گی۔ اس شک و شبہ کو سرکار کے اُس رویہ نے کہ جو رولٹ ایکٹ کے پاس کرنے میں برتا گیا اور بھی پختہ کر دیا اور عوام الناس میں سخت ہیجان پیدا ہونے لگا ستیاگرہ نے اس جلتی ہوئی آگ کو اور بھی بھڑکا یا اور بالآخر دہلی کے جانکاہ حادثہ نے کہ جس میں بلا عذر لوگوں پر گولیاں چلائی گئیں اور معصوموں کی جانیں ضائع ہوئیں لوگوں کے دلوں سے صبر و تاب کھو دیا۔ مہاتما گاندھی کی گرفتاری کی خبر اور امرتسر کے مقامی لیڈروں کی گرفتاریاں اُن کی زیادتیوں کا بہانہ ہوئیں کہ جو امرتسر، احمدآباد، قصور اور گوجرانوالہ وغیرہ میں عوام الناس کی جانب سے ہوئیں۔ پنجاب میں جان و مال کا نقصان جو کچھ اور جس طرح ہوا اس کے لئے لازم تھا کہ حکومت وقت سختی کے ساتھ کام لے اور امن و امان قائم کرے۔ اس پر نہ کوئی اعتراض ہو سکتا تھا اور نہ کسی نے کیا ہے۔ سوال صرف یہ ہے کہ گورنمنٹ نے جو تدابیر اختیار

کیں کیا وہ امن و امان قائم کرنے اور مجرموں کو کیفرِ کردار تک پہونچانے کے لئے لازمی اور ضروری تھیں ؟ کیا وہ بجائے امن و سکون پیدا کرنے کے مزید ہیجان اور بدامنی کا باعث نہ ہوں گی ؟ اس کے بحث کرنے یا ثابت کرنے کی ضرورت نہیں کہ حکومت و سلطنت کی بنیاد محض انسانیت، انصاف اور قانون کے ہی اصولوں پر رکھی جا سکتی ہے اگر رعیت کو حکومت کی طرف سے قانون اور انصاف برتے جانے یا انسانیت کا سلوک ہونے کی توقع باقی نہ رہے تو پھر امن و امان یا سکون و اطمینان قائم نہیں رہ سکتا۔ اس کسوٹی پر جب ہم حکومت پنجاب کے طرزِ عمل کو جانچتے ہیں تو افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ سر مائیکل اوڈوائر کی حکومت کا رنگ بہت ماند معلوم ہوتا ہے۔

چند واقعات کی تشریح سرکاری یا نیم سرکاری بیان کے مطابق ہی ہمارے بیان کی تصدیق کرتی ہے۔ لاہور میں دو روز اور دو مرتبہ مجمع عام پر گولی چلائی گئی گو یہ کہیں بیان نہیں کیا گیا ہے کہ مجمع نے جان و مال کا کوئی نقصان کیا تھا۔ گوجرانوالہ میں بلوائیوں نے پبلک اور پرائیوٹ جائداد کا بہت کچھ نقصان کیا۔ مسلح پولیس نے گولی چلائی اور جب بلوائیوں کے قدم اکھڑ گئے تھے ان پر ہوائی کشتی سے بم کے گولے برسائے گئے اور کلدار توپ چلائی گئی۔ شارع عام پر درجنوں سفید پوش باشندگانِ شہر کو کوڑے لگائے گئے اور نہایت ذی اقتدار لیڈروں کو کہ جن کا شمار کسی طرح باغیوں یا بلوائیوں میں نہیں کیا جا سکتا اور جن کو ہندوستانی پبلک کسی بھی حالت میں ایسے جرائم کا مرتکب ماننے کیلئے تیار نہ ہوگی جلاوطن کیا گیا یا اب کورٹ مارشل کیا جا رہا ہے۔ کیا یہ تدابیر حکومت، انصاف قانون یا انسانیت کے اصولوں کی رو سے جائز اور روا رکھی جا سکتی ہیں یا پبلک ان کو واجب اور جائز سمجھتی ہے ؟ ہمیں خوف ہے کہ اس کا جواب اثبات میں نہیں دیا جا سکتا۔ ماسوا بغاوت یا بدامنی کی کیفیت ایک ہفتہ سے زائد قائم نہیں رہی اب تقریباً ایک ماہ کے قریب گذر گیا کہ پنجاب میں قطعی سکون ہے تو کیا ایسی حالت میں بھی مارشل لا کا جاری رکھنا جائز یا روا کہا جا سکتا ہے ؟

ممکن ہے کہ مارشل لا کے واجب و غیر واجب ہونے پر جو کچھ اخبارات لکھ رہے

ہیں وہ قابل وقعت نہ سمجھا جائے لہٰذا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس مسئلہ پر قانونی پہلو سے بھی کچھ روشنی ڈالی جائے۔ کلکتہ کے نہایت ذی وقعت اور نامور قانونی رسالہ موسوم بہ "ویکلی نوٹس" کہ جو بجز قانونی مسائل پر کبھی بحث نہیں کرتا اور جس کو ہندوستانیوں سے کوئی خاص اُنس یا لگاؤ نہیں ہے مارشل لا کے مسئلہ پر ایک تازہ اشاعت میں کس قدر وضاحت سے لکھتا ہے ہم اس کے اقتباسات ذیل میں درج کرتے ہیں:۔

"انگریزی ضابطہ قانون میں مارشل لا کے نام سے کوئی خاص قانون نہیں ہے۔ یہ لفظ حکومت اور اُن کے افسروں کے اس اختیار کلی کے لیے استعمال کیا جاتا ہے کہ جو ان کو اس وقت حاصل ہوتا ہے کہ جب ملک میں شورش۔ فساد یا جنگ چھڑی ہوئی ہو اور اس شورش اور فساد کا دبانا بجز زبردستی کے اور کسی طرح ممکن نہ ہو۔ اس نازک حالت میں تمام وہ حکام سرکار کہ جو حفظ امن کے ذمہ دار ہیں اس بات کے مجاز ہیں کہ فوج اور دوسرے شہری باشندوں کی مدد سے شورش کو دبا دیں خواہ اس صورت میں جان و مال کا نقصان ہی کیوں نہ ہو"۔

آگے چل کر یہ صاحب رائے یوں تحریر کرتا ہے:۔

"بغاوت، شورش اور فساد کا سب سے سچا ثبوت یہ ہے کہ جب عدالتیں اپنا کام کرنے سے قاصر رہیں اور اپنے احکام کا نفاذ نہ کرا سکتی ہوں، ایسی حالت میں فوجی حکومت کو اختیار ہے کہ مارشل لا سے کام لے اور مجرموں کو فوراً سزائیں دے۔ امن دامان قائم ہونے پر کوئی عدالت ان فوجی حکام پر اعتراض نہ کر سکے گی بشرطیکہ اس کا اطمینان ہو جائے کہ ملک میں شورش اور بغاوت واقعی پھیلی ہوئی تھی اور ضرورت سے زیادہ سختی نہیں برتی گئی اور بے رحمی سے کام نہیں لیا گیا لیکن جب امن دامان قائم ہو جائے اس وقت یہ معمولی قانون ہے کہ باغی بھی مارشل لا کی رو سے سزایاب نہیں ہو سکتے البتہ اگر فوجی سپاہی باغی ہوں تو بات دوسری ہے"۔

اس کے بعد قابل اڈیٹر نے یہ ثابت کیا ہے:

"کہ ہندوستانی مارشل لا ریگولیشن ۱۸۰۴ء کہ جس کی رو سے یہاں مارشل لا

کا اعلان ہوا ہے انگریزی مقننوں کے رائے کی ہی پیروی کرتا ہے اور اس کی رو سے مارشل لا اسی حالت میں جاری ہو سکتا ہے کہ جب بغاوت پھیلی ہوئی ہو اور معمولی فوجداری کی عدالتیں اپنا اجلاس کرنے سے قاصر ہوں اور ان کے احکام کا نفاذ نہ ہو سکتا ہو۔"

ذیل کے الفاظ خاص طور سے قابل غور ہیں:۔

بغاوت کے دب جانے کے بعد اور امن و امان قائم ہونے پر گورنر جنرل بر اجلاس کونسل کو اختیار ہے کہ ایسے کمیشن مقرر کر دے کہ جو حکومت کے خلاف جرائم کا فیصلہ کر سکیں لیکن ہم کو اس میں بہت شبہہ ہے کہ گورنر جنرل با اجلاس کونسل کو بھی یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ مارشل لا کی نوعیت کے کمیشن امن و سکون کی حالت میں بھی قائم اور جاری رکھ سکیں۔"

چونکہ گورنر جنرل بہادر نے مارشل لا آرڈیننس اس غرض سے جاری کیے ہیں

قائم کیے جائیں کہ ۱۸۰۴ء کے ریگولیشن کی بنا پر سزائیں دیں یہ سوال واجبی طور پر کیا جا سکتا ہے کہ کیا صاحب موصوف کو یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ ایسے آرڈیننس جاری کریں کہ جو ۱۸۰۴ء کے ریگولیشن کے منشا کے خلاف ہوں۔ چونکہ ہم کو بعد کافی غور و خوض کے اس بارے میں کافی شبہات ہیں ہم اپنا فرض سمجھتے ہیں کہ حضور والا ویسرائے کی توجہ اس جانب دلائیں۔ اب جبکہ امن و امان قائم ہو گیا ہے معمولی فوجداری کی عدالتوں کے روبرو ملزمین کو پیش کرنا اور سزائیں دلوانا لوگوں میں اطمینان کی حالت پیدا کرے گا۔ اور لوگوں کو پنجاب میں جو کیفیت مارشل لا کی قائم ہے اس کے قانونی یا غیر قانونی ہونے کے بارے میں بھی بحث پھر اٹھانے کی نوبت نہ آئے گی۔"

قصہ مختصر ان تمام زیادتیوں کا مجملاً بیان کر دینا ہی کہ جو مارشل لا کے نام اور بہانے سے پنجاب میں کی گئیں اور جس صورت جس موقع اور جس حالت میں کی گئیں اس کے ثابت کر دینے کے لیے زیادہ بحث کی گنجائش نہیں رکھتا کہ وہ موقع کی ضرورت سے کہیں زیادہ خلاف قانون اور انصاف

اور انسانیت کے معمولی اصولوں کے قطعی برعکس تھیں اور اُن کے بابت نہ صرف پنجاب بلکہ ہندوستان کے ہر حصہ اور طبقہ میں یہ خیال جڑ پکڑتا گیا ہے۔ (اس کی بحث فضول ہے کہ وہ کہاں تک صحیح اور کہاں تک غلط ہے) کہ وہ رعیت کے ڈرانے اور سہمانے کی غرض سے کی گئیں نہ کہ امن و امان کے قائم کرنے کے خیال یا انصاف اور عدل کی داد دینے کی غرض سے۔ لہذا اگر اس سرکاری طرز عمل کی غرض واقعی امن و امان و سکون و اطمینان پیدا کرنا ہو بھی تو جبتک کہ رعیت کا خیال ان کے بارے میں وہی رہتا ہے کہ جو ابھی بیان کیا گیا تو اس سے اصل غرض پوری نہیں ہو سکتی۔

اب ہم اس سوال پر ایک دوسرے پہلو سے نظر ڈالتے ہیں بلا لحاظ اس کے کہ سرکاری پولیسی اور حکومت کا یہ طرز عمل شایستہ حکومتوں کے معیار کے مطابق پورا اُترتا ہے یا نہیں۔ آیا مہذب دنیا کے اخلاق و انصاف کے مقبول عام اصولوں کے سامنے اس کی کیا حقیقت رہ جاتی ہے اور فرنگی قوموں کا یہ دعویٰ کہ وہ پست قوموں اور ایشیائی ملکوں کو محض اسلئے اپنے سایۂ عاطفت میں لے لیتے ہیں کہ پھر کبھی اُن سے چھوکر بارس ہو جائے کہاں تک سچا ثابت ہوتا ہے اور اس پولیسی اور طرز عمل کے قائم رہتے ہوئے اِن غریب پسماندہ قوموں کے لئے شاہراہ ترقی پر چلنے یا آزادی اور خود مختاری کی منزل کی طرف قدم بڑھانے کی گنجائش کہاں تک باقی رہ جاتی ہے۔ غرض کہ بلا خیال اس کے کہ ان لحاظ سے کیا صورت پیدا ہوتی ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا کسی ایک قوم کا دوسری قوم پر یا کسی حکومت کا اپنی رعایا پر اس سخت گیری اور جابرانہ طرز عمل کے ذریعہ سے ایک مدت مدید تک امن و امان اور سکون و اطمینان سے حکومت کرنا ممکن ہے؟ زمانہ حال کا سب سے بڑا انگریزی فلاسفر اور مدبر اس کا جواب یوں دیتا ہے:۔

"حکومت کی بے عنوانیاں بدامنی پھیلاتی ہیں۔ شورش اور بدامنی کا دفعیہ لازم ہو جاتا ہے۔ اصلاحات و مراعات طاق نسیان پر رکھ دیئے جاتے ہیں۔ سختگیری اور جبر و تشدد کا دور شروع ہوتا ہے۔ انقلاب سر اُٹھاتا ہے اور معاملہ کی صورت زیادہ نازک ہوتی جاتی اور بگڑتی جاتی ہے۔

... ...

> آخر آئندہ کیا حشر ہوتا ہے۔ کیا ہم یہ کہیں کہ پہلے تو شورش بند کر دو اور خاموشی ہو تب ہم اصلاح کا نام زبان پر لائیں گے۔ بالفعل ہم تمہاری ایک نہ سنیں گے۔ نظر بندی، جلاوطنی اور کورٹ مارشل ہمارا دستور رہے گا؟ یہ تو زار اور ڈیوما کی طرح بڑا پرانا دکھڑا ہے۔
>
> (لارڈ مارلے)

اس بارے میں تاریخ جو کچھ ہم کو بتلاتی ہے وہ بھی کم سبق آموز نہیں۔ زمانۂ حال کی مثالوں میں آئرلینڈ اور روس کے قضیے بہت نمایاں اور پیش پیش ہیں۔ پچھلے ۵ سال میں آخر آئرلینڈ میں کیا ہوا۔ ایک جانب سے وعدہ خلافی، حق تلفی، ہٹ دھرمی، زبردستی۔ دوسری جانب سے بائیکاٹ بلوہ اور فساد قتل اور خون۔ پھر اُدھر سے جبر و تشدد نظر بندی اور جلاوطنی جیل خانہ اور پھانسی اور مارشل لا۔ اُدھر سے بغاوت اور اعلان آزادی۔ یہ سچ ہے کہ ابھی آئرلینڈ طوق غلامی گردن سے پھینک کر اپنی خود مختاری اور آزادی حاصل کرنے میں کامیاب نہیں ہوا ہے۔ لیکن کیا انگریزی قوم اور انگریزی حکام آج سے نہیں برسوں سے آئرلینڈ میں ایک بھی شکھ چین کی نیند سو سکے ہیں؟ روس میں کون سا دقیقہ اٹھا رکھا گیا ہے۔ پچھلے دس بارہ برس میں زار کی حکومت نے دراصل وہ سب کچھ اور اُس سے بھی سوا کیا کہ جس کی نقل پچھلے دو ہفتوں میں سر مائیکل اوڈائر نے بہت کچھ کامیابی کے ساتھ پنجاب میں اُتاری۔ لوگ ہزاروں کی تعداد میں سائبیریا کے جنگلوں میں جلاوطن کر کے بھیجے گئے۔ جیل خانے قیدیوں کی بھرمار سے تنگ آ گئے۔ بے گناہ عام مجمعوں پر گولیاں چلائی گئیں۔ ہڑتالوں کا علاج یہ سوچا گیا کہ پولیس کے ذریعہ سے بلوے کرائے گئے اور جب بلوے ہو گئے تو مارشل لا سے کام لیا گیا۔ غرض کہ کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا گیا لیکن آخر کار حشر؟ لوگوں کا حافظہ بھی کس قدر ضعیف ہوتا ہے اور ہٹ دھرمی کی تو انتہا ہی نہیں۔ آج بولشوزم کو ہر کس و ناکس گالیاں دیتا ہے اور کوستا نظر آتا ہے لیکن اس پر غور کرنے کی مہلت کسی کو نہیں ہے کہ بولشوزم آخر کیوں آئی اور کیسے آئی۔ اُس کا بیج کس نے بویا تھا؟ اس پودے کو سینچنے والے کون تھے؟ گرگے

مرد سے اکھاڑنا بُرا سہی لیکن ان لوگوں کے لئے کہ جو تاریخ تمدن اور سیاست کی اُلجھی ہوئی گتھیوں کو سلجھانے کی فکر کرتے ہیں صحیح نتائج پر پہونچنے سے گو وہ کیسے ہی ناگوار کیوں نہ ہو جھجکنا نہ چاہیئے۔ جن لوگوں نے زار روس کو بے بسی لوٹتے ہوئے دیکھا اور اُس سے رسم آشتی بڑھائی ان کو اس کے پھل کے کھانے کے لئے تیار رہنا چاہئے بولشوزم کو بُرا بھلا کہنا کارگر نہیں ہو سکتا۔ اسباب کے نتائج بغیر ظاہر ہوئے نہیں رہ سکتے۔

دور کیوں جائیے۔ ہندوستان میں ہی بنگالہ کی مثال موجود ہے۔ تقسیم بنگالہ کے بعد سودیشی اور بائیکاٹ کی صورت میں جو شورش وہاں برپا ہوئی وہ پنجاب کی شورش سے کسی حالت میں کم نہیں کہی جا سکتی۔ وہاں بھی سر بمپفائلڈ فلر اور سر انڈریو فریزر نے کم و بیش وہی طرز عمل اختیار کیا کہ جس سے آج سر مائیکل اوڈائر نے پنجاب والوں کے دل ہلا دیے ہیں۔ بابو سرانڈرناتھ بنرجی، بابو اشونی کمار دت۔ بابو کرشنا کمار متر کے سے نامی لیڈر گرفتار اور جلاوطن کیے گئے۔ جن کو جیل خانہ بھیجا گیا ان کی تعداد یاد نہیں۔ لوگوں کو کوڑے بھی سر بازار لگائے گئے۔ کملا، رنگ پور، جمال پور، باریسال، مدنا پور اور خود کلکتہ میں ایک نہیں کئی کئی مرتبہ بلوے ہوئے کہ جن میں ہزارہا شرفا بنگالیوں کے مال اور آبرو پر بن آئی اور جن کے بارے میں یہ ثابت ہو گیا کہ نواب صاحب ڈھاکہ کی اعانت اور پولیس کی شہ سے یہ سب ہنگامے برپا ہوئے۔ اس ظلم اور تشدد کا لازمی نتیجہ تھا کہ انارکسٹ پیدا ہوں۔ چنانچہ انگریز اور ہندوستانی حکام کے خون بھی ہوئے اور مجرموں نے کالے پانی اور پھانسی کی سزائیں بھی پائیں اور لوگ ہزاروں کی تعداد میں نظربند بھی کیے گئے۔ غرض کہ سرکار نے سخت گیری کی پولیسی کافی عرصہ تک برتی۔ گو پنجاب کی طرح وہاں عدالت کا دروازہ کبھی بند نہ ہوا تھا۔ اور اُس شورش اور ہنگامے کے زمانہ میں بھی برٹش انصاف اور عدالت کی بعض درخشاں مثالیں ایسی ظاہر ہوئی تھیں کہ جنہوں نے بنگال میں حکومت کے اُکھڑتے ہوئے قدموں کو پھر ایک مرتبہ جما دیا۔ یہ سب کچھ ہوا لیکن جبر و تشدد کے طرز عمل نے بنگال میں سکون و اطمینان کی صورت نہ پیدا ہونے دی۔ آخرکار لارڈ ہارڈنگ کی مدبرانہ حکمت عملی اور شہنشاہ کے دست شفقت نے بنگال کے اُس زخم پر کہ جو ناسور بن چلا تھا مرہم رکھا اور تقسیم بنگالہ مسترد کر دی گئی۔ شورش بنگالہ رفع ہو گئی

اور باوصاف اس کے کہ ملک میں اس وقت ایک آفت برپا ہے لوگ متعجب ہیں کہ بنگالہ کیسے خاموش ہے؟ لیکن امر واقعہ یہ ہے کہ بنگال میں اس لئے سکون اور اطمینان ہے کہ حکومت نے وہاں مرض کی صحیح تشخیص کرکے معالجہ سے منہ نہیں چرایا۔ کیا پنجاب کے معاملہ میں ایسی بھی حکومت وقت اپنا دل و دماغ قابو میں لاکر اس امر کی جرأت کرے گی کہ رعیت کے دکھ درد کی دوا کرے۔ جو ظلم اور زیادتیاں کہ سر مائیکل اوڈوائر نے مارشل لا کے پردے میں کی ہیں انکی پوری پوری تحقیق اور تفتیش کی جائے۔ ہماری رائے میں بجز پارلیمنٹری کمیشن کے اور کسی طریق سے لوگوں کا اطمینان نہ ہوگا۔ تحقیقات کی رو سے جو لوگ مستوجب سزا قرار پائیں انکو اپنی زیادتیوں کا خمیازہ بھگتنے دینا چاہئے۔ بلا اس رو رعایت کے کہ وہ اعلیٰ ہیں کہ ادنیٰ۔ اگر ایسا کیا گیا اور آیندہ حکومت کا برتاؤ بھی قابل اطمینان ہوا تو غالباً موجودہ زخم تو بھر جائیں گے اور معاملات کی صورت ابتر ہونے سے بچ جائے گی ورنہ قانون قدرت اپنا کام کرتا رہے گا اور خاص حالتوں میں خاص اسباب کے خاص نتائج بغیر نکلے نہ رہیں گے۔

(جون ۱۹۱۹ء)

••

'پنجابی'

شورش پنجاب و مابعد

شورش پنجاب کے پر آشوب زمانہ کی یاد ہنٹر کمیٹی کے فیصلہ اور پارلیمنٹ کے مباحثہ نے پھر از سر نو تازہ کر دی ہے۔ ہنٹر کمیٹی کی تقرری کے بعد ہی سے انصاف کی امید بہت کم رہ گئی تھی کیونکہ یہ کسی طرح امید نہیں کی جا سکتی تھی کہ جو حکام حکومت ہند کے ماتحت یا اُس کے زیر اثر ہیں وہ اُس کی بداعمالیوں کے خلاف زبان کھولنے کی جرأت کر سکیں گے۔ البتہ لارڈ ہنٹر کی ذات سے کچھ امید وابستہ تھی۔ رپورٹ کے فیصلہ اور انداز تحریر نے اس کو بھی پاش پاش کر دیا۔ بہر حال ہماری اشک شوئی کے لئے یہی غنیمت ہے کہ ہندوستانی ممبروں نے اپنا فرض ایمانداری و جرأت سے ادا کیا۔ کاش کانگرس کمیٹی نے ہنٹر کمیٹی کے روبرو شہادت پیش کرنے سے احتراز نہ کیا ہوتا تو شبہہ کی گنجائش نہیں کہ مائنوریٹی رپورٹ زیادہ زوردار اور میجورٹی رپورٹ اور بھی مضحکہ خیز ہوتی۔

ہنٹر کمیٹی اور کانگرس کمیٹی کی تحقیقات نے شورش پنجاب کے تمام حالات و معاملات کی چھان بین کر کے انہیں روز روشن کی طرح عیاں کر دیا ہے۔ اب کہیں وہم و قیاس یا شک و شبہہ کی گنجائش نہیں۔ شورش پنجاب کے اسباب و وجوہ جو بیان کئے گئے ہیں اُن کا اثر کم و بیش تمام ملک پر یکساں تھا۔ ضروریات زندگی کی گرانی، مسلمانوں میں شرائط صلح کے خوف سے ہیجان، رولٹ ایکٹ سے ناراضی یا ستیہ گرہ کی تحریک کا اثر ان میں سے کوئی بھی ایسا سبب نہ تھا کہ جس کا اثر صرف پنجاب تک محدود ہوتا۔ پھر کیا سبب تھا کہ باوجود بے چینی کے ان تمام اسباب کے موجود ہوتے ہوئے اور تو تمام ملک میں امن و امان رہا لیکن شورش برپا ہوئی تو صرف پنجاب میں۔ احمد آباد کے فسادات کا تذکرہ اس وجہ سے ضروری نہیں معلوم ہوتا کہ وہاں جو کچھ ہوا وہ محض مہاتما گاندھی کی گرفتاری کی وجہ سے۔

جب مہاتما گاندھی احمد آباد واپس آ گئے تمام شر و فساد فرو ہو گئے۔ پھر پنجاب کی شورش کے خاص اسباب کیا تھے۔ اصلیت یہ ہے کہ سر مائیکل اوڈائر کی فرعونیت اور نادر شاہی حکومت نے پنجاب کا ناک میں دم کر دیا تھا۔ جب ضبط کی تاب نہ رہی اور پیمانۂ صبر لبریز ہو چکا، چھلک گیا۔ میجورٹی رپورٹ نے سر مائیکل اوڈائر کا لحاظ و پاس کر کے اس امر سے چشم پوشی کی ہے لیکن مائنورٹی رپورٹ میں اس اصلیت کو بے نقاب کر کے دکھایا گیا ہے کوئی شبہ نہیں کہ سر مائیکل اوڈائر کی زبردستیوں نے رعیت کو تنگ کر رکھا تھا۔ رولٹ ایکٹ کی منظوری اور اُس کے خلاف ناراضی پھیلنے نے تمام ملک میں بےچینی کے آثار پیدا کر رکھے تھے لیکن حقیقت حال کی اس صورت سے چشم پوشی نہیں کی جا سکتی کہ پنجاب اور احمد آباد میں لوگوں نے صبر و تحمل کو اُسی وقت ہاتھ سے کھویا کہ جب امرتسر سے ڈاکٹر کچلو اور ڈاکٹر ستیہ پال جلاوطن کیے گئے اور احمد آباد اور پنجاب میں مہاتما گاندھی کی گرفتاری کی خبر پھیلی۔ اس سے قبل نہ پنجاب اور نہ گجرات میں کوئی شر و فساد برپا ہوا۔ ہنٹر کمیٹی کے روبرو مسٹر مائلس اروِن ڈپٹی کمشنر امرتسر کی شہادت میں اس امر کا اقرار موجود ہے کہ امرتسر میں ۳۰ مارچ اور ۶ اپریل دونوں تاریخوں میں ہڑتال ہوئی لیکن کسی قسم کی بدامنی یا شورش نہ ہونے پائی۔ ۹ اپریل کو رام نومی کا جلوس نکلا کہ جس میں ہزارہا ہندو مسلم باشندگان شہر شریک تھے لیکن کسی قسم کا کوئی فساد برپا نہ ہونے پایا ایک موقع پر ڈپٹی کمشنر صاحب امرتسر خود اس جلوس کا نظارہ کر رہے تھے۔ جس وقت جلوس کا بینڈ (انگریزی باجا) ان کے سامنے سے گزرا تو اُس نے تعظیماً "خدا بادشاہ کو سلامت رکھے" کا راگ گایا۔ ۹ اپریل کی شام تک ڈپٹی کمشنر صاحب کو باشندگان شہر سے کوئی شکایت سنگین قسم کی پیدا نہ ہوئی تھی۔ ۱۰ کی صبح ڈاکٹر کچلو اور ڈاکٹر ستیہ پال حسب الحکم حکومت پنجاب جلاوطن کیے گئے اور شہر میں خبر پھیلتے ہی ہیجان عظیم پیدا ہو گیا۔ کئی ہزار کا گروہ برہنہ سر و برہنہ پا فریادی صورت بنائے ڈپٹی کمشنر کے بنگلے کی جانب چلا کہ اپنے لیڈروں کی رہائی کا مطالبہ کرے۔ یہ امر قابل غور ہے اس مجمع کے پاس نہ ہتھیار تھے نہ لاٹھیاں۔ اس مجمع کو راستہ میں کئی انگریز ملے لیکن اس نے

کسی کو نہ ستایا اور نہ کسی پر وار کیا۔ جو کچھ فساد اور آفت برپا ہوئی وہ اُس وقت کے قطعی بعد کہ جس وقت پولیس اور فوج نے اس مجمع پر گولی چلا دی تھی اور اُس کو بزور شمشیر منتشر کر دیا تھا۔ یہاں پر امرتسر کے اُن بلوائیوں کی کہ جنہوں نے کشت و خون کیا کسی قسم کی حمایت کرنا منظور نہیں۔ جو کچھ ہوا بہر حال و بہر صورت قابل نفرین اور قابل الزام تھا۔ لیکن اس کی تمام ذمہ داری یک طرفہ نہیں ہو سکتی اور حکومت پنجاب اشتعال دینے اور اس آگ کو بھڑکانے کے الزام سے کسی حالت میں بَری نہیں کی جا سکتی۔ پنجاب اور احمد آباد کے دردناک سانحوں کی طویل فہرست میں ڈاکٹر ستیہ پال اور ڈاکٹر کچلو کی جلاوطنی اور مہاتما گاندھی کے خلاف حکومت دہلی اور پنجاب کا حکم پہلی مجرمانہ غلطی تھی کہ جس نے رولٹ ایکٹ کے ایجیٹیشن کی چنگاریوں کو بھڑکا کر آگ لگا دی اور وہ شورش اور صورت پیدا کی کہ جس پر حکومت برطانیہ کے باہر ناز ارکین سلطنت آج شرم سے گریبان میں منہ ڈال رہے ہیں۔ ستیہ گرہ یا رولٹ ایکٹ کا ایجیٹیشن صوبۂ بمبئی یا صوبۂ متحدہ میں بہ نسبت پنجاب کے کسی صورت سے کم زور دار نہ تھا لیکن یہاں کسی قسم کی بدامنی یا شورش محض اس وجہ سے نہ پیدا ہونے پائی کہ حاکم صوبہ بیدار مغز اور مربی رعیت تھا۔ صوبۂ بمبئی میں بھی جو کچھ ہوا اُسی غلطی کا خمیازہ تھا کہ جو حکومت ہند نے پنجاب گورنمنٹ کے مشورے سے کی تھی۔ اس امر کا کہ مہاتما گاندھی کی گرفتاری کیسی مجرمانہ غلطی تھی اس سے زیادہ اور کیا ثبوت ہو سکتا ہے کہ صاحب موصوف جس وقت رہا کیے گئے اور موقع پر پہونچے تو احمد آباد کی تمام بدعنت فرد ہو گئی اور ان کی موجودگی نے بھڑکتی ہوئی آگ کے ساتھ پانی کا کام کیا۔ ہنٹر کمیٹی کے میجوریٹی رپورٹ اس سیدھی سچی بات کو بھی کشادہ پیشانی سے ماننے کے لئے تیار نہیں غالباً اس وجہ سے کہ حکومت پنجاب اور حکومت ہند کے حق میں اس امر کا اعتراف خلاف جائیگا۔

ہنٹر کمیٹی نے حکومت پنجاب اور حکومت ہند کی تائید خیال کرتے ہوئے پنجاب کے فسادات کو "علانیہ بغاوت" قرار دیا ہے۔ غنیمت صرف اس قدر ہے کہ انگریزی حکام اور افسروں کی شہادتوں میں بھی ان کو اس امر کا کہیں پتہ یا ثبوت نہ مِل سکا کہ یہ تمام فسادات مظاہرے تھے اس کوشش کے کہ برٹش حکومت کو ہندوستان سے دریا برد کر دیا جائے ورنہ کمیٹی کو یہ فیصلہ دینے میں بھی تکلف نہ ہوتا کہ یہ کوئی بڑی گہری سازش تھی کہ جو گورنمنٹ کے تباہ

و برباد کرنے کی غرض سے عملاً کی گئی تھی۔ سوال یہ ہے کہ کیا ہنٹر کمیٹی کا یہ فیصلہ کہ پنجاب کے فساد کو "اعلانیہ بغاوت" قرار دیا جا سکتا ہے، واقعات اور شہادت کی بنا پر صحیح مانا جا سکتا ہے؟ ہنٹر کمیٹی کی مائنوریٹی رپورٹ نے اس فیصلہ کی تردید نہایت شافی اور کافی کر دی ہے۔ یہاں اس قدر گنجائش نہیں کہ ہم کمیٹی کے ہندوستانی ممبروں کے دلائل و وجوہ بالتفصیل بیان کر سکیں تاہم بعض ضروری باتیں ضمناً لکھی جاتی ہیں۔ اگر پنجاب کے فسادات عملاً حکومت برطانیہ کو تباہ و برباد کرنے کی غرض سے برپا کیے تھے یا اگر وہ "اعلانیہ بغاوت" قرار دیے جا سکتے ہیں تو کیا یہ امر کسی قدر تعجب انگیز نہیں کہ بغاوت کرنے والوں نے ہتھیار حاصل کرنے یا فوجی مزاحمت کرنے کی کوئی تدبیر نہ کی اور نہ دیہاتی رعایا پنجاب کو اپنی بغاوت میں شریک کرنے کی کوئی کوشش کی۔

بعض انگریزی افسروں سے جو جرح ہنٹر کمیٹی کے ہندوستانی ممبروں نے کی اُس سے اس مسئلہ کے اس پہلو پر کافی روشنی پڑتی ہے۔ لفٹننٹ کرنل جانسن نے کمیٹی کے ایک سوال کے جواب میں بیان کیا کہ لاہور شہر میں ۷۰۰ لائسنس دار ہیں کہ جن کو ہتھیار رکھنے کی اجازت حاصل ہے۔ کرنل جانسن سے سوال کیا گیا تھا کہ اگر صوبہ کے لوگ بغاوت کرنے پر آمادہ ہوتے تو کیا یہ قرین قیاس نہیں کہ پہلا کام جو وہ کرتے یہ ہوتا کہ ان ہتھیاروں پر قبضہ کرنے کی کوشش کرتے۔ کرنل جانسن نے جواب میں کہا کہ میں نے اپنی رائے دیدی لیکن آپ کا خیال بھی صحیح ہے۔ کئی موقعوں پر جہاں بلوے ہوئے شروع میں لوگوں کے پاس لاٹھیاں بھی موجود نہ تھیں۔ بعض انگریز گواہوں کی توجہ اس امر پر جب مبذول کرائی گئی تو اُنہوں نے جواب میں کہا کہ یہ بغاوت بھی مضحکہ خیز بغاوت تھی۔ سر مائیکل اوڈائر نے پنجاب کے فسادات کو بڑی سنگین سازش کا نتیجہ قرار دیا ہے اور اکثر حکام اور ذی مرتبہ افسروں میں بھی یہ وہم ابھی تک باقی ہے۔ کرنل اُبرائین ڈپٹی کمشنر گوجرانوالہ کی شہادت اس کے متعلق بہت کچھ معنی خیز ہے۔

سوال۔ آپ کے بیان کے مطابق اُس سازش کا مرکز پنجاب میں تھا لیکن گوجرانوالہ سے باہر؟

جواب۔ میں یہ نہیں کہہ سکتا۔ صرف یہ کہہ سکتا ہوں کہ گوجرانوالہ کے باہر تھا۔

سوال۔ پنجاب میں تھا کہ پنجاب کے باہر؟

جواب۔ میں یہ نہیں بتا سکتا۔

سوال ۔ آپ یہ نہیں بتا سکتے کہ سازش کا مرکز کہاں تھا۔

جواب ۔ نہیں یا مجھ کو کوئی اطلاع نہیں ۔

سوال ۔ آپ یہ بھی نہیں بتا سکتے کہ آیا سازش کا مرکز کوئی تھا بھی کہ نہیں ۔

جواب ۔ میں نہیں بتا سکتا ۔

سوال ۔ جب آپ کو اس سازش کے متعلق کچھ معلوم ہی نہ تھا تو پھر آپ نے اس کا ذکر کیوں کیا؟

جواب ۔ میں نے ایسا خیال کیا تھا ۔

سوال ۔ آپ نے بلا کسی شہادت کے اور بلا کسی تحقیقات کے یہ فرض کر لیا کہ کوئی گہری سازش کی گئی ہے ۔

جواب ۔ مجھے اپنے ضلع کے باہر کے فرداً فرداً معاملات سے واقفیت حاصل کرنے کی ضرورت نہیں ۔

سوال ۔ آپ نے ایک بیان پیش کیا ۔ آپ کے بیان کی کچھ بنا ہونی چاہیے ۔

جواب ۔ میں جرح کے لیئے تیار نہ تھا ۔ میرا خیال نہ تھا کہ مجھ سے جرح کی جائے گی ۔

سوال ۔ لہٰذا آپ نے سمجھا کہ کچھ مضائقہ نہیں جو جی میں آئے کہدینا چاہیے ۔

جواب ۔ پنجاب گورنمنٹ نے مجھے اپنی رائے ظاہر کرنے کے لئے کہا تھا اور میں نے اپنی رائے ظاہر کر دی ۔

یہ یا اسی قسم کی اور شہادت ہے کہ جس کی بنا پر سر مائیکل اوڈائر دعوی کرتے ہیں کہ پنجاب کے فسادات کی تہ میں بڑی سنگین سازش تھی اور ہنٹر کمیٹی کی میجورٹی رپورٹ میں پنجاب کے فسادات کو "علانیہ بغاوت" قرار دیا گیا ہے ۔

تیسرا سوال مارشل لا کے جاری کرنے کا ہے ۔ ہنٹر کمیٹی کی میجورٹی رپورٹ میں اسکو واجب اور جائز قرار دیا گیا ہے لیکن مائنورٹی رپورٹ میں نہایت لاجواب دلائل سے سر مائیکل اوڈائر اور ہنٹر کمیٹی کے اسباب و وجوہ اور فیصلہ کی تردید کر کے یہ ثابت کیا گیا ہے کہ مارشل لا کے جاری کرنے کی قطعی ضرورت نہ تھی ۔

ڈائسی ، سر جیمس میکنوش ، سر جیمس سٹیفن کے سے پایہ کے مقنن اس پر متفق الرائے ہیں کہ "مارشل لا صرف اشد ضرورت کی حالت میں جاری ہونا چاہیئے یعنی ایسی حالت میں

کر آیا جب ملک پر غنیم حملہ کر رہا ہو یا سنگین بغاوت برپا ہو اور حکومت وقت بے قابو ہوگئی ہو۔ عدالتیں نہ اجلاس کر سکتی ہوں اور نہ اُن کا کام جاری رہ سکتا ہو۔ اگر یہ صورت نہیں تو مارشل لا کا محض رعیت کو تادیب دینے یا سبق سکھانے کے لئے جاری کرنا قطعی ناواجب بلکہ ظلم ہے"۔ پنجاب میں صورت حال کیا تھی۔ امرتسر میں ۱۰ اپریل کو، قصور میں ۱۲ اپریل کو اور گوجرانوالہ میں ۱۴ اپریل کو سنگین بلوے ہوئے لیکن ان بلووں کے فوراً ہی دوسرے روز حکومت وقت نے پھر اپنا قابو جما لیا اور امن وامان قائم ہوگیا۔ لاہور میں جہانتک کر بلوائیوں کا تعلق تھا کسی قسم کا کوئی نقصان جان و مال کبھی نہ ہوا۔ گجرات اور لائل پور میں کبھی کوئی فساد برپا نہ ہوا۔ حتیٰ کہ جس وقت گجرات میں مارشل لا جاری کرنے کا حکم پہونچا تو حاکم ضلع نے یہ خیال کر کے غالباً اس کا تعلق گجرات کاٹھیاوار سے ہے مارشل لا جاری کرنے میں توقف کیا اور صریحاً احکام صادر ہونے پر بھی لوکل گورنمنٹ کو اطلاع دی کہ اس ضلع میں مارشل لا کی قطعی ضرورت نہیں۔ تاہم امرتسر اور لاہور میں ۱۵ اپریل کو گوجرانوالہ میں ۱۶ کو اور گجرات اور لائل پور میں ۱۹ اور ۲۴ اپریل کو مارشل لا جاری کیا گیا۔ ہنٹر کمیٹی کے روبرو جو شہادتیں حکام ضلع کی گذری ہیں ان میں سے بالخصوص مسٹر کچن کمشنر لاہور کی شہادت صاف صاف کہہ رہی ہے کہ مارشل لا امن وامان قائم کرنے کے لئے نہیں جاری کیا گیا تھا۔ امن وامان تو قائم ہو چکا تھا۔ مارشل لا اِس کی وجہ سے جاری کیا گیا تھا کہ شر و فساد کی آگ اور اضلاع میں بھی نہ بھڑکے۔ جن لوگوں کو گرفتار کیا گیا تھا ان کو بآسانی و سرعت سزائیں دی جاسکیں اور رعایا کو آئندہ کے لئے سبق دیا جائے کہ مارشل لا کا مزہ چکھنے کے بعد پھر وہ کبھی سر نہ اٹھا سکے۔ سر مائیکل اوڈائر نے مارشل لا جاری کرنے کے جو وجوہ بتلائے ہیں ان میں یہ وجوہ بھی شامل ہیں کہ نارتھ ویسٹرن ریلوے پر اسٹرائک ہو جانے کا اندیشہ تھا۔ شرائط صلح کی وجہ سے مسلمانوں میں ہیجان تھا۔ گرانی اشیا کی وجہ سے رعایا میں پریشانی تھی فوج کے صدہا سپاہی ولایت سے واپس شدہ بیکار تھے۔ اور امریکہ کے واپس شدہ سکھوں نے ایک زمانہ گذرا کہ غدر یا رنج میں شریک ہو کر حکومت پنجاب کو دق کیا تھا۔ جہاں تک کہ آخر الذکر امور کا تعلق ہے یہ امر قابل لحاظ ہے کہ سر مائیکل اوڈائر نے ان سکھوں کو نظر بند

رکھنے کے بعد رہا کر دینا مناسب سمجھا تھا اور پچھلے تین سال میں صاحب موصوف پنجاب کی وفاداری اور خدمت گذاری کی ثنا و صفت میں کئی مرتبہ رطب اللسان ہو چکے تھے لیکن پنجاب کے اِن فسادات نے غالباً اُن کے ہوش و حواس بجا نہ رکھے اور انہوں نے خود اپنے دعووں کو اس وقت پس پشت ڈالنا مناسب سمجھا۔ یہ وجوہ ہیں کہ جن کی بنا پر پنجاب میں مارشل لا جاری کیا گیا تھا۔ واضح رہے کہ دوران شہادت میں رجسٹرار ہائیکورٹ نے اس امر کا اقبال کیا کہ پنجاب ہائیکورٹ کا کام کبھی ایک دن کے لئے بھی نہ رکا اور عدالتیں برابر اپنا کام کرتی رہیں۔ بایں ہمہ ہنٹر کمیٹی کی میجورٹی رپورٹ کا فیصلہ ہے کہ مارشل لا کی ضرورت تھی اور حکومت پنجاب اور حکومت نے جو کچھ کیا روا اور بجا تھا۔

مارشل لا اگر واقعی ہنٹر کمیٹی کی رائے میں پنجاب کے لئے ضروری اور لابدی تھا تو یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ انگریز ممبران ہنٹر کمیٹی نے بمبئی گورنمنٹ کی سرزنش کیوں نہ کی کہ انہوں نے گجرات میں مارشل لا جاری نہ کیا۔ صوبہ گجرات میں پنجاب سے کچھ کم بدعنوانیاں نہ اٹھی تھیں۔ وہاں بھی بلوائیوں نے ستم ڈھائے تھے کہ جیسے پنجاب میں۔ لیکن حکومت بمبئی نے بلا مارشل لا کی امداد کے ان کو دو روز میں فرو کر دیا۔ مارشل لا کے پردے میں جو جور و ظلم رعایائے پنجاب پر سر مائیکل اوڈوائر نے ڈھایا اُس کی داستان نہایت طویل و دردناک ہے اور غالباً ہندوستان کا بچہ بچہ اس وقت اس کے ہر لفظ سے واقف ہے۔ نہ اس کے دہرانے کی ضرورت اور نہ یہاں گنجائش ہے تاہم اِس پُرآشوب زمانہ کے سبب سے دردناک سانحہ یعنی جلیانوالہ باغ کے قتل عام کا تذکرہ چند الفاظ میں ضروری معلوم ہوتا ہے۔

جنرل ڈائر نے ۱۲ اپریل کی شب کو امرتسر کا چارج لے کر ۱۳ کی صبح ایک اعلان بعض حصص شہر میں اس امر کا شایع کیا کہ شہر والے کسی قسم کے مجمع یا جلسہ میں جمع نہ ہوں۔ لیکن ۱۳ کی دوپہر کو جب جنرل مذکور کو یہ خبر معلوم ہوئی کہ اسی شام کو جلیانوالہ باغ میں ایک جلسہ ہونے والا ہے تو آپ نے ارادہ کر لیا کہ اس کو قتل و خون سے منتشر کیا جائے۔ چنانچہ آپ ایک دستہ فوج دو مسلح کار کہ جو ممنزلہ توپخانہ کے ہوتے ہیں لے کر جلیانوالہ باغ پہونچے اور داخل ہوتے ہی نصف منٹ کے وقفہ سے گولی چلانی شروع کر دی۔ آپ نے اپنی شہادت

میں اس امر کا اعتراف کیا ہے کہ آپ مسلم ارادہ کر کے گئے تھے کہ گولی چلائیں گے۔ آپ نے مجمع کو کسی قسم کی اطلاع یا آگاہی اپنے ارادے کی نہ دی۔ باوصف اس کے کہ مجمع بدحواس ہو کر منتشر ہونے لگا لیکن آپ اس وقت تک برابر گولی چلاتے رہے کہ جب تک آپ کے پاس گولی چلانے کا سامان باقی نہ رہا۔ نشانہ اُسی جگہ لگایا جاتا تھا کہ مجمع کثیر جہاں معلوم ہوتا تھا۔ آپ کو اس امر کا افسوس رہا کہ آپ اپنے مسلح کار کام میں نہ لاسکے کیونکہ راستے کے تنگ ہونے کی وجہ سے آپ کے سامان کو باغ کی چہار دیواری میں لے جانا غیر ممکن تھا۔ آپ نے اس امر کا اقبال کیا ہے کہ اگر آپ کے پاس سامان زیادہ ہوتا تو آپ گولی چلاتی اور زیادہ دیر تک جاری رکھتے۔ آپ نے یہ بھی فرمایا ہے کہ اگر آپ چاہتے تو بلا کشت و خون کے اس مجمع کو منتشر کر دیتے لیکن آپ کا مقصد اس قتل عام سے اہل پنجاب کے دلوں کو دہلانا اور ان کے عزور ہمت کا توڑنا تھا لہذا آپ نے ضروری سمجھا کہ چند ہزار ہندوستانیوں کو مجروح و قتل کیا جائے۔ جنرل ڈائر اس بات کا اعتراف بھی کرتے ہیں کہ اس مجمع میں اکثر لوگ ایسے ہوں گے کہ جنہوں نے اُن کے اعلان کو نہ سنا ہوگا اور آپ نے یہ بھی بچشم خود دیکھا کہ کافی تعداد اس مجمع میں ایسے دیہاتیوں کی بھی تھی کہ جن کا تعلق امرتسر سے کچھ نہ تھا اور جو صرف بیساکھی میلے میں شریک ہونے کی غرض سے آئے تھے۔ مقتولین و مجروحین کو تڑپتا چھوڑ کر جنرل ڈائر جلیانوالہ باغ سے واپس آئے اور پھر کبھی خبر بھی نہ لی کہ مرنے والوں اور جینے والوں کا کیا حال ہوا۔ کیونکہ آپ کی رائے میں آپ کو اس سے کچھ غرض تھی اور نہ یہ آپ کا فرض تھا۔ یہ سب کچھ اقبال و اقرار تو جنرل ڈائر نے ہنٹر کمیٹی کے روبرو کیا لیکن ولایت پہونچ کر صاحب موصوف اب اہل انگلستان کو یہ سمجھاتے ہیں کہ ان کے سامنے ایک کثیر التعداد باغی فوج تھی کہ جس کا مقابلہ آسان نہ تھا۔ اگر وہ اس وقت مستعدی سے کام نہ لیتے تو ہندوستان برطانیہ کے ہاتھ سے نکل جاتا۔ واقعات پر یہ حاشیہ جواب چڑھایا جا رہا ہے یہ غالباً سر مائیکل اوڈائر کے مشورے سے کیونکہ سر مائیکل اوڈائر یہ تہیہ اول روز سے کر چکے ہیں تاکہ اہل برطانیہ مغالطے میں پڑ کر آپ کے حامی و طرفدار بن جائیں۔ ہم کو نہیں معلوم کہ دہلی کا قتل عام کہ جو نادر شاہ کے حکم سے ہوا تھا اور وہ مظالم

کہ جو جرمنی نے بلجیم و فرانس میں ڈھائے جلیانوالہ باغ کے قتل عام سے زیادہ سنگین یا ہیبتناک تھے۔ بالغرض اگر وہ اس سے بھی زیادہ وحشیانہ اور سفاکانہ تھے تو ان کی معذرت میں کہا جاسکتا ہے کہ وہ ایک حملہ آور غنیم نے مفتوح ملک میں فوجی ضروریات کے لحاظ سے برپا کیے تھے لیکن جلیانوالہ باغ کے قتل عام میں ملک معظم کی اُس رعایا کا بے گناہ خون بہایا گیا کہ جس نے برطانوی عہد حکومت کی ۱۵۰ سال کی زندگی میں بارہا اپنی وفاداری اور جانبازی کا ثبوت اپنا جان و مال نچھاور کر کے دیا تھا۔ ہمیں شرم اور افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ اس وحشیانہ ظلم کی ہنٹر کمیٹی نے دبی زبان سے ہی شکایت کی ہے اور حتی المقدور جنرل ڈائر کو بچایا ہے لیکن چونکہ جنرل ڈائر نے خود اپنی زبان سے ہاتھ کاٹ دیے تھے۔ ہنٹر کمیٹی کے انگریز ممبر پوری طرح سینہ سپر نہ ہو سکے۔ اگر ہندوستانی ممبران کمیٹی نے اپنا فرض ایمانداری اور جرأت سے ادا نہ کیا ہوتا تو جنرل ڈائر اس معمولی لعنت و ملامت سے بھی بچ جاتے کہ جو وزیر ہند اور برطانوی حکومت نے اُن کی کی ہے۔ ہم کو اعتراف ہے کہ مسٹر مانٹیگو نے اُس مراسلے میں کہ جس میں انہوں نے برطانوی حکومت کا فیصلہ ہنٹر رپورٹ پر صادر کیا ہے کافی انصاف پسندی اور صاف گوئی سے کام لیا ہے اور جہاں تک کہ جنرل ڈائر کی شرمناک حرکات کا تعلق ہے یا مارشل لا کی زیادتیوں کا تذکرہ ہے انہوں نے نفریں و ملامت کرنے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا ہے اور آیندہ کے لیے حکومت ہند کو صاف صاف الفاظ میں ہدایت کی ہے کہ اگر پھر کبھی مارشل لا کی نوبت آئے تو ایسی وحشیانہ حرکات ظہور میں نہ آئیں۔ اس تحریر کا اگر کوئی مقصد اور اس کے اگر کوئی معنی ہو سکتے ہیں تو صرف یہی کہ مسٹر مانٹیگو اور برطانوی حکومت ہندوستانیوں پر یہ واضح کیا چاہتے اور ان کو یہ یقین دلایا چاہتے ہیں۔ کہ انگریزی عمال حکومت کے جور و ستم سے تنگ آکر اگر وہ اپنی فریاد دربار برطانیہ تک بھی پہنچائیں گے تو ان کی فریاد سنی جائیگی اور ان کے ساتھ انصاف کیا جائے گا۔ اسی کے ساتھ اس تحریر کے یہ معنی بھی ہیں کہ برطانوی حکومت اپنے ماتحت عمال حکومت کو تنبیہ کرنا چاہتی ہے کہ آیندہ سے وہ ایسی زیادتیوں کے متحمل نہ ہوں گے۔ سوال یہ ہے کہ کیا برطانوی حکومت کے اس طرز عمل سے ہندوستانیوں کو تشفی ہوئی اور سرکار ہند کی آنکھیں کھلیں؟ ہرگز نہیں۔ ہندوستانیوں کی تشفی اُسی حالت میں ہو سکتی ہے کہ جب ان کے ساتھ انصاف برتا جائے اور ان کو اس امر کا یقین ہو جائے کہ اُن کے ساتھ انصاف برتا جا رہا ہے۔ گورنمنٹ

جنرل ڈائر اور مارشل لا کی زیادتیوں اور شرمناک حرکتوں کو تسلیم کرتی ہے لیکن جنرل ڈائر کو سزا صرف اس قدر دیتی ہے کہ ان کو سرکاری عہدے سے برخاست کر دیتی ہے اور بس۔ مارشل لا کی شرمناک حرکتیں قابل الزام ٹھہرائی جاتی ہیں۔ لیکن جو شخص کہ ان تمام شرمناک مظالم کا ذمہ دار تھا اس کو قابل تعریف کارگذاری کی سند دی جاتی ہے اور لارڈ چیمسفورڈ میں اعتماد ظاہر کیا جاتا ہے۔ کیا یہی انصاف ہے؟ کیا اس سے ہندوستانیوں کی کچھ تشفی و تسکین ہو سکتی ہے؟ کیا ان لوگوں کو کہ جو ان تمام مظالم کے ذمہ دار ہیں برطانوی حکومت کے اس طرز عمل سے کچھ تنبیہ ہو سکتی ہے؟ کیا ان دل لبھانے والے الفاظ اور پالیسی کی طرز عمل سے کوئی نتیجہ نکل سکتا ہے؟ ہماری رائے میں تو یہ ایک ایسا معمہ ہے کہ جس کا حل آسان نہیں اور جو موجودہ صورت معاملات کو ذرہ بھر بھی بہتر یا اطمینان بخش نہیں بنا سکتا۔ یہ ہے برٹش گورنمنٹ کا ضرب المثل انصاف! اور اس پر طرہ فلسفیانہ مشورہ کہ گذشتہ را صلواۃ آئندہ را احتیاط! بے شک فلسفہ اچھا ہے لیکن انسانی فطرت اس سے مختلف ہے۔

(۵ جون ۱۹۲۰ء)

لاجپت رائے

پنجاب کی بدقسمتی پر چند منتشر خیالات

وائے بر حال پنجاب! تین مہینہ سے جب سے کہ پنجاب پر سر مائیکل اوڈوائر کے ظلم و ستم کی داستانیں اس دور از وطن افتادہ کے کانوں میں پڑنے لگیں، دن رات پنجاب کی تصویر آنکھوں کے سامنے پھرا کرتی ہے۔ اٹھتے بیٹھتے، سوتے جاگتے، چلتے پھرتے اُس بد نصیب سرزمین کا دھیان ہے نہ کھانے میں لطف ہے نہ پینے میں مزا۔ راگ رنگ کا تو مجھے کبھی بھی شوق نہ تھا لیکن غم غلط کرنے کے واسطے کبھی کبھی کھیل تماشہ میں چلا جاتا تھا وہ بھی دو ماہ سے قطعی بند ہے۔ نیند نہ آنے کا مرض مجھے سالوں سے ہے مگر ان گزشتہ مہینوں میں ہفتوں بلا نیند کے گذرے ہیں۔

گذشتہ چند سالوں سے مجھے پنجاب کی پبلک لائف کی طرف سے سخت بے اطمینانی رہی ہے۔ جو بیداری کہ گذشتہ چند ماہ سے یا قریباً ایک سال سے پنجاب کی پبلک لائف میں ظہور میں آئی اولین میں اپنے دل ہی دل میں خوش ہوتا تھا اور امید کرتا تھا کہ یہ تبدیلی مستقل ہو گی مگر افسوس کہ جو کچھ ظہور میں آیا وہ میرے وہم و خیال میں بھی نہ تھا۔ سر میکائل اوڈوائر نے جس دن سے پنجاب کی سرزمین پر قدم رکھا اُسی روز سے وہ اِس کوشش میں رہے کہ پنجاب میں آزاد خیالی اور آزادروی کا نشان بھی نہ رہے۔ پنجاب کی بدقسمتی سے سر چارلس ایچیسن کے بعد اُس کو یکے بعد دیگرے ایسے لفٹنٹ گورنر میسر آتے رہے ہیں جنہوں نے پنجاب کے پولٹیکل معاملات میں دیگر صوبوں سے پیچھے رکھنے کی لگاتار کوشش کی اور اس کوشش میں ہر قسم کی پولٹیکل آزادی کو بیخ و بُن سے اکھاڑ دیا۔ سر چارلس ریواز ایک معمولی درجہ کے حکمران تھے جن میں سول سروس کو قابو میں رکھنے کی قابلیت نہ تھی وہ اپنے ماتحت سویلین

افسروں کے ہاتھ میں کٹھ پتلی کی طرح تھے۔ ۱۹۰۷ء کا ہنگامہ اُن کی کم عقلی اور افسران ماتحت کی تنگ نظری کا نتیجہ تھا۔ اُس کی تہ میں سوائے چند نوجوانوں کے خون کا جوش کے اور کچھ نہ تھا۔ ان نوجوانوں کی کامیابی ان کی لیاقت یا ایثار نفسی یا پولیٹیکل تدبر کا نتیجہ نہ تھی اُسکا سبب وہ ناراضگی اور بے اطمینانی تھی جو کہ پنجاب کے زمینداروں میں پنجاب گورنمنٹ کولونائزیشن پالیسی سے پیدا ہوئی تھی۔ پنجاب کے سویلین حکام پنجاب کی پبلک اوپینین (رائے عامہ) کو ہمیشہ حقارت سے دیکھتے رہے ہیں۔ ہندو مسلمانوں کی نااتفاقی زمیندار جماعت کی بے علمی پنجاب کی رئیس جماعت کی غلامانہ روش نے اُن کو ہمیشہ جابرانہ حکومت پر اکسایا ہے حتی کہ اُن کی خود غرضانہ اور جابرانہ حکومت سے آہستہ آہستہ پنجاب کی زراعت پیشہ جماعت کے دلوں میں بھی برٹش حکومت کی طرف سے بدظنی پیدا ہو گئی ہے۔ ایک وقت تھا کہ پنجاب کی رعایا سر ہنری لارنس اور پنجاب کے زمانہ ابتدائی کے برٹش حکام کی رعایا پروری کو احسان اور شکرگذاری سے یاد کرتی تھی۔ برسوں تک اہل پنجاب انگریزی عملداری کو عہد سابق کی سکھا شاہی سے مقابلہ کرکے انگریزی حکومت کی مدح سرائی کرتے رہے۔ پنجابیوں کی وفاداری و بہادری نے انگریزی حکومت کو ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ میں بیخ کنی سے بچایا۔ اس کے بعد دنیا کے ہر حصہ میں پنجابیوں نے اپنی سینہ سپری سے انگریزی جھنڈے کا ساتھ دیا۔ اور مختلف طبقات دنیا کو انگریزی قوم کے لیے فتح کیا۔ لیکن جب ہم اس وفاداری اور سینہ سپری کا مقابلہ پنجاب کی موجودہ پولیٹیکل یا اقتصادی حالت سے کرتے ہیں تو ہم کو از حد مایوسی ہوتی ہے۔ انگریزی حکومت کا اہل پنجاب کی اقتصادی حالت پر کیا اثر ہوا ہے اُس کی کہانی مسٹر تھاربرن سابق فنانشیل کمشنر پنجاب نے اپنی تصنیف Panjab in peace & war میں بیان کی ہے۔ مسٹر تھاربرن کو بھی آزاد منش افسر نہ تھے ان کے خمیر میں رعونیت اور غرور از حد درجہ بھرے ہوئے تھے۔ وہ ہندو تعلیم یافتہ جماعت کو از حد نفرت و حقارت کی نظر دیکھتے رہے ہیں اپنے دور ملازمت میں انہوں نے ہمیشہ تعلیم یافتہ جماعت کے ساتھ حقارت کا سلوک کیا ہے۔ جمہوری خیالات کی بو بھی اُن کی سرشت میں نہیں ہے۔ وہ ہندوستان میں جمہوری طرز حکومت کے خیال کو بازیچہ طفلاں سے زیادہ وقعت نہیں دیتے۔ حالانکہ

انگلستان میں انہوں نے مانٹیگو چمسفورڈ اسکیم پر ایک مضمون پڑھا تھا جس میں ان ہر دو ممبروں کی اسکیم اور رائے کے بنیادی خیالات کا مضحکہ اڑایا تھا۔ تاہم اپنی تصنیف میں انہوں نے پنجاب کی زراعت پیشہ جماعت کی سیاسی و تمدنی حالت پر جو خیالات ظاہر کیے ہیں وہ بہت حد تک راستی سے مملو ہیں اور وہ بذات خود پنجاب میں انگریزی حکومت کی ناکامیابی کی زبردست شہادت دے رہے ہیں۔

میرا عقیدہ ہے کہ ہندوستانی پولیٹکل بدامنی کی بنیاد میں ہندوستان کی تمدنی بربادی ہے۔ ہندوستان کے پولیٹکل لیڈروں نے تاحال تمدنی بربادی پر کافی توجہ نہیں دی۔ جو کچھ لٹریچر اس وقت تک تمدنی بربادی کا رعایت کی تمدنی حالت زار یا مفلسی یا فاقہ کشی پر موجود ہے وہ انگریزی ملازمان یا افسران کی بہم پہونچائی ہوئی تھی۔ مسٹر دادا بھائی نوروزجی کی کتاب "انڈین پورٹی" Indian Poverty یا مسٹر ولیم ڈگبی کی کتاب Prosparous British India یا رمیش چندردت کی تمدنی تواریخ سب کی سب انگریزوں کی شہادتوں پر زیادہ تر سرکاری کاغذات کی شہادت پر مبنی ہیں۔ ہندوستانیوں نے سرکاری کاغذات سے باہر ایک بھی ایسی آزادانہ تحقیقات نہیں کی جسکو کوئی شخص بھر در سے اپنے دعویٰ کی تائید میں پیش کر سکے۔ سال بسال کانگریس میں یا انڈسٹریل کانفرنس میں ہم نے ملک کی اکانامک سروے کے حق میں رزولیوشن پاس کیے گئے مگر خود نمونہ کے طور پر بھی اس صیغہ میں کچھ نہ کیا۔ اگر ہم آزادانہ تحقیقات سے چند منفرد دیہات یا چند منفرد قصبات کی تمدنی حالت کی تحقیقات کر کے نتائج کو قلمبند کرتے تو شاید گورنمنٹ پر ہماری صدق دلی کا زیادہ اثر ہوتا۔ ہم نے ہندوستان کی غربت کے گیت گائے مگر اُن کی تائید میں ہندسوں یا واقعات کی شہادت پیش کرنے سے قاصر رہے۔ جن منصف مزاج انگریزوں نے ہمارے لئے ان گیتوں کا مصالحہ بہم پہنچایا اُن کے بیانات کو تقویت دینے کے لئے ہم نے کبھی پکے اور بے لاگ واقعات جمع نہ کیے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سرکاری رپورٹوں میں جو خوش حالی کی تصویر ملازمان ماتحت کی رپورٹوں پر کھینچی جاتی رہیں اُس کو افسران یا مدبران بالادست نے بلا تامل قبول کر لیا اور ہمارے مخالف لوگوں کو ہماری بدنیتی یا مفسدہ پردازی پر محمول کیا۔ خیر یہ تو جملہ معترضہ تھا۔ ہم کو افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ پنجاب کی تمدنی حالت ان صوبجات سے کہیں بدتر ہے جن کی

فوجی خدمات کا پنجاب کے ساتھ مقابلہ بھی نہیں ہوسکتا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ پنجاب کے انگریزی حکام نے پنجاب کی زراعت پیشہ جماعت کو ارادتاً بے علم رکھا۔ زبانی جمع خرچ تو انگریزوں نے زراعت پیشہ لوگوں کے حق میں بہت کچھ کیا مگر ان کو تعلیم دینے اور ان میں پولٹیکل اور ایکانامک قابلیت پیدا کرنے کی ذرا بھی کوشش نہیں کی گئی۔

پنجاب کے زمینداروں کو ساہوکاروں سے بچانے کی بہت لن ترانیاں کی گئیں، قانون انتقال آراضی بھی پاس کیا گیا لیکن اس تمام پالیسی کی بنیاد میں کم نظری، کوتاہ اندیشی اور خالی جنبہ داری کے سوائے اور کچھ بھی نہ تھا۔ ہندو مسلمانوں، زراعت پیشہ و ساہوکاروں میں حسد و بغض کی بنیادیں مزید اس قانون نے مضبوط کیں لیکن جمہور زراعت پیشہ کو ان قوانین سے کچھ فائدہ نہ ہوا۔ پنجاب کی زراعت پیشہ جماعت کی مالی حالت بعض اضلاع میں مزدوروں سے بھی بدتر ہے۔ چھوٹے چھوٹے قطعات آراضی کی کاشت سے سالانہ آمدنی غریب زمینداروں کو اتنی بھی نہیں ہوتی جتنی کہ ملوں میں کام کرنے والوں مزدوروں کو ہوتی ہے۔ نہر چناب و جہلم کی نوآبادیوں سے بھی زیادہ تر مالدار اور خوش حال حصہ کو فائدہ پہونچا۔ غریب کسانوں کو کچھ بھی فائدہ نہیں ہوا لیکن سب سے زیادہ قابل افسوس واقعہ اُن کی بے علمی کا ہے۔

اُدھر جب ہم تعلیم یافتہ جماعت کی طرف نگاہ ڈالتے ہیں تو ہمیں افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ سر چارلس ایچیسن کے زمانہ کے بعد تمام لفٹنٹ گورنران کو شبہہ کی نظر سے دیکھتے رہے۔ زراعت پیشہ کے ساتھ ہمدردی کی آڑ میں تعلیم یافتہ جماعت و متوسط درجہ کے شہری لوگوں کو طرح طرح سے ستایا گیا۔ مذہبی تفرقات کو مختلف تدبیروں سے اُکسایا گیا اور ہر طرح سے آزاد منشی اور راست بازی کو دبا کر اُس کی جگہ جھوٹی وفاداری کو بڑھایا گیا۔

ہم یہ کہنے سے باز نہیں رہ سکتے کہ پنجاب میں کم نظری کی اس پالیسی کی خاطر خواہ کامیابی کے لئے خاص اسباب تھے اور اُن میں پنجابی تعلیم یافتہ جماعت کی اخلاقی کم ہمتی ایک زبردست سبب تھا۔

ایک زمانہ تھا کہ زندہ دلان پنجاب اپنی حب الوطنی، قومی ہمدردی اور پبلک

فیاضی سے تمام ہند میں شہرۂ آفاق تھے۔ دیگر صوبجات کی تعلیم یافتہ جماعتیں پنجاب کی طرف بنظر تعریف اور حسد کی نظریں ڈالتی تھیں۔ پنجاب کو پبلک سپرٹ کی نظیر بتایا جاتا تھا۔ اگر پنجاب کی مالی حالت کے ساتھ پنجاب کی اُن پبلک تحریکوں (انسٹی ٹیوشن) کا مقابلہ کیا جائے جو پبلک چندوں سے چل رہی ہیں تو اُس میں کچھ کلام نہیں کہ پنجاب پبلک فیاضی و زندہ دلی کے لئے ہمارے ہندوستان میں اپنا نظیر نہیں رکھتا لیکن دوربین نظر سے جب دیکھا جائے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہی امر واقعی پنجاب کی پبلک لائف میں اخلاق کمزوری کا ایک زبردست باعث ثابت ہوا۔

پنجاب کی مختلف جماعتوں (آریہ سماج، خالصہ سماج، سناتن سبھا، انجمن اسلامیہ، دیو سماج، جماعت احمدیہ) نے پبلک انسٹی ٹیوشن قائم کرنے میں ایسی گھوڑ دوڑ قائم کی کہ یہ انسٹی ٹیوشن آخر میں اُن کے گلے کا ہار ہو گئے۔ "تلے رو شنگ طبیع تو رمن بلا شدی" والا معاملہ ہو گیا۔ ہر ایک جماعت نے اپنے انسٹی ٹیوشنوں کو اپنا کعبہ بنا لیا۔ جس ملک اور جس قوم کی خدمت کے لئے یہ انسٹی ٹیوشن قائم کیے گئے تھے اُس کے مجموعی نفع و نقصان کو ایک واحد جماعت یا انسٹی ٹیوشن کے نفع و نقصان پر قربان کیا گیا۔ آپس میں حسد و بغض و کینہ و مقابلہ کی آگ کو اس درجہ مشتعل کیا گیا کہ انگریزی حکام کو ان جماعتوں کو ایک دوسرے سے الگ رکھنے کے کافی موقعے ہاتھ آئے اور انہوں نے ان موقعوں سے خوب فائدہ اٹھایا۔ معمولی اوقات میں مقابلہ کی اس آگ نے پنجاب میں پولٹیکل تحریک کی بنیادوں کو جمنے نہ دیا۔ ہندو سبھا اور مسلم لیگ کے باہمی مقابلہ میں کانگریس اور انڈین ایسوسیشن کو کبھی تقویت نہ ملی۔ جو لوگ مقابلتاً پولٹیکل احساس کے مؤید تھے ان کو ہر طرح سے مرکز عتاب و عناد بنایا گیا۔ پبلک لائف میں خوشامد، چاپلوسی، چغل خوری، جاسوسی، مکاری، خود غرضی اور خود بینی نے اس قدر اپنا اثر جما لیا کہ پنجاب کی تعلیم یافتہ جماعت اس آگ میں جل کر خاکستر ہو گئی:

جان من خود کردہ خود کردہ را درمان چیست؟

ہم نے پنجاب کی بدقسمتی کے اسباب ڈھونڈھنے میں حکام وقت کی زیادتی

کو نظرانداز کر کے سب سے پہلے اپنے ہم وطنوں پر ہی نکتہ چینی اس لئے شروع کر دی ہے کہ ہماری رائے میں جو شخص اپنی اخلاقی کمزوری یا نااتفاقی سے کسی دوسرے شخص کو اپنے اوپر زیادتی کرنے کی اجازت دیتا ہے یا اس کو زیادتی کرنے کا موقع دیتا ہے یا زیادتی کرنے کے لئے اس کا حوصلہ بڑھاتا ہے وہ اس زیادتی کے لئے اسی قدر ذمہ دار ہے جس قدر زیادتی کرنے والا۔ سر میکائل اوڈوائر کو پنجاب پر ظلم و ستم کرنے کا حوصلہ نہ ہوتا اگر ان کو اس امر کا یقین نہ ہوتا کہ پنجاب کی پبلک لائف اس قدر بوسیدہ ہے کہ اس پر جس قدر زیادتی کیجائے وہ تھوڑی ہے۔ ۱۹۰۷ء میں اور اس کے بعد ۱۹۱۰ء میں اور اس کے بعد ۱۹۱۴ء میں اگر پنجاب کی تعلیم یافتہ جماعت اپنے بودے پن کا ثبوت نہ دیتی تو آج ان کو وہ دن دیکھنا نصیب نہ ہوتا جس پر آج چاروں طرف سے آہ و زاری ہو رہی ہے۔ ہماری اس مصیبت کے ذمہ دار وہ کم اندیش لیڈر ہیں جنہوں نے اپنے ذاتی اغراض کو پیش نظر رکھ کر اول ہندو مسلمانوں میں نااتفاقی کا بیج بویا اور پھر ہندوؤں میں رئیس جماعت کے نقش قدم پر چل کر اپنی آزادی کو خاک میں ملا دیا۔

پنجاب میں جو اقتصادی تہلکہ ۱۹۱۲ء میں وقوع میں آیا اس کی تہ میں بھی یہی نااتفاقی تھی۔ اسی سال جو بجلی کہ ہمارے خرمن امید پر پنجاب کی سرزمین میں پڑی اس کی بنیاد میں بھی وہی نااتفاقی ہے۔

میری اس نکتہ چینی کے یہ معنی نہیں کہ میں گورنمنٹ پنجاب کو بری الذمہ سمجھتا ہوں۔ نہیں ہرگز نہیں! پنجاب میں جو کچھ ہوا (ابھی تک پورے صحیح صحیح واقعات اکٹھے نہیں ہوئے) وہ سر میکائل کے جابرانہ تحکم کا نتیجہ ہے۔ سر میکائل پنجاب کو باقی ہندوستان کی پبلک لائف سے علیحدہ رکھنا چاہتے تھے جن لیڈروں نے اس کے خلاف کوشش کی ان پر ان کا خاص عتاب نازل ہوا۔ قدرت نے ان کو ایسی جابرانہ انتقام و حسد و بغض و کینہ کی بھری ہوئی نیچر دی تھی کہ وہ پنجاب کی بیداری برداشت نہ کر سکے اور انہوں نے پنجاب کے لیڈر سان کی ذات میں تمام اہل پنجاب کو ایسا نیچا دکھایا کہ جس سے وہ ہمیشہ کے لئے پنجاب میں پبلک لائف کی بیخ کنی کے درپے ہو گئے مگر سر میکائل اوڈوائر ایک دور اندیش شخص

ہوتے تو وہ یہ سمجھتے کہ بدظنی اور ناراضگی عامہ کو اگر باضابطہ اور باقاعدہ اظہار و انکشاف کا موقع نہ دیا جائے گا تو وہ مواد کی شکل میں تبدیل ہو کر سارے سوشیل و پولیٹیکل سسٹم کو زہر آلودہ کر دے گی اور اگر گورنمنٹ پنجاب اپنی پالیسی کو تبدیل نہ کرے گی تو دس سال آئندہ میں نہ معلوم پنجاب میں کیا گذرے۔

۱۹۰۷ء کا ایجیٹیشن بالکل باقاعدہ اور باضابطہ تھا اگر اُس کو جبر و ستم سے دبایا نہ جاتا تو وہ ایکٹ آبادی ہارے کی منسوخی پر خود بخود ختم ہو جاتا۔ لیکن اُس موقع پر بھی جن لوگوں کو اس ایجیٹیشن کی وجہ سے مورد عتاب کیا گیا اُن پر ایسی سختی کی گئی کہ باقاعدہ پولیٹیکل تحریک کی بیخ کنی ہو گئی۔ علانیہ پولیٹیکل ایجیٹیشن کے بند ہو جانے سے خفیہ تحریک کو تقویت ہوئی۔ خفیہ تحریک کے ذمہ دار پنجاب کے پولیٹیکل لیڈر ہی نہیں بلکہ وہ کوتاہ اندیش حکام بھی ہیں جنہوں نے اپنی جابرانہ و بے رحمانہ پالیسی سے نوجوانان پنجاب کے دلوں میں انتقام و غصہ کی آگ بھڑکائی۔ اُس وقت بھی پنجاب کے لیڈران نے گورنمنٹ کے دباؤ سے اپنی پالیسی کو وفادارانہ لباس پہنانے کی غرض سے بہت سی بیہودہ حرکتیں کی ہیں اور اب بھی ہم دیکھتے ہیں کہ ڈاکٹر ایونگ کی رہنمائی میں پنجاب کے تعلیمی افسر اُسی قسم کی پالیسی پر دلدادہ ہیں۔ پنجاب کی حالت کبھی رو بصحت نہ ہو گی جب تک پنجاب گورنمنٹ پنجاب میں علانیہ پولیٹیکل تحریک کو دبانے سے باز نہ رہے گی اور جب تک پنجاب کے تعلیمی و مذہبی لیڈر اخلاقی دلیری سے کام نہ لیں گے۔ یاد رکھنا چاہیے کہ انسٹی ٹیوشن قومی بہتری و اخلاق پھیلانے کے ذریعے ہیں۔ قوم اُن کے لئے نہیں ہے وہ قوم کے لئے ہیں جو انسٹی ٹیوشن قوم میں اخلاقی کمزوری و مکاری و بزدلی پھیلانے کے سامان ہیں وہ قوم کے حق میں و نیز انجام کار گورنمنٹ کے حق میں زہر قاتل ہیں۔ قوم کو لکھے پڑھے اصحاب کی ضرورت ہے مگر قوم کو لکھے پڑھے ہوئے غلاموں سے کچھ فائدہ نہیں پہونچ سکتا۔ احتیاط، نکتہ چینی، مصلحت وقت، وفاداری ان سب باتوں کی ایک حد ہے۔ جب وہ اس حد سے تجاوز کرتی ہیں تو سارے سسٹم میں زہر پھیلانے کا باعث ہو جاتی ہیں۔ ہمارے لیڈروں کو سمجھنا چاہیے کہ قومی بیمار کو ایسے طبیب کی ضرورت ہے جو سسٹم سے بیماری کا زہر نکال ڈالے۔ جو طبیب ایک بیماری کے علاج میں دوسری بیماری کا باعث بنتا ہے وہ طبیب نادان و کوتاہ اندیش ہے۔ تعلیم اخلاق

کا سرچشمہ ہے۔ اخلاق دلیری وسچائی وایثار نفسی کا نام ہے۔ جو تعلیم ہم کو دلیری وایثار نفسی نہیں سکھلاتی وہ ہماری نجات وبہتری کا موجب نہیں ہو سکتی

(۱ اکتوبر ۱۹۱۹ء)

صبح امید کے ایڈیٹر کا نوٹ مضمون اور مضمون نگار کے بارے میں:۔

لالہ لاجپت رائے

عرصہ دراز سے لالہ لاجپت رائے صاحب اپنے وطن سے دور امریکہ میں مقیم ہیں گو کہ ہندوستان کی سرزمین آپ کی آنکھوں سے دور ہے، مگر دل سے دور نہیں ہے۔ ہندوستان کے قومی اور پولیٹکل مسائل پر جو مضامین آپ نے مسلسل تحریر کیے ہیں اُن سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کا دماغ امریکہ کے گوشۂ تنہائی میں اپنے وطن کی خدمت کے لئے وقف ہے۔ اس ماہ کے "صبح امید" میں آپ کے قلم سے نکلا ہوا ایک مضمون شائع کیا جاتا ہے۔ اس مضمون میں جس مدبرانہ دور اندیشی کا اظہار کیا گیا ہے وہ ہماری ستائش کا محتاج نہیں ہے۔ لالہ لاجپت رائے کے دامن کے سایہ میں پنجاب کی قومی زندگی نے پرورش پائی ہے اور آپ کے ایثار نفس اور وطن پرستی کا سکہ تمام ہندوستان کے دل پر جاری ہے۔ ہمیں امید ہے کہ اہل پنجاب آپ کی نصیحت سے کافی فائدہ اٹھائیں گے اور قومی زندگی کی بنیاد پختہ کرنے میں دل وجان سے ساعی ہوں گے۔

(بذیل رفتار قوم: اکتوبر ۱۹۱۹ء)

●●

رشی ازمان سرودر

پرانا دکھڑا

تاج تھا اور سردیوں کی رات۔ چندرماں کی بڑھتی کلا دن کے آگے آسمان پر تاروں کا رنگ فق اور ہوائیاں سی اُڑ رہی تھیں۔ چمن میں چاندنی ہزار انداز سے نکھری ہوئی اتراہٹ کے مارے پھولی نہ سماتی تھی۔ آکاش سے امرت برس رہا تھا۔ رات کچھ کچھ بھیگ چلی تھی۔ سبزہ خوابیدہ اور اس کے پاسبان دم بخود کھڑے تھے۔ نرگس کی آنکھیں جھپکی جاتیں اور سوسن بھی چپ سادھے ہوئے تھی۔ البتہ کبھی کبھی کوئی ہوا کا جھونکا بھولا بھٹکا آجاتا تو قدرت کو اس عالم محویت میں دیکھ کر وہ بھی دبے پاؤں چپکے سے نکل جاتا۔ غرضکہ عجیب دلفریب سماں تھا لیکن جذبوں کی تاثیر بھی انوکھی ہوتی ہے۔ چاندنی رات کی شیتل تا اور تاج کا نکھار بجائے اس کے کہ سکون اور تسلی کا باعث ہوتا، سروجنی اور کیلاش کی بے چین طبیعتوں پر اور تازیانہ کا کام کر رہا تھا۔ یوں تو سروجنی لب خموش لاپرواہی کے انداز سے کرسی پر بیٹھی ظاہرا جھیلوں کا تماشہ دیکھ رہی تھی اور کیلاش کا اُسکے پہلو میں کُرسی کے سرے پر ہاتھ ٹیکے ہوئے کھڑے رہنا گویا اُس کے بہادینی بھی نہ تھا لیکن دل تھا کہ ماہی بے آب کی طرح مضطرب اور بلیوں اچھل رہا۔ وہ چاہتی تھی کہ کسی بہانے سے باتوں کا سلسلہ چھیڑے لیکن پھر کچھ سوچ کر منتظر رہ جاتی۔ چند لمحے اسی خاموشی کی کیفیت میں گذرے۔ آخر کیلاش سے نہ رہا گیا وہ کسیقدر جھکا۔ سروجنی کو مخاطب کر کے اس نے اپنی ارمان بھری نگاہ اُس پر ڈالی اور اپنے دونوں ہاتھ آہستہ سے اس کے شانوں پر رکھدیے وہ چاہتا تھا کہ اپنے جوش محبت کا پیام اس تک اس طرح پہونچائے کہ بس لبوں کو جنبش ہو اور بدن کی رگ رگ میں بجلی دوڑ جاوے۔ لیکن نہ زبان افشائے راز کی مجرم ٹھہرے، اور نہ اپنا دکھڑا ہی کسی کے کانوں پر گراں بار گذرے۔ سروجنی اس کے منشاء و مطلب کو سمجھی۔ کچھ شرمائی کچھ جھجکی اور اس سوال کو ایک ادا سے ٹال گئی۔ لیکن کیلاش کی پیشانی پر شکن پڑتے دیکھ کر وہ کرسی

سے اٹھی، مسکرائی اور کیلاش کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر بولی کہ چلیے بس مذاق ہو چکا۔ بھائی آپ کا انتظار کرتے ہوں گے اور ادھر جمنا کنارے چاندنی کا لطف بھی ہوگا۔

کیلاش۔ کیوں صاحب آخر یہ دوری کا برتاؤ کب تک رہے گا۔

سروجنی۔ کیسی دوری، کیسا برتاؤ، میں تو کچھ نہیں۔

کیلاش۔ آپ نے اگر نہ سمجھنے کی قسم کھائی ہے تو مجبوری ہے۔ خیر جانے دیجیے۔

سروجنی۔ خوب صاحب۔ بگڑنے کی کوئی بات بھی ہو۔ اچھا انصاف ہے۔ مصرعہ

آپ ہی ظلم کریں آپ ہی شکوہ اٹھا

کیلاش۔ خیر میرے اُس سوال کا کیا جواب ہے کہ جو میں نے آپ سے پرسوں کیا تھا۔

سروجنی۔ سوال کا جواب تو اس قدر ظاہر تھا کہ نہ آپ کو سوال کرنے کی حاجت نہ مجھے جواب دینے کی ضرورت تھی۔

کیلاش۔ یعنی۔

سروجنی۔ جیسے ان ہونی بات کا ہونا۔

کیلاش۔ ایسی پر محبت کا دعویٰ اور جذبۂ شوق کا اظہار۔

سروجنی۔ میں نے یہ دعویٰ کب کیا اور آپ کو تو میری جانب سے اظہار محبت کی ہمیشہ شکایت ہی رہی اور بالفرض محال (مسکراکر) آپ کے دل خوش کرنے کے لئے میں چند منٹ کے لئے یہ بھی مان لوں کہ مجھے آپ سے محبت ہے تو میرے اوپر یہ پابندی کس طرح لازم آتی ہے کہ آپ کی جا و بے جا ہر خواہش کے آگے سر تسلیم خم کر دوں۔

کیلاش۔ تو کیا طبیعت کے اُس تعلق کے ہوتے ہوئے کہ جو ہم میں اور تم میں ہے اور جس پر مجھے اور تمہیں دونوں کو شرمانے کی وجہ نہیں۔ تم واقعی خیال کرتی ہو کہ میری یہ خواہش کہ ہم تم اپنی زندگی ایک ساتھ بسر کر سکیں ایسی بے جا خواہش ہے کہ جو نہ پوری ہو سکتی ہے اور نہ تم جسے پورا کر سکتی ہو۔

سروجنی۔ میں نہیں چاہتی تھی کہ اس دو گھڑی کے لطف ملاقات کو پھانس کی، اُس کھٹک کو چھیڑ کر کہ جو میرے اور تمہارے دونوں کے لئے یکساں تکلیف دہ ہے تم کرکرا کرو۔

لیکن تم مصر ہو۔ لہذا مجھ پر واجب ہے کہ تمہارا اطمینان کر دوں۔ سنو! - اپنا سوال کرتے وقت تم نے دو باتوں کو قطعی بھلا دیا۔ اوّل یہ کہ میں عورت ہوں اور دوسرے یہ کہ میری شادی ہو گئی ہے۔ ہماری قوم اور ہمارے ملک میں عورت کے معنی ہیں کہ نہ اُس کی کوئی ہستی ہو نہ بجز اس کے کوئی مقدر کہ جو ماں باپ اور اُس کے شوہر نے اپنے قلم سے اُس کی پیشانی پر لکھ دیا ہو اور ہمارے رواج و قانون کی مہر بھی اُس نوشتہ پر ثبت ہو۔ ہماری مثال کمہار کے ان کھلونوں کی سی ہے کہ جو وہ اپنی مرضی اور خوشی سے بناتا ہے اور بگاڑتا ہے۔ تم کس طرح سے امید کر سکتے ہو کہ یہ مٹی کے کھلونے اپنے بننے سنورنے، بگڑنے اور مٹنے کا فیصلہ از خود کر سکیں گے یا کمہار کے ہاتھ میں رہ کر اور وہ چلنے لگیں تو وہ ان کو توڑ نہ ڈالے گا۔ بالفرض محال اگر کسی معجزے سے ان مٹی کے کھلونوں میں حس و حرکت پیدا ہو جائے اور وہ اپنے بننے بگڑنے میں دخل دینے لگیں تو بتاؤ کہ انہیں پھر مٹی کا کھلونا کون کہے گا۔ اسی طرح اگر ہم عورتیں آج اپنے مقدر سے کسی طرح منحرف ہو بھی جائیں تو ہم عورتیں کہاں رہیں۔ اور میں تمہیں یاد دلا چکی ہوں کہ میں عورت ہوں پھر میری شادی بھی ہو گئی ہے، جس کی حقیقت اور اصلیت کچھ ہم عورتیں ہی سمجھتی ہیں۔ تمام دنیا میں شادی لوازمات زندگی میں سے ہے۔ یعنی جہاں زندگی بہترین طریقے سے گذارنے کے لئے اور بہت سی سبیلیں ہیں۔ وہاں ایک یہ بھی ہے لیکن ہمارے لئے یعنی ہماری قوم میں شادی کے معنی یہ ہیں کہ زندگی اِس مقدر کے پورا کرنے لئے ہمیں عطا کی گئی ہے۔ تم میرے اس کہنے کی اہمیت کا اندازہ کہ میری شادی ہو گئی ہے اُس وقت پورے طور سے کر سکو گے کہ جب تم لمحہ بھر کے لئے بھی یہ نہ بھولو کہ یہ مقدر وہ پتھر کی لکیر ہے کہ جو ایک مرتبہ کھنچنے کے بعد پھر تا بہ زندگی نہیں مٹائی جا سکتی۔ کیونکہ تمہارا قانون نہ طلاق کو روا رکھتا اور نہ دوسری شادی کی اجازت دیتا ہے۔ ایسی حالت میں سوچو کہ تمہارا سوال ان ہونی بات ہے کہ نہیں۔

کیلاش۔ کیا ہماری اور تمہاری محبت کی تاثیر ایسی بھی نہیں کہ جیسے یہ پتھر کی لکیر۔

سروجنی۔ کیسی بات کرتے ہو؟ محبت طبیعتوں کو بدل سکتی ہے، مزاجوں کو ہموار کر سکتی ہے، ہمارا چلن بنا اور بگاڑ سکتی ہے لیکن اس مقدر کو کیوں کر مٹا سکتی ہے۔

کیلاش۔ محبت اگر سچی ہے تو دنیا میں کوئی رکاوٹ اس کے راستہ میں ایسی نہیں ہو سکتی کہ جسے وہ ہٹا نہ سکے۔ ہمت درکار ہے۔

سروجنی۔ صرف ہمت؟

کیلاش۔ میرا دل تو یہی کہتا ہے۔

سروجنی۔ اس کی حقیقت امتحان کے وقت کھل جائے گی۔ جب تک منتظر رہو۔

جاڑے کے دن تھے۔ رات کے کوئی دو بجے ہوں گے۔ سروجنی غم و غصہ کی حالت میں تھوڑی دیر ہوئی ہو گی کہ سوئی تھی کہ پورٹیکو کی جانب برآمدے سے دروازہ کھٹکھٹانے کی اس زور سے آواز آئی کہ سروجنی دفعتاً سوتے سے چونک پڑی اور سہم سی گئی۔ لیکن دو ہی منٹ بعد جب پھر وہی شور ہوا تو اُس نے سومناتھ (شوہر) کی آواز پہچانی اور سمجھی کہ حضرت اب تشریف لائے ہیں۔ ایک لمحہ تو اُس نے یہ ارادہ کیا کہ کچھ پرواہ نہ کرے۔ ویسی بھی اس وقت سردی تھی، بستر چھوڑ کر باہر جانا آسان نہ تھا لیکن پھر کچھ سوچ کر اٹھی۔ کواڑ وسطے کرکے دروازے تک پہونچی اور چٹخنی کھول دی۔ سومناتھ سامنے آئے تو عجیب حالت تھی۔ چہرہ اور آنکھیں سرخ۔ پیر لڑکھڑاتے ہوئے۔ مخمور اور بدحواس اور دروازے کے دیر میں کھلنے کی وجہ سے کچھ خشمناک بھی۔ ان کی یہ حالت دیکھ کر سروجنی جس کے دیکھنے کی کم و بیش عادی ہو گئی تھی اُسے بُرا ضرور معلوم ہوا۔ چونکہ نئی بات نہ تھی زیادہ تعجب نہ ہوا۔ لیکن سومناتھ کے ساتھ ہی ساتھ جب ایک بی صاحبہ بھی داخل دروازہ ہوئیں تو سروجنی کی حیرت غصہ اور شرم کی انتہا نہ رہی۔ اُس کا بدن غصے سے کانپنے لگا اور شرم سے گڑ گئی کیونکہ ایسا پہلے نہ گذرا تھا۔ چاہا کہ ایک ٹھوکر دے کر اُسے نکال باہر کرے۔ لیکن ہمت نہ پڑی ٹھٹھک کر رہ گئی۔ سومناتھ نے نہایت کرخت لہجہ میں کھانا لانے کا حکم دیا۔ اس پر سروجنی سے زیادہ ضبط نہ ہو سکا اور بولی۔

سروجنی۔ میں ایسی حالت میں آپ کے کمرے میں آنا پسند نہیں کرتی۔ کھانا الماری میں رکھا ہے لے لیجیے۔

سومناتھ۔ دیا ہو گا۔ چلتی ہے کہ نہیں۔

سروجنی۔ کھانا رکھا ہے خود لے لو۔

یہ سننا تھا کہ سومناتھ آپے سے باہر ہو کر گالیاں دیتے ہوئے سروجنی کی طرف بڑھے اور اس زور سے جھٹکا دے کر اس کو ڈھکیلا کہ غریب کا سر دروازے سے ٹکرا کر بھنا گیا۔ لیکن خیر سے وہ اپنے کمرے کے قریب تھی سنبھل کر فوراً اندر ہو رہی اور دروازہ بند کر لیا۔ سومناتھ بھوک سے پریشان تھے۔ زیادہ شر کی مہلت نہ ملی۔ اور اس وقت معاملہ رفع دفع ہو گیا۔ صبح تڑکے ہی سروجنی اٹھی تو سر میں درد تھا اور طبیعت بھاری تھی لیکن اس کا ارادہ مضبوط اور ہمت تازہ تھی۔ میز پر گئی۔ کچھ دیر سر پکڑے بیٹھی سوچتی رہی۔ پھر جگہ پر سے اُٹھی۔ ٹائم ٹیبل نکالا۔ ریل کے وقت اور کرایہ دیکھا۔ پرس کے نوٹ اور روپے گنے۔ باپ کے نام لاہور ایک تار لکھا اور اسباب باندھنے میں مصروف ہو گئی۔ نو بجتے بجتے اس کا سامان سفر تیار تھا۔ نوکر کو بلا کر تار دیا کہ تار گھر لے جائے اور اسٹیشن کے لئے کرایہ کی گاڑی لائے۔ اس اثنا میں سومناتھ کے نام خط لکھنے بیٹھی کہ جس کا آخری فقرہ یہ تھا کہ "اس گھر کو اب ہمیشہ کے لئے سلام ہے"۔ خط کا سرنامہ کر کے میز پر رکھا اور گاڑی پر اسباب رکھوانے میں مشغول ہو گئی کہ اتنے میں دیکھا کہ سومناتھ سو کر اٹھے اور کمرے کے باہر آئے ہیں۔ اسباب گاڑی پر جاتا دیکھ کر کچھ حیران اور کچھ غصہ ہوئے اور سروجنی سے پوچھا کہ کس کا اسباب ہے؟

سروجنی۔ میرا۔

سومناتھ۔ کہاں کا ارادہ ہے؟

سروجنی۔ لاہور کا۔

سومناتھ۔ کس کے حکم سے۔

سروجنی۔ اپنی مرضی سے۔

یہ سُن کر سومناتھ کے تیور چڑھے اور بولے کہ خوب دیدہ دلیری اور جرأت! سب شان طومجبر میں کرکری ہو جائے گی!! چاہتے تھے کہ قدم آگے بڑھائیں اور سروجنی کو اُس کے ارادے سے زبردستی باز رکھیں، لیکن سروجنی آنے والی مصیبت کا اندازہ کرکے آخری مرتبہ اوراہت کی جیب سے ایک شیشی نکال کر سومناتھ کو دکھائی اور کسیقدر سخت لیکن متین لہجہ میں کہا کہ خبردار جو آگے قدم بڑھایا ہو۔ قبل اس کے کہ مجھے ہاتھ لگا سکو میری لاش پڑی دیکھو گے۔ سومناتھ اس کے لئے تیار نہ تھے۔ جھجکے اور رکے ہوئے۔ سروجنی نے کمرے میں سے اپنا دستی بیگ اور شال اُٹھایا اور گاڑی پر سوار ہو کر روانہ ہو گئی۔ بعد کو کوئی نئی چال سوچ کر سومناتھ اسٹیشن روانہ ہوئے لیکن ان کے پہونچتے پہونچتے پنجاب میل روانہ ہو چکا تھا۔

شوہر کے گھر کو الوداع کہے ہوئے تو سروجنی کو کئی ہفتے ہو چکے تھے آج میکے کو بھی اُس کا آخری سلام تھا۔ کیونکہ اُس کے ماں باپ اُس کی حرکت سے بہت نادم تھے پریشان اور خفا تھے۔ اُن کا اصرار تھا کہ وہ الٰہ آباد فوراً واپس جائے۔ کئی روز کے پس و پیش، کشمکش اور گذشتہ اور آئندہ کے حوادث زندگی کے نشیب و فراز پر غور کرنے کے بعد اُس نے آج طے کر لیا تھا کہ اُسے کیا کرنا چاہیے۔ کوٹھی کے پچھلے لان پر ٹہلتے ٹہلتے وہ ابھی تھک کر ایک درخت کے نیچے بیٹھ گئی تھی۔ دن ڈھل رہا تھا اور سورج کی ماند کرنیں اُس کے زرد اور پژمردہ چہرہ پر اس طرح پڑ رہی تھیں کہ جیسے دو بھولے بھٹکے راہ گیر دن بھر کی مسافت طے کرنے کے بعد سے تھک کر بیٹھ جاتے اور ایک دوسرے کا سہارا ڈھونڈھتے ہیں۔ یوں تو بے حس و حرکت اور نہایت سکون کی حالت میں بیٹھی تھی، لیکن اُس کی نگاہوں سے انتظار کے طور پائے جاتے تھے۔ پتہ کا کھڑکنا بھی اُسے چونکا دیتا تھا اور اِدھر اُدھر دیکھنے لگتی تھی۔ آخر کار کچھ پاؤں کی آہٹ سی معلوم ہوئی۔ سروجنی نے بیتابی سے نگاہ اُٹھائی اور کیلاش کو دیکھ کر اس کے چہرے پر خوشی کے آثار نمایاں ہوئے۔ وہ جلدی سے اُٹھ کر کیلاش کی طرف بڑھی اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا اور دوسرا ہاتھ شانہ پر رکھ کر بولی۔

سروجنی۔ صبح کا بھولا شام کو آئے تو اُسے بھولا نہ کہنا چاہیے۔ ہے نہ۔ لیکن آپ اب آسانی

اور جلدی سے نہ جانے پائیں گے۔

کیلاش۔ عنایت کا شکریہ۔ مگر یہ تو بتاؤ تم نے کچھ طے بھی کیا۔

سروجنی۔ (مسکرا کر۔ گو یہ مسکراہٹ ہونٹوں کے ساتھ ایک زبردستی تھی) قطعی طور پر۔

کیلاش۔ کیا؟ جلدی بتاؤ۔ کیا؟

سروجنی۔ اس کے جواب کے لیے ابھی آپ کو انتظار کرنا پڑے گا۔

کیلاش۔ یہ دل لگی اچھی نہیں۔

سروجنی۔ جو کچھ بھی ہو میرا فیصلہ آپ کے موافق نہیں۔

کیلاش۔ سروجنی تمہیں کیا ہو گیا ہے۔ کیوں نہیں مانتیں۔ لوگوں کی زبانیں تو آج تک کسی نے بند نہیں کی ہیں۔ بغیر بدنام کیے تو یہ مانیں گے نہیں پھر آخر زندگی تباہ کرنے سے کیا فائدہ؟

سروجنی۔ (سنجیدہ لہجہ میں) میں نے لاکھ لاکھ سمجھایا لیکن نہ معلوم تم کیوں نہیں سمجھتے۔ اگر میں نے نیک نامی اور بدنامی کی پروا کی ہوتی تو آج یہ نوبت کیوں آتی۔ کیا اب بھی تم کہہ سکتے ہو کہ میں نے ہمت نہیں کی۔ پیارے کیلاش! سچ مانو کہ جب تک تمہارے دل میں میرے لیے جگہ ہے اور میں تم سے محبت کرتی ہوں دنیا کے پردے پر کوئی قوت اور ہستی ایسی نہیں کہ جو میرے اور تمہارے درمیان حائل ہو سکے۔ میں اس کی پروا نہیں کرتی کہ لوگ کیا کہتے ہیں اور کیا کہیں گے۔ مگر اس کے ساتھ مجھے یہ بھی گوارا نہیں کہ ہمارے اس جذبۂ محبت کے پاک دامن پر کوئی ایسا داغ لگے کہ جس پر مجھے شرمانا پڑے اور خود میری طبیعت اس پر ملامت کرے۔ مجھے اور تمہیں اختیار کامل ہے کہ ہم اپنی زندگی کو جس طرح چاہیں بنالیں یا بگاڑ دیں، بشرطیکہ ہم اس کا خمیازہ بھگتنے کے لیے تیار ہوں لیکن مجھکو اور تم کو یہ کب اختیار ہے کہ چند اور معصوم ہستیوں کو بھی وجود میں لا کر انہیں اس طرح دنیا کا نشانۂ ملامت بننے دیں کہ وہ شرم کے مارے کسی سے آنکھ نہ ملا سکیں۔ دنیا انہیں کیا کہہ کر پکارے گی نہ میری زبان اس کلمہ کے نکالنے اور نہ کان اس کے سننے کے لیے تیار ہیں نہ میری

محبت اس جرم کا بار اٹھانے کی متحمل ہوگی۔ کیا اب بھی تم کہہ سکتے ہو کہ یہ محض محبت کی سچائی اور دل کی ہمت کا سوال ہے۔ محبت کی سچائی اور دل کی ہمت دنیا کی لوک لاج اور رسم و رواج کی پابندیوں کو توڑ دے مگر قانون کی بندشیں کس طرح ڈھیلی ہو سکتی ہیں، یہ مقدر کس طرح مٹایا جا سکتا ہے بغیر طلاق کے شادی کا رشتہ کس طرح ٹوٹ سکتا ہے اور جب تک کہ یہ رشتہ قطع نہ ہو جائے تم سے شادی کی صورت کیسے نکل سکتی ہے۔ یقین جانو کہ میں نے آج کی طرح اس بات کو پہلے کبھی محسوس نہ کیا تھا کہ میں عورت ہوں اور میری شادی ہو گئی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ کل سے تم بھی اس پر کافی غور کرنے پر مجبور ہوگے۔

کیلاش۔ تو پھر تم نے طے کر لیا ہے کہ تم آج الہ آباد جاؤ گی۔

سروجنی۔ قطعی نہیں، غیر ممکن۔

کیلاش۔ (متعجب ہو کر) تو پھر آخر کیا سوچا ہے۔

سروجنی۔ بتا دوں گی جلدی کیا ہے۔ کیا کہیں جانا ہے؟

کیلاش۔ نہیں تو۔ لیکن تمہارے اس پہیلی بجھوانے سے اُلجھن ہوتی ہے۔

سروجنی۔ اچھا ذرا صبر کرو بتائے دیتی ہوں (چونک کر) دیکھو تو آسمان پر وہ کیا چیز ہے؟

کیلاش۔ کہاں، کس طرف؟

سروجنی۔ سامنے والے درخت کے اوپر۔ وہ دیکھو وہ۔ میری انگلی کی سیدھ میں۔ درخت کے داہنے طرف کچھ دیکھا۔

کیلاش۔ کچھ بھی نہیں۔ کیا تھا؟

سروجنی۔ لعنت بھیجو ہوگا بھی کچھ۔

کیلاش۔ بڑی ہشیار ہو۔ خوب بات ٹالی۔ لیکن آپ کو بتانا ہوگا کہ کیا طے کیا ہے۔

سروجنی۔ (مسکراتی ہوئی کیلاش کی طرف بڑھی اُس نے اپنی دونوں باہیں اُس کے گلے میں ڈال دیں اپنے ہونٹ اس کے ہونٹوں پر رکھ دیے اور نہایت آہستہ اور کانپتی ہوئی آواز سے بولی کہ پیارے کیلاش میں نے یہ طے کیا ہے کہ

جب تک دم میں دم ہے اور جان اس تن زار سے نہیں نکلتی ہیں اب لمحہ بھر کے لئے تم سے جدا نہ ہوں گی (وہ آبدیدہ ہو رہی تھی لیکن مسکراتے ہوئے اس نے پوچھا کہ) اب تو تمہیں مجھ سے کچھ شکایت نہ رہے گی اور قائل ہو گئے کہ تم ہمیشہ مجھ سے ناحق رو ٹھا کرتے تھے۔

کیلاش کی مخمور آنکھیں ابھی ضیافت نظارہ سے سیر نہ ہوئی تھی اور وہ نہیں چاہتا تھا کہ منھ سے لگے ہوئے جام کو ہونٹوں سے ہٹائے لیکن دفعتاً وہ چونکا اور بولا کیا ہے۔ تمہارے ہونٹ سخت نیلے ہو رہے ہیں۔ بدن کانپ رہا ہے۔ ہاتھ ٹھنڈے ہیں۔ خیر تو ہے۔

سر دجنی۔ کچھ بھی نہیں۔ دیکھو اب تم دور بھاگ گئے " بلو۔ اس کی نہیں بدلی تھی۔

کیلاش۔ (کسی قدر گھبرا کر) کچھ تو ہے تم پر مردنی اور بے ہوشی سی چھا رہی ہے۔ آنکھیں کیوں بند ہوتی جاتی ہیں۔

کیلاش سر دجنی کو اس حالت میں دیکھ کر گھبرایا۔ جب بار بار آواز دینے پر بھی وہ نہ بولی تو یقین کر کے کہ کسی وجہ سے وہ بے ہوش ہو گئی ہے اس نے اسے گود میں اٹھایا اور دونوں ہاتھوں پر لے کر کمرے کی طرف لے گیا۔ پلنگ پر لٹایا پنکھا کیا۔ منھ پر پانی کے چھینٹے دیے۔ خوشبو سنگھائی۔ سینہ پر ہاتھ رکھ کر دل کی حرکت دیکھی اور چاہتا تھا کہ اس کی بند مٹھیوں کو کھول کر اس کے ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کہ دفعتاً اسے سر دجنی کے ہاتھ میں ایک چھوٹی سی شیشی دیکھی کہ جس پر سم قاتل کا لیبل لگا ہوا تھا۔ شیشی کا دیکھنا تھا کہ اس کے ہوش و حواس جاتے رہے۔ پیر تلے کی مٹی نکل گئی وہ بدحواسی کے عالم میں پلنگ سے اٹھا دروازے کی طرف لپکا اور ڈاکٹر کی تلاش میں نکل گیا۔

دن ڈھل چکا تھا۔ رات کی تاریکی رفتہ رفتہ اپنا پرا جماتی جاتی تھی۔ چمن کے ناخواندہ اور شوریدہ سر مہمان جاڑے اور پالے کی شدت سے امان مانگتے ہوئے گھونسلوں میں بسیرا کر رہے تھے۔ سکوت اور سناٹے کا عالم تھا۔ چاروں طرف کچھ مردنی اور وحشت

سی چھائی ہوئی تھی کہ جسے رات کی تاریکی اور بھیانک بنائے دیتی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ تمام کائنات قدرت نے کسی حادثۂ جانکاہ کے انتظار میں ماتمی لباس پہنا ہے اور گھڑی پل میں کوئی آفت آنے والی ہے۔ دفعتہً آسمان سے ایک تارا ٹوٹا اور اس کے ہم جلیسوں میں کہ جواب تک دم بخود بیٹھے تھے کنکھیوں سے دیکھتے اور چپکے چپکے سرگوشیاں کر رہے تھے کھلبلی مچی کہ قسّام ازل کے دفتر سے گنہگار عشق کی طلبی کا پروانہ جاری ہو چکا ہے۔ پیک اجل نے بیمار محبت کو نوید آزادی سنایا اور لے اڑا۔ عرش بریں کے پاسبانوں اور فردوس کے دربانوں نے سروقد استادہ تعظیم دی اور وہ بدنصیب لیکن پاک روح کہ جسے دنیا کے پردے پر کہیں ٹھکانا نہ میسر آتا تھا جنّت میں داخل ہوگئی۔

سرد جنی پلنگ پر بے حس و حرکت پڑی تھی۔ کمرے میں اندھیرا اور کامل خموشی تھی۔ سردی کی شدت سے ٹھٹھرتا ہوا جا ایک شمع کچھ ٹمٹماتی تھی وہ بھی گھڑی پل کی مہمان تھی کہ کسی نے دروازے کا پٹ آہستہ سے کھول کر اندر جھانکا اور کسی قدر کرخت لہجہ میں کہا کہ "سرد جنی یہ بے خبر سونے کا وقت نہیں تمہیں جانا ہے اور ٹرین کا ٹائم آپہونچا"۔ وہاں کون تھا جو سنتا اور جواب دیتا۔ شمع بولی اور یہ کہہ کر کہ وہ تو قبل از وقت سفر آخرت کا کوچ کر گئی اور سدھار چکی، خود بھی ہمیشہ کے لئے خاموش ہوگئی۔

۱ اپریل ۱۹۱۹ء

کانگرس کا کچا چٹھا

(مان سرور کی ڈاک)

بھائی جان! تمہارے خواب کی تعبیر یہ ہے کہ دلّی کے قدیم اور شہرۂ آفاق شہر میں کہ جس میں نہ معلوم کتنے تاجداروں کی آبرویں اور سلطنتوں کی حسرتیں دبی پڑی ہیں، جس کی خاک کا ذرہ ذرہ ہند کے کھوئے ہوئے عروج اور اقبال، تہذیب اور شائستگی کا پتہ دیتا ہے، جو شہر گرچہ آج بھی دارالسلطنت کے نام سے پکارا جاتا لیکن فی الحقیقت ہند کی حکومت اور تہذیب کا بڑا پرانا مدفن ہے، اُسی دِلّی کے شہر میں قوم کے امانت داروں کے اُس قافلہ کو کہ جو ہمت اور استقلال سے قدم بڑھائے منزلِ مقصود کی جانب جا رہا تھا اور جس کے دم کے ساتھ ہماری تمام اُمیدیں اور حوصلے وابستہ تھے اپنے ہی یارانِ وطن نے دن دہاڑے لوٹ لیا اور اسی دِلّی کی سرزمین کانگرس کا مدفن ثابت ہوئی۔ یہ سچ ہے کہ قوم کے نادان دوستوں نے اس شہید وفا کا جنازہ یہ کہہ کر نکالا کہ ع

عاشق کا جنازہ ہے ذرا دھوم سے نکلے

اور تُربت بھی بڑی شان کی بنوائی لیکن بالآخر آبرو اور عظمت کو پیوندِ خاک ہی کر کے چھوڑا۔

ایک زمانہ ہوا کہ کسی لطیفوں کی کتاب میں ایک مذاق نظر سے گذرا تھا کہ جو ہے تو بھونڈا سا لیکن چونکہ معنی خیز اور برمحل ہے، تمہیں بھی سنائے دیتا ہوں۔ کسی گنوار کسان کی ہنسیا ایک مرتبہ اتفاق سے کھیت میں دھوپ میں پڑی رہ گئی۔ گرمی کے دن تھے۔ دھوپ کی شدت سے لوہا اس قدر گرم ہو گیا کہ اُس کا چھونا دشوار تھا۔ کسان کو ہنسیا کو اس حالت میں دیکھنے کا اتفاق

پہلے نہ ہوا تھا۔ بہت گھبرایا اور فوراً حکیم صاحب کے پاس پہنچا اور کہا کہ حضور ہنسیا کو تپ آگئی ہے اس کی دوا کیجئے۔ حکیم صاحب تھے تو دیہاتی لیکن بڑے ستم ظریف تھے۔ بولے کہ بھیا اس کو تالاب میں نہلا دو تپ اُتر جائے گی۔ چنانچہ اس عمل پر کاربند ہونے سے ہنسیا کا بخار دریا برد ہو گیا اور گنوار بہت خوش ہوا۔ قضائے الٰہی سے کچھ دنوں بعد اس کسان کی بڑھیا ماں شدید بخار میں مبتلا ہوئی۔ اس دفعہ حکیم صاحب تو ملے نہیں لیکن ان کا مجرب نسخہ کسان کو یاد تھا۔ بھائی بندوں نے بھی یہی مشورہ دیا کہ اسی پر عمل کیا جا دے۔ چنانچہ بڑھیا کو ندی کنارے لے گیا اور نہانے کی ترغیب دی۔ وہ بد حواس ہو رہی تھی نہانے پر آمادہ نہ ہوئی۔ یار لوگوں نے ایک نہ مانی گلے میں رسی کا پھندا دے کر پانی میں ڈال ہی دیا۔ اس میں دم ہی کتنا تھا جب وہ بھی ہوا ہو گیا تو بدن ٹھنڈا پڑ گیا اور دانت باہر نکل آئے۔ یہ دیکھ کر ساتھیوں نے خوش ہو کر مذاق اڑایا کہ لو ابھی سے دانت نکالتی ہیں۔ حضرت سلامت یہی سلوک آپ کی کانگرس کے ساتھ کیا گیا۔ آئرلینڈ کی مثالیں ہمارے دوستوں کے لئے قیامت ہو گئیں۔

یہ تو تمہیں معلوم ہی ہے کہ ایک مدت مدید سے مصائب عالم سے تنگ آکر اور مکروہات دنیوی سے پیچھا چھوڑا کر میں یہاں کائنات قدرت کی قدامت اور وسعت کے دامن میں پناہ گزیں ہوں کہ جہاں بشر کا گذر تو درکنار پرندہ بھی مشکل سے پر مارتا ہے۔ مہینوں اور برسوں دنیا کی خبر نہیں رہتی تاہم اگر کوئی بھولا بھٹکا کبھی ادھر آنکلا اور اس نے کچھ کہا تو اس کا قصہ بھی سُن لیتا ہوں۔ پچھلے دو تین برس میں کئی دفعہ کانوں میں یہ بھنک پڑی کہ قوم میں ہیجان پیدا ہے اور طوفان کے آثار نمایاں ہیں بالخصوص چھ مہینے ہوئے سُنا کہ کانگرس میں ایک آفت برپا ہے اور ہنگامہ آرائیاں ہو رہی ہیں سُننا تھا کہ دل پر چوٹ لگی اور درد سا اٹھا۔ ضبط کی تاب نہ لا سکا۔ کانگرس جانے کی ٹھان لی اور دلی جا پہونچا۔ بھلا اُس نقار خانۂ جمہوریت میں اس طوطی کی آواز کون سنتا۔ اس کی پہلے سے بھی امید نہ تھی۔ لیکن آنکھیں اور کان اپنے تھے جو کچھ آنکھوں سے دیکھا اور کانوں سے سُنا قلمبند کر کے بھیجتا ہوں اسے کانگرس کا کچا چٹھا سمجھو۔ پڑھو اور غور کرو۔ تمہارے خواب کی تعبیر جو میں نے لکھی ہے اس کی حقیقت اس سے اور آشکارا ہو جائے گی۔

۲۶ دسمبر کو دوپہر دن چڑھے جب قوم پرستوں کی آرزوؤں اور تمناؤں کے مندر کے پٹ کھلے اور جھانکی شروع ہوئی تو چاندنی چوک کے نکڑ پر خلقت کا وہ میلہ تھا کہ شاید و باید۔ اندر کی کیفیت بھی کم دلچسپ نہ تھی۔ پنڈال طرح طرح کے سنگار سے دلہن بنا ہوا تھا۔ بارہ ہزار کے مجمع کو اس طرح ترتیب دے کر بٹھایا تھا کہ مہاراشٹر کی لال پگڑیاں پنجاب کے سفید شملے، بنگال کے ننگے سر، اسلام کی ترکی ٹوپیاں اور انواع و اقسام کے انگریزی اور ہندوستانی سرپوش سب باقاعدہ چھٹے ہوئے نظر آتے تھے۔ سنگھاسن پر سامنے چند بڑی بڑی مورتیں دکھ رہی تھیں پیچھے ہند کی دیویوں کا مجمع تھا۔ آسام و برہما سے لے کر حیدرآباد سندھ اور کراچی تک اور پشاور اور راولپنڈی سے مالابار اور راس کماری تک کا کوئی حصہ ملک کا ایسا نہ ہوگا کہ جس کے جاتری اس درشن میلے میں شامل نہ ہوں۔ ہندوستان کا ہر طبقہ وکیل بیرسٹر ڈاکٹر، سیٹھ ساہوکار، رئیس نواب، راجہ پرجا حتیٰ کہ سیکڑوں غریب کسان بھی گویا لارڈ سڈنہم کی خاطر سے یہاں موجود تھے۔ پھر وہ سکون اور اطمینان تھا اور ایسی ترتیب اور انتظام کہ جس سے دل خوش ہو۔ اس مندر کے مہارشی یعنی صدر کانگریس کے درشن سب نے کھڑے ہو کر نہایت تعظیم سے کیے۔ بندے ماترم کے راگ سے آرتی شروع ہوئی۔ حکیم حاذق الملک نے دلی والوں کی طرف سے کانگریس کا خیر مقدم کیا اور پنڈت مدن موہن مالویہ نے کرسی صدارت سے کانگریس کا پیغام ملک اور سرکار کو سنایا اور تقریباً ۲ گھنٹے کے بعد کانگریس کا پہلا اجلاس بخیر و خوبی ختم ہوا۔ یہ کانگریس کا سب سے زیادہ شاندار اور دل خوش کرنے والا سین تھا۔ جس طرح کہ ہولی، دیوالی یا عید و شب برات کے میلوں میں سفید پوش اور رنگیلے اپنے صاف ستھرے اور زرق برق لباس میں چلتے پھرتے اور اخلاق و ادب سے ملتے جلتے نظر آتے ہیں، اسی طرح "قوم" بھی اس سالانہ دربار میں نہایت تہذیب و متانت خلق اور خندہ پیشانی سے مراسم قومی ادا کرتی اور دنیا کو اپنا بہترین اور روشن رخ دکھا رہی تھی یا یوں کہیے کہ اس پنڈال میں آپ قومی کارخانہ کا Show Room سجا ہوا دیکھ رہے تھے کہ جہاں ہر ایک چیز نہایت سلیقے اور موقعے سے رکھی ہوئی دکھتی اور دل لبھانے والی معلوم ہوتی ہے۔

اس محفل کا دوسرا سین سر شام اس وقت شروع ہوا کہ جب متفرق اطراف ملک

کے ڈیلیگیٹ اپنے اپنے حلقوں میں سبجکٹس کمیٹی کے ممبروں کے انتخاب کے لئے جمع ہوئے۔ تمہارے ہاں صوبہ کے تقریباً دو ہزار آدمی تھے۔ اُن کا حال لکھتا ہوں۔ وہ ہڑبونگ تھا کہ کان پڑی آواز نہیں سنائی دیتی تھی۔ ہر شخص اپنی کہتا تھا اور دوسرے کی ہرگز نہ سنتا تھا۔ ان میں سے کوئی نصف درجن جوادروں سے زیادہ شوخ اور بیباک تھے، کرسیوں پر کھڑے ہو کر قوم کی دُہائی دیتے اور جمہوریت کی قسمیں کھا رہے تھے۔ لیڈر کہتے تھے کہ ہم لیڈر ہیں۔ قوم کہتی تھی کہ میں لیڈر گر ہوں۔ ڈیڑھ گھنٹہ کی جلد جہد اور کشمکش کے بعد بیچارہ صدر کمیٹی کو زبان کھولنے کی اجازت ملی تو انہوں نے ناموں کی ایک چھپی ہوئی فہرست پڑھنی شروع کی اور تجویز پیش کی کہ انہیں منتخب کیا جاوے۔ جس قوم کو یہ زعم ہو کہ میں لیڈر گر ہوں بھلا وہ اس خود پسندی اور خودسری کو کب روا رکھ سکتی تھی۔ جمہور نے آوازے کسے کہ یہ جمعیت خواص ہے صحبت عوام نہیں لہذا نامنظور۔ پھر یہ تجویز کی گئی کہ نصف درجن نامور اور ذی اقتدار احباب پر چھوڑ دیا جاوے کہ کمیٹی کے ممبر تجویز کر کے قضیہ کو ختم کریں۔ لیکن قوم ان دم جھانسوں میں آنے والی نہ تھی شور اٹھا کہ ہم اپنی تقدیر کا فیصلہ دوسروں پر نہیں چھوڑ سکتے۔ یہ طرز آئین جمہوری کے خلاف ہے۔ غرضیکہ قوم بہنچی، چلائی، کودی، پھاندی اور دل کا خوب ہی بخار نکالا جو ناگفتنی باتیں تھیں کہیں اور جو ناشنیدنی تھیں سنائیں۔ اور جب تک گلے بیٹھ نہ گئے اس وضع جمہوری کی خوب ہی داد تھی اور کامل چار گھنٹہ بعد رات کے تقریباً دس بجے بھوک پیاس سے عاجز ہو کر اور نیند حرام ہونے کے خوف سے اس قضیہ کو لعنت بر سبیح کہہ کر کچھ فیصلہ کیا۔ یہ سین کسی قدر ماندہ، بھدا اور بھونڈا تھا اس کو قوم کی تصویر کا تاریک رُخ سمجھنا چاہیے۔ قوم کی یہ کیفیت ہماری اس کیفیت سے بعینہٖ مُشابہ تھی کہ جب ہم اپنی باہر کی مصروفیتوں اور صحبتوں سے فارغ ہو کر تھکے ماندے گھر آتے ہیں تو تکلف کی پوشاک اتار کر کھونٹی پر رکھنے کے ساتھ ہی ساتھ اکثر اپنی معمولی تہذیب بلکہ انسانیت کو بھی بوجھ سمجھ کر بالائے طاق رکھ دیتے ہیں اور یہ اطمینان رکھتے ہیں کہ اُن گھر والوں کو کہ جو ہماری خوشنودی مزاج کے خواہاں ہیں ہمارے غم و غصہ، جہالت اور جھنجھلاہٹ، نخوت اور تمکنت کا لازمی خمیازہ بھگتنے پر مجبور ہونا پڑے گا یہی انداز اس موقع پر قوم کا تھا۔ اور لسعضور کے اس ادا کی بلائیں لینے والے اور اس انداز پر جان دینے والے بھی وہاں کچھ

کم نہ موجود تھے۔

تیسرا اسٹیج وہ تھا کہ جہاں سبجکٹس کمیٹی کی محفل تھی۔ قوم تو پچھلے روز کی تھکی ماندی آج ذرا دم لے رہی تھی۔ لیکن اُس نے اپنے شاطر اور کھلاڑی چُن چُن کر بھیج دیے تھے کہ بڑھیں اور چالیں چلیں۔ یہ مجمع ۳۰۰ چیدہ احباب کا تھا۔ اس میں تین قسم کے لوگ شامل تھے۔ اوّل وہ کہ جو ملک میں انقلاب چاہتے ہیں اور اُس کو ذریعۂ نجات سمجھتے ہیں۔ ان کو نہ کانگرس سے کام نہ اس کے اصول اور منشاء سے سروکار۔ یہ اگر اس کا سہارا ڈھونڈتے اور اس میں شریک ہوتے ہیں تو محض اس لئے کہ اس ٹٹی کی آڑ میں شکار کھیل سکیں اور قوم کو بڑھاوا دیتے رہیں۔ یہ "دُھن کے پکے" ہیں لیکن ان کی تعداد زیادہ نہ تھی۔ دوسرے وہ تھے کہ جو کانگرس کے سچے معتقد اور پکے پیرو کار کہے جا سکتے ہیں، جو گو ترقی اور آزادی کے خواہاں ہیں لیکن انقلاب سے ڈرتے اور دور بھاگتے ہیں۔ کانگرس نے تو اب اُن کا پیچھا چھوڑ دیا لیکن پاس وضع کے خیال سے یہ اُس کا پنڈا ابھی نہیں چھوڑتے۔ یہ تھے لیکن کم تھے اور بہت پیچھے تھے۔ تیسری قسم کے لوگ بیش بیش تھے اور بکثرت تھے۔ ان میں بھی تفریق تھی۔ اوّل وہ کہ جو پایہ کے شاطر اور کھلاڑی تھے اور بازی کے الٹ پھیر کو بخوبی سمجھتے تھے اور ہوا کا رخ خوب پہچانتے تھے۔ دوسرے وہ تھے کہ جو ان شاطروں کے ہاتھ میں مُہروں کی طرح کام دیتے اور کٹ پتلیوں کی طرح ناچتے تھے۔ یہ ہوا کا رخ دیکھتے اور "ہاں" کر دیتے تھے۔ اس سے زیادہ کا نہ انہیں شعور تھا اور نہ ہمت تھی۔ انکی تعداد کثیر تھی اور اسی لئے اگر آپ انہیں "قوم" کہہ کر خطاب کرتے تو بہت خوش ہوتے اور اپنا ووٹ آپ کی نذر کرتے تھے۔ نشست کی صفوں میں بھی اس فرقہ بندی کی کافی جھلک نظر آتی تھی۔ میز کے ایک طرف مسٹر سی۔ آر۔ داس، بنگال کے مشہور بیرسٹر کہ جو مسٹر تلک کی غیر حاضری میں اُن کی پارٹی کی رہنمائی کر رہے تھے، بیچ میں بیٹھے تھے۔ ان کے دائیں مسٹر بمکیش چکرورتی، بپن بابو اور بعض زندہ دلانِ پنجاب تھے۔ بائیں مسٹر تلک کے لفٹننٹ مسٹر کھاپرڈے۔ مدراس کے دو چار گھوچاری "مرہٹہ" کے اڈیٹر مسٹر کیلکر اور آگے بڑھ کر مسٹر پٹیل اور مسٹر موتی لال نہرو بیٹھے تھے۔ اس صف کے پیچھے مدراس کے "نوخیز لیڈر" مسٹر سیتا مورتی اور مسٹر رنگ سوامی آئنگر کمک پر تیار تھے۔ میز کے دوسری جانب مسٹر داس کے سامنے گجنسنٹ، ان کے برابر میں صدر کانگرس اور دائیں جانب مسٹر سی پی راما سوامی، مسٹر بھُرگری اور مسز بسنٹ کے بائیں

مسٹر شاستری، مسٹر جمنا داس دوارکا داس اور دوسرے بھی موڈریٹ تھے۔ مسٹر جناح، مسز نائیڈو، مسز بارنیلی اس صف کے پیچھے تھے۔ خاموشی کا پردہ اُٹھتے ہی عیاں ہونے لگا کہ آج مسٹر داس اور مسز بسنٹ کی پارٹی میں معرکہ آرائی رہے گی۔ ولیعہد کی تشریف آوری ہندوستان پر خیر مقدم کے رزولیوشن کے مسترد ہوتے ہی مسز بسنٹ کا ماتھا ٹھنکا کہ شگون بُرا ہوا۔ لیکن جس نے ایسے سیکڑوں میدان سر کیے ہوں یہ اُس کے کیا بجا دین تھا۔ مسز بسنٹ اٹھیں اور اپنی فصاحت کے کرشمے دکھانے لگیں۔ مسٹر داس اس میدان کے طفل مکتب تھے لیکن چٹکیاں خوب لیتے تھے بس بحث چھڑ گئی کہ ابھی سپیشل کانگرس کی طرح اس دفعہ بھی صوبوں کی خود مختاری کے سوال کو آیا چھ سال کے لئے ملتوی رکھا جاوے کہ جیسا مسز بسنٹ کہتی ہیں یا فوراً کامل آزادی کا مطالبہ کیا جاوے کہ جیسی مسٹر داس کی تجویز ہے۔ دونوں جانب سے تقریروں کا بازار گرم ہوا۔ اس اثنا میں مسٹر سری نواس شاستری نے فریق نرم کے نقطۂ نظر سے بھی چند ترمیمیں پیش کیں کہ جو بجائے آگے قدم بڑھانے کے پیچھے ہٹ کر قدم جمانے کی ترغیب دیتی تھیں۔ جب اس پر بحث چھڑی تو مسز بسنٹ نے موقع کو غنیمت جانا۔ گھٹا کی طرح اٹھیں، گرجیں، کڑکیں اور مسٹر شاستری پر برس پڑیں۔ کہتی تھیں اور پھر پھر کر کہتی تھیں کہ نونہالان قوم اور دلاورانِ ہند آگے بڑھنے کے لئے بیتاب ہو رہے ہیں۔ مصلحتاً آگے قدم بڑھانے میں احتیاط کی ضرورت ہے لیکن قدم پیچھے ہٹانا تو خارج از بحث ہے۔ نوجوانان قوم میرے دست و بازو ہیں۔ میری ہمت اور ملک کا سہارا ہیں میں ان کے خلاف نہیں جا سکتی۔ مسز بسنٹ کا داؤں چلا لیکن ادھورا۔ نونہالان قوم نے تالیاں تو بڑے جوش اور زور سے بجائیں۔ لیکن جب مسٹر داس کی تجویز پر ووٹ دینے کا وقت آیا تو طوطے کی طرح آنکھیں پھیر کر ووٹ مسز بسنٹ کے خلاف دیا۔ مسٹر شاستری کی تجاویز کا حشر تو پہلے سے ہی معلوم تھا غالباً وہ خود بھی محض پاس وضع کے لحاظ سے بولنے اُٹھے تھے لیکن جب تقریباً ۷ گھنٹہ کے پینتروں اور چالوں کی کشمکش کے بعد اس بازی میں مسز بسنٹ کو مات ہوئی تو البتہ بہت سے لوگوں کو حیرت اور مایوسی ہوئی۔ جس وقت صدر کانگرس نے اپنے ایڈریس میں صوبوں کی کامل خود مختاری کے مطالبہ کا اشارہ کیا تھا تو غالباً اس وقت وہ یہ نہ سمجھے تھے کہ کانگرس اس پر سچ مچ اڑ جائیگی اور ذرا سی بات کا اس قدر بتنگڑ بنے گا۔ لیکن جب یہ معلوم ہوا کہ کانگرس میں کھلم کھلا اس پر بحث ہوگی اور اس کا طومار بنے گا تو آپ نے دوسرے دن کمیٹی میں پھر اس معاملہ کو از سر نو چھیڑنا چاہا

ظاہر ہے کہ یہ آسان نہ تھا۔ جن لوگوں نے دن بھر خون پسینہ ایک کرکے بمشکل تمام میدان سر کیا تھا بھلا وہ اس پر کس طرح راضی ہوتے کہ کیا کرایا سب مٹیا میل ہو جاوے۔ مسٹر داس کو تو غالباً جمہور کی تلون مزاجی سے اندیشہ تھا۔ مسٹر کھاپرڈے شاید مسٹر تلک کے موجود نہ ہونے سے گھبراتے تھے۔ مسٹر داس چیں بر جبیں ہوئے۔ مسٹر وجے راگھواچار نے چپکے چپکے دو ایک چٹکیاں لیں اور مسٹر کھاپرڈے تو صدر کانگرس سے الجھ ہی پڑے۔ لیکن جمہور قوم کل کی جیت پر خوش اور اپنی قوت اور ہمت پر نازاں تھے اور اترا کر کہتے تھے کہ کیا مضائقہ دو دو ہاتھ پھر سہی۔ قصہ کوتاہ بحث پھر چھڑی اور کئی گھنٹہ صرف ہوئے۔ نتیجہ آخر کار وہی ہوا کہ جس کا مسٹر جناح، مسز بسنٹ اور مالوی جی کو دھڑکا تھا۔ اس معرکہ کا ایک حادثہ سننے کے قابل ہے۔ دوران بحث میں مسٹر جناح تقریر کرنے کھڑے ہوئے۔ آدمی ہشیار ہیں اور گفتگو ہمیشہ شان سے کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ لوگ آپ کی بات دھیان سے سنتے ہیں۔ لیکن اس دفع جب آپ بولنے کھڑے ہوئے تو غالباً یہ بھول گئے کہ کلکتہ اور دہلی کانگرس کے درمیان بمبئی میں ایک اسپیشل اجلاس اور بھی ہو چکا ہے کہ جس میں آپ شریک تو تھے لیکن غالباً اس وقت یا تو طبیعت حاضر نہ تھی یا مصلحتاً اور غروراً باگیں چھوڑنا مناسب سمجھا تھا۔ مسٹر داس کی تجویز کے خلاف آپ نے فرمایا کہ تم نے ابھی تک یہ دعویٰ کبھی نہیں کیا کہ تم کامل خود مختاری کے اس وقت بھی قابل ہو۔ تم نے (رپورٹ کے بنیادی اصولوں کو مان لیا ہے لہذا تم اُن کے خلاف نہیں جا سکتے۔ کل کی بات ہے کہ تم کہہ چکے ہو کہ صوبوں کی خود مختاری سے ۶ سال کے لئے باز دعوے دیتے ہیں پھر آج اس کا مطالبہ کس طرح کرتے ہو؟ مسٹر جناح ایک ایک دلیل پیش کرتے تھے اور دوسری جانب سے اسپیشل کانگرس کے رزولیوشن اُن کے سامنے آئینہ کی طرح رکھ دیے جاتے تھے کہ جس میں وہ اپنی شکل دیکھ کر خود شرما جاتے تھے۔ غرض کہ یاران وطن نے مسٹر جناح کو اس قدر تنگ کیا کہ وہ شرما کر خود بیٹھ گئے اور تقریر ختم نہ کر سکے۔ بات یہ ہے کہ مسٹر جناح اس موٹی سی بات کو بھول گئے تھے کہ کوئی شخص بھی خواہ وہ کیسا ہی زبان کا کاریگر کیوں نہ ہو ایک وقت میں دو روپ بھر کر یہ نہیں کہہ سکتا کہ بیرے دونوں میٹھے۔ جو لوگ کہ آج خود پسندی کے زعم میں غوغائے عام کے فتنہ کو کامیابی سے جگا کر شہرت حاصل کیا چاہتے ہیں اُن کا یہ گمان محض وہم باطل ہے کہ کل وہ لیڈر، مصلح یا فرشتۂ امن کا روپ

دھار کر اس جلتی ہوئی آگ کو اسی آسانی سے بجھا بھی سکیں گے جو ڈیماگوگ Demagogue کر
کی عارضی شہرت پر جان دیتے ہیں وہ مدبّر کی حیثیت سے کوئی قوت اور اثر یا شان و شہرت نہیں
حاصل کر سکتے۔ ۱۱ دسمبر کو مسٹر جناح نے لارڈ ولنگڈن اور سر دین شاہ واچا کے خلاف شہر بمبئی
میں ایک طوفان برپا کر کے شاہان سلف کی طرح بالاخانے کے درشن جھروکہ میں نمودار ہو کر جمہور شہر سے خراج
اطاعت و تحسین حاصل کیا تھا۔ ٹھیک ۱۵ روز بعد ۲۷ کو انہیں جمہور کے بھائی بندوں نے کانگرس
کی سبجکٹس کمیٹی میں مسٹر جناح کا نشہ اتار دیا اور زبان بند کر کے بٹھا دیا!

جن لوگوں نے دو روز پے در پے شکستیں دے کر میدان سر کیا تھا ان کے دماغ جیت
کے نشہ سے مخمور تھے۔ انہیں اپنی طاقت کا زعم تھا اور وہ اس سے جا بیجا ہر طرح کا فائدہ اٹھانا
چاہتے تھے۔ کانگرس کی آواز تو سرکاری رپورٹ کے خلاف اٹھ ہی چکی تھی اس نے تو معاملہ کی صورت
کو بگاڑنے میں کسر اٹھا رکھی ہے نہ تھی پھر بھی یہ سہارا تھا کہ ڈیپوٹیشن ولایت پہونچ کر شاید بگڑی بات
کو کچھ بنائے اور برٹش کانگرس کمیٹی الجھی ہوئی گتھی کے سلجھانے میں مدد دے لیکن یاران وطن نے ان
دونوں کا بھی لگے ہاتھوں قلع قمع کر ڈالا۔ طے ہوا کہ ڈیپوٹیشن یہاں سے پابند احکام کانگرس جا دے۔
اس میں چوں و چرا کی گنجائش نہ ہو۔ یہ کون کہتا اور اگر کوئی کہتا بھی تو سنتا کون کہ صوبوں کی کامل خود مختاری کا مطالبہ
کر کے تم نے سرکاری اسکیم کی جڑیں کاٹ دیں۔ رپورٹ کے بنیادی اصول سے تم منحرف ہو گئے، گفت
و شنید کی تم نے گنجائش ہی نہ رکھی، پھر اگر ڈیپوٹیشن بھی پابند احکام کانگرس گیا تو یہ ڈیپوٹیشن معاملہ
اور تصفیہ تو کچھ کر نہ سکے گا۔ پھر اس کے بھیجنے کا فائدہ؟ کیوں نہ کانگرس کے رزولیوشن رجسٹری کرا کر
ڈاک میں بھیج دیے جاویں اور بس۔ سر شاستری موجود نہ تھے، مسٹر جناح بیزار ہو کر اٹھ گئے، تھیں مسز
بسنٹ بیٹھی تھیں لیکن کہتیں کیا؟ وہ کلکتہ کانگرس میں خود ہی ڈیپوٹیشن کو پابند احکام بنا کر پہلے سے
اپنی زبان بند کر چکی تھیں۔ جب ہوش آیا تو ووٹ خلاف دیکر بیٹھ رہیں۔ رہی برٹش کانگرس کمیٹی چونکہ
اس نے بجائے کانگرس کے ماڈریٹ پارٹی کا ساتھ دیا تھا تجویز کیا گیا کہ نافرمانی کی سزا میں اس کی
رسد بند ہو اور اسے بھوکا مارا جائے۔ یہ کسی بندۂ خدا نے نہ سوچا کہ کانگرس کمیٹی کا توڑ دینا تو آسان
ہے مگر اس کی جگہ لینے والا ابھی تو کوئی پیدا ہو مگر وہاں کانگرس اور ملک کی فکر کس کو تھی؟ وہاں تو
غصہ یہ تھا کہ اس نے ہماری نافرمانی کی ہے لہذا سزاوار اور قابل دار ہے۔ برٹش کانگرس کمیٹی کا جرم

ظاہر ہے اور ڈیپوٹیشن کا بھی ولایت جانا معلوم تو بھلا تمہیں بتاؤ کہ تمہارے خواب کی تعبیر میں نے جو کچھ بتائی وہ کیوں کر غلط ہے؟ اور پھر معاملہ یہیں پر ختم نہیں ہوتا ابھی تھوڑا سا دکھڑا اور باقی ہے۔ یہ تو سچ ہے کہ کانگرس ۳۲ برس سے جو کچھ کہا کی اس پر سرکار نے بہت کم دھیان دیا۔ بہت سی باتیں سُن کر ٹال دی گئیں لیکن اُسی کے ساتھ کانگرس کی وفاداری، معقول پسندی اور شان تدبری کے دوست و دشمن سب یکساں قائل رہے اور اُس نے وہ شہرت حاصل کی کہ اُس کا لوہا سب نے مانا۔ یہی ہماری پونجی تھی۔ اور یہیں پر ہماری جیت تھی۔ سو دلی میں لیگ آف دی نیشنس اور صلح کی کانفرنس کے مسئلوں پر بہکی بہکی باتیں کر کے اور بچوں کی طرح مچل کر ہم نے پونجی بھی کھو دی اور اپنی شہرت پر بھی داغ لگایا۔ یہ تو سبجکٹس کمیٹی کا قضیہ تھا لیکن قابل یادگار سین کانگرس کا وہ اجلاس تھا کہ جس میں وہ رزولیوشن کہ جو فساد کی جڑ تھا پیش ہوا۔ مسٹر بیکش چکرورتی نے تجویز کی تحریک کی لیکن باوجود اس کے کہ اُن کی تقریر میں گر اندر بابو کی کافی خبر لی گئی تھی اُن کا انداز بیان اس قدر پھیکا تھا کہ لوگ اُکتا رہے تھے۔ مسٹر پٹیل نے تائید میں زیادہ جوش صرف کیا، لیکن محبت گرما نہ سکی۔ مسٹر شاستری کے انداز بیان اور شان تقریر کے سبھی بہت قائل تھے اور اُن کی ہمت کا ہر شخص معترف تھا لیکن جو کچھ انہوں نے کہا بہت کم لوگوں کے دل میں سمایا۔ مسز بسنٹ کی سحر بیانی تو خراج تحسین لے ہی لیتی ہے اور اُن کی یہ تقریر بھی خوب تھی۔ لیکن جن لوگوں کی باگیں وہ خود ہی پہلے ڈھیلی کر چکی تھیں اُن کا قابو میں آنا دشوار تھا۔ مسٹر ستیا مورتی نے مسز بسنٹ کی تقریر کی دھجیاں اُڑا نی چاہیں اور بال بابو نے دل لگیاں اور گدگدیاں پیدا کر کے لوگوں کو اپنا طرفدار بنایا۔ مسٹر جمنا داس دوارکا داس نے مسز بسنٹ کی حمایت میں بہت کچھ کہا لیکن حریفوں نے رنگ جمنے نہ دیا۔ مسٹر گوبند رگھوا ائر کی معقول اور مغز خیز تقریر تو کسی نے سنی بھی نہیں لیکن شاردا صاحب نے جو کچھ کہا اُس کو سُن کر بھی ٹال ہی دیا۔ آخر میں مسٹر داس نے بہت غم و غصہ کا اظہار کیا اور لوگوں کی ہمدردی رجوع کی۔ ووٹ لئے گئے تو مسٹر شاستری کو تقریباً ۱۵۰ اور مسز بسنٹ کو مشکل سے ۲۰۰ ملے ہوں گے ورنہ سب کے سب مسٹر داس کے ہمنوا تھے۔ عموماً تو لوگوں نے یہ سمجھا کہ یہ کانگرس کا ایک رزولیوشن تھا کہ جو کسی قدر مخالفت کے بعد کثرت رائے سے پاس ہو گیا اور بس۔ بعض سنجیدہ طبیعتوں کو یہ دیکھ کر ملال بھی ہوا کہ

جس طرح کلکتہ میں سر اندر بابو اور موڈریٹ کانگرس سے نکالے گئے دہلی میں اس سال مسز بسنٹ اور مہوم رولر بھی پسپا ہوئے لیکن ایسے لوگ بہت کم تھے کہ جنہوں اس حقیقت حال کو محسوس کیا ہو کہ اس دن ملک کی تاریخ کے ایک نہایت اہم درخشاں باب کا خاتمہ ہوا اور ایک ایسے دور جدید کا آغاز ہوا کہ جس کی امیدیں اور وسوسے ہماری نگاہ سے ابھی اوجھل ہیں۔ ۱۹۰۷ اور ۱۹۰۸ کی شورش میں ملک میں بہت سے فتنے اور ہنگامے برپا ہوئے۔ سازشوں اور بلودں، بم کے گولوں اور تمنچوں، خون اور خرابے سب ہی کی نوبت آئی۔ کانگرس کا دور زندگی بھی سنگین حادثوں سے نہ بچ سکا۔ مسٹر تلک جب بازی نہ لے جا سکے تو سورت میں انہوں نے ہنگامہ برپا کر کے کانگرس کو توڑنا چاہا۔ لیکن کانگرس کا نقش قوم کے دل پر جما ہوا تھا۔ اس کے معیار اور اصول ملک کے لئے قانون کا حکم رکھتے تھے۔ یہی حادثہ سورت کے دوسرے روز جب سر فیروز شاہ نے کنونشن میں زندہ باد کانگرس کا "سم سم" پڑھا، کانگرس جیتی جاگتی اٹھ کھڑی ہوئی۔ آج صورت بدلا ہوا ہے۔ کانگرس کے معیار، اصولوں اور ولولوں کی بہترین روایات کو پس پشت ڈال کر قوم دیدہ و دانستہ اپنی کشتی طوفان انقلاب میں ڈال رہی ہے اور مسٹر تلک کو اپنا ناخدا قرار دیتی ہے۔ طبیعت اسے باور نہ کرنا چاہتی ہو، زبان اسے کہتے ہوئے جھجکتی ہو، لیکن امر واقع یہ ہے کہ ۲۹ دسمبر کے اجلاس میں دور کانگرس کا خاتمہ ہوا اور انقلاب نے سر اٹھایا۔ یہ انقلاب کیا کیا رنگ لائے گا۔ کیا محض باد صرصر کے جھونکے کی طرح یہ آناً فاناً گذر جائے گا یا بہار وطن پر خزاں کی طرح چھا جائیگا، آیا یہ خلش کھٹکتی ہوئی پھانس کی طرح نکل جائے گی یا زخم بغیر مندمل ہوئے ناسور بن جائیگا؟ اس کا دار و مدار زیادہ تر سرکار عالیہ کی پولیسی پر ہے۔ اگر حکومت وقت نے اپنے نادان دوستوں کی پروا کیے بغیر ہمت و جرأت کر کے ہندوستان کے ساتھ وہ سلوک کیا کہ جس کا وہ مستحق ہے اور توقع رکھتا ہے تو گمان غالب یہ ہے کہ ۲۰ء شروع ہوتے ہوتے قوم کے ہوش و حواس بجا ہو جائیں گے ورنہ اگر سڈنہم کی ٹکڑی اور ولسی کی پارٹی سے مرعوب ہو کر سرکار ہندوستان کے ساتھ اپنا فرض نہ ادا کر سکی تو یقیناً اس ملک کے ساتھ حکومت کے لیے بھی برے دن آئیں گے۔

ایڈیٹر کا نوٹ: یہ ظاہر ہے یہ مضمون شائع ضرور کیا جاتا ہے لیکن صبح امید کا ہر مضمون کے اکثر خیالات کی روش کا ذمہ دار نہیں ہے۔ اس مضمون میں جنگش ملکی کے افسانے بھی لکھے گئے ہیں لیکن چونکہ یہ قصے خواہ ٹھیک یا غلط دیں بھی درج ہو چکے ہیں اور زبان زد عام ہیں لہذا ان کی اشاعت کی خلاف مصلحت نہیں۔

ڈاکٹر تیج بہادر سپرو

آئینی اصلاحات ہند

ڈیڑھ سال ہونے آتے ہیں کہ صاحب وزیر ہند نے دولت برطانیہ کی جانب سے دارالعوام میں یہ اعلان کیا تھا کہ ہندوستان میں برطانوی حکومت کا مقصد و منشا یہ ہے کہ اسے خودمختاری اور آزادی کی منزل مقصود تک پہونچایا جائے۔ ہمیں اس امر کا بھی یقین دلایا گیا تھا کہ ہم اپنی ہفتخوان کی پہلی منزل بہت جلد بلکہ فوراً طے کر سکیں گے۔ مسٹر مانٹیگو ہماری مبارکباد اور شکریہ کے مستحق ہیں کہ انہوں نے نہایت نیک نیتی اور صادق دلی سے حتی المقدور ایفائے عدہ کی پوری پوری کوشش کی اور غالباً وہ دن دور نہیں کہ ہماری یہ پہلی منزل طے ہو جائے۔ مسٹر مانٹیگو نے مسودۂ قانون آئینی اصلاحات ہند پارلیمنٹ میں پیش کر دیا ہے۔ وہ اس وقت ہمارے پیش نظر ہے اور قبل اسکے کہ یہ مضمون شائع ہو غالباً وہ دونوں ایوان پارلیمنٹ کی اس مشترکہ کمیٹی کے حوالہ کر دیا جائیگا کہ جو لندن میں اس مسودہ کے متعلق تجاویز پر غور کرنے کے لئے مقرر ہونے والی ہے۔ اس مسودہ پر رائے زنی کرنے کے لئے یہ لازمی ہے کہ وہ چند واقعات کہ جن کی وجہ سے گورنمنٹ برطانیہ ہندوستان کے لئے آئینی اصلاحات دینے پر آمادہ ہوئی ہے پیش نظر رکھے جائیں۔

۲۰ اگست ۱۹۱۷ء کو آئینی اصلاحات کے متعلق جو اعلان پارلیمنٹ میں کیا گیا تھا وہ وزارت برطانیہ کی رضامندی سے ہوا اور اس پر انگلستان کے کسی فرقہ یا جماعت کو کوئی اعتراض نہ تھا۔ اس کی تعمیل کی غرض سے مسٹر مانٹیگو معہ چند دیگر احباب کے ولایت سے یہاں تشریف لائے اور ہندوستان کے مختلف فرقوں اور جماعتوں کے نمائندوں سے گفت و شنید کرنے کے بعد انہوں نے اور لارڈ چیمسفورڈ نے اپنی مشترکہ رپورٹ قلمبند کی۔ جب یہ رپورٹ آئینی اصلاحات ہند گذشتہ سال شائع ہوئی تو ہم کو یہ معلوم ہوا کہ اس خواب کی تعبیر کہ جس کا تذکرہ مسٹر مانٹیگو نے پارلیمنٹ میں کیا تھا عملی طور پر کیا ہوگی۔ اس رپورٹ کے شائع ہونے کے

بعد مسٹر مانٹیگو نے دو کمیٹیاں مقرر کیں کہ جن کے صدر لارڈ ساؤتھ برو تھے ان کمیٹیوں کی رپورٹ بھی اب شایع ہو چکی ہے۔ ماسوا گورنمنٹ ہند کے وہ مراسلے بھی کہ جو ان رپورٹ کے متعلق تلمبند کر کے یہاں سے صاحب وزیر ہند کی خدمت میں بھیجے گئے ہیں مسودہ قانون کے پیش ہونے سے قبل شایع کیے جا چکے ہیں۔ ان تمام سرکاری کاغذات پر غور کرتے وقت یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جو تجاویز اس مسودہ میں قلمبند ہیں وہ اس اعلان کے کہاں تک مطابق ہیں کہ جو ۲۰ اگست ۱۹۱۷ء میں کیا گیا تھا۔ میں اس مضمون میں صرف اس سوال پر بحث کروں گا۔

اعلان مذکور میں یہ مسئلہ بالتصریح تسلیم کر لیا گیا ہے کہ ہندوستان میں بجائے مطلق العنان اور شخصی حکومت کے ایسی دستوری یا آئینی حکومت قائم کی جائے کہ جس میں عمال حکومت اپنے فعل و عمل کے لئے رعایا کے سامنے ذمہ دار قرار دیے جا سکیں اور اصول حکمت کا قرار دینا کونسلوں کے دائرہ اختیار میں ہو مگر اس مسئلہ کو چند شرائط کے ساتھ محدود کیا ہے۔ اول شرط یہ ہے کہ جو کچھ تغیر اور تبدل طریق حکومت میں ہوگا وہ تبدریج ہوگا۔ دوسری شرط یہ ہے کہ رفتار ترقی کا فیصلہ کرنا سرکار برطانیہ کے اختیار میں ہوگا۔ ہندوستان میں پہلی شرط پر تو چنداں اعتراض نہیں ہوا ہے مگر دوسری شرط سے بہ لحاظ تجربہ سابق لوگوں کی طبیعتوں میں بے اطمینانی ضرور رہے۔

مسٹر مانٹیگو اور لارڈ چیمسفورڈ نے جو تجاویز پیش کیے ہیں اُن کا خلاصہ یہ ہے کہ اول تو ووٹ دینے والوں اور کونسلوں کے ممبروں کی تعداد میں اضافہ کیا جائے۔ دوسرے یہ کہ صوبجات کو گورنمنٹ ہند کی نگرانی اور باز پُرس سے کافی آزاد کیا جائے۔ تیسرے یہ کہ صوبجات کی حکومتوں میں صیغوں اور محکموں کی تقسیم اس طرح کی جائے کہ کچھ تو ان میں سے رعایا کے نمائندوں کے اقتدار اور اختیار میں رہیں تاکہ عملی طور پر اُن صیغوں کا انتظام اور انصرام ایسے وزرا کے سپرد کیا جائے کہ جو کونسلوں میں رعایا کے نمائندوں کے روبرو ذمہ دار ٹھہرائے جا سکیں اور کچھ صیغے بدستور اُسی حصہ حکومت کے زیر انتظام رہیں کہ جو قانونی طور پر نمایندگان رعایا کے روبرو ذمہ دار نہیں ٹھہرایا جا سکتا۔ چوتھے یہ کہ گورنمنٹ ہند بدستور حالت میں قائم رہے یعنی اُس میں کوئی ایسی تفریق نہ کیجائے کہ جیسی صوبجات

میں کرنا مدنظر ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ گورنمنٹ ہند کو مثل موجودہ حالت کے اختیار باقی رہے گا کہ جو حکم احکام مناسب سمجھے بلا پابندی رائے نمایندگان رعیت جاری کر سکے، البتہ گورنمنٹ ہند کے متعلق جو قانونی کونسل ہوگی اس کے ممبروں کی تعداد موجودہ تعداد کے مقابلہ میں بہت کچھ بڑھادی جائے گی۔ منجملہ اس تعداد کے منتخب شدہ نمایندوں کی تعداد دو ثلث ہوگی۔ لارڈ ساؤتھ برو کی کمیٹی نے یہ سفارش کی ہے کہ امپریل لیجسلیٹو اسمبلی میں علاوہ گورنر جنرل کے ۱۲۰ ممبر ہوں منجملہ ان کے ۸۰ منتخب شدہ اور باقی ۴۰ نامزد کیے ہوئے ہوں گے اور نامزد کیے ہوئے میں سے ۱۴ غیر سرکاری احباب اور ۲۶ سرکاری افسر ہوں گے۔ علاوہ امپریل لیجسلیٹو اسمبلی کے گورنمنٹ آف انڈیا میں ایک کونسل آف اسٹیٹ بھی ہوگی کہ جس کی تعداد ممبران مع گورنر جنرل کے ۵۰ ہوگی اس میں سے ۲۲ منتخب شدہ ممبر ہوں گے۔ ایک برہما کا نمائندہ ہوگا اور غیر سرکاری نامزد شدہ اصحاب ہوں گے اور باقی ۲۸ سرکاری افسر ہوں گے۔ اس کونسل کے اختیارات بہت وسیع ہوں گے اور گورنر جنرل کو اختیار ہوگا کہ کوئی مسودہ قانون کہ جس کو وہ اہم اور ضروری سمجھتا ہو محض اس کونسل کے سامنے پیش کرکے کثرت رائے سے منظور کرائے۔ پانچویں تجویز یہ ہے کہ وزیر ہند کی تنخواہ برطانوی خزانہ سے دی جایا کرے تاکہ ممبران پارلیمنٹ اس کے انداز حکومت کو دیکھتے بھالتے رہیں اور ان کو ہندوستان کے معاملات سے زیادہ دلچسپی اور انہیں دخل دینے کا زیادہ موقع حاصل رہے۔

ان باتوں کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جو مسودۂ قانون کہ پارلیمنٹ میں پیش ہوا ہے وہ تجاویز مندرجہ رپورٹ آئینی اصلاحات سے کہاں تک مطابق ہے اور اس سے ہماری مطلب برآری کس حد تک ہوتی ہے۔ مسودۂ مذکور کے دیکھنے سے واضح ہوتا ہے کہ ۲۰ر اگست ۱۹۱۷ء کے اعلان کا منشا بالتصریح مسودہ کی تمہید میں شامل کردیا گیا ہے اگرچہ دستوری حکومت کا نفاذ فی الحال صوبجات کی حکومتوں ہی تک محدود رکھا گیا ہے۔ مسودہ میں ووٹ دینے والوں کی توسیع تعداد کا کوئی تذکرہ نہیں ہے۔ غالباً یہ تعداد ان قواعد کے بموجب کہ جو اس مسودہ کے مطابق نافذ کیے

جائیں گے مقرر کی جائے گی مگر اس تعداد کا کچھ اندازہ ساؤتھ برو کمیٹی کی رپورٹ کی سفارشوں سے ہو سکتا ہے۔ میں تمثیلاً اپنے صوبہ کا تذکرہ کروں گا۔ صوبجات متحدہ میں ووٹ دینے والوں کی کل تعداد ۱۴۸۲۵۰۰ ہو جائے گی۔ اگرچہ یہ اعداد دیکھنے میں بمقابلہ موجودہ حالت کے بہت زیادہ معلوم ہوتے ہیں لیکن جب کل صوبہ کی آبادی پر نظر ڈالی جاتی ہے تو یہ نہایت ہی قلیل معلوم ہوتے ہیں۔ ان کا تناسب کل صوبہ کی آبادی سے بقدر ۲ فیصدی رہ جاتا ہے یا مردوں کی آبادی کے تناسب کے لحاظ سے ۶ فیصدی ہوتا ہے۔ ۱۰ شہر ایسے ہوں گے کہ جہاں شہر کے باشندوں کو علاوہ ضلع کے باشندوں کے ووٹ دینے کا اختیار حاصل ہوگا۔ مثلاً لکھنؤ میں ½ ۱۰ ہزار ووٹر ہوں گے، بنارس میں ½ ۹ ہزار، الٰہ آباد میں ½ ۶ ہزار اور کانپور میں ۶ ہزار باقی سب کی تفصیل دینے کی ضرورت نہیں۔ ضلعوں کے لحاظ سے جو انتخابی حلقے بنائے جائیں گے ان میں ہزاروں کی تعداد ہوگی۔ مثلاً الموڑے میں مسلمانوں کو علیحدہ کر کے ۹۶۰۰۰ ووٹر ہوں گے۔ اسی طرح بلند شہر میں ۹۵۰۰۰ میرٹھ میں ۶۰۰۰۰ بیس یا پچیس ہزار کے قریب ووٹر تو بیسوں ضلعوں میں ہوں گے۔ جیسا کہ ابھی کہا جا چکا ہے آبادی کے لحاظ سے تو یہ تعداد نہایت ناکافی ہے۔ لیکن ساتھ ہی اس کے یہ بھی ماننا پڑے گا کہ موجودہ حالت کو مد نظر رکھتے ہوئے زمین و آسمان کا فرق ہے۔ مجھکو پورا یقین ہے کہ ۱۰ برس کے بعد یہ تعداد بھی نہایت ناکافی سمجھی جائے گی اور یہ ناممکن ہے کہ تعلیم میں ترقی ہونے اور سیاسیات سے دلچسپی بڑھنے کے بعد ۱۰ برس میں یہ تعداد بجائے ۲ یا ۶ فیصدی کے ۵ یا ۱۰ فیصدی نہ ہو جائے۔ لیکن یہ واضح رہے کہ گورنمنٹ ہند لارڈ ساؤتھ برو کی کمیٹی کی سفارشوں سے متفق نہیں۔ اس کے خیال میں یہ تعداد بہت زیادہ ہے اور اس کی تخفیف کی ضرورت ہے۔ میری رائے میں گورنمنٹ ہند کی رائے سے ہم کو کبھی اتفاق نہیں ہو سکتا۔ اب رہی کونسل کے ممبروں کی تعداد تو ہمارے صوبہ کے بارے میں لارڈ ساؤتھ برو نے سفارش کی ہے کہ کونسل ۱۱۸ ممبروں کی بنائی جائے۔ منجملہ ان کے ۲۷ مسلم ۵۷ غیر مسلم، ایک یوروپین ۵ تعلقہ داران اودھ، ایک زمینداران آگرہ، ایک یونیورسٹی، دو انگریزی ایوان تجارت اور ایک ہندوستانی ایوان تجارت کے نمائندے

ہوں گے۔ علاوہ بریں ۵ شخصوں کو گورنمنٹ نامزد کرے گی۔ منجملہ ان کے ایک پنچ ذاتوں کا قائم مقام ہوگا۔ دو متفرق ممبر اور ۱۸ سرکاری افسر ہوں گے۔ اس میں شک نہیں کہ ۱۰ برس بعد یہ تعداد بھی ناکافی سمجھی جائے گی۔ بالفعل اس پر کوئی خاص اعتراض نہیں کیا جاسکتا۔

دوسرا سوال کہ جس کا میں نے شروع میں ذکر کیا تھا یہ ہے کہ صوبجات کو گورنمنٹ ہند کی نگرانی اور بازپرس سے کافی آزاد کیا جائے۔ یہ معاملہ صوبجات کی حکومتوں اور گورنمنٹ ہند کے تعلقات کی پیچیدگیوں سے وابستہ ہے اور عام پبلک کے لئے زیادہ دلچسپ نہیں ہوسکتا اور نہ ناظرین کو قانونی اور اصطلاحی پیچیدگیوں میں الجھانے سے کوئی خاص فائدہ متصور ہے۔ لہذا اس پر تفصیلی بحث بیکار ہے صرف اس قدر لکھ دینا کافی ہوگا کہ گورنمنٹ ہند تین طریقوں سے صوبجاتی حکومتوں کی نگرانی کرتی ہے یعنی قانونی، انتظامی اور مالی۔ چنانچہ موجودہ حالت میں صوبجاتی حکومتوں کے فعل اور عمل پر جہاں تک کہ ان کے قانونی پہلو کا تعلق ہے گورنمنٹ ہند کافی نگہداشت رکھتی ہے اور بسا اوقات ان کی منظوری یا نامنظوری گورنمنٹ ہند پر منحصر کرتی ہے۔ اکثر قوانین ایسے ہوتے ہیں کہ صوبجات کی کونسلوں میں بلا اجازت گورنمنٹ ہند پیش نہیں کیے جاسکتے اسی طرح انتظامی معاملات میں گورنمنٹ ہند کو کافی اختیارات حاصل ہیں کہ جن کی رو سے وہ جب چاہے دخل اندازی کرسکتی ہے اور تقریباً ہر سنگین معاملہ میں مداخلت کرتی ہے۔ رہے مالی معاملات تو ان میں تو صوبجاتی حکومتیں ہر وقت گورنمنٹ ہند کی دست نگر رہتی ہیں۔ ان تینوں معاملات میں یہ تجویز ہے کہ صوبجاتی حکومتوں کو جہاں تک ممکن ہوسکے گورنمنٹ ہند کی پابندی سے آزاد کیا جائے۔ مسودۂ قانون سے قطعی طور سے ترشح ہوتا ہے کہ اس قسم کی آزادی ضرور دی جائیگی میں خیال کرتا ہوں کہ ان معاملات پر تفصیلی طور پر قواعد بنائے جائیں گے کہ جس کا اندازہ اس رپورٹ سے ہوسکتا ہے کہ جو لارڈ ساؤتھ برو کی دوسری کمیٹی نے پیش کی ہے۔ ایک معنی میں تو یہ آزادی اور خودمختاری نہایت مناسب ہے لیکن اس سے پورا فائدہ اسی وقت اٹھایا جاسکتا ہے کہ جب کہ صوبجات میں رعایا کے نمایندوں کے اقتدار و اختیار کو پورا دخل حاصل ہو ورنہ اندیشہ اس بات کا ہے کہ نہ تو ادھر سے جمہور کے اقتدار و اقتدار نہ ہونے کی وجہ سے صوبجات کی حکومتوں پر کوئی دباؤ رہے گا اور نہ ادھر سے جو قابو اور اختیار اب تک گورنمنٹ ہند اور وزیر ہند کو تھا

باقی رہ جائے گا اور صوبجاتی حکومتیں اب سے بھی زیادہ خود سر اور مطلق العنان ہو جائیں گی۔
بہرحال جس حد تک کہ صوبجاتی حکومتوں میں رعایا کے نمایندوں کا اثر اور اقتدار جتنا نظر آتا ہے اس حد تک صوبجاتی حکومتوں کا گورنمنٹ ہند کی پابندیوں سے آزاد ہونا ضرور مناسب اور مفید ثابت ہوگا۔

تیسرے سوال کے متعلق کہ جس کا تذکرہ اوپر آچکا ہے یہ عرض کرنا بے محل نہ ہوگا کہ اس کے بارے میں ہندوستان اور نیز انگلستان میں کامل اتفاق رائے ہے۔ اصل وجہ یہ ہے کہ جو تجویز مسٹر مانٹیگو نے کی ہے اس کی کوئی مثال تاریخ میں موجود نہیں۔ حکومت کی دو حصوں میں تفریق کرنا ایک ایسا نیا تجربہ ہے کہ جس کے قبول کرنے سے طبیعت جھجکتی ہے۔ چنانچہ جب اس کا اعلان کیا گیا تھا تو عام طور پر ہندوستان میں بھی اس سے اختلاف کیا گیا تھا اور میں اپنے بارے میں خود اس امر کا اعتراف کرنے کے لیئے تیار ہوں کہ ابتدا میں میں بھی اس سے جھجکتا تھا لیکن کافی غور کرنے اور تمام اسکیموں پر نگاہ ڈالنے کے بعد میری رائے یہ ہوئی کہ ۲۰ اگست کے اعلان کے منشا کے پورا کرنے کے لئے اس سے بہتر کوئی اسکیم نہیں ہو سکتی کیونکہ اگر ہم چند محکموں کے انتظام و انصرام میں کامیاب ہوئے کہ جس کی مجھے توی امید ہے تو یہ لازمی نتیجہ ہوگا کہ باقی اور محکمے بھی ہمارے سپرد کر دیے جائیں۔ یہ ہمیشہ یاد رکھنا چاہیے کہ مسٹر مانٹیگو کی یہ اسکیم محض عارضی ضروریات کے لیے ہے اور اس کے برُے یا بھلے ہونے کا ثبوت صرف تجربہ سے مل سکتا ہے جو جلسہ کہ مختلف صوبوں کے گورنروں کا پچھلی فروری میں دہلی میں ہوا تھا اس کی کارروائی پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ سوائے لارڈ رانلڈ شے اور سر ایڈورڈ گیٹ کے تقریباً اور تمام گورنر مانٹیگو چیمسفورڈ اسکیم کے خلاف تھے اگر ہندوستانیوں کو اس وجہ سے اختلاف تھا کہ یہ اسکیم ان کی توقعات کے لحاظ سے کمتر ثابت ہوتی ہے تو گورنروں اور دیگر معترضین کو کہ جن کی تعداد ولایت میں کافی ہے اس وجہ سے اعتراض ہے کہ یہ اسکیم ان کے وہم گمان سے کہیں زیادہ بڑھ چڑھ کر ہے۔ فرض کیا کہ کونسلوں میں منتخب شدہ ممبروں کی تعداد بھی زائد کر دی گئی اور انتظامی کونسلوں میں بھی ہندوستانی اب سے زیادہ پہنچنے لگے تو اس سے کیا نتیجہ۔ بجائے اس کے کہ اب ۲۰ یا ۲۵ منتخب شدہ ممبر گورنمنٹ کو اپنے اعتراضوں کی بوچھار سے کسی قدر تنگ کر سکتے ہیں تو آیندہ ۷۵ یا ۸۰ غل مچانے لگیں گے اور ہندوستانی بھی انتظامی کونسل کے ممبر ہوئے تو وہ بھی

گورنمنٹ ہی کے روبرو ذمہ دار ہوں گے نہ کہ رعیت کے نمایندوں کے سامنے۔ اصل بات یہ ہے کہ ہندوستانیوں کے ہاتھ میں اختیار اور اقتدار آنا چاہیے، تاکہ عمال حکومت یہ سمجھنے لگیں کہ ہم کو رعیت کے نمایندوں کے سامنے جوابدہی کرنا ہے۔ مسٹر مانٹیگو کی اسکیم سے یہ بات ایک حد تک یعنی کم از کم منتقل محکموں میں تو ضرور حاصل ہوتی ہے۔ میرا خیال یہ ہے کہ اس اسکیم کی مخالفت مشترکہ کمیٹی کے سامنے لارڈ سڈنہم اور ان کی ٹکڑی کی طرف سے ضرور اور سخت ہوگی۔ نتیجہ کیا ہوگا یہ کہنا تو غیر ممکن ہے مگر جہاں تک کہ سننے میں آیا ہے بڑے بڑے ذی اقتدار وزرا اور اہل الرائے اس اسکیم کی تائید کے لئے تیار ہیں۔ مسودۂ قانون میں انتقال صیغہ جات کا تذکرہ تو ضرور ہے لیکن اس کا پتہ نہیں چلتا کہ کون کون سے صیغے منتقل کیے جائیں گے۔ لارڈ ساؤتھ برو کی کمیٹی نے ۱۸ صیغوں کے انتقال کی سفارش کی ہے کہ جن میں صیغۂ تعلیم (ادنیٰ، متوسط اور اعلیٰ)، لوکل سلف گورنمنٹ، میڈیکل، حفظان صحت، آبکاری، تعمیرات، زراعت، صنعت و حرفت اور صیغۂ رجسٹری اور کوآپریشن شامل ہیں۔ صیغہ جات حفظ امن یعنی پولیس و عدالت اور صیغہ جات مال، آب پاشی جنگلات (سوائے بمبئی) وغیرہ ابھی محفوظ رکھے گئے ہیں۔

گورنمنٹ ہند نے اپنے مراسلے میں دو صیغوں کے انتقال کے بارے میں نہایت شد و مد سے مخالفت کی ہے اول تو صیغۂ تعلیم (بجز ابتدائی کے) اور دوسرے صنعت و حرفت۔ ان دونوں میں سے گورنمنٹ ہند کسی کو بھی منتقل نہیں کیا چاہتی۔ جہاں تک کہ صیغۂ تعلیم کا تعلق ہے میرے خیال میں شاید ہی دو چار ہندوستانی ایسے ہوں کہ جن کو گورنمنٹ ہند کی رائے سے اتفاق ہو۔ جہاں تک کہ اعلیٰ اور متوسط درجہ کی تعلیم کا تعلق ہے گورنمنٹ کو کامل ۶۰ برس تک یہ موقع حاصل رہا کہ وہ اس کی حالت ایسی سنبھال دیتی اور اس کو اس درجہ پر پہنچا دیتی کہ اس کو دوسروں اور غیروں کے آگے کم از کم ترسانے کی نوبت تو نہ آتی۔ بصورت حال یہ ہے کہ اس کی موجودہ کیفیت سے نہ تو خود گورنمنٹ ہی مطمئن ہے اور نہ لوگ ہی خوش ہیں۔ اصل یہ ہے کہ ایک قوم دوسری قوم کو تعلیم نہیں دے سکتی۔ اگر کوئی معاملہ ایسا ہے کہ جس میں ہم کو خود مختاری کا حق یقینی طور پر حاصل ہے تو وہ تعلیم ہے۔ تعلیم ہی پر ہمارے ہست و نیست کا دار و مدار ہے۔ میری رائے میں ہندوستان میں تعلیم کبھی اسی وقت

تک نشو ونما نہیں پا سکتی کہ جب تک اُسے سیاسی علتوں سے بری نہ کیا جائے۔ اگر اس مسئلہ کے متعلق تفصیلی گفتگو کی جائے تو مجھے ایک علیحدہ مضمون لکھنا پڑے گا اسوقت میں گورنمنٹ کی رائے کے خلاف صرف دو چار موٹی موٹی باتیں لکھنے پر اکتفا کردوں گا۔ اوّل تو یہ کہ سر سنکرن نائر ممبر صیغۂ تعلیم حکومت ہند کی خود یہ رائے ہے کہ محکمۂ تعلیم کلیۃً "منتقل ہونا چاہیے۔ اگر سر سنکرن نائر کی نسبت یہ کہا جائے کہ وہ ہندوستانی ہیں تو سر ہارکورٹ بٹلر حکومت ہند میں صیغۂ تعلیم کے ممبر رہ چکے ہیں اور اس صوبہ کے لفٹنٹ گورنر کی حیثیت سے بھی ہماری تعلیمی حالت سے بخوبی واقف ہیں اُنہوں نے لارڈ ساؤتھ برو کی کمیٹی کے روبرو انتقال محکمۂ تعلیم کی پوری پوری تائید اور سفارش کی ہے علاوہ اس کے گورنمنٹ بمبئی نے بھی یہی خیال ظاہر کیا ہے شاید ناظرین کو یہ سُن کر تعجب ہو کہ سر مائیکل او ڈائر کے سے لفٹنٹ گورنر کی طبیعت کا رجحان بھی اسی طرف پایا جاتا تھا۔ صوبۂ بہار کی گورنمنٹ اعلیٰ اور متوسط درجہ کی تعلیم اس وجہ سے منتقل نہیں کرنا چاہتی کہ صوبہ نیا ہے اور یونیورسٹی بھی نئی ہے اور تقریباً ایک کروڑ روپیہ کے اس صوبہ کو تعلیم کے لئے درکار ہے۔ ممالک متوسط کی حکومت نے انتقال تعلیم سے اس بنا پر اختلاف کیا ہے کہ وہ تو کوئی محکمہ بھی منتقل کرنا پسند نہیں کرتی۔ اب رہی مدراس کی حکومت تو وہ تو کسی قسم کی بھی نقل و حرکت کے جڑ ہی سے خلاف ہے۔ سوائے ۲ ڈائرکٹران سررشتہ تعلیم کے تقریباً سب محکمۂ تعلیم کے منتقل کردینے کے موافق ہیں۔ اب خود ساؤتھ برو کمیٹی کو لیجیے اس میں تین سویلین تھے اور تین ہندوستانی۔ تینوں سویلین یعنی مسٹر ٹامسن چیف سکریٹری پنجاب گورنمنٹ، مسٹر اسٹیفینس چیف سکریٹری بنگال گورنمنٹ اور مسٹر کوچین ممبر صیغۂ مال مدراس محکمۂ تعلیم کے منتقل کردینے کے موافق ہیں بجز اس کے کہ مسٹر کوچین مدراس میں خاص وجوہ کی بنا پر اسکا منتقل کرنا پسند نہیں کرتے۔ خود چیرمین صاحب مسٹر فیڈہم بھی انتقال تعلیم کے موافق ہیں۔ اب رہے تین ہندوستانی ممبر یعنی سر چمن لال سیتلواد جو عرصہ سے بمبئی یونیورسٹی کے وائس چانسلر ہیں، سر رحیم بخش وزیر ریاست بہاولپور اور خود راقم الحروف ہم سب کی رائے تعلیم کے منتقل کرنے کے موافق تھی۔ قصہ مختصر بہت زیادہ کثرت رائے انتقال تعلیم کے موافق تھی اور ہے اور جو وجوہ کہ گورنمنٹ ہند نے

اپنے مراسلہ میں اس کی مخالفت میں پیش کیے ہیں ان کو کوئی ذی واقف کار شخص یا عاقبت اندیش طبیعت قبول نہیں کر سکتی۔ اسی طرح صیغۂ صنعت و حرفت کی نسبت کہا جا سکتا ہے کہ جہاں تک کہ انگریزی تجارت کا تعلق ہے نہ اس پر کوئی حملہ کیا گیا ہے اور نہ اس پر حملہ ہونا قرین قیاس ہے۔ لارڈ ساؤتھ برو کی کمیٹی نے باتفاق رائے اس کے منتقل کرنے کی سفارش کی ہے۔ یہی دو صیغے ایسے ہیں کہ جن کے منتقل کرنے سے ہماری قابلیت کا اندازہ ہو سکتا ہے اور جن پر قابو اور اختیار حاصل ہونے سے قوم کی ترقی اور بہبودی کی بنیادیں پختہ کی جا سکتی ہیں۔ اگر یہ دونوں صیغے منتقل نہ ہوئے تو میرے خیال میں ہندوستانیوں کو سخت مایوسی ہوگی بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ ہندوستان میں سخت ناراضی پھیلے گی۔

اب اس مسئلہ کے متعلق دو باتوں کا تذکرہ کرنا اور باقی ہے۔ اوّل تو یہ کہ اصلاحات جاری ہونے کے بعد ہمارے جو وزرا مقرر کیے جائیں گے ان کی صوبجاتی حکومت میں کیا حیثیت ہوگی۔ دوسرے یہ کہ صوبوں کے بجٹ یعنی مالی معاملات میں ہم کو کس قدر دخل اور کیا اختیار حاصل ہوگا۔ پہلے سوال کے متعلق اگر گورنمنٹ ہند کی اُس رائے پر کہ جو ان کے مراسلوں میں درج ہے غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ ہمارے وزرا کو نہ آزادی دینا چاہتی ہے اور نہ واقعی کوئی اختیار۔ ایسے وزرا کے رکھنے سے کیا فائدہ کہ گورنر جب چاہے علیحدہ کر دے، جن کی رائے کے خلاف ان کے ماتحتوں کی شکایات ان کے پس پشت گورنر سنا کرے یا جن کے عہدوں کا قائم رہنا گورنر کی خوشی یا ناخوشی پر منحصر ہو۔ گورنمنٹ ہند نے اگر کوئی بات ڈھنگ کی لکھی ہے تو صرف اس قدر کہ نئی کونسلوں کے ابتدا ہی سے وزرا ان کے روبرو ذمہ دار قرار دیے جا سکیں گے۔ مجھ کو تعجب ہوگا اگر مسٹر مانٹیگو گورنمنٹ ہند کی اُن تجاویز کو کہ جو انہوں نے وزرا کے متعلق تحریر کی ہیں منظور فرمائیں گے۔ میرے خیال میں ہم ہندوستانیوں کو صاف کہہ دینا چاہیے کہ اگر آپ وزرا مقرر کرتے ہیں تو ذی اختیار اور ذمہ دار وزرا مقرر کیجیے ورنہ کھلونوں سے بہلانے سے کام نہ چلے گا۔ انجام کار کیا ہوگا اس کا پتہ مسودۂ قانون سے نہیں چلتا غالباً اس کا فیصلہ بھی ان قواعد پر چھوڑ دیا گیا ہے کہ جو قانون اصلاحات کی تکمیل کی غرض سے مرتب کیے جائیں گے۔

اب میں بجٹ کے متعلق مختصراً عرض کروں گا۔ اس وقت جو حالت ہے وہ یہ ہے کہ جب کونسلوں میں بجٹ پیش ہوتے ہیں تو ممبروں کو اختیار ہے کہ ترمیم اور تنسیخ کی غرض سے اپنی تجاویز پیش کریں اور مختلف مدوں میں اضافہ یا تخفیف چاہیں۔ لیکن نہ تو یہ تجاویز جو بکثرت ممبران سرکاری کے بالعموم منظور ہوتی ہیں اور نہ ان کا کوئی خاص اثر ہوتا ہے اور اگر کسی طرح سے یہ منظور ہو بھی جائیں تو سرکار ان پر عمل کرنے کے لئے پابند نہیں۔ اس نقص کے اصلاح کی غرض سے اپنی رپورٹ کی دفعات ۲۵۶ اور ۲۵۷ میں مسٹر مانٹیگو اور لارڈ چیمسفورڈ نے بجٹ کے متعلق خود ایسی تجاویز تحریر فرمائی ہیں کہ اگر وہ اثر پذیر ہو جائیں تو حسب ذیل نتائج ظاہر ہوں گے۔ اول یہ کہ بجٹ دونوں حصص حکومت کے لئے مشترکہ طور پر تیار کیا جائے گا۔ دوسرے یہ کہ صوبہ کی آمدنی پر پہلا مواخذہ حکومت ہند کا ہوگا یعنی یہ کہ وہ رقم کہ جو منجانب صوبہ گورنمنٹ ہند کو دینا قرار پائے گی سب سے پہلے ادا کی جائے گی۔ دوسرا مواخذہ ان محکموں کا ہوگا کہ جو محفوظ محکموں کی فہرست میں شمار ہوں گے بعدہ وہ جو کچھ کہ بچے گا منتقل صیغوں کے حوالہ کیا جائے گا، اگر اس سے منتقل صیغوں کی ضروریات پوری نہ ہوں گی تو مزید ٹیکس لگا کر کمی کو پورا کیا جائے گا، خواہ منتقل صیغوں کی ضروریات پورا کرنے کے لئے یا کسی اور ضرورت کے واسطے غرضکہ جس حال میں بھی ٹیکس کی تجویز پیش کی جائیگی وزرا کی رضامندی لازمی ہوگی۔ بلا اُن کی رضامندی کے کوئی ٹیکس نہ لگایا جاسکے گا۔ کونسل کو اختیار ہوگا کہ وہ اُسے منظور کرے یا نہ کرے۔ سوئم یہ کہ جب بجٹ کونسل کے سامنے پیش ہوگا تو اُس کے متعلق کونسل کے ممبروں کو اختیار ہوگا کہ جو تجویز چاہیں پیش کریں اور اگر کوئی تجویز بکثرت رائے منظور ہو جائے تو عموماً اس پر عمل کیا جائے گا اور گورنمنٹ اُس کی پابند ہوگی۔ لیکن اگر صیغۂ محفوظ کے متعلق کوئی ایسی تجویز منظور ہوگی کہ جو گورنر کی رائے میں حفظ امن یا صوبہ کی بہبودی کے خلاف ہے تو اُس سے اختلاف کر کے اصلی تجویز بجٹ کو گورنر بحال کر سکے گا۔ ان تجاویز سے ظاہر ہے کہ ہم کو ان سے تین بڑے فائدے متصور ہیں۔ اول تو یہ کہ کونسلوں کے اختیارات مالی معاملات میں بہت کچھ وسیع اور پر اثر ہو جائیں گے کیونکہ جب بجٹ پر ووٹ لیا جائے گا تو ہر ایک ممبر گورنمنٹ کو خواہ وہ انتظامی کونسل کا ممبر ہو یا وزرا میں سے ہو یہ ملحوظ خاطر رکھنا پڑے گا کہ بجٹ ایسا ہو کہ آسانی سے منظور ہو جائے اور مقبول عام ہو۔ دوسرا نفع یہ ہے کہ اگرچہ محفوظ صیغوں میں ہم کو پورا دخل اور

اختیار حاصل نہ ہوگا لیکن بوجہ بجٹ پر ووٹ ہونے کے ہماری رائے کا اثر ان محکموں پر بھی پڑا کرے گا۔ تیسرا نفع یہ ہوگا کہ ٹیکس لگانے کا اختیار خود کونسل کو ہوگا۔ اور یہ تجویز صرف وزرا ہی کی تحریک سے پیش ہو سکا کرے گی۔ اس تمام تجویز کو "کیسۂ مشترکہ" کے نام سے نامزد کیا گیا ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ اس کل تجویز کے عمل پذیر ہو جانے سے عملی طور پر دقتیں نہیں ہوں گی اور جو اعتراض کہ گورنمنٹ ہند نے اپنے مراسلے میں اس تجویز پر کیے ہیں محض بے معنی ہیں۔ مگر جب ان فوائد پر نظر ڈالی جاتی ہے کہ جن کا تذکرہ میں نے ابھی کیا ہے تو میری رائے میں گورنمنٹ ہند کے اعتراضوں میں بہت کم وزن رہ جاتا ہے۔ یہ کہنا زیادہ قرین انصاف ہوگا کہ اگر گورنمنٹ ہند کی جدید تجاویز کا کہ جن کا منشا یہ ہے کہ ہر حصۂ حکومت کا بجٹ قطعی علیحدہ ہو ہر ایک کی آمدنی کے ذرائع علیحدہ ہوں اور گورنمنٹ کا ہر حصہ اپنی ضروریات کو ملحوظ رکھ کر جدید ٹیکس سے (کہ جو منجانب لوکل گورنمنٹ لگایا جائے گا) اپنی کمی کو پورا کرے اور بجٹ پر کونسل کا ووٹ نہ لیا جائے مان لی جائیں تو جو اختیارات مالی ہم کو اصل تجویز سے ملنے والے ہیں بالکل ہاتھ سے جاتے رہیں گے اور ان کے ضائع ہو جانے سے کونسلوں کے اقتدار اور اثر میں بے حد کمی ہو جائے گی۔ میری رائے میں گورنمنٹ ہند کی جدید تجاویز محض انتظامی تجاویز نہیں بلکہ اصولی ہیں اور جس اصول پر یہ مبنی ہیں وہ اس اصول کا بالکل متضاد ہے کہ جو مسٹر مانٹیگو اور لارڈ چیمسفورڈ نے اپنی ابتدائی رپورٹ میں تسلیم کیا ہے میں اس کے فروعی پہلوؤں پر اس مضمون میں کچھ لکھنا فضول سمجھتا ہوں لیکن اصولاً مجھ کو گورنمنٹ ہند کی تجاویز سے قطعی اختلاف ہے۔ یہ واضح رہے کہ گورنمنٹ ہند کی تجاویز کی ساؤتھ برو کمیٹی نے تائید نہیں کی ہے بلکہ اس بات پر اعتراض کیا ہے کہ یہ تجاویز کمیٹی کے سامنے ایسے تنگ وقت پر پیش کی گئیں کہ ان پر بحث کرنا اور جواب لکھنا ممکن نہ تھا یعنی جس وقت کہ کمیٹی اپنا کام تقریباً ختم کر چکی تھی یہ بھی واضح رہے کہ سر شنکرن نائر نے بھی اپنے ہمجلیسوں سے نہایت شد و مد کے ساتھ اختلاف کیا ہے۔ مسودۂ قانون کے دیکھنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مسٹر مانٹیگو اپنی اصلی تجاویز پر ہی قائم ہیں اور گورنمنٹ ہند کی نئی تجاویز پر انہوں نے توجہ نہیں کی ہے۔

چونکہ چند صیغے محفوظ رکھے گئے ہیں اور یہ ظاہر ہے کہ اس کا احتمال واجب طور سے ہو سکتا ہے کہ جو قوانین کہ ان محکموں کے متعلق پیش کیے جائیں وہ بوجہ کثرت تعداد منتخب شدہ ممبروں کے منظور

نہ ہوسکیں، لہٰذا اس مشکل سے بچنے کی غرض سے یہ تدبیر سوچی گئی ہے کہ کونسل کے ممبروں ہی میں سے ایک ایسی کمیٹی مقرر کی جائے کہ جس کے سپرد تمام ایسے مسودات قانون کیے جائیں کہ جن کی جانب سے سترد ہو جانے کا خوف ہے۔ اس کمیٹی کا نام "گرانڈ کمیٹی" تجویز کیا گیا ہے۔ اس کمیٹی میں کثرت سرکاری نامزد شدہ ممبروں کی ہوگی کہ جن کی امداد سے یہ قوانین منظور کیے جا سکیں گے۔ یہ ایک نہایت ہی پیچیدہ طریق ہوگا اور میرے خیال میں اس کی ضرورت ہے کہ اس کے طرز عمل درآمد کو زیادہ سلیس بنایا جائے۔ علاوہ بریں سرکاری نامزد شدہ ممبروں اور دیگر ممبروں کا تناسب بھی محتاج ترمیم ہے۔ گورنمنٹ ہند کے بارے میں کچھ تو پیشتر عرض کیا جا چکا ہے، یہاں پر اس قدر عرض کر دینا ضروری ہے کہ جبکہ صوبجات میں طرز حکومت بدلا جا رہا ہے تو گورنمنٹ ہند میں بھی کچھ جزو ذمہ داری ضرور داخل ہونا چاہیے۔ اس مسئلہ کے متعلق ہندوستان کی کسی سیاسی جماعت میں کوئی اختلاف نہیں۔ مگر مسٹر مانٹیگو اور گورنمنٹ ہند کی رائے یہ معلوم ہوتی ہے کہ چونکہ گورنمنٹ ہند مرکزی حکومت ہے اس میں کم از کم اس وقت تو کسی قسم کا ضعف نہ آنا چاہیے۔ جب کہ صوبجات میں نئے طرز حکومت کی کافی آزمائش ہو چکے گی اور کافی تجربہ حاصل ہو جائے گا اس وقت اس طرف توجہ کرنے کی ضرورت ہوگی۔ بخلاف اس کے ہندوستانیوں کا یہ خیال ہے کہ گورنمنٹ میں بھی ذمہ داری کا جزو داخل ہو جانے سے بجائے ضعف کے حکومت کو تقویت حاصل ہوگی۔ مسودۂ قانون کے دیکھنے سے مجھے یہ امید نہیں پڑتی کہ اس معاملہ میں ہمارے خاطر خواہ کوئی تبدیلی کی جائے۔ میرا ذاتی خیال تو یہ ہے کہ غالباً مسٹر مانٹیگو اور ان کے مشیر یہ سمجھتے ہیں کہ اگر گورنمنٹ ہند میں کسی تبدیلی کرنے کا سوال اٹھایا گیا تو نہ صرف گورنمنٹ ہند، بلکہ دوسرے اینگلو انڈین حضرات کی طرف سے ایسی سخت مخالفت ہوگی کہ ممکن ہے کہ جو اصلاحات صوبجات کے متعلق تجویز کی جا رہی ہیں وہ بھی خطرے میں پڑ جائیں۔

مسودۂ قانون میں محض چند اصولی باتیں درج ہیں اور اکثر اہم اور ضروری سوالوں کا فیصلہ قواعد کی ترتیب پر چھوڑ دیا گیا ہے کہ جو غالباً پارلیمنٹ کی مشترکہ کمیٹی کے روبرو پیش کیے جائیں گے۔ "آئینی اصلاحات ہند" کے کئی پہلو اور رخ تو ہم نے اب تک مانٹیگو چیمسفورڈ رپورٹ، ساؤتھ برو رپورٹ، گورنمنٹ ہند کے مراسلوں اور مسودۂ قانون میں دیکھ لیے۔ اب دیکھنا ہے کہ پارلیمنٹ کی مشترکہ کمیٹی کے پردۂ غیب سے کیا ظاہر ہوتا ہے۔ قصہ مختصر ہماری کیفیت اس وقت بیم و امید کی ہے۔ ساحل تو دکھ رہا ہے لیکن موجوں کے تھپیڑے اور باد صرصر کے جھونکے وہاں تک پہنچنے نہیں دیتے۔ دیکھیے کب تک اور کیسے بیڑا پار ہو۔

(جولائی۔ اگست ۱۹۱۹ء)

یوسف الزماں آسیونی

مساوات کا مسئلہ

ریحانہ (جنوری ۱۹۲۱ء میں شائع شدہ) 'معیار قومیت' از مسٹر یوسف الزماں آسیونی کا اقتباس:-

"اتحاد عالم کو استوار کرنے کے لئے ایک اور شئے ضروری ہے لیکن جس کا خیال ہندوستان میں بہت کم لوگوں کو ہے وہ "مساوات" ہے۔ یہ صرف کہنے کی بات ہے کہ ہم بیوروکریسی (مطلق العنان حکام) کے غلام ہیں۔ سب سے پہلے ہم جاہ و ثروت، شرافت و نجابت، تفریق مراتب اور پرانی رسم و رواج کے غلام ہیں۔

بیوروکریسی کی غلامی تو سب کے بعد آتی ہے۔ اگر آج ہم ان سب کی غلامی سے آزادی حاصل کریں تو بیوروکریسی کی غلامی سے ہم خود بخود آزاد ہو جائیں گے۔ ہم میں کتنے لوگ ہیں جو غریب دیہاتی کاشتکاروں کو نیم وحشی نہیں تصور کرتے۔ ہم میں کتنے ہیں جو زمینداروں اور تعلقہ داروں کی کثیر دولت، ان کے باہمی مراتب، ان کے خدم و حشم کو نظر استحسان نہیں دیکھتے۔

کاش کہ ہم ان برہنہ کاشتکاروں اور مفلس ملکی بھائیوں کا بھی خیال کرنے لگیں جن کا پیٹ کاٹ کر ہم اپنی شکم پری نہیں بلکہ شکم سیری کر رہے ہیں۔ کاش ہم وقتاً فوقتاً ان کروڑوں بے دست و پا ہندوستانیوں کی افسوسناک حالت سے متاثر ہونے لگیں جو اچھوت کے نام سے پکارے جاتے ہیں اور جو اگر آج اپنے بھائیوں کو چھوڑ بیٹھیں تو ارباب دولت کا سارا سامان اور کر و فر "سیمیا کی سی نمود" ہو جائے۔ افسوس ہم ابھی دولت کے بندہ ہیں اور تفریق مراتب اور ذات پات کے خیال کو ہم نے مذہبی حرمت دے رکھی ہے۔ ہندوؤں میں برہمن چھتری وغیرہ دوسروں کو اپنے برابر نہیں سمجھتے اور مسلمانوں میں بھی زیادہ تعداد ایسے لوگوں کی ہے جن کو کم از کم شادی بیاہ کے وقت کسی عربی النسل ہی کی تلاش ہوتی ہے۔ بمشکل سے کوئی مسلمان گھرانا ایسا ہوگا جو خود کو ہندوستانی نومسلم سمجھتا ہوگا۔ ورنہ ہر ایک اس بات کا مدعی ہے کہ ہمارے اجداد عرب، ایران، بخارا، کابل وغیرہ سے آکر یہاں آباد ہوئے اور اس طرح وہ خود کو ہندوستانی کہتے ہوئے ایک قسم کی ذلت سی محسوس کرتے ہیں۔

کوئی ان بندگان "مدارج" اور دشمنانِ "مساوات" سے پوچھے کہ آپ عرب اور کابل و بخارا سے اپنے تعلقات تاریخی اور نسلی حیثیت سے ثابت تو کریں۔ اتنے ہی سوال پر وہ آمادۂ فساد ہو جائیں گے۔ کیونکہ ان کا عربی الاصل ہونا ویسی ہی بدیہی ہے جیسا کہ دو اور دو چار کا ہونا۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ مسلمان ہوئے کو جہاں دس بیس نسلیں گزر گئیں بس خاص عرب اور صحابہؓ سے شجرۂ خاندانی کے ملا دیئے کہ وہ "قانوناً" حقدار ہو گئے۔ اس گروہ کے نزدیک دوسرے مسلمان گو مذہباً نہیں۔ تاہم سوشیل حالات میں بالکل حقیر اور کمتر ہیں۔

"اتحاد عالم" کے خیال کو عملی جامہ پہنانے کے واسطے ہندوستان کے سچے بہی خواہوں کو موجودہ تفریق مراتب کے جلوہ کا راز فاش کرنے میں کوشش، استقلال اور زبردست ایثار دکھانا ہوگا۔ یاد رہے کہ جب تک ہم میں اس طرح کی دولت اور تفریق مراتب کا خیال موجود رہے گا حقیقی بین الاقوامی جماعت کبھی وجود میں نہیں آسکتی۔"

(بذیلیہ ہمارے معاصر ضیا: جنوری ۱۹۲۱ء)

برج نرائن چکبست

اورنگ زیب عالمگیر کے بارے میں

مخزن کے جون نمبر میں پنڈت دتّاتریہ پرشاد صاحب نے ایک مضمون شاہنشاہ عالمگیر کی ثنا و صفت میں تحریر فرمایا ہے۔ عالمگیر کی مدبّری اور اصول سیاست سے باخبری اس کا زہد و تقویٰ اس کی جفاکشی اور مشقت سے ہر شخص واقف ہے اس کے ساتھ جو ناگوار اور ناجائز واقعات اس کے وقت میں ہوئے وہ بھی کسی سے پوشیدہ نہیں۔ پنڈت دتّاتریہ پرشاد صاحب کے مضمون سے ان کی جدّت اور بے تعصبی کا ثبوت ضرور ملتا ہے مگر ہم ان کی تاریخ دانی اور فلسفہ کے قائل نہیں ہو سکتے۔ عالمگیر پر دو بڑے الزام یہ ہیں کہ اس نے سلطنت حاصل کرنے کے لئے اپنے باپ اور بھائیوں کے ساتھ نہایت بُرا برتاؤ کیا اور غیر مسلموں کو ان کی مرضی کے خلاف مسلمان بنانا چاہا۔ پہلے اعتراض کے جواب میں پنڈت دتّاتریہ پرشاد صاحب فرماتے ہیں: "دیکھئے مسلمانوں کی نسبت ہندو کتنے تنگ نظر واقع ہوئے ہیں۔ ارجن نے بھی تو کوروکشیتر کے میدان پر ایک سو چچیرے بھائیوں کو پچھاڑا تھا لیکن کیا مجال جو کوئی ہندو اس پر حرف گیری کر جائے بلکہ سب کے سب یک زبان ہو کر کہتے ہیں کہ کرشن نے تو پہلے ہی سے کوروں کو نشانۂ اجل بنا رکھا تھا صرف ارجن کے سر پر ظفر مندی کا سہرا باندھنا مقصود تھا جو اس کے ہاتھوں میں شمشیر دی گئی۔ ادھر اورنگ زیب جیسے باکمال شخص کی آہ اس کے معدہ پر داز بھائیوں پر اثر کر گئی، تو بجائے اس کے کہ مسلمان بھائی خدا کی حکمت کاملہ کے قائل ہوتے سارا قصور اورنگ زیب کے سر مڑھتے ہیں"۔ تعجب ہے کہ پنڈت دتّاتریہ پرشاد صاحب ارجن اور اورنگ زیب کے معاملہ میں فرق نہیں کر سکتے۔ دریودھن غاصب تھا اس نے یدھشٹر اور اس کے بھائیوں سے ان کا حق فریب سے چھینا تھا۔ ان کو طرح طرح کی اذیتیں دی تھیں، بھرے دربار دروپدی کی آبروریزی کرنی چاہی تھی اور آخر میں بارہ برس کی جلاوطنی کے بعد اپنے باپ دھرت راشٹر کی رائے کے خلاف پانڈوں کو ان کا حق دینے سے انکار کر دیا تھا اور یہی لڑائی کی بنا تھی۔ کیا شاہجہاں، دارا، شجاع اور مراد نے بھی اورنگ زیب سے ایسے ہی سلوک کیے تھے؟ اورنگ زیب نے اگر بھائیوں کو قتل کیا اور باپ کو قید کیا تو اس لئے کہ وہ اس کے

مصالح ملک گیری میں حائل تھے۔ ارجن کا معاملہ اورنگ زیب کے معاملے سے بالکل مختلف ہے اور ارجن کے فعل اورنگ زیب کے واسطے حجت نہیں ہو سکتے۔ دوسرے الزام کو دفع کرنے کی بھی پنڈت صاحب نے کوشش کی ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں: "اگر اس نے (عالمگیر نے) کسی شخص کو مسلمان ہونے کی ترغیب دی ہے، تو اس نے محبت کے خدمات سے متاثر ہو کر ایسا کیا ہے۔ وہ چاہتا تھا کہ مذہب کی جس جنس گراں بہا سے وہ خود مالا مال ہوا ہے اس سے اس کی رعایا بھی بہرہ ور ہو۔ اگر اس نے مسمار شدہ مندروں کی جگہ مسجدیں بنوا دی ہیں تو اس خیال سے کہ خانۂ خدا بنانے کے لئے اس کے پاس مسجد کے نقشہ سے بہترین کوئی پلین (نمونہ) تھا ہی نہیں۔" پنڈت دتّہ پرشاد صاحب کو معلوم ہونا چاہیے کہ مذہب کی آڑ میں جتنے مظالم دنیا میں ہوئے ہیں یہ اصول ان سب پر حاوی ہے۔ فرنگستان میں رومن کیتھولک پادری پروٹسٹنٹ فرقہ کے لوگوں کو اسی اصول پر زندہ جلاتے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ یہ لوگ گمراہ ہیں اور ہم ان کو راہ راست پر لانا چاہتے ہیں۔ جسم روح کے مقابلہ میں نہایت حقیر ہے، ہم ان کے جسم کو جو فانی ہے جلا کر ان کی روح کو عذاب ابدی سے بچانا چاہتے ہیں۔ اگر اس وقت عیسائی حکام مندروں اور مسجدوں کو مسمار کر کے گرجا بنانا شروع کریں تو ان کا فعل بھی پنڈت دتّہ پرشاد صاحب کے اس اصول کے تابع ہو سکتا ہے کہ خانۂ خدا بنانے کے لئے ان کے پاس گرجا کے نقشہ سے بہتر کوئی پلین ہے ہی نہیں، کیونکہ ہر مذہب کا پیرو اپنے مذہب کو حق اور دوسرے مذہب کو باطل سمجھتا ہے۔

(بذیل ہمارے معاصرین: جولائی، اگست ۱۹۱۹ء)

●●

وشنو پرشاد فدا

(اورنگ زیب عالمگیر پر چکبست کی تحریر کے جواب میں) مراسلہ

کرمفرمائے برحال بندہ جناب اڈیٹر صاحب دام عنایتہٗ

نیاز مندی۔ آپ نے میرے ایک مضمون پر جو رسالہ 'مخزن' کے جون نمبر میں شہنشاہ عالمگیر خلد آشیانی کے عنوان سے شائع ہوا ہے، جو تنقیدی نوٹ لکھا ہے میں اس کی محققانہ اسپرٹ پر صاد کرتا ہوں۔ تاہم چونکہ آپ کے اور میرے نکتۂ خیال میں بہت فرق ہے اس واسطے میرا فلسفہ آپ پر کچھ اثر نہیں کر سکا۔ میں نے تاریخ کے مستند واقعات کو نظر انداز نہیں کیا اور نہ ہی ایسا کر سکتا ہوں۔ ہاں جس رنگ اور پیرایہ میں بعض مورخوں نے انہیں پیش کرنا چاہا ہے، مجھے اس میں تعصب اور بے انصافی کی جھلک دکھائی دی ہے۔ تاریخ کسی پردۂ غیب کی آواز کا نام نہیں کہ اس کی راستی یا ناراستی پر کوئی حجت نہ اٹھائی جاسکے۔ آپ ایک سانحہ کو ایک رنگ میں لکھیں گے، میرا رنگ جداگانہ ہوگا۔ وقائع نعمت خان عالی کو ایک نظر دیکھ جائیے۔ جا بجا جگہ پر مبالغہ اور افترا پردازی کا پتہ چلتا ہے، تو پھر کس طرح اس کی اور اس کے معاصرین کی تحریروں کو پتھر پر لکیر سمجھ لیں۔

شہنشاہ عالمگیر کو جہاں کی دار و گیر سے مخلصی پائے ہوئے دو سو برس سے زائد عرصہ ہونے کو آیا ہے اور بمصداق ان اشعار کے کہ:

گذرتی ہے مزے میں زندگی غفلت شعاری سے — مرے نزدیک بیہوشی ہے بہتر ہوشیاری سے
زباں کھولیں گے مجھ پر بد زباں کیا بد شعاری سے — کہ میں نے خاک بھر دی ان کے منہ میں خاکساری سے

ہماری مدح اور ذم کا اس پر کوئی اچھا یا برا اثر نہیں ہو سکتا۔ میں نے فقط انصاف کے تقاضے سے مجبور ہو کر وہ مضمون لکھا تھا۔ میرے جذبات گوارا نہیں کرتے کہ میں مختلف ذرائع سے ایک بادشاہ کے تدبر اس کے زہد و تقوی، اس کی خدا ترسی اور منکسر المزاجی کا بھی قائل ہوں اور ساتھ ہی اسے جابر، طماع و کوتاہ اندیش بھی گردانتا ہوں۔ عقل سلیم نے گواہی دی کہ یا تو اس کا باپ کو قید کر دانا اور بھائیوں کو تلوار کے گھاٹ اتروانا نظر کا دھوکا تھا، یا اس کی ریاضت و پرہیزگاری اور خیرات و زکوٰۃ محض نمائشی تھی اور اس کی عمر بھر کا فقیرانہ انداز محض ایک سوانگ تھا جو اس نے خود غرضی کی بنا پر بھرا تھا۔

تاریخ گواہ ہے کہ جس وقت شاہجہاں کو عارضۂ جانکاہ لاحق ہوا، تو دارا شکوہ نے اپنے بھائیوں سے

اس کی علالت کو عمداً چھپانا چاہا۔ پھر جب شاہزادے اپنے والد محترم کی تیمار داری کے لئے آئے تو وہ انہیں ملنے نہیں دیتا تھا۔ اس سے آپ خود اندازہ لگالیں کہ ان بھائیوں کے تعلقات کس قدر کشیدہ تھے۔ آخر جب اورنگ زیب کو وہاں دخل ہوا تو اس کی غیرت گوارا نہ کر سکی کہ ایسے مفسدہ پرداز بھائی والد کی علالت میں اس کے گرد موجود ہوں۔

ممکن ہے شاہجہاں کے عارضے نے ہی کچھ ایسی خطرناک صورت اختیار کرلی ہو کہ مصلحت وقت کے خیال سے اُسے الگ رکھنا منظور ہو یا معاملات اس قدر طول پکڑ چکے ہوں کہ عالمگیر کو کسی جفا کیش بھائی کو بادشاہ کے نزدیک آنے دینا گوارا نہ ہو۔ اس قسم کی علیحدگی کو عام آدمی قید سے تعبیر کریں گے۔ لیکن خدائے عزوجل کے بغیر کوئی قیاس نہیں لگا سکتا کہ آیا اس قسم کی علیحدگی ثواب میں داخل تھی یا ایک مجرمانہ حرکت تھی۔ کم از کم اس بیسویں صدی میں تو ایک مریض کو علیحدہ رکھنے میں کوئی بُرائی متصور نہیں ہوتی۔[1]

نیز اس میں بھی شک نہیں کہ بیماری سے اٹھ کر شاہ جہاں نے تخت پر جلوس نہیں فرمایا۔ لیکن کوئی مستند شہادت موجود نہیں کہ آیا جبراً اسے تخت سے علیحدہ رکھا گیا یا اس نے خود جہانبانی کی زحمتوں سے کنارہ کشی اختیار کرلی۔ ہاں اس بات کی شہادت موجود ہے کہ شاہجہاں اپنے چاروں شاہزادوں میں سے اورنگزیب کو سب سے زیادہ مستعد اور معاملہ فہم سمجھتے تھے اور ان کی دلی خواہش تھی کہ ان کا جانشین اورنگ زیب ہو اور ایسا کہیں ذکر نہیں آیا کہ عالمگیر کا تخت پر بیٹھنا شاہ جہاں کو شاق گذرا۔

اس بات سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا کہ عالمگیر نے اپنے بھائیوں کو قتل کروایا! لیکن کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ وہ بھائی بھی اس کے قتل پر آمادہ تھے۔ ممکن ہے کہ پہلے انہوں نے وار کیے ہوں اور آخر اپنے ہی بچھائے ہوئے جالوں میں پھنس کر ہلاک ہو گئے ہوں۔

اپنے بھائیوں کے مقابلے پر کھڑا ہونا بجائے خود کوئی گناہ نہیں اور نظیر کے طور پر میں نے کورد کھشیتر کے فریقین کی طرف اشارہ کیا تھا۔ میرا ہرگز یہ مطلب نہ تھا کہ اس میدان میں بے وجہ بھائی بھائیوں کے قتل پر

---

[1] سبحان اللہ و بحمدہ! عذر گناہ بدتر از گناہ اسی کو کہتے ہیں۔ اہل فرنگ بھی تو یہی فرماتے ہیں کہ ایشیا اور افریقہ کے لوگ سخت بیمار ہیں۔ ہم بہ نظر ہمدردی انسانی ان کا معالجہ کرنے کے لیے ان کے ممالک پر قابض ہیں، اپنا فائدہ مقصود نہیں۔ (اڈیٹر)

آمادہ ہوگئے تھے۔ میں نے تو صرف ہندوؤں کی دور بینی کی داد دی تھی کہ جہاں مسلمان اکرم سے کے معتقد ہونے کے باوجود وہ تو اس بات کے قائل ہوسکے کہ کورو پہلے سے ہی نشانۂ اجل ہو چکے تھے وہاں تقدیر پر ایمان رکھنے والے مسلمانوں کو اتنی وسعت نصیب نہ ہوئی کہ اپنے بھائیوں کا کیفر کردار کو پہنچنا مشیت ایزدی کا ایک ادنیٰ سا کرشمہ متصور کرتے۔

اب رہا دوسرا الزام' کہ اورنگ زیب نے لوگوں کو جبرًا مسلمان بنانا چاہا، اس کے متعلق کوئی مستند شہادت نہیں اور جو افواہیں زبان زدعوام ہیں وہ ایسی بے بنیاد ہیں کہ کوئی ذی ہوش انہیں باور نہیں کر سکتا۔ مثلاً عام طور پر مشہور ہے کہ اورنگ زیب جب تک سوا من زنّار ہر روز اتروا نہ لیتا کھانا نہ کھایا کرتا۔ جائے غور ہے کہ اگر ایک زنّار کا وزن زیادہ سے زیادہ دو ماشہ ہو تو اس حساب سے چوبیس ہزار ہندوؤں کے زنّار ہر روز اتر تے۔ اگر ہندو اس سرعت سے مسلمان ہونا شروع ہو جاتے تو اس کے عہد سلطنت میں شاید جزیرہ نمائے ہند چھپنی تک کے ہندوؤں کو اسلام میں ایک چھوڑ دو مرتبہ داخل کیا جا سکتا تھا۔ لیکن ہندوؤں کی تعداد اب بھی چوبیس کروڑ کے لگ بھگ ہے۔ حالانکہ انگریزی عملداری میں علاقہ مدراس اور بنگال اور احاطہ بمبئی اور صوبہ جات متحدہ میں گھرانوں کے گھرانے عیسائی مذہب کے پیرو کار بنائے جا چکے ہیں۔

اورنگ زیب کا وزیر اعظم ہندو تھا، جو اپنے عقیدے کا پورا پورا پابند تھا۔ چنانچہ روایت ہے کہ جب ایک دفعہ ایک مسمار شدہ مندر کی جگہ شہنشاہ عالمگیر نے ایک مسجد تیار کروائی تو اس موقعہ پر وزیر مذکور نے ایک بیت برجستہ کہا۔ اگر ہو سکے تو وہ بیت[1] درج فرما دیجئے جس کا مطلب یہ ہے کہ دیکھیے حضرت! ہمارے صنم خانوں کو یہ شرف حاصل ہے کہ ویران ہو کر خانۂ خدا بن جاتے ہیں۔ شہادت موجود ہے کہ اورنگ زیب کی پیشانی پر اس راست بیانی سے بل تک نہیں آیا۔ کیا اس بات سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ شاہ عالمگیر کسی شخص کے مذہبی جذبات کو مجروح پہنچانا نہیں چاہتے تھے۔

ویران اور مسمار شدہ مندروں کی جگہ مسجدیں تعمیر کروانے اور نئے مندروں کو ویران اور مسمار کر کے مسجدیں تعمیر کروانے میں بڑا فرق ہے۔ اگر اورنگ زیب نے مندروں کے کھنڈرات پر مسجدیں تعمیر کروائی ہیں تو میرے خیال میں فرنگستان کے رومن کیتھولک پادریوں کی نظر اس پر عائد نہیں ہو سکتی اگر ایک غیر مستعمل اور خستہ حال مندر

---

[1] ببیں کرامت بتخانۂ مرا اے شیخ　　که چوں خراب شود خانۂ خدا گردد　　(ایڈیٹر)

کی جگہ اس نے ایک عبادت خانہ بنوادیا ہے، تو اُس سے کسی فرقے کی دل آزاری مقصود نہ تھی بلکہ اس کے پاس خانۂ خدا کا مسجد سے بہتر کوئی پلین تھا ہی نہیں۔ ممکن ہے کہ ایک دو مقامات پر کسی صوبہ دار کے جبر و تعدی سے کوئی ایک آدھ ناخوشگوار بات سرزد ہوگئی ہو۔ لیکن اگر اصل حالات کی پڑتال کی جائے گی تو اس کا ہمیں باہمی کھینچا تانی کے سوا اور کچھ نہ ملے گا۔

حاصل کلام یہ ہے کہ اورنگ زیب کے متعلق جس قدر اتہام باندھے جاتے ہیں وہ سب کے سب مبالغہ آمیز معلوم ہوتے ہیں اور آئندہ مورخوں کو دو باتوں میں سے ایک بات پر عمل پیرا ہونا چاہیے۔ یعنی یا تو عالمگیر کو متقی اور پرہیزگار اور سیاست مدن کے اصولوں پر پورا پورا حاوی قرار نہ دیں یا اُسے غاصب، غدار، کوتاہ اندیش، پرلے درجے کا متعصب اور مردم کش کہنا چھوڑ دیں، ورنہ ان پر یہ شعر عاید ہوگا:

تو مرے حال سے غافل ہو پر اے غفلت کیش ٭ تیرے انداز تغافل نہیں غفلت والے

اگر میں عالمگیر کو ظاہر پرست سمجھتا تو شاید مجھے اس کی شان میں اس قدر خامہ فرسائی کرنے کی ضرورت نہ پڑتی۔ لیکن خوش قسمتی یا بدقسمتی سے میں اُسے ایک ایسا پاکباز شخص سمجھتا ہوں جس نے اس قدر پیچ در پیچ خانہ جنگیوں کے باوجود اپنے مافی الضمیر کو نظر انداز نہیں کیا اور جس نے ساری عمر کسی اور چیز کی چنداں پروا نہیں کی حتیٰ کہ رضائے الٰہی کی۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ ہندوؤں کے چند جنگ جو فرقے جو مسلمانوں کے خلاف زور پکڑتے گئے ان کی وجہ سے ہندوؤں اور مسلمانوں کے تعلقات کچھ بے طرح کشیدہ ہو رہے تھے اور بعض حالتوں میں دونوں طرفوں سے طرح طرح کے مظالم سرزد ہو جاتے تھے۔ لیکن اورنگ زیب نے حتی الوسع خون آشامی سے پرہیز کیا ہے۔

نیاز کیش: (دستہ پرشاد فدا)

اڈیٹر کا نوٹ: ہم اس بحث کو طول دینا نہیں چاہتے۔ جزئیات کو نظر انداز کر کے اورنگ زیب کی زندگی کے بڑے بڑے واقعات ہر اسکول کے لڑکے کو معلوم ہیں اور دنیا ان پر رائے قائم کر چکی ہے۔ صرف دو باتیں عرض کرتی ہیں اول یہ کہ تاریخ ممکنات کا نام نہیں بلکہ واقعات کا نام ہے۔ آپ فرماتے ہیں "ممکن ہے کہ شاہجہاں کے عارضے نے کچھ ایسی خطرناک صورت اختیار کر لی ہو" "ممکن ہے کہ پہلے انہوں نے وار کیے ہوں" وغیرہ وغیرہ۔ اگر ممکنات سے بحث کرنا ہے تو ایک دفعہ ہی کیوں نہ کہہ دیجیے کہ ممکن ہے اورنگ زیب نے نہ اپنے بھائیوں کو قتل کرایا ہو، اور نہ اپنے باپ کو قید کیا ہو۔ یہ سب دھوکا ہی دھوکا ہو۔ دوسرے یہ کہ تعصب مذہبی کی ایسی سیکڑوں مثالیں دنیا میں مل سکتی ہیں کہ باوجود اتقا اور پرہیزگاری کے مذہب کے معاملے میں لوگوں نے جبر و تعدی سے کام کیا ہے۔ پروٹسٹنٹ اور رومن کیتھولک، شیعہ اور سُنّی کے جھگڑوں کی تاریخ اس بات کی شاہد ہے۔ (ستمبر ۱۹۱۹ء) ●●

سید سلیمان ندوی

سلطنتِ اودھ میں ہندوؤں کا حصّہ

ہندو مسلمانوں میں آج جو اختلافات ہیں اُن کی ذمہ داری بہت کچھ اُس تاریخ کے سر ڈالتا ہوں جو ہمارے اسکولوں اور کالجوں میں پڑھائی جاتی ہے۔ دنیا میں کسی قوم کا دورِ حکومت سراپا معصوم اور بے گناہ نہیں ہو سکتا۔ دیکھنا یہ چاہیئے کہ اس کی خوبیوں اور برائیوں میں سے کس کا پلہ بھاری ہے۔ انگریزی کورس کی تاریخ میں ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر وہی واقعات سامنے لائے جاتے ہیں جن سے دونوں قوموں کے درمیان بیر پیدا ہو اور محبت کے خیالات کافور ہو جائیں۔ میں ہندو مسلمان اہلِ قلم سے اپیل کرتا ہوں کہ وہ ہمارے نوجوانوں کے سامنے تاریخِ ہند کے وہ نقوش نمایاں کریں جن میں جادوئے محبت کی تاثیر ہو۔

ذیل کا مضمون اسی دریائے خیال کی ایک لہر ہے۔

سلطنتِ تیموری کا قاعدہ تھا کہ جب کوئی شخص کسی ملک کی صوبہ داری پر نامزد ہوتا تھا تو اُس کے ساتھ کے عملہ (اسٹاف) کا انتخاب بھی بادشاہ ہی کی طرف سے ہو جاتا تھا۔ صفدر جنگ کو جب اودھ کی صوبہ داری ملی تو اُن کے ساتھ راجہ نول رائے ونا دیوان (وزیرِ مال) اور پورن چند نام دلّی کے ایک کایستھ سکسینہ بھی سر دفتر بنا کر بھیجے گئے۔ راجہ نول چند روہیلوں کے استیصال کے بعد روہیل کھنڈ کے صوبہ دار بنائے گئے۔ پورن چند جو بعد کو راجہ پورن چند ہوئے ان کے خاندان نے لکھنؤ کے زمانۂ شاہی میں بڑا عروج حاصل کیا۔ اُس زمانہ کے مسلمانوں میں عربی، فارسی، ترکی اور دیگر عقلی اور ادبی علوم کی اعلیٰ تعلیم تھی۔ اس خاندان کا ایک ایک ممبر اُس میں فاضلِ یگانہ تھا۔ سلطنتِ اودھ کے اعلیٰ مناصب اور عہدے بلا تفریقِ ذات و قومیت اُن کو ملتے تھے۔ لکھنؤ کا محلہ پورن ٹولہ

اسی خاندان کی یادگار ہے۔ غدر سے پہلے یہاں اس خاندان کے لوگوں کی بڑی بڑی قلعہ نما عمارتیں تھیں جن کو حکومت انگریزی نے اس خوف سے کہ یہاں باغی پناہ گزیں نہ ہوں منہدم کرا دیا۔

راجہ پورن چند کے بعد ان کی اولاد میں راجہ صاحب رام دہلوی اودھ کی طرف سے ملتے کے املاک شاہی کے منتظم و مختار تھے۔ راجہ صاحب رام کے بعد اسی خاندان کا ایک اور ممبر راجہ بہادر سنگھ اسی عہدہ پر ممتاز ہوئے۔ ان کے چھوٹے بھائی رائے منولال عربی و فارسی کے بہت بڑے فاضل تھے۔ اردو فارسی میں شعر کہتے تھے اور صفا تخلص رکھتے تھے۔ اردو کا یہ مشہور شعر؎

چرخ کو کب یہ سلیقہ ہے ستم گاری میں کوئی معشوق ہے اس پردۂ زنگاری میں

انہیں کے سلیقۂ شاعری کا ایک نمونہ ہے۔ عہد شاہی میں اخبار نویس (افسر تاریخ) تھے۔

رائے منولال صفا کی شادی مہاراجہ جھاؤلال کی لڑکی سے ہوئی تھی۔ یہ وہی جھاؤلال ہیں جن کے نام سے بازار جھاؤلال اور پل جھاؤلال لکھنؤ اب تک یادگار ہیں۔ مہاراجہ جھاؤلال نواب آصف الدولہ کے عہد میں وزیر جنگ اور افواج شاہی کے جنرل تھے۔ اس خاندان کے ایک اور ممبر راجہ لعل جی بہادر فوج شاہی کے بخشی الممالک تھے۔ لعل جی کے بعد ان کے بیٹے راجہ الفت رائے بہادر فوج کے بخشی ہوئے اور بخشی الممالک خطاب ہوا۔ یہ شاعر بھی تھے اور الفت تخلص رکھتے تھے۔ بال کرشن پرشاد مخاطب بہ مشیر الدولہ موید الملک مہاراج اعتماد جمارت جنگ دفتر شاہی کے افسر اعلیٰ تھے۔ وہ بھی اسی خاندان سے رشتۂ قرابت رکھتے تھے۔ رائے بالک رام توپ خانۂ شاہی کے افسر بھی اسی دودمان عالی کے یادگار تھے۔ علمی حیثیت سے اس خاندان کے سب سے بڑے مایۂ ناز فرزند رائے بالک رام کے بیٹے فخر الدولہ بخشی الممالک مہاراجہ رتن سنگھ بہادر ہوشیار جنگ تھے۔ مہاراجہ رتن سنگھ اپنے زمانہ کے بہت بڑے عالم تھے۔ عربی فارسی اور ترکی میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔ منطق، فلسفہ اور خصوصاً ریاضیات میں ان کا پایہ بہت بلند تھا۔ ریاضیات میں حدائق النجوم ان کی نہایت معرکۃ الآرا کتاب ہے اور اب تک عربی درسگاہوں میں مستعمل ہے۔ شرح گلگشتی بھی ان کی ایک تصنیف ہے۔ بادۂ شیراز کے متوالے تھے۔ ان کا فارسی

دیوان بہت بڑا ہے۔ زخمی تخلص رکھتے تھے۔ کلام کا نمونہ یہ ہے۔ ؎

اے غازہ بنام تو برخ شاہد فن ما　　پیرایہ ز وصف تو عروسان سخن را

شب کہ بیمار عشق مرگ تمنا می کرد　　خندہ زیر لبش کار مسیحا می کرد

شب کہ آن رشک قمر بود جدا از زخمی　　کار خورشید قیامت مہ تابان می کرد

قیاس اُستادی آن غمزہ زاینجا می توان کردن　　تقاضا مشق ستم کردہ است مشقی در دلبستانش

ہر زمان بسکہ ز انداز دگر می آئی　　چشم بد دور چہ زیبا بہ نظر می آئی
یا تنم یافتم از زلف عبیر آگینت　　بہم آمیختہ با شام سحر می آئی

(رباعی)

ابرست و صبا دم مسیحا دارد　　بیمار غمت مرگ، تمنا دارد
گر بہر عیادت قدمے رنجہ کنی　　قربان تغافلت سرم جا دارد

مہاراجہ رتن سنگھ اس علم و ہنر کے ساتھ سلطنت اودھ کے ایک اعلیٰ منصب پر ممتاز تھے یعنی محمد علی بادشاہ کے میر منشی (سکریٹری) تھے۔ تمام فرامین اور مراسلات انہیں کے ہاتھ سے جاری ہوتے تھے۔

اس خاندان کے ایک اور نوبادۂ اقبال نواب افتخار الدولہ افضل الملک مہاراجہ میوا رام بہادر صلابت جنگ سلطنت اودھ کے دیوان یعنی وزیر مال تھے اور عزت و توقیر میں وزیر اودھ کے ہم رتبہ تھے۔ میوا رام کے نواسے راجہ ادہراج بشیشوا پردھان راجہ مراد سنگھ بہادر دار الضرب شاہی کے مہتمم تھے۔ مہاراجہ رتن سنگھ کے نام راجہ بھگوان داس

؎ پٹنہ لائبریری کی فہرست محبوب الالباب سے منقول ہے (سید سلیمان ندوی)

سلطنت اودھ کے مشہور رکن تھے۔ بادشاہ کی طرف سے ملک روہیل کھنڈ کے صوبہ دار مقرر ہوئے تھے۔

صفدر جنگ کے ساتھ تیسرا ہندو خاندان راے نہال راے کا لکھنؤ آیا تھا۔ یہ خاندان اکبر کے زمانہ سے سلطنت تیموریہ کے دامن سے وابستہ تھا اس خاندان کے مورث اعلیٰ راے بھاگ مل کو شاہجہاں کی طرف سے خطاب راے گی اور قنوج میں جاگیر شاہی عطا ہوئی تھی۔ اس خاندان میں راے ہر سدھ رام نے بہت شہرت حاصل کی۔ مراتب نویسی کی خدمت اور پانصدی (۵۰۰ سواروں کے افسر) منصب عطا ہوا۔ راے نول راے انہیں کے بیٹے تھے۔ حکومت اودھ کی فوج سوار کے افسر داغ تھے۔ یہ عہدہ دو تین پشتوں تک انکے خاندان میں موروثی رہا۔ ان کی اولاد میں سے راجہ مجلس راے نے نواب سعادت علی خاں کے مزاج میں نہایت رسوخ اور دخل حاصل کیا اور آخر بخشی گری کا عہدہ پایا۔ ضلع اوناؤں اور قنوج میں لاکھوں روپے صرف کرکے سراے اور مندر تعمیر کرایا۔

مجلس راے کے بیٹے راے پرتھی چند نے محمد علی شاہ کے زمانہ میں بڑی عزت حاصل کی اور حسن خدمت کے صلے میں گراں بہا خلعت پائے اور قیام الدولہ بخشی الممالک مستحکم جنگ کے خطاب سے مخاطب اور بخشی گری و سپہ سالاری کے عہدے پر ممتاز ہوئے۔ لاکھوں کے صرف سے قنوج اور لکھنؤ کے نواح میں تالاب، سراے اور مندر انہوں نے تعمیر کرائے۔ شاعر بھی تھے دائم تخلص رکھتے تھے۔

راجہ بینی بہادر کا نام بھی اس موقع پر بھلایا نہیں جا سکتا۔ وہ نواب شجاع الدولہ کی حکومت کے دست و بازو تھے۔ مختار و مدار المہام سرکار اودھ ان کا عہدہ تھا۔ سیر المتاخرین کے مصنف نے ان کی جرأت اور حق گوئی کی بڑی تعریف کی۔ بندیل کھنڈ کی فتح میں فوج شاہی کا ہراول انہیں کی زیر افسری تھا۔ بکسر میں شاہ اودھ اور انگریزوں سے جو لڑائی ہوئی تھی راجہ بینی بہادر اس میں بھی افسر فوج تھے۔ راجہ خود اور انکے صاحبزادے راجہ جسونت سنگھ پروانہ بھی شاعر تھے۔ راجہ کا تخلص بہادر تھا۔ ایک شعر باقی رہ گیا ہے:

سیا ہی مو کی گئی، دل کی آرزو نہ گئی　　ہمارے جامۂ کہنہ سے مے کی بو نہ گئی

پرواز کا شعر ہے:

کیا جانیے ہلام کر اُسے دیکھ کے ہم تو　　ہر چند سنبھالے رہے پر دل کو غش آیا

کہتے ہیں کہ ایک دفعہ پرواز شیخ علی حزیں کی ملاقات کو گیا۔ شیخ نے کہلا بھیجا:

درین بزم رہ نیست بیگانہ را

پرواز نے برجستہ جواب دیا:

کہ پروانگی داد "پرواز" را

راجہ جسونت سنگھ نے شجاع الدولہ کے عہد حکومت میں دیوانی (وزارت مال) کا عہدہ حاصل کیا۔

آخر میں ہم کو ایک خاندان کا اور تذکرہ کرنا ہے، وہ راے منولال فلسفی کا خاندان ہے۔ یہ خاندان اصل میں مالوہ کا تھا۔ خلجیوں کے زمانہ میں وہاں سے آوارہ ہوا اور آخر اودھ کے قصبہ سندیلہ میں اس نے سکونت اختیار کی۔ راے رگھناتھ عرف راے نندرام اس خاندان میں پہلا شخص ہے جس نے دربار شاہی میں رسائی حاصل کی۔ یہ شاہجہاں کا زمانہ تھا۔ وہ صلاحی منصب پر ممتاز ہوا۔ چندر بھان برہمن کا فارسی میں شاگرد تھا۔ اس کے بعد اس کا لڑکا بھی اسی عہدہ پر مامور ہوا۔ اس کا پوتا مرزا بیدلؔ کا شاگرد اور نواب محمد امین خاں کا مصاحب تھا۔ پرپوتا راے خوشحال راے شاہ گلشن کا شاگرد تھا اور پانچ ہزاری فوج کا وکیل تھا۔ نادر جب ہندستان آیا ہے اور دلی غارت کر کے یہاں کے عجائبات اپنے ملک کو لے جانے لگا تو ان عجائبات میں راے خوشحال راے کا بھی شمار ہوا اور وہ نادر کی معیت میں ولایت کو روانہ ہوا اور کابل جا کر وفات پائی۔

راے منولال خوشحال راے کا پوتا تھا۔ اس نے اپنے زمانہ کے مشاہیر علما سے تعلیم پائی تھی۔ عربی و فارسی دونوں میں استاد تھا۔ فلسفہ اور ریاضیات میں اس کو کامل دستگاہ حاصل تھی۔ ادبیات میں گلستان ارم، بوستان حیرت، شارستان نور، دیوان اشعار۔ معقولات میں سایدالاستخراج، کتاب الاحکام، عجائب در علم حساب، جغرافیہ و ہیئت و

حکمت میں چند رسائل، طب میں مفردات الطب، تاریخ میں تنقیح الاخبار اس کے ہمہ گیر قلم کی مخلوقات علمیہ ہیں فلسفی تھا اس لئے فلسفی تخلص رکھتا تھا۔ ابتداءً نواب فیض اللہ خاں کی سرکار میں اور اس کے بعد نواب آصف الدولہ کے دربار میں نوکر ہوا۔ فلسفی کا بھائی لالہ موہن لال حاذق طبیب اور فارسی کا ادیب تھا۔ نسخۂ دلبستان اس کی تالیف ہے۔ اس نام در باپ کا فرزند ماجر کندن اشکی ہے۔ عربی فارسی کی کتابیں بریلی، رامپور، دلی اور بنارس کے بڑے بڑے علما سے پڑھیں۔ سنسکرت کے علوم سری کیب اندر جھا سے حاصل کیے۔ اسلامی علوم و فنون میں بھی اس کی نظر نہایت وسیع تھی۔ ہیئت میں اس کو خاص ملکہ تھا۔ زیج اشکی اس کی قابلیت کی بہترین سند ہے۔ فلسفہ میں حکمت ہندیہ، اکسیر سعادت اور قسطاس تین کتابیں۔ آخری کتاب ہندوؤں، یونانیوں، عربوں اور فرنگیوں کے علوم کی انسائیکلوپیڈیا ہے۔ فارسی اشعار کا ایک دیوان بھی اس کی یادگار ہے۔ پہلے ایسٹ انڈین کمپنی میں ملازمت کی اس کے بعد نواب منتظم الدولہ مہدی علی خاں کی وساطت سے محمد علی شاہ کی سرکار میں رسائی حاصل کی۔ چار صدی منصب اور محکمۂ انشا (مجسٹریٹ) میں کسی ممتاز عہدے پر سرفراز ہوئے۔ راجہ بختاور سنگھ اور راجہ ٹکیت رائے جن کے نام سے ٹکیت گنج لکھنؤ میں اب تک آباد ہے، سلطنت اودھ کے ان ارباب مناصب میں ہیں جن کا نام اودھ کی تاریخ کے ساتھ زندہ رہے گا۔ اسی طرح رائے آتمارام جو آصف الدولہ کے زمانہ میں چودہ محال کے چکلہ دار (کلکٹر) تھے، ان کا خاندان مرادآباد میں اب تک موجود ہے۔ راجہ درشن سنگھ اور شنکر سہائے یکے بعد دیگرے علاقہ رامپور کے ناظم (کمشنر) مقرر ہوئے۔ گوپال رائے اور بھولا ناتھ دونوں باپ بیٹے بخشی گری کے عہدہ پر ممتاز ہوئے۔

صفحات بالا میں ہم نے نہایت سرسری طور پر سلطنت اودھ کی تاریخ کا ایک مختصر سا باب پیش کیا ہے۔ اس میں آپ کو نظر آ سکتا ہے کہ دلی کے نظام شمسی میں اختلال پیدا ہونے کے بعد جو ستارہ ہمارے ملک میں ٹوٹ کر گرا وہ بھی کس قدر درخشاں اور تاباں تھا۔ ہندوستان کا ہر صوبہ آج حکومت برطانیہ سے ذمہ دار مناصب، اعلیٰ خطابات اور ملکی حکومت کا خواستگار ہے۔ ہمارا صوبہ بھی اس سیاسی طلب اور خواستگاری میں

دوسرے صوبوں سے پیچھے نہیں ہے لیکن اس وقت جب کہ وہ مستقبل میں آگے بڑھنے کے لئے کوشاں ہے اُس کو پیچھے مڑ کر ایک دفعہ اپنی ماضی پر ایک نگاہ غلط انداز ڈال لینی چاہیئے۔ آج ہندوستان کا ایک ایک گوشہ لارڈ سنہا کے خطاب عالی اور منصب رفیع پر خوشی و مسرت کے ترانوں سے گونج رہا ہے۔ دارالحکومت اودھ میں شکریہ اور منت پذیری کے لئے شہر کے عوام و خواص کا اجتماع ہوتا ہے۔ لیکن غور سے سنو! اس شہر کی تاریخ ماضی کے فونوگراف میں اس سے بلند تر خطابات کے الفاظ تم کو سنائی نہیں دیتے؟ غور سے دیکھو! اُس کے مرقع حکومت میں ہندو مسلمان پہلو بہ پہلو مناصب عالیہ کی کرسیوں پر بیٹھے دکھائی نہیں دیتے؟ ہندوستان کی موجودہ حکومت میں اگر پچھلی حکومت کا کم از کم یہی منظر دوبارہ نمایاں ہو جائے تو آپ کہہ سکتے ہیں کہ کانگریس مسلم لیگ اور ہوم رول لیگ اپنے مقصد میں ناکام رہیں؟

(اپریل - ۱۹۱۹ء)

••

سیّد ابوالاعلیٰ مودودی کے ایک مضمون کے بارے میں

رسالہ دلکش کے دو نمبر ہمارے سامنے ہیں۔ اس کی ضخامت تین جز، کاغذ سفید دبیز، سرورق نہایت دلکش اور تصاویر عمدہ ہیں۔ لکھائی چھپائی البتہ خیر خواہ نہیں۔ غالباً مرادآباد میں اس سے بہتر انتظام ممکن نہ ہوگا ورنہ یہ کمی باقی نہ رکھی جاتی۔ مضامین کا دائرہ ظاہر محدود نہیں ہے کیونکہ تاریخی اور ادبی مضامین کے علاوہ سیاسی موضوع پر بھی توجہ دی جاتی ہے۔ البتہ رسالہ کی زبان ظاہراً متانت و شوکت سے گری ہوئی ہے اور مضامین بھی زیادہ توجہ کے محتاج ہیں۔ اس کی وجہ ظاہراً یہ معلوم ہوتی ہے کہ مسٹر اوتار کرشن اگروال اڈیٹر رسالہ خود ابھی میدان صحافت میں نو آموز ہیں۔ تاہم آپ کی کوشش اور ہمت قابل داد ہے۔ دلکش کے فروری نمبر میں دو مضامین قابل ذکر ہیں۔ اوّل حضرت سید جمال الدین المعروف بہ افغانی کا تذکرۂ زندگی از قلم قاضی عبدالغفار صاحب اڈیٹر جمہور مرحوم۔ دوسرے "مسٹر آصف علی بیرسٹر کی بیدار دیاں ٹیگور کے ساتھ" از مولوی ابوالاعلیٰ مودودی۔ قاضی عبدالغفار صاحب نے اس مضمون میں اس تذکرہ کی صرف تمہید ڈالی ہے اور آئندہ نمبروں میں حضرت جمال الدین افغانی کے سوانح زندگی کے مفصل بیان کرنے کی توقع دلائی ہے۔ حضرت مودودی نے مسٹر آصف علی دہلوی کے ترجمہ چترا پر اعتراضات کیے ہیں کہ جو جا بھی ہیں اور بیجا بھی۔ جو اعتراضات کہ جا ہیں ان کو تو غالباً آصف علی صاحب بھی مان لیں گے، لیکن بیجا اعتراضات پر بحث چھیڑنے کی کافی گنجائش ہے۔ ہمیں افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ حضرت مودودی کے خود اس ترجمہ پر کہ جو انہوں نے بطور صحت کیا ہے کافی اعتراضات کی گنجائش ہے۔ ہم کو یہ بحث چھیڑنی منظور نہیں ورنہ ہم اپنے اعتراضات پیش کرتے۔ اصلیت یہ ہے کہ ایسے اعلیٰ پایہ کی کتابوں کا ترجمہ کرنا کہ جیسے ٹیگور کی تصنیفات ہر کس و ناکس کا کام نہیں لیکن کیا کیا جائے کہ فی زمانہ زباندانی کا زعم باطل اور صاحب تصنیف بننے کا مرض عالمگیر ہو رہا ہے۔

(بدایوں ہمارے اخبار : مارچ ۱۹۲۰ء)

ل؎ صبح امید کے ایک مضمون بعنوان "مصر انگریزی احتلال سے پہلے" میں بڑے بھائی سید ابوالخیر مودودی نے سیّد ابوالاعلیٰ مودودی کے ایک اور مضمون کا حوالہ دیا ہے جس کا عنوان انہوں نے "انگریزی لغت میں دوستی کے کیا معنی ہیں" بتایا ہے۔ یہ حوالہ نہیں دیا کہ یہ مضمون کہاں شائع ہوا تھا۔ (ع ر ب)

نورالحسن نیرؔ

لفظ تظلّم کا استعمال

سرورؔ اور ابوالکلام آزاد کی غلطی

ادیبِ اُردو کے فروری اور مارچ نمبر ہمارے سامنے ہیں۔ جیسا کہ رسالہ کے نام سے ظاہر ہے اس کا مقصد اردو کی اصلاح اور ادبی مباحث کا سلسلہ قائم رکھنا ہے۔ ماسوا اس کے ایکسٹرا من یہ بھی معلوم ہوتی ہے کہ مدیر رسالہ کا تصنیف "نورُاللغات" کی اشاعت بھی اسی سلسلہ میں ہو جائے۔ امید ہے کہ اپنے محدود دائرہ میں رسالہ اپنا مقصد پورا کرے گا۔ دونوں نمبروں میں دو سے زیادہ مضامین قابلِ تذکرہ نہیں۔ فروری نمبر میں مولانا حالیؔ کے فارسی اور عربی کلام کا تذکرہ ہے اور مارچ نمبر میں میر اوسط علی رشکؔ کا ذکر کیا گیا ہے۔ لفظ "تظلّم" کے اردو میں غلط استعمال کی بحث بھی چھیڑی گئی ہے۔ اور اسی سلسلہ میں مولانا ابوالکلام آزادؔ اور مولوی عبدالحلیم صاحب سرورؔ پر اس لفظ پر اعتراض کیا گیا ہے۔ بحث دلچسپ ضرور ہے۔ ملاحظہ ہو: ایڈیٹر

"ایک عرصہ سے اُردو زبان میں لفظ تظلّم بجائے ظلم مستعمل ہو رہا ہے۔ حالانکہ اس کے معنی ازروئے لُغت کسی کے ظلم وستم سے فریاد کرنے کے ہیں۔ مثالیں ملاحظہ ہو:

(سعدی) تظلّم بر آورد و فریاد خواند (نظامی): تظلّم زنانند بر شاہ روم (میر شاہی)؛ داد خواہم بر در سلطان تظلّم میکنم (امیر الشعرا) تیغ بجائے مرادست تظلّم مجھ کو۔ اُردو کی بہت کم کتابیں ایسی خوش نصیب ہوں گی جن میں اس لفظ کا بیجا استعمال نہ کیا گیا ہو۔ چند مواقع ملاحظہ ہوں:

رسالہ "نقیب" بدایوں، بابت مارچ ۱۹۱۹ء میں حکیم فضل الرحمٰن صاحب کی ایک نظم بعنوان عرضِ حال شائع ہوئی ہے۔ ایک شعر میں وہی غلطی موجود ہے:

تعصب سے "تظلّم سے" جفا سے کام لیتے ہیں
یہ بدلے ہم سے کب کے دشمنِ اسلام لیتے ہیں

فسانۂ کلارنس ور دھا مترجمۂ منشی امیر حسن خان کاکوروی "سازش رائی ہوکس" کے ذیل میں یہ لفظ موجود ہے۔

چند روز ہوئے اخبار "سیاست" کے کسی پرچہ میں خود اس کے ایڈیٹر کے قلم سے یہی لفظ بے موقع

لکھا ہوا دیکھ چکا ہوں۔ افسوس کہ وہ پرچہ موجود نہیں اور نہ اس کی تاریخ ہی یاد ہے۔

طوالت کے خوف سے میں عوام میں سے صرف اپنی چند ناموں پر اکتفا کروں گا۔

خواص میں سے اس وقت دو نام پیش کروں گا جن کی ذات پر اردو لٹریچر کو فخر و ناز ہے :

(۱)— علامۂ زمان حضرت مولانا مولوی ابوالکلام صاحب آزاد مدظلہ العالی رسالہ "البلاغ" نمبر ۱۲ میں رقمطراز ہیں :

"اگرچہ مخالفین کے دستِ تطلّم نے بارہا اس کو بھی بے نام و نشان کرنا چاہا۔"

(۲)— مؤرخ دوراں مولانا مولوی محمد عبدالحلیم صاحب شرؔر لکھنوی ایڈیٹر رسالہ "دلگداز" سخن سنج بابت ماہ اکتوبر ۱۹۱۸ء میں لکھتے ہیں :

"جنہوں نے کسی نہ کسی وقت دلِ آرزومند کی طرح خزاں کے دستِ تطلّم کا جور سہے ہوئے جوانانِ چمن کی امیدوں کی بات رکھ لی۔"

یہ کیا غضب ہے اردو زبان کے وہ بے نظیر انشا پرداز جن کا ثانی زمانہ کبھی نہ پیدا کر سکے گا ایسی بڑی غلطی کا شکار ہیں، جب کہ اُن کے سے عالم و فاضل اشخاص سے کسی طرح امید نہیں کی جا سکتی۔ مجھے قوی امید ہے کہ میری یہ مختصر تحریر بغیر کسی قسم کے رنج و غصّے کے پڑھی جائے گی اور مولانا شرؔر یا مولانا آزاد اس طرف توجہ کرکے اپنی زبان کو اس غلطی سے پاک کرکے اردو پر احسانِ عظیم کریں گے۔"

(بذیل ہمارے معاصرین : مارچ ۱۹۲۱ء)

●●

حضرت ثاقب سے معذرت

فروری ۱۹۱۹ء کے "صبح امید" میں مولانا حسرت موہانی کا ایک مضمون "دفار امپوری" کے حالات کے متعلق شائع ہوا تھا۔ اس مضمون میں مولانا موصوف نے برسبیل تذکرہ حضرت ثاقب پروفیسر وکٹوریا کالج گوالیار کی نسبت لکھا تھا کہ "آپ ایک حسن پرست رند مشرب آزاد اور داور سست مذہب بزرگ ہیں اور نماز نہیں پڑھتے ہیں"۔ مضمون کے طرز بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ثاقب اور مولانا حسرت کے مراسم بے تکلفانہ ہیں۔ اسی خیال سے یہ کلمات شائع کر دیے گئے۔ حضرت ثاقب کی ایک تحریر ہمارے پاس آئی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ ان کلمات سے ناخوش ہیں۔ لہٰذا ہم حضرت ثاقب کو یقین دلاتے ہیں کہ ہمیں واقعی افسوس ہے کہ آپکی نسبت ایسی باتیں شائع ہوگئیں۔ علاوہ اس کے اگر واقعی مولانا حسرت کا کوئی اور جملہ بھی آپکے بار خاطر ہوا ہو تو اس کے لئے بھی "صبح امید" معافی کا طالب ہے۔ ہماری نیت ہرگز نہ تھی کہ حضرت ثاقب کے دل کو کسی قسم کا صدمہ پہنچے ہمیں امید ہے کہ "صبح امید" کے پڑھنے والے اگر حضرت ثاقب کو مولانا حسرت کے مضمون کی بنیاد پر حسن پرست، رند مشرب، آزادہ رو یا سست مذہب سمجھنے لگے ہیں تو اس تردید کے بعد وہ اپنا خیال بدل دیں گے۔ (ایڈیٹر)

(بشکریہ رفتار قوم: مارچ ۱۹۱۹ء)

constitutional and political problems of India mainly focussed by *Tej Bahadur Sapru*, *Lala Lajpat Rai* and *Kishan Prashad Kaul*. The following section is devoted to a controversy regarding **Aurangzeb** followedby an assessment of **Hindus' contribution** to the court and culture of Avadh.

The Selection begins as also ends with pure literary themes as three writings, one on Maulana Maududi the other on Maulana Abul Kalam Azad, and the third on Maulana Saqib, mark the end of the present section.

It is hoped that, apart from bringing to light, afresh, significant literary pieces of the years around 1920, this Selection may also throw light on the level of socio-political consciousness of the Indian intellectuals during the period immediately following the first World War with special reference to the Liberal and Swarajist wing of the Indian National Congress and, incidentally, uncovering a grand chapter of India's fight for freedom.

—*Editor*

FOREWORD

The Present Issue contains a Selection of the significant writings appearing in the Urdu monthly of the famous nationalist Urdu poet, Pandit Braj Narain *Chakbast* (1882-1926). The Selection opens, in commemoration of Prem Chand centenary, with 4 forgotten short stories of **Prem Chand** and notices of his two **Collections**, alongwith an article placed separately in another more relevant section. It is followed by compositions of three poets : *Nazar*, *Qamar* and *Syed Sulaiman Nadvi*—not easily found elsewhere. The next section is devoted to lesser known but otherwise significant poets : *Mashshaq*, *Wafa*, *Azal* and a few junior and senior contemporaries of Naubat Rai Nazar—alongwith two notes regarding *Iqbal* and *Josh*. The following section of this part contains philological controversies. **Pure literary** portion of the Selection ends here.

The second part of the Selection concerns the issues of **Language and Education** in national perspective : *Tej Bahadur Sapru*, *Lala Lajpat Rai* and *Abul Khair Maududi* (the elder brother of Maulana Maududi) are the contributors of this section.

The third part, on **Religion**, contains two articles, one on Hinduism and the other on Buddhism. It is followed by the next part on **Political Thought** in general and **Indian Political Scene** in particular. Contributors of this part include *Premchand*, *Abdul Majid Daryabadi*, the prolific *J. R. Rai*, *Tej Bahadur Sapru* and (now, Col.) *Bashir Husain Zaidi*.

Middle East is the next section wherein **Egypt** and **Iraq** are the main issues. The discussion here as well is, however, as usual, with the perspectives and prospectives of Indian Politics in view.

The next part is devoted to **Socialism**, **Bolshevism** and the new world of **Soviet Russia**. It is followed by discussion on **contemporary**

Selections from the Urdu Monthly

SUBH-I UMMID (1918-21)

of

Braj Narain Chakbast

Editorial Committee :

Mr. Q. A. Wadood, Bar-at-law (***Chairman***)
Dr. S. H. Askari
Mr. A. F. Haider
Dr. A. R. Bedar (***Secretary***)

1. The Khuda Bakhsh Library Journal is a quarterly journal specialising in oriental studies in Arabic, Persian and Urdu languages, covering meaningful research based on the material preserved in the Khuda Bakhsh Oriental Public Library, or having any concern with it.

2. Articles will be accepted in English, Arabic, Persian and Urdu.

3. Notes and addenda, by way of corrections and additions to any information published in this Journal or in any publication of the Library e.g. Catalogues, will be a regular feature of the Journal.

KHUDA BAKHSH O. P. LIBRARY
PRICE
Rs.
PATNA-800004

Rs. 30 00 per copy

Annual subscription : Rs. 60.00 (Inland)
Pakistan : 12.00 Dollars
Europe : 8.00 Pounds
U.S.A. & Other Countries : 24.00 Dollars

Printers : Tara Press, Tripolia, Patna-7 & Patna Litho Press, Patna-4
Publisher : Mahboob Husain, for Khuda Bakhsh O.P. Library, Patna

Khuda Bakhsh Library

Journal

10-11

1979

Khuda Bakhsh Oriental Public Library
PATNA-800 004
(INDIA)

Khuda Bakhsh Library

JOURNAL

10-11

Khuda Bakhsh Oriental Public Library
Patna